حیدرآباد دکن

مجلّہ طیلسانئین کا چندہ و اشتہارات کا نرخ

مجلّہ کے چندے کے متعلق حسب ذیل امور پر عمل ہوگا۔

(۱) (الف) مجلّہ چندہ دہندہ ارکان انجمن طیلسانئین عثمانیہ کو بفقرہ قواعد کے بموجب بلا قیمت ارسال کیا جائیگا۔

(ب) مجلّہ کا حصّہ دوم بہ "معاشیات" معاشی کمیٹی انجمن طیلسانئین کے ارکان کے پاس بلا قیمت ارسال کیا جائیگا۔ اگر ان کو مجلّہ کے دونوں حصّے مطلوب ہوں تو اسکے لئے انکو (عہ) ایکروپیہ سالانہ اپنے چندہ رکنیت کے علاوہ ادا کرنا ہوگا۔

(ج) مجلّہ کے دونوں حصوں کی قیمت محصول ڈاک کے علاوہ خریداران مملکت آصفیہ سے پانچ روپے سکۂ عثمانیہ سالانہ ہوگی اور بیرون مملکت آصفیہ سے پانچ روپے سکۂ حکومت ہند۔

(د) مجلّہ کے عام حصّہ کی قیمت محصول ڈاک کے علاوہ خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ تین روپے سکۂ عثمانیہ ہوگی اور بیرون مملکت آصفیہ سے تین روپے سکۂ حکومت ہند۔

(ھ) مجلّہ کے حصّہ معاشیات کی قیمت مع محصول ڈاک خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ تین روپے سکۂ عثمانیہ ہوگی اور بیرون مملکت آصفیہ سے تین روپے سکۂ حکومت ہند۔

(۲) مجلّہ کے ہر حصہ کی قیمت فی نسخہ ایکروپیہ ہوگی۔ دونوں حصوں کی قیمت فی نسخہ ایکروپیہ آٹھ آنے ہوگی۔

(۳) اشتہارات کا نرخ حسب ذیل ہوگا۔

مقدار	نرخ سالانہ	نرخ فی اشاعت
پورا صفحہ پہلا ورق	۵۰، مہ ۱۵	صہ ۵
اندرونی	۱۵، عنہ	سے ۳
نصف صفحہ پہلا ورق	۱، عہ	عالہ
اندرونی	۱، صہ	عہ ۸

البتہ تبادلہ کے طور پر اشتہارات کی اشاعت مطلوب ہو تو مراسلت کے ذریعہ تصفیہ ہوسکے گا۔

(۴) مجلّہ کے سلسلہ میں ہر قسم کی مراسلت معتمد انجمن طیلسانئین عثمانیہ کمرہ نمبر ۲۰ مجرد گاہ مدرسہ کن نظام شاہی حیدرآباد دکن کے توسط سے کیجانی چاہیئے۔

(۵) خریداران اپنے پتہ کی تبدیلی سے مہتمم مجلّہ کو بروقت مطلع فرمائیں۔

انجمن طیلسانیین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی ترجمان

مجلۂ طیلسانیین

ساتویں جلد پہلا شمارہ

سنہ ۱۳۵۲ف مطابق سنہ ۱۹۴۳ء

مدیر ـ محمد غوث ام اے ال ال بی (عثمانیہ)

فہرست

Checked 1965

صفحہ

اداریہ

مملکت آصفیہ کے کسی نوآغاز ادارہ کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا بات سرمایۂ افتخار ہو سکتی ہے کہ ملک کی ہر جہتی ترقی کیلئے اسکی ناچیز سعی خود آقائے ولی نعمت کی پیشگاہ عالی مرتبت میں "قابل قدر" قرار پائے۔

مصنوعات مملکت آصفیہ کی پانچویں نمائش کے افتتاح کے لئے جلالت الملک اعلیحضرت بندگانعالی کا بہ نفس نفیس رونق افروز ہونا' اور ہز ہائنس والاشان ولی عہد بہادر و ہر ہائنس والاشان شہزادی صاحبہ برار اور مملکت آصفیہ کے صدر اعظم گرامی قدر و معزز ارکان باب حکومت کی موجودگی میں انجمن طیلسانیین عثمانیہ کے ایک ملحقہ ادارے کی قایم کردہ جماعت "مجلس نمایش" کا سپاس نامہ ایک عثمانیہ طیلسانی سے سماعت فرما کر ارشاد شاہانہ سے کامراں فرمانا اور نمایش کا دست مبارک سے افتتاح ایک ایسا اعزاز ہے کہ اس پر انجمن طیلسانیین عثمانیہ کی ساری تنظیم جس قدر بھی فخر و ناز کرے بجا ہے اور پیشگاہ حضور پرنور میں جس قدر بھی عقیدت مندی اور تشکر عرض کرے زیبا ہے آقائے ولی نعمت نے فرط نوازش سے ارشاد فرمایا کہ

"مجھے امید ہے کہ یہ انجمن اہل ملک کی مدد سے آیندہ اور زیادہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کریگی"

اس ارشاد ملوکانہ کے بعد انجمن کے کارکنوں کی زبان بس یہی دہرا سکتی ہے کہ زیر سایہ اعلیحضرت بندگان عالی ملک کے خدمت گزاروں کا قدم راسخ، ارادہ مضبوط، اور ان کے عمل میں خلوص نصیب ہو اور انجمن کو اپنے علمی نتائج کی بدولت تاریخ حیدرآباد میں بقاء دوام نصیب ہو۔

عرض حال

اس شمارے سے مجلہ کی عمر کا چھٹا سال شروع ہوتا ہے۔ مجلہ کی ترقی اور اسکو ایک علمی برادری کے

ترجمان کی حیثیت میں معیاری بنانے کے لئے کوشش وسعی مسلسل جاری ہے۔ پہلی کوشش تو یہ ہے کہ مجلہ اپنے مقررہ وقت پر شائع ہوا کرے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کوشش میں کامیابی ہو رہی ہے اور وہ وقت قریب ہے کہ مجلہ کی عدم پابندی کی شکایت دور ہو جائیگی۔ مجلہ کے اس شمارے کے لئے ضرور تھا کہ وہ بہمن میں شائع ہو جاتا لیکن مہینہ ڈیڑھ مہینہ کی تاخیر سال سال بھر کی تاخیر کے مقابل ضرور قابل مسرت ہے توقع ہے کہ مجلہ کا آیندہ شمارہ اپنے مقررہ وقت پر اردی بہشت میں شائع ہو جائے۔

وقت کی پابندی کے بعد بہتر کتابت اور عمدہ طباعت کی باری آئیگی اور رفتہ رفتہ سب خامیاں دور ہوتی جائینگی۔ صفحات کے اضافہ اور تصاویر کی کثرت میں جنگ کی مجبوریاں مانع ہیں۔ جنگ یا غیر جنگ مجلہ کے مالیات مستحکم ہوں تو سب مشکلات پر غلبہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مالیات کی فکر سے کارکنان مجلہ کو مستغنی کر دینا طیلسانی برادروں کی ہمت پر موقوف ہے۔

اس موقع پر اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ کابینۂ انجمن نے سالہ ۱۳۵۱ف کی ابتدا میں ہی مجلہ کی ادارت کے متعلق بعض امور طے کئے تھے لیکن جناب مولوی عبدالقادر صاحب سروری کے میسور تشریف لے جانے کی وجہ سے نئے انتظام کی ضرورت داعی ہوئی۔ کابینۂ انجمن کے تصفیہ کے بموجب سرکاری محکموں میں کارروائی چل رہی ہے سرکارت منظوری حاصل ہونے کے انتظار میں مجبوراً مجلہ موجودہ مجلس ادارت کے ہی نام سے شائع ہو رہا ہے۔

ترتیب مجلہ

۱۔ مجلہ کے گزشتہ شمارے سے ابواب کی جو ترتیب قائم کی گئی ہے اور حصۂ معاشیات کا جو اضافہ عمل میں آیا ہے اسکے متعلق مجلہ کے ناظرین کے خیالات اور رائے کا کارکنان مجلہ کو ابھی کوئی اندازہ نہیں ہوا۔ یہ مجلہ بھی اسی ترتیب سے مرتب ہوا ہے البتہ آئندہ قارئین کے مشورہ اور رائے سے اسمیں تغیر و تبدل ہو سکیگا۔

۲۔ واضح ہو کہ مجلہ کے مقاصد میں یہ مقصد بھی شامل ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے امتحانات ام۔اے اور ام۔ایس۔سی کے لئے لکھے ہوئے مقالے طبع کئے جائیں چنانچہ اس سے قبل تین مقالے طبع ہو چکے ہیں اور ایک مقالہ حصۂ معاشیات میں قسط وار چھپ رہا ہے۔ اس شمارے میں ایک اور مقالہ جس کے مولف

مولوی محمد غوث صاحب (محبوب نگری) ام۔ اے ہیں شروع کیا گیا ہے۔ اس مقالہ کا موضوع "امام غزالی کے کلامی خصوصیات" ہے۔ آئندہ اشاعت ہیں اس مقالہ کی تکمیل ہو جائیگی۔ مجلّہ کے صفحات پر جیسے جیسے گنجائش فراہم ہوتی جائیگی خود صاحبان مقالہ کی خواہش پر مزید مقالوں کی اشاعت عمل میں آئیگی۔

۳۔ اس شمارے سے جامعۂ عثمانیہ کے ایک قابل سپوت مولوی فاضل ڈاکٹر میر سیادت علیخانصاحب ام اے ال ال بی (عثمانیہ) پی ایچ، ڈی، بی، سی، ال (آکسن) بیرسٹرایٹ لا کے گران قدر مضامین کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ ان مضامین کا موضوع اصول قانون ہے۔ اُمید ہے کہ ان مضامین سے نہ صرف طلبۂ قانون بلکہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے اصحاب بھی استفادہ حاصل کرینگے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر اردو میں ابھی بہت کچھ لکھا جانا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جو توجہ کی ہے وہ سب اہل قانون سے ممنونیت حاصل کریگی۔

۴۔ مولوی محمد فاروق صاحب کا مضمون شہر سے قصبہ تک علمی نقطہ نظر سے بہت توجہ کے قابل ہے اگر دوسرے طیلسانی برادران بھی اپنے تجربے اسی طور سے قلم بند کریں تو بہت فائدہ بخش ہوگا۔ ایک برادر کے تجربہ سے دوسرا برادر استفادہ کریگا اور عام طور سے دوسرے علمی کام کرنے والے اصحاب کے معلومات میں بھی اضافہ ہوگا۔ بہت ساری غلط فہمیاں دور ہونگی اور کام کے نئے پہلو نمایاں ہوتے جائینگے۔

فکر و نظر

جنگ کی وجہ سے پیدا شدہ مشکلات کے باوجود یہ امر خوشی اور مسرت کا باعث ہے کہ مملکت آصفیہ میں ہر جہتی ترقی کے مراتب متواتر طے ہوتے جا رہے ہیں اور علمی سرگرمی کو زیادہ سے زیادہ فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ جیسا کہ حضرت پیر و مرشد نے سال گذشتہ کی نمائش کے ملاحظہ کے بعد پروانۂ خوشنودی میں تحریر فرمایا "بیداری کے آثار چو طرف رونما ہیں اور اگر واقعات کی رفتار یہی رہی تو وہ زمانہ دور نہیں ہے کہ ملک خوشحالی اور ارتقا کے منازل سرعت سے طے کرتے ہوئے کہاں سے کہاں پہنچ جائیگا"

حیدرآباد میں تعلیمی کتب کا کاروبار کرنے والے مشہور ادارہ اعظم اسٹیم پریس کے مالکوں نے ایک جدید علمی سعی کا آغاز کیا ہے اور "ادارہ اشاعت اردو" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے، اسکے مقاصد اور

کاروبار کے طریقہ کے متعلق ہر چند مجلّہ کو کوئی راست اطلاع حاصل نہیں ہے لیکن مقامی اخباروں میں یہ اطلاع شائع ہوئی تھی کہ اس ادارہ کا مقصد ادب اطفال، ادب نسواں اور ادب عالیہ کو ترقی دینا ہے۔ مجلّہ طیلسانیین اس نئے ادارہ کا تہ دل سے خیر مقدم کرتا اور اپنی اس توقع کا اظہار کرتا ہے کہ ان نوعیتوں کے ادب کو ترقی دینے میں مشرقی روایات، مشرقی خصوصیات اور مشرقی اداب کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائیگا۔ جدید ترقی پذیر نظریات اور رجحانات کو نظر انداز کردینا ظاہر ہے کہ کسی طرح خوش آئیند نہیں ہوسکتا البتہ پیش نظر یہ بات ضرور رکھنی چاہیئے کہ مشرق میں صدیوں کے تجربہ کے بعد جو امور کامل العیار ثابت ہوچکے ہیں وہ پس پشت نہ پڑجائیں اور مغرب کے وہ اصول جو خود مغرب کے تجربہ میں ناقص ثابت ہوچکے ہیں ہمارے جدید ادب میں داخل ہوکر سو پچاس سال کے بعد خود ہمیں بھی نہ تلملادیں۔

سال گزشتہ حیدرآباد اکاڈیمی نے جو علمی ہفتہ منایا تھا اسکی کامیابی سے ہمت پاکر اس نے گزشتہ ماہ دے میں دوسرا علمی ہفتہ منایا۔ یہ بھی ہر اعتبار سے کامیاب ہوا۔ اکاڈیمی کی کوششوں سے حیدرآباد کا علمی وقار بیرونی علمی حلقوں میں کافی طور سے زیادہ ہورہا ہے۔ اکاڈیمی کے لئے کام کرنے کے ابھی اور بھی میدان موجود ہیں۔ چونکہ اکاڈیمی سستی شہرت اور نام و نمود کے عصری بدنام طریقوں سے کام لینا نہیں چاہتی اسلئے لامحالہ اسکو اپنے مالیہ سے ابھی بے فکری حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اب یہ اہل حیدرآباد کا کام ہے کہ وہ ایسے سودمند اداروں کو مالی دشواریوں سے آزاد کردیں۔

اسی دوران میں جامعۂ عثمانیہ کی بیرونی تقاریر کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ان تقاریر کی سودمندی سے کوئی انکار نہیں ہوسکتا۔ ضرورت ہے کہ ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے۔ آیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ان تقاریر کا کوئی سلسلہ اضلاع میں بھی شروع کیا جائے۔ کم از کم اورنگ آباد، ورنگل، گلبرگہ اور نظام آباد میں اس نوعیت کے تقریروں کی بہت ضرورت ہے تاکہ تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنے معلومات میں اضافہ کا موقع حاصل ہو۔ یہ ایک حقیقت حال ہے کہ اضلاع کے باشندوں کو اس قسم کے مواقع بہت کم میسر ہوتے ہیں اور ملک کی عام علمی سطح کو اونچا کرنے کے لئے اس تجویز پر عمل پیرائی بہت سودمند ثابت ہوگی۔

اس علمی سرگرمی کے دوران میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی ۱۴ ویں اجلاس کی محفل گلبرگہ میں رچی

اور خوب رچی۔ کانفرنس کو اس بات کا امتیاز حاصل ہے کہ ۳۰ برس پہلے اسی کی کوششوں سے ملک میں تعلیمی ترقی کا ولولہ پیدا ہوا۔ شکر ہے کہ اب کانفرنس آہستہ آہستہ اپنا سابقہ وقار حاصل کر رہی ہے لیکن اس کو بھی سرمایہ کی کمی ہمیشہ دامن گیر رہتی ہے ورنہ کام کرنے کیلئے ولولہ اور حوصلہ دونوں موجود ہیں۔ اب یہ اہل حیدرآباد کا کام ہے کہ "اول خویش بعد درویش" کے آزمودہ اصول کے تحت پہلے اپنے گھر کے اداروں کو مالی دشواریوں سے بے نیاز کر دیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کے کارکنوں نے اپنی سعی اور مسلسل کام کرنے کی جو مثال قائم کی ہے اسکے متعلق کچھ لکھنا غیر ضروری ہے۔ اسکے سب کاروبار میں اردو امتحانات کے منصوبہ نے جو کامیابی حاصل کی ہے، وہ مبارک باد کی مستحق ہے۔ اسکے تقسیم اسناد کا جلسہ ہز ہائنس والاشان حضرت ولیعہد بہادر کی ممتاز صدارت میں منعقد ہونا کام کی سودمندی کی ضمانت ہے۔

ان سب اداروں میں کام کرنے والے اصحاب عموماً مشترک ہیں آیا یہ ممکن نہیں ہے کہ باہمی اشتراک عمل، تقسیم کار اور تنظیم کی کوئی ایسی صورت پیدا ہو کہ کم خرچ اور کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام انجام پائے۔

عثمانیہ ٹریننگ کالج کے جلسۂ تقسیم انعامات میں کالج کے صدر نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی کہا کہ

"ہماری بے موقع اور تعلیم کش تعطیلات اور یکسالہ نصاب کے درحقیقت یہ معنی ہیں کہ کم و بیش (۱۵۰) ایام کار یا (۵۰۰، ۷) تعلیمی گھنٹوں میں سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ زمانہ کے حالات اس تیزی سے کروٹ بدل رہے ہیں کہ ہمارے ہاں کی تعطیلات کا مسئلہ دن بدن اہم ہوتا جاتا ہے"۔

اس کے جواب میں عالیجناب صدر اعظم بہادر نے ارشاد فرمایا کہ

"مولوی سجاد مرزا صاحب نے اپنی تقریر میں مسئلہ تعطیلات کا بھی ذکر کیا ہے۔ میں اسے خود محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے ہاں تعطیلات سب جگہ سے زیادہ ہوتی ہیں یہ مسئلہ نہ صرف حکومت سرکار عالی کے زیر غور ہے بلکہ یہاں کی پبلک کی بھی توجہ کا محتاج ہے کہ وہ اس اقتصادی تقابل کے زمانے میں اپنے ملک کے سال میں کتنے روز کام کرنے کیلئے رکھنا چاہتے ہیں"۔

عالیجناب صدر اعظم بہادر نے یہاں کی پبلک کو بھی توجہ دلائی ہے ۔ اسکے سلسلہ میں یہ ظاہر کرنا نامناسب نہیں کہ انجمن طیلسانیین عثمانیہ بھی اس امر سے بالکلیہ متفق ہے کہ ہماری تعطیلات بے موقع اور تعلیم کش ہیں اور اس اقتصادی تقابل کے زمانہ میں تعطیلات کی نظر ثانی ازبس ضروری ہے۔ اس مسئلہ پر کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ نے بھی ایک سے زیادہ وقت حکومت کو توجہ دلائی، یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر کوئی صاحب معلومات تفصیلی بحث علمی انداز میں مرتب کریں، ایسی کوئی تحریر وصول ہو تو مجلّہ کے صفحات حاضر ہیں۔

بعض ضروری اطلاعیں

۱۔ جیسا کہ اخبارات میں بھی اعلان کیا جا چکا ہے مجلّہ کا جو شمارہ اردی بہشت میں شائع ہوگا اس میں حصۂ معاشیات صنعتی نمبر کے طور پر شامل ہوگا ۔ جو اصحاب اس شمارے کے لئے مضامین تحریر فرمائیں وہ جلد سے جلد مجلّہ کے دفتر پر ارسال فرمادیں۔

۲۔ مجلّۂ طیلسانیین کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس میں جامعۂ عثمانیہ کے ام اے اور ام ایس سی کے امتحانات کی غرض سے لکھے ہوئے مقالے طبع ہوں چنانچہ اب تک تین مقالے طبع ہو چکے اور دو مقالے فی الوقت زیر طبع ہیں۔ ایک عام حصہ میں اور ایک حصۂ معاشیات میں ـــ مجلّہ کے نئے انتظامات کے تحت اب توقع ہے کہ مزید مقالے جلد جلد طبع ہوسکینگے ۔ جو صاحب چاہتے ہوں کہ ان کا مقالہ جلد طبع ہوجائے براہ کرم معتمد انجمن طیلسانیین عثمانیہ سے مراسلت فرمائیں۔

۳۔ مجلّہ انجمن طیلسانیین عثمانیہ کے صرف ان ارکان کی خدمت میں بھیجا جاتا ہے جن سے مجلّہ کا چندہ پیشگی وصول ہو جائے ۔ کاغذ اور سامان طباعت کی بے انتہا گرانی کی وجہ سے اس قاعدہ کی پابندی بہت ضروری ہوگئی ہے ۔ اُمید کہ ارکان انجمن مجلّہ کا چندہ جو سالانہ صرف ایک روپیہ ہے جلد ادا فرماکر تعاون فرمائینگے ۔

خریداری کے قواعد ٹائیٹل کے دوسرے صفحہ پر ملاحظہ فرمائے جا سکتے ہیں۔

متقابلہ علم اصول قانون

از جناب مولوی فاضل ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب

ادبیات

(۱) آسٹن JURISPRUDENCE پہلے ۶ لکچر بہ استثنا دوسرے لکچر کے سخت گنجلک کتاب ہے مگر اہم بھی اسی کا ایک اسٹوڈنٹ اڈیشن مولفہ کیمبل بھی ہے۔ دیکھو اشاریہ اور جلد دوم۔

(۲) AUTINIAN THEORY OF LAW BY JETHRO BROWN ضمیمے اور اشاریہ۔

(۳) SALMOND'S JURISPRUDENCE اس کا حصہ دوم پہلے حصہ سے زیادہ مفید ہے۔

(۴) HOLLAND'S JURISPRUDENCE آسٹن کی تقلید تنقیدانہ نظر سے کرتے ہیں مفید کتاب ہے۔

(۵) VINOGRADOPH HISTORICAL JURISPRUDENCE ابواب ۱ تا ۳۔ ۵۔ ۶۔ ۸ تا ۱۰۔ اس کتاب کا دیباچہ علحدہ بھی شائع ہوا ہے اس میں علم اصول قانون پر ایک مفید تبصرہ اور دیگر علوم سے اسکا تعلق بتلایا گیا ہے

(۶) BRYCE'S STUDIES IN HISTORY & JURISPRUDENCE ذیل کے مضامین پڑھیے علم اصول قانون کے مختلف مذاہب۔ اقتدار اعلیٰ۔ قانون قدرت۔

(۷) FREDRICK HARRISON'S JURISPRUDENCE AND CONFLICT OF LAWS.

(۸) POLLOCK S FIRST BOOK OF JURISPRUDENCE۔ نظائر پر اچھا باب ہے۔

(۹) ELEMENTS OF LAW BY MARKOY۔ آسٹن کی کورانہ تقلید ہے مگر طرز بیان آسٹن سے بہت صاف ہے

(۱۰) J.C.GRAY'S NATURE & SOURCES OF LAW مصنف امریکی ہے سطحی کتاب ہے۔

(۱۱) BENTHAM'S PRINCIPLES OF MORAL & LEGISLATION کلارنڈن پریس آکسفورڈ نے ایک چھوٹے پیمانہ پر شائع کیا ہے

(۱۲) BENTHAM'S FRAGMENT'S ON GOVT. قابل دید ہے۔

(۱۳) DICEY'S LAW & OPINION اس میں بنتھم پر جو باب ہے بہت مفید ہے۔

(۱۴) ROSCO POUND'S INTRODUCTION TO THE PHILOSOPHY OF LAW AND INTERPRETATION OF LEGAL HISTORY جدید اور قابل امریکی مصنف ہیں

(۱۵) COMMENSENSE IN LAW BY VINOGRADAPH پڑھنا چاہیئے۔

(۱۶) PROF. ALLEN'S LAW IN THE MAKING ۔ نظائر اور قانون سازی کے باب خصوصاً پڑھنے کے قابل ہیں

(۱۷) SIR H.S. MAINE'S ANCIENT LAW مع پالک کے نوٹس کے۔

(۱۸) SIR H.S. MAINE'S EARLY HIS. OF INSTITUTIONS

(۱۹) WISE & WINFIELD'S JURISPRUDENCE علم اصول قانون پر چھوٹی سی چھوٹی کتاب ہے

(۲۰) مزید مطالعہ کیلئے MODERN LEGAL PHILOSOPHY SERIES ۔ دیکھئے اس میں کرکوناف کی GENERAL THEORY OF LAW BY KURKUNOV اچھی کتاب ہے۔

متقابلہ علم اصول قانون ہمارا موضوع ہے ۔ اس کی تعریف ماہیت ۔طریق کار اور وسعت ذہن نشین کرنے کے پہلے ضروری ہے کہ علم اصول قانون کی ماہیت کو ذہن نشین کیا جائے ونیز علم اصول قانون کے طریق کار بھی سمجھے جائیں ۔ اس لئے ابتدا علم اصول قانون کی ماہیت کے بیان سے کی جاتی ہے اور میں اسکے بعد اسکے طریق کار بیان کرونگا۔ جس کے بعد متقابلہ علم اصول قانون کی ماہیت تعریف۔ وسعت اور طریق کار بیان کئے جائینگے ۔ ان مضامین کے دوسرے حصہ میں ماہیت قانون پر غور کیا جائیگا اور اس حصہ میں قانون کے ۴ مشہور ترین نظریوں سے بحث ہوگی۔ جن میں تحلیلی نظریہ قانون بھی ہوگا۔

۱۔ ماہیت علم اصول قانون ۔ مطالعہ کے لئے دیکھئے (ہالینڈ باب اوّل ۔ سامنڈ دیباچہ گرے ۔ صفحات ۱۳۳ تا ۱۵۱ ۔ طبع دوم ۔ برایس بارہواں مقالہ جنتھر و براون ضمیمہ الف وینوگراڈاف جلد اول صفحہ ۱۰۳ تا صفحہ ۱۶۰ ۔ کرکوناف نظریۂ قانون باب اوّل۔)

جب ہم علم اصول قانون کی ماہیت سمجھنے مختلف اساتذہ کی بلند پایہ تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں تو بعض جگہ ہمیں صرف مبہم الفاظ ملتے ہیں۔ چنانچہ بنتھم کے نزدیک علم اصول قانون ان چیزوں کو جن کو سب جانتے ہیں باقاعدہ طور پر نہ جاننے کے فن کا نام ہے[۱]۔ اس مبہم تعریف میں

---

[۱] THE ART OF BEING METHODICALLY IGNORANT OF WHAT EVERY-BODY KNOWS.

سمجھ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ علم اصول قانون کو سب جانتے ہیں لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ اس کا ضد صحیح ہے ؎

ہرکس نہ شناسندۂ رازاست وگرنہ ٭ ایں ہمہ رازاست کہ مفہوم عوام است

اور "باقاعدہ طور پر نہ جاننے" کے طنز کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے کہ یقیناً بے قاعدہ طور سے جاننے سے باقاعدہ طور پر نہ جاننا بہتر ہے اور یہ بھی ہے کہ ہر علم میں کمال حاصل کرنیکے بعد یہی کہنا پڑتا ہے کہ

تا بہ آنجا رسید دانش من ٭ کہ بدانم ھمیں کہ ندانم

آسٹن کی گنجلک تصنیف میں بھی علم اصول قانون کی ماہیت کا پتہ نہیں چلتا۔ بات یہ ہے کہ آسٹن نے کبھی علم اصول قانون کی ماہیت کی تعریف کرنیکی کوشش ہی نہیں کی۔ اس نے صرف علم کی وسعت کی حد بندی کی اور یہ پہلی دفعہ کی۔

اگر ہم علماء جدید کو چھوڑ کر قدماسے طلب ہدایت کرتے ہیں تو بعض وقت وہاں بھی مبہم الفاظ ہی ملتے ہیں۔ چنانچہ الپین نے علم اصولِ قانون کی تعریف یوں کی ہے — JURISPRUDENTIA EST DIVINARUM ATQUE HUMANARUM RERUM NOTIATA JUSTI ATQUE INJUSTI SEIENTA

یعنے "علم اصولِ قانون الٰہی اور انسانی جائز و ناجائز اشیاء کے جاننے کا نام ہے"۔ ظاہر ہے کہ اس تعریف سے ہمیں اصول قانون کی ماہیت معلوم نہیں ہوتی اور بات ہے یہ کہ رومنوں میں علم اصول قانون بطور ایک علٰحدہ علم کے تھا ہی نہیں۔ چنانچہ آپکو لاطینی زبان میں کوئی کتاب اس موضوع پر ملیگی نہیں

ڈین پاؤنڈ[1] نے علم اصول قانون کی متعدد تعریفیں ایک جگہ جمع کر دی ہیں۔ ان کا اعادہ بے سود ہے ان سب کو غور سے پڑھنے کے بعد ظاہر ہوتا ہے کہ علم اصول قانون کی ماہیت کے متعلق تین تصورات ہیں یعنے علم اصول قانون ایک سائنس ہے۔ (۲) وہ ایک فن ہے (۳) یا وہ ایک فلسفہ ہے۔

علم اصول قانون بطور ایک سائنس کے

۱۸۸۰ء میں پروفیسر ہالینڈ نے علم اصول قانون کی حسب ذیل تعریف کی ہے اور یہی تعریف

ا1 — INTRODUCTION TO PHILOSOPHY OF LAW

انگریزی قانون میں مشہور ترین ہے۔ "THE FORMAL SCIENCE OF POSITIVE LAW"
یعنی "علم اصول قانون۔ قانون صریح کا صوری علم ہے" صوری علم سے ان کی مراد قانون کے قواعد اور دفعات نہیں بلکہ انسانوں کے وہ باہمی تعلقات ہے جو ان قواعد اور دفعات سے منضبط کئے جاتے ہیں۔[1] بالفاظ دیگر علم اصول قانون کا مغز قواعد و دفعات نہیں بلکہ قواعد و دفعات کا مغز ہے۔ اور قانون صریح کو انہوں نے آسٹن کے معنوں میں لیا ہے۔ یعنے واقعی موجودہ انسان ساختہ قانون نہ کہ نظری۔ مجرد یا الہی قانون۔
اس طرح پر ہالینڈ کی تعریف سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم اصول قانون ایک ایسا علم ہے جس کا طریقہ کار استقرائی ہے نہ کہ قیاسی۔ وہ موجودہ انسان ساختہ قوانین کے مغز کو لیتا ہے۔ ان سے اس علم کے اصولوں کو مرتب اور مدون کرتا ہے نہ کہ بطور مفروضہ کے چند اصولوں کو تسلیم کرکے ان سے نتائج نکالتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا علم اصول قانون ایک سائنس (علم) ہے؟

سائنس (علم) سے مطلب ایک نظام معلومات یا منظم معلومات ہوتا ہے اور سائنس دراصل استقرائی ہوتا ہے۔ یعنے وہ خاص سے عام تک پہونچتا ہے۔ معطیات (DATA) سے اصول تک جاتا ہے اور سائنس کے اصول عام اور یکساں ہوتے ہیں۔ مقامی سائنس (LOCAL SCIENCE) بے معنی الفاظ ہیں۔

ہماری دانست میں علم اصول قانون پر سائنس کی تعریف کے یہ تینوں جزو صادق آتے ہیں علم اصول قانون منظم معلومات پر مشمول ہوتا ہے۔ اس کا طریق کار استقرائی ہے اور اس کے اصول عام ہوتے ہیں۔ کسی ایک نظام قانون تک لازماً محدود نہیں۔ اسی لئے ہماری دانست میں علم اصول قانون ایک سائنس ہے لیکن بعض اساتذہ علم اصول قانون کو سائنس مان کر بھی اس کو عام نہیں مانتے ہیں۔ وہ خاص علم اصول قانون (PARTICULAR JURISPRUDENCE) کے حامی ہیں ان کے نزدیک علم اصول قانون عام ہو ہی نہیں سکتا۔ یعنے اس علم کے کوئی اصول ایسے نہیں ہوسکتے جو ہر ملک و قوم اور زمانہ میں صحیح ہوں ان علماء کی تائید تاریخی مذہب (HISTORICAL SCHOOL OF LAW) کے نتائج سے ہوتی ہے۔ اس مذہب کی تعلیم سے ظاہر ہے کہ ہمیں عام اصولوں کے استنباط میں

[1] ۔ دیکھو علم اصول قانون تالیف ہالینڈ طبع سیزدہم صفحہ ۹

سخت احتیاط چاہیئے کیونکہ کوئی اصول ایسا نہیں جو کہ ہر زمان اور ہر مکان میں صحیح اُترے۔ ایک امریکی جج نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ کوئی اصول قانون ایسا نہیں ہے جو آج صحیح مانا جاتا ہو لیکن جو کل غلط نہ ٹھہرے۔ اور مانٹگوے نے کہا ہے کہ ہم اپنے کو مغالطہ دیتے ہیں جب ہم یہ کوشش کرتے ہیں کہ قانون کے عام اصول یا مقادیر مستقلہ (CONSTANTS) وضع کریں۔ الحاصل ایک عام علم اصول قانون (GENERAL JURISPRUDENCE) کے خلاف مذکورہ بالا دلائل ہیں اور خاص علم اصول قانون کے مؤید علما کا ایقان ہے کہ علم اصول قانون کو کسی ایک ملک اور نظام قانون تک محدود ہونا چاہیئے۔ دوسرے نظامات قانون سے کبھی کبھی تمثیلیں لی جاسکتی ہیں۔ لیکن زیادہ تر علم اصول قانون کا حصر کسی ایک ملک اور نظام قانون پر ہوتا ہے۔

سامنڈ بھی خاص علم اصول قانون کے حامی ہیں۔ اور انکی کتاب انگریزی نظام قانون کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اپنی کتاب (کے صفحہ ۲ نوٹ) میں وہ عام علم اصول قانون سے انکار کرتے ہیں۔ اور مثال نظائر (PRECEDENTS) سے دیتے ہیں۔

خاص علم اصول قانون کے اساتذہ کے مذکورہ بالا دلائل کا ایک مختصر سا جواب تو پروفیسر ہالینڈ نے دیا ہے کہ علم اصول قانون اگر علم یعنے سائنس ہے تو اس کو عام ہونا چاہیئے ہر سائنس کے اصول عام ہوتے ہیں۔ تھوڑا سا سوچنے سے ظاہر ہوگا کہ ہالینڈ کی اس حجّت کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا۔ اور ہماری دانست میں اس خیال میں کہ علم اصول قانون کے کوئی اصول ایسے نہیں ہوسکتے جو ہر ایک ملک و قوم اور ہر زمانہ میں صحیح ہوں مبالغہ ہے۔ کیونکہ بعض عام اصول تو قانون کے تصور کے اجزا لاینفک ہیں اور یہی قانون کے "مقادیر مستقلہ" ہیں۔ مثلاً

(۱) قیام امن۔ عدل گستری۔ تعین حقوق۔ (۲) عمل یا برتاؤ کی وہ چند عادتیں جن سے ہر جگہ رواج کا نشو و نما ہوتا ہے۔ (۳) نیز ہر جگہ کوئی ایسی قوت ہونی چاہیئے جو قانون کی پابندی کرائے اور ہر جگہ اشخاص تابع قانون اور اشیا محل قانون کا ہونا بھی ضروری ہے۔ (۴) اشخاص کے درمیان اقرارات (AGREEMENTS) بھی ہونا ضروری ہے۔ اس طرح پر ہر جگہ قانون معاہدہ ہوگا۔ (۵) نیز اشخاص اور

اشیاء کے درمیانی تعلقات بھی ضرور ہی ہونگے۔ اس طرح پر حقوق کا تصور ضروری ہوگا۔ اور حقوق کے تعین کے ساتھ ہی فرائض کا تعین بھی لازمی ہوگا۔ (۶) پھر حقوق کا تنازع بھی واقع ہوگا۔ اسطرح پر عدل گستری کی ضرورت ہوگی اور لازماً حکام عدالت کی۔ (۷) اور اگر قانون کی ضرورت انسانوں کے باہمی تعلقات کو منضبط کرنے کی وجہ سے ہے تو ضروری ہے کہ قانون موثر بھی ہو۔ اسلئے ذمہ داریاں ضروری ہوں۔ اصولہائے ذمہ داری کا تعین لازم آیا۔ اشخاص اور اشیاء کے خلاف تعمیل کی ضرورت محسوس ہوئی اور سزا بھی لازمی ہوئی۔ یہ ہیں قانون کے مقادیر مستقلہ کی مذکورہ بالا چند صورتیں۔ ہم خاص علم اصول قانون کی اہمیت کو گھٹانا نہیں چاہتے کیونکہ اسکا مطالعہ بھی مفید ہے لیکن ہم ضرور کہینگے کہ علم اصول قانون عام ہے۔ کیونکہ اس علم کے اہم اصول عام ہیں جو ہر زمان و مکان کی انسانی معاشرتوں پر اطلاق پاتے ہیں اور یہی عام اصول علم اصول قانون کے موضوع ہیں۔

کیا علم اصول قانون ایک فن ہے بعض اساتذہ مثلاً کرکوناف۔ گرے۔ جنہبرو براون اس کے فن ہونے کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک علم اصول قانون قانونی مواد کو خوش اسلوبی سے ترتیب دینے کا نام ہے۔ اور انکی دانست میں لفظ علم اصول قانون نہ صرف کل قانون کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے بلکہ اس کے کسی جزو کیلئے بھی۔ غرض ان اساتذہ کی رائے میں اس علم میں اصل چیز تصفف (CLASSIFICATION) ہے اور ان کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی خاص علم اصول قانون کے مؤید علما کے طرح زیادہ تر کسی خاص نظام قانون کے قوانین کی ترتیب ہی کو مدنظر رکھتے ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ تصفف ایک مفید چیز ہے۔ ہالسبری نے اپنی ضخیم کتاب "قوانین انگلستان" میں کل قوانین انگلستان کو ترتیب سے جمع کر دیا ہے اور وہ ہر پیشہ ور قانون داں کے لئے لوازمات سے ہے اسی طرح جسٹینین کی مجموعات بھی فائدہ سے خالی نہیں۔ اور اگر انکی ترتیب اچھی ہوتی تو وہ کہیں زیادہ مفید ہوتے۔ لیکن ظاہر ہے کہ محض ترتیب یا اسکیم کو عام اصول قانون نہیں کہہ سکتے۔ ایسا کہنا بعینہ کسی انسان کے گھر کو انسان سمجھنا ہوگا۔ اور یہ تو شئے یا جوہر اور اسکے عوارض میں خلط ملط کرنا ہوگا۔ کیونکہ ساری تفصیلات میں سے اصولوں کا استنباط علم اصول قانون کا کام ہے

اس استنباط اصول میں ترتیب یا تصفّف سے مدد ملتی ہے گویا وہ حصول مقصد کیلئے ذریعہ ہے خود مقصد نہیں ہو سکتا۔

ترتیب یا تصفّف کو علم اصول قانون کہنے والے علما ظاہر ہے کہ خاص علم اصول قانون کے حامی ہونگے اور ہیں۔ کیونکہ ساری دنیا کے قوانین کی ترتیب مواد کی زیادتی کی وجہ سے کوئی ایک شخص اپنے ذمہ مشکل ہی سے لے سکتا ہے۔ اسلئے اس ایقان کے علماء عام علم اصول قانون پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس کا مواد قانونی بے حد و بے اندازہ ہو جائیگا۔ اور اس علم کے علما کو ساری دنیا اور ہر زمان و مکان کے نظامات قانونی کا مطالعہ کرنا ہوگا جو بداھتہً ناممکن ہے۔

ہماری دانست میں یہ اعتراض محض عام علم اصول قانون ہی پر وارد نہیں ہوتا بلکہ تمام علوم پر۔ کسی بھی علم میں تمام معطیات (DATA) کو پیش نظر رکھنا ممکن نہیں۔ ہر علم میں قاعدہ یہ ہے کہ ہم اپنے نتائج پر نئے معطیات کی دریافت پر ان کی روشنی میں نظر ثانی کرتے ہیں۔ مثل اکثر علوم کے عام علم اصول قانون ابھی ایام طفولیت میں ہے۔ دنیا کے موجودہ نظامات قانونی کے متعلق جو کچھ بھی موجودہ معلومات ہیں اِن سے چند عام اصول مستنبط کئے گئے ہیں۔ ابھی دنیا کے نظامات قانونی کے متعلق بہت کچھ پڑھنا باقی ہے۔ اور علما تحصیل علم میں مشغول ہیں۔ خصوصاً جرمن و فرانسیسی علما کی کوششیں بڑے پیمانہ پر ہو رہی ہیں۔ اور متقابلہ نظامات قانون (COMPARATIVE LEGISLATION) کے انسائیکلو پیڈیا بنائے جا رہے ہیں۔ یہ بھی ملحوظ رکھئے کہ اگر محض کل معطیات تک دسترس ہی کو دیکھیں تو خاص علم اصول قانون پر بھی ہم یہی اعتراض کر سکتے ہیں۔ کیونکہ کسی ایک ملک کے نظام قانون کے بھی کل معطیات نہیں ملتے۔ مثلاً انگریزی قانون میں قانون ٹارٹس کے چند نظریات مثلاً غفلت۔ امدادی غفلت۔ سازش وغیرہ کے معطیات اس حد تک نہیں ملتے ہیں کہ انگلستان میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ قانون ٹارٹس ایک عارضی دور سے گذر رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ علم اصول قانون کے چاہے وہ خاص ہو یا عام تمام نتائج تخمینی ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہر علم کے نتائج تخمینی ہوتے ہیں۔

علم اصول قانون بطور فلسفہ کے عام طور پر فلسفہ سے مراد علم یا نظام معلومات ہوتا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں طبیعات کو بھی قدرتی فلسفہ کہتے تھے۔ لیکن آج کل فلسفہ سے کردار انسانی کے حسن و قبح کے

انتہائی اصول مراد ہوتی ہے[۱]۔ اور مابعد الطبیعات (METAPHYSICS) میں صداقت (ULTIMATE REALITY OR TRUTH) کی تلاش ہوتی ہے۔ اور یاد رکھئے کہ فلسفہ کا طریقہ کار اصلاً استخراجی یا قیاسی اور (APRIORI) حضوری ہے۔ تجربہ سے اس کو کم تعلق ہے خالص تخیلات کی فضا میں اس کی زندگی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم یہ طریقہ کار علم اصول قانون میں استعمال کرسکتے ہیں؟ براعظم یورپ کے اکثر ممالک میں یہ استعمال کیا جاتا ہے۔ لاریمر[۲] (LORIMER) نے اسکاٹ لینڈ میں بھی اسکو رواج دیا ہے۔ اسکی کتاب کانٹ کے فلسفہ سے بھری نظر آتی ہے۔ اسمیں اور آسٹن کی کتاب میں اضداد کا سا فرق ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جسکو فلسفیانہ علم اصول قانون (PHILOSOPHICAL JURISPRUDENCE) کہا جاتا ہے وہ علم اصول قانون کا فلسفہ ہے اور علم اصول قانون نہیں۔ یعنے وہ علم اصول قانون کی محض ایک شاخ ہے اس طرح جسطرح فلسفہ تاریخ تاریخ کی ایک شاخ ہے۔ بس علم اصول قانون فلسفہ نہیں ہے۔ کیونکہ علم اصول قانون کا کام تجربہ سے قانون کی بنیادی اور اصلی اصولوں کو مستنبط کرنا ہے۔ اور فلسفہ علم اصول قانون کے نتائج کو بھی لے کر صداقت کے انتہائی اصولوں کے ساتھ ان کی امیزش کرتا ہے۔ مثلاً کانٹ اور ھیگل نے اس کام کو اچھی طرح انجام دیا ہے۔ غرض یہ کہ فلسفہ اور علم اصول قانون میں فرق مقصد اور طریق کار ہے کیونکہ برخلاف فلسفہ کے علم اصول قانون سائنٹفک ہے اور اس کا طریقہ کار استقرائی ہے۔ اسلئے کہا گیا ہے کہ "قانون کی زندگی منطق نہیں بلکہ تجربہ ہے[۳]۔" علم اصول قانون کیلئے استنباط مسائل شرط لازمی ہے۔

الحاصل علم اصول قانون کی صحیح تعریف ہم یوں کرسکتے ہیں کہ علم اصول قانون۔ قانون کے بنیادی اصولوں کا علم ہے (THE SCIENCE OF THE FUNDAMENTAL PRINCIPLES OF LAW)

ف[۱] - PRINCIPLES OF ULTIMATE RIGHT OR WRONG IN HUMAN CONDUCT.
ف[۲] - LAWRENCE'S INSTITUTES P. 353.
ف[۳] - LIFE OF ALL LAW IS NOT LOGIC BUT EXPERIENCE.

سائنس کیونکہ وہ فلسفہ نہیں ہے اور صوری علم کہنے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ صرف سائنس بھی وہی مطلب نکلتا ہے۔ اس طرح صرف قانون بجائے قانون صریح (POSITIVE LAW) کے کافی ہے کیونکہ آج کل عام طور پر قانون سے مراد انسانی ساختہ قانون ہی ہوتا ہے۔ اور قانون بصیغہ واحد اور قوانین بصیغہ جمع نہیں۔ کیونکہ ہماری دانست میں علم اصول قانون کا موضوع کسی خاص ملک کا قانون نہیں بلکہ اسکا موضوع قانون بحیثیت ایک انسانی ادارہ کے ہے۔ گو تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ مختلف نظامات قانون میں بہت کچھ فرق ہے۔ لیکن ہماری رائے میں یہ فرق ایسے نہیں ہیں کہ ان سے قانون کے وہ اہم اصول یا عناصر جو تمام نظام قانون میں مشترک ہوتے ہیں۔ اور جن میں سے بعض کو ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے پوشیدہ ہو جائیں۔ اور بنیادی اصولوں کو ہم نے اضافی طور پر استعمال کیا ہے یعنے ہمارا مطلب یہ ہے کہ وہ اصول جو موجودہ معلومات میں بنیادی اصول ہیں۔ کیونکہ اس علم کے بھی مثل تمام دوسرے علوم کے نتائج تخمینی ہیں۔

علم اصول قانون کے طریق کار

تمام عمرانی علوم کی خصوصیت انکا اپنا طریق کار (METHOD) ہوتا ہے۔ ہمیں بھی سوچنا چاہیئے کہ علم اصول قانون کا کیا طریق کار ہے۔ اگر اسکے ایک سے زیادہ طریقہ کار ہیں تو انمیں سے کونسا صحیح ہے۔ چونکہ قانون پر ہمیشہ عمل ہوتا رہتا ہے اسکے علم کے طریق کار کی صحت کا معیار ایک ایسے نظام قانون کا پیدا کرنا ہوگا جو باہم متوافق متوازن اور عوام کی ضرورتوں کے موافق ہو۔ بالفاظ دیگر ہم دیکھ چکے ہیں کہ علم اصول قانون کا کام تجربہ سے قانون کے بنیادی اصولوں کو مستنبط کرنا ہوتا ہے اس استنباط مسائل کیلئے چار طریقے عام طور پر استعمال کئے گئے ہیں۔

۱۔ مابعد الطبیعاتی یا حضوری طریقہ (۲) تحلیلی طریقہ (۳) تاریخی طریقہ (۴) تقابلہ طریقہ

۱۔ مابعد الطبیعاتی یا حضوری طریقہ یہ اکثر جرمن، فرنچ اور ایطالوی مصنفوں کا طریقہ ہے اسکا قدم اول قانون اور حق کے مجرد تصورات کی تحقیق اور انکا قانون قدرت اخلاقیات آزادی اور ارادۂ انسانی سے تعلق کی تشریح ہوتا ہے۔ اس طرح پر اس میں پہلے مابعد الطبعیاتی نفسیاتی اور

اخلاقیاتی بحثیں آتی ہیں۔ بعد ازآں اسمیں چند بنیادی قانونی تصورات مثلاً اقتدار اعلیٰ۔ اطاعت ذمہ داری فرض اور حق سے بحث ہوتی ہے۔ خصوصاً حق کے تصور کی۔ اس طریقہ کار میں خوب تدقیق ہوتی ہے۔ پھر چند عالمی قانونی اداروں مثلاً خاندان۔ جائداد۔ وراثت۔ ازدواج اور معاہدے سے بحث کیجاتی ہے اور پھر انکے متعلق وہ اصول بنائے جاتے ہیں جو فطرتاً ان اداروں کی صحت مزاجی کے لئے مناسب ہوں۔

اس طریقہ کار کے بعض مصنفین تو محض مجردات ہی میں رہتے ہیں اور انکی تصانیف انکی بنیادی مفروضہ تصورات پر کلیتہً مبنی اور انہیں سے مستخرج ہوتے ہیں اور باقی مجردات کو چھوڑ کر بہت جلد واقعی قانون تک اتر آتے ہیں اور اسکے اصولوں سے بحث کرنے لگتے ہیں۔ جب اس طریقہ کار کے پابند کانٹ اور ہیگل جیسی قابل شخصیتیں ہوں تو ان کی تصانیف کو گھٹانا بے ادبی ہوگی۔ لیکن بلا شبہ ان کی کتابیں بہت ادق ہیں۔ ان کے مطالعہ سے بہت کم قانونی نقطۂ نظر سے مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں اور یہ تعداد میں اتنی زاید ہیں کہ انسان کی کم عمری بھی انکے پڑھنے میں حائل ہے۔ الحاصل یہ قانون اور قانونی اصولوں سے دور محض مجردات کے کھیتوں میں بڑی تعداد میں بڑے تناور پودے ہیں لیکن انکے پھل بہت کم ہیں۔ اور نیز ان کا طریقۂ کار بھی سائنٹفک نہیں کیونکہ سائنٹفک طریقہ تو استقرائی یا حصولی ہے۔ جو قانونی حقیقتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اصولوں کا استنباط کرتا ہے اور انکا طریقہ استخراجی۔ قیاسی یا حضوری ہے جو مجردات سے نکل کر مجردات ہی میں گم ہوجاتا ہے۔ یا اگر قانونی حقیقتوں تک آتا بھی ہے تو ناکافی حد تک۔ ان تمام عیوب کے گنوانے کے بعد انکے ایک ہنر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اور وہ انکی قوت یا نعمت تفکر ہے۔ اگر کوئی ایسا استاد پیدا ہوجائے جسمیں ان اساتذہ کی قوت تفکر ہو اور وہ مجردات کو سلام کرکے قانونی حقیقتوں پر حاوی ہوکر اپنی خداداد قوت تفکر سے کام لے تو پھر علم اصول قانون میں ایک اہم اضافہ ہوگا۔

۲۔ تحلیلی طریقہ یہ طریقہ انگریزی طریقہ اور مابعدالطبیعاتی طریقہ کا بالکل ضد ہے اسکے اساتذہ مابعدالطبیعات اور اخلاقیات کو دور ہی سے سلام کرکے واقعی حقیقی اور موجودہ انسانی ساختہ قانون سے ابتدا کرتے ہیں اور جیسا کہ اس طریقہ کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسکے اساتذ قانونی الفاظ یا حدود (TERMS) کو لیتے ہیں

ان کی تعریف کرکے ان کے صحیح معنے مشخص کرتے ہیں اور ان کے باہمی تعلقات بتاتے ہیں۔ خصوصاً حسب قانون کی تعریف جو ان اساتذہ نے کی ہے سب میں مشہور اور معرکتہ الآراء ہے۔ جب اسطرح پر قانونی تصورات کے صحیح معنے ذہن نشین ہو جاتے ہیں تو پھر قانون کے عام اصول استقرائی طریقہ پر مستنبط کرتے ہیں اور قانون کے کل اصولوں کو ایک نظام میں مرتب کرتے ہیں۔ اس طریقۂ کار کے سب سے بڑے استاد جرمی بنتھم گذرے ہیں۔ انہوں نے انگریزی قانون کی بڑی خدمت کی اسکے لغویات خرافات اور تصنعات کو بیرحمانہ تنقید کے ذریعہ ظاہر کیا اور نہایت صراحت کے ساتھ اس قانون کو موجودہ ضرورتوں کیلئے ناکافی ہونے کو ثابت کیا۔ انکی عمر اصلاح کے مدنظر بیرحمانہ نکتہ چینی میں گزری۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ صدیوں کا جمود ٹوٹ گیا۔ انگریزی قانون اب بے مثال نہیں سمجھا جانے لگا۔ بلاکسٹس کے شروحات جس کی انہوں نے اچھی طرح خبرلی اب انگریزی قانون کی صحیح تصویر نہیں سمجھی جانے لگیں اور قانونی نظریوں پر بحث کا میلان عام ہوگیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انکی وفات کے تیس سال کے اندر انگریزی قانون میں بہت سی اصلاحیں ہوکر اسکی موجودہ شکل کی ابتداء ہوئی۔ بنتھم کی وفات کے بعد انکے سب سے مشہور شاگرد جان آسٹن نے اسی طریقۂ کار پر عمل کیا اور انگریزی قانونی الفاظ کے معنے مشخص کرنے میں بڑی دقت اٹھائی لیکن شاید انگریزی قانون کے اسوقت بہت کچھ اصلاح طلب ہونے کی وجہ سے بھی ان اساتذہ نے ایک طرف تو ماضی اور تاریخ سے سخت بے اعتنائی کی۔ اور ظاہر ہے کہ علم اصول قانون کے بنیادی اصول بغیر تاریخی مدد کے سمجھنا دشوار ہے لیکن بنتھم نے اپنی ساری عمر نادانستہ یہ غلطی کی اور دوسری طرف دیگر نظامات قانونی سے کوئی قابل لحاظ مدد نہیں لی۔ یہ سچ ہے کہ جان آسٹن نے بہت کچھ قانونِ روما کو پیش نظر رکھا ہے جہاں جہاں انکی دانست میں انگریزی قانون میں کمی پائی گئی اسکو قانون روما سے پورا کرنیکی کوشش کی ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ قانون روما پر اچھی طرح حاوی نہیں تھے اور انہوں نے اسکے متعلق سخت غلطیاں کی ہیں[۵] اسی لئے اور بعض قانونی نظریوں کی دشواریوں تک انکی نظر نہ پہونچنے کی وجہ سے ان کے بہت سے نتائج غلط ہیں۔

---

[۵] مثال کے لئے ملاحظہ ہو آلن کی کتاب "لا ان دی میکنگ" دیباچہ۔

۳۔ تاریخی طریقہ اس طریقہ میں برخلاف مذکورہ بالا دو طریقوں کے قانون کو بطور ایک معطیہ (DATA) کے نہیں تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ بلکہ اسکے نشو و نما پر غور کیا جاتا ہے کہ اسکی ابتدا کیسے ہوئی اور موجودہ حالت تک وہ کسطرح پہونچا۔ اس طریقہ میں قانون وقت کی ایک پیداوار ہے۔ قانون بھی مثل مملکت کے انسانی فطرت کے اس اقتضار کا نتیجہ ہے کہ انسان مل جل کر ایک معاشرہ (SOCIETY) بنا کر رہتے ہیں اور گو اسکے اہم اور بنیادی اصول اور ادارے سارے متمدنہ ممالک میں ایک ہی ہوں لیکن ہر نظام قانون ہر وقت متغیر ہے۔ تصورات میں بھی اور نیز اشکال کی حد تک بھی۔

اس طریقہ کے فائدے دو ہیں۔ اس سے بہت سے قانونی تصورات، نظریوں اور قواعد کی تشریح ہوتی ہے۔ ایسی تشریح محض تحلیل یا مجرد نظریوں سے نہیں ہوتی کیونکہ یہ تصورات وغیرہ محض عقل انسانی یا فطرت اشیا ہی کے پیدا کردہ نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان پر اُس ماحول کا بھی اثر ہوتا ہے جہاں ان قوانین کی نشو و نما ہوتی ہے۔ ہر قانون ماضی اور حال روایت اور سہولت کے درمیان ایک مصالحت ہوتی ہے[1]۔ اور محض تحلیل میں چونکہ صرف حال سے بحث ہوتی ہے کسی بھی نظام قانون کی پوری تشریح نہیں ہوتی دوسری خوبی اس طریقہ کی اس واقعہ کو ظاہر اور ثابت کرنا ہے کہ قواعد اور قوانین چاہے آج ہمیں کتنے ہی مفید اور معقول نظر آئیں اگلی نسلوں کو اتنے ہی مفید اور معقول نظر نہیں آئینگے۔ اسی لئے ماضی کو بُرا نہیں کہنا چاہیئے کیونکہ حال بھی ماضی ہونے والا ہے۔ اس واقعہ کو جو اگرچہ قانون کے عام اصولوں سے نہیں بلکہ تفصیلات سے متعلق ہے۔ قانون سازوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس طریقہ میں خطرہ یہ ہے کہ بہت آسانی سے وہ ایکطرف قدامت پرستی (ANTIQUARIANISM) میں اور دوسری طرف عام سیاسی اور معاشرتی تاریخ میں متبدل ہو جا سکتا ہے۔ بعض نقاد اس پر الزام دیتے ہیں کہ یہ ماضی کی پرستش اور اس کو جایز سمجھنے سے اصلاح اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ یہ طریقہ کسی ایک خاص نظام قانون پر بہ نسبت تمام نظام ہائے قانون کے زیادہ قابل اطلاق ہے۔ کیونکہ مختلف ممالک کی قانونی تاریخ کی

---

[1] EVERY LAW IS A COMPROMISE BETWEEN THE PAST AND PRESENT, BETWEEN TRADITION AND CONVINIENCE.

تفصیلیں اتنی بیشمار ہیں کہ ان تمام کے نتائج کسی جامع قانونی نظام میں شامل کرنے کیلئے غیر معمولی معلومات اور قوت تعبیر کی ضرورت ہے۔ اور شاید بہ استثنار روڈالف فان اھیرنگ کے کوئی دوسرا شخص اس طریقہ پر عمل کرکے علم اصول قانون کی کوئی کتاب نہیں لکھ سکا ہے۔

۴۔ متقابلہ طریقہ | یہ طریقہ جدید ترین ہے۔ اسکو مکان سے وہی تعلق ہے جو تاریخی طریقہ کو زمان سے ہے اس میں قانونی تصورات، نظریات، اور اداروں کی جو مختلف ممالک اور نظام ہائے قانون میں پائے جاتے ہیں، متقابلہ تحصیل اور تحقیق کی جاتی ہے اور اس طرح سے اس طریقہ کار کا مقصد ایک ایسے نظام کی تعبیر ہوتا ہے جو فطری ہو۔ کیونکہ مختلف ممالک کے انسانوں میں مشترک ہوتا ہے۔ سائنٹیفک یا علمی ہو کیونکہ مختلف نظام ہائے قوانین کا مغز لیا جاتا ہے۔ اور کارآمد ہو۔ کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کن ذرائع سے ایک ہی مقصد مختلف نظام ہائے قوانین میں حاصل کیا گیا ہے اور ان میں سے کونسا طریقہ بہترین ہے۔

متقابلہ علم اصول قانون کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جسمیں تاریخ کی مدد لی جاتی ہے۔ کیونکہ کسی دو مختلف نظام قانون کے درمیانی اختلافات کا مطالعہ کہیں زیادہ مفید ہوجاتا ہے۔ اگر تاریخ سے مدد لیکر دیکھا جائے کہ ان اختلافات کی ابتدا کیسے ہوئی۔ اسطرح پر متقابلہ علم اصول قانون کی اس قسم میں معاشرتی اور سیاسی تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری ہوجاتا ہے اور اسی لئے اس قسم کو تاریخی طریقہ کی ایک توسیع شدہ شکل سمجھا جاتا ہے۔ دوسری قسم میں گو مختلف نظام ہائے قانون کے درمیانی اختلافات سمجھنے کیلئے تاریخ سے بھی مدد لیجاتی ہے لیکن چونکہ توجہ زیادہ تر حال کے قانونی مسائل پر ہوتی ہے۔ اسلئے دور تک تاریخی میدان میں مسافت طے نہیں کی جاتی ہے۔ اس طریقہ کی اس قسم میں ابتدا مختلف ممالک کے موجودہ قوانین سے کی جاتی ہے اور پھر دیکھا جاتا ہے کہ ایک ہی قسم کے مسائل کو ان مختلف قوانین میں کسطرح حل کرنیکی کوشش کیگئی ہے مثلاً آج کل قانون ٹارٹس میں ایک مشکل اور متنازع فیہ مسئلہ مالک کی نوکر کے افعال کیلئے ذمہ داری کا ہے اسکے متعلق اس طریقہ میں مختلف ممالک مثلاً فرانس جرمنی انگلستان ممالک متحدہ امریکہ اور برطانوی نو آبادیوں کے قوانین کا مطالعہ کیا جاتا ہے پھر یہ طے کرنے کی

کوشش کی جاتی ہے کہ اس مسئلہ کی مشکلات کو حل کرنے کا کونسا طریقہ آسان ترین اور عملاً بہترین ہے۔

متقابلہ علم اصول قانون کی طرف آج کل رجحان ہے۔ دس سال پہلے کیمبرج کے پروفیسر ونفیلڈ نے ایک بسیط خطبہ اسکی ضرورت اور فائدوں پر دیکر اسکی تحصیل کی ترغیب دی ہے۔ اور افسوس ظاہر کیا ہے کہ مین کے بعد سے کسی نے قابلِ لحاظ طور پر اس پر توجہ نہیں کی ہے۔ اصولاً اس علم اصول قانون کے اس طریقہ پر اعتراض کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ سوائے اسکے کہ باوجود اصولاً اسکے ٹھیک ہونے کے اس پر کام اتنا کم ہوا ہے کہ ہم کہہ نہیں سکتے کہ عمل میں اسکی کیا حالت رہیگی۔ مین نے بے شک قابلِ قدر کام کیا ہے۔ لیکن ہم ادب سے کہنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے تاریخ پر اتنی زیادہ توجہ کی ہے کہ انکے کام کو تاریخی مطالعہ کہہ سکتے ہیں اور اسی لئے علم اصول قانون کے عملی ضرورتوں کیلئے کم مفید ہے۔

آخر میں یہ سوال کرنے سے پہلے کہ آخر اصولاً ہمیں تحصیل علم اصول قانون کے لئے ان چار طریقوں میں سے کس طریقہ کو اختیار کرنا چاہیئے ہمیں یہ بھی پوچھنا چاہیئے کہ آخر علم اصول قانون کس کے لئے مفید ہوگا اور کس کے لئے اسکو مدون کرنا چاہیئے۔

اس علم سے فائدہ یا تو قانون سازوں کو ہو سکتا ہے یا وکلاء اور ججوں کو یا طلباء کو۔ دُنیا کے متمدن ممالک کی مجالس مقننہ میں آجکل بہت کم قانون داں اشخاص ہوتے ہیں۔ اسلئے زیادہ تر ہمارا روئے سخن وکلاء، ججوں اور طلبا کی طرف ہونا چاہیئے۔ قانون کے اصولوں پر مکمل طور پر حاوی ہونے ان کو صحت، روشن دماغی، ہوشیاری، ذہانت اور سرعت سے استعمال کرنے میں علم اصول قانون کہاں تک مفید ہو سکتا ہے؟

اس مطلب کیلئے تو چاروں طریق کار مفید ہیں۔ لیکن بلحاظ ثمرات شاید تاریخی طریقہ سب سے بہتر ہے کیونکہ مابعد الطبیعاتی طریقہ کے متعلق ہم کہہ چکے ہیں کہ اسکی خوبی قوت تفکر میں ہے۔ لیکن اس کا نقص یہ ہے کہ اس کی کتابیں بہت ادق ہیں اور وہ مجردات ہی میں بہت زیادہ گم ہے۔ تحلیلی طریقہ سے ہمارے خیالات اور قانونی تصورات متعین اور مشخص ہوتے ہیں لیکن تاریخ سے بے اعتنائی کی وجہ سے اس میں وسعت نظر نہیں

استقراء کے لئے بہت سے مواد سے فائدہ نہیں اوٹھایا جاتا۔ اسی لئے اسکے بعض اساتذہ نے بعض نتائج غلط اخذ کیے ہیں۔ متقابلہ طریقہ اصولاً ٹھیک ہے۔ لیکن ابھی اسکو عمل کی کسوٹی پر اترنا ہے۔ تاریخی طریقہ سے قانونی تصورات اچھی طرح سمجھ میں آتے ہیں۔ استقراء کیلئے اگر تھوڑی احتیاط کیجائے تو حسب ضرورت مواد مل جاتا ہے اور نتائج غلط ہونے کا احتمال نہیں رہتا ہے۔

لہٰذا اب اگر ہم سے سوال کیا جائے کہ قانون کی تعلیم اور قانونی ذہنیت کے پیدا کرنے کیلئے ان چار طریقوں کو کسطرح استعمال کرنا چاہیئے۔ تو کیا اس کا جواب حسب ذیل نہیں کہ ہمیں ابتداء اس تحقیق سے کرنی چاہیئے کہ قانون کی عمرانی علوم میں جگہ کہاں ہے؟ بالفاظ دیگر ہمیں قانون کا تعلق اخلاقیات، نفسیات، سیاسیات اور معاشیات سے دریافت کرنا چاہیئے۔ چونکہ یہ تحقیق فطرت انسان اور اسکے عام تصورات پر مبنی ہوگی۔ اسی لئے مابعدالطبیعاتی طریقہ کے تحت رہیگی۔ اسکے بعد ان تصورات کی تحقیق چاہیئے جو تمام نظام ہائے قانون میں بنیادی ہیں یعنے قانون، رواج، حق، فرض وجوب اور ذمہ داری۔ بعض اساتذہ ان تصورات کو مابعدالطبیعاتی یا حضوری طریقہ پر فطرت انسان سے مستخرج کرنا پسند کرینگے۔ اور بعض ان تصورات کے موجودہ اور مروج معنوں سے ابتداء کرکے تحلیل کے ذریعہ انکے معنوں کو معین اور مشخص کردینا۔ ان تصورات کی تحقیق میں چاہے ان دونوں میں سے کوئی بھی طریقہ استعمال کیا جائے۔ دراصل ان دونوں میں حقیقی فرق کم ہے۔ کیونکہ اگر ایک فطرت انسان کے حضوری تصور سے ابتدا کرتا ہے تو دوسرا اسکے مظاہر سے لیکن دونوں طریقوں میں تاریخی طریقہ کار کی مدد ضروری ہوگی۔ کیونکہ ہمارا مقصد قانون کے عام اصولوں کا مدون کرنا ہے۔ ان کی تدوین میں تاریخ سے بے اعتنائی نہیں برتی جاسکتی اور اسکی مدد ضروری ہوتی ہے۔ تاکہ ہم ان اصولوں کے ضروری اور مستقل عناصر میں سے کسی کو فروگزاشت نہ کریں۔ اور ہماری تعریفیں ان عام اصولوں کے ضروری اور مستقل عناصر پر مشتمل ہوں۔ مثلاً کچھ عرصہ قبل قانون کی جو مشہور ترین تعریف تھی اسی کو لیجیئے۔ اس کی رو سے قانون حکم مملکت (COMMAND OF THE STATE) ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ مین نے ثابت کردکھایا ہے یہ تعریف ہر سوسائٹی یا مملکت پر صحیح نہیں اترتی۔ پس اس واقعہ سے کہ وہ سیاسی ترقی کے

بعض مدارج پر اطلاق نہیں پاسکتی۔ ظاہر ہے کہ وہ کافی عام اساس پر مبنی نہیں ہے۔ ان عام تصورات کی تحقیق کے بعد ہم ایک دوسرے مجموعۂ تصورات کی طرف جو خالص قانونی ہیں ترقی کرینگے۔ مثلاً ذیل کے تصورات کی طرف یعنے ملکیت، قبضہ، معاہدہ۔ ٹارٹس ازدواج۔ ولایت وغلامی۔ انتقال جائداد۔ رہن۔ حقوق آسایش۔ بیع۔ شراکت۔ تحویل امانتی۔ جرم۔ فریب اور غفلت کی طرف۔ اسوقت ہم موجودہ نظام ہائے قوانین کے قواعد سے اور زیادہ قریب ہوجائینگے۔ گو ایک جرمن مابعد الطبیعاتی ان تصورات کو مثلاً ملکیت اور معاہدہ کے تصور کو ان عام حضوری اصولوں سے مستنبط کریگا جنکو وہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں اصول موضوعہ کے طور پر قرار دیگا۔ اور ایک سقراطی یا منتھمی تحلیلی طریقہ کا استاد ان تصورات کے معنوں کی تحلیل اور تجزیہ سے ان تعریفات کو وضع کریگا۔ لیکن ضروری ہے کہ ان تصورات کی تحقیق اور ان کی تعریف ان معنی کے مطالعہ پر مبنی ہوں جو ایک یا زاید نظام قانون میں ان تصورات کے ہیں۔ یہاں تاریخی طریقہ سے پھر بڑی مدد ملیگی کیونکہ کسی بھی نظام قانون کے وہ قواعد جو انسانوں کے اُن تعلقات کو منضبط کرتے ہیں جو انکے معنی سے نکلتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ حدتک بے ضابطہ اور ایک نہ ایک حدتک ایسی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں جو محض عقل کے پیدا کردہ یا محض عقل پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ تاریخی اسباب اور ماحول کے اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مثلاً قبضہ وراثت اور رہن کے قواعد میں بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جنکی توضیح محض تاریخی مطالعہ ہی سے ہوسکتی ہے۔ ہم عام اصول بتاتے وقت ایسی خصوصیات کو نظر انداز کردینگے۔ لیکن ہم کو یہ جاننا ضروری ہے کہ انکی ابتدا کیونکر ہوئی ہو۔

اسطرح پر ایک عام علم اصول قانون کی تدوین میں گو قانونی تاریخ کا درجہ ثانوی ہے لیکن بہت ضروری بھی ہے۔ کیونکہ تاریخی مطالعہ ہی سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اشیا یا تصورات جنکے نام مختلف ہوں دراصل حقیقت میں ایک ہی ہیں اور اشیاء یا تصورات جنکے نام ایک ہی ہیں دراصل حقیقت میں جدا ہیں۔ اسطرح پر علم اصول قانون کے استاد کو تاریخ سے قانونی تصورات کی وہ کامل توضیح وتشریح ملتی ہے جو بغیر اسکے ممکن نہیں۔ متقابلہ طریقہ سے بھی اسے اسی قسم کی مدد ملتی ہے کہ

بہت زیادہ زور کسی نظریہ یا ادائے کی اس خاص شکل پر جو کسی ایک نظام قانون میں اختیار کیا گیا ہے نہیں دینا چاہیئے۔ بلکہ مغز کو دیکھنا اور مختلف پردوں میں جو ایک ہی تصور کار فرما ہے اسکو گرفت کرنا چاہیئے۔

مذکورہ بالا تمام تصورات علم اصول قانون کے موضوع ہیں کیونکہ یہ ہر ترقی یافتہ نظام قانون میں پائے جاتے ہیں اور قانون کے مقادیر مستقلہ ہیں۔ لیکن اگر ہم آگے اور تفصیلات میں جائیں تو عام اصولوں کو جو ہر قوم و ملک میں اطلاق پا سکیں مستنبط کرنا مشکل ہوتا جاتا ہے۔ کیونکہ تفصیلات میں ہر قوم کے خاص طریقوں اور روایات کو بہت دخل ہوتا ہے اور یہاں جو طریقہ یا رواج ایک قوم کیلئے مناسب ہوتا ہے دوسرے کیلئے مناسب نہیں ہوتا۔ یہاں علم اصول قانون طالب علم کو الوداع کہیگا اور اسکو ان اساتذہ کے سپرد کردیگا جو مثلاً انگلستان۔ اسکاٹ لینڈ۔ فرانس یا روس کا قانون پڑھاتے ہیں اور رخصتانہ نصیحت یہ کریگا کہ ان قوانین کی تفصیلات میں اور ان پر تنقید کرتے وقت اُن عام اصولوں کو اطلاق دے جو علم اصول قانون میں اس نے سیکھے ہیں۔

اسطرح علم اصول قانون کے اصول موضوعہ بہت زیادہ نہیں ہیں اور ایک مختصر سے پیمانہ میں بیان کردیئے جاسکتے ہیں۔ سوائے اسکے کہ اساتذہ ایک طرف اخلاقیات میں اور دوسری طرف تاریخی مواد میں بہت زیادہ دور تک جائیں اور اس علم کے مطالعہ کا فائدہ ان معلومات کے بہم پہونچانے پر جو اس علم کے مطالعہ سے حاصل ہوتے ہیں موقوف نہیں ہے۔ بلکہ اس تربیت دینے پر کہ تفصیلات پر ہمیشہ صحیح اصولوں کو اطلاق دیا جاسکے اسی لئے ہر طالبعلم کو تفصیلات میں پڑنے سے پہلے اصولوں پر حاوی ہونے اور انکو صحت روشن دماغی۔ ذہانت اور سرعت سے اطلاق دینے میں ملکہ حاصل کرنا چاہیئے اور نہ اسکو اور نہ جج اور وکلا کو کبھی یہ فراموش کرنا چاہیئے کہ قانون کی ترقی میں وہ قابل قدر مدد دیکتے ہیں پس اسطرح پر اگر مذکورہ بالا امور کو ملحوظ رکھے تو عام علم اصول قانون کے اصولوں کی تدوین سے ہم ایک ایسا نظام قانون پیدا کرسکتے ہیں جو باہم متوافق متوازن اور عوام کی ضرورتوں کے موافق ہوگا۔

اوپر اوپر کی ساری بحث کا خلاصہ یہ ہوگا کہ علم اصول قانون ایک علم ہے اور وہ عام ہے

اسکی تحصیل کیلئے چار طریقے رائج ہیں ۔ چاروں مفید ہیں لیکن ہر ایک کی خوبیوں کو لیکر علم اصول قانون کے وہ اصول مرتب ہوسکتے ہیں جنکے مطالعہ سے قانونی ذہنیت پیدا ہوتی ہے ۔ اور جن سے نظام قانون متوافق ، متوازن اور عوام کی ضرورتوں کے موافق ہوتا ہے ۔ ان نوٹس کی ترتیب میں ان چاروں طریقوں سے بمصداق خذ ما صفا ودع ما کدر مدد لی جائیگی ۔ لیکن زیادہ زور متقابلہ علم اصول کے طریقہ پر حتی الامکان دیا جائیگا

علم اصول قانون کی ماہیت اور اس کے طریق کار کو اختصار سے بیان کیا جا چکا ہے ۔ جس میں متقابلہ علم اصول قانون کا ذکر بھی ضمنی طور پر آ چکا ہے ۔ اب کسی قدر تفصیل سے اسکی ماہیت تعریف اور وسعت پر غور کر لینا مناسب ہے ۔

ماہیت ظاہر ہے کہ متقابلہ علم اصول قانون بھی علم ہے ۔ کیونکہ اس کے اصول بھی عام ہیں ۔ یعنے اس میں بھی قانون کے انہیں عام اصولوں یا مقادیر مستقلہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے ۔ جو ہر زمان و مکان اور ہر قوم میں پائے جاتے ہیں ۔ عام طور پر اس کے تین مفہوم لئے جاتے ہیں ۔

(۱) ایک تو یہ مفہوم کہ متقابلہ علم اصول قانون مختلف اقوام کے مشترک قانون کو کہتے ہیں ۔ یعنے ایسے اصول ہائے قانون کو جو مختلف اقوام میں پائے جاتے ہیں ۔ اور اسی وجہ سے مستقل وقعت کے حامل ہوتے ہیں ۔ گویا متقابلہ علم اصول قانون قانون اجانب (JUS GENTIUM) کو کہتے ہیں ۔ لیکن یہ خلاف قانون اجانب کے رومنی تصور کے یہ نہ تو ناقابل تبدیل تصور کیا جاتا ہے اور نہ عالمی ۔ یعنے متقابلہ علم اصول قانون کے اصول مختلف اقوام کے قانون کی نشو نما کے ساتھ ساتھ نشو نما پا سکتے ہیں ۔ اور ان کا عالمی ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ عام ہونا کافی ہے ۔

(۲) متقابلہ علم اصول قانون کا دوسرا مفہوم وہی ہے جو عام علم اصول قانون کا ہے ۔ آسٹن نے خود علم اصول قانون کو عام یا متقابلہ علم اصول قانون کے مفہوم میں استعمال کیا ہے ۔ اور عام علم اصول قانون کو (GENERAL OR COMPARATIVE JURISPRUDENCE) یعنے عام یا متقابلہ علم اصول قانون کہا ہے ۔ یعنے اس مفہوم میں متقابلہ علم اصول قانون کی وہی تعریف ہوگی جو

عام علم اصول قانون کی ہے۔ کہ وہ قانون کے قواعد و دفعات کا علم نہیں ہے۔ بلکہ اُن انسانی تعلقات کا صوری علم ہے۔ جو ان قواعد و دفعات سے منضبط ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر قانون کے بنیادی اصولوں کا وہ علم ہے۔

(۳) تیسرے مفہوم میں متقابلہ علم اصول قانون کسی خاص قانونی موضوع کی تحصیل یا مطالعہ کو بھی کہتے ہیں۔ کہ دو یا زیادہ نظام ہائے قانون میں اس خاص قانونی موضوع کو کس طرح سمجھا گیا ہے اور اس مطالعہ کا مقصد۔ اصلاح یا تعبیر قانون کیلئے نکات کا حصول ہوتا ہے۔ تھوڑا سا غور کرنے سے ظاہر ہوگا کہ متقابلہ علم اصول قانون سے پہلے اور دوسرے مفہوم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں مفہوموں میں اس سے مراد قانون کے عام اصولوں کا مطالعہ ہے۔ یعنے ایسے عام اصولوں کا مطالعہ جو مختلف اقوام و مختلف زمانوں میں بھی پائے جاتے ہیں اور جو اسی وجہ سے قانون کے مقادیر مستقلہ ہوتے ہیں۔ انہیں عام اصولوں کی وجہ سے مثل علم اصول قانون کے متقابلہ علم اصول قانون بھی علم ہے اور اس کی تحصیل سے بھی وہی فواید حاصل ہوتے ہیں جو علم اصول قانون کے مطالعہ سے ہوتے ہیں یعنے قانونی ذہنیت کا پیدا کرنا اور یہ ملکہ پیدا کرنا کہ قانون کی ہر تفصیلات پر صحیح اصولوں کا اطلاق دیا جاسکے۔ اور قانونی اصولوں کو روشن دماغی، سرعت اور صحت کے ساتھ تفصیلات پر منطبق کیا جاسکے غرض ان دونوں مفہوموں میں بلحاظ ماہیت فرق نہیں ہے۔ فرق صرف طرز ادا کا ہے۔ تیسرے مفہوم میں مقصد کو محدود صرف اسلئے کہا جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔ یعنے قانون کے متعدد عام اصولوں میں سے صرف چند خاص اصولوں کا تفصیلی متقابلہ مطالعہ اسلئے کیا جاتا ہے کہ اس محدود حد تک زیادہ سے زیادہ ان اصول ہائے قانون کو بلکہ اُن نظام ہائے قانون کو بھی جن کے یہ اصول ہوتے ہیں اچھی طرح سمجھا جائے۔ مثلاً اگر آپ امریکہ کے چیف جسٹس ہومس یا پالک اور رایٹ کے تصور قبضہ کے متقابلہ مطالعہ کو پڑھیں تو نہ صرف آپ قبضہ ہی کے تصور کو اچھی طرح سمجھیں گے بلکہ قانون روما اور قانون انگریزی کے بنیادی تصورات تک بھی آپ کی نظر پہونچیگی۔ اور ان دونوں قوانین کو اچھی طرح سمجھنے میں آپ ایک قدم اور اچھا قدم اُٹھائینگے۔ اور آپ پر یہ صداقت ظاہر ہوگی کہ قانون کا سمجھنا صرف قواعد قانون کے پڑھنے ہی کو نہیں کہتے ہیں۔ بلکہ بہت سے ایسے اموز کے سمجھنے کو بھی جو متقابلہ مطالعہ سے

روشن ہوتے ہیں۔ متقابلہ تحصیل سے قواعد قانون کے مطالعہ میں ایک نئی روح معلوم ہوتی ہے اور طلبا کو ایک ایسی وسعت نظر حاصل ہوتی ہے۔ جو ان کو اس وقت بہت کام آتی ہے جب کہ اُن کے سامنے ایسے واقعات یا مجموعہ واقعات آجاتے ہیں۔ جن پر کوئی نظیر ہو اور نہ کوئی قانون۔ اور پہلی دفعہ ان سے متعلق قانون دریافت کرنا ہو۔ چنانچہ انگلستان کے ایک لارڈ چیف جسٹس نے مسٹر بنجامن کے متعلق کہا ہے کہ نپولین کے مجموعہ قانون کی جو زیادہ تر قانون روما پر مبنی ہے واقفیت سے بحث میں انہیں ایک خاص امتیاز حاصل تھا وہ عام وسیع اور کلی اصولوں تک پہونچ جاتے تھے۔ اور ان سے استناد کرتے ہوئے نہایت ہی متعلق مثالیں دیتے اور اس طرح دیتے تھے کہ اُن سے اتفاق نہ کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔

اسی طرح اگر آپ خاں روڈالف اھرنگ کی کتاب جس کا پروفیسر گوڈی (GOUDY) نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے مطالعہ کریں تو ظاہر ہوگا کہ انگریزی اور رومی قانون بیع کا مطالعہ کرنے سے ان دونوں نظام ہائے قانون سے آپ کس قدر زیادہ واقف ہوگئے ہیں۔ بلکہ آپ کو ایک قیمتی تجربہ قانون کے اصولوں کو موجودہ واقعات سے منطبق کرنے کے فن کا ہوگا۔ اور آپ سمجھ جائینگے کہ قانون کس قدر ہماری روزمرہ ضرورتوں پر حاوی ہے ونیز آپ میں یہ شوق بھی پیدا ہوگا کہ بطور خود بھی کسی موضوع کی مثل شرع شریف یا دھرم شاستر کے موضوع کی متقابلہ تحصیل یا مطالعہ کریں۔

الحاصل متقابلہ علم اصول قانون بھی اپنی ماہیت میں علم ہے کیونکہ یہ قانون کے بنیادی اصولوں کا علم ہے۔ اور ہم یہاں بھی حدود قانون بنیادی اور علم کو انہیں معنوں میں لینگے۔ جو اصول قانون کی تعریف و بیان ماہیت میں لئے گئے۔ اس میں یا تو عام طور پر قانون کے بنیادی اصولوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے یا خاص خاص مسائل کا۔ اور متقابلہ علم اصول قانون کی تعریف برائس کے الفاظ میں حسب ذیل ہوگی

(COMPARATIVE JURISPRUDENCE IS A SCIENCE OF COLLECTION AND EXAMINATION, A CRITCISON AND APPRAISEMENT OF THE RULES ADOPTED BY CIVILIZED NATIONS ON TOPICS WITH WHICHTHE LEGISLATION OF ALL OR MOST OF THE NATIONS HAS TO DEAL

یعنے متقابلہ علم اصول قانون، قانون کے اُن بنیادی اصولوں اور قواعد کا علم ہے جو تمام یا اکثر اقوام کے قوانین میں پائے جاتے ہیں۔ اور جس میں ان اصولوں کو جمع کیا جاتا، ان کی جانچ کی جاتی ہے، ان پر نقد و تبصرہ ہوتا اور ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر متقابلہ علم اصول قانون، قانون کے بنیادی اصولوں کا علم ہوتا ہے۔ اور اس میں اُن اصولوں کی متقابلہ تحصیل کی جاتی ہے۔

وسعت | بادی النظر میں متقابلہ علم اصول کی وسعت بہت زیادہ نظر آئیگی کیونکہ بادی النظر میں دنیا میں بہت سے نظام ہائے قانون ہیں لیکن غور کرنے پر ظاہر ہوگا کہ دنیا میں یا تو رومنی قانون یعنے قانون روما کی حکمرانی ہے یا ٹیوٹنی یعنے انگریزی تصور قانون کی۔ یا سامی یعنے عربی تصور قانون کی۔ ان قوانین کے علاوہ صرف چین و جاپان کے قوانین رہ جاتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مصر۔ یا بیلوتیہ کلدانیہ کے مخطوطات یا ایرستان کے کلٹک قوانین بھی زیر مطالعہ آئیں۔ لیکن یہ جزوی حد ہی تک ہونگے۔ دراصل بقول برائس متقابلہ تحصیل قانون روما اور قانون انگریزی کی ہوسکتی۔ اور اس میں بھی بہت سے اجزا قانون روما کے قانون انگریزی پر گہرے اثر کی وجہ سے ایک ہی ملینگے۔ دھرم شاستر کے متعلق برائس کہتے ہیں کہ وہ سوائے دو تین موضوعوں کے زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہے اور شرع شریف کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ بعض اہم موضوعوں میں کافی ترقی یافتہ نہیں ہے۔ لیکن غالباً دھرم شاستر اور خصوصاً شرع شریف کے اصولوں سے بھی متقابلہ تحصیل بلحاظ ثمرات بے ثمر نہیں رہیگی۔ عربوں کے ہاتھ میں قانون نے مثل دیگر علوم کے ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کئے ہیں۔

طریق کار | متقابلہ علم اصول قانون کے طریق کار بھی بالعموم وہی ہیں جو عام علم اصول قانون یا ہمارے مفہوم کے لحاظ سے علم اصول قانون کے ہیں۔ یعنی مابعد الطبیعاتی۔ تحلیلی اور تاریخی یعنے ہم جہاں تک عام طور پر قانون کے بنیادی اصولوں کی متقابلہ تحصیل کرینگے تو مابعد الطبیعاتی کی خوبی نعمت تفکر کو نظر انداز نہیں کرینگے۔ نہ تحلیلی طریقہ کی خوبی یعنے قانونی الفاظ، اصولوں کے مفہوم کو متعین کرنے اور ان کو اچھی طرح سمجھ کر استعمال کرنے اور ان کی وسعت پر ہمہ گیر نظر ڈالنے کو ترک کرینگے۔ اور نہ قانونی اصولوں کی تاریخ سے کافی حد تک مدد لینے سے دریغ کرینگے۔ یہی نہیں جب ہم قانون کے کسی خاص موضوع مثل غفلت و امدادی غفلت کی تحصیل پیش نظر رکھینگے تو بھی تینوں طریقوں سے حسب ضرورت مدد لینگے۔

۲- ماہیتِ قانون

قانون کیا ہے؟ اس حصہ میں ہمارے سامنے اسکی تحقیق ہے۔ مختلف اساتذہ کی قانون ماہیت کے متعلق مختلف رائیں ہیں۔ چنانچہ قانون کی ماہیت کے متعلق تحلیلی اور تاریخی مکاتیب میں معرکتہ الارا اختلاف ہیں۔ اور یوں تو راسکو پونڈ[ف۱] نے قانون کی ماہیت کے متعلق ۱۲ مختلف صورتیں گن دیئے ہیں لیکن بلحاظ شہرت اور اہمیت کے ہم حسب ذیل چار اہم تصورات پر غور کرینگے۔ چنانچہ قانون کی ماہیت کے متعلق پہلا اور بہت قدیم تصور یہ ہے کہ

(۱) قانون ایک مطلق عالمی اور اخلاقی اصول یا اس کا مظہر ہے[ف۲]۔ یعنے قانون قانون قدرت (JUS NATURALE OR LAW OF NATURE) ہے۔ یہہ تصور بہت ہی عام ہے۔ اسکو برک (BURKE) نے بدیں الفاظ بخوبی ادا کیا ہے کہ صحیح معنے میں تمام انسان ساختہ قوانین اعلانی ہیں یعنے ایک الہٰی قانون کے اعلانی ہیں[ف۳]۔

(۲) قانون ایک مقتدر اعلیٰ کی مرضی یعنے اسکا مظہر ہے (LAW AS AN EXPRESSION OF THE WILL OF A SOVERIGN AUTHORITY) قانون کے اس تصور کو تحکمی تصور (IMPERATIVE CONCEPTION) کہتے ہیں۔ اسکا اب بھی بڑا اثر ہے اور اسکی خوبی بھی کچھ تھوڑی نہیں ہے۔ انگریزی علم اصول قانون کا یہ خصوصی تصور ہے۔ گو ہمیں ماننا پڑیگا کہ یہ ایک رخی اور غیر مکمل تصور ہے۔

(۳) تیسرے تصور میں قانون تاریخی قوتوں اور حالات کا پیدا کردہ قاعدۂ عمل ہے وہ نہ تو

ف۱- INTRODUCTION TO PHILOSOPHY OF LAW CH.II. ف۲- LAW AS AN EXPRESSION OF AN ABSOLUTE UNIVERSAL MORAL PRINCIPLE

ف۳ ALL HUMAN LAWS ARE PROPERLY SPEAKING DECLA-RATORY, I.E, OF A DIVINE LAW.

شعوری تخلیق ایک فوق البشر عالمی حکمران اصول کی ہے اور نہ مقتدر اعلیٰ کی مرضی کی۔ بلکہ قانون ایک ارتقاء ہے ایک نشو نما ہے جو حالات کا پیدا کردہ ہے۔ ایسے حالات کا جو بڑی حد تک اتفاقی ہیں اور تقریباً کلیتاً زمان، مکان اور قوم کے اختیار سے باہر اور اسی لئے عالمی ہیں۔ قانون کا یہ تصور انیسویں صدی کے تاریخی اسکول کا تصور یا ہمارے الفاظ میں اسکی تعبیر ہے۔ اسکا اثر روزافزوں ہے اور اسکی خوبی بہت زیادہ۔ لیکن یہ بھی ایک رخی اور غیر مکمل ہے۔

(۴) چوتھے تصور میں قانون ایک خاص مقصد کیلئے ایک خاص ذریعہ ہے[۵۴]۔ یعنے وہ ایک آلہ ہے مقصود بالذات نہیں۔ مقصد تو کوئی اخلاقی یا معاشرتی ہوتا ہے۔ مثلاً انصاف، آزادی، افاد عوام یا افراد کا مادی مفاد۔ اس تصور کے حامی اساتذہ کا دعویٰ ہے کہ بغیر ان اخلاقی یا معاشرتی مقصدوں کو پیش نظر رکھے قانون کا سمجھنا دشوار ہے۔

ا۔ قانون قدرت

ادبیات:۔ مین کی (ANCIENT LAW) کارلائل کی (MEDIEVAL POLITICAL THEORIES IN THE WEST) برائس کا گیارھواں مقالہ پالک کی کتاب (ESSAYS ON THE LAW) اور پالک کی (THEORY AND EXPOSITION OF COMMON LAW) آسٹن کا اکیسواں لکچر۔ وینوگراف کی (COMMON SENSE IN LAW) اخری باب (۹) کرکوناف کتاب (۱) باب (۳)

قبل اسکے ہم قانون کے اس تصور کی ان چار دوروں کا ذکر کریں جو اس پر گذرے ہیں ہم یہ کہدینا چاہتے ہیں کہ آجکل اکثر اساتذہ قانون کے اس تصور کو بہت ہی شبہ سے دیکھتے ہیں اساتذہ کی تمام توجہ قانون صریح (POSITIVE) یعنے انسانی ساختہ قانون کی ماہیت سمجھنے اور اس کے مطالعہ میں صرف ہوتی ہے۔ بہت ہی کم اساتذہ اس انسان ساختہ قانون کو (IDEALISE) یعنے تمثالی بناکر اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ گویا آجکل نقطہ نظر معروضی ہے موضوعی نہیں۔ بہر حال اب ہمیں مختصر طور پر یہ جاننا چاہیئے کہ قانون کے اس تصور پر کہ قانون ایک

۵۴۔ LAW AS A MEANS TO AN END.

مطلق۔ عالمی اور اخلاقی اصول ہے یعنے اسکا مظہر ہے۔ حسب ذیل چار دور گذرے ہیں۔

الف۔ پہلا فلسفیانہ دور۔ ب۔ دوسرا قانونی دور ج تیسرا مذہبی دور د۔ اور چوتھا جدید دور۔

الف پہلا فلسفیانہ دور جب انسان قدرت کے مختلف مظاہر سے واقف ہوگیا اور ان پر غور کرنے لگا تو پہلے اسنے عالم حیوانات اور نباتات میں اور ان کے مختلف اقسام میں دیکھا کہ گوناگوں اختلافات کے باوجود یہاں چند مشابہتیں اور یکسانیتیں پائی جاتی ہیں اور تمام حیوانوں اور نباتاتوں میں جو سب سے زیادہ مشترک امر ہے ان کی نشو نما کے طریقے ہیں۔ یعنے تمام حیوان ایک ہی طریقہ پر پیدا ہوتے ہیں پہلے چھوٹے اور کمزور رہتے ہیں۔ انہیں دانت کچھ عرصہ بعد نکلتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ بڑے اور قوی ہوتے ہیں۔ اور اسکے بعد وہ کمزور ہو کر مرجاتے ہیں۔ اسی طرح تمام پودے زمین سے اُگتے ہیں کونپلیں اور پھر پتے نکالتے ہیں۔ انہیں پھول لگتے ہیں اور بڑے ہونے کے بعد ان میں بیج پیدا ہوتے ہیں اور پھر یہ بھی مرجاتے ہیں۔ ان مظاہر کو نوٹ کرنے سے اس کے ذہن میں چند تصورات پیدا ہوئے مثلاً یہ کہ یہ مشترک خصوصیات پیدائشی ہیں۔ نشو نما اور حیات و ممات کے قانون سے کسی کو مفر نہیں ہے اور یہ بھی کہ ان مظاہر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے پیچھے کوئی قوت ہے جو ان مخلوقات پر کارفرما ہے جو ان سے کلیتہً ماسوا ہے اور ان کے اختیار سے باہر ہے اور اسی نے ان کی زندگی کے طریقوں کو مقرر کیا ہے۔

قدرت کے مظاہر سے واقف ہونے کے بعد غور کرنے والے انسان کا دوسرا مشاہدہ یہ ہوا کہ خود انسانوں میں بھی مثل حیوانات اور نباتات کے باوجود گوناگوں اختلافات کے بہت سے اہم خصوصیات مشترک ہیں۔ انکی خواہشات۔ تمنّائیں اور جذبات ایک ہی ہیں۔ یہی خواہشات اور جذبات ہیں جو باوجود شخصی اختلاف کے تمام انسانوں کے افعال کے محرک ہوتے ہیں۔ اور ایسے اصولوں اور طریقوں پر محرک ہوتے ہیں جو ہمیشہ ایک ہی رہتے ہیں۔ اسطرح پر یہ تصور پیدا ہوا کہ باوجود شخصی اختلافات کے تمام انسانوں کی ساخت ایک ہی سی ہے۔ یہ ساخت انکی بنائی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ اسکا بیج انکی فطرت میں مضمر ہے جو جسمانی اور ذہنی ترقی کے ساتھ نشو نما پاتا ہے۔ اس طرح پر کل انسانوں کی مشترک خصوصیتوں کے

اہم ترجزو انکی پیدائش بحیثیت انسان اور انکی نشو نما اور زوال ہوتے ہیں۔ سو یہاں بھی حیات نشو نما اور ممات کے مظاہر ایسے مظاہر ہوئے جو تمام انسانوں سے متعلق ہیں۔

اور جب انسان غور کرنے سے آگے بڑھکر فلسفانے لگا یعنے جب اس میں فلسفی پیدا ہوئے تو انہیں ایک ایسی علّت کی تلاش ہوئی جو جاندار اور نیز بے جان عالم کی قوتوں کے پیچھے ہے اور جسکی وجہ سے ایک نظام سا دنیا میں پایا جاتا ہے کیونکہ دنیا کی طبیعاتی قوتیں، ہوا، بارش، پانی چاند سورج وغیرہ بھی ایک منظم قاعدہ کے تحت عمل کرتے ہیں تو جاندار اشیاء بھی مقررہ طریقوں اور اصولوں پر پیدا ہوتے نشو نما پاتے اور فنا ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے فلسفی اس نتیجے تک پہنچے کہ کارخانہ قدرت میں ایک ایسی قوت کا ہونا ضروری ہے جسنے اپنی مرضی سے دنیا میں یہ نظام قائم کیا ہے۔ چاہے یہ قوت ایک خدا ہو یا اشیاء ہی میں کوئی فطری اور ان روک طاقت۔ اس قوت کو انہوں نے جو نام دیا وہ پیدائش کے مشتقات سے ہے یعنے (NATURE) فطرت یا قدرت کے مشتقات سے۔

اس طرح جب فلسفی حضرات انسان کے متعلق سوچنے لگے تو پہلے تو انہیں تمام انسانوں میں چند مشترک خصوصیات دریافت ہوئیں۔ اور مزید برآں انہوں نے دریافت کیا کہ جس طرح تمام حیوانوں کی تمام قوتیں ملکر انکی جسمانی ترقی اور تحفظ کی طرف کام کرتے ہیں اس طرح انسان کی تمام قابلیتیں ذہنی اور جذباتی قابلیتیں انکے ایک ذی عقل ارادے کے ماتحت ہیں۔ پس وہ مرکزی اور بالاترین قوت جنہیں انہوں نے مادی دنیا میں فطرت یا قدرت کے نام سے موسوم کیا تھا انسانی دنیا میں اسے انہوں نے عقل سمجھا۔ اور جب انسانی دنیا میں اس قوت سے عاقلانہ کام سرزد ہوتے ہیں تو کیا یہ خود لازماً ذوالعقل نہیں۔ اس طرح پر فطرت اور عقل مرادف ہو گئے یا فطرت خود عقلمند سمجھی گئی۔ یا کم از کم فطرت میں عقل کا بھی ایک پہلو مانا گیا۔

پس جب فطرت یا قدرت کا تصور انسانی سوسائٹی کے متعلق اطلاق دینے سوچا جانے لگا تو انکے دو اجزا پائے گئے۔ یکسانیت اور قوت۔ یکسانیت اسلئے کہ تمام انسانوں کی ایک ہی قسم ہونیکی وجہ سے انکے جذبات اور خواہشات اور مقاصد اور ان کا مبدا اور مادی ایک سے ہوتے ہیں اور قوت اسلئے کہ

یہ یکسانیت ایک ذو العقل طاقت کی وجہ سے ہے۔ اور یہ ذو العقل طاقت چاہے مادی دنیا میں شعوری ہو یا نہو (اور یہاں فلسفیوں میں اختلاف تھا اور ہے) لیکن جو انسانی دنیا میں شعوری اور شخصی ہے

توانین قدرت کا لفظ بہت بعد میں وضع ہوا لیکن اسکے بھی دو اجزا تھے یعنے تمام دُنیا میں قدرت کے مظاہر میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اور یہ یکسانیت ایک ذو العقل طاقت کی وجہ سے ہے اسی کی وجہ سے مادی دنیا کی طبیعاتی مظاہر میں یکسانیت ہے اور یہ یکساں مظاہر توانین قدرت ہیں اسی طرح انسانی دنیا میں انسانی امور میں اخلاقی۔ معاشری۔ سیاسی اور قانونی امور میں باوجود گوناگوں اختلاف کے یکسانیت ہے اور یہی یکساں امور قانون قدرت ہیں۔

قانونی امور ہی کو لیجیے۔ مختلف قبائل میں کچھ تو انکے ماحول کی وجہ سے مثلاً ملک کے زرعی ہونے یا ریگستانی ہونے یا ساحل سمندر پر ہونے کی وجہ سے قانون کی تفصیلات میں فرق ہوگا۔ اور ایک دیہی آبادی کے توانین ایک بدویانہ خانہ بدوش شکاری قبیلہ کے یا ایک مچھلی خوار بستی کے توانین سے تفصیلات میں جدا ہونگے۔ اسی طرح نہ صرف ماحول کے اثر کی وجہ سے بلکہ کسی تاریخی حادثہ کی وجہ سے بھی توانین کی تفصیلات میں فرق ہو جائیگا۔ مثلاً کسی زبردست قبیلہ سے جنگ میں ہارنے کی وجہ سے زیر دست قبیلہ میں توانین کی بہت سی تفصیلات مختلف ہوجائینگے یا کسی زبردست بادشاہ کی بدمزاجیوں اور اوہام کا بھی توانین کی تفصیلات پر اثر ہوگا۔ لیکن تمام قبائل اور اقوام میں باوجود ماحول تاریخی حادثوں یا شاہی اوہام کے بہت سے رسم ورواج و توانین ایک سے ملینگے۔ ہر جگہ ایک ہی قسم کے افعال کو برا سمجھا اور ایک دوسرے قسم کے افعال کو اچھا سمجھا جائیگا۔ مثلاً سرقہ قتل وغیرہ کو برا بہادری شجاعت وغیرہ کو اچھا سمجھا جائیگا۔ ہر جگہ خاندانی تعلقات ہونگے۔ ان کے متعلق اصول باوجود گوناگوں تفصیلی اختلافات کے ایک ہی ہونگے۔ کسی نہ کسی قسم کی عدالتی مشنری ہوگی۔ کوئی نہ کوئی مذہبی پیشوا اور خدا ہونگے۔ یہ مشابہتیں اور یکسانیتیں اتنی یقینی اور عام طور پر پائی جائینگیں کہ اگر کوئی مسافر ایک بالکل ہی نئے قبیلہ میں جانکلے تو ان مظاہر کے وجود کا اسکو یقین کر لینا چاہیئے اور گو ترقی یافتہ

اقوام اور وحشی اقوام کے قوانین اور رسم و رواج میں فرق ہوگا۔ لیکن یہ فرق صرف درجہ کا ہوگا ـــ اور وحشی اقوام میں بھی انہیں قوانین و روایات کے تخم پائے جائینگے۔ جو مہذب اقوام میں بار آور پودونکی شکل میں نظر آتے ہیں۔ غرض ہر مکان اور زمان میں قوانین اور رسم و رواج کا یہ فرق کہ کچھ انمیں فطری عالمی اور مستقل اور کچھ مصنوعی مقامی یا عارضی ہوتے ہیں پایا جائیگا۔ قوانین اور روایات کا وہ حصہ جو فطری مستقل اور عالمی ہے وہ تمام انسانوں کی ساخت جسم اور فطرت کے ایک ہونے کی وجہ سے ہے یا بالفاظ دیگر فطرت نے انہیں ان قوانین کو سکھایا ہے۔ یہ بنی نوع انسان کے مشترک قوانین ہیں اور یہی قوانین فطری یا قدرتی ہیں۔

ان فطری یا قدرتی قوانین کی جانب ادب میں جگہ جگہ اشارے پائے جاتے ہیں۔ سفوکلس کی (ANTIGONE) میں جب بادشاہ نے انٹی یون پر شہر کے قوانین کی خلاف ورزی کا الزام دیا تو اس بہادر عورت نے جواب دیا کہ ان قوانین کو (ZEUS) یا عدل و انصاف نے یا (NETHER LAND) عالم علوی کے دوسرے خداوں نے نہیں بنایا ہے۔ موخرالذکر قوانین ایسے ہیں جو آج یا کل کے نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہینگے۔ سقراط کو بھی زہر کا پیالہ یونان کی قوانین کی خلاف ورزی میں انہیں قوانین کی طرف ہدایت کرنیکی وجہ سے پینا پڑا۔ سینٹ پال نے بھی ان قوانین کی تعریف یوں کی کہ یہ وہ قوانین ہیں جو انسانوں کے دلوں پر منقوش ہیں۔ (HERACLITIS) نے ان کو الہی قانون کہا جس سے تمام دنیوی قانون کو غذا ملتی ہے۔ سقراط نے کہا یہ قوانین خدا کے بنائے ہوئے ہیں کیونکہ ان کی خلاف ورزی میں ان کی سزا مضمر ہوتی ہے۔ افلاطون نے نظری انصاف کو واقعی انصاف کے مخالف بتایا ہے۔ ارسطو نے اس خیال کو اور بھی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ قوانین اور رسم و رواج اگرچہ انصاف پر مبنی ہوتے ہیں لیکن ہر وقت انکے اصلی انصاف پر مبنی ہونا ضروری ہے۔ اصلی یا نظری انصاف بہت سی صورتوں میں قوانین کے واقعی انصاف سے دور رہتا ہے یہی قانون قدرت ہے۔ واقعی قوانین کو اسی کی تلاش رہتی ہے۔ رواقیین پر ارسطو کی تصنیفات کا بہت اثر ہوا۔ انہوں نے اسکو عقل یا الہی عقل (DIVINE REASON) کے مرادف سمجھا اور قرار دیا کہ چونکہ عقل نظری ہے اسلئے اگر انسان اسکی

صحیح فطرت کے موافق زندگی بسر کرے تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو کر خوشی حاصل کریگا۔

ب۔ دوسرا قانونی دور | قانون قدرت کا دوسرا قانونی دور رومی دنیا میں رومی تجربہ کی وجہ سے شروع ہوا۔ روما جزیرہ نما اطالیہ میں ایسی جگہ واقع تھا کہ وہاں بہت سے اجنبی تجارت کی خاطر آتے تھے۔ ان اجنبی قبائل کے قوانین اور رسم و رواج رومی قوم کے قوانین وغیرہ سے جدا تھے اور یہ قانون روما کا ایک اصول تھا کہ اسکے قوانین سے فائدہ اٹھانے رومن شہری ہونا ضروری تھا اور ظاہر تھا کہ یہ اجنبی رومن شہری نہ تھا۔ اور یہ بھی ظاہر تھا کہ ان اجنبیوں اور رومن شہریوں کے تجارت وغیرہ کے تعلقات منضبط کرنے کسی قانون کی ضرورت تھی۔ اس طرح پر رومن مجسٹریٹوں کو ایک قانون بنانے کی ضرورت ہوئی جو بعد میں چل کر (JUS GENTIUM) قانون اجانب کے نام سے مشہور ہوا۔

اسکی ابتداء اور طریق کار کے متعلق مختلف نظریئے ہیں۔ چنانچہ سر ہنری مین کا نظریہ یہ ہے کہ ایک خاص رومن پریٹر اجنبیوں کیلئے مقرر کیا گیا اسنے مختلف قبائل کے قوانین کو دیکھا اور ان کا مقابلہ کرکے ان میں سے سب سے بہتر قانون کو منتخب کیا اور اسکو نفاذ دیا لیکن صحیح بات یہ ہے کہ کوئی ایک رائے قائم کرنا کمی معطیات کی وجہ سے مشکل ہے۔ مین کی رائے اب زیادہ وقیع نہیں سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ محض ان کا خیال ہے اور معطیات پر مبنی نہیں ہے۔ چنانچہ یہ امر مشکوک ہے کہ کیا ایک خاص پریٹر اجانب کیلئے قانون اجانب کو اطلاق دینے مقرر بھی ہوا تھا؟ اسمیں اور معمولی مجسٹریٹوں میں کام کی تقسیم کسطرح ہوتی تھی کیا وہ (EDICTS) اعلان نکالا بھی کرتا تھا۔ (اور اسلئے بھی کہ رومن لا میں بہت کم اجنبی عناصر پائے غالباً یہ خیال صحیح ہے کہ خود رومن لا کے اصولوں کو ان کے اصطلاحی عناصر سے صاف کرکے ترقی دیگئی) برائس کا خیال ہے کہ غالباً رومن مجسٹریٹوں نے تجار کے ان رواجات کو جس پر مختلف قبائل کے تاجروں کو عمل کرتے دیکھا لے لیا۔ اسی طرح جسطرح بہت بعد انگریزی ججوں نے لارڈ مانسفیلڈ کی سرکردگی میں انگریزی تجارتی قانون میں تاجروں کے روایات کو تسلیم کیا۔

چاہے طریق کار کچھ بھی ہو لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ رومنوں نے عملی ضرورت کی وجہ سے آہستہ آہستہ قواعد اور ضابطہ کا ایک ایسا مجموعہ تیار کیا جو گو عام خصوصیتوں میں انکے قانون سے مشابہ تھا

لیکن جو کم اصطلاحی اور زیادہ عملی اور عام انسانوں کے سمجھ کے موافق تھا اسکو انہوں نے قانون اجانب کہا۔ یعنے ایسا قانون جو مختلف قبائل اور اقوام میں عام ہو جسکو تمام اقوام استعمال کرتے اور سمجھتے ہوں۔ ہر قبیلہ یا قوم کے بہت سے قوانین ہر دوسرے قبیلہ یا قوم سے مختلف ہوتے ہیں لیکن ان تمام مختلف قوانین کے پیچھے نصفت اور سمجھ یا عقل کے عام اصول مضمر ہیں۔ اسی لئے اگر ان کے مطابق قوانین بنائے جائیں تو تمام اقوام ان پر عمل کرنا اور ان سے اپنے تعلقات کو منضبط کرنا پسند کرینگے اسطرح قانونِ اجانب بنی نوع انسان کا مشترک قانون ہوا۔ اور قانون اجانب کا یہ تصور جس تک رومن اپنی عملی اور حکمرانی ضرورتوں کی وجہ سے پہونچے یونانیوں کے "بنی نوع انسان کے مشترک قانون" یعنے قانونِ قدرت کے مشابہ ہوا جس تک یونانی مجرد طور پر اپنے فلسفہ کی وجہ سے پہونچے تھے ہاں دونوں میں فرق یہ تھا کہ رومنی تصور قوانین کے تجربہ پر مبنی اور استقرائی تھا اور اسی لئے کلیتہً مجرد انصاف یا مجرد عقل پر مبنی نہیں تھا۔

اس نوبت کے بعد رومنی سلطنت اور رومنی دنیا میں دو یا تین اسباب ایسے پیدا ہوئے جنکی وجہ سے قانون اجانب اور قانون قدرت عام طور پر ایک ہی سمجھے جانے لگے۔ پہلے تو رومن شخصی شہنشاہی قیام سے اکثر بہترین نوجوان دماغوں پر سینات عوام اور قانونی پیشہ میں تقریر کے ذریعہ امتیاز حاصل کرنیکا دروازہ بند ہوگیا۔ ان ایسے بہترین دماغوں میں (CICERO) بھی تھا۔ اس نے سیاسی سردبازاری کی وجہ سے علمی میدان کی طرف توجہ کی۔ رواقیین کے فلسفہ کو جو پہلے سے رائج ہو چلا تھا اپنی قابلیت اور عمدہ زبان اور طرز ادا کی وجہ سے ہر دلعزیز بنا دیا۔ خصوصاً قانون قدرت کی رواقیین کے فلسفہ میں خاص جگہ تھی۔ سسرو نے بھی اس پر خاص توجہ کی۔ اور تقریروں اور تحریروں میں فطرت کو اخلاق اور قانون کا اعلیٰ ترین ماخذ ثابت کیا۔ اسکے نزدیک قانون فطرت۔ (فطرت یا خدا تعالیٰ) سے ماخوذ ہے۔ انسان کیلئے طبعی ہے۔ یا دسے یا ہر قدیم ہے۔ ہر جگہ ایک ہی ہے۔ نہ تغیر و ترمیم پذیر ہے اور نہ تنسیخ پذیر۔ اخلاق کی بنیاد یہی ہے۔ اور قانون صریحی کے قواعد میں اسکو موجودہ سے زیادہ دخل ہونا چاہیئے۔ اسطرح پر رواقیین کا فلسفہ اور اس فلسفہ کا قانون قدرت کے متعلق خاص حصہ اس وقت رومن شاہنشاہیت میں بہت ہر دل عزیز ہوگیا۔ سیاسی میدان کی تنگی کے علاوہ اسکی دوسری وجہ مذہب کا

تعلیم یافتہ اشخاص میں نابود ہو جانا بھی تھا۔ غرض یہ ایقان کہ تمام بنی نوع انسان ایک ہیں۔ قانون قدرت تمام اخلاق اور قانون کی بنیاد ہے۔ بدیہی تصور مانے گئے اور جب رومن شاہنشاہیت تمام متمدن ممالک میں قائم ہوگئی اور دنیا کے اکثر حصوں پر رومن پرچم لہرانے لگے تو اس خیال میں اور تقویت ہوئی کیونکہ ایک سلطنت کیلئے ایک قانون بھی ہونا چاہیئے۔ اور یہ قانون اجانب ہی ہو سکتا تھا۔ اور گو واقعتاً اسکو رومن عدالتوں نے بنایا تھا لیکن وہ تمام بنی نوع انسان میں مشترک اور ان کے قوانین کے مغز پر مشمول ہے اور اسی لئے وہ عقل انسانی کا بنایا ہوا ہے۔ گویا وہ قانون قدرت ہے۔ جسٹینین کے (INSTITUTES) میں قانون قدرت اور قانون اجانب کا یہ انطباق تقریباً مکمّل ہوگیا۔

رواقی فلسفہ کے رواج عام اور رومن شاہنشاہیت کے عالمی وسعت کے علاوہ ایک تیسرے سبب اور تصور سے بھی اس انطباق میں مدد ملی۔ اور وہ تصور نصفت کا تھا۔ رومنوں کے نزدیک نصفت سے مراد (FAIRNESS) الفاظ اور اصطلاحات کے ورے انصاف۔ اس قسم کے جذبات جو ایک شریف اور ذی عزت شخص کو دوسروں کے ساتھ معاملات میں ہونے چاہیئں تھی۔ اسطرح نصفت کے تصور سے ایک اعلیٰ قانون کا تصور مکمل ہوا۔ اسطرح پر قانون قدرت مابعد الطبیعات اور فلسفہ کے نقطۂ نظر سے وہ قانون ہوا جسے فطرت یا خدائے عقل نے بنایا ہے۔ تاریخ اور سیاسیات کے نقطہ سے وہ وہ قانون ہوا جسکو بنی نوع انسان نے مختلف اقوام میں منظم ہو کر اپنے ارادہ سے رواج کے ذریعہ بنایا اور اخلاق و نفسیات کے نقطۂ نظر سے وہ وہ قانون ہوا جو اعلیٰ انسان کے ان شریفانہ رجحانات اور جذبات کا مظہر ہوا جسکی وجہ سے وہ اپنے ہمسایہ سے ویسا ہی برتاؤ کرنا چاہتا ہے جیسے کہ خود اپنے ساتھ ان تصورات کے اجتماع سے قانون قدرت کا تصور مکمّل متوافق اور متوازن ہوگیا۔

ج۔ تیسرا مذہبی دور ازمنۂ وسطی کا ہے اسمیں عیسائی پادریوں نے بڑی آسانی سے فطرت کو خدا سمجھا۔ چنانچہ سینٹ کرس سوسٹم نے کہا کہ "جب میں فطرت کہتا ہوں تو میرا مطلب خدا ہوتا ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ ہی ہے جس نے فطرت کو بنایا ہے" اور اس طرح قانون قدرت کو الٰہی قانون سمجھا گیا ہم سینٹ پال کا قول لکھ چکے ہیں کہ کسطرح انہوں نے قانون قدرت کو وہ قانون کہا جو خدائے تعالیٰ نے

انسانوں کے دلوں پر کندہ کیا ہے۔ اسطرح سینٹ اگسٹائن نے قانون قدرت کو وہ ابدی اور سرمدی قانون سمجھا۔ جو خدا کے شہر کا قانون ہے۔ غرض یہ کہ عیسائی پادریوں نے قانون قدرت کو خدا کا بنایا ہوا الٰہی قانون سمجھا اور اس سے انکی جو مراد تھی وہ سینٹ تھامس اکوئنم کے الفاظ میں یوں ظاہر کی جاتی ہے کہ ابدی اور الٰہی قانون جو تمام چیزوں پر حکمران ہے خدا کی جو سب سے بڑا قانون ساز ہے عقل کا مظہر ہے۔ اس کا وہ حصہ جو وحی کے ذریعہ نازل نہیں کیا گیا بلکہ خود انسان کو اسکی عقل کے ذریعہ سکھایا گیا مناسب طور پر قانون قدرت کہا جا سکتا ہے۔ یہ قانون انسانی عقل کا پیدا کردہ سہی لیکن خود انسانی عقل خدا کی عقل کا پیدا کردہ ہے اس طرح پر قانون قدرت بھی الٰہی قانون ہوا۔ غرض عیسائیوں کے نزدیک قانون قدرت وہ مطلق عالمی قانون ہوا جو انسان کو بحیثیت انسان کے اسکی عقل کے ذریعہ خدا نے سکھایا ہے۔ اور اسطرح پروفیسر آلن کے الفاظ میں تیرھویں صدی کے آخر میں قانون قدرت کا مکمل عیسائی تصور جو ہوا وہ رواقیین کے قانون قدرت کا تصور ہی تھا گو دوسرے الفاظ میں تھا اسکی تعبیر وحی کے الفاظ میں کیگئی تھی اور اسکو مذہبی اقتدار حاصل تھا۔ اور کلیسائی قانون کی اسپر مہر تھی۔

ظاہر ہے کہ اس دور میں اس تصور کا استعمال زیادہ تر اخلاقی اور مذہبی دائروں میں ہوا۔ کیونکہ اس دور میں قانون کی تحصیل کم ہوتی تھی۔ اور اس تصور کا ایک مصرف ہمیں اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ پوپ اور شاہنشاہ کے حامی ایک دوسرے کو اسکی خلاف ورزی کا مرتکب گردانتے تھے۔ اور بعض وقت رعایا نے بھی انکے قوانین کی خلاف ورزی کو اسوجہ سے جائز سمجھا کہ یہ قوانین اس قانون قدرت کے خلاف تھے۔ اس طرح پر اس تصور کے ذریعہ اعلیٰ اخلاقی اصولوں کی برتری کا اعلان کیا جاتا تھا۔ شاہان مابعد کا یہ فرض بتلایا جاتا کہ وہ انکی پابندی کریں۔ شہریوں سے اس حق کا مطالبہ کیا جاتا کہ اس کے ذریعہ سے وہ اپنے حقوق کی حفاظت کریں یا چاہے یہ حفاظت بغاوت اور ظالم بادشاہوں کی معزولی اور قتل کے ذریعہ ہی ہو۔ یا بالفاظ دیگر الٰہی انصاف کو تمام قوانین کا ماخذ قرار دیکر اس تصور نے قانون صریح کے اقتدار پر روک لگائی اور یوں قوانین صریح کے جواز کو قانون قدرت کی مطابقت سے محدود کیا۔

یہ چوتھا جدید دور | یہ ازمنہ وسطیٰ کے اختتام اور نشاۃ جدیدہ اور عہد اصلاح سے شروع ہوتا ہے اس دور میں قانون قدرت کے تصور کا استعمال ذیل کے تصورات کے سمجھنے اور حل کرنے میں کیا گیا مثلاً قانون کا

ماخذ کیا ہے۔ سیاسی معاشرہ اور سیاسی اقتدار کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ اس دور میں یہ سوالات اسلئے پیدا ہوئے کہ ازمنہ وسطی کے سیاسی نظام میں پوپ کے اقتدار کو جو حضرت عیسےٰ کے سینٹ پیٹر کے ارشاد سے اور شاہنشاہ کے اقتدار کو یا تو پوپ کے اقتدار سے یا راست خدا کے اقتدار سے ماخوذ سمجھا جاتا تھا ختم ہو گئے تھے۔ اور ضرورت تھی کہ بادشاہ اور مملکت کو کسی دوسرے نظریہ کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔ تاکہ انکی اطاعت کا مسئلہ حل یعنے انکی اطاعت کا جواز ثابت ہو۔ اس فضا میں اس ضرورت کو پورا کرنے فطرت کے تصور کا ایک نیا استعمال کیا گیا ھابس نے ایک حالت فطری کو فرض کیا جسمیں ہر شخص دوسرے کے ساتھ مصروف پیکار تھا۔ اس جنگ و جدل کے ختم کرنے انہوں نے اپنے سارے قدرتی حقوق ایک شخص کے سپرد کر دیئے۔ جسکی اطاعت اسی قانون قدرت کی وجہ سے واجب ہو گئی۔ برخلاف ھابس کے لاک نے بھی ایک حالت فطری کو فرض کیا۔ لیکن اسکے نزدیک وہاں باہمی جنگ و پیکار نہیں تھی۔ گو ایک شخص کو اختیارات دیئے گئے لیکن بغاوت کا حق باقی رکھا گیا۔ اسطرح پر قانون قدرت لاک کے نزدیک آزادی کا حلیف ہوا۔ اور امریکہ کے ۱۷۷۶ء کے اعلان آزادی میں قانون قدرت فطری حق کے نام سے بطور استناد پکارا گیا۔ اسی اثناء میں روسو بھی اپنے حالت فطری اور معاہدہ معاشری کے نظریوں کے ذریعہ سے فطرت اور قانون قدرت کے نئے نئے استعمال کو ہر دل عزیز بناتا رہا۔ جو بہت جلد ۱۷۸۹ء میں فرنیچ کنونشن کے ذریعہ اعلان حقوق انسانی کے نام سے دنیا کے کانوں کو ہلا دیا۔

اسطرح پر اب قانون قدرت ھابس، لاک اور روسو کی تصانیف کی وجہ سے ایک نئی تخریبی سیاسی قوت ہو گیا۔ اور گو آزادی، مساوات اور اخوت کے تصور پہلے بھی یعنے یونانی اور رومی قانون قدرت کے تصور میں شامل تھے لیکن خاموش اور سکون کی حالت میں تھے۔ اس دور میں سیاسی حالات کی وجہ سے یہ سکون ختم ہو گیا اور ان نعروں کے تحت قانون قدرت ایک محرک سیاسی قوت ہو گیا۔

مذکورہ بالا خصوص کے علاوہ تین اور خصوص میں قانون قدرت کے اثرات دور جدید میں پائے جاتے ہیں انگریزی قانون میں نصفت کا تصور اس قانون قدرت کے تصور کا رہین منت ہے۔ اور نیز انگریزی قانون میں قانون قدرت سے استناد بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بیورٹن جو ایڈورڈ چہارم کے زمانہ میں گذرے ہیں کہتے ہیں کہ نظائر اور احکام کی عدم موجودگی میں ججوں کو قانون قدرت کی پابندی کرنی چاہیئے کیونکہ یہ قانون تمام قوانین کی اساس ہے

بلاکسٹن نے یہاں تک کہدیا ہے کہ قانون قدرت تمام کرۂ ارض پر قابل پابندی ہے۔ اور کوئی قانون جو اسکے خلاف ہو قانون ہی نہیں اور بلاکسٹن معاہدات معنوی کو جو لارڈ مانسفیلڈ نے جائز رکھا ہے اسی قانون قدرت پر عمل کرنیکی وجہ سے بتاتے ہیں انگریزی قانون میں قانون قدرت پر مبنی قوانین کی چند دوسری مثالیں انگریزی مرکنٹائل لا۔ اور قانون ٹارٹس میں معقول آدمی کا معیار احتیاط ہیں۔ باوجود اتنے اثر کے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انگریزی قانون زیادہ تر تجربہ سے بنا ہے اور تجربہ پر مبنی ہے مجرد اصولوں کا اس پر اثر نسبتاً کم رہا ہے۔ نظائر اور احکام کی موجودگی میں مجرد اصولوں پر عمل کم ہوتا تھا۔

۲۔ قانون بین الاقوام کے اساتذہ مثلاً گروٹیس جینٹی لس۔ لیبنٹز۔ اور پوفن ڈورف نے قانون قدرت ہی کو اس قانون کا سنگ بنیاد بنایا۔ کیونکہ قانون قدرت جب بنی نوع انسان کا مشترک قانون ہوا تو اس پر مملکتوں کے درمیان بھی عمل ہونا چاہیئے۔ غرض اس قانون کے بہت سے اصول رومن قانون اجانب سے لئے گئے۔ پہلے پہل اسکا نام بھی قانون اجانب یا ممالک رکھا گیا۔ جہاں قانون اجانب یا ممالک سے مراد اجانب یا اجنبی قبائل میں مشترک قانون نہیں تھی بلکہ مختلف مملکتوں کے درمیانی تعلقات کو منضبط کرنے والا قانون۔ اور حال حال ہی میں قانون بین الاقوام کا نام اس قانون کو دیا گیا۔

۳۔ آجکل جرمنی فرانس اور ایطالیہ میں قانون قدرت سے مراد قانونی تصورات اور عام قانونی نظریوں کی مابعد الطبیعاتی اساس لی جارہی ہے۔ یہاں ان ممالک کے اساتذہ نے جن کو جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں مابعد الطبیعاتی اسکول کے اساتذہ کہتے ہیں۔ اور جن کے علم اصول قانون کا طریق کار مابعد الطبیعاتی ہے اس اصول پر عمل کرکے تمام انسانوں کی ساخت ایک ہی ہے ان کے تمام افعال عقل سے (اور اسی لئے انصاف) منضبط ہوتے ہیں۔ قانون کا ایک نظریہ بنایا ہے جسمیں تمام قوانین کی اساس کو مجرد عقل ٹھہرایا ہے واقعی قوانین کے تجربہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کیگئی ہے اور اسی لئے ان کا نظریۂ قانون موجودہ حقیقتوں سے دور ہوگیا ہے۔

آخر میں ہم کو اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ مجرد عقل انسانی یا فطرت انسان پر مبنی حق و انصاف کے مجرد تصورات اور اسی لئے قانون قدرت کسی بھی مجموعہ قانون کی اساس نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ بقول اسپاینوزا (SPINOZA) عقل پارہ کا ایک ایسا صندوق ہے جسپر کوئی کھڑے رہ نہیں سکتا۔ مثلاً دیکھئے ازدواج ہی کے متعلق

کوئی ایک قانون عقلِ محض یا فطرت پر مبنی نہیں ہو سکتا مثلاً کہئے کہ عقل پر مبنی قانون کی رو سے تعدّد ازدواج اچھا ہے یا صرف ایک بیوی سے مذہبی نکاح کرنا یا صرف ایک بیوی سے معاہدہ کی رو سے نکاح کر لینا ہر شخص کو اپنے لئے نر اور مادہ کا آزادی کے ساتھ انتخاب کر کے اسوقت تک اسکے ساتھ رہنا جب تک کہ جی چاہے یا موزوں نر اور مادے کا انتخاب سرکاری عہدہ داروں کے ذریعہ ہونا۔ اسی طرح جرائم کی سزا کو لیجئے کہ محض عقل پر مبنی قانون کی رو سے کیا سزا کس بنیاد پر دیجانی چاہیئے۔ کیا جرائم کو دبانے کیلئے اور اسی لئے قطع ید وغیرہ ہونا چاہیئے جیسا کہ افلاطون کہتا ہے۔ کیا بقول ارسطو تعلیم کیلئے کیا بقول بنتھم محض ڈرانے کیلئے یا کیا بقول کانٹ محض اخلاقی کفارہ کیلئے یا بقول لومبروسو (LOMBROSO) اور امریکہ کے بعض اساتذہ کے مجرموں کو سزا دینی ہی نہیں چاہیئے بلکہ انکے علاج کیلئے انہیں دواخانہ بھیجنا چاہیئے ان مثالوں سے ظاہر ہوگا کہ عقلوں میں کیسا اختلاف ہو سکتا ہے اور یہ کہ مجرد عقل پر کسی قانون کو مبنی کرنا کتنا دشوار ہے۔ اور نیز یہ بھی کہ محض قانون قدرت ہی کسی قوانین کی اساس نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسکی تعریف یہی ہے کہ وہ عقل انسانی کا بنایا سکھایا ہوا عالمی مطلق اور اخلاقی قانون ہے۔

مگر قانون کے تصورِ قانونِ قدرت کو بے سود اور لغو سمجھنا بھی غلطی ہوگی بات یہ ہے کہ قوانین کی بھی مثل انسانوں اور قوموں کے عمر ہوتی ہے۔ نہ صرف اسکے منفرد قواعد اور نظریہ پرانے اور دور از کار ہو جاتے ہیں بلکہ وہ قومی اور تاریخی حالات جنمیں کسی قوانین کا نشو و نما ہوتا ہے کلیتاً بدل جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے بسا اوقات کل نظام قانون کا بدلنا ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ ان انسان ساختہ قوانین سے حالات کے بدل جانے کی وجہ سے انصاف نہیں ظلم ہونے لگتا ہے۔ جیسا کہ مثلاً اٹھارھویں صدی کے آخر میں فرانس میں ہوا۔ ایسے زمانوں میں قوموں کو حقیقی موجودہ قوانین سے بدظن ہو کر آئیڈیل تمثالی قوانین کی تلاش ہوتی ہے۔ اسوقت قانون کا یہ تصور کہ قانون ایک عالمی مطلق اور اخلاقی اصول کا مظہر ہے کام آتا ہے۔ بالفاظ دیگر قانون قدرت ایک قیصر سے دوسرے قیصر کو اپیل کرنے کا مفید اور ضروری کام دیتا ہے۔ گو آجکل جماعات مقننہ کے ذریعہ قانون میں اکثر ترمیمیں ہو جاتی ہیں اور اسی لئے قانون قدرت سے آجکل اتنا استناد نہیں کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی کون کہہ سکتا ہے کہ یہ تصور جو ماضی میں اتنا کام آیا ہو۔ جسکے ذریعہ مذکورہ بالا کام انجام پا سکتا ہے

سے بے ضروری اور لغو ہوگیا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ قانون کا یہ تصور کہ وہ ایک مطلق، عالمی اور اخلاقی اصول کا مظہر ہے مابعد الطبیعاتی نقطۂ نظر سے ٹھیک ہے لیکن قانونی نظر سے گو بے سود نہیں لیکن چنداں مفید اور صحیح بھی نہیں۔ وہ کسی صحیح نظریۂ قانون میں کسی مجموعۂ قوانین کی اساس نہیں بن سکتا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر وہ تجربہ سے موجودہ حقیقی قوانین کے تجربہ سے دور ہے۔ بلاشبہ روما کا قانون اجانب ایسے قوانین کے تجربہ پر مبنی تھا۔ لیکن اب جبکہ زمین کی طنابیں کٹ گئی ہیں اور کُل روئے زمین کے تجربہ کی تحصیل ہوسکتی ہے اور رومنی دنیا کے مقابلہ کرتے آجکل دنیا کے حالات اتنے بدل گئے ہیں کہ کایا پلٹ ہوگئی ہے ہم یہہ نہیں کہہ سکتے کہ جن عام اصولوں پر قانون اجانب مشمول ہوا تھا اب بھی کلیتاً صحیح ہیں ۔ مزید متقابلہ تحصیل ضروری ہے۔ ایسی متقابلہ تحصیل آجکل جرمنی اور فرانس میں بڑے پیمانوں پر جاری ہے اسکی تکمیل کے بعد ہمیں علم اصول قانون کے عام اصولوں کیلئے موجودہ واقعی قوانین کے تجربوں پر مبنی اب سے زیادہ اچھا مواد مل جائیگا۔ لیکن پھر بھی اگر ہم قانون کی یہ تعریف کرینگے کہ وہ مطلق عالمی اور اسی لئے بھی اخلاقی اصول کا مظہر ہے تو یہ تعریف ایک رخی ہوگی۔ کیونکہ ماحول اور قومی ضروریات کے اختلاف کی وجہ سے تفصیلات اور جزئیات میں فرق ہوگا اور پھر ہمیں یہ حقیقت بھی نہیں فراموش کرنی چاہئیے کہ دنیا کی کوئی حکومت اپنے وضع کردہ قوانین کی پابندی پر کسی دوسرے اصول کی چاہے وہ مطلق اور عالمی اور اخلاقی ہی کیوں نہ ہو پابندی کو ترجیح دیگی۔ بالفاظ دیگر جبتک ان قوانین کے تجربہ پر مبنی مطلق، عالمی اور اخلاقی اصولوں کے پیچھے حکومت کی قوت نافذہ نہو وہ صحیح معنی میں قانون نہیں بن سکتے۔ آجکل جبکہ ایسے اصول ہمارے پاس نسبتاً کم ہیں۔ ججوں کی خود اختیاری رائیوں کو روکنے حکومت زیادہ صحیح ہے وگرنہ قوانین کی (CERTAINTY) یعنے قوانین کے معین ہونے کا احساس جاتا رہتا ہے۔

امام غزالیؒ کے کلامی خصوصیات

از جناب محمد خورشید صاحب (محبوب نگری)، ام، اے

نام وکنیت

امام غزالی کا اسم گرامی محمد اور کنیت ابو حامد ہے۔ یہ خراسان کے شہر طوس میں بمقام طاہران سنہ ۴۵۰ھ میں پیدا ہوئے اس میں تو کوئی کلام ہی نہیں کہ اسلامی اور عربی عقلیت و فکر کا یہ جلیل القدر اور ممتاز نمایندہ ایک عظیم المرتبت فیلسوف اور حکیم، نقید المثال باحث اور محقق کی حیثیت سے اپنے وقت کا امام ہوا۔ مورخین فلسفہ اور ادب نے ان کے بے مثل تنوع فکری کے مدنظر ان کو اعجوبۂ زمان قرار دیا ہے۔ یہ معقول اور منقول کے جامع، علوم ظاہری و باطنی کے زبردست عالم، صاحب معرفت، حقیقت شناس تھے۔ ان کا شمار ان بلند نظر ارباب علم وفضل اور نوادر دہر ہستیوں میں کیا جاتا ہے جنھوں نے صدر اول کے اختتام پر پانچویں صدی ہجری کو اپنے مقدس اور بافیض وجود سے زینت دی۔ دنیائے اسلام نے امام صاحب کی شہرہ آفاق اور بلند پایہ تصنیف احیا، علوم الدین کی عظیم قدر وقیمت کے اعتراف میں جس سے سلف صالح کے قیمتی آثار کا احیار ہوا تھا بغیر کسی قسم کے مبالغہ اور رعایت کے حجۃ الاسلام جیسے لقب سے ان کو یاد کیا ان کے نام کے متعلق اختلاف رہا ہے کہ غزالی زے کی تخفیف سے ہے یا تشدید سے۔ شمس الدین ذہبی نے اپنی تالیف "العبر" اور "شذرات الذہب" میں اور عبدالرحیم اسنوی نے اپنی کتاب "طبقات الشافعیہ" میں زے کی تشدید کو ثابت کیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ غزالی مثل عطاری و خبازی کے

اہل خراسان کے لہجہ کے مطابق حرفِ وسطی کی تشدید کے ساتھ تلفظ کیا جاتا ہے، طبقات الشافعیہ میں منقول ہے کہ ان کے والد ماجد اون کاتا کرتے تھے۔ اپنے والد ماجد کے اس پیشہ کی مناسبت سے انھوں نے غزالی لقب پایا۔ کیوں کہ غزل کے معنے عربی میں کاتنے کے ہیں۔ اس کے برخلاف علامہ سمعانی کا خیال ہے کہ قصبہ غزالہ کی جانب منسوب ہونے میں جو شہر طوس کے اطراف واکناف میں واقع ہے ان کے اس لقب کا راز مضمر ہے ہمارا میلان بھی اس لقب کو ز سے کے تخفیف ہی کے ساتھ استعمال کرنے کی طرف ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ان کے والد اون کاتا کرتے تھے اور اس کی خرید و فروخت کرتے تھے یا نہیں۔

امام صاحب کی ابتدائی تربیت اور طلب علم میں تحمل مشقت

اتنی بات یقیناً ثابت ہے کہ امام صاحب کے والد بزرگوار اپنے دو لڑکے ابو حامد محمد اور احمد کو بچہ چھوڑ کر انتقال کر گئے تھے۔ ان کی عسرت و تنگ حالی کے بارے میں کوئی شک وشبہہ نہیں تھا۔ اپنے ایک صوفی دوست کو ان بچوں کی دیکھ بھال کی وصیت کی تھی انھوں نے ان بچوں کے والد کے متروکہ کے ختم ہونے تک ان کی تہذیب، تعلیم و تربیت میں سعی بلیغ کی۔ تقدیر کا یہی منشا تھا کہ انبیاء مصلحین اور فلاسفہ اور حکماء کی طرح جن کے مبارک نفوس کی واقعی تکوین اور صحیح تکمیل کے کفیل مصائب وطن اور آلام غربت و سفر ہوا کرتے ہیں، امام صاحب بھی طلب علم کے لئے سفر و قطع مسافات کی مشقتوں کو خاطر میں نہ لائیں۔ چنانچہ نہ صرف اپنی نوعمری میں بلکہ اپنے شفیق اور قابل استاد کی زندگی ہی میں امام صاحب کے لئے یہہ ممکن ہوا کہ تالیف و تدریس سے متعلق کامیاب خدمات انجام دیں اور لوگوں کے لئے افادہ کا سبب بنیں۔ اپنے وقت میں امام صاحب سب سے زیادہ محقق اور صاحب نظر مشہور رہے۔ ان خصوصیات میں امام صاحب ابن سینا کے بالکل مماثل نظر آتے ہیں

امام صاحب کے ابتدائی تعلیمی دور میں ایک انقلاب آفرین واقعہ

امام صاحب کے ابتدائی زمانۂ تعلیم میں ایک واقعہ کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا جب امام صاحب جرجان سے وطن مالوف واپس ہورہے تھے تو اثنائے راہ میں قزاقوں نے امام صاحب کا سامان معہ ان کی مرتب کی ہوئی علمی یادداشتوں کے لوٹ لیا۔ امام صاحب حیران و پریشان ہوکر ڈاکوں کے سردار کے پاس گئے اور ان یادداشتوں کو اپنے سفر کا واحد مقصد اور سرمایہ قرار دیتے ہوئے کم ازکم ان ہی کو واپس دیدینے کے لئے منت وسماجت کی سردار نے مسکراتے ہوئے یہہ کہہ کر کاغذات واپس دیدیئے کہ وہ بھی کیا خاک تحصیل علم ہوا جس کا مدار چند یادداشتوں پر ہو۔ یہہ تھا تو ایک نرا مذاق لیکن امام صاحب کے حق میں یہی ایک چبھتا ہوا اور موثر فقرہ انقلاب آفرین ثابت ہوا۔ علمی محصولات کے ان قرطاسی نقوش کے مقابلہ میں اب انھوں نے ان کے ذہنی ارتسام کو ترجیح دی اور اس طرح تمام مسائل علمیہ کے جید حافظ بن گئے۔

امام صاحب کا فکری ماحول

یہہ وہ زمانہ ہے کہ تقریبًا تمام بلاد اسلامیہ فکری تحریکات اور علمی سرگرمیوں کیلئے ضرب المثل ہورہے تھے۔ اور ان سب میں بغداد اور نیشاپور مرکزیت کا درجہ رکھتے تھے۔ امام صاحب نے نیشاپور کا قصد کیا اور امام الحرمین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے شاگردوں میں غزالی نے جلد ممتاز حیثیت حاصل کرلی اور معید بنائے گئے اس طرح کی مثالیں کمیاب ہیں کہ غزالی کی طرح کسی شاگرد نے اپنے استاد کی زندگی میں اتنی شہرت اور مرجعیت حاصل کی ہو کہ خود استاد کو اپنے تلمیذ پر ناز ہونے لگے۔ امام الحرمین کے انتقال کے بعد ایک محترم روزگار جید فاضل کی حیثیت سے امام صاحب نے نیشاپور کو خیرباد کہا اور نظام الملک طوسی کے دربار کا رخ کیا۔ ملک شاہ سلجوقی کے اس ذی علم اور قدردان وزیر نے اپنے اس نادرۂ روزگار فاضل ہموطن کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نظام الملک کا دربار کیا تھا بلند نظر ارباب علم وفضل کا ایک مرکز تھا کہ جہاں منتخبۂ روزگار ہستیاں اپنے علمی کمالات کا مظاہرہ کرتیں اور اس قدردان علم وحکمت سے خراج تحسین

حاصل کرتیں۔ یہاں بحث و مناظرہ کے میدان میں امام صاحب نے اپنی ضرب المثل علمی قابلیت سے سبھوں کو نیچا دکھایا اور اسی چیز نے امام صاحب کو آسمان شہرت و عظمت کا درخشاں ستارہ بنا کر چمکایا

مدرسۂ نظامیہ بغداد میں امام صاحب کی قدر و منزلت

اب ان کے لئے بغداد کے مدرسۂ نظامیہ میں تدریس کے جلیل القدر منصب پہ فائز ہو جانا کوئی دشوار امر نہ تھا۔ نظام الملک نے یہ منصب ان کے آگے پیش کیا اور اس عہدہ کو زینت دینے کے لئے امام صاحب بغداد روانہ ہوئے۔ بغداد نے بھی جو اس وقت حریت فکر کے لئے تنہا مرکز شمار کیا جاتا تھا امام صاحب کی مسلمہ قابلیت اور تبحر علمی کے وثیقہ پر مہر تصدیق ثبت کی۔ یہاں پہونچ کر امام صاحب مرجع کل بنے ہوئے تھے ان کی رائے اور مشورہ کے بغیر مہات سلطنت کا طے پانا دشوار ہو گیا تھا۔ ان کا حلقۂ درس نہ صرف عوام سے معمور رہا کرتا تھا بلکہ روساء و امراء بھی اس میں شرکت کو باعث امتیاز و فخر سمجھتے تھے۔

فلسفہ اور فلاسفہ کے متعلق ایک عجیب حقیقت۔

ایک عجیب حقیقت جس کو تسلیم کرنے کے بغیر چارہ نہیں یہ ہے کہ فلسفہ نے اپنے ابتدا سے اپنی پشت پناہی کے لئے حکومت ہی کی قوت اور صولت پر اعتماد کیا ہے۔ یونان کے بزرگ ترین اور اولوالعزم فلسفی معلم اوّل ارسطو ہی کو لیجئے کہ جس نے فیلپس مقدونی اور اس کے لڑکے سکندر اعظم ہی کے دامن عافیت میں نجات دیکھی تھی دور جانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ وولٹیر (Voltaire) کے نسبت کون ناواقف ہے۔ فریڈرک اعظم کے دربار کی حمایت اس کو حاصل تھی اسی طرح جرمن فیلسوف گوئٹے نے امیر فیار کے دربار میں رسوخ حاصل کیا۔ اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو فلسفہ اور فلاسفہ کو صرف دو حالتوں میں آزادی نصیب ہوئی ہے ایک تو قناعت پسند فلسفی کی حالت میں کہ وہ اپنے فکر کے ثمرات کی حقیر آمدنی پہ گذر اوقات کی ہمت رکھتا ہو۔ جس طرح اسپنوزا نے کیا تھا گھڑی سازی و تالیف کی معمولی آمدنی پہ اس کی بسر اوقات کا انحصار تھا اور دوسرے مرفہ الحال اور دولتمند فلسفی کی حالت

میں کہ خواہ یہ دولت شوپنہور کی طرح وراثتاً اس کو ملی ہو یا جان اسٹوارٹ مل کی طرح تصنیف و تالیف غیر محدود ثروت کا سرچشمہ بنی ہوئی ہو لیکن ثروت و دولت کی اس قسم کی مثالیں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی ہیں۔ زیادہ تر مشاہدہ تو یہی رہا ہے کہ فلاسفہ نے فریڈرک نیٹشے اور برگ سان کی طرح فقر و افلاس کی حالت میں درس و تحریر کے ذریعہ اپنے فکری سرمایہ کے قلیل حصول ہی پر زندگی کے دن گزارے مسلمان فلاسفہ اس قاعدۂ کلیہ سے کس طرح بچ سکتے تھے۔ کندی، فارابی، اور ابن سینا نے اپنے افکار اور خیالات کی نشر و اشاعت اور اپنے اصول کی ترویج کے لئے خلفاء اور وزراء ہی کا دامن عاطفت تھاما تھا۔ امام صاحب کی زندگی میں تو یہ حقیقت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ نظام الملک اور فخر الملک سے ان کا اتصال کوئی چھپا ہوا واقعہ نہیں ان کی زندگی کے دن آل سلجوق ہی کی حمایت میں آسودگی کے ساتھ بسر ہوئے۔

امام صاحب اور جان جاک روسو

امام صاحب کی تصنیفات میں ایک کتاب "المضنون بہٖ علیٰ غیر اہلہ" بھی ہے جس کے متعلق محققین یورپ کا خیال ہے کہ جان جاک روسو کے اعترافات کی طرح یہ بھی درحقیقت ان کے اعترافات ہی کا مجموعہ ہے۔ لیکن اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو امام صاحب کی اس تصنیف اور جان جاک روسو کے اعترافات میں ایک بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ روسو کی اپنی مادی معنوی اور عقلی زندگی نے ان اعترافات کی تدوین میں اصل مصادر کا کام دیا تھا اس کے برخلاف امام صاحب نے اپنے اعترافات کے دائرہ کو اپنے عقلی اور قلبی زندگی ہی تک محدود کر رکھا ہے۔ درحقیقت یہ ایک مکتوب ہے جو امام صاحب نے اپنے ایک عزیز دوست کے ایک استفسار کے جواب میں لکھا ہے۔ چنانچہ وہ اس کی ابتدا میں لکھتے ہیں "برادرم آپ نے علوم کے اسرار و غایات کے متعلق کچھ روشنی ڈالنے اور ان دشواریوں کو تفصیل وار بیان کرنے کی خواہش کی ہے جن کا حق خالص تک پہونچنے کے لئے ان فرقہ واری ہنگاموں اور اختلاف مذاہب میں مجھ کو سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہ بھی آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کس طرح میں نے اندھی تقلید کی تاریکیوں سے بصیرت کی

چوٹیوں تک رسائی پائی اور کس طرح پر ان لوگوں کے خیالات و افکار پر اطلاع پانے کا مجھ کو موقعہ ملا جن کے نزدیک حق کا پانا کسی امام ہی کی تقلید پر موقوف ہے اور کس طرح فلسفیانہ اصول کو ٹھکرا کر تصوف ہی کے آغوش کو میں نے اپنا ماوٰی و ملجا قرار دیا اور تلاش حق کے دوران میں کس طرح میں نے خلق اللہ کی بول چال سے استنباط حق کے مواقع پائے بغداد میں طلبہ علم کی کثرت کے باوجود کس چیز نے مجھ کو علم کی نشر و اشاعت سے باز رکھا اور ایک طویل مدت کے بعد کون سی چیز میرے نیشاپور واپس آنے کی باعث ہوئی"۔ اس عبارت سے یہ صاف ظاہر ہے کہ حق تک پہونچنے میں امام صاحب کو بڑے مصائب و نوائب سے دوچار ہونا پڑا تھا اور بالآخر انھوں نے تصوف کے دامن میں پہنچ کر فلسفہ سے اپنی بیزاری کا اعلان کیا تھا۔ امام صاحب کی عقلی زندگی کی مفتاح اسی کو قرار دینا چاہیے۔

تحقیق حق کے لئے امام صاحب کی مساعی آزاد بحث اور وسعت نظر

ان کے اعتراف سے یہ چیز بھی مترشح ہے کہ وہ اپنے عنفوان شباب میں سن بلوغ سے تیس سال عمر تک پہنچنے سے پہلے اور اپنی وفات سے پانچ سال قبل پچاس سال کی عمر تک کامل آزادی کے ساتھ حل اسرار میں منہمک رہے اور کشف اسرار و حل رموز کی ان مساعی میں انہوں نے مختلف فرقوں کے حق و باطل اور ان کے پابند سنت یا بدعتی ہونے کو حائل نہ ہونے دیا۔ اس طرح تحقیق حق کے دوران میں اگر ایک طرف انھوں نے فلسفہ اور فلاسفہ کا غائر مطالعہ اور قربت و اتصال سے فلسفہ کے راز ہائے سربستہ پر علم و اطلاع پانے کے لئے مواقع پائے تو دوسری طرف متکلمین کے مجادلات کی حقیقی غرض و غایت دریافت کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ صوفی کا مطالعہ اگر اسرار تصوف سے واقفیت کے لئے کیا تو زنادقہ، ملاحدہ، منکرین و معطلین کی دراست اس غرض سے کی کہ الحاد، زندقہ اور انکار و تعطل کے واقعی اسباب کا سراغ لگائیں۔ امام صاحب کی اس آزاد بحث و تحقیق اور درس و مطالعہ سے ان کی وسیع النظری، بلند خیالی اور سلامتی قلب کا پتہ چلتا ہے۔ ایک سچے محقق کے لئے جس میں حقیقت تک پہونچنے کی واقعی لگن پائی جاتی ہو اس کے بغیر چارہ بھی تو نہیں ہے کہ ان تمام مذاہب کا تفصیلی جائزہ لے جہاں حقیقت کا کچھ بھی شائبہ ہو۔

امام صاحب اور کانٹ

دورِ جدید کے فلاسفہ میں کانٹ نے بھی اپنی جلیل القدر تصنیف "نقدِ عقلی" میں امام صاحب ہی کے اس اسوۂ حسنہ کی تقلید کی ہے۔ نہ صرف زندگی کے ابتدائی مراحل بلکہ عنفوانِ شباب ہی سے ہم امام صاحب میں حقائقِ اشیاء تک رسائی کا ایک فطری ذوق اور تڑپ اور قدرتی جذبہ پاتے ہیں۔ محض اس وجہ سے کہ تحقیقِ حق ہی ان کا تنہا مقصد تھا۔ انھوں نے اپنی ان طبعی خصوصیات کو آخر دم تک اپنا مذہب و مسلک بنائے رکھا اور اسی کے نتیجہ کے طور پر موروثی عقائد اور تقلید کے جوئے کو انھوں نے اپنی گردن سے اتار پھینکنے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی ایک مثال سے جو انھوں نے پیش کی ہے ان کے اصول کی متانت اور رائے کی اصابت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کا قول ہے کہ جب یقینی طور پر جان لیں کہ دس کا عدد تین سے بڑا ہے تو کسی قائل کے اس قول کو تین کا عدد دس سے بڑا ہوتا ہے محض اس دلیل کی بناء پر کہ وہ لکڑی کو اژدھا بنا سکتا ہے اور بالفعل بنا بھی دے اور امام صاحب بچشم خود اس کا مشاہدہ بھی کرلیں اس کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ یعنے وہ اپنے اس سابقہ یقین یعنے "دس تین سے بڑا ہے" میں تبدیلی کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ اس خرقِ عادت سے ان کو اس شخص کی غیرعادی قدرت پر حیرت تو ضرور ہوگی جو اس کو لکڑی کے اژدہا بنانے پر حاصل ہے۔ رہا اپنے علم و یقین کے متعلق شک و شبہہ تو قطعاً نہیں۔ بالآخر امام صاحب نے یہ دریافت کرلیا کہ تاوقتیکہ اس درجہ کا موکد اور یقینی علم نہ حاصل ہو کسی علم پر اعتقاد و بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی نظر میں اس علم کی کوئی قیمت ہی نہیں جو یقین اور اطمینان کی نعمت سے محروم ہو۔

امام صاحب اور فلسفہ حسیہ

امام صاحب کے متعلق ایک عجیب واقعہ کا اظہار کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ڈیوڈ ہیوم (David Hume) ایک مشہور اور نامور انگریز فلسفی سے چھ یا سات صدی پہلے فلسفہ حسیہ کو اپنا فکری مسلک بنانے میں پیش قدمی کی تھی اور جب ہم اس حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں کہ جرمن فلسفی کانٹ (Kant) کے ارتقائے فکری سے ڈیوڈ ہیوم کو بڑا دخل رہا ہے

جس کا خود کانٹ نے ان الفاظ میں اعتراف کیا تھا کہ اس کو خواب غفلت سے کسی نے بیدار کیا تو وہ ہیوم ہی تھا تو ہم بآسانی اس دقیع اثر کا اندازہ کر سکتے ہیں جو امام صاحب کی عقل و درایت اور ذوق آگہی نے یورپ کے ان رفیع المرتبت اور متبحر روزگار جدید فلاسفہ کی فکری تکوین میں کیا ہے۔
جس زمانہ میں امام صاحب نے تحقیق حق کے لئے علوم دارجہ کا تفصیلی جائزہ لیا تھا تو بجز حسیاتی و بدیہاتی علم کے کسی ایسے علم تک ان کی رسائی نہ ہوئی جس کو یہ صحیح معنے میں علم کہہ سکتے۔ اس ضمن میں خود ان کا یہہ اعتراف شاہد عدل ہے کہ یاس اور ناامیدی کی اس گھٹاٹوپ میں مشکلات اور پیچیدگیوں کے حل کی اگر کوئی صورت دکھائی دیتی ہے تو حسیات و بدیہات ہی کے ذریعہ۔ اسی بناء پر امام صاحب نے ان حسیات و بدیہات کے احکام و تحقیق کو مقدم قرار دیا تاکہ اس جانب سے پوری طرح اطمینان ہو جائے کہ محسوسات پر اعتماد اور بدیہات میں خطا سے احتراز اسی طرح کا ہے جس طرح کہ پہلے تقلیدات میں تھا۔ علوم فلسفہ کے درس و بحث سے فرصت پالینے اور ان کے جن مسائل سے اتفاق تھا ان کا اعلان اور جن سے اختلاف تھا ان کی تردید و تکذیب کر چکنے کے بعد بھی ان کو اطمینان حاصل نہ ہوا اور یہہ محسوس کیا کہ اپنے بلند تر مقصد کی تکمیل کیلئے یہ علوم بھی کارآمد نہیں۔

امام صاحب اور تعلیمی مسلک

اب ان کی نظر تعلیمی مسلک اور اس سے متعلق مباحث کی تحقیق کی طرف مائل ہوئی۔ لیکن قبل اس کے کہ امام صاحب نے اس مسلک کا مطالعہ شروع کیا ہو اس نتیجہ تک ان کا ذہن کانٹ سے بہت پہلے پہنچ چکا تھا کہ عقل میں یہہ سکت نہیں ہے کہ ہر گونہ مطالب و معانی کا مستقل طور پر احاطہ کر سکے اور نہ ہر قسم کی مشکلات کے حل ہی کی اس کو قدرت حاصل ہے۔ اسی جدید عقیدہ کی روشنی میں جس کو ان کی عقلی تکوین کا تیسرا مرحلہ قرار دیا جاسکتا ہے (اس لئے جیسے کہ ہم نے معلوم کرلیا کہ پہلا مرحلہ تقلید کا تھا۔ دوسرا متکلمین او فلاسفہ کے اقوال سے بحث و تنقید کا) امام صاحب نے باطنیہ فرقہ کے اصول کی فلسفیانہ دراست ابتداءً ان کے کتابوں کے جمع کرنے اور ان کے ترتیب دینے سے شروع کی۔ یہہ ترتیب اس درجہ محکم اور محققانہ اور اس فرقہ کے

نقطۂ نظر کی اتنی شرح و بسط کے ساتھ توضیح تھی کہ خود ان کے ہمعصر علماء نے اس فرقہ کے دلائل کی توضیح و تشریح میں ان کے اس مبالغہ کو ناپسند کیا تھا اور یہ کہنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ یہ تو اس گروہ کے خیالات کی صریح وکالت ہے علمائے اسلام کا یہ کوئی نیا اعتراض نہ تھا۔ احمد ابن حنبل نے حارث المحاسبی کی معتزلہ کے رد میں لکھی ہوئی کتاب کو ناپسند کیا تو حارث نے یہ جواب دیا کہ بدعت کی تردید فرض ہے لیکن ابن حنبل نے کہا کہ یہ تو درست ہے "مگر تم نے اہل بدعت کے شبہات کو پہلے بیان کیا ہے اور اس کے بعد ان کا جواب دیا ہے لیکن تمہارے لئے اس اطمینان کے کیا اسباب ہیں کہ کسی مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں صرف شبہات ہی چسپاں ہو کر رہ جائیں اور وہ اُن کے جواب کی طرف یا تو التفات ہی نہ کرے اور اگر التفات کرے بھی تو ان کی حقیقت کے سمجھنے سے قاصر رہے" ابن حنبل کا ارشاد انہی شبہات کی حد تک درست ہو سکتا ہے جو اعلان و شہرت نہ پائے ہوں لیکن جو شبہات کہ پھیل چکے ہوں ان کا تو جواب دینا ہی واجب ہوگا اور جواب اسی وقت دیا جا سکتا ہے جبکہ ان شبہات کو ان کی حقیقی صورت میں پیش کر دیا جائے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس فرقہ تعلیمیہ کے مذہب کی تردید میں ذاتی شغف کے علاوہ سیاسی محرکات نے بھی امام صاحب کو آمادہ کیا تھا اس لئے کہ باطنی مذہب کی اشاعت عوام الناس میں اس عقیدہ کو پھیلانے کا موجب ہو رہی تھی کہ قائم بالحق امام معصوم ہی کے ذریعہ حقائق امور کی معرفت ممکن ہے خلیفۂ وقت نے ان خیالات کے رواج پانے سے خلافت کی بنیادیں متزلزل ہوتے دیکھیں تو امام صاحب کو اس فرقہ کی تردید و مخالفت پر آمادہ کیا۔ چنانچہ امام صاحب اس بارے میں خود لکھتے ہیں کہ اس کے بعد یہ صورت پیش آئی کہ دربار خلافت سے ایک ایسی کتاب کی تصنیف کے بارہ میں حکم ہوا جو اس گروہ کے مذہب کی حقیقت کو آشکارا کر سکے۔ اس حکم کی تعمیل کے سوائے میرے لئے چارہ کار نہ تھا البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس حکم نے اصل باعث اور محرک کی فوری عمل کی طرف رہنمائی کی حسن تعلیل کی اس سے زیادہ لطیف مثال شاید ہی ملے۔ طبقہ تعلیمیہ کے مسلک سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ سیاست اور شریعت کا درحقیقت ایک مرکب ہے۔ جس میں سیاست کا پہلو غالب اور تھوڑی سی فلسفہ کی بھی آمیزش ہے جس کو ان لوگوں نے اپنے مذہب کی ترویج کے لئے آلہ کار بنایا تھا تاکہ اس طریقہ سے وہ اپنے مسلک کو حکمت کا رنگ دے سکیں

چنانچہ فیثاغورث کے بعض اقوال کی انھوں نے پیروی کی ہے۔ اس بنا پر یہ بحث فلسفہ سے یکلخت بیگانہ نہ رہی اور جب کبھی اس گروہ کو ان اشکالات کا سامنا ہوا جن کو وہ سمجھ نہ سکے اور ان کا حل ان کیلئے دشوار ہوا تو بلا تامل ان کی گرہ کشائی امام غائب منتظر کی ذات سے وابستہ کر دی جس کی ناکام تلاش ان کی زندگی کی نمایاں صفت بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ "المستظہری"، "مفصل الخلاف"، "کتاب الدرج" اور "القسطاس المستقیم"، امام صاحب کی اسی سلسلہ کی کتابیں ہیں۔

امام صاحب کا تصوف کی طرف میلان

اس آخری بحث و تحقیق نے امام صاحب کو صوفی مسلک کی طرف کلیتاً مائل کر دیا جس کو درحقیقت ان کی طبیعت سے پوری طرح مناسبت تھی۔ اب امام صاحب نے اپنی توجہ کو سمیٹ کر اسی ایک طریقہ کی درآمد پر مرتکز کر دیا ظاہر ہے کہ عمل کے مقابلہ میں علم زیادہ سہل اور آسان ہوا کرتا ہے صوفیاء کی کتابوں اور ان کے رسائل کا امام صاحب نے پوری طرح مطالعہ کیا۔ ابوطالب مکی، حارث محاسبی، جنید، شبلی، اور ابویزید بسطامی کی اہم تصانیف ان کی نظر سے گذریں تعلیم اور سماع کے ذریعہ ان صوفیاء کے طریقوں سے متعلق جس قدر ممکن تھا انھوں نے حاصل کیا لیکن بالآخر امام صاحب نے محسوس کیا کہ جو خاص الخاص باتیں ان کے طریقہ کی ہیں وہ سیکھنے سے نہیں آتیں بلکہ ذوق حال اور صفات کی تبدیلی سے پیدا ہوتی ہیں صحت، بھوک اور نشہ کی تعریف ان کے اسباب اور شروط کا علم اور نفس الامر میں صحت مند شکم سیر اور مخمور ہونے میں زمین و آسمان کا فرق ہے ایک شخص صحت اور شکم سیری کی تعریف جان سکتا ہے اور ان کے اسباب و شرائط پر بخوبی حاوی ہوسکتا ہے مگر اس سے وہ صحت مند اور شکم سیر نہیں ہو جاتا۔ زہد کی حقیقت اور شرائط کا دریافت کر لینا ایک اور چیز ہے اور زاہد بن جانا ایک دوسری چیز۔ متصوفہ کی حقیقت سے جس کسی نے بھی بحث کی ہے وہ قطعیت کے ساتھ جانتا ہے کہ صوفیاء کرام قوال ہونے کے بجائے ایک خاص کیفیت اور حالت کے مالک ہوا کرتے ہیں۔ امام صاحب کے لئے لکڑی کا سانپ کی شکل میں بدل جانا استعجاب و حیرانی کا موجب تو ضرور ہوا تھا لیکن اس کو علم الیقین کے انکار کی دلیل یا وجہ قرار دینا دشوار تھا۔ تصوف کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد یہ کہتے ہوئے ان کو کوئی تامل نہیں ہوا

کہ علوم عقلیہ وشرعیہ کی تحقیق و تفتیش کے لئے انھوں نے جن راستوں کو اختیار کیا اور جن علوم کی دراست کا موقع پایا ان سب چیزوں نے ان میں اللہ تعالےٰ، نبوت اور یوم جزا کے متعلق ایک غیر متزلزل اور یقینی ایمان پیدا کر دیا۔ اور ایمان کے یہ تینوں اصول ان کے نفس میں کسی معین اور مجرد دلیل و برہان کی بنا پر نہیں راسخ ہوئے جس طرح کہ اس چیز نے جگہ پائی تھی کہ دس کا عدد تین سے بڑا ہے۔ بلکہ ایسے قرائن و تجارب اور حالات ان اصول کے راسخ ہونے کا باعث ہوئے جن کی توضیح حیطۂ اقتدار سے باہر ہے۔ یہ تقاضائے سن اٹھ وسے کہ تقریباً اپنی پوری عمر مکارم اخلاق میں بسر کر دی تھی امام صاحب نے یہ معلوم کر لیا کہ عقبیٰ کی سعادت کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ اور وہ تقویٰ و طہارت اور نفس کا لذات سے احتراز و اجتناب جس کا نتیجہ دنیا سے تنفر اور بے تعلقی اور دار الخلود سے کامل تعلق اور ارتباط اور ذات واجب کے تنہا مقصود اور مطلوب ہو جانے پر ہے۔ چونکہ جاہ و حشمت و مال و دولت اور شان و شوکت وغیرہ دنیاوی مطالب ہی اس اشرف ترین غرض کی تحصیل میں مانع و مزاحم ہوا کرتے ہیں اس لئے ان سے اعراض و روگردانی ہی کو انھوں نے مقدم ترین فرض قرار دیا۔

قطع علائق دنیوی کیلئے امام صاحب کی مردانہ وار مساعی اور بغداد سے کوچ

خود امام صاحب کو اپنی عظمت اور شوکت کے ترقی یافتہ دور میں ان مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا یہ وہ وقت تھا جب کہ دنیاوی تعلقات نے چاروں طرف سے ان کو گھیر رکھا تھا اور تدریس و تعلیم جو ان کی زندگی کا اہم ترین مشغلہ بنا ہوا تھا وہ بھی خود ان کے اعتراف کے بموجب طلب جاہ اور شہرت و ناموری کے اثرات سے پاک نہ تھا۔ کامل چھ ماہ تک ان حالات سے نجات پانے کے لئے امام صاحب بغداد سے چلے جانے کا قصد کرتے رہے تھے لیکن کبھی شیطانی وساوس اور خواہشات نفسانیہ کے لشکر حملہ آور ہو کر ان کو مغلوب کر دیتے تھے اور کبھی دنیاوی لذائذ ان کو اپنے شکنجہ میں زیادہ سے زیادہ جکڑتے تھے اور کبھی عالم خلود کی غیر فانی نعمتیں اپنی پوری دلآویزی کے ساتھ ان کو اپنے قابو میں کر لیتیں چھ ماہ تک اس کشاکش و تردد میں رہ کر بالآخر وہ بیمار ہو گئے اور اطبا نے ان کے صحت یاب ہونے کے متعلق اپنی مایوسی کا اظہار کر دیا۔ انہی مضطرب اور پریشان حالات میں خلیفہ اور درباریوں سے اپنے

عزائم کو مخفی رکھ کر شام جانے کے بہانہ سے کسی نہ کسی طرح اس عزم کے ساتھ بغداد سے نکل کھڑے ہوئے کہ پھر کبھی واپس نہ ہوں گے۔ شام پہونچ کر عزلت و خلوت، مجاہدہ اور ریاضت میں امام صاحب نے دو سال بسر کئے اور تزکیہ نفس، اصلاح باطن، تہذیب اخلاق اور ذکر الٰہی سے تصفیہ قلب میں ہمہ تن منہمک و مصروف رہے۔ یہاں سے انھوں نے بیت المقدس کا رخ کیا جہاں ان کو ریاضت، مجاہدہ اور توجہ الی اللہ میں کمال استغراق کے مزید مواقع ہاتھ آئے۔ اس کے بعد حج کا ارادہ کر کے مکہ اور مدینہ منورہ کے برکات و فیوضات سے مستفید ہوئے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی زیارت سے فارغ ہو کر سرور کائنات صلعم کی زیارت سے مشرف ہوئے یہاں سے حجاز کا رخ کیا۔

صوفی مسلک کے ایک عظیم المرتبت داعی کی حیثیت سے امام صاحب کی وطن کو مراجعت

اہل و عیال کی کشش نے ان کو یہاں سے وطن لوٹنے پر مجبور کیا۔ دس سال تک یہی نشیب و فراز رہا۔ اس طویل ریاضت و تزکیہ نفس کے بعد جس چیز نے ان کو مطمئن کیا وہ ان کا یہ یقین تھا کہ حق تعالیٰ کی معرفت کے لئے اگر کوئی مسلک مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے تو صوفیا ہی کا مسلک ہے صوفیاء سے امام صاحب کے کامل اتصال اور ان کے اصول اور تعلیمات کے گہرے درس و مطالعہ نے ان کو پوری طرح یقین دلا دیا کہ صرف صوفیا ہی کے اخلاق و عادات میں نجات ہے۔ جو مشکوٰۃ نبوت کے نور سے مستفیض ہیں۔

تصوف کا دار و مدار مجاہدہ اور ریاضت پر ہے اور اسی سے مشاہدات اور مکاشفات تک رہبری ہوتی ہے اہل کشف عالم بیداری میں ان چیزوں کو دیکھ اور سن سکتے ہیں جن کا دیکھنا اور سننا عام حالات میں ناممکن اور محال ہوتا ہے اور اس طرح مذہب سے متعلق ان تمام چیزوں کا ان کو کامل اذعان و یقین ہو جاتا ہے جو غیر صوفی کے لئے چیستاں بنی ہوئی ہیں۔ بالآخر صوفی اپنے مجاہدہ اور ریاضت سے اس بلند ترین مقام تک رسائی پاتا ہے جس کو اصطلاح میں وصول، اتحاد اور حلول جیسے مختلف ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے جس سے مراد قرب الٰہی کا انتہائی کمال ہے۔

امام صاحب ایک عقلی فیلسوف ہیں یا مذہبی حکیم

امام صاحب کے ذہنی تکوین وفکری رجحانات، افتادِ طبع اور افکار وخیالات سے ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ وہ ایک عقلی فیلسوف سے بڑھ کر مذہبی حکیم کہلانے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔ علم، عقل، شریعت اُسی حد تک اُن کے مرغوب خاطر دکھائی دیتے ہیں جس حد تک کہ وہ ان کی طبیعت سے میل کھا سکیں۔ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ہم کو امام صاحب کی عقل وفراست سے انکار ہے۔ یونانی اور اسلامی فلاسفہ کی دراست کے زمانہ میں جہاں وہ خود مستفید ہوئے فلسفہ کو بھی ان کی ذات سے معتدبہ فائدہ پہونچا۔

تقلیدی عقاید سے امام صاحب کی بیزاری

اپنی متجسس طبیعت کے ہاتھوں امام صاحب اپنے زمانہ کے تقریباً تمام فرقوں کے خیالات اور عقائد کی تہ تک پہونچنے کی کوشش پر مجبور ہوئے تلاشِ حق کے اس جذبہ نے ان کے اندر ایک نمایاں انقلاب پیدا کر دیا۔ تقلید کی گرہیں اب ڈھیلی ہونے لگی تھیں اور تقلیدی عقائد کی حقیقت کے تسلیم کرنے میں اب ان کو تامل ہونے لگا تھا۔ اس حق کے یہ متلاشی تھے جس میں شک وشبہہ کی گنجایش نہ ہو اور اس تک رسائی کی کوئی صورت نہ دیکھائی دیتی تھی جس قدر زیادہ اساطین سلف کی تصانیف پر انھوں نے غور کیا ان کے شبہات بڑھتے گئے۔

فلسفہ کی دنیا میں امام صاحب کو پناہ نہ ملی

خیال ہوا کہ فلسفہ کی دنیا میں پناہ ملے گی اس کے مقدمات اور اصول کا انھوں نے کامل انہماک کے ساتھ مطالعہ شروع کیا لیکن نتیجہ ان تمام مساعی کا اور بھی زیادہ یاس آفرین رہا۔ اب وہ ہر چیز کے قطعی انکار کے طرف مائل ہوئے حتیٰ کہ اوس علم میں بھی جو حسیات اور بدیہات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے شک کرنے لگے۔ "المنقذ من الضلال" امام صاحب کی اُسی دورِ انتشارِ خیالی کا صحیح مرقع ہے۔ اپنے بعض احباب کے استفسار کے جواب میں امام صاحب نے یہ کتاب لکھی تھی۔ اس میں اُنھوں نے ان مشکلات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جو مختلف مباحث

فلسفہ کی تعلیم اور مبادی حق و باطل میں امتیاز و تفریق کے وقت سد راہ ہوا کرتے ہیں

محسوسات اور معقولات کے ناقابل تشفی ہونے کی توجیہہ

حسی اور عقلی معلومات کے ناقابل تسلیم ہونے کی انھوں نے اس طرح توجیہہ کی ہے کہ انسان کی حیثیت اور عقلیت حالات کے تابع ہوا کرتی ہے۔ حالات کی تبدیلی حس اور عقل میں بھی تبدیلی کا سبب بن جاتی ہے ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ کسی ایک حکم عقلی پر اطمینان ممکن نہیں حالات کی تبدیلی سے سابقہ عقلی احکام اکثر بدلتے رہتے ہیں کسی ایک عقلی حکم کو دوسرے عقلی حکم کے ساتھ وہی نسبت ہوا کرتی ہے جو بیداری کو خواب سے ہوتی ہے۔ اس بناء پر یہہ کس طرح ممکن ہے کہ حس اور عقل کے ذریعہ جو علم حاصل ہو وہ یقین کا درجہ حاصل کرے۔

مذہبی اختلافات کے لحاظ سے فلاسفہ کی تقسیم

مذہبی اختلافات کے لحاظ سے امام صاحب نے فلاسفہ کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر ایک کی تکفیر کو واجب قرار دیا ہے۔

پہلا طبقہ دہریہ کا ہے۔ جو صانع عالم یعنے خدا کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ عالم ہمیشہ سے اپنے آپ موجود تھا کسی نے اس کو بنایا نہیں حیوان، نطفہ سے اور نطفہ حیوان سے ہوتا رہا ہے اور یوں ہی ہمیشہ ہوتا رہے گا امام صاحب نے ان لوگوں کو زندیق کہا ہے۔

دوسرا طبقہ طبعیین کا ہے۔ ان لوگوں نے اگرچہ طبیعت کے نت نئے عجائب اور کائنات کے عجیب و غریب نظم و نسق پر غور کر کے مجبوراً ایک قادر مطلق کے وجود کو تسلیم کیا ہے لیکن ساتھ ہی قوائے حیوانی کی تکوین میں اعتدال مزاجی کی زبردست تاثیر کے بھی قائل ہیں۔ انسان کی قوت فاعلہ کو اوس کے مزاج کے تابع مانتے ہیں جس کے یہہ معنی ہیں کہ مزاج کا بطلان اس قوت فاعلہ کے بطلان کا موجب ہوتا ہے۔ اور جب یہہ ایک مرتبہ معدوم ہو جائے تو پھر اس کا اعادہ ان کے نزدیک ناممکن ہے۔ اس بناء پر ان کے عقیدے میں حشر اجساد اور اعادۂ نفس محال ہے اسی کے نتیجہ کے طور پر انھوں نے آخرت کی سزا و جزا جنت و دوزخ کا بھی سرے سے انکار کر دیا۔ امام صاحب نے ان لوگوں کا بھی شمار زنادقہ میں کیا ہے کیونکہ انھوں نے تو ہر قسم کے قیود سے آزاد ہو کر شہوات نفس کی غلامی کو اپنا

طرۂ امتیاز قرار دیا۔

فلاسفہ کا تیسرا مرکزی گروہ الٰہیین کا ہے جس کے متعلق امام صاحب فرماتے ہیں کہ یہ فرقہ متاخرین فلاسفہ کا ہے جن میں افلاطون، سقراط، اور ارسطاطالیس داخل ہیں۔ اگرچہ تمام فلاسفہ نے دہریین اور طبعیین کی تردید کی ہے بلکہ ارسطاطالیس نے تو خود اپنے استاذ افلاطون اور سقراط اور اُن تمام فلاسفہ الٰہیین کی جو اس سے پہلے تھے تردید کی۔ تاہم اس کے مذہب میں بھی کچھ کچھ رذائل کفر باقی رہ گئے ہیں۔

فارابی اور ابن سینا کی تکفیر سے متعلق چند ملاحظات

اس بنا پر امام صاحب نے اس کی اور ان کی بھی جو فلاسفہ اسلامین سے ان کے پیرو ہیں جیسے کہ ابن سینا اور فارابی وغیرہ سب کی تکفیر واجب بتائی ہے طبعیین، دہریین اور عام فلاسفہ الٰہیین کی تکفیر تو ظاہر ہے لیکن ابن سینا اور فارابی اور ان کے امثال کی تکفیر کو واجب قرار دینا یقیناً ہمارے لئے اچھبے کا باعث ہوا۔ امام صاحب جیسی عظیم المرتبت، وسیع النظر اور بلند فکر ہستی سے جن کو عام تنگ نظر اور متعصب علماء کے مقابلہ میں بہرحال ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ کبھی توقع نہ ہو سکتی تھی کہ کفر کے دائرہ کو وہ اس قدر وسیع فرمائیں گے۔

کفر و ایمان کے حدود کے تعین میں امام صاحب کی مجتہدانہ بلند نظری

زیادہ تعجب اس لئے ہوتا ہے کہ خود امام صاحب نے اپنی دوسری تصانیف میں کفر و ایمان کے حدود فاصلہ کے تعین میں زیادہ وسعت نظر سے کام لیا ہے۔ انھوں نے کفر و ایمان کی جانچ پڑتال کے لئے جو اصول وضع فرمائے ہیں ان کی روشنی میں فلاسفۂ اسلام کے متعلق یہ شدت یقیناً ناقابل فہم ہو جاتی ہے۔ "التفرقہ بین الاسلام والزندقہ" میں امام صاحب اپنے دوست کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ "اگر تم کفر کی حد جاننی چاہو تو میں تم کو اس کی نشانی جو سب جگہ اور ہر طرح ٹھیک آوے بتا دوں تاکہ تم لوگوں کو جب تک وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر یقین رکھتے ہیں ناحق کافر نہ کہو اور اہل اسلام کے حق میں زبان درازی نہ کرو گو کہ ان کے

طریقے کیسے ہی مختلف ہوں۔ لہٰذا سمجھ لو کہ کفر رسول اللہ صلعم کی تکذیب ہے اور جو کچھ ان پر نازل ہوا ہے اس کو جھٹلانا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو کافر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلعم کی تکذیب کرتے ہیں اور براہمہ اس لئے کافر کہ تمام رسولوں کو جھٹلاتے ہیں اور دہریئے بھی کافر ہیں کہ وہ رسولوں کو نہیں مانتے۔ کفر ایک حکم شرعی ہے جس کا مطلب خلود فی النار ہے اور اسکی پہچان بھی شرعی ہے کہ نص شرعی یا قیاس سے پہچانا جاتا ہے۔ یہود اور نصاریٰ کے حق میں نص موجود ہے۔ براہمہ و بت پرست اور زندیق اور دہریہ انہیں کے ساتھ ہیں۔ کیونکہ وہ رسول کی تکذیب کرتے ہیں اور جو رسول کی تکذیب کرتا ہے وہ کافر ہے یہی علامت ہے جو الٹ پلٹ کر سب طرح ٹھیک آتی ہے"۔

اس فاضلانہ تقریر اور مبصرانہ و محققانہ بیان ہی پر امام صاحب نے اکتفا نہیں کی ہے جو تنہا بوعلی سینا اور فارابی کی گلو خلاصی کے لئے کافی تھا بلکہ اس کے بعد جو لکھا ہے وہ در حقیقت تحقیق کا ایک دریائے شفاف اور الہام ربانی دکھائی دیتا ہے فرماتے ہیں کہ "جو بات ہم نے بیان کی وہ نہایت غور و خوص کے قابل ہے ہر ایک فرقہ دوسرے فرقہ کی تکفیر کرتا ہے اور اس پر رسول کی تکذیب کی تہمت دھرتا ہے۔ حنبلی اشعری کو کافر کہتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ اوس نے جو خدا کے لئے اوپر کی جہت ثابت کی ہے اور عرش پر خدا کا بیٹھنا مانا ہے تو اوس نے اس طرح رسول کی تکذیب کی ہے۔ اور اشعری حنبلی کی کافر کہتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ وہ خدا کی تشبیہہ کا قائل ہے اور رسول اکرم روحی فداہ نے تو کہا ہے "لیس کمثلہ شئی" اس لئے وہ رسول کی تکذیب کرتا ہے اور اشعری، معتزلی کو اس خیال سے کافر بناتا ہے کہ اس نے خدا کی رویت اور اس کے علم و قدرت اور دیگر صفات کے قائم فی الذات ہونے سے انکار کرنے میں رسول کی تکذیب کی ہے اور معتزلی اشعری کو اس خیال سے کافر بتاتا ہے کہ صفات کو عین ذات ماننا تکفیر فی الذات ہے اور توحید ذات باری میں تکذیب رسول کی ہے پس ان جھگڑوں سے نکلنا جب تک کہ تکذیب و تصدیق کی حقیقت نہ سمجھی جائے مشکل ہے"۔

تصدیق کی حقیقت اور مدارج وجود۔

تکذیب و تصدیق کی حقیقت امام صاحب نے یہ بتائی ہے کہ کسی خبر کی تصدیق صرف اس خبر ہی تک نہیں ٹھہرتی بلکہ مخبر تک پہونچتی ہے اور اس کی حقیقت اوس خبر کے وجود کو تسلیم کرنا ہے جس کے وجود کی خبر رسول نے دی ہے۔ لیکن وجود کے پانچ درجے ہیں اُن کے نہ جاننے ہی سے ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو کافر بناتا ہے اور وجود کے پانچ درجوں کی امام صاحب نے اس طرح تشریح کی ہے۔

(۱) وجود ذاتی حقیقی وجود ہوتا ہے جو خارج میں موجود ہو اور حس اور عقل اس کو سمجھے جیسے آسمان اور زمین۔ جانور اور نباتات کا وجود جو حقیقتاً موجود ہے اور سب جانتے ہیں بلکہ اکثر ان سے بجز ان کے وجود کے کوئی معنے ہی نہیں سمجھتے۔

(۲) وجود حسی ایسا وجود ہوتا ہے جو آنکھ میں محسوس ہوتا ہے مگر خارج میں اس کا وجود نہیں ہوتا اس کا وجود صرف حس ہی میں ہوتا ہے۔ اور حس کرنے والا ہی اس کو دیکھتا ہے۔ اور کوئی دوسرا شخص اس کو نہیں دیکھتا جیسے کہ مریض جاگنے میں بعض دفعہ طرح طرح کی صورتوں کو اسی طرح دیکھتا ہے جیسے کہ وہ تمام اور موجودات خارجی کو جو وجود حقیقی رکھتے ہیں دیکھتا ہے حالانکہ ان کا وجود خارج میں کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ کبھی انبیار اور اولیار اللہ کو صحت کی حالت اور جاگنے میں ایک خوبصورت شکل میں جو فرشتہ کی خیال کی جاتی ہے دکھائی دیتی ہے اور اس کے ذریعہ سے ان تک وحی والہام پہونچتا ہے جیسے کہ حضرت مریم کو ایک آدمی کی صورت دکھائی دی تھی جس کی نسبت خدا نے فرمایا ہے "فتمثل لھا بشرا سویا" اور جیسے کہ آنحضرت صلعم نے جبرئیل کو بہت طرح کی صورتوں میں دیکھا ہے اور اصلی صورت میں صرف دو دفعہ ہی دیکھا ہے۔

(۳) وجود خیالی ان محسوس چیزوں کی صورتیں ہیں جو ہم کو دکھائی دیتے ہیں جبکہ وہ ہمارے سامنے موجود نہ ہوں۔ مثلاً آنکھ بند کرتے ہی ہاتھی اور گھوڑے کی صورت اپنے خیال میں پید

کر سکتے ہو گو یا اس کو دیکھ رہے ہو اور وہ ہو بہو پوری صورت کا سامنے موجود ہے۔ مگر موجود فی الخارج کچھ بھی نہیں۔

(۴) وجود عقلی۔ ہر ایک چیز کی ایک حقیقت اور اس کے لئے کوئی معنے یعنے غایت ہے پس جبکہ عقل اسی شئی کو غایت و مقصد کی طرف بلا لحاظ اوس کی صورت ذاتی یا خیالی یا حسی کے منتقل ہوئی تو اوس شئے کا وجود وجود عقلی ہوتا ہے مثلاً ہاتھ اوس کی ایک۔ تو صورت موجود فی الخارج ہے جو اس کا وجود ذاتی ہے اور ایک اس کا وجود حسی ہے اور ایک وجود خیالی ہے جس کی تفصیل اوپر بیان ہوئی۔ مگر اس کے سوا ہاتھ کے لئے ایک معنی بھی ہیں جو دراصل اوس کی حقیقت اور غایت ہے اور وہ کیا ہے۔ پکڑنے کی قدرت اور یہی عقلی ہاتھ ہے اور مثلاً قلم اس کی ایک صورت ہے مگر اس کے لئے ایک معنی بھی ہیں اور وہ کیا ہیں علوم کو نقش کر دینا اور اس امر کو بغیر اس کے کہ قلم کو لکڑی یا نیزہ یا پر یا دھات کی صورت پر خیال کیا جائے عقل تسلیم کر لیتی ہے اور یہی اس کا وجود عقلی ہے۔

(۵) وجود شبہی وہ ہے کہ نفس شئے موجود نہ ہو نہ حقیقت میں اور نہ فی الخارج اور نہ فی الحس اور نہ فی الخیال اور نہ فی العقل بلکہ ایک ایسی چیز موجود ہو جو اوس کی کسی خاصیت یا صفت میں مشابہ ہو اس کی مثال امام صاحب نے خدا کی طرف غصہ اور شوق اور صبر اور اسی طرح کی باتوں کی نسبت کرنے کی دی ہے وہ فرماتے ہیں کہ مثلاً غضب اس کی حقیقت دل میں خون کا جوش مارنا ہے اس مقصد سے کہ غصہ کر کے تسکین حاصل ہو اور یہ بات نقصان اور رنج سے خالی نہیں پھر جس شخص کے نزدیک خدا کی نسبت ذاتی یا خیالی یا حسی یا عقلی طور پر غضب کو منسوب کرنا دلیل سے محال ثابت ہوا ہے تو وہ اس سے ایک اور صفت کو مراد لیتا ہے جو غضب پر مبنی ہوتی ہے۔ جیسے ارادۂ عقاب لیکن ارادۂ عقاب اور چیز ہے اور غضب اور چیز ہے۔ لیکن اس کی صفات میں سے ایک صفت کے قریب ہے اور ایک اثر ہے جو غضب سے صادر ہوتا ہے اور وہ خدا کی شان کے نامناسب نہیں ہے۔

ان پانچوں قسموں کے وجود کے حد درجہ بلیغ پیرایہ بیان اور نہایت عمدہ مثالوں سے ان کی تشریح و توضیح کے بعد امام صاحب نے فرمایا ہے کہ جو شخص شارع کے اقوال کو ان قسموں میں سے

کسی قسم پر تسلیم کرتا ہے تو وہ شارع کے قول کی تصدیق کرنے والا ہوگا۔ نہ کہ تکذیب کرنے والا۔ تکذیب تو جب ہی ہوگی جب وہ ان سب قسم کے معانی و مراد سے انکار کرے اور یہ گمان کرے کہ جو کہا ہے اس کے کچھ معنی نہیں ہیں اور وہ کذب محض ہے اور قائل کی غرض اس سے دھوکا دینا ہے یا دنیاوی مصلحت اور یہ محض کفر و زندقہ ہے اور تاویل کرنے والوں کو جب تک کہ وہ قانون تاویل کو پکڑے ہوئے ہیں جس کو ہم آگے بیان کریں گے، کفر لازم نہیں ہوتا۔

امام صاحب کے اپنے موضوعہ اصول کے لحاظ سے فارابی اور ابن سینا کی تکفیر کی حقیقت۔

امام صاحب کی اس حکیمانہ تشریح کے بعد خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی کلمہ گو کو آیا اس جرم کی پاداش میں کفر و زندقہ کی سزا کا مستحق قرار دینا حق بجانب ہوگا کہ وہ امام صاحب کی طرح عرش و کرسی اور جنت و دوزخ کے وجود ذاتی کو نہیں بلکہ ان کے وجود عقلی یا وجود شبہی کو تسلیم کرتا ہے۔ یا مثلاً اس کے نزدیک کسی دوسرے جسم غیر مرئی۔ اور غیر محسوس کا موذی للانسان یا ہادی للانسان ہونا محال ثابت ہوا ہے اور اس لیے وہ شیطان یا ملائک کے وجود خارجی کا منکر ہو کر اوس کا وجود فی نفس الانسان تسلیم کرتا ہے یا مثلاً لوح محفوظ اور قلم کا وجود ذاتی نہیں بلکہ وجود عقلی مانتا ہے۔ یا مثلاً وحی من اللہ میں کسی دوسرے کے واسطے کو بدلائل محال سمجھتا ہے اور وہ اسی قوت کو جو انبیاء میں ہے جس کے سبب ان پر نزول وحی ہوتا ہے اور جس کو ملکۂ نبوت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے جبرئیل تسلیم کرتا ہے اور اسی معنی کر کے جبرئیل کے حق ہونے کا بدل قائل ہے۔ انہی پر کیا انحصار ہے اسی قسم کے اور صدہا مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں اور یہ سوال بحالہ قایم رہتا ہے کہ کیو لا ایک شخص کو محض اس وجہ سے کافر و زندیق کہا جائے کہ وہ رسول کی دی ہوئی خبروں کے اوس وجود کو تسلیم نہیں کرتا جس کو امام صاحب یا امام صاحب کے ہم خیال تسلیم کرتے ہیں بلکہ ان اقسام خمسہ مذکورہ میں سے کسی اور ہی خاص قسم کے وجود کو تسلیم کرتا ہے نفس وجود کی حقانیت کا وہ قائل ہے۔ انکار تو صرف علماء کے متعین کئے ہوئے کسی خاص قسم کے وجود سے ہے یا مثلاً نفس تاویل کو

امام صاحب نے جائز قرار دیا ہے اور اپنے بنائے ہوئے قانون تاویل کے مطابق تاویل کرنے والے کی تکفیر سے منع کیا ہے۔ اب فرض کیجیے کہ ایک شخص نے تاویل میں امام صاحب کے اصول کی پابندی نہیں کی تو کیا محض اس وجہ سے کہ اوس نے امام صاحب کے بنائے ہوئے قانون تاویل کی مخالفت کی کافر ہو جائے گا۔ امام صاحب کی اس منطق کو بہت کوشش کے باوجود ہم نہیں سمجھ سکے جو انھوں نے عدم کفر کو اپنے بنائے ہوئے قانون تاویل سے مشروط کرنے میں برتی ہے۔ اشاعرہ، معتزلہ اور حنابلہ نے جو ایک دوسرے کو کافر کہا ہے تو صرف اس وجہ سے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو اپنے مسائل و مذہب کا پابند نہیں سمجھتا اس تکفیر کو تو امام صاحب ناجائز قرار دیتے ہیں لیکن اوس شخص کو کافر کہنے میں تامل نہیں کرتے۔ جو ان کے وضع کئے ہوئے قانون تاویل کا پابند نہیں بلکہ تاویل کے کسی اور ہی اصول پر عامل ہے اکثر مشاہیر فلاسفۂ اسلام کے کلمہ گو ہونے میں تو شاید امام صاحب کو بھی شک نہ ہو۔ قصور اگر انہوں نے کیا ہے تو صرف اس قدر کہ مسائل مذہب کی فہم و تفہیم کے لئے عام علمائے اسلام سے ہٹ کر اپنے لئے ایک علیحدہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ تاویل کرتا ہے تکذیب نہیں کرتا اور امام صاحب ہی کے بنائے ہوئے قانون تاویل کی پیروی کو اپنے لئے کوئی ضروری نہیں خیال کرتا اور یہ وہ طریق عمل ہے کہ جس کی بنا پر کسی کی تکفیر سے امام صاحب نے خود منع فرمایا ہے۔ اس کے باوجود امام صاحب نے بوعلی سینا اور فارابی وغیرہ کی تکفیر کو جو واجب قرار دیا ہے تو معلوم ایسا ہوتا ہے ایسا کرتے ہوئے بوعلی کا یہ شعر اون کے پیش نظر نہیں تھا۔

در دہر چو من یکے و آں ہم کافر
پس در ہمہ دہر یک مسلماں نبود

امام صاحب اور علوم فلسفہ

فلاسفہ کے علوم کی امام صاحب نے چھ قسمیں بیان کی ہیں۔

(۱) ریاضی (۲) منطقی (۳) طبعی (۴) الہی (۵) سیاستی (۶) خلقی۔ ان میں سے بجز الہیات کے امام صاحب کی نظر میں کوئی علم ایسا نہیں ہے جس کے مسائل دین سے متعارض ہوں۔ ریاضی

بلدہ سے قصبہ تک

(مجالس اضلاع و قصبات)

از جناب محمد فاروق صاحب بی۔اے۔ یچ سی یس دوم تعلقدار بودھن

گذشتہ بلدی کانفرنس میں جو بصدارت راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی مقرر ہوئی تھی اور اس کا باغ عامہ کی نمائش گاہ میں راجہ دھرم کرن بہادر صدر المہام تعمیرات و بلدیہ نے افتتاح فرمایا تھا یہ مضمون سنایا گیا تھا

جناب صدر!

مجھے اعتراف ہے کہ میرے اس مضمون کا عنوان کچھ زیادہ واضح نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اس کانفرنس کے اجلاس میں کچھ وقت کا اسلئے خواہاں ہوا کہ اس عنوان کے تحت اضلاع ملک سرکار عالی کی مجالس مقامی کی ترکیب و اختیارات نیز دائرۂ عمل کا مجلس بلدیہ حیدرآباد سے موازنہ و مقابلہ کرسکوں ضمناً قصبات ملک سرکار عالی میں بلدی آسایشوں کی فراہمی کے جو طریقے اختیار کئے گئے ہیں ان کا بھی تذکرہ کروں گا۔

جناب صدر! جہاں تک کہ اضلاع کی مجالس مقامی کا تعلق ہے ان کی فی الحال چار قسمیں ہیں مجلس ضلع مجلس تعلقہ، مجلس صفائی، مجلس قصبہ، مجلس قصبہ کیلئے ۵ ہزار کی آبادی کا لزوم ہے اسکے بعد ہی محاصل مقامی عاید ہوسکتے ہیں۔ بعض اضلاع مثلاً پربھنی کی حد تک مجلس ضلع مستقر ضلع کی مجلس قصبہ بھی ہے۔ اسطرح بعض تعلقات کی مجلس مستقر تحصیل کیلئے بھی کارفرما ہے۔ ضلع اورنگ آباد میں جالنہ اور عثمان آباد میں لاتور باوجودیکہ مستقر ضلع نہیں ہیں وہاں مجالس صفائی اختیارات کے لحاظ سے مجلس ضلع کے ہم پلہ ہے مجلس بلدیہ کے مقابل کہ جس میں ۳۶ ارکین شریک ہیں، مجلس قصبہ میں صرف ۱۰ یا ۱۲ ارکان ہوتے ہیں۔ یہی حال مجلس ضلع کا بھی ہے مجلس بلدیہ کے ارکین میں ۱۳ منتخب ہوتے ہیں۔ ۲۳ سرکار عالی سے نامزد ہوتے ہیں اور بقیہ ۱۰ یا تو طبقات کے منتخب کردہ یا علاقہ جات کے نامزد کردہ ہوتے ہیں۔ وہاں ان مجالس قصبات میں نصف ارکین غیر سرکاری اور نصف ارکین سرکاری حکام ہوتے ہیں۔ سرکاری حکام بحیثیت عہدہ مقرر ہوتے ہیں اور مقامی عہدہ دار کو تو الی بمقامی عہدہ دار تعلیمات وغیرہ پر مشتمل ہوتے ہیں مثلاً مجلس قصبہ میں مقامی امین صاحب کوتوالی، مقامی صدر مدرس حسب منشا مقامی طبیب معری، مقامی نائب امین کروڑگری علاوہ دوم تعلقدار یا تحصیلدار کے شریک ہیں

بعض قصبات میں منصف صاحبان بھی رکن مجلس ہیں گو اصولاً اب اسے ختم کردیا گیا ہے۔ مجلس ضلع میں علاوہ اوّل تعلقدار حسب
دوم تعلقدار و مقامی تحصیلدار کے سیول سرجن مہتمم کوتوالی اور صدر مہتمم تعمیرات شریک ہوتے ہیں ان سرکاری اراکین کی
مساوی تعداد میں غیر سرکاری ارکان وکلاء تجار و خوش باش اصحاب میں سے نامزد ہوتے ہیں۔ مجلس ضلع کی حد تک
اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ہر ہر تعلقہ سے ایک ایک غیر سرکاری رکن مجلس میں شامل رہے ان غیر سرکاری اراکین کو
شرکت اجلاس پر سفر خرچ بھی ایصال ہوتا ہے۔ مجلس بلدیہ میں سرکار عالی میر مجلس کی حیثیت سے ایک ایک میعاد کی
حد تک کسی صدر المہام کو مقرر کرتی ہے لیکن مجلس قصبہ و مجلس ضلع کی حد تک یہ دستور العمل ہی میں شریک ہے کہ عہدہ دار مال
یعنی تحصیلدار یا دوم تعلقدار یا اوّل تعلقدار بحیثیت عہدہ میر مجلس ہوگا۔ مجالس ضلع کے ارکان کی ہر دو سال کو
تجدید ہوسکتی ہے اگرچہ کہ علی العموم وہی ارکان برقرار رہتے ہیں"۔

جناب صدر! مجلس بلدیہ کی حد تک اسکے تین اجزائے ترکیبی قانون بلدیہ میں دئیے ہوئے ہیں یعنی
مجلس بلدیہ و مجلس قائمہ اور ناظم بلدیہ۔ مگر مجالس اضلاع کی حد تک ایسی کوئی صراحت نہیں ہے تاہم وہاں میر مجلس نہ صرف
ارکان کے مباحث کی صدارت کرتا ہے بلکہ وہ اعلیٰ عہدہ دار عاملہ بھی ہے اور ایک معتمد مجلس کی مدد سے وہ تمام انتظامات
عمل میں لاتا ہے مجالس اضلاع کی حد تک اب تحصیلداروں کی مماثل یافت کے تنخواہ یاب معتمدین مامور ہونے لگے ہیں۔
مجالس قصبات کی حد تک اگر دوم تعلقدار میر مجلس ہو تو مقامی تحصیلدار اور اگر تحصیلدار میر مجلس ہو تو پیشکار تحصیل معتمد مجلس
مقرر ہوتا ہے۔ سیلو کی طرح بعض قصبات میں چونکہ تحصیلدار نہیں ہیں لہٰذا میر منشی دفتر ڈویژن معتمد مجلس ہیں۔
پرلی تمانوت کے مقامات میں وہاں کے کسی مقامی شخص کو معتمد مجلس قرار دیا گیا ہے اور دوم تعلقداران ڈیژن مومن آباد
وپربھنی علی الترتیب وہاں کے میر مجلس ہیں جہاں تک کہ اختیارات کا تعلق ہے مجلس بلدیہ اور مجالس اضلاع و مجالس
قصبات میں اختلاف عظیم ہے درآں حالیکہ مجلس بلدیہ اپنی قراردادوں کے ذریعہ بڑی سے بڑی رقم کا صرفہ منظور کرسکتی ہے،
خدمات قائم کرسکتی ہے عطایا دے سکتی ہے۔ مجالس اضلاع کیلئے قیود ہیں کہ فلاں حد سے بڑھکر انہیں اختیار منظوری نہیں ہے
بلکہ ان کے تصفیوں کی سرکار سے منظوری کی ضرورت ہے مثلاً مجلس ضلع (۲۰۰۰) تک صرفہ کرسکتی ہے اس سے
زاید کے لئے توثیق صدر درکار ہے۔ یہی حال گتوں کی منظوری کا ہے میر مجلس ضلع (۲۰۰۰) تک کے گتے خود
دے سکتا ہے اس سے زاید رقم کیلئے صوبہ دار صاحب یا محکمۂ سرکار کی منظوری ضروری ہے۔ مجالس قصبات کی حد تک

موثر چارۂ کار فراہم کرتا ہے۔

تنقیح حسابات، کی حد تک محکمۂ بلدیہ کے برخلاف جہاں ان کا اپنا اگزامنر حسابات مامور ہے اضلاع کی مجالس کے حسابات کی تنقیح مہتمم صاحبان خزائن اضلاع سے متعلق ہے اور اگزامنر صاحب حسابات تعمیرات سے اس قسم کی تنقیح کا تعلق ہے۔ ان مجالس کے موازنوں کی منظوری کا تعلق بھی سرکار سے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر ۵ سال کو ایک معیاری موازنہ مرتب کر دیا جاتا ہے اور سال بسال اسکی پابندی ضروری ہے۔ پابند موازنہ رقوم کی حد تک دو ہزار کی قید رقم کے ساتھ مجلس صفائی کو پورے اختیارات ہیں سلک شریک موازنہ کی حد تک محکمۂ معتمد سرکار عالی کی اور سلک خارج از موازنہ کی حد تک پیشی صدارت عظمیٰ سے بتوسط محکمہ فینانس منظوری حاصل کی جانی لازم ہے۔

اضلاع میں نفاذ محاصل کی منظوری مثل محکمۂ بلدیہ حیدرآباد سرکار عالی سے متعلق ہے۔ البتہ تشخیص محاصل اور ان کے مرافعے کا طریقہ بالکل مختلف ہے گھرپٹی اور روشنی پٹی کیلئے مہتمم تعلقہ کو ساتھ رکھکر دو تین اراکین مجلس محاصل کی تشخیص کرتے ہیں ان کا اعلان ہوتا ہے اور ناراضِ تشخیص اوّل تعلقدار کے ہاں اس کا مرافعہ کر سکتا ہے قانون بلدیہ کیطرح ان مجالس سے متعلقہ قانون میں عدالت سے رجوع ہوسکنے کی بابت کوئی تذکرہ نہیں ہے لیکن حال میں عدالت منصفی پربھنی نے تحت قانون داد رسی خاص اشخاصِ ناراض کے لئے استقراری ڈگری صادر کی ہے۔

یہ امر سرکار عالی کے زیر غور ہے کہ ان مجالس کو بہت سارے مزید اختیارات کی تفویض عمل میں آئے۔

رہ گیا یہ امر کہ بعد نفاذ اصلاحات ان کے اختیارات میں کیا اضافہ ہوگا وہ میری بحث سے خارج ہے۔

قصبات ملک سرکار عالی اور بلدی آسائش

یہ تبصرہ حسب ذیل فقرات کے تحت قابلِ ملاحظہ ہے

(۱) آبرسانی (۲) ڈرینیج ۔ ۔ ۔ ۔ (۳) روشنی شوارع (۴) تعمیر امکنہ رفاہی (۵) توسیع آبادی (۶) توفیر مالی و ترتیب موازنہ

(۱) مبارک دورِ عثمانی کی یہ خصوصیت ہے کہ قصبات ملک سرکار عالی کے جن میں اورنگ آباد اور نظام آباد کے سوا کہیں آبرسانی کا بطرز جدید انتظام نہ تھا وہاں اب تقریباً دو درجن قصبات میں یہ انتظام ہوچکا ہے یا ہو رہا ہے اور آیندہ دو سال میں کمل ہو رہیگا۔ حضرت اقدس و اعلیٰ نے گذشتہ جنگ یورپ کے ختم کے بعد ملک سرکار عالی کے اکثر قصبات کو بنفس نفیس معائنہ فرما کر یہ یادگار حکم صادر فرمایا تھا کہ وہاں آبرسانی کا انتظام کیا جائے اور اس کے لئے بعجلۂ اول ۱۰ لاکھ کا عطیہ منظور کیا گیا۔ اس کے لئے ایک نظامت آبرسانی اضلاع قائم ہوئی بعد میں ایک مجلس آبرسانی

ڈرینیج بھی مقرر ہوئی صدر المہام مال و لوکلفنڈ اس کے صدر ہیں نیز صدر المہام صاحبان تعمیرات و فینانس مع اپنے
معتمدوں کے اس کے رکن ہیں معتمد صاحب مال ناظم صاحب طبابت و صحت عامہ کے سوا نائب معتمد صاحب مال
اسکے رکن اور معتمد ہیں۔ اس مجلس کو موازنۂ سرکار عالی سے ہر ہر میقات کے موقع پر ایک خطیر رقم سپرد ہوا
کرتی ہے کم وبیش اب تک اس طرح سے سرکار عالی کا ایک کروڑ روپیہ صرف ہو چکا ہے۔ ناظم صاحب آبرسانی
اضلاع منتخب شدہ مقامات کے اسکیم مرتب فرماتے ہیں اور مجلس آبرسانی اپنی گنجائش سے تین چوتھائی رقم بطور
عطیہ اور ایک چوتھائی رقم بطور قرضہ دے کر اسکیم کی ناظم صاحب آبرسانی کے اہتمام میں تکمیل کا حکم کرتی ہے۔ قرضہ کی
نہایت ہی آسان اقساط میں واپسی ہوتی ہے۔ یہ امر یہاں موجب دلچسپی ہوگا کہ حکومت مدراس کے ہاں صرف
نصف رقم بطور عطیہ دے کر نصف رقم قرضہ دینے کا طریق ہے۔ مہتمم صاحبان آبرسانی کو مجالس قصبہ سے ماہوار
ایصال ہوتی ہے۔ وہ ان کے ٹاؤن انجنیر بھی ہیں اور مجلس کی ہدایات کی تعمیل کرتے ہیں لیکن عملاً وہ ناظم صاحب
آبرسانی کے ماتحت ہیں انتظامات آبرسانی کی فنی حیثیت کی حد تک بلا مبالغہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ محکمہ
آبرسانی اضلاع کے فن کاروں کیلئے بجا طور پر موجب طمانیت ہیں ہر ہر قصبے کیلئے جسطرح پانی کی فراہمی ہوئی وہ
ایک دلچسپ حقیقت ہے محکمۂ نظامت آبرسانی میں اس کا مطبوعہ مواد دستیاب ہو سکتا ہے پانی نہ صرف
صاف شدہ دیا جاتا ہے بلکہ اس میں دواؤں کی بھی آمیزش ہوتی ہے درآں حالیکہ بمبئی کی سی بڑی بلدیہ میں صرف
صاف شدہ پانی فراہم ہوتا ہے۔ مجالس قصبہ اپنے ذمگی قرضہ کی ادائی کیلئے علاوہ آبادی سے سالانہ قیمت آب
لینے کے نل پٹی بھی عاید کر سکتی ہیں۔

(۲) ڈرینیج | جہاں جہاں آبرسانی کا محکمۂ نظامت آبرسانی اضلاع نے انتظام کیا وہاں فوراً ہی ڈرینیج
اسکیم بطور ایک ناگزیر جزو کے مرتب کی گئی اس کے لئے بھی اس محکمے سے سروے پارٹیاں اُن مقامات کو جن کا
انتخاب ہو جاتا ہے، پہونچتی اور اسکیمیں مرتب کرتی ہیں ہر اسکیم میں عام بیت الخلا کی تعمیر بھی شریک رہتی ہے
نیز نگہداشت وصفائی نالیاں کیلئے مامور شدنی عملہ کی تعداد بھی دیجاتی ہے اکثر اسکیموں میں گندے پانی کو کارآمد
بنانے کیلئے گندلے بنائے گئے ہیں ان کی تکمیل بھی آبرسانی کی طرح سہ ربع عطیے اور ایک ربع قرضہ سے ہوتی ہے۔
اگر عام طور پر ہر ہر قصبہ کیلئے عام اس سے کہ وہاں آبرسانی کا انتظام ہوا ہے کہ نہیں ڈرینیج اسکیم سروے پارٹی کی

تعیناتی کے ساتھ مرتب کرادی جائے تو مجالس قصبہ اپنے اپنے موازنوں سے ہر سال اس کا ایک ایک حصہ تکمیل کرلینگی تا آنکہ مجلس آبرسانی و ڈرینیج اعترافاً رقوم منظور کرکے ان کے ہاں ڈرینیج کی تکمیل کرادیگی۔ مکمل اسکیم کے بغیر قصبات میں موریاں اگر ضرورت کے تحت بنائی جائیں تو پھر ان کے لیول کے ٹھیک نہ ہونے اور غیر مربوط و غیر متوافق ہونے کا اندیشہ ہے قصبہ سیلو میں اسی طرح عمل ہوا ۱۳۴۹ف میں وہاں ایک سروے پارٹی متعین ہوئی کہ جس نے ایک اسکیم (۵۰) ہزار لاگت کی مرتب کی۔ دوران ترتیب ہی میں اسی سال وہاں مجلس قصبہ نے کچھ حصہ اسکیم اپنی گنجائش سے مکمل کرالیا۔ ۱۳۵۰ف میں اسکیم محکمہ نظامت آبرسانی اضلاع نے تیار اور طبع کردی تو اسکے مطابق مزید کچھ کام مکمل کیا گیا اور اسطرح مجلس آبرسانی و ڈرینیج کے روبرو یہ مسئلہ پرزور سفارشات کیساتھ پیش ہوسکا کہ چونکہ مجلس قصبہ سیلو نے (۵۰) ہزار کی اسکیم کے منجملہ (۳۵) ہزار کا کام اپنی گنجائش سے مکمل کرلیا ہے اسلئے انکو نہ صرف تکملہ (۱۵) ہزار دیا جائے بلکہ اندرون آبادی بہنے والے لینڈی نالے کی سطح کی پختہ تعمیر کیلئے مزید (۳۰) ہزار دیا جائے۔ مجلس مذکور میں جناب ناظم صاحب محکمہ آبرسانی اضلاع نے یہ فرمایا تھا کہ اپنی آپ مدد کرنے کی مجلس قصبہ سیلو نے بڑی مناسب مثال قائم کی ہے درآں حالیکہ ہر ہر قصبہ کی اسکیم مرتب کی جاکر دو سال نہیں پانچ سال میں اپنے آپ تکمیل کرلینے کا لزوم جملہ قصبات پر قائم ہوسکتا ہے

(۳) انتظام روشنی شوارع | سرکار عالی کے محکمہ تعمیرات نے نواب علی نواز جنگ کے دور میں محکمہ برقی اضلاع کی اپنی ایک شاخ قائم کی اور اورنگ آباد، ناندیڑ، نظام آباد، رائچور، یادگیر، نارائن پیٹ، گلبرگہ، ورنگل میں قوت خانے قائم ہوکر نہ صرف اہل قصبہ بلکہ قصبہ کے شوارع کیلئے برقی روشنی کی فراہمی ہوسکی۔ محکمہ برقی اضلاع نے بجا طور پر یہ قرار دیا کہ فراہمی قوت برقی کے کاروبار کو ایک سرکاری اجارہ رہنا چاہئے کیونکہ برطانوی ہند میں اس سے بعض سرمایہ داروں نے خوب کمائی کی ہے۔ لیکن نہ معلوم کون اسباب تھے کہ کماحقہ تیزی اور وسعت کے ساتھ دیگر قصبات میں برقی قوت اور روشنی فراہم نہ ہوسکی۔ ایک وجہ بداہتہً یہی تھی کہ سرکار عالی کے پاس کوئی برقابی قوت خانہ نہیں ہے کہ جس سے تولید قوت برقی کے اخراجات کم ہوسکیں۔ غالباً دوسرے کارخانہ داروں سے اور ریلوے کے ساتھ ممکنہ اشتراک عمل نہ ہوسکا ورنہ تقریباً ہر ایسے قصبے میں جہاں کارخانہ کی قوت محرکہ برقی قوت پر مشتمل ہو وہاں روشنی شوارع اور دیگر اغراض عامہ کیلئے قوت برقی کی بابت مناسب مفاہمت ممکن تھی۔ مثال کے طور پر جالنہ کا سا اہم مقام

باوجودیکہ وہاں متعدد کارخانے قوت برقی سے چل رہے ہیں حدود صفائی کی روشنی کیلئے پٹرومکس کی قنادیل کا محتاج ہے۔ ناندیڑ میں عثمان شاہی ملز سے ابتدا میں معاہدہ کرکے قوت برقی ساری آبادی کیلئے فراہم ہورہی تھی۔ اس طرح سے اورنگ آباد گلبرگہ کی ملز سے بھی انتظام ممکن تھا۔ دوسری طرف سرکاری قوانین کے نفاذ سے بآسانی ممکن تھا کہ سب کارخانہ داروں کو سرکاری قوت خانوں سے الحاق کی شرط کا پابند کردیا جاتا یہ دونوں امور خاطر خواہ طور پر نہیں ہوئے اور اسلئے مقابلہ دیگر صوبہ جات ہند کے حیدرآباد بہت پس ماندہ رہا۔ ایک شکل یہ ہوسکتی تھی کہ کارخانہ داروں کو کہہ دیا جاتا کہ بلا اسکے کہ انہیں کوئی امداد دی جائے یا طمانیت دلائی جائے انہیں عارضی طور پر حدود قصبات میں قوت برقی کی فراہمی کا مجاز کیا جاتا ہے سرکار عالی مختار و مجاز ہوگی کہ جب چاہے انہیں اپنا کام ختم کرنے کی نوٹس کی فہمائش دیدے۔ البتہ ان کے آلات وانجن وغیرہ کی مناسب قیمت کی ادائی پر غور کیا جاسکیگا۔ آیا یہ شکل قابل عمل تھی کہ نہیں اس کا اس طرح اظہار ہوسکتا ہے کہ قصبۂ سیلو میں سٹر پارک وہاں کے ایک مقامی کارخانہ دار کو تعلقدار وقت نے اجازت دی کہ وہ گنج اور اسکے اطراف کے امکنہ کو برقی روشنی فراہم کریں لیکن یہ صراحت کردی گئی کہ جب بھی سرکار حکم دے انہیں اپنے انتظامات برخاست کرنے ہونگے نیز یہ کہ نہ تو بوقت آغاز کار اور نہ تو بوقت برخاست انہیں کوئی امداد یا معاوضہ ایصال ہوگا۔ بعد میں اس رقبے میں کچھ توسیع بھی ان ہی شرایط کے تحت کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت سیلو کا ایک ثلث رقبہ برقی روشنی سے منور ہے۔ سیلو کی طرح قصبہ مانوت سے بھی انہیں شرایط پر اجازت نامہ ایک نہیں تین اشخاص نے طلب کیا اور اس کا قرینہ ہے کہ اگر سرکار عالی کی یہ پالسی ہورہے تو اور قصبات سے درخواستیں داخل ہونگی اور اس طرح شہری آسایش و اصلاح میں مدد ملیگی۔

(۴) **تعمیر امکنہ رفاہی** | امکنۂ رفاہی سے مراد وہ مکانات ہیں جن سے عام رعایا کو استفادے کا موقع ہے مثلاً مسافر بنگلے، دھرم سالے، باوڑیاں، مارکٹ، مسالخ۔ بیت الخلا اور حمام، دھوپ گھاٹ، مدفن چمن اور باغ نیز بازی گاہوں کا بھی اس میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ قصبات ملک سرکار عالی میں بلا استثناء اس قسم کے امکنہ میں سے کچھ نہ کچھ ہر مقام پر موجود ہیں اور سرکار عالی کی توجہات پر محکمۂ اسپیشل انجنیر لوکلفنڈ نے اپنے آرکٹکٹ کی رائے سے ایسے معیاری نقشے مرتب کرلئے ہیں جو بہ فرق مدارج مختلف قصبات کو کافی ہو رہے ہیں جہاں تک کہ معلوم ہوا ہے اس قسم کے معیاری نقشوں کی ترتیب کے ضمن میں محکمۂ نظامت طبابت و صحت عامہ سے بھی مشورہ لیا جاتا ہے کہ

عمارتیں حفظِ صحت کے لحاظ سے بھی تشفی بخش رہیں بہر طور مقامی مجالس کو یہ محسوس کرنے کی ضرورت ہے کہ اُن کے سرمایہ سے مارکٹوں اور مسلخوں کی بوجہ اولیٰ تعمیر ہو تا ان کے قصبے کیلئے ایک طرف حفظِ صحت کا باعث ہوگا تو ساتھ ہی اُن عمارتوں کے حقِ استعمال کے ہَراج سے انہیں آمدنی بھی ہو رہیگی ۔ مسافر بنگلوں، دھرم سالوں اور چاوڑیوں کی حد تک بجائے آرائش و خوبیٔ تعمیر افادے کا پہلو پیشِ نظر رہنا چاہیئے نیز یہ اصول بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ جس طبقے کے مسافروں کی آمد و رفت زیادہ ہے اس طبقہ کیلئے عمارت کی تعمیر ہو اور وہی اس سے مستفید ہوں۔ چاوڑیوں کی تعمیر کی حد تک یہ دیکھا گیا ہے کہ قدیم سے بعض ایسی عمارتوں پر محکمۂ کوتوالی اضلاع کا تسلط رہا حال میں اس محکمے نے اپنی ذاتی عمارات تعمیر کریں اور یوں سابقہ عمارات اسکے کار آمد نہ رہیں۔ ان سب کو تھوڑی بہت نگہداشت کے ساتھ مکرر چاوڑیوں کے طور پر استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔

مارکٹوں مسلخوں کی حد تک ان کیلئے موزوں جگہ کا انتخاب نہ کرنا بعض وقت مصارف کو رائیگاں کر دیتا ہے۔ ہمیشہ اس کا لحاظ رہنا چاہیئے کہ ان سے قریب ہی پانی میسر آئے تا کہ صفائی میں آسانی رہے نیز ان کے معیاری نقشوں کی حد تک جگہ جگہ کے حالات کے لحاظ سے مناسب تبدیلی سے کبھی بھی دریغ نہ کرنا چاہیئے مثلاً مسالخ کو سایہ دار رکھنا بعض چھوٹے قصبات کیلئے ضروری نہیں جہاں بمشکل دو ایک جانور روزانہ ذبح ہوتے ہیں۔

زنانی بیت الخلا کی تعمیر میں ان کا جدید رجحانات کے موافق رہنا ان کی افادیت کو قطعاً گم کر دیتا ہے۔ کتنے قصبات ہیں کہ جہاں فلش سسٹم کے بیت الخلا بنے اور لوگوں کی استعمال سے ناواقفیت کی بنا پر وہ محض باعثِ تکلیفِ عام ہوگئے۔ تجربہ یہ واضح کر رہا ہے کہ ہماری دیہی آبادی کہ جو کھلی فضا میں رفع حاجت کرنے کی عادی ہے اکہرے قدمچوں کے بیت الخلا کو کہیں بھی استعمال نہ کرے گی۔ قصبہ مانوت میں رضا کارانہ طور پر آبادی سے ہٹ کر ایک چار دیواری کی حال ہی میں تعمیر کی گئی اور اس میں پختہ فرش کے ساتھ ایک ۳۰ فٹ طویل موری دو فٹ گہری اور ۹ انچ چوڑی بنادی گئی اور وہ اس درجہ استعمال ہو رہی ہے کہ وہاں ایسے ہی اور بیت الخلا بنانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ جب رفتہ رفتہ مستورات کھلی فضا کی جگہ اس طرح کے آسرے میں رفع حاجت کرنے لگیں تو پھر بتدریج قدمچے اور درمیانی آسرے کی دیواریں بن سکتی ہیں۔

قصبات ملک سرکار عالی میں ابھی دھوب گھاٹوں کی تعمیر کی طرف کما حقہ توجہ نہیں ہو رہی ہے۔

درآں حالیکہ امراض متعدی کا انتشار دھوبیوں کے ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ اس طرح سرکار عالی کے محکمۂ امور مذہبی کے توسط اور نگرانی کی وجہ ہمارے ہاں کی مجالس قصبات میں مدفنوں پر اس طرح کی توجہ نہیں کی جاتی کہ جس کا برطانوی ہند کے سب قصبات میں معائنہ ممکن ہے مسافتوں کی حد تک ایک محصور بھٹی کی تعمیر جہاں نعشیں جلائی جائیں تو مد نظری نہ ہو نیز دھواں چمنی کے ذریعہ اُوپر ہی پھیل جائے بے حد مغتنم ہوگی۔ قبرستان کا یہ انتظام رہنا چاہیئے کہ اولاً وہ چوطرف سے محصور ہوں۔ اسکے بعد قبروں کیلئے متوازی خطوط میں جگہ بنا دی جائے۔ اس کا پلان رکھا جائے اور ایک مدت کے گذرنے پر قبروں کا دوبارہ استعمال ہوسکے ورنہ نہ معلوم کتنی زرعی اراضیات کو بطور قبرستان مبدل کرنا ہوگا۔

چمن بندی کے مقابل ایسی بازی گاہیں جہاں لوگ جمع ہوسکتے ہیں زیادہ کامیاب ثابت ہوئیں بعض مقامات پر پردہ باغ بھی تعمیر ہوئے ہیں بعض قصبات میں زنانی حمام بھی بنائے گئے ہیں اور فی الحال وہ استعمال نہیں ہورہے ہیں۔ دراصل غریب مستورات کو اس طرف سے ابھی خدشات لگے ہوئے ہیں کہ شریر لوگ نہ معلوم ستائیں تو کیا کیا جائے۔ بلدۂ حیدرآباد میں نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے ان حماموں پر جو مہاراجہ یمین السلطنۃ آنجہانی کی فیاضی کی بدولت تعمیر ہوئے ہیں ایک ایک مزدورنی کا بطور محافظ تقرر کرکے انہیں بالعموم استعمال کے لائق کردیا تھا۔ یہی امر یہاں بھی ہوسکتا ہے۔

(۵) توسیع آبادی قصبات ملک سرکار عالی میں بلحاظ تجارت کاروبار جب ترقی ہوئی اور ساتھ ہی مجلس مقامی کی توجہ وہاں کی اصلاح و آرائش پر متوجہ ہوئی تو پھر توسیع آبادی کیلئے جدید خطہ ہائے اراضی کے انتخاب کی ضرورت پڑی یہ اراضیات مختلف اغراض کیلئے منتخب ہوئیں مثلاً بعض قصبات میں گنج کیلئے رقبہ مختص ہوا کہ جہاں کی بنڈیاں نیز اناج کی بنڈیاں ٹھیرتی ہیں بعض قصبات میں ان دونوں کے لئے جُدا جُدا مقامات منتخب کئے گئے ہیں بعض قصبات پر آبادی کی گنجایش رفع کرنے جدید سڑکیں نکالی گئیں اور قدیم سڑکوں کو چوڑا کیا گیا۔ بعض قصبات میں بعض موقع کے مقامات کو جو پُرانے مکانات اور کھنڈرات تھے حاصل کیا جاکر یک قلم ہموار کردیا گیا اور وہاں دوکانات مارکٹ سینما وغیرہ کے لئے جگہ نکالی گئی۔

توسیع آبادی کے ضمن میں یہ بھی ہورہا ہے کہ مزدور پیشہ آبادی کیلئے انکی محنت مزدوری کے ٹھکانوں کے

قریب جدید محلے معیاری نمونوں پر بنائے جارہے ہیں اور اسکے لئے مجالس مقامی کو سرکار سے مبادلہ بھی مل رہا ہے۔ چنانچہ لاتور میں اسکی تعمیر شروع ہوچکی ہے اور ناندیڑ میں پیش نظر ہے اصول امداد باہمی کے تحت بھی انجمنوں کا قیام ممکن ہے

ان امکنہ کی تعمیر کے سلسلے میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ وہ (Slums) ہو کر نہ رہ جائیں۔

مکان کی لاگت مقابلتہً (۵۰۰) سے زیادہ نہیں ہے اور ان کی گنجائش نہ صرف کمروں والانں پر محیط ہے بلکہ اسمیں ایک باورچی خانہ اور ایک دھونے دھانے کی جگہ شریک ہے۔ ان کے سوا بعض بڑھیا مکانوں میں حمام اور بیل بندی رکھنے کیلئے بھی جگہ دی گئی ہے۔ جن قواعد پر یہ مکانات رہنے سہنے کیلئے مزدوروں کو دیئے جائینگے۔ اس میں یہ امر بھی ملحوظ ہے کہ ایک مدت تک مزدوران میں رہیں تو پھر مکان ان ہی کا ہورہے۔

علاوہ مزدوروں کے اور دوسرے پیشہ وروں مثلاً گولیوں کیلئے بعض قصبات میں گولی پورہ بسایا جارہا ہے لکڑی کے بیوپاریوں کیلئے بھی الگ محلے بسے ہیں ان میں آتشزدگی سے بھی بچاؤ ہے۔

کہیں خوشحال ارکان معاشرہ کیلئے بھی محلے بسے ہیں۔ سرکاری دفاتر اور امکنہ کیلئے بھی قطعات اراضی علیحدہ کئے گئے ہیں۔

ایک بڑی دقت اصلاح و آرائش قصبات کے سلسلے میں کارخانوں کا عین آبادی میں وقوع ہے۔ اسکے لئے سڑکیں نکال کر اُن کو آبادی سے کنارے کردیا جارہا ہے اکثر قصبات میں صنعتی رقبے منتخب اور معین ہورہے ہیں ہمارے ہاں کے اکثر کارخانے فی الحال چالو نہیں ہیں بعض نے ایک قسم کا ساجھا کر رکھا ہے کہ جسکی وجہ ان کے چالو نہ رہنے کے باوجود انہیں نفع ملتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا سرکار رعالی مبادلات وغیرہ کے ذریعہ ایسا نہیں کرسکتی کہ اس طرح کے خوابیدہ کارخانے یا تو قانوناً حاصل کرلئے جائیں یا انہیں صنعتی رقبے میں منتقل ہونے پر مجبور کیا جائے بتایا جاتا ہے کہ یہ کارخانے اگر حاصل کرلئے جائیں تو ان کی مشنری وغیرہ کے دام نکل آئینگے۔ زمین کے بہترین پلاٹ بن سکینگے اور نیز کارخانے آبادی سے نکل جائینگے۔ اسی ضمن میں سررشتہ تعمیرات نے جو تعاون کیا ہے اس کا تذکرہ ضروری ہے۔ پٹرول اسکے حصہ رسدی کی تقسیم سے اکثر قصبات مثلاً جالنہ اورنگ آباد ناندیڑ ورنگل لاتور میں سمنٹ کی سڑکیں منجانب تعمیرات بنادی گئیں۔ بعض مقامات مثلاً پربھنی ہنگولی میں مقامی مجالس نے سمنٹ کی سڑکیں تعمیر کی ہیں۔ سڑکوں کے تذکرے کے ضمن میں یہ امر قابل بیان ہے کہ احاطۂ مدراس میں محکمۂ تعمیرات عامہ کی جو سڑکیں حدود صفائی قصبات سے گذرتی ہیں انکی

نگہداشت کیلئے مجالس مقامی کو گرانٹ ملا کرتی ہے اور اس گرانٹ کو یکمشت بھی دیا جاتا ہے تاکہ اسکی ملنع گرد دیرپا تعمیر ہو سکے۔ ملک سرکار عالی میں یہ سلسلہ نہیں ہے درآں حالیکہ محکمۂ تعمیرات کے موازنے میں ان سڑکوں کی نگہداشت کیلئے رقم شامل رہتی ہے۔ اس رقم کا مجالس قصبات کو سڑکوں کے ساتھ سپرد ہونا ممکن ہے۔ اس سے ایک ہی قصبے کی حدود میں دوعملی نہ رہیگی اگر سڑکوں کی تفویض باضابطہ طور پر نہ کی جائے تو بھی کم از کم نگہداشت کا تعہد بجائے خانگی گتہ داروں کے مجلس قصبہ کو دیا جاسکتا ہے۔

محکمۂ تعمیرات بجا طور پر ان سڑکوں کو مجالس قصبہ کے حوالے کرکے ان کی نگہداشت بھی مجالس قصبہ سے متعلق کرسکتا ہے بشرطیکہ امکنۂ تعمیرات سرکار عالی مستوجب محاصل مقامی ہو رہیں۔ درآں حالیکہ محکمۂ بلدیہ حیدرآباد میں سرکاری اماکن پر محصول جائداد قائم ہے اور محصول آبرسانی بھی ادا ہوتا ہے، اضلاع سرکار عالی کے کسی قصبہ میں سرکاری امکنہ پر گھرپٹی، روشنی پٹی قائم نہیں ہے ایک بار ایک مجلس ضلع میں اسکی تحریک کی گئی تھی جملہ سرکاری اراکین کے اس عذر سے مسئلہ ملتوی ہو گیا کہ ان کے سررشتہ کے موازنہ میں جب تک سرکار سے الگ رقم مہیا نہ ہو جائے وہ اپنے اپنے موازنہ کی گنجائشوں کو زیر بار نہیں کرنا چاہتے۔

ذرائع آمدنی و ابواب خرچ سطور بالا سے یہ واضح ہو چکا کہ سرکار عالی کی مجالس مقامی کی چار اقسام ہیں لیکن بلحاظ ذرائع آمدنی و ابواب خرچ ان کو مجالس قصبات و مجالس ضلع کی تبویب میں لیا جاسکتا ہے۔ واقعہ سرکار عالی نے اپنے لوکل فنڈ یا سرمایہ مقامی کی ابتداء زر مالگذاری کے ہر ایک روپیہ کے ساتھ ایک آنہ زاید وصول کرنے سے کی تھی کہ جس میں سے ۳ پائی تعلیمات اور ۲ پائی حفظان صحت کے لئے دیا جا کر بقیہ ۷ پائی رفاہی اغراض کیلئے مجالس ضلع کے سپرد ہوتا ہے۔ اسکے سوائے ندیوں کو عبور کرانے کے حقوق نیلام کرنے کے جو محصول رود گھاٹ کے نام سے موسوم ہے نیز ان سیکلوں پر ٹیکس کے قیام سے جو مواضعات میں استعمال میں آتی ہیں مزید کچھ آمدنی جمع ہوتی ہے۔ مجلس ضلع کے مسافر بنگلے، چاوڑیاں بھی اسکے لئے آمدنی جائداد کا باعث ہوتی ہیں۔ کونڈواڑے بھی آمدنی کا موجب ہیں۔ مجلس تعلقہ کا کوئی موازنہ نہیں مرتب ہوتا ہے۔ اس کے مقابل مجالس قصبات اور مجالس مقامی کو اپنی حدود مقامی میں محاصل جائداد از قسم گھرپٹی، روشنی پٹی عاید کرنے کا حق ہے۔ آبرسانی کے انتظام کی صورت میں نل پٹی بھی وصول کی جاسکتی ہے۔ گھرپٹی کیلئے کرایہ مکان کے

ہر روپیہ پر ۳ پائی کم از کم سالانہ وصول کیا جاتا ہے۔ روشنی پٹی بھی اسی قدر وصول ہوتی ہے، اس میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے مگر اسکے لئے قرارداد مجلس قصبہ بتوسط مجلس ضلع و صوبہ داری سرکار عالی کی منظوری کی ضرورت ہے۔

اسکے سوا حدود قصبہ میں آنے والی سامان کی بنڈیوں پر بار برداری پٹی اور مارکٹ پٹی فی بنڈی کم از کم ایک آنہ عاید کیجا سکتی ہے۔ جہاں زرعی مارکٹ کمیٹیاں قائم ہوگئی ہیں وہاں پر مارکٹ پٹی اس کمیٹی کے طرف سے وصول کیجاتی ہے۔ کپاس کی بنڈیوں کی پوری رقم مارکٹ کمیٹی کی ہوتی ہے۔ البتہ اناج کی بنڈیوں کی نصف رقم مجلس صفائی و مجالس قصبات کو دی جاتی ہے اور مارکٹ کی روشنی صفائی مجلس صفائی کے ذمہ رہتی ہے اگرچہ یہ دیکھا گیا ہے کہ اس قاعدے کے کہیں کہیں خلاف بھی عمل ہوا ہے۔ مثلاً سیلو میں بلا امتیاز بنڈیاں کپاس و اناج نصف مارکٹ پٹی مارکٹ کمیٹی نے لے لی ہے۔ مارکٹ پٹی، بار برداری پٹی کی وصولی بذریعہ تعہد دار ہوتی ہے، اگرچہ امانی میں وصولی کا احکام کی رو سے امکان ہے۔ سیلو میں یہ دونوں بلاحظہ تنگ پٹیات جمع کیجاتی ہیں۔ تنگ پٹیات وہ رسایدہیں جو اڑھتیے اور خریدار رعایا کا مال خرید کرکے اجرا کرتے ہیں۔ انتظام کیا گیا ہے کہ اسکے تین قطعات ہوں ایک مارکٹ کمیٹی کو دیا جائے ایک فروخت کنندہ لے جائے اور ایک تاجر خریدار کے ہاں رہے۔ بداہتاً اس طریقہ سے وصولی درمیانی مستاجرین کی زیادہ ستانی کو روک کر مزارعین کی سہولت و طمانیت کا باعث ہوتی ہے۔ مجالس قصبات کو بھی محصولات خاص (رو دگھاٹ و ٹیکس سیکل) کی آمدنی ہوتی ہے بشرطیکہ قصبات ندی کنارے آباد ہوں۔ مجالس قصبہ کو آمدنی جائداد کے تحت ہفتہ واری بازار کے کرایہ نیز اپنی دیگر اراضیات کے استعمال کی فیس معقول مقدار میں ملتی ہے۔ نیز اسکے مسلخ اور مارکٹ بھی اسکے لئے آمدنی کا ذریعہ ہیں خس و خاشاک کی فروخت سے بھی کچھ رقم ملتی ہے۔ خصوصاً جہاں گنج قائم ہوں وہاں خس و خاشاک کی خوب قیمت اٹھتی ہے۔ لوگ اس سے کھاد بناتے ہیں یا بھٹیاں جلاتے ہیں بعض مجالس نے مغاک قائم کر رکھے ہیں جہاں کچرہ حیوانی اور انسانی فضلہ ملا کر کھاد بنایا جاتا ہے اور یہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا ہے۔ سواری پٹی سے بھی کچھ رقم حاصل ہوتی ہے۔

مجالس قصبات کو جبتک کہ انکے اپنے ذرائع آمدنی اچھے نہ ہو رہیں، مجلس ضلع سے امداد گرانٹ دیجاتی ہے اور یہ واضح ہونا چاہیئے کہ سرکار عالی سے انہیں کوئی گرانٹ نہیں ملتی ہے نہ سرکاری املاک پر محاصل جائداد ہوتے تھے لیکن وقتاً بوقت سرکار عالی نے اپنے مواضعات میں رقوم مختص کی ہیں تاکہ قصبات پر امداداً تقسیم ہوں چنانچہ

سنہ ۱۳۴۲ف میں پانچ لاکھ کی رقم منظور ہوئی تھی۔ آبرسانی اور ڈرینیج کی اسکیموں کے سلسلے میں جو اعانت ممکن ہے اسکا تذکرہ اوپر ہو چکا۔ ماسوا اسکے سررشتہ تعمیرات سرکارعالی اپنی سڑکوں کی مانع گرد تعمیر کرکے اچھا خاصہ اشتراک عمل کرتا ہے۔

مجالس قصبہ کو بطریق مبادلہ سرکارعالی سے یا مجلس ضلع کی گنجایش سے رقم یکمشت حاصل کرکے اپنا تعمیری پروگرام بہ یک وقت مکمل کرلینا چاہیئے کہ جس سے انکی آمدنی میں اضافہ ہو اور بار بھی کم پڑے۔ توسیع آبادی کے ضمن میں نئے نئے محلے بسا کر پلاٹ فروخت کرکے بھی ان مجالس کو معقول آمدنی ہوسکتی ہے۔ اپنے حدود میں تشہیر پر بھی فیس عاید کی جاسکتی ہے۔

بہر حال بعض ذرائع آمدنی مثلاً اشیائے خورد و نوش نیز اشیائے مضر صحت و خطرناک کی فروخت پر فیس لائسنس کا قیام نیز ٹیکس تفریحات ایسے رہ گئے ہیں کہ جنکا رواج ضروری ہے۔ دستورالعمل اختیارات مجالس صفائی متعلق بہ حفظان صحت میں قیام لائسنس کی گنجایش موجود ہے۔

بلاشبہ گھرپٹی روشنی پٹی کی شرح ہماری مجالس قصبات اضلاع میں ایسی ہے کہ بلدیہ حیدرآباد سے بھی اسکا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بلدیہ حیدرآباد میں صرف گھرپٹی قائم ہے۔ روشنی پٹی نہیں وصول کیجاتی ہے ٹیکس آبرسانی تو دراصل پانی کی قیمت ہے۔ باربرماری پٹی یا مارکٹ پٹی کے عنوان سے بھی وہاں کوئی ٹیکس وصول نہیں ہورہے ہیں ان محاصل مقامی کا ہر (۵) پانچ سال کو رویژن (تشخیص جدید) عمل میں آتا ہے۔ اراکین مجلس کی سب کمیٹی بمشورہ فنتدان یہ کام تکمیل کرتی ہے۔ اسکا مرافعہ اوّل تعلقدار کے ہاں ہوتا ہے۔ عدالتوں سے رجوع ہونے کے متعلق قانون محاصل مقامی خاموش ہے۔

بعض مواضعات میں مویشی کے بازار منعقد ہوتے ہیں اور فروخت مویشی کا داخلہ خریدار کو حاصل کرنا ہوتا ہے پولیس پٹیل جنکو یہ داخلہ دینا ہوتا ہے۔ فی مویشی ہر لئے بغیر یہ داخلہ نہیں دیتا۔ ایک تجویز یہ ہے کہ یہ داخلہ بجانب مجالس دیا جائے کہ جو ان بازاروں کا انتظام کرتی ہیں اور فی داخلہ ہر حاصل کیا جائے اس سے بھی کچھ رقم ملیگی اور آسایش جانوران پر صرف ہوگی۔

ابواب خرچ کے سلسلے میں فی الحال قصبات کو اخراجات مرکزی کے نام سے ایک معتدبہ رقم سرکار میں جمع کرادینی ہوتی ہے اور اس سے مہتمان و صدر مہتمان لوکلفنڈ و نظامت کا رہائے لوکلفنڈ ٹاؤن پلانرز کے

تقررات عمل میں آئے ہیں نیز عملۂ تنقیح وحسابی کے اخراجات کی پابجائی بھی ہوتی ہے۔ فی الجملہ اس طرح سے ایک ڈومینین لوکلفنڈ سرویس کا قیام ہو کر بہتر کاردان اسٹاف فراہم ہو سکا ہے۔ اس میں صوبۂ مدراس کی حکومت نے اپنی مجالس کے ہلت افسران اور انجینیران کی حد تک یہی کیا ہے۔ بہ لحاظ مدارج ہلت افسروں کو مختلف قصبات کی آبادی کے لحاظ سے درجہ اوّل، درجہ دوم، درجہ سوم اور درجہ چہارم کے شہروں اور قصبات میں مامور کیا جاتا ہے اور درجہ بدرجہ ترقی ہوتی ہے۔ درجہ اوّل کے ہلت افسران شہروں پر مامور ہوتے ہیں جسکی آبادی ایک لاکھ یا اس سے متجاوز ہے اور نیز مجالس اضلاع کے ہلت افسر کی طرح بھی انہیں متعین کیا جاتا ہے۔

محکمہ نظامت حفظان صحت مدراس کے نائب ناظم کی دو جائدادوں کو انکی ترقی کا آخری زینہ قرار دیا گیا ہے بالکل اسی طرح میونسپل انجنیروں کا بھی حال ہے آخر میں چل کر یہ لوگ حکومت مدراس کے سینیٹری انجنیروں کی نائبی کی خدمات کے حقدار ہوتے ہیں ان دونوں فن داں بلدی عہدہ داروں کے اخراجات تا بحد نصف حکومت مدراس برداشت کرتی ہے۔

بلا شبہ ہماری حکومت نے سیول سرجن صاحبان اضلاع کو ہلت افسر قرار دے کر نیز ہلت افسر صاحبان کے مددگاروں کے تقرر اور سینیٹری انسپکٹران کی ماموری سے جو دس ہزار سے زاید آبادی کے قصبات پر متعین ہوتے ہیں ایسا ہی ایک اچھا قدم اٹھایا ہے۔ لیکن تابحد مہتممان وصدر مہتممان وناظم صاحب کارہائے لوکلفنڈ کچھ ایسا ہی عمل ہونے کی ضرورت ہے چنانچہ ایک اچھی شکل یہ ہو چکی ہے کہ سرکار عالی کی طرف سے جو ناظم کارہائے آبرسانی و ڈرینیج اضلاع مامور ہوتے ہیں وہ نظامت کارہائے لوکلفنڈ کا کام بھی سنبھال رہے ہیں جس طرح کہ سابق میں ان دونوں خدمات پر ایک ہی صاحب مامور تھے۔ ساتھ ساتھ مہتممان وصدر مہتممان وغیرہ کی ماموری کے اخراجات میں سرکار عالی کا اشتراک واشتمال اس وزن کو ہلکا کریگا۔

اس سے قطع نظر مجالس اضلاع ومجالس قصبات کے اخراجات تعمیرات وصفائی کی صدر مدات پر بڑی حد تک منقسم ہیں۔ مجالس اضلاع کے موازنوں میں گذشتہ سال سے پنچایتوں کی امداد کیلئے بھی رقم شریک ہوئی ہے جنکا قیام پیش نظر ہے۔ دیگر ذیلی مدات میں درختان سایہ دار کی تنصیب وانتظامات اعراس وجاترا، قیام بازیگاہ اطفال، انعقاد نمائش قابل تذکرہ ہیں جہاں جہاں آبرسانی کا انتظام ہو چکا ہے وہاں ایک مد

آبرسانی کے اخراجات کی بھی قائم ہے۔ یہ مجالس صفائی اعراس و جاتراؤں کے انعقاد میں ذرا بھی توجہ کریں تو علاوہ اسکے کہ صفائی و حفظان صحت کے انتظام کی وجہ جانی نقصانات نہ ہونگے مقامی تجارت و زراعت نیز دستکاری کو مدد ملیگی۔ اسپورٹس وغیرہ کے انعقاد سے رعایا کی صحت جسمانی کا بھی انصرام ہوگا۔ ان مجالس مقامی کو دائیگان کی تعلیم کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیئے اور دواخانوں پر جو لیڈی ڈاکٹر یا نرس ملازم ہوتی ہے۔ وہ مقامی دائیوں کو یکجا کرکے ان کے معلومات کی صحت و ترقی کا ذمہ لے سکتی ہے۔ ان کی ششماہی ٹریننگ کے بعد انہیں آلات و لباس کا ایک ایک سٹ فراہم کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح سے جملہ قصبات ملک سرکار عالی کی دائیگان کی معلومات کی تصحیح ہو رہیگی۔

جن جن قصبات میں مارکٹ کمیٹیاں قائم ہوئی ہیں چونکہ انکا میر مجلس بھی وہی عہدہ دار ہوتا ہے جو اُن مجالس مقامی کا صدر رہے، نیز ان مارکٹ کمیٹیوں میں مجالس قصبات کا ایک ایک نمائندہ شریک رہتا ہے لہذا ان کے دفاتر کی یکجائی اور وصولیات محاصل وغیرہ میں تعاون و اشتراک بلکہ ہفتہ واری بازار کی تہ بازاری کی وصولی مارکٹ کمیٹیوں کی معرفت ہونا مقامی تجارت و کاروبار کی ترقی کا باعث ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ ایک سرکاری عہدہ دار کا ان مجالس کا میر مجلس ہونا انکی کارکردگی میں بدرجہا اضافہ کرچکا ہے۔ برطانوی ہند میں جبتک حکام ضلع و ڈویژن ان مجالس کے صدر رہے انکی کارکردگی کا یہی حال تھا۔ حکومتی افسروں پر رعایا کی بے اعتمادی کا یہ اثر ہوا کہ غیر سرکاری افراد ان کی صدارت کرنے لگے رائے عامہ چونکہ تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل نہیں ہے اس لئے ایسے افراد کا انتخابات کی مشین کے ذریعہ ان مجالس میں شریک ہونا خارج از امکان ہوگیا اور اس لئے اب وہاں کی مجالس کی ہیئت عامہ بہت ہی روبہ انحطاط ہے۔ حتیٰ کہ وہاں کے حکام یہاں کے عہدہ داروں کو آہستہ خرامی کا مشورہ دے رہے ہیں۔ بہرطور سرکاری عہدہ دار کا ان مجالس میں شریک ہونا اور ان کا صدر مقرر رہنا ان کا کارکردگی کیلئے اور انہیں سودمند اور مفید ادارے بنانے کیلئے لازم ہے۔ رائے عامہ کا شمول بھی مناسب ہے لیکن اسکی نگرانی ضروری ہے کہ سچے دردمند شہری شریک ہوں فقط

مخطوطات کے خزانے

(۲)

از محمد غوث صاحب ایم اے

(۳)

تذکرۃ البلاد والحکام

دکن کی تاریخ کے ساتھ کرناٹک کی تاریخ بھی ابھی بہت کچھ توجہ کی طالب ہے۔ کرناٹک کی تاریخ جیسے جیسے روشنی میں آتی جائیگی ہندوستان کی تاریخ کے بعض اہم واقعات پر سے تاریکی دور ہوتی جائیگی۔ کرناٹک کی تاریخ پر جو فارسی کتابیں موجود ہیں ان کے زیادہ سے زیادہ مطالعہ کی ضرورت ہے۔

تذکرۃ البلاد والحکام بھی کرناٹک کی تاریخ ہے۔ مولف کا نام میر حسین علی کرمانی ہے۔ ان کے والد کا نام سید عبدالقادر ہے۔ مولف اور ان کے اجداد کی بود و باش کرناٹک میں رہی تھی۔ مولف کے اجداد قطب شاہی دربار کے متوسل تھے۔ چنانچہ فتح خاں وغیرہ اپنے زمانہ میں بڑے عہدوں پر کرناٹک کے علاقوں میں مامور تھے۔ اس کتاب کے علاوہ مولف کی ایک اور تالیف "نشان حیدری" ٹیپو سلطان اور ان کے والد کے زمانہ کے حالات پر مشتمل ہے۔ ان کی تالیف کردہ اور کتابیں بھی ہیں چنانچہ ایک تالیف بدیع المعانی کا پتہ زیر تذکرہ تالیف سے چلتا ہے۔

تذکرۃ البلاد والحکام کی تالیف ۱۲۲۵ھ میں ہوئی اور اسکے موضوع کے متعلق مولف نے واضح کیا ہے کہ بالاگھاٹ کرناٹک کے جن امراء اور راجگان کے حالات تاریخ فرشتہ اور تاریخ افاغنہ میں درج نہیں ہیں ان کے حالات کی وضاحت کے لئے یہ کتاب لکھی گئی۔

ہر چند مولف نے اپنے ماخذوں کی کوئی صراحت نہیں کی ہے اور حوالے نہیں دیئے ہیں اور بعض امور میں غلطیوں کا امکان بھی ہے بریں ہم جو حالات جمع کئے ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ کتاب کا

اسلوب اور مواد کی ترتیب بھی عامیانہ ہے لیکن جو کچھ مواد خام اس میں جمع کیا گیا ہے وہ کسی اور فارسی کتاب میں نہیں مل سکتا۔

یہ کتاب ۱۴ اورنگ پر مشتمل ہے تا مناسب ہوگا اگر مضامین کی تفصیل سے صراحت کی جائے۔

پہلی اورنگ میں پنوکنڈہ، ویجانگر عرف اناگندی کے راجاؤں کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ ۳۰ھ سے اسکی تاریخ آغاز ہوئی ہے۔

راجہ ہری ہر کے حالات میں مولف نے یہ اشارہ بھی کیا ہے کہ ان کے زمانہ میں اسلامی ممالک سے تجارتی تعلقات قائم ہوئے۔ مولف نے صراحت کی ہے کہ

"دوراکثر اوقات آں زماں از ولایت توران وایران وکاشمیر وکاشغر وکابل و قندہار ولاہور وملتان سوداگران باتحایف آں ممالک مثل شال وکمخاب واطلس و مشک نافہا وترکش وکمان واشتر کابلی وقندہاری واسپان عراقی وترکی وارد ایں نواح می شدند۔ چوں ارباب دولت وریاست راخریدئی چنیں اجناس نفیس ضرور بل لازم است لہٰذا طرف مغرب کوہ مذکور بفاصلہ دوفرسنگ معمورہ احداث کردہ تر کلاپٹن نام نہادہ بود تا سوداگراں وتاجران ہموں جا اقامت ورزند۔ وایں کار پردازان خود رامع مبلغ خطیر درانجا فرستادہ اجناس و راسہا خرید کردہ می طلبید"

اسی زمانہ میں (سنہ ۶۹۰ھ) سید بابا فخرالدین حسینی گنج الاسرار سہروردی پنوکنڈہ میں آئے، ان کے متعلق بھی مولف نے مختصر حالات بیان کئے ہیں۔ اور اپنے فیض باطن اور روحانی اثر سے خود راجہ کو بھی متاثر کیا۔

"بعد وفات آنحضرت دو موضع یکے بنام پرم پلی و دیگر تنکور کہ محاصل ہر دو موضع ۱۱۰۰ ہن رایلی کہ فی ہن سہ روپیہ وچہار آنہ می شود مقرر بود بخراج تیل چراغ وگل وخوش بوئی مرقد مبارک بطور جاگیر سپردہ تا زیست خود ہر شب پنجشنبہ اشنان کردہ گرد مرقد منور سہ بار تصدق گشتہ بخانہ می رفت"

بعد میں بھی راجاؤں نے اس درگاہ سے اپنے تعلق کو باقی رکھا چنانچہ لکھا ہے کہ
"فی الجملہ ہرکس از راجان انجا بدرگاہ حضرت زر نذر و غلاف وغیرہ سال بسال می فرستاند"
دوسرے اورنگ میں صوبہ سرا کے راجاؤں کے حالات بیان کئے ہیں۔ سرا سے موجودہ رتن گری کا علاقہ مراد ہے۔ بیان کیا ہے کہ راجگان بیجانگر کے زمانہ میں ہی یہ علاقہ آباد ہوا۔ بعد میں عادل شاہی دربار سے اس صوبہ کا تعلق ہوگیا تو مسلمان صوبہ دار مامور ہوتے رہے۔ بالآخر اس کا تعلق ٹیپو سلطان کی سلطنت سے ہوگیا۔ اور ٹیپو سلطان کی شہادت پر ملک پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے قبضہ کرلیا۔
تیسرا اورنگ ادھونی کے حالات پر مشتمل ہے۔ ادھونی کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ چنانچہ اسکی تاریخ کا سلسلہ تین ہزار سال قبل سے قایم کیا ہے۔ ۹۷۱ھ میں یہ علاقہ عادل شاہی سلطنت میں شامل ہوگیا۔ ملک ریحان پہلا صوبہ دار تھا۔ اسکے بعد سدی مسعود تربیت یافتۂ علی عادل شاہ نے اس علاقہ کی صوبہ داری حاصل کی اور اپنے حسن انتظام سے بڑی عزت و ناموری پیدا کی۔ آصف جاہی دور میں یہ علاقہ نواب ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ کے تفویض ہوا۔ پھر نواب بسالت جنگ نظامت ادھونی پر مامور ہوئے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب کہ سلطنت آصف جاہی ہر طرف سے اعداء کے نزع میں تھی۔ اس وقت کے مختلف واقعات و حالات اختصار سے بیان کئے ہیں۔
چوتھا اورنگ افاغنہ ساونور کے حالات کے لئے مختص کیا ہے۔ یہ عادل شاہی امرا تھے۔ حضرت آصف جاہ اوّل کو لوگوں نے افاغنہ ساونور کی سرکوبی کے لئے اکسایا تھا لیکن حضرت موصوف نے اس پر توجہ نہیں کی اور اپنے تدبر و ملاطفت سے افاغنہ ساونور کو اپنے زیر اثر کرلیا۔ اس اورنگ میں حضرت آصف جاہ کی وفات کے بعد ممالک دکن میں جو افراتفری مچی اسکے بعض تفصیلات بیان کئے ہیں۔ دوسری کتابوں سے مقابلہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ بعض واقعات نئے معلوم ہوں۔
پانچواں اورنگ خوانین کڑپہ اور چھٹا اورنگ خانان کرنول کے حالات پر محتوی ہے۔ واضح ہو کہ حضرت آصف جاہ کی وفات کے بعد ہنگامۂ جانشینی میں ان علاقوں کے نوابوں نے جو حصہ لیا وہ بہت اہم ہے۔ ان نوابوں کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کیلئے مستند ماخذوں کی بہت کمی ہے۔ اس کتاب سے بھی

تفصیلات معلوم نہیں ہوتے۔ محض اشارے ملتے ہیں۔ غرض جو بھی حالات بیان کئے ہیں وہ غنیمت ہیں، البتہ ان کی تنقید اور تفحص کے لئے دوسری کتابیں مثل تو زک آصفی اور توزک والاجاہی وغیرہ سے مدد لی سکتی ہے۔ کوئی عجب نہیں کہ خانان کڑپہ و کرنول وغیرہ کے پاس خود وہاں کی ہی مرتب کردہ تاریخ کی کتابیں موجود ہوں۔ اب ان کو روشنی میں لانا بہت ضروری ہے۔

اس کتاب کے دوسرے اورنگ جن مقامات کے حالات پر شامل ہیں ان کی تفصیل ذیل میں مندرج ہے:

ساتواں اورنگ ذکر پالیگاران نواح ہرپن پلی، آٹھواں اورنگ کیفیت بنائے رائے درگ حاکمان، نواں اورنگ راجگان چک بالاپور، دسواں اورنگ حکام کنچن گڈہ۔ گیارہواں اورنگ مرارراؤ کھوڑپڑیا و کوہ گتی۔ بارھواں اورنگ۔ حکام سرہٹی۔ تیرہواں اورنگ حکام بلاری۔ چودہواں اورنگ حالات دھونڈوجی واکیہ۔

واضح ہو کہ بارہویں اورنگ کے خاتمہ پر مولف نے صراحت کی ہے کہ یہ ۱۲ اورنگ ۱۲۱۵ھ میں مرتب ہوئے اور کتاب بنام تذکرۃ البلاد والحکام تالیف پائی، خاتمہ بھی لکھا گیا لیکن ۱۲۲۵ھ میں آخری دو اورنگ مزید ترتیب پائے۔ ان کو بھی بعد میں شامل کتاب کیا گیا۔ اور خاتمہ ان کے آخر میں شامل کیا گیا۔ اس لحاظ سے کتاب کی پہلی نقلوں میں یہ دو اورنگ شامل نہیں ہیں۔

پیش نظر نسخہ مولوی محمد حبیب اللہ صاحب مرحوم فرزند سالارالملک مرحوم کے کتب خانہ کا ہے جو فی الوقت کتب خانۂ سعیدیہ حیدرآباد دکن میں امانتاً مخزون ہے۔ یہ نسخہ ۱۲۵۱ھ میں ترقیم پایا۔ کسی سید احمد نے اسکو لکھا ہے۔ نسخہ صاف خط میں نیلے ولایتی کاغذ پر لکھا گیا ہے اور مصحح ہے۔ ۱۲۵۲ھ میں تصحیح ہوئی ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالوہاب مدار الامر دیوان نواب کرناٹک نے تصحیح کی ہے۔ یہ نسخہ اصل میں ان کے کتب خانہ کا ہی ہے۔ پہلے صفحہ پر ان کے دستخط بھی موجود ہیں۔

اس کتاب کے مزید نسخے بھی دیکھنے میں آئے ہیں اور مدراس و حیدرآباد میں تلاش سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ فقط

تاریخی کاغذات کے ذخیرے

(۲)

از محمد غوث صاحب ام اے

(۳)

تنجاور کے راجہ پرتاپ سنگھ کے نام نواب صلابت جنگ مرحوم کی پیشگاہ سے جو عنایت نامے صادر ہوئے اُن کے منجملہ چند عنایت نامے کتب خانۂ سعیدیہ حیدرآباد میں محفوظ ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کے لفافے موجود نہیں ہیں البتہ ان کی پشت پر کاتب کی اصل مہر چسپاں کر دی گئی ہے۔ دو ایک عنایت ناموں کی پشت پر مرہٹی میں خلاصۂ عنایت نامہ درج ہے۔ یہ عنایت نامے افشانی کاغذ پر تحریر ہوئے ہیں، بیض خاص سے مزین ہیں اور بعض عنایت ناموں پر "صلابت جنگ بہادر ۱۱۶۴" کی مہر ثبت ہے اور باقی پر "آصف الدولہ ۱۱۶۵" کی مہر۔ ایک عنایت نامہ پر "شرح دستخط خاص" بھی موجود ہے۔ اسی کا عکس مجلّہ کی اس اشاعت میں شامل کیا گیا ہے۔

واضح ہو کہ نواب ناصر جنگ مرحوم کی شہادت کے بعد جس وقت نواب مظفر جنگ عازم بلدۂ حیدرآباد ہوئے نواب حسین دوست خاں چندا صاحب نے کرناٹک کی صوبہ داری حاصل کرنے کیلئے سعی و کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ نواب مظفر جنگ نے چندا صاحب کو صوبہ دار کرناٹک مقرر کیا تھا۔ نواب محمد علی خاں والاجاہ بر بنائے فرمان دہلی جو نواب ناصر جنگ شہید کے وساطت سے حاصل ہوا تھا خود کو اس خدمت کا مستحق خیال کرتے تھے۔ ان دونوں دعویداروں نے خوب مقابلہ کیا۔ انجام کار چندا صاحب کو راجہ پرتاپ سنگھ کے ایک عہدہ دار فوج مانا جی راؤ نے شعبان ۱۱۶۵ھ میں قتل کر ڈالا۔ اس وقت نواب مظفر جنگ مرحوم بھی دنیا سے گزر چکے تھے اور نواب صلابت جنگ مرحوم مسند آصفی پر متمکن تھے چندا صاحب کا واقعہ وقوع میں آنے کے بعد نواب موصوف نے راجہ پرتاپ سنگھ کو جو عنایت نامے تحریر فرمائے ان کے من جملہ ایک عنایت یہ ہے جو بہ ثبت "مہر آصف الدولہ ۱۱۶۵" و بہ ثبت بیض خاص صادر ہوا۔

ھُوَ الکریم

شہامت و جلادت دستگاہا

قبل ازیں عنایت نامجات متواتر متضمن طلب حضور بہ انور الدین خاں بہادر[۵۱] ترسیل یافتہ حالا ہم بتاکید تشدید نوشتہ شدہ یقین کہ مطابق حکم کاربند خواہد شد۔ چوں خدمت جلیل المرتبت ارکاٹ وترچناپلی بعموصاحب مہربان گورندور بہادر ظفر جنگ[۵۲] مقرر است دریں ولا نیابت عموصاحب معزالیہ بہ شہامت دستگاہ غلام مرتضیٰ خاں[۵۳] تفویض یافتہ باید کہ آں جلادت دستگاہ باتفاق و استصلاح گورندور بہادر شریک خان مشارالیہ بودہ حسن خدمت و تردد را ذریعہ توجہ خاطر شناسد۔ زیادہ چہ نوشتہ شود" بیض خاص

شرح دستخط خاص" تاکید اکید داند"

مطلب یہ ہے کہ نواب انور الدین خاں کو حضور میں طلب کیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ وہ چلے آئینگے۔ ارکاٹ کی صوبہ داری پر ظفر جنگ (دوپلے) مامور ہیں ان کی نیابت کیلئے اس وقت غلام مرتضیٰ خاں کو مقرر کیا گیا ہے تنجاور کے راجہ کو بھی چاہیئے کہ ظفر جنگ کے اتفاق مشورہ سے غلام مرتضیٰ خاں کے شریک کار رہیں۔

اس عنایت نامہ کا متن رسالۂ معارف اعظم گڈھ کے شمارہ ۱ جلد ۳۲ میں شائع ہوا تھا لیکن عکس اب پہلی مرتبہ شائع کیا جارہا ہے۔ فقط

۵۱۔ نواب محمد علی خاں والاجاہ مراد ہیں۔

۵۲۔ دوپلے گورنر پانڈی چری۔

۵۳۔ غلام مرتضیٰ خاں ویلور کے جاگیردار تھے۔ اور نواب حسین دوست خان کے خاندان سے تھے۔

تنقید و تبصرہ

(۱) محمدؐ رسول اللہ

اس کتاب کے مترجم مولانا عبیدالرحمٰن عاقلؔ رحمانی ہیں اور اس کے ناشران کتابستان پوسٹ بکس ۳۱۶۴ بمبئی ۲ قیمت ۸/

یہ مختصر سا رسالہ دراصل کارلائل کی مشہور کتاب ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ (مشاہیر اور مشاہیر پرستی) کے دوسرے لیکچر کا اردو ترجمہ ہے۔

ٹامس کارلائل انگلستان کے ان چند ممتاز اہلِ قلم سے ہے جن پر نہ صرف ان کے ابنائے وطن فخر کرتے ہیں بلکہ جن کے بلند پایہ علمی کارناموں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی ہے۔ یوں تو کارلائل کی تمام تصانیف انگریزی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ سمجھی جاتی ہیں لیکن جو شہرت و مقبولیت "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" کو حاصل ہے وہ اس کی کسی اور تصنیف کو نصیب نہ ہو سکی۔

یہ کتاب دراصل مجموعہ ہے ان لیکچروں کا جو کارلائل نے ۱۸۴۰ء میں لندن یونیورسٹی کی دعوت پر اہل علم کے ایک ممتاز مجمع کے سامنے دیئے تھے اور جس میں اس نے دنیا کے چند مختلف النوع مشاہیر پر اظہارِ خیال کیا تھا۔

یہ مشاہیر عالم اگرچہ مختلف ادوار اور مختلف اقوام سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان سب کا شمار (اس خاص حیثیت سے جس کے وہ علم بردار تھے) دنیا کے منتخب ترین افراد میں تھا مثلاً شاعر کی حیثیت سے شیکسپیر اور ڈانٹے، فرمانروا کی حیثیت سے نپولین بونا پارٹ، مذہبی مصلح کی حیثیت سے لوتھر اور پیغمبر کی حیثیت سے حضرت محمدؐ صلعم۔

پیش نظر کتاب (محمدؐ رسول اللہ) کارلائل کے اسی لیکچر کا ترجمہ ہے جس میں اس نے حضرت

سرور کائنات صلعم کے حالات و تعلیمات پر ایسی بے تعصبی اور صداقت پسندی سے نظر ڈالی ہے کہ مغربی ادبیات میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس لکچر کے مختلف اقتباسات اگرچہ اردو زبان میں بکثرت شائع ہوتے رہے لیکن پورے لکچر کا مکمل اور لفظی ترجمہ پہلی بار ۱۳۱۹ھ میں جامعۂ عثمانیہ کے ایک طیلسانی (محمد اعظم خاں صاحب ایم اے) نے بعنوان سیدالانبیا کیا تھا جو حیدرآباد سے شائع ہو چکا ہے۔ زیر تنقید کتاب (محمد رسول اللہ) اسی لکچر کا ایک اور اردو ترجمہ ہے مولانا عبیدالرحمٰن عاقل نے بمبئی سے شائع فرمایا ہے باوجودیکہ زیر نظر ترجمہ سے قبل اس کا مذکورۂ بالا ترجمہ شائع ہو چکا تھا۔ پھر بھی موجودہ ترجمہ میں بکثرت خامیاں پائی جاتی ہیں۔

سب سے بڑی خرابی اس ترجمہ میں یہ ہے کہ اس میں مترجم نے اپنی طرف سے اتنے تصرفات کئے ہیں کہ اصل سے بالکل مختلف ایک نئی چیز بنگئی ہے۔ کہیں تو اصل کے کئی کئی فقرے غائب ہیں تو کہیں مترجم نے اپنی طرف سے بالکل ایک نیا مضمون داخل کر دیا ہے مثلاً لکچر کے آغاز ہی میں مصنّف کہتا ہے کہ "اوڈن کی پرستش ہم کو حیران کر دیتی ہے یعنی لوگوں کا فرط حیرت و محبت سے ایک بڑے انسان کو سجدہ کرنا اور نہ دل سے یہ سمجھنا کہ وہ عرش کا مکین یعنی خدا ہے" ترجمہ میں یہ حصہ اور اس کے بعد کے کئی فقرے حذف کر دیئے گئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ص ۱۹) ایسی حذف شدہ عبارتوں کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ اس کے ساتھ ایسی مثالیں بھی بہت ہیں جہاں مترجم نے اپنی طرف سے ایک نیا مضمون اضافہ کر دیا ہے مثلاً صفحہ ۲۲ کا بیشتر حصہ محض مترجم کی طرف سے اضافہ ہے۔ پھر جہاں کہیں اصل سے مطابقت کی کوشش کی گئی ہے وہ بھی کامیاب ثابت نہیں ہوئی اور اکثر جگہ ترجمہ بالکل خبط ہو گیا ہے۔ مثلاً کتاب کے ابتدائی حصہ میں ایک جگہ مصنف کہتا ہے کہ "کسی عہد کی تاریخ میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ اُس کے زمانہ کے لوگوں نے کسی جلیل القدر انسان کا استقبال کس طرح کیا لوگوں کو ہمیشہ ایسے انسان میں صفات ایزدی کا کچھ نہ کچھ پرتو نظر آیا ہے۔ یہ نہایت اہم سوال کہ لوگ ایسے شخص کو خدا سمجھتے ہیں یا پیغمبر یا کچھ اور اسکا جواب بمنزلۂ ایک روزن کے ہے جسمیں سے ہم اُس قوم کی روحانی حالت بخوبی دیکھ سکتے ہیں"

اس مضمون کا ترجمہ زیر نظر کتاب (محمد رسول اللہ) صفحہ ۱۸ پر حسب ذیل کیا گیا ہے:۔

غالباً ہر دور میں سب سے مشکل چیز یہی کسی بڑے انسان کا استقبال رہا ہے۔ خواہ لوگوں نے

اس کا استقبال خدا کی طرح کیا ہو یا نبی کی طرح یا جس طرح بھی ہو۔ بس سب سے بڑا سوال یہی ہے۔ ان کے اس سوال کے طریقۂ جواب اور اس کے متعلق مذہب کی کیفیت سے ان کی صحیح روحانی حالت کا دیکھ لینا ہمارے لئے ممکن ہے اگرچہ یہ دیکھنا ویسا ہی ہو جیسا کہ کسی بند دریچہ کے سوراخ سے کسی چیز کو دیکھ لیتے ہیں"

اگر ان تصرفات اور غلط فہمیوں سے قطع نظر کر لی جائے تب بھی ترجمہ ادبی معیار سے بہت گرا ہوا ہے اور اس کی عبارت اکثر جگہ نہایت نامانوس ہو گئی ہے مثلاً حسب ذیل عبارت ملاحظہ ہو۔

"میرا خیال ہے کہ وہ لوگ جو صحراؤں اور چٹیل میدانوں میں انفرادی زندگی بسر کرتے ہیں وہ ظواہر طبعی اور ان اسرار پر اسی وقت گفتگو کرتے ہیں جبکہ وہ ذکی القلب تیز ذہن خفیف الحرکتہ اور ثاقب نظر والے ہوں" صفحہ (۲۹)

ایک جگہ اور لکھا ہے "خدا وہی ہے جس نے گھوڑے کے حلق میں رعد اور کڑک ودیعت کر دیا ہے" (ص ۳۴)

جب ایک مرتبہ ترجمہ ہو چکا تھا تو پھر نئے ترجمہ کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر ترجمہ کرنا ہی تھا تو اس طرح کہ کوئی یہ نہ کہتا کہ ترجمہ کی کوشش رائگاں گئی۔

ن

(۲) "ہماری کتابیں"

انجمن ترقی اردو ہند کی حیدرآبادی شاخ خاموشی سے اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں مصروف ہے۔ اس نے ایک گشتی کتب خانہ قائم کیا ہے تاکہ اردو داں اصحاب آسانی سے بکثرت کتابوں کا مطالعہ کر سکیں اس گشتی کتب خانہ نے اپنے ناظرین کی سہولت کے لئے "ہماری کتابوں" کے نام سے اپنا ایک ماہانہ ترجمان جاری کیا ہے۔ اس رسالہ کا ظاہر و باطن دونوں ترقی پذیر رجحان کا عکس ہیں۔ اس رسالہ کی ترتیب کو ۵ ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ۱۔ تبصرہ، جدید اردو مطبوعات پر اظہار خیال، ۲۔ تذکرہ، محسنین اردو کی علمی و ادبی خدمات اور ان کے کارنامے۔ ۳۔ تکملہ، ان کتابوں کی فہرست جو گشتی کتب خانہ میں شامل ہوتی ہیں۔ ۴۔ تعارف، جدید مطبوعات کا حال احوال۔ ۵۔ مقالات

ملک کے ممتاز اہلِ قلم کے رشحات۔

آخری موضوع کے تحت ”میں مطالعہ کس طرح کرتا ہوں“ کے عنوان پر بعض مشہور لوگوں نے جیسے کہ مولانا عبدالحق صاحب، پنڈت برج موہن دتاتریہ۔ نواب بہادر یار جنگ بہادر اور مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے دلچسپ انداز میں اپنا طریقۂ مطالعہ تحریر کیا ہے۔ دوسرے موضوعوں پر بھی دوسرے مشہور اصحاب نے قلم اٹھایا ہے لیکن یہ مضامین ایسے ہیں کہ ان پر یادداشتوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس ترجمان کا اصل مقصد ”تبصرہ“ اور تعارف ہے اس پر مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ مضامین سے بڑھ کر ان ابواب کی جانب توجہ کرنی چاہیئے۔ تبصرہ کے باب میں نہ صرف جدید مطبوعات پر تبصرہ ہونا چاہیئے بلکہ قدیم مطبوعات پر بھی مثلاً رسالہ نے جہاں ”میں مطالعہ کس طرح کرتا ہوں“ کے موضوع پر مضامین لکھوائے ہیں، وہاں چند مزید موضوع مقصد رسالہ کے مدنظر یہ ہونے چاہئیں کہ ”کونسی کتابوں کا مجھ پر اثر پڑا“ ۲۔ ”کس مولف کی کونسی کتابیں مجھے پسند ہیں“ ۳۔ ”میرا کتب خانہ“ وغیرہ غرض مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ لوگ بہتر اور مفید کتابیں نہ صرف پڑھیں بلکہ خریدا بھی کریں۔ اسی طرح ادیبوں اور ممتاز اہلِ قلم کی سوانحی کیفیتیں جو لکھوائی جائیں اس میں ان کی تالیفات کے احوال کا تناسب زیادہ ہونا چاہیئے بلکہ یہ انتظام ہو کہ ان کی ایک ایک تالیف پر ممتاز اہل قلم سے تبصرہ لکھوایا جائے۔

بہرحال توقع ہے کہ یہ رسالہ اردو کتابوں سے عام دلچسپی بڑھانے میں اپنے مستعد اور مخلص کارفرماؤں کی کوششوں سے کامیابی حاصل کریگا۔ جو لوگ کتب خانہ میں شریک نہیں ہیں ان کے لئے بھی اس کا مطالعہ ضرور سودمند ہے۔ چندۂ سالانہ ایک روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ

گشتی کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند) اردو منزل ترپ بازار حیدرآباد دکن

م، غ۔

معاصروں کے صفحے

۱۔ مجلۂ سیاست کے شمارہ ماہ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں INDIAN TRADE تالیف بی۔ وی نارائینا سوامی نائڈو پر ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی صدر شعبۂ معاشیات جامعۂ عثمانیہ نے ایک تبصرہ لکھا ہے۔ یہ کتاب انامَلہ کی یونیورسٹی نے شائع کی ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ

"گزشتہ تین برس کے عرصہ میں انامَلہ یونیورسٹی نے معاشیات کے متعلق دس کتابیں پروفیسر نائڈو کی ادارت میں شائع کی ہیں۔ یہ کتابیں اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت ہی اہم ہیں۔ تین برس کے عرصہ میں دس کتابیں شائع کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے اور وہ بھی انامَلہ جیسے نئے خانگی ادارے کے لئے جس کی مالی حالت کچھ ایسی زیادہ عمدہ نہیں ہے اس پر خوبی یہ ہے کتاب کی قیمت بالکل واجبی رکھی گئی ہے اور اکثر وبیشتر کتابیں علمی اداروں اور ذی علم ارباب کو مفت دی جاتی ہیں"

انامَلہ کے اس روشن پہلو کو دکھا کر ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی نے جامعۂ عثمانیہ کے متعلق یہ لکھا ہے کہ

"اس کے برعکس ہماری یونیورسٹی ہے جہاں بفضل الٰہی سلطنت آصفیہ کی علم پروری اور فیاضی کی وجہ سے مالی تنگ دامانی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ علمی خدمت کے متعلق بالخصوص اردو کے ذریعہ ہمارے دعوے بہت بلند ہیں، لیکن جہاں تک علمی کام کا تعلق ہے ہماری کوشش ہمارے اخراجات کے مقابلہ میں بہت ہی حقیر معلوم ہوتی ہے۔ معاشیات اس یونیورسٹی میں گزشتہ ۲۰ برس سے اردو میں پڑھائی جاتی ہے۔ جامعہ کی طرف سے معاشیات کی حد تک اس وقت تک کوئی تحقیقی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ تراجم کی حد تک صرف ایک درجن کتابوں کا

ترجمہ اب تک شائع ہوا ہے۔ حال ہی میں مجھے پنجاب کواپریٹیو یونین لاہور نے اپنے تراجم تصانیف وتالیفات کا ایک پورا سلسلہ تحفتاً بھیجا ہے۔ مجھے یہ دیکھکر انتہائی حیرانی ہوئی کہ ایک نامعلوم گمنام سے صوبہ جاتی ادارے نے اس وقت تک معاشیات کی دس مستند کتابوں کا ترجمہ اردو میں شائع کیا ہے۔ ایک یونیورسٹی جو اردو میں تعلیم کا دعویٰ کرتی ہے، جہاں معاشیات کی ام اے تک تو کیا پی ایچ ڈی تک اردو میں تعلیم ہوتی ہے وہاں بیس برس کے طویل عرصہ میں صرف ایک درجن معاشیات کی کتابوں کا ترجمہ ہوتا ہے۔ جس پر بلاشبہ کئی لاکھ روپیہ صرف ہوئے ہونگے۔ ہمارے ہاں اگر ایک کتاب کا ترجمہ دو برس میں ہوتا ہے تو دوسروں کے ہاں وہی ترجمہ چار چھے ماہ میں ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جو کتاب دو برس میں چھپتی ہے باوجود اس کے کہ ہمارے ہاں اپنا مطبع موجود ہے دوسروں کے ہاں وہی کتاب باوجود اپنا مطبع نہ ہونے کے تین چار ماہ میں شائع ہو جاتی ہے۔ ہمارے یہاں جس کتاب کی قیمت آٹھ دس روپے سے کم نہیں رکھی جاتی دوسروں کے ہاں وہی کتاب دو ڈہائی روپے میں مل جاتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ کسی اردو ترجمہ کی قیمت اصل انگریزی کتاب سے بڑھنے نہ پائے محدود کاروباری نقطۂ نگاہ سے یہ پالسی مفید ہو تو ہو لیکن علمی لحاظ سے اور بالخصوص ادبی حد تک یہ پالسی بالکل بے معنی ہے کیونکہ اردو داں طبقہ انگریزی داں طبقہ سے مقابلتاً کہیں زیادہ غریب ہے اور وہ اتنی قیمت ادا نہیں کر سکتا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جامعۂ عثمانیہ کی پالسی کے بالکل برعکس پنجاب کواپریٹیو یونین نے انگریزی کتابوں کی قیمت کے مقابلے میں اردو ترجموں کی قیمت برائے نام رکھی ہے۔"

اسکے بعد ڈاکٹر صاحب نے جدولوں کے ذریعہ دونوں جگہ کی کتابوں کی قیمت کا تقابل کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"ہماری کتابوں کے انبار دارالترجمہ کی الماریوں میں مقفل رہتے ہیں اس لیئے کہ اکثر حضرات اس گراں قیمت پر یہ تصانیف خرید نہیں سکتے۔ اگر یہ کتابیں طلبہ کے فائدے کیلئے

لکھی گئی ہیں تو ان کے لئے بھی خریدی ممکن نہیں ہے بالخصوص عثمانیہ کے طلبہ کیلئے جو تعلیمی فیس تک ادا نہیں کرسکتے۔"

۲۔ شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ کے امتحان ام اے کے لئے ایک مقالۂ "حالات امام طحاویؒ" کے نام سے مولوی سید قطب الدین حسینی صاحب ام اے نے لکھا تھا۔ یہ مقالہ رسالۂ برہان دہلی میں قسط وار طبع کیا جا رہا ہے۔ اسکے سلسلہ میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اپنے صحیفہ "صدق" مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۴۲ء میں لکھا ہے کہ۔

"علوم جدیدہ میں سے دقیق سے دقیق اور اعلیٰ سے اعلیٰ علم کی تعلیم و تدریس کی زبان اردو بنا دینا بجائے خود عہدِ عثمانی کا ایک اولوالعزمانہ اور تجدیدی کارنامہ ہے، ہندوستان ہی کیلئے نہیں سارے مشرق کے لئے باعث فخر لیکن اس ادبی اور علمی کارنامہ سے بھی کہیں بڑھ کر ہم مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے وہ اہم دینی خدمات ہیں جو جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات کے ذریعہ سے ظہور میں آ رہی ہیں۔ ان بلند پایہ تحقیقی مقالات کا ایک نمونہ وہ تھا جو "جنایات بر جائداد" کے نام سے، ایک خاصی ضخیم کتابی صورت میں عرصہ ہوا نکل چکا ہے، اور اس پر ریویو بھی ان صفحات میں شائع ہو چکا ہے اور ایک تازہ نمونہ امام طحاوی پر وہ تحقیقاتی مقالہ ہے جو رسالۂ برہان (دہلی) میں شائع ہونا شروع ہوا ہے اور بشرط گنجائش عجب نہیں کہ صدق میں بھی شائع ہوتا رہا"

رسالۂ برہان کے کارفرما اصحاب عثمانیہ برادری کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ جو کام خود عثمانیہ برادری کو کرنا چاہیئے وہ دوسرے اصحاب دور سے انجام دے رہے ہیں۔ اگر عثمانیہ برادری توجہ کرے تو اس قسم کے سارے قیمتی مقالے خود مجلّہ کے صفحات پر شائع ہو جا سکتے ہیں۔

صدق کے متذکرۂ صدر بیان میں "جنایات بر جائداد" پر ریویو کا تذکرہ آیا ہے — یہ ریویو صدق کی اشاعت مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا ہے جو یہ ہے۔

"جامعہ عثمانیہ کے دوسرے شعبوں کی طرح اس کا شعبۂ دینیات بھی بحمداللہ کاہل اور مجہول نہیں،

متحرک، مستعد اور فعال ہے۔ پیش نظر رسالہ اسی شعبہ کے ایک گراجویٹ طالب علم کا تحقیقی مقالہ ہے۔ جنایت ایک فقہی (یعنی شریعت اسلام کی قانونی) اصطلاح ہے۔ انگریزی قانون میں اس کا مترادف (TORT) ہے۔ مالی جنایات اور مسائل متعلقہ مقالہ کا موضوع ہیں۔ اور مقالہ تحقیق اور تفصیل دونوں سے لکھا گیا ہے۔ ترتیب ابواب مباحث بہت صائب اور مذاق حال کے بالکل مطابق ہے۔ لیکن اسناد ہر جگہ محققین فقہاء ہی کے اقوال سے کیا گیا ہے۔ عین جس زمانہ میں کہ قدیم مذہبی درسگاہوں میں انگریزی کالجوں کی تقلید کی وبا پھیلتی جارہی ہو ایک ام، اے، ال ال، بی کا اس خالص دینی موضوع کی تحقیق میں پڑنا ایک فال نیک ہے۔

تحقیقی مقالات عموماً صرف طلبۂ فن کے کام کے ہوتے ہیں اور یہی بات اس مقالہ میں بھی ہے تاہم مصنف کا سلجھا ہوا طرز بیان ایسی کشش رکھتا ہے کہ عام تعلیم یافتہ شخص بھی ذرا سنجیدگی اور توجہ سے اس کا مطالعہ کرے تو محروم نہ رہیگا۔ البتہ یہ دیکھکر حیرت ہوئی مصنف کے تواضع و انکسار پر کہ ان کے ماخذوں کی فہرست میں اونچی اونچی محققانہ و فاضلانہ کتابوں کے پہلو میں ایک قرآن مجید کا اردو ترجمہ از مولوی نذیر احمد مرحوم بھی ہے۔"

۳۔ "اضافیت" جامعہ کے نامور فرزند ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی کی تالیف ہے انجمن ترقی اردو نے اسے شائع کیا ہے۔ اسکے متعلق بھی مولانا عبدالماجد صاحب ۲۸ ستمبر ۱۹۴۲ء کے صدق میں لکھتے ہیں کہ

"پڑھے لکھوں میں کون ایسا ہے جس نے جرمنی کے مشہور یہودی ریاضی دان آئن شٹائن کا نام نہیں سنا ہے نیوٹن کی طرح اسکے نام سے بھی سائنس اور ریاضیات کی دنیا کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے لیکن ساتھ ہی مخصوص سائنٹفک حلقہ کو چھوڑ کر عام پڑھے لکھوں میں کتنے ایسے ہیں جو اسکے نظریات خصوصاً نظریۂ اضافیت کے مفہوم سے بھی واقف ہیں؟ پیش نظر رسالہ

شرح ہے امکانی عام فہم زبان میں اسی نظریہ کی۔ شرح دُنیا کے ایک مشہور ترین ریاضی داں کے کلام کی، ہندوستان کے ایک مشہور ترین ریاضی داں کے قلم سے۔ شرح زیادہ سے زیادہ سلیس اور عام فہم زبان میں ہے جس حد تک ایک خالص اور ٹھوس دقیق ریاضی مسٔلہ کی شرح ممکن ہے۔ کتاب ۱۱ بابوں میں تقسیم ہے شروع کے تین باب نسبتاً زیادہ مشکل ہیں، آخر میں فرہنگ اصطلاحات اور اشاریہ دونوں حل مشکلات میں خاصی حد تک معین ہونگے۔ کتاب فاضل محترم نے اقبال مرحوم کی فرمائش پر شروع کی تھی مگر قبل اسکے کہ کتاب تکمیل کو پہنچے خود اس حکیم ملت کا پیمانۂ عمر لبریز ہوگیا۔ لیکن مرحوم کے حسنات میں یہ امر بھی شامل رہیگا کہ ان کے طفیل میں ایسی اہم کتاب اردو میں عالم وجود میں آگئی۔ مصنف اور ناشر دونوں قابل مبارکباد ہیں مصنف اس پر کہ ان کے قلم سے ایسی اہم تصنیف نکلی۔ ناشر اس پر کہ اردو میں خس و خاشاک کا جو ڈھیر لگتا جاتا ہے ان کے ذریعہ سے اس میں ایک گوہر رخشاں کا اضافہ ہوا۔

۴۔ ڈاکٹر جعفر حسن صاحب استاذ عمرانیات جامعۂ عثمانیہ کی تالیف "ہماری ریلیں اور سڑکیں" پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد صاحب نے صدق مورخہ ۲ نومبر ۱۹۴۲ء میں لکھا ہے کہ

"ہندوستان کے ذرائع حمل و نقل پر انگریزی میں جتنا بھی ذخیرہ موجود ہے اردو میں تو اب تک بمنزلہ صفر کے تھا اور اردو داں غریب اس معاملہ میں بالکل اندھیرے میں تھا۔ انجمن ترقی اردو قابل مبارک باد ہے کہ اس نے اس موضوع کے لئے ایک اچھے اور اہلیت رکھنے والے صاحبِ قلم کا انتخاب کیا۔ اور اس سے ایک خاصی اور متوسط ضخامت کی دلچسپ، مفید، پر معلومات کتاب لکھوادی .... ہر مسٔلہ سے متعلق آپ کو مفصل و مستند معلومات اور جچی تلی رائیں ان صفحات میں مل جائینگی۔ ان کی تلاش و فراہمی میں انگریزی کے ہزارہا اوراق آپ کو اُلٹ پلٹ کرنا ہوتے اور پھر بھی کامیابی شاید اس حد تک نہ ہوپاتی۔ انداز بیان بڑا دلچسپ اور زبان سلیس و شیریں ہے .... کتاب اول سے آخر تک ہر پڑھنے کے شوقین کے لئے خصوصاً سیاسیات و معاشیات ہند سے دلچسپی رکھنے والے کے

پڑھنے کے قابل ہے ۔ باب جسکا عنوان ریلوں کا تاریک پہلو ہے بہت سے دماغوں سے تاریکی دور کرسکتا ہے ریلوں، سڑکوں اور مسافروں وغیرہ سے متعلق اعداد شمار بھی بہت قابل قدر ہیں"

---

۵ ۔ صدق کے شمارہ مورخہ ۲ر نومبر ۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کی تالیف گارساں دتاسی پر بھی تبصرہ شائع کیا گیا ہے۔ مولانا عبدالماجد نے لکھا ہے کہ یہ اس تالیف کا جدید اڈیشن پہلے سے کہیں بہتر ہے کیفیت وکمیت دونوں میں کہیں برتر ہے۔ لکھا ہے کہ

"اردو زبان وادب کے ہر طالب علم کے لئے یہ رسالہ ایک قیمتی تحفہ ہے اور طالب علم سے مراد صرف بتدی نہیں ہوتے متوسط اور منتہی سب اس میں شامل ہیں"

---

۶ ۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کی تالیف "خلق وحق" پر بھی صدق کے اسی شمارے میں مولانا عبدالماجد صاحب نے تبصرہ کیا ہے۔ لکھا ہے کہ

"حق کیا ہے اور خلق کیا ہے یہ اور اس قسم کے بیسیوں سوالات کے جوابات اگر ایک مختصر رسالہ کے اندر دلکش زبان میں اگر دیکھنا ہو تو اس فلسفی کے اس رسالہ کو ملاحظہ کرلیا جائے .... رسالہ ہے اتنا دلچسپ کہ ایک بار شروع کردینے کے بعد پھر چھوڑنے جی نہ چاہیگا"

---

۷ ۔ رسالۂ معارف ــــ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے دو رسائل "عہد نبوی کا نظام تعلیم" اور "عربی وحبشی تعلقات" پر تبصرہ شایع کیا گیا ہے۔ صاحب تبصرہ نے لکھا ہے کہ

"جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب جامعۂ عثمانیہ میں قانون بین الممالک کے استاذ ہیں، اور ہندوستان کے ان چند ذی علم میں سے ہیں جن کی طرف وسعت نظر، صحت تخیل، فکر صحیح اور ذوق تحقیق وجستجو کے لحاظ سے نگاہ اٹھتی ہے، موصوف کی نظر عہد نبوی کے بین الاقوامی تعلقات پر خاص طور سے ہے اور "وثایق سیاسیہ" پر ایک ضخیم تصنیف (عربی میں مصر سے)

شایع کرا چکے ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً مختلف عنوانوں سے ہند و بیرون ہند کے ممتاز رسایل میں اپنے نتائج فکر پیش کرتے اور معلومات میں اضافہ اور اہل علم سے خراج تحسین وصول کرتے رہے ہیں"۔

۸۔ رسالۂ معارف اعظم گڈہ کے شمارۂ ماہ نومبر ۱۹۴۲ء میں "قرآن اور علاج خوف" کے عنوان سے ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب استاذ فلسفۂ جامعۂ عثمانیہ کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ یہ مقالہ موتمر علوم اسلامیہ میں پڑھا گیا تھا۔ یہ موتمر بزم دینیات جامعۂ عثمانیہ کے اہتمام سے جامعۂ عثمانیہ میں منعقد ہوئی تھی۔ اس موتمر میں پڑھا ہوا ایک اور مقالہ اسی رسالۂ معارف کے شمارۂ دسمبر میں شایع ہوا ہے، یہ مقالہ جناب عبدالقادر صاحب بی ایس سی آنرز (لندن) استاذ معاشیات جامعۂ عثمانیہ کا ہے مقالہ کا موضوع "ابن خلدون کے معاشی خیالات" ہے۔

۹۔ تاریخی کاغذات کو روشنی میں لانے کے لئے مجلّہ نے ایک باب مختص کیا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس جانب اب دوسرے مجلّے بھی توجہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد کا موقر انگریزی مجلّہ اسلامک کلچر نے اپنی اشاعت ماہ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں کھڑلہ کی جنگ کے نقشہ کی تصویر شایع کی ہے ۱۷۹۵ء میں حضرت نظام علی خاں اور مرہٹوں کے مابین بمقام کھڑلہ یہ لڑائی ہوئی تھی اور تاریخی اعتبار سے اسکو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس دور کے طلبۂ تاریخ کے لئے یہ نقشہ بہت دلچسپ ہے۔

یوں اسلامک کلچر اپنے ذرائع کی وسعت سے اس میدان میں اور بہت کام کرسکتا ہے اور کرنا چاہیئے۔

۱۰۔ حیدرآباد کے ہفتہ وار معاصر سلطنت نے نمایش مصنوعات مملکت آصفیہ کے موقع پر اپنی ایک خاص اشاعت صنعتی نمبر کے نام سے شائع کی ہے۔ اس میں نمایش کے تعلق سے سب ضروری اور کار آمد مواد ایک جگہ فراہم کردیا گیا ہے۔ صنعتی امور کے متعلق بھی مفید معلومات اور مضامین شامل ہیں،

توقع ہے کہ سلطنت کی یہ اشاعت پانچویں نمائش کے سلسلہ میں ایک کارآمد رہبر ثابت ہوگی۔

۱۱۔ معاشی کانفرنس کے اختتام پر حیدرآباد کے روزانہ معاصر رہبر دکن نے "معاشی صنعتی نمبر" کے نام سے اپنی ایک خاص اشاعت شائع کی ہے۔ اس میں کانفرنس کے خطبات کے علاوہ دو ایک مقالے بھی شریک ہیں۔ یہ نمبر کانفرنس کی روداد کا ایک اچھا مرقع ہے۔

مجلۂ طیلسانیین کے ناظرین سے استدعا

۱۔ خریداران براہ کرم اپنے پتہ کی تبدیلی سے بروقت مطلع کردیں
۲۔ تنقید کے لئے کتابیں بھیجی جائیں تو مدیر کے پاس راست دفتر مجلّہ پر بھیجی جائیں۔
۳۔ مضامین، مقالوں اور دیگر متعلقہ امور میں مدیر کو مخاطب کرنا مناسب ہے
۴۔ اشتہارات، خریدی اور دیگر مماثل امور میں مہتمم کو مخاطب کرنا بہتر ہوگا۔

مجلّے کے دفتر کا پتہ

دفتر انجمن طیلسانیین عثمانیہ کمرہ ۱۹ مجردگاہ
نظام شاہی روڈ۔ حیدرآباد دکن

جامعاتی معلومات

چین کی وزارت تعلیمات اور ہندوستان کے حکام تعلیمات میں اس امر کے تفصیلات طے پا رہے ہیں کہ چین کے چند طلبہ ہندوستان میں اپنے علم و فن کی مابعد طیلسانی مزید تکمیل اور اعلیٰ تعلیم کے لئے ہندوستان آئیں اور ہندوستان کے چند طلبہ چین جائیں اس سلسلہ میں ہندوستان کی جانب سے چین کے حکام تعلیمات کو دس چینی طالب علموں کو ہندوستان بھیجنے کی دعوت دی جاچکی ہے۔ اسی طرح چین کی طرف سے دس ہندوستانی طالب علموں کو چین بھیجنے کیلئے دعوت وصول ہوچکی ہے (انڈین ریویو دسمبر ۱۹۴۲ء) جامعہ عثمانیہ میں بھی چین بھیجنے کے لئے چند طلبہ کا انتخاب عمل میں لایا جارہا ہے۔

"فیڈریشن آف یونیورسٹی وومن آف انڈیا" (وفاق طیلسانی خواتین ہندوستان) میں تمام مسلمہ جامعات کی ہر طیلسانی خاتون بلا لحاظ قومیت و مذہب و ذات شریک ہوسکتی ہے۔

۲۶ اگست ۱۹۴۲ء کو وفاق کا جو جلسہ منعقد ہوا اس میں صدر نے اعلان کیا کہ وفاق کا ایک وظیفہ رقمی (۱۰۰) روپے طبی تحقیقات کے لئے مس جے آر مانجری (کاما ہاسپٹل بمبئی) کو عطا کیا گیا۔ نیز یہ اعلان بھی کیا گیا کہ بین الاقوامی وفاق طیلسانی خواتین کی جانب سے ایک فیلوشپ رقمی (۲۵۰) پونڈ مس بینا گھوش (جامعہ بنارس) کو عطا ہوا ہے، موصوفہ سنسکرت میں تحقیقاتی کام کرنے کے لئے ہارورڈ (HARVARD) کی جامعہ کو روانہ ہوچکی ہیں۔ یہ دوسری ہندوستانی خاتون ہیں جنہوں نے ایک بین الاقوامی فیلوشپ حاصل کیا ہے۔ پہلی خاتون مس کملا بھگوت (جامعہ بمبئی) تھیں۔ (کرنٹ سائنس ستمبر ۱۹۴۲ء)

سیلون کی نئی قائم شدہ جامعہ کا پہلا جلسہ تقسیم اسناد ۱۴ اکٹوبر ۱۹۴۲ء کو کولمبو میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں دو ہندوستانی صاحبان علم کو ال ال ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی ۔ ایک تو سر راد ہاکرشنن جامعۂ بنارس کے معین امیر ہیں اور دوسرے ڈاکٹر لکشمن سوامی مدلیار جامعۂ مدراس کے معین امیر (کرنٹ سائنس اکتوبر ۱۹۴۲ء)

انٹر یونیورسٹی بورڈ آف انڈیا کی جانب سے ایک فہرست سائنس اور فنون کے ان موضوعات کی شائع کی گئی ہے جن پر ہندوستان کی جامعات میں تحقیقاتی کام انجام دیا جارہا ہے یا حال حال میں انجام دیا جا چکا ہے تفصیلات کیلئے مجلّہ کے صفحات ناکافی ہیں ۔ صرف سائنس کے موضوعات کے چند اعداد پیش ہیں۔

۱۔ جامعۂ آگرہ ۔ حیوانیات ۵ موضوعات ۔ کیمیا ۱۳ موضوعات ۔ ریاضی ۲ موضوعات ۔ زراعت ۹ موضوعات ۔ طبعیات ۶ موضوعات ۔ نباتیات ا موضوع ۔

۲۔ جامعۂ الہ باد ۔ نباتیات ۷ موضوعات ۔ کیمیا ۲۹ موضوعات ۔ ریاضیات ۲۰ موضوعات حیوانیات ۸ موضوعات ۔

۳۔ جامعۂ اندھرا ۔ کیمیا ۶ موضوعات ۔ ٹکنالوجی ۷ موضوعات ۔ ریاضی ۴ موضوعات ۔

۴۔ جامعۂ انا ملائی ۔ حیوانیات ۵ موضوعات

۵۔ جامعۂ بمبئی ۔ کیمیا ۸۳ موضوعات ۔ طبعیات ۱۲ موضوعات ۔ حیاتیات ۳۱ موضوعات معدنیات ۵ موضوعات ۔ نباتیات ۲۴ موضوعات ۔

۶۔ جامعۂ ڈھاکہ ۔ ریاضیات ۶ موضوعات ۔ طبعیات ۷ موضوعات ۔ حیاتیات ۱۰ موضوعات کیمیا ۳۷ موضوعات ۔

۷۔ جامعۂ میسور ۔ طبعیات ۱۳ موضوعات ۔ کیمیا ۳۲ موضوعات ۔ نباتیات ۲۱ موضوعات حیاتیات ۱۴ موضوعات ۔ معدنیات ۱۰ موضوعات ۔

۸۔ جامعۂ عثمانیہ ۔ حیاتیات ۷ موضوعات ۔ کیمیا ۸ موضوعات ۔ نباتیات ۵ موضوعات ۔

۹۔ جامعۂ ٹراونکور ۔طبعیات ۵ موضوعات۔ کیمیا ۳۲ موضوعات۔ نباتیات ۹ موضوعات۔ حیوانیات ۲۵ موضوعات۔ انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس بنگلور میں طبعیات کے ۲۷ موضوعات پر اور کیمیا کے ۳۳ موضوعات پر کام جاری ہے۔

علاوہ ازیں بعض دوسرے فنون کے سلسلہ میں دو ایک جامعات کے اعداد کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

جامعۂ الہ آباد میں معاشیات کے ۱۲ موضوعات پر کام جاری ہے۔ بمبئی کے اسکول آف اکنامکس اینڈ سوشیالوجی میں پی ایچ ڈی کے لئے ۵۳ موضوعات پر کام ہو رہا ہے اور ام اے کیلئے ۱۵ موضوعات پر۔ جامعۂ عثمانیہ میں ایک موضوع پر کام ہو رہا ہے۔

الہ آباد کی جامعہ میں عربی و فارسی کے دس موضوعات پر کام جاری ہے۔ جامعۂ بمبئی کے صرف ایک کلیہ میں تاریخ کے ۲۵ موضوعات پر کام جاری ہے۔ جامعۂ عثمانیہ میں ۴ موضوعات پر کام کیا جا رہا ہے۔

غرض اس کتابچہ سے کام کے متقابل اندازہ کا بہت اچھا مواد مہیا ہوتا ہے۔

میسور کی جامعہ نے اپنے بی اے کے نصاب میں تاریخ اسلام کو بھی بحیثیت ایک اختیاری مضمون کے داخل کر لیا ہے۔ (اطلاع انٹر یونیورسٹیز بورڈ)

جے پور (اندہرا) کے راجہ صاحب نے جامعات کے ٹینس کے مقابلہ کے لئے ایک قیمتی کپ عطا کیا ہے۔ (اطلاع انٹر یونیورسٹیز بورڈ)

معاشی کتب خانہ

معاشی کمیٹی ایک معاشی کتب خانہ کے قیام کے ابتدائی مراتب سرگرمی سے طے کر رہی ہے۔ یہ کتب خانہ حیدرآباد میں اپنی نوعیت کا پہلا اکیلا کتب خانہ ہوگا۔ معاشی کمیٹی کے ارکان کے علاوہ اہل فن اصحاب اور عامۃ الناس اس کتب خانہ سے استفادہ کر سکینگے۔ جو ہمدردان معاشی موضوعات سے متعلق اپنی تالیفات وغیرہ بطور عطیہ دیں وہ شکریہ کے ساتھ قبول کئے جائینگے۔

انجمن طیلسانیین عثمانیہ اور اسکے ملحقہ اداروں کی اطلاعیں

۱۔ ۲۸ر دے ۱۳۵۲ف کو انجمن طیلسانیین عثمانیہ کا جلسۂ عام کاروباری منعقد ہوا جس میں موازنہ انجمن منظور کیا گیا اندازہ آمدنی ۳۶۰۲ روپے اور خرچ کا اندازہ بھی اسی قدر کیا گیا۔

۲۔ مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ام اے۔ ایچ سی ایس نے اپنے بعض ناگزیر ضروریات اور کم فرصتی کے باعث انجمن کی صدارت سے استعفا دے دیا۔ کابینۂ انجمن نے اپنے اجلاس منعقدہ ۷ر اسفندار ۱۳۵۱ف میں بہ رنج و ملال استعفا منظور کرلیا۔ اور حسب دستور انجمن سال کی باقی ماندہ مدت کے لئے صدارت پر نواب میر احمد علی خاں صاحب ام اے، ال ال، بی کا انتخاب عمل میں لایا۔

۳۔ یہ طے کیا گیا ہے کہ طیلسانیین عثمانیہ کی دسویں سالانہ کانفرنس بمقام بلدہ حیدر آباد بتواریخ ۲۹ و ۳۰ فروردی ۱۳۵۲ف منعقد کی جائے۔ مولوی عبد الرزاق صاحب قادری جعفر ام اے اسکے معتمد منتخب کئے گئے ہیں۔

۴۔ کابینۂ انجمن نے اغراض مندرجۂ ذیل کیلئے ذیلی کمیٹیاں مقرر کی ہیں۔ یا ان کے جدید ارکان مقرر کئے۔

۱۔ نتائج امتحانات جامعۂ عثمانیہ پر غور کرنے کے لئے ۲۔ نگہداشت حقوق طیلسانیین عثمانیہ و فراہمی اعداد ۳۔ ترمیم دستور انجمن۔ ۴۔ رجسٹر اسماء طیلسانیین اور ان کے پیشہ کی تکمیل۔ ۵۔ لسانی کمیٹی۔

۵۔ کابینۂ انجمن نے امور مندرجۂ ذیل کی نسبت ضروری کارروائی اختیار کی ہے۔

۱۔ مجلس رفقا اور دیگر مجالس جامعۂ عثمانیہ میں طیلسانیین عثمانیہ کو راست حق انتخاب حاصل ہونا۔ ۲۔ کلیات جامعۂ عثمانیہ میں داخلۂ طلبہ پر تحدید۔ ۳۔ کلیات جامعہ عثمانیہ میں معافی فیس و وظایف رعایتی۔ ۴۔ انجمن کی مجلس علمیہ کی جدید تشکیل۔ ۵۔ انجمن اور اسکے ملحقہ اداروں کے کتب خانوں سے استفادۂ عام۔ ۶۔ انجمن اور اسکے ملحقہ اداروں کے لئے ذاتی عمارت۔ ۷۔ تنقیح حسابات انجمن۔ ۸۔ اضافہ مدارس نسواں۔ ۹۔ اساتذہ پر تقریر و تحریر کی پابندیاں ۱۰۔ مملکت آصفیہ کے معاشی ذرائع سے کام لینے کی تجاویز۔ ۱۱۔ مسئلہ تعلیم اناث۔

۶۔ دفتر انجمن کے عملے نے ایک انجمن امداد باہمی بنام "انجمن امداد باہمی دفتر انجمن طیلسانیین عثمانیہ" قائم کی ہے

اسکی حسب قانون رجسٹری عمل میں لانے کے لئے کارروائی عمل میں لائی جارہی ہے۔

۷۔ طیلسانیین شعبۂ انجنیرنگ جامعۂ عثمانیہ کی انجمن نے طے کیا ہے کہ اس انجمن کو انجمن طیلسانیین عثمانیہ سے ملحق کردیا جائے۔ دستوری اور ضابطہ کے ضروری امور پر دونوں انجمنوں میں گفت و شنید امید ہے کہ جلد تکمیل کو پہونچ جائیگی۔

اطلاعات مجلس نمائش

۱۔ مولوی سید جمال الدین صاحب ناظم باغات و رکن مجلس مشاورت مجلس نمائش کے انتقال پر مجلس عاملہ نے حسب ذیل قرارداد تعزیت منظور کی۔

"مجلس نمائش معاشی کمیٹی کی مجلس عاملہ مولوی سید جمال الدین صاحب ناظم باغات کے انتقال پر اپنے گہرے تاسف کا اظہار کرتی ہے۔ صاحب موصوف مجلس نمائش کی مشاورتی کمیٹی کے ایک سرگرم رکن تھے۔ سال ہائے گذشتہ میں انہوں نے جس انہماک سے ہمارا ہاتھ بٹایا اسکی یاد کبھی بھلائی نہیں جاسکتی۔ مجلس عاملہ مرحوم کے اعزا و اقارب سے اپنی حقیقی ہمدردی کا اظہار کرتی ہے"

۲۔ مجلس عاملہ نے مجلس نمائش کا موازنہ بابتہ ۱۳۵۲ف جو منظور کیا ہے اس کی رو سے اندازۂ آمدنی (۲۹۳۴۴) روپیہ کیا گیا اور اندازۂ خرچ بھی (۲۹۳۴۴) روپے منتقل بہ مد محفوظ کے لئے (۲۵۰۰) روپے مختص کئے گئے ہیں۔

۳۔ مجلس عاملہ نے نمائش کے سلسلہ میں جو ذیلی کمیٹیاں قائم کی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ مجلس مشاورت، داعی معتمد مجلس نمائش، شرف الدین صاحب ۲۔ مالیاتی کمیٹی، داعی خازن مجلس نمائش، استنکرجی صاحب ۳۔ تشہیر کمیٹی، داعی نائب معتمد مجلس نمائش محمد عبدالعلی صاحب ۴۔ اسٹال کمیٹی، داعی، استنکرجی صاحب۔ ۵۔ کمیٹی رضاکاران، داعی رگھوبیر لی صاحب رکن مجلس بلدیہ ۶۔ کمیٹی امداد و انعامات صناعان، داعی حکیم نارائن داس صاحب رکن مجلس بلدیہ۔ ۷۔ کمیٹی مرکزی اسٹال، داعی عبدالرؤف صاحب دوم تعلقدار۔ ۸۔ مظاہرات کمیٹی، داعی، حبیب خان صاحب ایم ایڈ۔ ۹۔ برقی کمیٹی، داعی، محمد یوسف الدین صاحب ایم اے۔ ۱۰۔ کمیٹی فنون لطیفہ، داعی، خواجہ محمد احمد صاحب مددگار ناظم آثار قدیمہ ۱۱۔ کمیٹی نمائش کلب ما

داعی، راجہ گرو داس صاحب۔ ۱۲۔ تفریحات کمیٹی، داعی، میر وزیر علی خاں صاحب ناظم اعزازی فوجداری بلدہ
۱۳۔ کمیٹی یوم خواتین، داعیہ بیگم ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی۔

۴۔ مجلس نمائش کے دفتر کیلئے ایک ذاتی عمارت مہیا کرنے کے لئے کام شروع کردیا گیا ہے۔

اطلاعات معاشی کمیٹی

۱۔ مجلس عاملہ اور دوسرے ذمہ داران کمیٹی معاشی کانفرنس کے انعقاد میں سرگرم رہے مجلس عاملہ نے اسکے لئے ایک ذیلی کمیٹی مقرر کردی تھی۔

۲۔ مجلس عاملہ نے معاشی کمیٹی کا موازنہ آمد و خرچ بابتہ سنہ ۱۳۵۲ف منظور کیا۔ اندازۂ آمدنی تین ہزار سے زیادہ کیا گیا اور اندازۂ خرچ دو ہزار روپے۔

۳۔ مجلس عاملہ نے معاشی کتب خانہ کے لئے ایک ذیلی کمیٹی مقرر کی ہے اور (۵۰۰) روپے موازنہ میں منظور کئے ہیں۔

۴۔ مجلۂ معاشیات کے لئے بھی مجلس عاملہ نے ایک کمیٹی مقرر کی اور موازنہ میں تین سو روپے منظور کئے ہیں۔

۵۔ دیہات سدھار کے سلسلہ میں مجلس عاملہ نے خاص توجہ مبذول کی ہے۔

اطلاعات عثمانیہ بلدی جماعت

۱۔ نمائش مصنوعات ملکی کے ساتھ جماعت نے ایک کامیاب نمائش اطفال کا انعقاد کیا۔

۲۔ مختلف امور کے انصرام کے لئے کئی ذیلی کمیٹیاں کام کر رہی ہیں۔

اطلاعات جماعت اتحاد و ترقی

۱۔ مجلس عاملہ جماعت کے کام کو پھیلانے کے لئے سرگرم عمل ہے۔

۲۔ جماعت کے قواعد میں مناسب ترمیمات کے لئے ایک ذیلی کمیٹی کام کر رہی ہے۔

۳۔ مجلس تخفیف مصارف سرکار عالی کے لئے ایک یادداشت اور تجاویز مرتب کئے جا رہے ہیں۔

۴۔ گرانی اجناس سلسلہ میں تہیہ ساحت اگر اتفاق سے عمل میں لائی جا رہی ہے اور سب سے روک تھام کیلئے ایک رضاکار جماعت قائم کر رہی ہے۔

رجسٹرڈ نمبر (۲۱) سرکار آصفیہ

منجن شفیع کے متعلق ضروری تصدیق

منجن شفیع ہم نے متعدد مریضوں پر استعمال کرایا جس سے خاطر خواہ فائدہ حاصل ہوا اکثر مریض فائدہ کے معترف ہیں۔ دانتوں کے جملہ بیماریوں کیلئے ہمارے تجربہ کی بنا پر یہ منجن بیحد مفید ثابت ہوا ہے اسلئے ہم ضرور سفارش کرتے ہیں کہ مایوس العلاج مرضا دیہ زود اثر اکسیر صحت، ملکی ایجاد، مفید منجن کے استعمال سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔

اسپیشل منجن شفیع پائیوریا کیلئے بیحد مفید ثابت ہوا ہے۔ دانتوں کے جملہ امراض کی صحت ان منجنوں کے استعمال پر ہی منحصر ہے۔ یقیناً یہ قابل فخر منجن ہے۔

(۱) حکیم مرزا محمود بیگ مہتمم مخزن ادویہ صدر دواخانہ یونانی سرکار عالی۔

(۲) حکیم محمد اعظم صدیقی ناظر الاطبا یونانی سرکار عالی

(۳) حکیم شنکر پرشاد ہری گوبند معتمد دواخانہ آیورویدک سرکار عالی ترپ بازار

(۴) حکیم سید قطب الدین احمد محمودی مدرس مدرسہ فوقانیہ چادر گھاٹ سرکار عالی۔

(۵) ڈاکٹر مانک راؤ ٹیم۔ ڈی چمن گول بنگلہ۔

(۶) حکیم سید علی وکیل ہائیکورٹ دارالشفاء۔

معزز ناظرین

منجن شفیع اسپیشل منجن شفیع کلید شفا ہے۔ یہ منجن دانت کے ہر مرض کا بہترین و بشرطیہ مقبول عام علاج ہے۔ ایک وقت کا امتحان ہماری سچائی کی دلیل ہے۔

ایک وقت جو لگایا جو یا ہوا اسی کا :: دیتا شفا خدا ہے یہ وہ منجن شفیع ہے

تیار کردہ

ملکی کارخانہ منجن شفیع عبدالقادر شریف اسناد و تمغہ یافتہ سرکار آصفیہ باغ مرلیدھر نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

مجلّۂ طیلسانیین

حصّہ

معاشیات

دوسری جلد سنہ ۱۳۵۲ف مطابق سنہ ۱۹۴۳ء پہلا شمارہ

فہرست مضامین

مدیر مجلۂ طیلسانیین ۔ محمد غوث، ام اے ال ال بی، (عثمانیہ)

حرف آغاز

خدا کا شکر ہے کہ "معاشیات" کا دوسرا شمارہ شائع ہو رہا ہے " معاشیات" کے پہلے شمارہ میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ

"دُنیا کے اس خلفشار میں کسی نئے کام کا آغاز بیسیوں مشکلات کا سامنا کرنے کے مترادف ہے۔ یوں تو ہر کام کی ابتدا میں دقتوں کا پیش آنا لازمی ہے چنانچہ اس کوشش میں بھی گوناگوں دقتیں پیدا ہوئیں لیکن تکیہ اس بات پر ہے کہ حرکت میں برکت ہوتی اور کوشش مسلسل سے ہی ہر مشکل کامیابی کا مقدمہ بن جاتی ہے۔"

درحقیقت "معاشیات" کی ہر مشکل آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی ہے۔ معاشی کمیٹی نے مجلّہ کے مالیہ کو مستحکم کرنے میں بڑا حصّہ لیا ہے۔ اسکے لئے مجلّہ کی جانب سے ممنونیت کا اظہار سراسر برمحل ہے۔ یوں یہ کچھ مشکل نہیں کہ ممنونیت کے اظہار کے لئے پُرشکوہ الفاظ میں ایسی عبارتیں لکھی جائیں جو نثر میں قصیدہ کہلائیں۔ لیکن مجلّہ اس کا قائل نہیں۔ اس کا اعتقاد یہ ہے کہ جو تائید و اعانت عمل میں آئے اسکو برمحل صرف کرنا اور اس طرح تائید و اعانت کا جواز ثابت کرنا ہی ممنونیت کا اصلی، صحیح اور حقیقی اظہار ہے۔ خدا کرے کہ مجلّہ کو اپنے محسنوں کے پاس نادم ہونے کی نوبت کبھی پیش نہ آئے۔

مملکت آصفیہ کے مصنوعات کی پانچویں نمائش نے اس سال گوناگوں مشکلات کے باوجود جو کامیابی حاصل کی وہ مبارکباد کی مستحق ہے۔ ۵ برس پہلے رضاکارانہ اصول پر اس کام کی ابتدا ایک نیا تجربہ تھا۔ یہ تجربہ جس قدر جلد کامیاب ثابت ہوا وہ دراصل نیت کی برکت ہے۔ اس تجربہ میں جہاں جہاں قدم ڈگمگاتے ہیں اسکی وجہ نہ صرف جلد معلوم کر لی جاتی ہے بلکہ اصلاح کی کوشش بھی امکان بھر عمل میں لائی جاتی ہے۔ اس سال تو

اسکے لئے آزمایش و ابتلا کا کچھ اور بھی سامان ہوا تھا اور یہ ثابت ہوا کہ نیت کیساتھ صداقت کا بھی بول بالا ہوتا ہے۔

بعض لوگ نیک نیتی سے ہی سہی اس ساری کوشش و سعی کو " تماشا " سے تعبیر کرتے اور عملی نتائج کی لگے ہاتھ توقع کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس پر نظر نہیں ڈالتے کہ خود اس تماشے کے لئے کتنا کام کرنا پڑتا ہے کتنے لوگ اپنا وقت بلا معاوضہ صرف کرتے ہیں اور محنت، مشقت اور عمل کے کتنے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں، اور کچھ نہیں تو چند نوجوانوں کی رضا کارانہ اصول پر کام کرنے کی ہی جو تربیت ہوتی ہے وہی کس قدر قیمتی ہے۔ اسکے علاوہ نمائش نے ملک میں بیداری پیدا کرنے میں خیالات کی اصلاح کرنے میں اور جذبات کو اُبھارنے میں جو حصہ لیا ہے اسکی اہمیت سے کسی کو انکار نہ کرنا چاہیئے۔ اگر اور بھی کام کرنے کے ہیں تو وہ بھی انجام دئیے جائینگے لیکن اور بھی لوگ میدان میں تو آئیں۔ کچھ مشورہ دیں اور کچھ وقت دیں اور کچھ کام کریں پھر دیکھیں خیر و برکت کا چشمہ خود بخود اُبلنے لگتا ہے۔

نمایش کے دوران میں ہی پانچویں معاشی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ اور کامیابی کے ساتھ اس کا اختتام ہوا۔ اس مرتبہ کانفرنس میں بحث کے موضوعات پہلے سے مقرر کردیئے گئے تھے۔ ان پر جو مباحثہ ہوا وہ کافی دلچسپ اور مفید تھا۔ مملکت کے مالیاتی اصول اور معاشی طریقہ کار قرار دینے میں اُن خیالات سے جو کانفرنس میں ظاہر کئے گئے بلاشبہ کافی مدد ملیگی۔ کانفرنس میں جو خطبات پڑھے گئے اور جو مقالات سنائے گئے ان سب کو مجموعۃً مجلّہ کی آئندہ اشاعت میں بطور رُوداد کانفرنس شائع کیا جائیگا۔

معاشی کانفرنس کے سلسلہ میں بھی لوگ یہ کہتے سُنے گئے کہ یہ بھی تماشا ہے۔ اگر تماشا ہے تو تماشا ہی لیکن یہ تماشے اس نیت سے کئے جاتے ہیں کہ ملک کی ترقی کے خاطر خیالات کے اظہار کا بھی تو موقع آئے، کچھ دردمندی کا بھی تو اظہار ہو اور کچھ ملنے جلنے کا بھی تو موقع آئے۔ اگر کام کا مقصد نیک ہے اور کام کرنے والے صادق ہیں تو ان کے خیالات عمل اور سرگرمی کی تمہید ثابت ہونگے۔ پہلے خیال ہی تو پیدا ہوتا ہے۔ عمل اسی سے اپنی خمیر حاصل کرتا ہے

معاشیات کی پہلی اشاعت میں اس بات کا بھی اظہار کیا گیا تھا کہ اسکے آغاز کے موقع پر ارادوں اور

خیالات کا کوئی غیر معمولی اظہار مناسب نہ ہوگا۔ یہی بات اس اشاعت میں بھی دہرانی ضروری ہے،
اس وقت اصلی کوشش یہ ہے کہ مجلّہ کو وقت کا پابند بنایا جائے۔ توقع ہے کہ آیندہ اشاعت اپنے مقررہ
وقت پر اردی بہشت میں شائع ہوجائیگی۔ اور امید کی جانی چاہیئے کہ اس اثنا میں مجلّہ کو معیاری درجہ
حاصل ہوسکے گا۔ بریں ہم "معاشیات" کے لائحہ عمل کو برسبیل تذکرہ واضح کردینا نامناسب نہ ہوگا۔

مجلّہ کے عام حصہ میں "معاصرین کے صفحے" کے تحت ناظرین کو ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی
صدر شعبۂ معاشیات جامعۂ عثمانیہ کا وہ بیان نظر آئیگا جس میں ڈاکٹر صاحب نے یہ بات ظاہر کی ہے کہ
۲۰ سال کے طویل عرصہ میں جامعۂ عثمانیہ سے معاشیات پر کوئی تحقیقاتی تالیف شائع نہیں ہوئی،
یہ ایک حقیقت ہے کہ جامعۂ عثمانیہ میں جو تحقیقاتی کام انجام پاتا ہے وہ منظر عام پر نہیں آتا۔
امتحان ام اے کے لئے جو بیسیوں مقالے لکھے گئے ہیں وہ اور اسکے علاوہ مابعد ام اے مقالے بھی کافی تعداد میں
طبع نہیں ہوئے، ام اے کے تین مقالے مجلّہ نے طبع کئے۔ دو مقالے اس وقت مجلّہ میں زیر طبع ہیں،
ایک حصۂ عام میں اور دوسرا حصۂ معاشیات میں۔ ام اے کا ایک مقالہ رسالۂ معارف اعظم گڈھ نے
شائع کیا اور ایک رسالۂ برہان دہلی میں قسط وار شائع ہورہا ہے۔ مابعد ام اے دو مقالے انجمن ترقی اردو ہند نے
شائع کئے۔ باقی ۷۰، ۵۰ مقالے طباعت کے منتظر ہیں۔ مجلّہ کی یہ تمنّا ہے کہ یہ سب مقالے اسکی وساطت سے
شائع ہوجائیں اور عثمانیہ برادری کا علمی وقار بلند ہو۔ جہاں تک علم ہے معاشیات کے مقالے اگر ہمت
کی جائے تو ایک سال کے اندر ہی سب کے سب طبع ہوجائیں۔ پھر یہ شکایت نہ رہے گی کہ جامعہ سے
معاشیات پر کوئی تحقیقی تالیف شائع نہیں ہوئی، اگر جامعہ اپنے فرزندوں کی تالیفات شائع نہیں کرسکتی تو
خود فرزندوں میں یہ بل بوتا ہونا چاہیئے کہ اپنے برادروں کی کاوش ہائے علمی کو اکارت نہ جانے دیں۔

مجلّہ نے متعدد بار اعلان کیا ہے اور پھر اعلان کرتا ہے کہ اسکے لائحہ عمل کا ایک بڑا جزو طیلسانی
برادری کے مقالوں کی طباعت ہے۔ ہر چند مجلّہ کا مالیہ نہایت کمزور ہے بریں ہم وہ برادر جن کے پاس
قابل طباعت کوئی چیز بھی ہے۔ ترجمہ، مقالہ، تالیف۔ مجلّہ کے پاس بھیجدیں۔ طباعت کا سامان ہو ہی جائیگا۔

یہ تو خیر کام کا ایک پہلو ہوا۔ مجلّہ کے پیش نظر افادہ اور استفادہ کے لئے دوسرے امور بھی ہیں۔

مثلاً اپنے ملک اور دوسرے ممالک کے مشاہیر معاشیات کی زندگی اور ان کی سعی و کوشش کی علمی اور عملی روئدادیں اردو ادبیات کا مستقل جزو بننے کی مستحق ہیں، مجلّہ کوشش کریگا کہ اسکے صفحات پر اس نوعیت کے معیاری مضامین ایک دو نہیں بکثرت شائع ہوں۔ اسی طرح دنیا میں بڑے بڑے کاروباری ادارے کس طرح وجود میں آئے، ان کی تنظیم اور ان کے کام کے طریقوں سے واقف ہونا ہمارے ملک کیلئے نہایت ضروری ہے۔ مجلّہ اس کے لئے بھی اپنے صفحات وقف کریگا۔

اگر حالات اور سرمایہ اجازت دے تو مجلّہ یہ انتظام کریگا کہ شاہدان عینی کے مرتب کردہ حالات اور تاثرات مجلّہ کے صفحات کی رونق بڑھائیں۔ صحیح معاشی معلومات حاصل کرنا اور پھیلانا۔ کاروبار، بازار اور موسم پر مسلّمہ معاشی اصولوں کے تحت تنقید و تبصرہ۔ دلچسپ و سبق آموز اعداد و شمار کی فراہمی۔ معاشی مطبوعات پر تنقید۔ نئی کتابوں کا احوال، اہم خطبات و تقاریر کے نقاط، معاصرین کے صفحات کا جائزہ۔ ہمسایہ صوبوں اور ریاستوں کی سرگرمیوں کی روئداد۔ مملکت آصفیہ کی سرکاری اور غیر سرکاری جد و جہد کا تذکرہ۔ غرض یہ اور اسکے مماثل امور پر مستند مواد اور معلومات فراہم کرنا مجلّۂ طیلسانین کے حصۂ معاشیات کا پروگرام ہے۔

لیکن مجلّہ کے کام اور اسکے مقصد کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔

۲۰، ۲۵ برس ہوئے کہ ایک محب وطن نے ایک انجمن اصلاح معاشرت کے قیام کی ابتدائی یادداشت میں لکھا تھا کہ

"رو تمدن کی چلی آتی ہے موجیں مارتی ═ اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر
دست کاری کو مٹاتی صنعتوں کو روندتی ═ علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر
(حالی)

یہ اشعار مجاز نہیں ہیں بلکہ ان میں واقعہ کی ایسی دل نشین تعبیر ہے جس نے کسی مزید صراحت کا موقع اٹھا نہیں رکھا۔ صدیوں سے ہمارے ملک میں معشیت کے جو طریقے

چلے آئے تھے ان سے ہمارے پاس دولت کی وہ افراط تھی جس نے دور دراز اقطاع عالم کو ہمارے ملک کی دولت کھینچنے کے لیئے بیتاب بنا رکھا تھا۔ ہمارے نشۂ غفلت کی سزا میں بقول حالیؔ "آفتاب مغرب سے نکلنے لگا"۔ بلاد مغرب کی فنی اکتشافات نے انسان کے کمزور ہاتھوں سے برق اور بخار کو مسخر کرلیا۔ دیکھتے دیکھتے ہمارا گرد و پیش بدل گیا۔ ہمارے تمدّن میں بے حد تبدیلیاں پیدا ہوگئیں۔ دخانی کلوں اور بجلی کے تاروں نے ہماری تمام سابقہ معاشرت و معیشت کے تار و پود کو درہم برہم کردیا۔ وہ گھرانے جو دولت کے سایہ میں مست تھے اب بحال تباہ گرفتار ہیں۔ اس سیلاب کی حد سے بڑھی ہوئی شدت اور وحشت انگیز گرانی نے غفلت کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ اب ہم جو سن کہولت کو پہنچ گئے ہیں محسوس کرنے لگے ہیں کہ نئی اور پرانی معاشرت کے پر پیچ اور بعض صورتوں میں ہمارے لئے ناموافق اور نامانوس حالات نے ہمیں کس ضغطہ میں پھنسا رکھا ہے۔ ہر طبقہ کی حالت یکساں غور طلب نظر آئیگی۔ متوسط طبقہ کی یہ حالت ہے کہ معمولی اخراجات کی آخر مہینہ تک سربراہی مشکل سے ہوتی ہے۔ گراں بار قرضہ مرنے کے بعد بھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔ بچوں کی تعلیم کی فکر الگ ہے جو شاید ہی اس بوقلموں دُنیا میں کبھی اس قدر گراں ہوئی ہو۔ پھر اس سے زیادہ مشکل مرحلہ اولاد کی خانہ آبادی کا ہے۔ پرانی دھوم دھام تو ایک طرف معمولی اصول معاشرت کی بجا آوری کی فکر نوجوانوں کے بال سفید بنارہی ہے"

تقریباً ربع صدی کا زمانہ گذر چکا لیکن حالات کی جو تصویر مندرجۂ بالا الفاظ میں کھینچی گئی ہے وہ آج بھی ہو بہو موجود ہے۔ اس جنگ عالم سوز نے ان حالات کو اور بھی بھیانک بنا دیا ہے۔ نہ معلوم دنیا کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے اور نہ معلوم ہمیں چند سال کے بعد کن معاشی مسائل سے دوچار ہونا پڑے۔ "مملکت آصفیہ کی وسعت، ہندوستان میں اس کا محل وقوع اور اسکے وسائل و ذرایع کی بہتات" اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم اپنے معاشی مسائل خود ہی

حل کریں اور ایک خوش حال معاشرہ کے لئے معشیت کے جن عناصر کی ضرورت ہے وہ خود ہی مہیا کریں۔ مجلّہ اس خصوص میں اپنی بساط کے موافق کوشش وسعی کا حق ادا کرنا چاہتا ہے۔

ہر ملک کا حال و مستقبل اسکے ماضی سے مربوط ہوتا ہے اور جب تک کوئی قوم اپنے ماضی سے باخبر نہ ہو اور اپنی گزشتہ غلطیوں اور کوتاہیوں سے سبق لینا نہ چاہے ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ ہم اب اپنی سیاسی تاریخ سے کچھ کچھ باخبر ہو رہے ہیں لیکن ہماری معاشی تاریخ قطعی طور سے تاریکی میں ہے، ہم نے یہ فرصت ہی نہیں پائی کہ اپنے قدیم معاشی نظام کی خوبیوں یا خامیوں کی علمی ضابطہ و آئین کے تحت تحلیل کریں اور دیکھیں کہ ہمارے معاشی نظام کا تار پود کہاں سے بکھرا اور کیوں بکھرا۔ مجلّہ چاہتا ہے کہ اسکے صفحات پر ملک کی معاشی تاریخ کا صحیح اور اصلی مواد زیادہ سے زیادہ مہیا کیا جائے۔

زراعت، صنعت اور تجارت نے اس زمانہ میں سرمایہ اور مزدور، دولت اور تقسیم دولت کے جو نازک اور پیچیدہ مسائل پیدا کردیئے ہیں، ان کے علمی اور عملی پہلو پر تدبیر و دانش نے ابھی کوئی قول فیصل نہیں کہدیا۔ جو اصحاب ان مسائل کے حل کی فکر میں منہمک ہیں مجلّہ کے صفحات ان کے افکار کے اظہار کے لئے ہر وقت کھلے موجود رہینگے۔

اس دور کے عجائبات سے یہ امر بھی ہے کہ بعض قدیم علوم نئے اصطلاحات کے ساتھ مغرب سے مشرق میں آکر نئی دنیا اور نیا آسمان پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان نئے اصطلاحات کی وجہ سے ہم جس علم کو نیا سمجھتے ہیں ایا اس نے کبھی اہل مشرق کے ذہن و دماغ کو مس ہی نہیں کیا! مسئلہ معاش دنیا کا کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ مشرق، جس نے حکمت و دانش کے دریا بہائے ہیں ایا اپنے مسئلہ معاش سے ہمیشہ بالکل ناآشنا ہی رہا؟ تحقیق و کاوش کے لئے یہ میدان کتنا وسیع ہے۔ مجلّہ کی یہ خواہش ہے کہ وہ اس میدان میں کام کرنے والوں کا پوری طرح ہاتھ بٹائے۔

پھر یہ دنیا اپنے خود ساختہ تحدیدوں سے کب تک خود اپنی تباہی کا سامان کرتی رہیگی۔ اب جب کہ زمین کی طنابیں کھینچ گئی ہیں اور وقت و فاصلہ، زمان و مکان نے نیا چولا بدلا ہے آخر انسان کبھی کسی عالمگیر معاشی برادری کا کوئی خواب بھی دیکھیگا؟ اگر خواب دیکھے بھی تو ایا وہ کبھی شرمندۂ تعبیر بھی ہوگا؟ ان سوالات کا جواب مغرب سے نہیں مشرق سے ہی دیا جاسکتا ہے اور دیا جانا چاہئیے۔ اگر کسی کے ذہن و دماغ کی صلاحیتیں اس نور کو دیکھ سکتی ہیں تو وہ مجلّہ کے صفحات کو بھی منور کرے۔

ادارۂ انجمن طیلسانین عثمانیہ کی مطبوعات

۱۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیان ریاست عادل شاہی دور تولیت کی بسیط اور محققانہ تاریخ
مولفۂ سید علی محسن صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) قیمت بارہ آنے ۱۲

۲۔ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی مفصل محققانہ اور مستند تاریخ
مولفۂ ظہیر الدین صاحب یم۔ اے (عثمانیہ) قیمت عہ

۳۔ موضع دوپلی کی معاشی تحقیق از محمد ناصر علی صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) زیر طبع

۴۔ امام غزالی کے کلامی خصوصیات۔ از محمد غوث صاحب (محبوب نگری) زیر طبع

اراکین انجمن اور خریداران مجلّہ طیلسانین عثمانیہ سے نصف قیمت کتب فروشوں کے ساتھ خاص رعایت۔ بغرض سہولت کتابیں تبادلہ میں بھی دیجاتی ہیں۔

ملنے کے پتے

(۱) دفتر مجلّۂ طیلسانین (انجمن طیلسانین عثمانیہ) حیدر آباد دکن نظام شاہی روڈ
(۲) مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن۔

تدابیر انسداد بیروزگاری سلطنت آصفیہ

از جناب مولوی احمد عبدالعزیز صاحب ام ، اے لکچرار معاشیات گلبرگہ کالج

تمہید

آج کل مسئلہ بیروزگاری دنیا کی ہر حکومت کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ یوں تو تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے طلب و رسد عنت کے مسائل دنیا کے ہر حصہ میں جاری رہے ہیں ۔ جس کا ثبوت خود تاریخ سے اس طرح ملتا ہے کہ جب کبھی وسائل معیشت کی تنگی محسوس ہونے لگی تو خانہ بدوش قبائل نے نقل وطن کی صورت اختیار کی۔ اور ایسی جگہ جاکر آباد ہو گئے جہاں ضروریات حیات کی بہ سہولت و آسانی تکمیل ہوتی تھی۔ لیکن آج کل کے مسائل بے روزگاری کی وسعت مقامی نوعیت سے بڑھ کر ایک عالمگیر حیثیت محض اس لیے اختیار کر لی ہے کہ انگلستان کے صنعتی انقلاب کے بعد یورپ کا ہر ملک مشینی ساخت کا سامان تیار کر رہا ہے اور مشینی پیداوار کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عموماً پیدائش بر پیمانۂ کبیر کی طرف راغب رہتی ہے اور پیدائش بر پیمانۂ کبیر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قوی کو قوی تر اور کمزور کو کمزور تر کر دیتی ہے کیونکہ مقابلہ و مسابقت کے بغیر دنیا کا کوئی بھی کارخانہ عالمگیر تفوق کا اعزاز حاصل نہیں کر سکتا۔ بہرحال یہ ایک امر واقعہ ہے کہ انیسویں صدی کے عظیم الشان صنعتی انقلاب نے دنیا کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے ۔ ایک سرمایہ دار اور دوسرا مزدور پیشہ ۔

بیروزگاری کے وجوہ

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بے روزگاری کی پہلی بنیادی وجہ دولت کی غیر مساویانہ تقسیم ہے ۔ دوسری وجہ سیاسی غلبہ بھی ہو سکتی ہے ۔ وہ اس طرح کہ جب ایک قوم دوسری قوم پر

غالب آجاتی ہے تو وہ عموماً محکوم قوم کو بے دست و پا کر دیتی ہے۔ تیسری وجہ اخلاقی کمزوری بھی ہے وہ یہ کہ جب ایک قوم خود زندہ رہنے کے لئے دوسروں کو خوش حال زندگی کے حق سے محروم کرنا چاہتی ہے تو پھر محکومانہ زندگی کے مصائب میں بے روزگاری بھی ایک زبردست مصیبت بن جاتی ہے۔ چوتھی وجہ معاشی اسباب بھی ہیں۔ جب ایک زبردست صناع قوم اپنی نا اتفاقی سے آزادی کی نعمت سے محروم ہو جاتی ہے تو اس کی صنعت و حرفت حاکم قوم کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ ...... اور عموماً ہر حاکم قوم اپنی مصنوعات کو ترقی دینے کی خاطر محکوم قوم کی صنعت و حرفت کو بوجہ عدم سرپرستی موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ پانچویں وجہ تعلیمی بھی ہو سکتی ہے وہ اس طرح کہ اگر ملک میں دفتری خدمات یا خاص پیشے کے ماہرین کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو جائے اور بہ اعتبار طلب رسد کی قلت محسوس ہونے لگے تو اس وقت بھی تعلیم یافتہ بے روزگاری کا مسئلہ نازک صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ہندوستان کا مسئلہ تعلیم یافتہ بے روزگاری کا مسئلہ ہے۔ اس کی وجہ زیادہ تر نظام تعلیم کی خرابی ہے۔ ظاہر ہے کہ نظام تعلیم کی جب تک اصلاح نہ کی جائے گی اور اس کو ملکی ضروریات کے مطابق نہ بنایا جائے گا۔ اس مسئلہ کا خاطر خواہ حل ممکن نہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ایک سو سال کی کورانہ تقلید کے بعد نظام تعلیم کی تبدیلی پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جا رہا ہے اور ہندوستان کا ہر صوبہ نظام تعلیم میں مناسب اصلاح کی تجاویز پر فاعلانہ انداز میں غور کر رہا ہے۔ اس اصول کے تحت ہماری ریاست سرکار عالی میں بھی نظام تعلیم کی اصلاح عمل میں آئی ہے چھٹی وجہ معاشی تغیرات بھی ہیں۔ ہر قوم کے بنیادی عناصر معاشرت غذا لباس اور مکان ہیں یعنے طرز زندگی کے شعائر کی تبدیلی بھی بے روزگاری پر اثر ڈالتی ہے وہ اس طرح کہ جب ایک قوم اپنی قدیم معاشرت میں تبدیلی پیدا کر کے جدید معاشرت اختیار کر لیتی ہے تو رسم و رواج کے تغیر کی وجہ سے ان صناعوں دستکاروں اور اہل حرفت کے روزگار پر اثر پڑتا ہے جو اس قوم کی معاشرتی ضروریات کی بہم رسانی کرتے ہیں۔

ساتویں وجہ جذبۂ قومیت کی ترقی ہے۔ جب ایک قوم اپنی صنعت و حرفت کی ترقی کی

خاطر دوسری قوم کی ارزاں مصنوعات خریدنے سے پرہیز کرنے لگتی ہے تو اس صنعتی ملک پر بے روزگاری کا اثر پڑتا ہے کیونکہ اصول طلب و رسد کی بنا پر جب تک رسد طلب کی مطابقت نہ کرے تجارت میں توازن قائم نہیں ہوسکتا اور فوراً رسد کی بے وقعتی کی وجہ سے تجارتی کساد بازاری کا دور دورہ شروع ہوجاتا ہے چنانچہ تمام دنیا کو کساد بازاری کی وجہ سے بے روزگاری کی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑا تھا اور یہ مسئلہ باوجود کوشش بسیار آج تک خاطر خواہ طریقہ پر حل نہ ہوسکا اور مستقبل قریب میں بھی حل ہونے کی کوئی توقع نہیں۔

آٹھویں وجہ سائنس کی حیرت انگیز ترقی اور نت نئی ایجادات کی فراوانی ہے۔ ہر ملک کے سائنس داں بطور بدل قومی ضرورت کی نئی نئی چیزیں اختراع کررہے ہیں مثلاً جرمنی میں خارجاً مسموع ہوا کہ ہوا سے نائٹریٹ حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے اسی طرح ارزاں کھاد کی ایجاد سے زرعی پیداواروں کی قیمتوں میں حیرت انگیز کمی واقع ہوئی ہے اب جو ممالک قدیم طریق کاشت کے عادی ہیں اُن کی پیداواریں بہ نسبت جدید طریق کاشت والے ممالک کے مقابلہ میں عموماً گراں ہوتی ہیں اس لئے زرعی مزدوروں کی بیروزگاری کا مسئلہ ہندستان میں دن بدن خطرناک صورت اختیار کررہا ہے اور ہندوستان کی زرعی خستہ حالی کے اسباب میں سے ایک سبب قدیم طرز کا طریقہ کاشت بھی ہے ہندوستان کے اجناس بوجہ متقابلہ ارزانی کے اب وہ قدر و قیمت کے مالک نہیں رہے جو گزشتہ جنگ عظیم کے پیشتر تھے۔

بہرحال یہ آٹھ اسباب منجملہ کئی اسباب کے ہیں اگر ان اسباب میں محصولات تامینی کی حکمت عملی کو شامل کیا جائے تو یہ نواں سبب بھی آج کل بجد اہمیت حاصل کرچکا ہے اس کا سبب گزشتہ جنگ عظیم ہے جبکہ ہر ملک اپنی معاشی بے بضاعتی کی وجہ سے دوسرے ملک کی امداد کا محتاج نظر آیا۔ بعد اختتام جنگ ہر حربی ملک اپنی معاشی کمزوریوں کو رفع کرنے کی پیہم کوشش میں مصروف ہوگیا قانون موازنہ مصارف کا عالمگیر عمل جذبۂ قومیت کے سیلاب میں بہہ گیا۔

اور محاصل درآمد کی دیواروں کو بلند کرکے ہر آزاد و دیگر کمزور ملک نے اپنی صنعت وحرفت وزراعت کو ترقی دینے کی انتھک کوشش شروع کردی۔ نتیجہ اس صورت حال کا یہ ہوا کہ دوسرے ممالک کے کارخانے بوجہ کمی طلب بتدریج بند ہونے لگے اور اس طرح اُس ملک میں بے روزگاری پھیلنے لگی جیسے کہ ہندوستان میں سودیشی تحریک نے غیر ملکی پارچہ کو نقصان پہنچایا۔

ایک آخری دسویں وجہ مغربی ممالک کے اعلیٰ معیار زندگی کی بھی بیان کی جاتی ہے۔ مغربی تہذیب کا دستورالعمل یہ ہے کہ احتیاجات بڑھاؤ اور اس طرح دولت زیادہ پیدا کرو کیونکہ مغربی معاشیات میں ہر وہ چیز جو انسانی احتیاج کو پورا کرے دولت ہے۔

جب تک احتیاجات نہ بڑھائی جائیں معیار زندگی بلند نہیں ہوسکتا۔ اور پھر جب تک معیار زندگی بلند نہ ہو دولت زیادہ سے زیادہ مقداروں میں پیدا کرنے کی نہ کوئی خواہش ہوتی ہے اور نہ جوش عمل کا اظہار۔ بہر حال عام طور پر یہی دس اسباب ہیں جن کو معاشئین عالم موجودہ بیروزگاری کے عوامل بیان کرتے ہیں مگر یہ بھی یاد رہے کہ یہ عوامل بے روزگاری ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ نہیں کیا جاسکتا جہاں تک انسداد بیروزگاری کا تعلق ہے کسی ملک میں بیروزگاری کے اسباب کی مساحت اس وقت تک مکمل تصور نہیں کی جاسکتی جب تک ان دس وجوہات کی کسوٹی پر اس ملک کے حالات کی جانچ نہ کرلی جائے اس لئے ہم ان ہی وجوہات کی روشنی میں انسداد بیروزگاری کی تدابیر و تجاویز پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہندستان کے وسائل صنعتی

سب سے زیادہ ضروری بات جہاں تک کہ ہندستان کی بیروزگاری کا تعلق ہے یہ ہے کہ قدرتی وسائل معیشت کی فراوانی کی بنا پر نہ صرف ہم مسئلہ زراعت ہی کی ترقی پر غور کریں بلکہ مسئلہ ترقی صنعت وحرفت پر بھی زیادہ سے زیادہ توجہ کریں۔ ہندوستان کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جس کا سیدھا ہاتھ تو طاقتور ہے لیکن بایاں ہاتھ مفلوج ہے اس لئے وہ جہاد زندگی میں اپنے آپ کو کمزور پاتا ہے

پس ضرورت اس امر کی ہے کہ اس حالت کو دور کیا جائے ہندوستان میں مسئلہ زراعت ضرورت سے زیادہ قابل توجہ بن گیا ہے اور صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے خاطر خواہ پیمانہ پر غور و خوض نہیں کیا گیا۔ ہندوستان زمانۂ قدیم سے درجہ اول کا صنعتی ملک رہا ہے اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ اس ملک میں صنعتی ترقی کے جملہ ذرائع موجود تھے۔ یہاں زرعی صنعتی حیوانی جنگلاتی اور معدنی پیداواریں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ملک ہند اپنی قسمت کا آپ مالک تھا حکومت وقت عوام کے ذرائع معیشت کی تبدیلی میں کبھی غور نہیں کرتی تھی۔ بلکہ ہندوستان کا خود مکتفی دیہاتی نظام ہزاروں سال سے ترقی پذیر حالت میں برقرار چلا آتا تھا۔ اس کو زمانہ کی ستم ظریفی کہنا چاہیئے کہ ہندوستان کی محکومی نے اس کو یہ روز بد دکھایا۔ بہرحال ہندوستان کے خاص معاشی حالات نے جس صورت حال کو پیدا کیا وہ یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ تسلط کے بعد ہی ہندوستان بتدریج درجۂ اول کے صنعتی ملک کی حیثیت سے گھٹ کر ایک خستہ حال زرعی ملک بن گیا

زراعت پر اکتفا کرنے کی خرابی

ظاہر ہے کہ زراعت عموماً قانون تقلیل حاصل کی پابند ہوتی ہے اور صنعتیں عموماً قانون تکثیر حاصل کی پیروی کرتی ہیں پس بقول سر فریڈرک لسٹ مشہور جرمن معاشی کے کوئی قوم زراعت میں خواہ کتنی ہی ترقی یافتہ ہو ایک ہی ہاتھ والی قوم کہلائے گی اور جب تک وہ ملک صنعتی دنیا میں ترقی نہ کرے کبھی بھی خوشحالی کے اس معیار کو حاصل نہیں کرسکتا جس کے حاصل کئے بغیر کوئی قوم معاشی اعتبار سے خوشحال تصور نہیں کی جاسکتی۔ بہرحال اس وضاحت کا مطلب یہ ہے کہ محض زراعت پیشہ ملک قوم کی جملہ ضروریات کی تکمیل نہیں کرسکتا اس کے لئے صنعت و حرفت کا ہونا بھی لازمی ہے اور یہ بات قانون قدرت کے بھی عین مطابق ہے وہ اس طرح کہ قدرت نے ہر انسان کو ایک خاص کام کے لئے پیدا کیا ہے بعض افراد قوم قدرتی طور پر سائنس میں ملکہ حاصل کرتے ہیں بعض انجینرنگ کے لئے بعض طب کے لئے اور بعض پروفیسری کے لئے موزوں ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قوم کے اگر کل افراد باوجود اس قسم کی مختلف ذہانتوں کے صرف زراعت ہی کے لئے حالات زمانہ کی مجبوری کی بنا پر مختص ہوجائیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ قدرتی ذہانت کا خون ہوا اور مختلف فائدہ رساں ذہانتیں

اپنی ناقدری کی بہ دولت مفلوج ہوگئیں پس محض زراعت پیشہ ملک ہونے ہیں یہ سب سے بڑی خرابی مضمر ہے کہ مختلف قابلیتوں کے افراد قومی ترقی کا باعث ہونے کے بجائے پیشہ زراعت کو مجبوراً قبول کرنے کی بنا پر فطرتاً قدامت پرست ہوجاتے ہیں۔ برخلاف اس کے صنعت وحرفت کی ترقی کی ہر قوم کے لئے اسلئے سخت ضرورت ہے کہ مختلف قابلیتوں کے افراد کی کھپت ہر پیشہ کی موزونیت کے لحاظ سے ہوجاتی ہے۔ ایک زراعت پیشہ قوم کی بے روزگاری کا واحد علاج اس ملک کی ترقی صنعت وحرفت ہے عام طور پر یہ معاشی نظریہ کم ازکم ہندوستان کی حد تک بالکل صادق نہیں آتا کہ ہندوستان کا ہر فرد معاشی انسان کی حیثیت سے اپنی زندگی بسر کر رہا ہے واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان جیسے صنعت کی ترقی کے لئے قدرتی موزونیت رکھنے والے ملک میں پیشہ زراعت کا عالمگیر رجحان اور زراعت پیشہ افراد کی ستر فیصدی کثرت محض اس لئے پائی جاتی ہے کہ اس ملک کی سیاسی محکومی نے اس کو معاشی اعتبار سے بھی محکوم بنا دیا ہے۔ اور اس لئے صنعت وحرفت کی ترقی مفلوج حالت میں ہے۔

پس اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں صحت بخش اصول پر مسئلہ بیروزگاری کو حل کرنا مقصود ہے تو سب سے پہلے پیدائش بر پیمانہ صغیر کے علاوہ پیدائش بر پیمانہ کبیر کی صنعتوں کو ترقی دینے کی شدید ضرورت ہے تاکہ ہزاروں لاکھوں افراد مختلف پیشیوں میں مصروف ہوکر اپنی زندگی بجائے خستہ حالی کے خوشحالی کے ساتھ گزار سکیں۔

ہندستان کا مسئلہ بیروزگاری

اب ہم ہندستان کے ان خاص حالات کا ذکر کریں گے جو مسئلہ بیروزگاری کو ایک بھیانک صورت میں تبدیل کر کے پیش کر رہے ہیں تقریباً ہر متمدن ملک میں عموماً صنعتی بیروزگاری کی دبا اشیائے ما یحتاج کی طلب و رسد میں عدم توازن کی وجہہ سے بڑھتی جا رہی ہے لیکن ہندستان چونکہ ابھی دنیائے صنعت وحرفت میں گویا طفولیت سے گزر رہا ہے اسی لیئے ابھی ہندستان میں صنعتی بیروزگاری کا مسئلہ وہ اہمیت نہیں حاصل کرسکا جو ترقی یافتہ مغربی ممالک میں ہے البتہ نہ صرف ہندستان میں بلکہ خود سلطنت

حیدرآباد میں جو مسئلہ بیروزگاری حکومت کو پریشان کر رہا ہے، وہ تعلیم یافتہ بیروزگاری کا حوصلہ شکن مسئلہ ہے۔ واضح رہے کہ ہندوستان میں تعلیم یافتہ بیروزگاری کے مسئلہ کی جو نوعیت ہے وہ دوسرے ممالک متمدنہ میں نہیں ہے۔

تعلیم یافتوں کی بیروزگاری

اس تعلیم یافتہ بیروزگاری کے اسباب میں سب سے بڑا سبب نظام تعلیم کی کمزوری ہے اس لیے کہ ۱۸۳۵ء سے ۱۹۳۵ء تک یعنے کامل ایک صدی تک منجانب حکومت عام تعلیم کے لیے اس لیے زور دیا گیا کہ چند تعلیم یافتہ اہلکار حکومت کی دفتری ضروریات کی تکمیل کرسکیں لیکن اب دفتری خدمات بھی تعلیم یافتہ امیدواروں کی طلب محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ کیونکہ اگر تمام قوم اہلکارانہ خدمات کی انجام دہی کے لیے تیار کی جائے تو اتنی خدمات ہی کہاں ہیں جو ہر امیدوار ملازمت کے لیے روزی فراہم کرسکیں اور جب کسی تعلیم یافتہ فرد کو باوجود اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے دنیا میں خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی حد تک مایوسی ہوتی ہے تو یہ مایوسی حکومت سے نفرت اور موجودہ نظام سیاست و معیشت کی تخریب کی جانب مائل و مبدل ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۵ء کے بعد سے ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہر صوبجاتی حکومت انسداد بیروزگاری کے وسائل دریافت کرنے کے لیے باقاعدہ کمیشن مقرر کر رہی تھی۔ خود مملکت حیدرآباد میں بھی سیکنڈری اسکیم اسی لیے مرتب کی گئی کہ حالات زمانہ کے لحاظ سے نظام تعلیم میں اصلاح کی جائے۔ یوں تو ہر صوبہ میں کسی نہ کسی کمیٹی کا انعقاد مسئلہ بیروزگاری کی تحقیقات کے لیے عمل میں آیا لیکن سپرو کمیٹی کے سفارشات سب سے زیادہ قابل عمل ثابت ہوئیں اس لیے ان سفارشات کی روشنی میں مملکت حیدرآباد میں مسئلہ بیروزگاری کو حل کرنے کی مختلف تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔

حیدرآباد میں تعلیم یافتہ آبادی کی بیروزگاری کے ازالہ کی تدابیر

واضح رہے کہ مثل ہندوستان کے حیدرآباد میں بھی تعلیم عامہ کی حیرت انگیز ترقی کی وجہ سے تعلیم یافتہ بیروزگاری کا مسئلہ دن بدن اہمیت اختیار کرتا جارہا ہے اور اس باب میں حیدرآباد میں بھی وہی تدابیر

اختیار کی جانی چاہیئے جو ہندستان کے دوسرے صوبجات میں اختیار کی جارہی ہیں یا اختیار کی جانے والی ہیں یہ تدابیر حسب ذیل ہیں۔

(۱) نظام تعلیم کی ضروریات زمانہ کے اعتبار سے تبدیلی۔

(۲) صنعت و حرفت و زراعت کی ترقی کے لئے صنعتی و زراعتی کالجوں کا قیام۔

(۳) صاحب حوصلہ افراد کی واجبی شرح سود پر قرضہ سے سرپرستی۔

(۴) تحفظ صنعت و حرفت ملکی کے لئے تامینی محصول عاید کرنا۔

(۵) پیدایش بر پیمانۂ کبیر کی صنعتوں کو مالی حالت کی سہولت کے اعتبار سے عوام پر صنعتی شوق پیدا کرنے کے لئے خود حکومت جاری کرے یا نہیں تو کثیر حصص خرید کر کارخانہ کی کامیابی کا عوام کو یقین دلائے۔

(۶) ۱۳۴۰ء کے معاہدہ تجارتی میں ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ترمیم کی جائے۔

(۷) ہر محکمہ کو پابند کیا جائے کہ بہ وقت ضرورت سررشتۂ تحصیل معیشت سے امیدواران ملازمت حاصل کرے۔ امیدوار کا انتخاب اس کی ذاتی قابلیت کی بنیاد پر عمل میں آئے نہ کہ سفارش کی بنا پر۔

(۸) ملکی مصنوعات کی ترقی کے لئے اوّل تو عوام میں اپنا نفس کی تعلیم دی جائے۔ دوسرے پیدائش بر پیمانۂ صغیر کی صنعتوں کی بر وقت مالی امداد فرمائی جائے۔ اور اس باب میں قوانین امداد باہمی میں ترمیم کی جائے۔

(۹) خود حکومت اپنے دفاتر میں اور دیگر حکومتی ضروریات کی تکمیل کے لئے ملکی کارخانوں کو آرڈر دیکر اُن کی سرپرستی کرے۔

تدابیر کی تفصیل

جہانتک حیدرآباد کا تعلق ہے بڑی خوشی کی بات ہے کہ نظام تعلیم میں حالات زمانہ کے تغیر کے لحاظ سے خاطر خواہ تبدیلی عمل میں آرہی ہے۔ اب مکینزی اسکیم کی منظوری کے بعد عام تعلیمی مدارس کے ساتھ

ہی ساتھ صنعتی اور حرفتی مدارس بھی قائم کئے جارہے ہیں۔ لیکن اس باب میں سخت ضرورت اس امر کی ہے کہ عوام کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ اور کسی پیشہ کو محض اس لئے نہ ذلیل سمجھا جائے کہ وہ اب تک ان افراد کا ذریعۂ معاش رہا جو سماجی اعتبار سے کوئی خاص مرتبہ نہ رکھتے تھے۔ بلکہ اکل حلال کے فلسفہ کی تشہیر کی جائے۔ اس تشہیر کے لئے اگر ایک ہنگامی اسٹاف کے تقرر کی بھی ضرورت پیش آئے تو منجانب محکمہ صنعت و حرفت یا دفتر تحصیل حیثیت ایسے ملکی زبان جاننے والے افراد کا تقرر کیا جائے جو موضع موضع اور تعلقہ تعلقہ دورہ کرکے عوام میں فرسودہ ذہنیت کی تبدیلی کی کوشش کریں۔ جہاں تک ہندو قوم کا تعلق ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ بہ وجہ ذات پات کے قیود کے ہر پیشہ کو جو موجودہ زمانہ میں منفعت بخش ثابت ہورہا ہو۔ ہر ذات والا ہندو فرد قبول نہ کرسکیگا۔ ذات پات کی قیود کی وجہ سے ہر ہندو غریب فرد اُس پیشہ کو قبول نہیں کرسکتا جس سے اسکی ذات پر حرف آتا ہو۔ البتہ وہ اقوام جن کے مذہب میں ذات پات کوئی چیز نہیں ہے ضرور ہر منفعت بخش پیشہ کو قبول کرسکینگی۔ ہر مسلم فرد اکل حلال کے اُصول کی تقلید میں ہر منفعت بخش پیشہ کو قبول کرسکتا ہے۔ صرف ضرورت اس امر کی ہے کہ شدت سے تعلیم اور نشر عمل میں لائی جائے اور واعظین و علماء اور سرکاری پروپگنڈا اسٹاف کی جانب سے یہ کام شروع کردیا جائے۔ اور اس کو ایک ثواب کا کام سمجھا جائے۔ کیونکہ اس پروپگنڈے سے قوم کی معاشی حالت درست ہونیکا قوی امکان ہے۔ جہاں تک ترقی صنعت و حرفت کے لئے سرکاری امداد کا تعلق ہے۔ اُس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت سرکار عالی نے نہ صرف مالی امداد کا انتظام ایک انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ قائم کرکے کیا ہے۔ بلکہ اعلیٰ پیمانہ پر جو کارخانے قائم کئے گئے ہیں یا قائم کئے جارہے ہیں اُن کے حصص خرید کر عوام میں اعتماد کی ایک اسپرٹ بھی پیدا کررہی ہے۔ لیکن شدید ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت اس امر کا خاص خیال رکھے کہ کسی کارخانہ کے قائم کرنیکے پیشتر اس کارخانہ میں کس قسم کی قابلیت والے افراد کی ضرورت ہوگی۔ اس کا پہلے اندازہ کرلے اور جب تک ایسی قابلیت والے افراد ملک میں موجود نہوں اُس کارخانہ کے قائم کرنے میں تامل کرے۔ کیونکہ ایسے کارخانوں کے قیام سے ملک کو اسوقت فائدہ حاصل ہوگا جبکہ اُس کارخانہ کی اعلیٰ خدمات کے حامل افراد

باہر کے نہ ہوں۔ اگر کارخانوں میں کام کرنے والے افراد باہر کے ہوں تو ملک کی بیروزگاری دفع نہ ہوگی بلکہ علی حالہٖ قائم رہیگی۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد موجود نہ ہوں تو مجبوراً باہر کے افراد کا تقرر کیا جاتا ہے۔ مگر یہ اعتراض اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا۔ کیونکہ جب ملکی افراد موجود نہ ہوں تو قبل از قبل حکومت طلبہ کے سرپرستوں پر ظاہر کردے کہ وہ فلاں قسم کے فن داں طلبہ کی ضرورت کو چار سال کے بعد یا دو سال کے بعد محسوس کریگی۔ اس لئے ہونہار طلبہ کے والدین اس فن کے موزوں طلبہ کو اس فن کی تعلیم دلائیں یا اگر کوئی طالب علم ذہین ہے مگر غریب ہے تو خود حکومت اسکو تعلیم دلائے حکومت نظامئے کارخانہ کو مطلع کردے کہ کوئی کارخانہ ریاست حیدرآباد میں اُسوقت تک قائم نہ ہوسکیگا جب تک کہ (۷۵) فیصدی ملکی سرمایہ کے علاوہ اس کارخانہ کے مہارت یافتہ یا بے مہارت مزدور ملکی نہ ہوں بہرحال یہ وہ کامیاب طریقہ ہے جسکا تجربہ ہر جگہ کیا جاچکا ہے۔ اور آج کل ایران و ترکی وغیرہ میں بھی کامیابی سے کیا جارہا ہے۔

مخفی مباد کہ ریاست حیدرآباد کی صنعتی ترقی میں ۱۸۰۲ء کا وہ تجارتی معاہدہ سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہا ہے۔ جو بہ زمانہ نواب نظام علیخاں بہادر سرکار آصفیہ اور سرکار کمپنی کے مابین طے پایا تھا۔ اس معاہدہ کی بناء پر ملکی صنعت و حرفت کے تحفظ کیلئے ہماری ریاست غیر ملکی مصنوعات پر پانچ فیصدی سے زیادہ محصول درآمد نہیں عائد کرسکتی۔ حالانکہ جب کوئی صنعت عالم طفولیت سے گزرتی ہے تو اسوقت اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ غیر ملکی مستحکم صنعت کے مقابلہ میں ملکی جدید صنعت کو بچایا جائے۔ ورنہ گلوتراش مقابلہ کی تاب نہ لاکر نوپید ملکی صنعت ضرور تباہ ہو جائیگی۔ چنانچہ یہ ایک اندوہناک حقیقت ہے کہ غیر ملکی صابن کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر گولکنڈہ صابن کے کارخانہ نے دم توڑ دیا۔ اسی طرح بیرونی مقابلہ کی تاب نہ لاکر عثمان شاہی ملز نانڈیڑ نے اپنی شکست کا اعتراف کرلیا تھا۔ اور قیام کارخانہ کے آٹھ سال بعد صرف بمشکل سے دو یا ڈھائی فیصدی منافع تقسیم کیا جانے لگا۔ حالانکہ عوام اگر سیونگ بنک میں اپنا اندوختہ محفوظ کراتے تو اُس زمانہ کے لحاظ سے کم از کم تین فیصدی منافع حاصل کرتے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تامینی محصول کی دیوار میں جب غیر ملکی صنعت کے مقابلہ کا زور توڑنے کیلئے نہیں کھڑی

لی جاسکتیں تو آیا یہ ممکن بھی ہے کہ حیدرآباد میں پیدائش بر پیمانۂ کبیر کی صنعتیں قائم کیجاسکیں بہ حالات موجودہ حیدرآباد میں اعلیٰ صنعتوں کی یقینی کامیابی کے متعلق کوئی قطعی دلیل نہیں پیش کیجاسکتی۔ ظاہر ہے کہ جب تک اعلیٰ پیمانہ پر کارخانے قائم نہ ہوں اور انکی کامیابی کا عوام کو گذشتہ تلخ تجربات کی بناء پر یقین ہو وہ کس طرح اپنا سرمایہ خریدی حصص میں مشغول کرسکینگے۔ جب ایک مرتبہ اس معاملہ کا کوئی مناسب حل دریافت کرلیا جائے تو نہ صرف اعلیٰ پیمانہ پر کارخانے قائم ہونگے بلکہ سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں مزدور ان کارخانوں میں مصروف رہکر بیروزگاری کے مسئلہ کی اہمیت کو بہت بڑی حد تک گھٹا دینگے۔
خدا کا شکر ہے کہ دفتر تحصیل معشیت کے قیام سے ریاست حیدرآباد میں ایک سخت ضرورت کی تکمیل کردیگئی ہے۔ کیونکہ جبتک بیروزگاروں کا پتہ نہ چلے روزگار فراہم کرنیکی تدابیر عملی صورت اختیار نہیں کرسکتیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر سررشتہ بطور خود امیدواروں کی تلاش کرنیکی بجائے صرف دفتر تحصیل معشیت سے اپنا ربط قائم کرکے حسب خواہش امیدواروں کو حاصل کرلے۔

جہاں تک زرعی بیروزگاری کا تعلق ہے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ کاشتکار طبقہ کے وسائل معشیت میں اضافہ فرمایا جائے محض فصلوں کی کاشت کاشتکار کو متمول نہیں بنا سکتی۔ بلکہ باغبانی، مرغبانی زرعی ضرورت کے آلات و اوزار بنانیکی تعلیم اور علاج حیوانات کے ابتدائی اصول کی تعلیم بھی سخت ضروری ہے۔ فصلوں کی کاشت میں ایسی زرعی ساحت کی ضرورت ہے جسکی بناء پر یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ کونسی زمین کس قسم کی کاشت کیلئے موزونیت رکھتی ہے۔ اس خصوص میں قانون طلب و رسد کے تحت منجانب سررشتہ زراعت ایسی فصلوں کی کفایت شعارانہ اصول پر کاشت کی ترغیب دی جائے جنکی ممالک غیر میں شدید طلب ہے۔ اور غیر ممالک سے آرڈر حاصل کرنے کیلئے مثل ریاست میسور ٹریڈ کمشنروں کا تقرر عمل میں آئے۔ اس تقرر کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ درمیانی تاجروں کی جماعت ناجائز نفع اندوزی کا بوجہ جہالت کاشتکار کبھی خیال نہ کرسکیگی۔ اس ضرورت کے ارتفاع کیلئے زرعی مارکٹوں کے قیام کی بھی ضرورت ہے بشکر خدا کہ ایسے مارکٹ ریاست سرکار عالی کے مختلف اضلاع میں قائم کئے گئے ہیں اور ایک مارکیٹنگ آفیسر کا تقرر بھی عمل میں آیا لیکن یہ سب کچھ اندرون ملک پیداواروں کی فروخت کی حد تک درست ہے۔ لیکن جہاں تک تجارت خارجہ

ریاست حیدرآباد کی تنظیم کا تعلق ہے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ تجارتی کمشنروں کا تقرر عمل میں آئے۔ یہ معلوم کرنا موجب دلچسپی ہوگا کہ ہماری ریاست کے (۹۰) فیصدی روغنی تخم فرانس میں خریدے جاتے تھے لیکن اسپر بھی صوبہ گلبرگہ کا روغنی تخم والا کاشتکار مفلس ہی ہے۔ اسکی وجہ زیادہ تر یہی ہے کہ جو منافع کاشتکار کو ملنا چاہئے وہ بہت بڑی حد تک تجارتی دلالوں کے جیب میں چلا جاتا ہے۔ مسٹر ڈارلنگ مشیر زراعت پنجاب نے "نقصان کسان" کے موضوع پر عرصہ ہوا ایک بیان شائع کیا تھا جس میں انھوں نے صراحت کے ساتھ بیان کیا تھا کہ ہندوستانی کاشتکار اپنی پیداوار کی تمام قیمت ایک روپیہ میں سے صرف نو آنے وصول کرتا ہے۔ اور بقیہ سب منافع درمیانی تاجروں کی جیب میں چلا جاتا ہے کیا اچھا ہوتا ہماری ریاست میں بھی اس نازک مسئلہ کے حل کی طرف قرار واقعی توجہ کیجاتی۔ اور اسطرح زرعی بیروزگاری کا مسئلہ بہت بڑی حد تک حل ہو جاتا۔

چند عملی تدابیر

یہاں تک تو اصولی حیثیت سے مسئلہ بیروزگاری کے انسداد کی بنیادی مسائل سے بحث کیگئی۔ اب عملی حیثیت سے بھی کچھ اور تدابیر بیان کیجاتی ہیں۔ یہ یاد رہے کہ ہر وہ چیز جو ملک کی معاشی ترقی کے مسئلہ کو حل کرنے میں معاون ہو سکتی ہے۔ وہ ساتھ ہی ساتھ مسئلہ بیروزگاری کا بھی حل دریافت کر سکتی ہے۔ جب عوام کا معیار تمول عام ملکی خوشحالی کی وجہ سے بڑھ جاتا ہے تو اسی وقت کارخانوں اور صنعتی اداروں کی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ اہلکاروں پروفیسروں اساتذہ وکلاء ڈاکٹروں فروشندگان مال تجارت ناظمان تجارت اور منتظمین بیمہ کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح جب کبھی حکومت ملک کی ہمہ جہتی ترقی کی جانب کوشش کرتی ہے تو نئے نئے سر رشتوں کے قیام سے جدید تقررات کا سوال درپیش ہوتا ہے۔ اور اس طرح تعلیم یافتہ بیروزگاروں کیلئے نئے وسائل روزگار فراہم ہوجاتے ہیں تعلیم یافتہ آبادی کی بیروزگاری کے انسداد کیلئے ریاست عمل کی تجاویز ذیل میں پیش کیجاتی ہیں۔

(۱) وہ تجاویز جن پر عمل کرنے کی صورت میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی طلب بڑھ جائیگی۔

(۲) وہ تجاویز جن کو بروئے کار لانے کی صورت میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تعداد گھٹ جاتی ہے۔

(۳) وہ تدابیر جن کو اگر عملی جامہ پہنایا جائے تو تعلیم یافتوں کی طلب و رسد میں ایک قسم کا توازن پیدا ہو جائیگا ذیل میں ہر ایک کی مختصر تشریح کیجاتی ہے۔

(۱) تعلیم یافتہ نوجوانوں کی طلب میں اسی وقت اضافہ عمل میں آسکتا ہے ۔ جب کہ

الف مجلس صفائی اور مجالس ضلع اعلیٰ تعلیم یافتہ انجینیروں اور سپروائزروں کا تقرر سرکاری عمارات کی نگرانی کرنے یا سرکاری سڑکوں کی جانب سے کلفنڈ تعمیر کرنے یا فرائض نگہداشت کی انجام دہی کیلئے عمل میں لائیں ۔

ب ۔ یہ کہ حکومت کیجانب سے سند یافتہ ڈاکٹروں کو دیہاتی علاقوں میں پھیل جانے اور بروقت طبی امداد بہم پہنچانیکی شدید ضرورت کے مدنظر بہ اعتبار آبادی طبی امدادی حلقے باقاعدہ طور سے مقرر کئے جائیں ۔ اور ہر حلقہ کے کسی موزوں مقام پر سند یافتہ ڈاکٹر کو چاہیئے کہ اپنا مطب کھولے ۔ اور منجانب لوکلفنڈ ایسے ڈاکٹر کو کوئی مستقل الونس بھی دیا جائے ۔ اور کسی ڈاکٹر کا سرکاری دواخانہ کی جائید اور پر اسوقت تک تقرر نہ کیا جائے جب تک کہ وہ کم از کم پانچ سال خانگی مطب کر کے اپنی ہمدردی اور مقبولیت کا عوام کے دلوں پر سکہ نہ بٹھا دیا ہو ۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر ایک طرف خانگی ڈاکٹروں کی کھپت زیادہ ہوگی تو ساتھ ہی ساتھ تجربہ کار سلیم الطبع سرکاری ڈاکٹر حکومت کو دستیاب ہونگے ۔

ج ۔ اسی طرح سرکاری طور پر ایسے عمل خانے قائم کئے جائیں جہاں سند یافتہ ڈاکٹر صاحبان ملکی جڑی بوٹیوں کی تحقیقات کر کے امراض مزمنہ کے نئے نئے علاج دریافت کریں ۔ ایسے ڈاکٹروں کی خصوصیت کے ساتھ سرپرستی کیجائے جو نئی نئی دوائیں ایجاد کر کے ملکی صنعت و حرفت میں ترقی کا باعث ہوں ۔ بلکہ ایسے ہی ڈاکٹروں کو دواخانہ عثمانیہ افضل گنج میں رکھا جائے ۔

د ۔ علاوہ ازیں صرف سند یافتہ ڈاکٹروں کو کسی شہر کے حدود مجلس صفائی میں مطب جاری کرنیکی اجازت دی جائے اور بے سند ڈاکٹروں کو خانگی مطب کرنیکی اجازت نہ دی جائے اس کا بھی نتیجہ یہی ہوگا کہ تعلیم یافتہ ڈاکٹروں کی تعداد میں اضافہ ہوجائیگا اور یہ موزگار ہوجائینگے ۔

ھ ۔ جہاں تک ممکن ہو سکے حکومت جز معاش ملازمین سرکاری کی تخفیف کے متعلق ہرگز ہرگز غور نہ کرے حال ہی کا واقعہ ہے کہ جب محکمہ جنگی بلدہ برخاست کر دیا گیا تو سینکڑوں صاحب روزگار افراد بے روزگار ہو گئے ۔ بجائے جائیدادیں تخفیف کرنیکے یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ عام اسکیل قایم کر کے اعلیٰ تنخواہوں میں کچھ تخفیف کر دی جائے ۔

و ۔ اسی طرح قواعد عمر (۵۵) سالہ کے بعد وظیفہ ملازمین سرکار عالی کی سختی سے پابندی کیجائے ۔ تاکہ نوجوان نسل کو خدمات انجام دینے اور تجربہ حاصل کرنیکا موقع ملے ۔

ز ۔ پیدائش بر پیمانہ کبیر اور پیمانہ صغیر کی صنعتوں کو ممکنہ حد تک رواج دیا جائے ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہزارہا لاکھوں افراد کی کھپت ان صنعتوں میں ہو جائے گی ۔ واضح رہے کہ ملک دکن میں اکثر مقامات لوہے اور کوئلہ کی کانیں قریب قریب پائی گئیں ہیں ۔ جیسے کہ بمقام ملیغرٹ تعلقہ لکشٹی پیٹھ اور بمقام ستقر تعلقہ بلید و ضلع ورنگل جہاں نہ صرف کوئلہ کی قربت ہے بلکہ اگر چاہیں تو آبشار کرشم ندی کے ذریعہ برقی قوت کے حصول کے بعد بمقام ملیغرٹ بہترین قسم کے لوہے کا کارخانہ بھی قائم کیا جا سکتا ہے ۔ اور چونکہ صنعت فولاد ملک کی کلیدی صنعت سمجھی جاتی ہے اسی لئے شدید ضرورت اس امر کی ہے کہ جسقدر جلد ممکن ہو سکے حکومت اس معاملہ میں عملی اقدام فرمائے ۔ جب حکومت عوام کو ایسے کارخانہ کے زیادہ حصص خرید کر کامیابی کا یقین دلائیگی تو عوام بکثرت حصص خریدنے راضی ہو جائینگے ۔ اور جسطرح حکومت نے نظام شوگر فیکٹری کے حصص کی خریدی سے سرپرستی کی ہے ۔ اور جس طرح کارخانہ کاغذسازی کے قیام کی بمقام سرپور ہمت افزائی فرمائی ہے اسیطرح قیام کارخانہ فولاد کی تجاویز کو عملی صورت دی جائے تو یقین ہے کہ قدرتی سہولتوں کی بناء پر مندرجہ بالا مقامات میں کارخانہ قائم اور نفع بخش ہوگا ۔ حکومت سرکار عالی نے گھریلو صنعتوں کی ترقی کیلئے بمقام مشیرآباد ایک مرکزی ادارہ بھی قائم کیا ہے لیکن اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے ہونہار صناعوں کی سرپرستی کیجائے جو بہتر سے بہتر قسم کی اشیا تیار کرتے ہوں ۔ جیسے بیدر کے بٹن محبوب نگر کی کمبلیں اور تعلقہ امرآباد کی دیسی جڑی بوٹیوں کی مجرب ادویہ ہمارے نزدیک حکومت کی سرپرستی سے مراد یہ ہے کہ کوئی عہدہ دار سرکاری ان اشیاء کو مفت میں حاصل نہ کرے یا بالکل کم قیمت میں نہ لے بلکہ واجبی قیمت دیکر اہل حرفہ کی سرپرستی کرے علاوہ ازیں اہل حرفہ کو اس قسم کی معلومات بھی منجانب محکمہ صنعت و حرفت بہم پہنچائی جائیں کہ ان کا مال ہندوستان کے کس حصہ میں قدر و قیمت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور کس ضلع میں باعتبار دستکاری عوام ایسی صنعت کے خواہشمند ہیں ۔

ح ۔ منجانب حکومت ایسے معاشی ماہرین کے تقرر کی سخت ضرورت ہے جو اپنی ملکی صنعت کیلئے نئے نئے بازار پیدا کرنے اور ان پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں ۔ حال ہی کا واقعہ یہ ہے کہ حکومت جرمنی نے ڈاکٹر شاسٹ کو معاشی سیاحت کیلئے ہندوستان روانہ کیا تھا اور انھوں نے ہندوستان میں طویل دورہ کر کے جرمنی کی پیدائش بر پیمانہ کبیر یا پیدائش بر پیمانہ صغیر کا مال وسامان ہندوستان کے کن کن حصوں میں کامیابی سے فروخت ہو سکتا ہے ۔ اسکی تفصیلی رپورٹ جرمن گورنمنٹ کے آگے پیش کر دی تھی ۔ کیا اچھا ہوتا ہماری حکومت کیطرف سے بھی ایسے ہی تجارتی ایجنٹ ملکی صنعت کے فروغ کیلئے نہ صرف

اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی دورہ کرتے حکومت میسور نے اسی اُصول کی بنا پر خود مستقر حیدرآباد میں مصنوعاتِ ریاست میسور کی ایک نمائش گاہ کا افتتاح کیا۔

ط۔ اگر ہماری مملکت کی مصنوعات کی نمائش گاہیں بھی دہلی بمبئی مدراس، کلکتہ، لاہور میں قائم ہوں تو بہت اچھا ہوگا۔

ی۔ عام اشاعت تعلیم کیلئے کوشش کیجائے اسکا ایک خوشگوار نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ دیہات میں تعلیم دینے سے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں اساتذہ کی ضرورت ہوگی اور اسطرح بہت سے بے روزگار پریشان حال اساتذہ روزگار حاصل کرینگے۔

(۳) وہ تجاویز جنکو بروئے کار لانیکی صورت میں ملازمت سرکاری کے خواہشمند افراد میں خاطر خواہ کمی عمل میں آسکتی ہے حسب ذیل ہیں۔

(۱) طبقہ فوقانیہ کے آخری امتحان کیلئے دو قسم کے اسناد مقرر کئے جائیں۔ ایک سند تو اُس امتحان کیلئے مختص کردیجائے جو اعلیٰ ثانوی کہلاتا ہے۔ اور جس میں کامیابی کے بعد حکومت کے مختلف دفاتر میں امیدوار ملازمت کو خدمت انجام دینا ممکن ہوسکیگا۔ علاوہ ازیں اسی امتحان میں کامیابی کے بعد صنعتی تجارتی اور زرعی مدارس میں اعلیٰ تعلیم کیلئے داخلہ عمل میں آسکیگا۔

(۲) امتحان اعلیٰ ثانوی کی سند صرف اُن ذہین طلبہ کو دیجائے جو اعلیٰ نمبرات حاصل کرکے کامیاب ہوئے ہوں اور جن میں یہ قابلیت ہو کہ وہ آیندہ حکومت کے مختلف اعلیٰ خدمات کے مقابلہ کے امتحانوں میں شرکت کرسکیں۔ علاوہ ازیں اعلیٰ تعلیمی اسناد حاصل کرنیکی صلاحیت تامہ رکھتے ہوں۔ اور محض اپنی قابلیت کی بنیاد پر جامعہ کے سائنس کالجوں اور فنی کالجوں میں داخل ہوسکیں۔ اس طریقہ کار کا یہ نتیجہ ہوگا کہ جو طلبہ معمولی ذہانت کے ہیں امتحان اعلیٰ ثانوی کی کامیابی کے بعد جامعی تعلیم پانیکی ہمت نہ کرسکینگے۔ اور اپنی توجہ کسی ابتدائی سرکاری ملازمت کے حصول میں صرف کرینگے۔ یا کسی صنعتی و حرفتی مناسب طبع تعلیم کے حصول کیجانب مائل ہوجائینگے۔ اور اسطرح اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی تعداد گھٹ کر صرف ایسے کامیاب طلبہ باقی رہینگے جو ڈاکٹری انجنیرنگ سرکاری اعلیٰ خدمات صحافت تصنیف و تالیف کی قدرت کیلئے بدرجہ اتم موزونیت رکھتے ہوں۔ ایسے موزوں طلبہ بعد فراغت امتحان مقابلہ و مسابقت میں کمی کی وجہ سے جس پیشہ کو بھی اختیار کرینگے اُس کو کامیابی کے ساتھ انجام دیکر اپنی شہرت آپ پیدا کرسکینگے۔ اسکا ایک اچھا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی بیروزگاری کا مسئلہ بالکل نظرانداز کرنیکے قابل ہوجائیگا۔ چنانچہ انگلستان وغیرہ میں اسی حکمت عملی

کا نتیجہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد میں بیروزگاری بہت ہی کم محسوس کیجاتی ہے۔

(۳) دو تدابیر حسب ذیل ہیں جنکو اگر عمل میں لایا جائے تو تعلیم یافتہ افراد کی طلب و رسد میں ایک طرح کا توازن پیدا ہو جائے گا۔

(۱) حرفتی تعلیم کے اداروں میں زیادہ تر عملی تعلیم حاصل کرنے کیلئے قابل لحاظ سہولتیں مہیا کیجائیں اور بہ حیثیت مجموعی حرفتی تعلیم کا رجحان زیادہ تر بجائے اصولی ہونیکے عملی رہے۔ اور خصوصاً مدارس تحتانیہ میں عملی تعلیم دیہاتی ضروریات کو پیش نظر رکھکر دیجائے۔ اور زیادہ تر عملی کام کرنیکی تحتانی جماعتوں کے طلبہ کو تربیت دیجائے۔

(۲) ڈاکٹروں اور اطباء یونانی کو تعلقہ جات اور اضلاع میں پھیل جانیکی ترغیب دیجائے۔ اور منجانب سرکار ان کو کوئی مستقل بونس بھی دیا جائے کم از کم آلات جراحی سے ڈاکٹروں کی اور آلات دواسازی سے یونانی اطباء کی امداد کیجائے اور شہروں میں قیام کی مدت افزائی نہ کیجائے اور ان کو بطور خاص ہدایت کیجائے کہ امراض وبائی کے شیوع کے بعد ہر غریب مریض کا بلا اجرت تشخیص و معائنہ علاج کریں۔ اس سے ایک زبردست فائدہ یہ ہوگا کہ انکی انسانی ہمدردی کی شہرت کی بدولت خود اُن کا مرجوعہ بڑھ جائیگا۔ اسطرح انکی آمدنی میں بھی اضافہ عمل میں آئیگا۔

(۳) علاوہ ازیں ترقی پذیر ضروریات قومی کی تکمیل کی غرض سے دواسازی، دندان سازی، محاسبی، حسابداری، تجارتی کتب نویسی، فرائض بیمہ و ضمانت کے پیشوں کی تعلیم و تربیت عملی کا بھی انتظام نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ متمدن شہر میں ایسے تعلیم یافتہ افراد کیضرورت رہتی ہے۔ خارجاً مسموع ہوا کہ حکومت سرکار عالی صدر دار الصنعت کے قیام کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے۔ یہ اہم ادارہ جسقدر جلد قائم ہو جائے اُتنا ہی اچھا اور بہتر ہے۔

(۴) اس امر کی کوشش کی بھی سخت ضرورت ہے کہ زرعی کالجوں کے تعلیم یافتہ لڑکوں کو ترغیب دیجائے کہ وہ اپنا ذریعہ معاش بجائے ملازمت سرکاری کے خود زراعت کو قرار دیں اور سائنٹفک اصول پر طریق کاشت کی بدولت اپنی آمدنی پیدا کریں۔

(۵) اس امر کی بھی جد و جہد کیضرورت ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کو تجارتی اداروں میں بغرض تربیت سوداگری کام کرنیکی ترغیب دیجائے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے علاقہ داری تجارتی صنعتی ماہرین کا تقرر یا انتخاب عمل میں آئے تاکہ وہ نوجوان تعلیم یافتہ افراد کو تجارت داخلہ و تجارت خارجہ کے اُصول سے واقف کرائیں اور خود ان کو جوانو

میں ایک تجارتی ذہنیت پیدا کردیں ۔

(۶) حکومت اپنے مختلف وسائل سے طلبہ کے والدین کی توجہ کو مستقبل قریب میں مطلوب پیشہ جات کی تعلیم کیلئے بھی آمادہ کرنے کیلئے کافی جد وجہد کرسکتی ہے ۔ وہ اسطرح کہ اگر چار سال کے بعد حکومت کسی محکمہ یا کارخانہ کے قیام کا ارادہ کررہی ہے تو ابھی سے طلبہ کے والدین کی اطلاع کے لئے عام اعلان کیا جاسکتا ہے کہ آیندہ حکومت کو ایسے فن دان افراد کی ضرورت ہوگی ۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ والدین اپنے بچوں کو منفعت بخش پیشہ جات کی تعلیم دلائینگے ۔ اور بے ضرورت عام تعلیم دلاکر اپنا روپیہ ضائع نہ کرینگے ۔ یوں اکثر طلبہ کے والدین اپنی اولاد کے ضروریات زمانہ کے مطابق تعلیم و تربیت کیلئے اپنی ذہنیت میں کافی تبدیلی پیدا کررہے ہیں ۔ اس سلسلہ میں ابتدا سے ہی ہر طالب علم کا رجحان ذہنی کا ایک باقاعدہ ریکارڈ مثل طبی معائنہ کے رکھا جائے تو طلبہ کے والدین کو آیندہ اپنی اولاد کی صحیح تربیت کیلئے ایک اچھی خاصی رہبری حاصل ہوگی ۔ اور ہر طالب علم اپنے رجحان ذہنی کے لحاظ سے وہی پیشہ اختیار کریگا جس کیلئے وہ قدرتی طور سے موزونیت رکھتا ہے ۔ اس قسم کی تقسیم عمل کا انتظام جسقدر بھی جلد عمل میں آئے اتنا ہی اچھا ہوگا ۔ اور طالب علم کی عمر عام تعلیم کے حصول کیلئے ضائع نہ ہوگی ۔ اور وہ خلاف موزونیت طبع مضامین کی تعلیم پاکر اور کئی کئی سال ناکام ہوکر اپنے والدین کی پریشانی خاطر کا بھی باعث نہ ہوگا جب تک تشخیص رجحان ذہنی کا ایسا ادارہ قائم نہ ہوگا اوسوقت تک حیدرآباد کی تعلیمی ترقی کھوکھلی ہوگی ۔

(۷) اعلیٰ ثانوی امتحان کی جماعتوں میں متعدد اور متنوع نصابات تعلیم کے انتظام کی سخت ضرورت ہے اور جامعات کی تعلیم میں تحقیقاتی کام کی تربیت کی بعد ضرورت ہے ۔ اسی طرح ملک میں ایسے تعلیم یافتہ کی جماعت پیدا ہوجائیگی ۔ جس کی درحقیقت ملک اور قوم کو ضرورت ہے ۔

(۸) مجلس تقررات کے قیام کی بغرض انتخابات امیدواران ملازمت سخت ضرورت ہے ۔ ہر محکمہ کیلئے موزوں امیدوار ملازمت کے انتخاب کے مدنظر ایک امتحان مقابلہ ضرور ہونا چاہیئے تاکہ غیر موزوں امیدوار اُس محکمہ میں ملازمت کا تصور ہی نہ کرسکیں ۔ اور جب تک محکمہ متعلقہ کے امتحان مقابلہ میں کوئی امیدوار کامیابی حاصل نکرے اُس کو باقاعدہ اسوقت تک اُس محکمہ میں ملازمت کی نہ کوئی امید دلائی جائے نہ ایسے ناکام امیدواروں کو کسی قسم کی منصرمی دیجائے ۔ ایسے امتحان مقابلہ کے وقت ممتحنوں کو سخت ہدایت کیجائے کہ کسی قسم کی رعایت سے کام نہیں

اور نہ کسی کی سفارش کو درخور التفات سمجھیں۔ بلکہ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ہر محکمہ کا حاکم مقتدر خود بھی امتحان مقابلہ کے پرچوں کی نظر ثانی کرے تاکہ رعایتی نمبرات کامیابی دینے کا بھی خطرہ باقی نہ رہے۔ بہر حال امتحان اعلیٰ ثانوی ہو کامیاب اور جامعاتی امتحانات میں کامیاب شدہ امیدواران ملازمت سرکار عالی جب اپنی قدر ذاتی کی بنیاد پر منتخب ہونگے تو بوجہ موزونیت طبع اور کاروانی ہر اُس محکمہ میں بہت جلد ترقی کرینگے۔ جس میں خدمات انجام دے کر اُن میں اپنی عمر گزارنا ہے۔

بہر حال یہ چند وہ تجاویز ہیں جن پر اگر عمل کیا گیا تو یقین ہے کہ بیروزگاری کا بھوت جس کے تصور سے حکامان سرکاری کے حواس باختہ ہو رہے ہیں بہت جلد بھاگ جائیگا۔ خدا کرے کہ وہ دن آئے کہ حکومت سرکار عالی اپنے ملک کے خاص خاص صنعتی و حرفتی مسائل کو اپنی ضروریات کے مطابق حل کرے اور بہی خواہان حکومت و وابستگان سرکار آصفیہ کو امن و چین اور خوشحالی کی حسب دستور قدیم زندگی گزارنے کا مسرت بخش موقع حاصل ہو فقط

مسائل معاشیات حیدرآباد

از جناب مولوی حافظ محمد مظہر صاحب ایم اے معتمد حیدرآباد اکنامک کانفرنس

تمہید

ہمارے ملک کی صلاح و فلاح کے جو اہم امور ہیں ان کے من جملہ ایک مسئلہ ملک کی معاشی ارتقاء ہے۔

جناب مولوی لیاقت اللہ خان صاحب نے معاشی کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے ۱۱ اسفندار ۱۳۵۱ف کو ایک دلچسپ خطبۂ صدارت سنایا۔ سرکار عالی کے معتمد فینانس ہونے کے علاوہ محکمۂ ریلوے و معدنیات کی خدمت اور سرکار عالی کے انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کی اصل ذمہ داری بھی ہے اور جو مجلس وضع قوانین کے ذی اثر رکن ہیں۔ حیدرآباد کی ثروتی ترقی کا محور بجا طور پر تصور کیا جا سکتا ہے۔ مملکت محروسۂ سرکار عالی کے ذرائع ثروت کا حقیقی علم معتمد فینانس کو رہتا ہے اور ہر قسم کے معلومات ان کو آسانی سے مل سکتے ہیں نیز ملک کے معاشی ارتقاء میں ان کے کشش ہائے قلم اور جنبش ہائے لب بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے جناب ممدوح سے اس امر کی توقع بجا طور پر کی جا سکتی تھی کہ حیدرآباد کی پبلک کو وہ اپنے اعتماد میں لیں اور یہ فرمائیں کہ ملک کے ثروتی اور کاروباری ارتقاء کے لئے حکومت کا کیا مرکوز خاطر ہے اور یہ کہ اہل ملک عموماً اور سرمایہ دار خصوصاً کس طرح سرکار عالی کے ساتھ تعاون و تشارک کر سکتے ہیں۔ بہر حال جناب موصوف کے خطبۂ صدارت کو پڑھنے کے بعد ۵ سال کے ایک ادنیٰ طالب علم معاشیات کی حیثیت سے جو معلومات حاصل ہوئے ہیں ان کو قلم بند کرنا مناسب متصور ہوا۔

صنعتی ترقی کے امکانات

ممالک سرکار عالی کا رقبہ ۸۲۰۰۰ ہزار مربع میل اور آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ مملکت آصفیہ کی پیداوار معدنی صحرائی، زرعی، اور مویشی کی دریافت کے لئے حضرت سکندر جاہ مرحوم کے زمانۂ حکومت سے وزارت نواب مختار الملک مرحوم تک بکثرت انگریز ماہران فن مامور ہوئے اور ان کی یادداشتیں اور رپورٹیں بایان کا ماحصل "حیدرآباد افیرس" کی ضخیم جلدوں میں بنز ہسٹاریکل اینڈ ڈسکرپٹیو اسکیچز تالیف نواب عماد الملک و مسٹر ولمٹ اور اورنگ آباد گزیٹر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان سب کا لب لباب یہ ہے کہ مملکت آصفیہ کے طول و عرض میں معدنیات بکثرت ہیں جنگلات بھی وسیع ہیں اور زرراعتی پیداوار بھی نہ صرف کافی ہے بلکہ اس کو مزید ترقی دیجاسکتی ہے اس طرح معاشی ارتقاء کے لئے بہت پرامید ان عمل سامنے ہے۔

حالات زمانہ کے اقتضا سے گذشتہ ۱۰ سال میں ملک نے معاشی اعتبار سے یقیناً ترقی کی ہے لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ ترقی کے جو کچھ امکانات ہیں ان کے مقابل بہت کم کام ہوا۔

ایک عرصہ کی خاموشی کے بعد مسٹر ویکفیلڈ سابق صدر ناظم مال و صنعت و حرفت نے معاشی ترقی کے بارے میں توجہ کی۔ گرشتہ جنگ عظیم کے وقت جنگی امداد کے سلسلہ میں انھوں نے مہوہ کے پھول سے الکوہل پیدا کرنے پر توجہ کی اور اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ممالک محروسہ سرکار عالی کے معاشی ذرائع پر اپنی نظر ڈالی اور ایک تفصیلی نوٹ اس کے متعلق مرتب کرکے سرکار میں پیش کیا۔ بعد میں عام طور سے اس کو شائع بھی کیا گیا۔

سررشتہ صنعت کا قیام

مسٹر ویکفیلڈ کی محنت پر حضرت بندگان عالی نے بنفس نفیس توجہ فرمائی اور یہ حکم صادر فرمایا کہ ایک علحدہ صدر نظامت و معتمدی تجارت و حرفت خود مسٹر ویکفیلڈ کی ذمہ داری میں قائم کی جائے اور اس سے وہ تمام سرکاری سررشتے متعلق کر دیئے جائیں جن کا تعلق معاشی ارتقاء سے ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد باب حکومت کا قیام عمل میں آیا اور ایک مستقل صدر المہامی سررشتہ جات تجارت و حرفت کیلئے

قایم ہوئی۔ مسٹر وکینفیلڈ صدر المہام نہ ہونے کے رنج اور دوسری جگہ زیادہ ترقی کرنے کی توقع میں سرکارِ عالی کی ملازمت سے سبکدوشی حاصل کرلی۔

بہرحال صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے ایک پورا سررشتہ۔ نظامت، مہتمی اور صدر المہامی؛ قایم ہوئی۔ نیز موید الملک سر علی امام نے بہت بڑا پروگرام ترقیات عامہ کے نام سے علحدہ چھپوایا اور کچھ نہ کچھ کام ہوتا رہا۔ مگر بظاہر یہ پایا جاتا ہے کہ ہمارے ملک اور ہمسایہ برطانوی صوبجات کے مدارج ترقی میں بہت تفاوت ہے۔ ابھی میں خود سرکارِ عالی کے اعلیٰ ترین ذمہ دار حکام نے بار بار عام طور سے یہ ظاہر کیا کہ ملک کی صنعت اور تجارتی کاروبار کو فروغ دینا چاہیئے۔ سرکارِ عالی نے اپنی عملی توجہ کا بھی اظہار فرمایا۔ حضرت بندگانِ عالی نے بھی متواتر احکام و فرامین صادر فرمائے اور انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ بھی قایم ہوا اور برطانوی ہند سے برٹش عہدہ دار اور ہندستانی افسر بھی آئے لیکن نتائج کچھ درخشاں نہیں ہیں۔

صنعتی پالیسی

سرکارِ عالی کے ایک بڑے وظیفہ یاب عہدہ دار نے جو سررشتۂ مال اور سررشتۂ تجارت و حرفت میں ذمہ دارانہ خدمات پر کارفرما رہ چکے ہیں اور دانائے رموز ہیں، راقم سے ارشاد فرمایا تھا کہ ہمارے ملک کے کارفرماؤں کی یہ پالیسی رہی ہے کہ تقسیم عمل کے طور پر مملکت آصفیہ کو اشیائے خام فراہم کرنے پر قانع رہنا چاہیئے۔ یہی بات دیگر عہدہ داران وظیفہ یاب و کارگذار بھی بیان کرتے رہتے ہیں۔

یہ پالیسی ہو یا نہ ہو عہدہ داران ملک اگر دل سے چاہیں اور عمل پر آمادہ ہوجائیں اپنی قوت اقتدار کو حقیقی طور سے محسوس کرکے اس سے کام لیں تو دس پندرہ سال کی مدت میں ملک کی کاروباری ترقی کہاں سے کہاں پہونچ سکتی ہے۔

جناب مولوی لیاقت اللہ خان صاحب کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ

"معاشی پستی کے رفع کرنے کے لئے ہر طبقہ میں ملک کے حالات کا مطالعہ"

"ضروری ہے جب اسباب دریافت ہوجائیں تو ان کا حل مشکل نہ ہوگا"

ایک سال خوردہ مگر ہنوز طالب علم معاشیات کی حیثیت میں یہ واضح کرنا قابل معافی ہونا چاہیئے

کہ ہر طبقہ ملک کے حالات اور تمام ممالک محروسہ آصفیہ کی پیداوار معدنی، صحرائی و زرعی وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہوئے اس ملک کو تقریباً ۲۰۰ سال گذر چکے ہیں۔ اکثر اسباب اب تو روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ مگر یہ خیال ہے کہ اب بھی مطالعہ اور دریافت اسباب کی مصروفیت درکار ہے تو گویا ایک معمہ ہے جو نہ کبھی حل ہوا ہے اور نہ حل ہوگا۔

ملک کی قدیم تنظیم

ممالک محروسہ سرکار عالی کی قدیم دیہی تنظیم کی تفصیل بیان کرنے میں اس بات کا اظہار کہ خدمت کا بدل خدمت سے ہوتا تھا۔ شاید ڈیڑھ دو ہزار برس قبل کا واقعہ ہے ورنہ کم از کم ممالک دکن میں اسلامی حکومت قائم ہونے سے پہلے کے دور کے متعلق بھی تاریخ یہ صاف پتہ دیتی ہے کہ شہری اور دیہاتی زندگی دونوں کا اس ملک میں وجود تھا زراعتی کاروبار کے ساتھ صنعتی کاروبار بھی نہایت بلند پیمانہ پر ہوتا تھا۔ ممالک دکن کے مصنوعات کی برتری قائم تھی اور ان کی برآمد نہ صرف اندرون ہندستان ہوتی تھی بلکہ بیرون ہندستان بھی ان کی مانگ تھی۔ اورنگ آباد گزیٹر اور ولمرٹ کی تالیف نیز دوسرے سفرناموں وغیرہ سے اس ادعا کی تائید ہوتی ہے۔ یوں تو صدیوں سے ممالک اور اقوام میں خدمت کا معاوضہ نقد و جنس کے ذریعہ ہی ہوتا چلا آرہا ہے

قدرتی ذرائع

تمہید کے بعد جناب مولوی لیاقت اللہ خان صاحب نے بیان فرمایا ہے کہ

"جن ممالک میں قدرتی ذرائع بافراط موجود تھے اور جن کے باشندوں
نے ان سے استفادہ کی صلاحیت حاصل کرلی وہ قدرتاً ان ممالک پر سبقت
لے گئے جہاں ایسے قدرتی ذرائع نہ تھے یا اگر تھے تو ان سے استفادہ کی
کافی صلاحیت وہاں کے باشندوں میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔"

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے جزائر برطانیہ میں قدرتی ذرائع بافراط کہاں ہیں۔ خام پیداوار کے لئے انگلستان کس قدر تہی مایہ ہے اہل برطانیہ نے دوسرے ممالک کے خام پیداواروں سے

استفادہ کی صلاحیت حاصل کرلی اور اس کے بل بوتے پر دنیا میں اپنی دھوم مچائی۔ پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ مملکت آصفیہ اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں قدرتی ذرائع کی موجودگی اور استفادہ کی صلاحیت میں فی الوقت بھی کیا بعد المشرقین ہے؟ بظاہر قطعی نفی میں جواب نہیں دیا جا سکتا مگر اس خطبۂ صدارت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ

"بد قسمتی سے حیدرآباد کو ان دونوں کوتاہیوں سے سابقہ ہے"

یا دوسرے الفاظ میں مملکت آصفیہ میں قدرتی ذرائع موجود نہیں ہیں اور اہل ملک میں ان استفادہ کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ نتیجہ جو اخذ کیا گیا ہے اس کی بنیاد امور ذیل پر رکھی گئی ہے۔

(۱) سستی برقی قوت یہاں مفقود ہے کیونکہ میسور کے مماثل یہاں کوئی قدرتی آبشار نہیں ہے جس سے برقابی کی قوت حاصل کی جا سکے۔

(۲) ہماری اپنی کوئی بندرگاہ نہیں ہے جہاں سے مال کی درآمد برآمد میں سہولت ہو سکے۔

(۳) چاروں طرف سے ہم دوسرے علاقہ کے ریلوں سے گھرے ہوئے ہیں اور ان ریلوں سے نرخوں کے متعلق معاہدہ کئے بغیر جدید ریلوے قائم نہیں کر سکتے۔

اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ دنیا میں ہر ملک کو تمام قدرتی ذرائع حاصل نہیں ہوتے ہر ملک میں مخصوص پیداوار ہوتی ہے اور اسی سے اسکی دولت و خوشحالی وجود میں آتی ہے۔ ہندوستان کو ایک براعظم تصور کر لیا جائے اور برطانوی صوبوں اور بڑی بڑی ریاستوں کو اس کے اجزا قرار دیا جائے تو یہی نظر آئے گا کہ ہر ایک حصہ کو ایک یا زیادہ قدرتی ذرائع کی کمی سے سابقہ پڑا ہے مگر یہ کمی ہر حصہ کی مجموعی قوت استفادہ میں حائل نہیں ہو سکتی ہے۔ مثلاً حیدرآباد میں کوئلہ نہایت وافر مقدار میں معادن سے نکالا جاتا ہے اس کے ساتھ کپاس اور حبوب روغن دار بھی اس افراط کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں کہ اگر ہمارا ملک اس سے کامل استفادہ شروع کر دے تو دس سال میں ہی کایا پلٹ ہو جا سکتی ہے۔ میسور میں کوئلہ نہیں اور ملک کا رقبہ کچھ بڑا ہے اور زرعی پیداوار بھی اس قدر وافر نہیں ہے کہ وہ کسی بڑی زرعی پیداوا

کو صنعتی صورت میں تبدیل کر کے فائدہ حاصل کر سکے۔ اسی طرح بمبئی پریسیڈنسی بھی کوئلہ سے محروم ہے باہر سے لانے میں صرفہ زیادہ ہوتا ہے اس لئے برقابی سے کام لیا جاتا ہے۔ سال ہا سال تک بمبئی اور احمد آباد میں صنعتی کارخانے بخار کی قوت سے چلائے جاتے تھے اور غیر ممالک یا ہمسایوں سے کوئلہ لینا پڑتا تھا۔ مدراس بھی کوئلہ سے محروم ہے۔ ہمارے ملک میں سالانہ تین چار کروڑ روپے کی روئی باہر والے خرید تے ہیں اور پھر اس کو کرو ڑگیری، کرایہ ریل، اور دیگر مصارف برداشت کرنے کے بعد سوت اور کپڑا بنا کر پھر اس ملک میں ہی روانہ کر کے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں سوت اور سوتی پارچہ کی درآمد سالانہ تین کروڑ روپے تک ہوتی ہے بلکہ بعض وقت اس سے بھی زیادہ۔ ان حالات میں کوئی وجہ نہیں کہ خود مملکت آصفیہ کے ایسے مقامات میں کہ جو کپاس کا مخزن ہیں اور جہاں کوئلہ بھی قریب ہے پارچہ بانی کے کارخانے کامیاب نہ ہوں۔ یہی صورت حبوب روغن دار کی ہے اور یہی صورت چمڑے کی ہے۔ اور اگر سرکار عالی کا انڈسٹریل ٹرسٹ پارچہ بانی، تیل اور چرمی اشیاء، رنگ سازی صابون عطریات اور ادویات طب مغربی کے کاروبار کو شکر اور کاغذ سازی کے کارخانوں کی طرح چلانے آمادہ ہو جائے تو اس کی صد فی صد کامیابی یقینی ہے۔

اس سے قطع نظر یہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ سستی برقی قوت یہاں پیدا نہیں کی جا سکتی۔ نظام ساگر اور اس کے نہروں کی تعمیر کا آغاز ۱۲ سال قبل اور تکمیل ۱۱ سال قبل ہو چکی ہے۔ نواب علی نواز جنگ بہادر نے اسی وقت صاف صاف بتایا تھا کہ برقابی قوت کی تولید کے کس قدر امکانات نظام ساگر میں موجود ہیں اور اسی وقت تجاویز پیش کرنے کے لئے ماہرین کی کمیٹی مقرر نہ کرنے کی ذمہ داری کس پر ہے؟ تالاب کی تعمیر کے ساتھ برقی قوت کی تولید اور شکر، تیل، پارچہ بانی کے کارخانوں کی اسکیم مرتب اور چلائی جا سکتی تھی۔ کس محکمہ میں ان امور سے اغماض برتا گیا؟ عام طور سے یہ خیال ہے کہ اس زمانہ میں سررشتہ فینانس کو نواب علی نواز جنگ بہادر سے اختلاف پیدا ہو گیا۔ اور بعض لوگوں نے یہ کوشش کی کہ نظام ساگر کے کاروبار کو مالی منفعت کے اعتبار سے ناکام ثابت کیا جائے۔ علاوہ بریں سررشتہ مالگزاری نظام ساگر کے متعلقہ مسائل کو مستعدی سے حل نہیں کر رہا تھا۔

عام طور سے یہ بھی مشہور ہے کہ نواب علی نواز جنگ بہادر کی برقابی قوت کی دوسری اسکیموں کے متعلق بھی اغماض برتا گیا۔ نواب صاحب موصوف غالباً چاہتے یہ تھے کہ برقی قوت کا کاروبار ملک کے ہر ضلع میں پھیلا دیا جائے۔ تنگبھدرا پراجکٹ کی تعویق کا بھی سبب یہی ہے کہ افراد کے باہمی اختلافات درمیان میں آ گئے جب تک برقابی قوت کی تولید کا انتظام نہ ہو کوئلہ سے کام لیا جا سکتا ہے۔

بندرگاہ

اگر مملکت آصفیہ کو بندرگاہ حاصل نہیں ہے تو بہار، صوبجات متوسط، صوبجات متحدہ، اور پنجاب کو بھی بندرگاہیں حاصل نہیں ہیں۔ بندرگاہوں کی عدم موجودگی ان ممالک کے صنعتی کاروبار اور معاشی ترقی میں کسی طرح حائل نہیں ہے۔

یوں ۱۸۰۲ء کے معاہدۂ تجارت کی رو سے ہم ہندستان کی تمام بندرگاہوں سے کام لے سکتے ہیں۔ مدراس اور بمبئی کے علاقوں کی بندرگاہیں ہمارے استفادہ کے لئے موجود ہیں۔ جو کچھ بھی دشواریاں موجود ہیں یا آیندہ پیدا ہوں ان کے لئے ہم اپنے ہمسایہ دونوں صوبوں سے سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔

پھر غور طلب یہ امر ہے کہ بندرگاہ کا وجود مال کی درآمد و برآمد میں اس وقت سہولت بخش ہو سکتا ہے جبکہ سمندر پار اشیائے خام کو برآمد کرانا اور پھر مصنوعات کو اپنے ملک میں لانا مدنظر ہو یا اس کے برعکس صورت مدنظر ہو۔ اگر ہم اپنے ملک کی کپاس، حبوب روغن دار، اور چمڑے و اشیائے نباتاتی کو اپنے ہی ملک میں پارچہ، روغن، چرمی اشیاء، صابون، عطریات، اشیاء کیمیائی ادویات مغربی کی صورت دے سکتے ہیں تو اپنے ملک کی پیداوار کو برآمد کرانے کے لئے بندرگاہ کی ضرورت بہت کم ہوگی اس کے علاوہ جو مصنوعات ہم اپنے ملک میں تیار کریں گے اس کے لئے خود ملک کی ایک کروڑ ۱۰ لاکھ کی آبادی پہلی گاہک ہوگی۔ پھر اندرون ہند اس مال کو برآمد کیا جا سکیگا۔ ان حالات میں بندرگاہوں کی ضرورت سے استغنا ہو سکتا ہے اگر ممالک غیر کو ہمارے ملک کے ساختہ پارچہ اور روغن وغیرہ کی احتیاج ہوگی تو وہ خود اپنی خریداری میں جو مشکلات دیکھیں گے ان کو حل کریں گے۔ ہم ان ممالک سے

یہی کہیں گے کہ ہم سے جو بہ نہ لیجیئے روغن لیجیئے ہمارا بھی فائدہ ہے اور آپ کا بھی۔ اسی طرح روئی کے بجائے پارچہ حاضر ہے۔

ریلوے سے متعلق مسائل

یہ کہنا کہ ہم دوسری ریلوں سے گھرے ہوئے ہیں اور ان ریلوں سے نرخوں کے متعلق معاہدہ کئے بغیر جدید ریلوے قائم نہیں کرسکتے نظری طور پر درست ہے لیکن عملی مشکلات کس درجہ ہماری راہ میں حائل ہیں وہ بجائے خود زیادہ سنجیدگی سے قابل غور ہیں۔

راقم الحروف نے ریلوے، پٹہ اور تار کے متعلق حالات اور واقعات کا مطالعہ کیا ہے گزشتہ تاریخ کی تفصیلات میں جانے کے بغیر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حکومت ہند نے ریلوے، تار اور ٹپہ کے متعلق چند تحفظات اور اقتدارات اپنے لئے محفوظ کرلئے ہیں اور دیسی ریاستوں میں بھی یہ تحفظات اور اقتدارات قائم کرلئے گئے ہیں لیکن حقوق سرکار ہند سے قطع نظر جو کچھ معاہدات عمل میں آئے ہیں یا تصفیے ہوئے ہیں ان سے واضح ہے کہ حکومت ہند نے سرکار آصفیہ کے واجبی حقوق متعلق ذرائع رسل و رسائل کو تسلیم کرنے سے کبھی انکار نہیں کیا اور جب کبھی تعبیر معاہدات و استعمال حقوق کے متعلق مباحث پیش آئے اگر سنجیدگی اور صحیح استدلال کی قوت سے کام لیا گیا تو سرکار عالی کو شکایت کا بہت کم موقع ملا ہوگا۔

بہرحال عام طور پر ریلوے کمپنیاں کرایوں وغیرہ میں باہم مقابلہ کرتی ہیں بلکہ ایک دوسرے کو نقصان پہونچانے کی فکر میں رہتی ہیں چونکہ جی، آئی، پی، ریلوے کا حکومت ہند کے تحت انتظام ہے اور ہماری ریلوے کا اس سے اتصال ہے۔ نیز ام، ایس، ام ریلوے بھی ہماری ریلوے سے متصل ہے اس لئے حکومت ہند نے باہمی مقابلہ کو روکنے کے لئے ایک عام اصول یہ قرار دیا ہے کہ جب کسی ریلوے علاقہ میں کوئی ایسی توسیع عمل میں آئے جس سے دوسری ریلوے کے راستے اور آمدنی پر اثر پڑے تو سامان لانے اور لیجانے کے نرخوں اور مسافروں کے کرایہ کے تعین میں باہمی سمجھوتہ سے ایسی قرارداد عمل میں آئے جس سے دوسرے ریلوے

علاقہ کو غیر معمولی نقصان نہ اٹھانا پڑے ایک جانب اگر ہم ترخبوں اور کرایوں کے متعلق معاہدہ کئے بغیر جدید ریلوے لائن قائم نہیں کرسکتے کہ جس سے مدراس یا بمبئی کے علاقوں کے بندرگاہوں کی مسافت کم ہوجائے تو دوسری جانب جی، آئی، پی یا ام ایس، ام ریلوے بھی ہماری مملکت میں ہوکر کوئی ایسا راستہ قائم نہیں کرسکتے جو ہمارے بابمبئی یا مدراس، پی کے علاقہ سے کسی بندرگاہ کے اتصال کی مسافت کم کرے مثلاً ہماری علاقہ مدراس یا بیجاپور علاقہ بمبئی کے درمیان آمد و رفت کی مسافت کا قریب ترین راستہ ضلع رائچور اور گلبرگہ سے ہوکر ہوسکتا ہے مگر ام ایس، ام ریلوے یا جی، آئی، پی ریلوے کو مسافت کم کرنے کے لئے ممالک محروسہ سرکار عالی کے اندر لائن کی تعمیر اس طور سے کرکے کہ این ایس ریلوے بے تعلق ہوجائے کوئی ہدایہ اتصال پیدا نہیں کرسکتے۔ جی، آئی، پی ریلوے کی خواہش تھی کہ اس کو مملکت آصفیہ میں اس لائن کی تکمیل کا موقع دیا جائے جس پر سے گرانڈ ٹرنک اکسپرس گذرتی ہے حکومت آصفیہ نے اس سے انکار کردیا اور اپنے سرمایہ سے بالآخر اپنی ہی ریلوے لائن کی توسیع عمل میں لائی جہاں تک میرے معلومات ہیں، ام ایس، ام ریلوے کی کوشش تھی کہ اس کو ہمارے ملک میں چھوٹی پٹری کی ریلوے کی اس توسیع کا حق دیا جائے جس سے جنوبی و شمالی ہند کی چھوٹی پٹری کی ریلوں کو متصل کردے اس سے بھی سرکار عالی نے انکار کردیا۔ اور اس کی تعمیر بھی اپنے ہی سرمایہ سے عمل میں لائی۔

ریلوے کی توسیع

اس کے ساتھ دوسری پیش آمدہ صورتوں پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے۔ سرکار عالی کے علاقہ میں ریلوے کی توسیع ایک عرصہ تک اس مسئلہ کے حل کرنے میں رک گئی کہ ریلوے کی تعمیر کا سرمایہ کہاں سے فراہم کیا جائے۔ بالآخر سر جارج کیاسن واکر کے اس مدبرانہ تصفیہ سے کہ ریلوے کی توسیع کے لئے اولاً سرکار عالی کے ہی ذاتی سرمایہ پر انحصار کرنا چاہیئے اور سرکار عالی کی سلک اس غرض کے لئے کام میں لائی جاسکتی ہے ریلوے کی توسیع کی تجویزیں عمل میں آنے لگیں یہ خیال کیا گیا کہ ریلوے کی توسیع واڑی یا حیدرآباد سے ایسے خطہ ملک پر سے ہونی چاہیئے کہ جہاں ریلوے نہ ہو اور بالآخر اس کا اتصال مارماگوا تک ہونا چاہیئے تاکہ ایک جدید بندرگاہ سے ممالک محروسہ کے مال تجارتی کو راستہ مل جاسکے۔ ظاہر ہے کہ گویا اس کے جوڑ اور

مویار سر جارج واکر تھے مگر یہ تجویز نہایت دور رس اور بین الاقوامی پیچیدگی رکھتی تھی حکومت ہند کی پالسی یہ رہی ہے کہ ہندستان کے پرتگالی اور فرانسیسی بندرگاہوں کو برطانوی ہند کے تجارتی مال کا گزرگاہ نہ ہونے دیا جائے ۔ایسی حالت میں ہماری حکومت کی تجویز کہ برطانوی ہند کے کچھ حصہ میں سے ریلوے کو گذارتے ہوئے پرتگالی بندرگاہ تک ہم کو پہونچنے دیا جائے ہمار دی حاصل نہیں کرسکتی تھی علاوہ بریں جی ،ای ،پی اور ام ،ایس ،ام ریلوں کے کاروبار اور آمدنی بھی متاثر ہوتی تھی اور حکومت ہند کی آمدنی کروڑگیری پر بھی اثر پڑتا تھا۔

اس تجویز کی عمل پذیری میں دقتیں پیش آئیں مختلف راستوں کے تجاویز کے بعد بالآخر سر رضیاالدولہ گالانسی کی یہ تجویز ہوئی کہ ہماری چھوٹی لائن محبوب نگر اور گدوال سے ہوتی ہوئی رائچور اور رائچور سے تعلقات شاہپور ولنگسگور و جاگیرات نواب سالارجنگ بہادر سے گذرتی ہوئی گدگ تک پہونچائی جائے جس میں کچھ فاصلہ برطانوی علاقہ سے گزرے چونکہ جی ،ای ،پی ،اور ام ،ایس ،ام ریلوں کی آمدنی اس سے متاثر ہوتی تھی اس لئے غالباً اس راہ کی نسبت بھی مباحث پیدا ہوئے اور یہ شرط عائد کی گئی کہ نرخوں کے بارے میں معاہدہ کیا جائے اگر ہم اپنا یہ مقصد قائم کرتے کہ ہم اپنے ملک کے دشوار گذار اور ریل سے دور فاصلہ کے مقامات کو ریل سے متمتع کرنا چاہتے ہیں اور رائچور سے راستہ کو بجائے گدگ تک پہونچانے کے کپل کو انتہائی مقام قرار دیتے اور ریلوں کے نرخوں کے متعلق بھی عملی صورت میں معقول سمجھوتہ پر آمادگی ظاہر کرتے تو عرصہ گزرتا کہ ہماری چھوٹی ریلوے لائن رائچور اور کپل تک ملحق ہوجاتی ۔ریلوں کے نرخوں کا معاہدہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ نرخ حاضرہ میں تبدیلی نہ ہونے پائے ۔عدم تبدیل نرخ کے باوجود چونکہ فاصلہ کی کمی کا فائدہ ہم کو حاصل رہتا اس لئے کوئی نقصان نہ ہوتا ۔

بہرحال جی ،ای ،پی اور ام ،ایس ،ام ریلوں کے مقابلہ سے گھبرا کر ہم نے ایک متبادل راہ اختیار کرلی کہ گدوال سے کرشنا اور تنگبھدرا کی ندیوں کو عبور کرتے ہوئے کرنول تک پہونچ جائیں ۔اس علاقہ میں برٹش علاقہ کی چند میل کی ریلوے بھی نظام اسٹیٹ ریلوے کے سپرد ہوگئی اس راہ میں پلوں کی تعمیر کے بہت زیادہ مصارف برداشت کرنے پڑے اور منافع نسبتاً کم مل رہا ہے ۔بریں ہم نقصان نہیں ہے اور یقیناً اس تناسب سے بڑھ کر منافع ملتا ہے جو برٹش پرائیسری نوٹوں پر ملتا ہے ۔اور ایک

دشوار گذار مجھ یا حصہ بلاست ریلوے کے فوائد سے مستفید ہو سکا اور بنگلور کی قریبی راہ ہم اول کئی اس کے بعد خود ایس، ایس ریلوے نے ہی مزید توسیع کو نظر انداز کر دیا ورنہ ہم بلا شرط اجازت حاصل کر لیتے یا مناسب سمجھوتہ ہو جاتا۔

قاضی پیٹھ بلہار شاہ ریلوے

یہ بات اب سب پر ظاہر ہو چکی ہے کہ جب سرکار عالی نے جی، ای، پی ریلوے کو بلہار شاہ لائن کی اندرون ممالک محروسہ توسیع کی اجازت نہ دی اور خود اپنے سرمایہ سے قاضی پیٹھ بلہار شاہ لائن کی تعمیر کرنے کی تجویز مرتب اور بڑی دشواری کے باوجود صحیح استدلال کی قوت سے حکومت ہند کی رضامندی حاصل کر لی اور ابتدائی حصہ تعمیر پا چکا تو جی، ای، پی ریلوے نے مخالفانہ روش اختیار کر لی اور وہی "نرخوں" کی بحث شدت سے چھیڑ دی۔ اس وقت کے ریلوے ایجنٹ مسٹر لائڈ جونس کی رائے کی بنا پر سرکار عالی کے صدر المہام ریلوے سر اکبر حیدری مرحوم نے سرکار عالی کو یہ مشورہ دیا کہ سرکار عالی کے لئے اب یہی امر مناسب ہے کہ ریلوے لائن کی مزید توسیع سے ہی دست کش ہو جائے اور صوبہ ورنگل کے اضلاع میں سڑکوں کی تعمیر اور موٹر بسوں اور لاریوں کی سروسیس پر قانع ہو جائے سر اکبر مرحوم کی تجویز تھی کہ سنجر یال بلکہ رام گنڈم تک کام ختم کر دیا جائے۔ لیکن خود حضرت بندگان عالی مدظلہ العالی کی نظر دقیقہ رس اس تجویز کی خامیوں پر پڑھ گئی اور جن دشواریوں سے اس ریلوے کی تعمیر کی اجازت حاصل ہوئی تھی اس کا احساس فرما کر مناسب ہدایتیں صادر فرمائیں۔ سر اکبر حیدری مرحوم نے اپنی حکمت عملی سے بہت کچھ کام لیا اور پوری کوشش کی کہ ان کی متذکرۂ بالا تجویز منظور ہو جائے۔ ریل کی توسیع نہ ہو۔ اب یہ کوئی راز نہیں ہے کہ اس وقت نواب تلاوت جنگ بہادر نے اپنی تدبیر صائب سے یہ کوشش کی کہ رام گنڈم و سنجریال پر ریل کی تعمیر ختم نہ کر دی جائے بلکہ مملکت آصفیہ کی آخری سرحد تک اس کا سلسلہ پہونچایا جائے اور ہم اپنا یہ مقصد قرار دیں کہ ہم اپنے ملک کو ریلوے سے متمتع کرنا چاہتے ہیں۔ بالآخر پیش گاہ جہاں پناہی سے نواب تلاوت جنگ بہادر کی رائے کو شرف منظوری عطا ہوا اور جیسے ہی حکومت ہند کو سرکار عالی کے اس تصفیہ سے مطلع کیا گیا خود حکومت ہند نے جی، ای، پی ریلوے

کا پیدا کردہ بحث ختم کردی خود حکومت ہند نے اس ریلوے کے بیشمار فوائد محسوس کیے اور مشکلات رفع ہوگئیں بالآخر یہ لائن تیار ہوگئی اور اس کے فوائد سے سارا براعظم ہندوستان یکساں متمتع ہورہا ہے اور فخر کے ساتھ سر اکبر حیدری اس کو اپنا کارنامہ بتانے لگے۔

اس تفصیل سے خود بخود یہ امر واضح ہے کہ "نرخوں کا معاہدہ" کوئی معمائے لاینحل نہیں ہے اور وہ تدبیر صائب، سنجیدگی اور معقول دلائل سے ہر وقت اسی طرح حل ہوسکتا ہے جیسا کہ ایک مرتبہ نواب ناظر جنگ بہادر کی جرأت اور سعی سے حل ہوگیا۔

ریل کا کرایہ

خطبۂ صدارت میں بیان کیا گیا ہے کہ

"مثال کے طور پر اگر ہم کوئی لائن ایسی قائم کریں جس سے بمبئی یا مدراس"
"کے بندرگاہوں سے مسافت کم ہوتی ہو تو معاہدہ کے وقت ہمارے"
"حصہ ریلوے پر جو کرایہ مال اور مسافروں کو لیجانے کے لئے مقرر ہوگا،"
"وہ ایسا ہوگا کہ ہم ان ریلوں سے مسابقت نہ کرسکیں جو ہماری سرحد"
"سے بندرگاہوں تک جاتی ہیں۔"

اگر کسی حقیقی صورت کی اس کے ساتھ وضاحت ہوتی تو زیادہ مناسب ہوتا۔

واضح ہو کہ ہم اپنے ملک سے مدراس و بمبئی کے علاقوں کے بندرگاہوں تک قریبی راستہ سے لائن قائم نہیں کرسکتے کیونکہ مملکت آصفیہ کو عبور کرنے کے بعد بھی ان علاقوں کے بندرگاہوں تک پہنچنے کے لئے بڑا حصہ باقی رہتا ہے اس حصہ پر لائن تعمیر کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔ اور جی، آئی، پی ریلوے اور ایم، ایس، ایم ریلوے ہم سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ ان کے علاقوں میں ہم ان کو نقصان پہونچانے کا کوئی ذریعہ اختیار نہ کریں، البتہ ایسی صورتیں ضرور موجود ہیں کہ ہم اندرون ملک ایسی شاخیں قائم کریں جن سے فاصلہ کم ہوجائے مثلاً بیدر سے شولاپور تک یا قاضی پیٹھ یا کھمم سے نیلور یا گنٹور کے کسی مقام تک اپنی ریلوے کی توسیع۔ یہ سب تجویزیں زمانۂ جنگ میں تو ممکن نہیں ہیں

مگر آیندہ اس قسم کی توسیع میں ہم خود اپنی موجودہ لائنوں کو متاثر کردیں گے۔ مثلاً ورنگل سے بجوارہ
کی اور حیدرآباد سے واڑی کی لائن کی آمدنی متاثر ہو جائے گی۔

ضلع مانڈیٹر سے عادل آباد تک مجوزہ ریلوے لائن کے سلسلہ میں مال اور مسافروں کے نرخ
کرایہ کی نسبت جی آئی ۔ پی ریلوے ممکن ہے کہ بحث پیدا کرے۔ مخفی نہ رہے کہ مملکت آصفیہ کے اندر
ہم اپنے نرخ کے متعلق پابند نہیں ہوسکتے کہ یہاں کے باشندوں اور ہماری ریلوے لائن کے مصالح
سے تجاوز کریں۔ البتہ ہم کو ہرگز خیال نہ کرنا چاہیئے کہ ہم برٹش انڈیا کی مسافرت اور تجارت کے لئے
وہاں کی قائم شدہ ریلوے لائنوں سے مقابلہ کریں۔

آگے چل کر اس خطبۂ صدارت میں بیان کیا گیا ہے کہ۔

"ایک طریقہ بیرونی ریلوں کا یہ ہے کہ اگر مال ہماری ریلوں کے زیادہ"
"حصہ پر سے گذرتا ہو تو وہ اپنے کمتر حصۂ ریلوے کا کرایہ اس قدر زیادہ"
"مقرر کر دیتے ہیں کہ مال بھیجنے والے کے لئے یہ زیادہ کفایت آمیز ہوتا ہے"
"کہ وہ ہمارے قریب تر راستہ سے مال روانہ کرنے کے بجائے بیرونی ریلوں"
"کے بعید تر راستہ سے جن کا مجموعی کرایہ کم تر ہے روانہ کریں"

اس کے ساتھ بھی کوئی مثال بیان ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔ ہماری ریلوں کا عمل وتوع ایسا ہے کہ
متذکرہ صدر صورت صرف بنگال ناگپور ریلوے اور ام، ایس، ام ریلوے پر پیش آسکتی ہے یہاں
یہ ممکن ہے کہ سی، پی صوبہ کا مال قاضی پیٹھ اور بلہارشاہ کے راستہ سے مدراس کو روانہ کیا جائے۔ مگر
دونوں ریلوے علاقہ نرخ کا مقابلہ کرتے ہوئے مال کو کم کرایہ سے بعید راستہ سے براہ والٹیر وبجوارہ
مدراس کو پہونچائیں، مگر اس عمل سے ہم کو کوئی وجہ شکایت نہ ہونی چاہیئے کہ برٹش انڈیا کے مال کو
وہ جس طرح ہو سکے اپنی لائنوں کے ذریعہ پہونچائیں۔

ریلوے کی تعمیر کا سرمایہ

اس خطبۂ صدارت میں بظاہر اس نظریہ کو پیش نہیں کیا گیا ہے کہ ملک میں ریل کی توسیع کی

ضرورت نہیں موٹر بسیں اور لاریاں کافی ہیں البتہ اس سلسلہ میں یہ کہا گیا ہے کہ

"ظاہر ہے کہ کوئی ملک اپنا سرمایہ ایسی ریلوں کی تعمیر میں صرف نہ کرے گا جن میں
خسارہ ہونے کا اندیشہ ہو بریں اہم کم سے کم منافع پر بھی حکومت سرکار عالی نے
بعض ریلوے لائنیں قائم کر دی ہیں۔ جو اصحاب اس کی تبلیغ کرتے ہیں ملک میں
ریلوے کا جال بچھا دیا جائے وہ اس نقطۂ نظر کو پیش نظر نہیں رکھتے۔"

اس اقتباس کے تعلق سے چند امور قابل اظہار ہیں۔ اس ملک میں سرکار عالی کیلئے اپنی
سلک نیز اپنی رعایا کے پس انداز کو صرف کرنے کے لئے تین اہم اور بڑے ذرائع ہیں۔

۱۔ برٹش انڈیا کے سرکاری پرامیسری نوٹس یا کسی اور بلدی یا پورٹ ٹرسٹ وغیرہ میں یا کسی برٹش انڈیا کے کاروباری سرمایہ میں رقم لگائی جائے۔

۲۔ اس ملک میں ریلوے یا آب پاشی کے کاروبار میں رقم لگائی جائے۔

۳۔ اس ملک میں کوئی کاروبار شروع کیا جائے۔

پہلی صورت میں عملاً سالانہ تین چار روپیہ فی صدی سے زیادہ کوئی منافع نہیں حاصل ہوتا ہے اور اس سے براہ راست ہمارے ملک کے معاشی ضرورتوں کے لئے استفادہ کا کوئی موقع نہیں ہے۔

دوسری صورت میں پرامیسری نوٹس سے زائد منافع سے قطع نظر حسب ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

الف ۔ رقم کا معتدبہ حصہ خام اشیاء کی فراہمی میں خود اندرون ملک صرف ہوتا ہے۔

ب ۔ رعایا کی ایک کثیر تعداد کو مزدوری، کاروبار یا ملازمت کا موقع ملتا ہے۔

ج ۔ اندرون ملک آمد و رفت اور کاروبار میں عام سہولت حاصل ہو جاتی ہے۔

رقم کو منافع پر لگانے کی تیسری صورت میں نفع و نقصان کا جوکھم رہتا ہے اور برطانیہ میں ایسے کاروبار کو قومی سرمایہ اور عام دولت مندوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

یہ امر درست ہے کہ ریلوے ہو یا کارہائے آب پاشی ابتدا میں صرفہ ہی صرفہ ہوتا ہے

اور پھر بتدریج آمدنی شروع ہوجاتی ہے یعنی ابتداء میں منافعہ بہت کم ملتا ہے مگر چند سال کے بعد کافی منافعہ ملتا ہے اور سابقہ صرفہ کی تلافی ہو جاتی ہے۔ خود سرکار عالی کی ریلوے لائنوں پر ابتداء میں بہت کم منافعہ ملا۔ بلکہ نقصان رہا مگر اب بتدریج ریلوے کاروبار سرکار عالی کے مالیہ اور آمدنی کا بڑا اہم جزو ہو گیا ہے۔ مجموعی طور پر سرکار عالی کے لئے ریلوے کی آمدنی بمقابلہ سرمایہ صرف شدہ کافی خیال کی جاتی ہے لیکن ریلوے کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ریلوے کے ہر حصہ کی آمدنی کا تناسب اس حصہ پر صرف شدہ سرمایہ کے مقابلہ میں نکالا جائے۔ چنانچہ اس لحاظ سے سرکار عالی کی جدید تعمیر شدہ لائنوں پر سرمایہ صرف شدہ پر منافع ممکن ہے کہ تھوڑا بہت زیادہ نہ ہو۔ اگرچہ اعداد اس کے متعلق دستیاب نہیں ہوتے ہیں۔ اور اسی کی جانب اس خطبۂ صدارت میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ

"کم سے کم منافع پر ہی سرکار عالی نے بعض ریلوے لائن قائم کر دی ہیں۔"

اس سلسلہ میں اس بات کی وضاحت نامناسب نہیں کہ برٹش انڈیا میں برطانی حکومت کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ریلوے کی تعمیر میں برطانی سرمایہ کو جو وافر مقدار میں کسی نفع آور کاروبار کے انتظار میں رہتا ہے بیکار رہنے نہ دیا جائے اور قومی دولت کو فروغ دیا جائے۔ مگر اب خود برٹش انڈیا میں حکومت کا نقطۂ نظر یہی ہو گیا ہے کہ جیسے جیسے وقت آتا جائے ریلوں کو سرکاری دائرہ میں لے لیا جائے۔ اور نئی لائین قائم کرنے میں حکومت ہی سرمایہ فراہم کرے۔ وہاں بھی ابتداء میں کم سے کم منافع کافی خیال کیا جاتا رہا ہے بہر حال ریلوے کے قیام پر جو صرفہ سرکار عالی نے برداشت کیا ہے اس کا کافی منافع مل رہا ہے اور مجموعی طور پر فی صد سو کے قریب ہو گیا ہے۔ نظم و نسق کی ضروریات، رعایا کی سہولت اور معاشی اعتبار غرض ہر پہلو سے سرکار عالی کے ریلوے کاروبار کو مستحسن اور سود مند قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت ہند کے پرامیسری نوٹوں اور برطانوی ہند کے کاروبار میں کم از کم منافع پر سرمایہ لگانے کے بجائے کم از کم منافع پر خود ملک میں ریلوے پر ہی سرمایہ کیوں نہ لگایا جائے جس سے

بے شمار دوسرے فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی نظر انداز نہ ہونی چاہیئے کہ دنیا کے ہر ملک میں نظم و نسق کی سہولتوں اور تحفظ کے مدنظر بعض ایسی ریلوں کی تعمیر پر بھی روپیہ صرف کیا جاتا ہے کہ جس سے کم سے کم منافع کی توقع تو درکنار خسارہ بھی برداشت کیا جاتا ہے۔

اگرچہ جنگ کی وجہ سے فی الحال کسی جدید ریلوے کی تعمیر کا امکان نہیں ہے مگر جب تذکرہ آ ہی گیا ہے تو گزشتہ زمانہ کے متعلق کچھ حالات کا اظہار ناگزیر ہے۔ سرکار عالی کی ۰۰ سالہ ریلوے پالیسی کا بحث بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ اس کو کسی دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھا جاتا ہے اور حالیہ اکیس سالہ دور کے متعلق بطور سرگزشت ماضی کچھ حقائق کا اظہار کیا جاتا ہے۔

ریلوے کا انفکاک

اس زمانہ میں دو اہم ترین مسائل درپیش ہوئے۔ ایک تو قاضی پیٹھ بلہارشاہ ریلوے کا معاہدہ اور دوسرے مسئلہ انفکاک ریلوے پہلے مسئلہ کے متعلق صراحت ہو چکی ہے یہاں دوسرے مسئلہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

سب سے پہلے بطور ایک واقعہ کے اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ گزشتہ ۲۰ سال کے دور میں ایک بڑے عرصہ تک مسٹر لایڈ جونس نظام اسٹیٹ ریلوے کمپنی کے ایجنٹ متعینہ حیدر آباد تھے اور ریلوے معاملات میں سرکار عالی کے پاس انھوں نے ایک ایسے مشیر کی حیثیت حاصل کر لی تھی کہ جس کی رائے عملاً قطعی اور آخری ہوتی تھی۔ خود سر اکبر حیدری بھی باوجود حالات سے آگاہی اور قابلیت کے ریلوے کے متعلقہ امور میں مسٹر لایڈ جونس کے مشورہ سے انحراف پسند نہیں کرتے تھے۔

بہر حال نظام اسٹیٹ ریلوے کو کمپنی سے منفک کرانے کا امکان سنہ ۱۹۱۴ء میں حاصل تھا۔ سر جارج واکر نے ایک عرصہ قبل حضرت غفران مکان کی منظوری سے تصفیہ کر دیا تھا کہ سنہ ۱۹۱۴ء میں انفکاک کے موقع کو کام میں نہ لایا جائے کیونکہ اس قدر رقم جو انفکاک کے لئے مطلوب ہے

سرکارعالی مہیا نہ کرسکے گی البتہ سنہ ۱۹۳۲ء میں اس حق سے استفادہ کیا جائے اور اس دوران میں جس قدر بھی ممکن ہو کمپنی کے شیئرز اور ڈبنچر خوش خریدی سے سرکارعالی خرید لیا کرے اور سرکارعالی کی بچت سے ایک سرمایہ تبدریج جمع کیا جائے اور اس کو حکومت ہند کے پرامیسری نوٹس خرید کر کے محفوظ رکھا جائے جو بروقت انفکاک کے کام میں لائے جائیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ سر جارج واکر سنہ ۱۹۱۴ء کے مالیہ سرکارعالی کی درخشانی کی پیش بینی نہ کرسکے لیکن ان کے بعد کے اعلیٰ ترین ذمہ داران حکومت توجہ فرماتے اور فراست و تدبیر سے حالات کی تحقیق کراتے تو سنہ ۱۹۱۴ء میں ہی ریلوے کا انفکاک ہو جاتا اس وقت زاید رقم کی جس قدر ضرورت تھی اور جس کی مقدار پانچ کروڑ روپے کے اندر تھی وہ خود اندرون ملک قرضہ لے کر باسانی مہیا کی جاسکتی تھی ۔ اس سال میں جس قدر رقم بطور زائد منافع کمپنی نے حاصل کی اور جو رقم بطور انکم ٹیکس خزانہ انگلستان کو دی گئی اور نظم و نسق کمپنی میں صرف ہوئی اس سے قرضہ کی ادائی ہو کر ہر قسم کی ذمہ داریوں سے خلاصی حاصل ہو جاتی اور جو مزید بار بعد میں کروڑوں روپے کا برداشت کرنا پڑا اس میں بھی کمی ہو جاتی ۔

بہرحال سنہ ۱۹۱۴ء میں اگرچہ ریلوے کا انفکاک نہیں ہوا مگر بتدریج کمپنی کے شیئرز اور ڈبنچر بہ حق سرکار خریدے جانے لگے اور سرکارعالی کی سلک سے ایک کروڑ سے زیادہ رقم انفکاک کے کام میں لائی جانے کے لئے محفوظ کر لی گئی ۔ یہ سمجھا جانے لگا کہ حضرت بندگانعالی کی منظورہ پالیسی ہے کہ سنہ ۱۹۳۲ء کے آغاز میں ریلوے سرکارعالی کی ملک ہو جائے گی اور اس کا انتظام انگلستان میں ہونے کی ضرورت باقی نہ رہے گی لیکن سنہ ۱۹۳۲ء کو عرصہ باقی تھا کہ نہ معلوم کن وجوہات سے دفعتہ مسٹر لائڈ جونس نے یہ رائے ظاہر کی کہ ریلوے کا انفکاک اگر سنہ ۱۹۳۲ء میں کرایا جائے تو مالیاتی نقطۂ نظر سے بہت نقصان کا باعث ہوگا اس لئے ایک جدید کمپنی قائم کر کے انفکاک سنہ ۱۹۵۲ء بلکہ اس کے بعد کرانا چاہیئے ۔ سر اکبر حیدری مرحوم بھی اس رائے کے حامی ہو گئے اس وقت انھوں نے جو اعداد و شمار پیش کئے اور جو طریقہ استدلال اختیار کیا اس کے متعلق آج

یہ ظاہر کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ وہ غلط فہمی پیدا کرنے کا موجب تھا۔ حیدرآباد میں ایک جدید کمپنی قایم کرکے ۱۹۵۷ء تک انفکاک عمل میں نہ آنے دینے کے متعلق سر اکبر حیدری نے جو استدلال قائم کیا تھا اس کے دو اہم اجزا یہ تھے۔

(۱) کمپنی کا صدر مقام انگلستان میں رہنے کی وجہ سے لاکھوں روپے انکم ٹیکس کی بابتہ بلا وجہ ادا کرنے پڑتے ہیں اس لئے اگر نئے نام سے کمپنی حیدرآباد میں قائم ہو تو انکم ٹیکس کی بچت ہوگی

۲۔ ۱۹۳۴ء میں انفکاک کے لئے جس قدر رقم کی ضرورت ہوگی وہ خزانہ میں موجود نہیں ہے بازار میں ۶ فی صدی سود سے قرضہ لینا ہوگا۔ اس سود کا بار سرکار عالی کے خزانہ پر بے حد ہوگا اور مفروضہ حسابوں سے ظاہر کیا گیا کہ ۱۹۳۴ء میں انفکاک بمقابلہ ۱۹۵۷ء کے بار گران ثابت ہوگا۔

یہ کوشش عمل میں لائی گئی کہ وہ تمام کارروائی پوشیدہ یا نظر انداز کر دی جائے جو سر جارج واکر اور سر رجنالڈ گلانسی نے ۱۹۳۴ء میں ریلوے کے انفکاک کے لئے حضرت غفران مکان اور خود اعلیٰحضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہ کی شاہانہ منظوری سے عمل میں لائی تھی۔ اس فنڈ اور ان پر اسری نوٹوں کا حوالہ بھی نہیں دیا گیا جو انفکاک ریلوے کے لئے حضرت بندگان عالی کے حکم سے سرکار عالی کی سلاک میں محفوظ تھے اس رقم کو نظر انداز کر دینے سے ہی سر اکبر حیدری مرحوم کے مفروضہ حسابات کی قوت غالب آجاتی تھی۔

غرض سر اکبر حیدری مرحوم کی انتہائی رازداری اور مصلحت آمیز طریقہ کارروائی کے باوجود ان کے تجاویز کو شرف منظوری حاصل نہ ہوا اس نوبت پر پھر نواب تلاوت جنگ بہادر نے جو اس وقت رکن باب حکومت تھے اپنی حکمت عملی اور جرارت کام لائی تفصیلی واقعات کو معلوم کرکے یہ رائے قائم کی کہ ریلوے کے انفکاک کے لئے جو رقم جمع ہے اس کی منہائی کے بعد جو رقم مطلوب ہوگی وہ بھی سرکار عالی کی دیگر رقوم سلکت ادا کر دی جا سکتی ہے اس کے باوجود کچھ اور رقم ضروری ہو تو قرض لیا جا سکتی ہے نواب صاحب موصوف نے خود مسٹر لائڈ جونس کو اپنے پاس طلب کیا اور یہ ظاہر کرکے کہ سرکار عالی کے پاس ایک فنڈ ریلوے کے انفکاک کے لئے موجود ہے دریافت کیا کہ اس کو کام میں لانے کے بعد کیا جو حساب

صدر المہام فینانس نے مرتب کیا ہے اس میں فرق نہ آئیگا اور انفکاک کے حق میں جدید اعداد و نتائج مرتب نہ ہوسکیں گے مسٹر لائیڈ جونس نے تحریراً اس کا جواب اثبات میں دیا۔

نواب تلاوت جنگ بہادر کی رائے اور ان کا استدلال سر اکبر حیدری مرحوم کے لئے پریشانی کا موجب تھا ان کا ایک طریقہ کار یہ بھی تھا کہ اپنی غلطی کے باوجود غلط استدلال سے مقابلہ پر آمادہ ہوجاتے تھے ان کا جواب اب یہ تھا کہ محفوظ انفکاک فنڈ کو کام میں لایا جائے تو اس سے بھی ان کے مرتبہ اعداد میں فرق نہ آئیگا کہ سرکار عالی نے گویا فیصدی ۶ منافع والے کا سرمایہ اس کام میں استعمال کیا سر اکبر حیدری نے بھی اپنی تائید میں مسٹر لائیڈ جونس کی ایک دوسری تحریر حاصل کرلی۔ واضح ہو کہ جس سرمایہ کا سر اکبر حیدری نے حوالہ دیا تھا وہ تین روپیہ آٹھ آنہ فی صدی کے سرمایہ میں لگایا ہوا تھا اس کو ۶ فی صدی کے حساب میں شمار کرنا کہاں تک صحیح ہوسکتا تھا۔ اس کے اصلی اعداد اور نتائج حسابی سے تجاہل عارفانہ کرلیا گیا بہرطور اس وقت کے ذمہ داران حکومت بھی نواب تلاوت جنگ بہادر کی رائے سے اس کی قوت کی بنا پر انحراف کرنا ممکن نہ ہوسکا اور یہ خیال کیا گیا کہ یہ مسئلہ مزید غور و خوض و تفتیش اور رائے ماہرین کا محتاج ہے بالآخر نواب تلاوت جنگ بہادر کی رائے کہ سابقہ منظورہ احکام شاہی کے مطابق سنہ ۱۹۳۰ء میں ریل کا انفکاک ہوجانا چاہیئے، پیشگاہ حضرت بندگان عالی سے منظور فرمائی گئی۔

تین سال کے اندر ایک حیرت انگیز کایا پلٹ ہوئی وہی مسٹر لائیڈ جونس اور وہی سر اکبر حیدری جو سنہ ۱۹۵۲ء تک ریلوے کا تعلق قدیم کمپنی سے جدید نام کے ساتھ قائم رکھنے پر مصر تھے اب اس تحریک کے علمبردار ہوگئے کہ یکم جنوری سنہ ۱۹۳۳ء کے انفکاک کے بجائے سنہ ۱۹۳۰ء کے اختتام پر ہی ریلوے کمپنی سے منفک کرائی جائے بالآخر یہ تحریک منظور ہوگئی اور ۳ سال قبل ریلوے کے انفکاک کیلئے زائد از پچاس لاکھ رقم کا صرفہ بھی گوارا کیا گیا۔

اس زمانہ میں اخبار رعیت کا اختلاف اور اس کی مسدودی اور اخبار صحیفہ کی تائید یادگار رہ جائیں گے۔

وہ افسران و عہدہ دار جنہوں نے سابقہ تجویز بننے نہ دی تھی دریافت کرسکتے تھے کہ اس کایا پلٹ کی کیا وجہ ہے

بہرحال کایا پلیٹ اب بھی ایک راز سربستہ ہے مگر تعمق سے واضح ہوتا ہے کہ ایک کمپنی کے بجائے دوسری کمپنی کی تشکیل میں یا کمپنی کے اختتام پر اس کے ڈائرکٹروں کو بہت کچھ فوائد مختلف صورتوں میں حاصل ہوجاتے ہیں۔ جب تبدیل کمپنی کی توقع باقی نہ رہی تو صرف یہ شکل باقی تھی کہ انفکاک کمپنی کی صورت میں ہر حصہ پر فی صدی ۱۵۰ روپے زائد رقم کی جو توقع ۳ سال بعد بھی وہ مع دیگر فوائد پہلے ہی حاصل کرلی جائے ظاہر ہے کہ انفکاک ریلوے سے یہ فوائد جن لوگوں نے حاصل کرنے چاہے وہ اُنھوں نے حاصل کرلئے۔

انفکاک ریلوے میں اس سے قطع نظر کہ کئی لاکھ روپیہ کی رقم زائد ادا کرنی پڑی دو امور ایسے عمل میں آئے کہ جو اس وقت انفکاک ریل کی قدر و قیمت کم کر رہے تھے ان دونوں امور کی صراحت ذیل میں کی جاتی ہے۔

۱۔ حصہ داروں کا ایک ریلوے بورڈ انگلستان میں قائم تھا اور وہ وہاں سے مملکت آصفیہ کی ریلوے کا انتظام عمل میں لایا کرتا تھا اب خود سرکار عالی کا ریلوے بورڈ بھی انگلستان میں ہی قائم کیا گیا گویا پرانی شراب نئی بوتلوں میں بھری گئی۔ حالانکہ جب برٹش انڈیا میں سرکاری ریلوے کا انتظام ہندستان میں ہی محکمہ ریلوے بورڈ کے سپرد تھا تو یہاں بھی اسی اصول پر انتظام ممکن تھا۔

یہ مشہور ہے کہ اس انتظام سے مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی نے اختلاف کیا تھا مگر اختلاف اس وقت کامیاب ہوتا ہے جب لوہے کو فولاد سے کاٹنے کی کوشش کی جائے۔ جن اصحاب نے مہاراجہ کی اختلافی رائے کی ترتیب میں حصہ لیا تھا وہ اپنی کوشش میں یقیناً کامیاب ہوتے اگر وہ حسول معلومات اور صحیح استدلال کے ساتھ اسی طرح کوشش کرتے جیسے کہ نواب تلاوت جنگ بہادر نے اپنے وقت کی تھی۔

بہرحال اب ریلوے بورڈ حیدرآباد میں قائم ہوگیا ہے۔

۲۔ دوسرا امر فراہمی رقم کی سبیل تھی جس زمانہ میں سر اکبر حیدری نے انفکاک ریلوے کے لئے تجاویز پیش کی تھیں اس وقت انھوں نے اس بات کا تیقن حاصل کرلیا تھا کہ ان کی تجاویز منظور ہوجائیں گی۔ یعنی اس وقت انھوں نے ڈھائی تین کروڑ کے مابین رقم گورنمنٹ آف انڈیا کے

پرامیسری نوٹوں کی خریدی میں لگا دی۔ حالانکہ ان کو علم تھا کہ اس رقم کی ضرورت سرکار عالی کو انفکاک ریلوے کے لئے بہت ہی قریب زمانہ میں داعی ہوگی۔

اس زمانہ میں سررشتہ فینانس سرکار عالی کی سلک کو برٹش انڈیا کے پرامیسری نوٹوں میں لگا دیا کرتا تھا حالانکہ اس خطیر رقم کا مناسب حصہ خود ملک میں کارہائے آب پاشی ریلوے اور صنعت و تجارت کی ترقی میں بہتر طریقہ سے صرف ہوسکتا تھا۔

علاوہ ازیں سرکار عالی نے بہت عرصہ قبل جو فنڈ برٹش انڈیا کے ۳ پ فی صدی کے منافع والے پرامیسری نوٹوں کی صورت میں انفکاک ریلوے کے لئے مخصوص کردیا تھا اور اس کو اب فروخت کرکے نقد رقم حاصل کی جاسکتی تھی اس کو بھی نظر انداز کردیا گیا۔

ان دونوں طریقوں کو ترک کرکے یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ امپیریل بنک سے ۶ ۱/۲ فی صدی سود سے قرضہ لیا گیا۔

واقف حال افراد کے پاس یہ خیال کیا جاتا ہے کہ چند سال قبل سرکار عالی نے کثیر مقدار میں جو قرضہ بازار سے حاصل کیا اس کا بڑا حصہ امپیریل بنک کے اسی قرضہ کی ادائی کے لئے حاصل کیا گیا۔ بہرحال امپیریل بنک سے جو روپیہ لیا گیا اور پھر بازار میں جو قرضہ لیا گیا اس کا سود اس سے زیادہ دیا گیا ہے جو برٹش انڈیا کے پرامیسری نوٹوں سے سرکار عالی کو مل رہا تھا۔ اور جو رقمی اعداد انفکاک کے وقت بتائے گئے ادس میں اس کی وجہ تفاوت پیدا ہوگا۔ (باقی)

———— ❊ ————

انجمن ہائے قرضۂ حسنہ کی اہمیت اور حیدرآباد میں انکی حالت

از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب اُستاذ شعبۂ قانون جامعہ عثمانیہ

"اللھم انی اعوذ بک من الماثم والمغرم"

یعنی "اے اللہ میں تیرے پاس گناہ اور قرض سے پناہ مانگتا ہوں"

یہ وہ دُعا ہے جو ہر مسلمان روزانہ پانچ وقت کی نمازوں میں تشہد میں ضرور دہراتا ہے قرض کے متعلق دیگر اقوام اور ادبیات میں بھی کوئی تعجب نہیں جو ایسے ہی جذبات آفرین تصورات پائے جاتے ہوں۔

انسان کے صفات بہیمیہ میں سے ایک حرص اور نفع اندازی کی چاہت بھی ہے کسی کو کوئی ضرورت پیش آئے تو وہ شخص جو اس ضرورت کو پوری کرسکتا ہے اپنا معاوضہ چاہتا ہے مثلاً الف کو قرضہ لینے کی ضرورت ہوئی۔ ب کے پاس فالتو روپیہ ہے وہ الف کو مطلوبہ رقم دیتا ہے۔ فطرۃً وہ اس قرض کے واپس ادا کئے جانے کا نہ صرف مستحق ہوتا ہے بلکہ اس کا تصور ساتھ ہی یہ ہوتا ہے کہ میں نے ب کو اپنے روپیہ کے استعمال کا حق ایثار کرکے اور خود کو محروم کرکے دیا ہے۔ اسلئے اس کا معاوضہ ملنا چاہیئے روپے کا معاوضہ تو روپیہ لیکن اس ایثار کا معاوضہ کیا ہو؟ یہیں سے سود کا ادارہ وجود میں آتا ہے۔

دُنیا کا ہر مہذب مذہب فرشتہ صفاتی کو ترقی دینے کیلئے آیا۔ بلا معاوضہ ایثار بھی انہیں صفات ملکوتی میں شامل ہے کسی مذہب نے انسان کو فرشتہ بنانے میں غلو سے کام لیا اور کسی نے اعتدال پر قناعت کی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اعتدال کو مطمح نظر بنانے والے ہی زیادہ کامیاب رہتے ہیں۔

قرض میں سود لینا یہودی مذہب میں بھی حرام ہے، عیسائی مذہب میں بھی، اسلامی ممانعت کی تفصیل ابھی بیان کی جائیگی۔ مجھے سنسکرت نہیں آتی۔ دھرم شاستر یا ویدک کتابوں کا محدود مطالعہ بتاتا ہے کہ ہندوؤں کے ہاں بھی اس کی مشروط ممانعت ہے ممکن ہے میرے معلومات ناقص ہوں بہرحال ہندو نقطۂ نظر

یہہ معلوم ہوتا ہے کہ قرض بغیر سود کے دیا جائے لیکن قرضخواہ کے مطالبے پر مقروض وعدہ وفائی نہ کرے تو پھر اس تاریخ سے گویا بطور ہرجہ یا جرمانہ سود دینا پڑے گا۔

انگلستان کے پُرانے حالات دریافت کرنے کی میں نے کوشش نہیں کی۔ عیسائیت قبول کرنے کے بعد سود خواری کو مذہبی لوگ ایک گھناونی اور عیسائیت شکن چیز سمجھتے رہے۔ سود سے بچنے کے لئے رہن انتفاعی وجود میں آیا کہ دوران قرض میں مرہونہ زمین کے منافع سے قرضخواہ مستفید ہوتا رہے اور قرض کی بے باقی پر زمین مقروض کو واپس کیجائے۔ چنانچہ ولیمس نے کتاب جائداد اراضی (REAL PROPERTY طباعت نوزدہم صفحہ ۵۲۸) میں بیان کیا ہے کہ:۔

"THE OBJECT OF MORTUM VADIUM WAS TO GIVE THE CREDITOR THE PROFIT OF THE LAND IN LIEN OF INTEREST; THE TAKING OF WHICH UNDER THE NAME OF USURY, WAS ANCIENTLY REGARDED AS AN UNCHRISTIAN ABOMINATION"

غرض سود خواری ہر مہذب مذہب اور ملک میں ناپسند کیجاتی رہی ہے اور جدید ترین ماہرین معاشیات بھی یہ ماننے لگے ہیں کہ سب سے مہذب معاشرہ وہی ہوگا جہاں شرح سود سب سے کم ہو اور بلا سودی قرضہ ملنا ایک انتہائی مطمح نظر ہے۔ یہ چیز مان تو لی گئی ہے لیکن جب تک بلا سودی قرضہ دینے کا کوئی قابل اطمینان انتظام نہ کیا جائے صرف سود کی اخلاقی بلکہ قانونی ممانعت سے مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ مذہبی آدمی سود لینے سے تو بچیگا لیکن سود دینے پر وہ بھی خواہی نخواہی مجبور ہوجاتا ہے جب اس کے احتیاج کی تکمیل کسی سود خوار کے سوا کوئی اور کرنے آمادہ نہ ہو۔

مملکت کے اختیارات کی توسیع پر اس برائی کے ازالے کی کوئی تدبیر سوچی گئی تو صرف یہی کہ قانون کے ذریعے سے سود کی شرح معین کیجائے یعنی قرض کی نالش عدالت میں ہو تو ایک معینہ شرح سے زیادہ سود کی ڈگری نہیں دیجاسکتی۔ چنانچہ مشہور لامذہب بادشاہ ہنری ہشتم کے زمانے میں انگلستان میں (قانون نشان ۳۷ ہنری ہشتم کیشن ۱ کے ذریعے سے) سود کی عیسائی ممانعت کو قانوناً منسوخ قرار

دیا گیا اور اسی قانون کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ دس فیصد شرح سے سود لینے کی اجازت دی گئی۔ ملکہ این (ANNE) حکمران ہوئی تو اس نے شرح کو گھٹانے کا حکم دیا۔ اور (قانون نشان ۱۲ این کمیشن ۱۵ کے ذریعے سے) شرح سود پانچ فیصد مقرر کی گئی جو ۱۸۵۴ء تک باقی رہی۔ جس کے بعد سے ہر قسم کی ممانعت اٹھالی گئی اور فریقین معاہدے میں جو شرح سود مقرر کریں عدالت ان کی ڈگری دینے لگی۔ اور بنکوں اور قرض دہندوں کی کثرت کے باعث سود خواری کی اس قانونی عام اجازت کے باوجود عوام کو کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔

بہرحال سود کی ممانعت وہ مطمح نظر ہے جو ہر مذہب نے مقرر کیا ہے لیکن اس کی تعمیل کیلئے جو ضرورتیں تھیں وہ پوری نہیں کی گئیں۔

جب تک قرضہ بلاسودی کا انتظام نہ کیا جائے ظاہر ہے کہ سود خواری کے وجود سے دُنیا پاک نہیں ہوسکتی۔ ایسا انتظام دولت عامہ یعنے حکومت ہی کرسکتی ہے۔ کوئی اور عام فرد نہیں لیکن اکثر مذاہب نے حکومت کو اپنے دائرہ عمل سے خارج رکھا حتیٰ کہ مذہب اور سیاست ایک دوسرے سے بالکل الگ چیزیں سمجھی جاتی رہیں۔ ڈریپر نے یورپ میں مذہب عیسائیت اور سائنس کی طویل حریفی اور معرکہ آرائی پر ایک عالمانہ کتاب ہی لکھ ڈالی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب اسلام نے مذہب اور سیاست کو ایک ہی ماخذ اور ایک ہی اقتدار کے تحت کردیا تو اس کی نظر نے فوراً اس برائی کو تاڑ لیا اور اس نے اس کا علاج اس کی جڑ پر وار کرکے کیا۔

میرے محدود مطالعے میں وہ پہلا مذہب جس نے سود کو حرام قرار دیتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ قرضۂ حسنہ کا سرکاری انتظام کرنے حکم دیا وہ اسلام تھا چنانچہ تقسیم وگردش دولت اور مالداروں پر محصول لگاکر محتاجوں کی عام امداد کے احکام کے علاوہ قرآن مجید کے سورہ ۹ آیت ۶۰ میں موازنہ سرکاری کے اصول بتائے گئے ہیں کہ کن کن مدات میں سرکاری آمدنی خرچ کیجاسکتی ہے۔ اس میں "فقراء و مساکین" کے علاوہ "غارمین" ایک دلچسپ لفظ بھی ہے۔ اس کے معنے قرضداروں کے ہیں۔ فقراء و مساکین کے علاوہ غارمین کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ اس سے مراد وہ خوشحال لوگ ہیں جن کو مجبوراً عارضی طور سے قرض لینا پڑا ہو

مفلس قرضدار تو فقرا و مساکین میں آجائیگا۔

سود کی ممانعت عہد نبوی کے آخری احکام میں سمجھی جاتی ہے اور خوشباش لوگوں کے قرضۂ حسنہ کے یہ احکام جناب رسالتؐ کی وفات سے بمشکل سال بھر پہلے کے ہیں۔ اس لئے اس کا خصوصی "ادارہ" عہد نبوی میں وجود میں نہ آسکا۔ کیونکہ اس علم کے بعد جلدی ہی ارتداد وغیرہ کی بغاوتیں شروع ہوئیں جن کا سلسلہ حضرت ابو بکرؓ کے دور خلافت میں بھی جاری رہا۔ آخر جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں مملکت اسلامیہ نے استحکام اور وسعت حاصل کی تو مورخین نے بیان کیا ہے کہ بیت المال کے خزانۂ عامرہ میں ایک صیغہ قرضے بلا سودی کا بھی کھولا گیا تھا اور مختلف لوگ حتیٰ کہ خود خلیفہ بھی اپنی سالانہ تنخواہ کی کفالت پر بیت المال سے قرضہ حاصل کیا کرتے تھے۔

خلافت راشدہ میں اس کا سلسلہ جاری رہا اور مدینہ منورہ کے مرکزی بیت المال اور دیگر مقامات کے صوبہ داریوں سے یہ کاروبار ایک امر مفاد عامہ کے طور پر انجام پاتا رہا۔ اور مملکت اسلام میں سودی قرضوں کا نام و نشان تک نہ رہا۔

بعد کے ادوار میں اس کا زیادہ پتہ نہیں چلتا بلکہ خود گورنروں سپہ سالاروں وغیرہ کو اپنے ملازموں کی تنخواہ کے لئے یہودی سرمایہ داروں سے قرض لینا پڑتا تھا۔ اور انہیں سود تو نہیں دیا جاتا تھا البتہ اس کے عوض انعام کے نام سے مناسب زاید رقم یا کوئی اور چیز دیدی جایا کرتی تھی۔

مراکش کے پائے تخت شہر فاس کے مشہور علم دوست امیر سید عبدالحی الکتانی نے اپنی شہرۂ آفاق اور ضخیم (دو جلدوں میں لکھی ہوئی کتاب) **نظام الحکومۃ النبویۃ** میں اپنے وطن کا ایک دلچسپ واقعہ بھی ضمناً ایک جگہ درج کیا ہے کہ خیراتی اوقاف کے طور پر کئی سو سال ہوئے ایک مزاکتی مخیر نے کئی ہزار اشرفیاں اس غرض سے وقف کی تھیں کہ ان سے لوگوں کو بلا سودی قرضہ دیا جایا کرے۔ کافی عرصہ تک یہ کام چلتا رہا پھر متولیوں کی نااہلی سے نادہند قرضداروں نے اسے ختم کردیا۔

خانگی کوششوں کی یہ قدیم ترین مثال تھی جسکا مجھے تا حال علم ہوسکا۔

خانگی اور امداد باہمی کی عارضی انجمنوں کا ایک طریقہ ہندوستان میں خاصا قدیم کم از کم سو

یون سو سال سے نظر آتا ہے کہ چند آدمی ایک معینہ مدت تک ماہوار قسطوں میں ایک معینہ رقم دیتے رہیں اور ہر ماہ جتنی رقم جمع ہو وہ قرعہ اندازی کرکے یا باہمی رضامندی سے کسی ایک یا چند اشخاص کو دیدی جائے جملہ اقساط ادا کردینے پر ان کی جتنی مجموعی رقم ہوتی تھی اتنی ہی انہیں مل چکی ہوتی یہ طریقہ جیسے مدراس میں ندہی سسٹم کہتے ہیں ہمارے خاندان میں چٹھی ڈالنے کے نام سے کم ازکم میرے بچپن یعنی تیس ایک سال سے پایا جاتا ہے ممکن ہے اور جگہ بھی یہ طریقہ رائج رہا ہو۔

امداد باہمی اور قرضوں کی مستقل انجمنوں کا وجود یورپ میں کہتے ہیں کہ ۱۸۴۷ء سے جرمنی سے شروع ہوا۔ پھر مختلف ممالک میں ان کو زراعت، تجارت اور حرفت وغیرہ کیلئے اختیار کیا جانے لگا برطانوی ہند میں ۱۹۰۴ء تک اسے اختیار کیا نہ جاسکا لیکن یہ سب کاروبار سودی تھے یعنے چاہے شرح کم ہی کیوں نہ ہو، قرض لینے والے سے سود لیا جاتا اور رقم امانت رکھانے والے کو سود دیا جاتا تھا بہرحال برطانوی ہند میں ان کی عمر اب سینتیس ۳۷ اڑتیس ۳۸ سال سے زیادہ نہیں۔

حیدرآباد نے اکثر اہم اور عہد آفرین امور میں برطانوی ہند کی رہنمائی کی ہے۔ امداد باہمی کی انجمنوں اور ان میں بھی بلاسودی کاروبار کی انجمنوں کا آغاز بھی حیدرآباد میں برطانوی ہند سے پہلے ہوا۔ چنانچہ سب سے قدیم انجمن جس کا مجھے تا حال علم ہو سکا ہے وہ موئید الاخوان کے نام سے قائم ہوئی جس پر اسی ذیحجہ ۱۳۶۱ھ میں پورے باون سال گذر چکے ہیں۔ اور یہ انجمن اب تک جاری ہے۔ اسکے مختصر حالات اور اصول دلچسپی کا باعث ہونگے۔

سیدالشیوخ حضرت سید شاہ محمد عمر صاحب قادری حیدرآباد کے مشہور بزرگ گزرے ہیں جن کا مزار آجکل فلک نما کے پاس قادری چمن کے نام سے مشہور ہے۔ آغاز ذی حجہ ۱۳۰۹ھ میں انہوں نے موئید الاخوان کے نام سے قاضی پورہ حیدرآباد میں ایک انجمن قائم کی کہ جو لوگ بقرعید میں قربانی کے چمڑے خیرات کرنا چاہیں وہ اصل چمڑا یا فروخت کرکے اسکی قیمت اس انجمن کو دیدیں اور اس رقم سے لوگوں کو زیور یا دیگر قابل اطمینان کفالت پر بلاسودی قرض دیا جائے۔ حضرت سید الشیوخ کی ذاتی عظمت کے باعث ان کے مرید اور معتقد اپنی رقمیں بھی ان کے پاس امانت رکھاتے تھے۔ چنانچہ اس امانتی رقم کو بھی

وہ اسی انجمن میں رکھنے اور امانت رکھانے والوں کی اجازت سے اس سے بھی حاجت مندوں کو قرض دیتے۔ بیس اکیس سال تک حضرت موصوف کی سرپرستی میں یہ کام اسی طرح چلتا رہا اور ۲۰ صفر ۱۳۳۳ھ کو آپ کی وفات کے وقت انجمن کا سرمایہ دو ہزار آٹھ سو باسّی روپے اور دیگر رقوم امانت دو ہزار پانچ سو دو روپے تھیں۔ اس طرح تقریباً پانچ سوا پانچ ہزار کی رقم سے حضرت سید الشیوخ رحؒ کی وفات کے سال یعنی ۱۳۳۳ھ میں چھے ہزار سات سو ستھتر روپے قرض دیا گیا تھا۔

اس کے بعد سے یہ انجمن حضرت موصوف کے فرزند اور جانشین مولانا سید محمد بادشاہ حسینی صاحب قبلہ کی سرپرستی میں برقرار و کارگزار ہے۔ اب اس کا سرمایہ دس ہزار تک پہنچ گیا ہے جس سے اس باون سال کے عرصے میں کوئی ساڑھے پانچ لاکھ روپے بلا سودی قرضہ دیا گیا۔ اس سلسلہ میں مولوی سید محمد عبد الجبار صاحب مرحوم کا ذکر بھی کرنا چاہیئے جنہوں نے تقریباً چالیس سال تک مددگار معتمد کی حیثیت سے اس انجمن کے جملہ حسابی کاروبار محنت و دیانت سے انجام دیئے اور ثابت کر دیا کہ کسطرح صرف ایک چرم قربانی کی خیرات کو منظم طور سے صرف کیا جائے تو عظیم الشان نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

تقریباً اسی کی ہم عصر ایک انجمن معین الاخوان کے نام سے مغل پورہ حیدرآباد میں قائم ہوئی جو غالباً اب برخاست ہو چکی ہے۔ اس کے زیادہ حالات مجھے معلوم نہ ہو سکے۔

ایک اور مشہور انجمن معین المسلمین تھی جو اگرچہ جلدی ہی برخاست ہو گئی مگر کاروبار کی وسعت کے باعث اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ یکم رجب ۱۳۲۰ھ کو دبیر پورہ حیدرآباد میں قائم ہوئی۔ اس کے مطبوعہ دستور کا پہلا جملہ یہ تھا "قرضہ حسنہ دینے کے فوائد و ثواب جو آیات قرآنیہ واحادیث حضرت نبویہ علیہ وآلہ افضل الصلوٰۃ والتحیہ سے ثابت ہیں اس سے اکثر ہمارے بھائی مسلمان واقف ہیں مگر اسی زمانہ میں اس کا اصول جس طرح عنقا مثال ہو گیا ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ نظر بریں اس کار خیر کی اجرائی کی غرض سے چند سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ ہمارے بعض معزز حضرات اور سچے ہمدردان قوم نے مجلس مؤید الاخوان و معین الاخوان بہ محلہ قاضی پورہ و مغل پورہ قائم فرما کر کامیابی حاصل کی ہے۔ لہٰذا اب ہم نے بھی بنظر توسیع اشاعت و سہولت اسی غرض کی

تکمیل کیلئے ایک مجلس موسوم بہ معین المسلمین بمقام دبیر پورہ قائم کی ہے۔ جو فی نفسہ بلحاظ مقصود اغراض متحدہ کا حکم رکھتی ہے رع عبارا تنا شتی وحسنک واحد۔

اس کا اصول یہ تھا کہ لوگ کم از کم ماہانہ ایک روپیہ یا یکمشت بارہ روپئے جمع کریں۔ زیادہ کیلئے کوئی حد نہ تھی۔ اس مجتمعہ رقم سے شرکاء کو اولاً اور دوسرے لوگوں کو ثانیاً بقدر گنجایش قرضۂ حسنہ دیا جاتا تھا۔ امانتی رقوم ختم سال ہجری سے قبل کوئی واپس لینے کا مجاز نہ ہوتا تھا۔ واپسی کیلئے ایک ماہ قبل اطلاع دینی ہوتی تھی۔ اور بعض وقت رقم بہ اقساط واپس کی جاتی تھی۔ قرض کے لئے زیور کفالت میں رکھنا ہوتا تھا البتہ شرکاء کو ان کی مجتمعہ امانتی رقم کی حد تک بلا کفالت قرضہ دیا جاتا تھا۔ قرضہ شرکاء کو ان کی امانتی رقم سے دگنی رقم کی حد تک باخذ کفالت دیا جا سکتا تھا۔ اور غیر شرکاء کو شرکاء کی ضمانت پر پچیس ۲۵ روپے کی حد تک۔ اس کے معتمد مولوی سید محمد علی شطاری مرحوم تھے پہلے ہی سال کوئی آٹھ سو رقم جمع ہوئی جس سے الٹ پھیر ہو کر کوئی ڈیڑھ ہزار قرضہ دیا گیا۔

معین المسلمین کی چودھویں سالانہ رپورٹ جو غالباً آخری ہے میرے پیش نظر ہے۔ یہ ۱۳۳۲ھ کے متعلق ہے۔ اس چودہ سال کے عرصے میں (۱۰۹۰) ایک ہزار نوے اشخاص اس میں شریک ہوئے تھے اور ایک لاکھ بیس ہزار تین سو نواسی روپے، سالانہ نو ہزار کے اوسط سے، امانت رکھائے گئے اس سوا لاکھ روپے سے چودہ سال کے عرصے میں دو لاکھ نوے ہزار سے زاید قرضہ باخذ کفالت اور تقریباً پچیس ہزار بلا اخذ کفالت شرکاء کو ان کی اپنی رقم کی ضمانت میں گویا سوا تین لاکھ روپیہ بلا سودی قرض دیا گیا۔ ایسی انجمنوں کا آغاز چھوٹے کاروبار سے ہوتا ہے اور روز افزوں وسعت اختیار کرتا ہے اگر یہ انجمن اپنے سوا لاکھ روپے کے سرمایے سے کاروبار جاری رکھتی تو اب تک کروڑوں کا الٹ پھیر ہو جاتا۔

بہر حال ذمہ داران انجمن کی مروت اور بعض قرضداروں کی بدمعاملگی سے یہ انجمن آخر برخاست ہوگئی۔ غرۂ محرم ۱۳۴۳ھ میں ایک انجمن العروۃ الوثقی کے نام سے قائم ہوئی جس میں صرف

سُنّی مسلمان شریک ہوسکتے تھے۔ انجمن کے سرمایہ سے قرضِ حسنہ بھی دیا جاتا تھا۔ دو سال بعد اس انجمن نے تجارت کو بھی اپنے کاروبار میں شریک کرلیا جو سرمایہ مشترکہ سے شروع ہوئی اور سالانہ نفع کا ⅓ حصہ داروں میں تقسیم کیا جاتا تھا اور ⅔ سرمایۂ انجمن العروۃ الوثقیٰ میں داخل کیا جاتا تھا۔ تین سال کے عرصے میں اس کا سرمایہ تیس ہزار روپے ہوگیا۔ لیکن سنہ ۱۳۳۶ھ کی مشہور طغیانی میں اس کی سوائے ایک چھوٹی دکان کے باقی سب گودام بہہ گئے۔ اس کے بعد اسے سنبھالنے کی کوشش کی گئی لیکن بعض ملازمین کی نااہلی وغیرہ سے یہ کاروبار بھی ختم ہوگیا۔

غرہ محرم ۱۳۱۵ھ کو ایک اور انجمن قرضۂ حسنہ امداد المسلمین کے نام سے قائم ہوئی جس کے معتمد سید محمد عبدالقادر صاحب انتظاری تھے۔ اور شرکا کو زیور کی کفالت پر قرض دیا جاتا تھا۔ اس کو بھی زیادہ دن چلنا نصیب نہ ہوا

دوسرا دور حیدرآباد میں سنہ ۱۳۲۳ف (۱۳۳۲ھ) سے ہوتا ہے جب حیدرآباد میں برطانوی ہند سے آئی ہوئی سودی انجمن ہائے امداد باہمی سرکاری طور پر قائم ہوئیں۔ قانون آصفی نشان ۱۲ بابتہ ۱۳۲۱ف کے نفاذ کے بعد جلدی ہی سنہ ۱۳۲۶ف میں دفتر معتمدی مالگزاری میں اس دفتر کے ملازمین کے لئے ایک انجمن بلاسودی قائم ہوئی۔ مولوی ابو محمد خلیل اللہ صاحب منتظم اس کے بانی تھے اور خان عبدالمجید خاں صاحب رجسٹرار انجمن ہائے امداد باہمی سرکار عالی کی توجہ سے قیام انجمن کے ایک سال بعد اسفندار ۱۳۲۶ف (۱۳۳۶ھ) میں اس انجمن کو بھی رجسٹر کرلیا گیا۔ ورنہ لیکر کے نقیر دیگر افسران محکمۂ امداد باہمی کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ بلاسودی انجمن رجسٹر بھی کی جاسکتی ہے۔ نواب سعادت جنگ مرحوم شریک معتمد مال اس انجمن کے میر مجلس بنے اور وفات تک باوجود وظیفہ یابی اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔

اس انجمن نے شرکاء سے فی حصہ ماہانہ ۸ ار مد محفوظ بھی وصول کرنا شروع کیا تاکہ اتفاقی نقصانات کی پابجائی ہوسکے۔

سنہ ۱۳۴۲ف میں ناظم صاحب انجمن ہائے امداد باہمی نے اپنی سالانہ رپورٹ سررشتہ میں لکھا تھا کہ "یہ انجمن بہترین انجمنوں میں شمار کی جارہی ہے"۔

یہ انجمن باوجود مختلف دشواریوں اور اُتار چڑھاؤ کے گزشتہ انیس سال سے اب تک
قائم ہے۔ معتمد انجمن کی مطبوعہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ختم سال ۱۳۵۱ف تک اس میں کوئی تیس ہزار
روپے سے زاید حصص میں جمع ہوئے۔ تقریباً دو ہزار روپے مد محفوظ کے طور پر موجود ہیں۔ سرکار کو
ڈیڑھ لاکھ روپے سے زاید کا قرضہ دیا گیا۔ چار ہزار پانچ سو پچہتر روپے ایک تجارتی گودام یا اعظم جاہی
گرنی کے حصص میں لگے ہوئے ہیں جس سے اب تک انجمن کو سولہ سو روپے سے زاید نفع وصول ہوا ہے۔

دفاتر سرکاری کی دوسری انجمن دفتر تعلقداری آبکاری ضلع میدک میں قائم ہوئی تھی جس کا
تاریخی نام "مجلس فیض رساں" (۱۳۳۲ھ ۱۳۲۵ف) تھا اس نے بھی کئی سال تک زور شور سے کام کیا پھر
معتمد انجمن کے تبادلہ کے باعث ختم ہوگئی۔ اس کے معتمد مولوی خلیل اللہ صاحب کے فرزند صبغۃ اللہ صاحب تھے
آبکاری سے بندوبست میں تبادلے کے بعد وہاں بھی ایک انجمن قرضہ حسنہ قائم کی جو اس وقت ممالک
محروسہ سرکار عالی کی سب سے بڑی انجمن ہے۔ اس کی تشکیل ۱۳۳۲ف (۱۳۴۱ھ) میں ہوئی اور محکمۂ نظامت بندوبست کے
دفتر کی وسعت سے بھی اس کو سہولت حاصل ہے۔ ایک اور سودی انجمن اسی دفتر میں موجود ہوتے ہوئے بھی
یہ انجمن اپنا کاروبار روز افزوں ترقی پذیر طور سے چلا رہی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ
اس وقت ماہانہ اوسطاً بارہ پندرہ ہزار روپے اس میں جمع ہوتے ہیں۔ سالانہ دو ڈھائی لاکھ سے زیادہ کا
ہیر پھیر ہوتا ہے ختم ۱۳۵۱ف تک اس کے مد حصص میں خارج شدہ شرکا کی رقم منہا کرنے کے باوجود کوئی
ایک لاکھ روپے جمع ہو چکے ہیں۔ مد محفوظ ڈھائی ہزار سے اونچا ہے اور ایک تجارتی گودام میں تین ہزار روپے
لگائے گئے ہیں۔ جس کا منافع مد محفوظ میں رکھا جاتا ہے تاکہ وفات وغیرہ کے باعث احیاناً کسی سے قرضہ
وصول نہ ہو سکتا ہو تو اس کی تلافی کی جا سکے۔ قرضہ بلاسودی اب تک پانچ لاکھ سے زاید دیا گیا ہے۔
اور اس طرح شرکا کا کچھ نہیں تو تیس ہزار روپیہ سود میں جانے سے بچا ہے۔ مزید رعایت یہ ہے کہ قرضہ
بلاسودی اور گودام تجارت پر دو سال میں کوئی بیس قلیل قسطوں میں رقم وصول کیجاتی ہے۔ اور ہر سال دو قسطیں
محرم اور رمضان کی عید یا دسہرہ میں قسطیں وصول نہیں کی جاتی ہیں۔ چونکہ سب ارکان ملازمین دفتر ہیں اسلئے
ان کی تنخواہ کی ساکھ اور ان کی معاملت کی خوبی کے بھروسے پر قرضہ دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مطبوعہ رپورٹ میں

قرضوں کی تحلیل کرکے اغراض قرضہ بھی بتائے گئے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) سودی قرضے کی ادائی (۲) تعمیر مکان (۳) شادی یا دیگر رسوم (۴) علاج (۵) تعلیم اولاد۔ (۶) زراعت (۷) اتفاقی ضرورت کیلئے مبادلہ۔

ایک دلچسپ چیز یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ خوشحال شرکا، اس انجمن سے بلا سودی قرض لے کر سودی انجمنوں میں امانت رکھاتے اور سود کھاتے ہیں۔

سرکاری دفاتر میں کروڑگیری اور جامعہ عثمانیہ میں بھی ایک، ایک انجمن قرضۂ حسنہ ہے اور دیگر متعدد محکموں میں بھی ایسی ہی انجمنیں مختصر پیمانے پر مفید کام کر رہی ہیں علاقہ صرفخاص مبارک میں محکمۂ بازارات میں بھی ایک انجمن قائم ہوئی تھی جو قائم کنندہ مہتمم کی تبدیلی پر ختم ہوگئی۔

ایک اور انجمن کا ذکر بھی یہاں کیا جاسکتا ہے جو اب ستائیس سال سے قائم ہے۔ میری مراد انجمن عزیزیہ سے ہے جو ایک خاص خاندان کے افراد ہی کے لئے مخصوص ہے۔ مولوی عبدالعظیم صاحب اس کے انتھک معتمد ہیں اور ان کی کوشش سے انہے بانی کرکے اب تک کوئی پچیس ہزار کا سرمایہ جمع ہوچکا ہے اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ اب تک قرضۂ حسنہ دیا گیا ہے۔ ایک دوسری انجمن انجمن حلیمیہ بھی مسلسل کئی سال سے کام کر رہی ہے اسی طرح انجمن اہل نوایت بھی ہے محلہ وار انجمنوں میں سلطان پورہ کی انجمن بارہ سال سے چل رہی ہے۔

صدر انجمن اسلامیہ بھی قرضۂ حسنہ کا کام کرتی رہی ہے اور اس کی شاخوں میں سے نظام آباد کا بیت المال اب کافی شہرت پاچکا ہے۔

یہ تمام انجمنیں صرف قرضہ دینے کے لئے قائم ہوئی ہیں اور کبھی کبھی ضمناً تجارت میں بھی حصہ لیتی رہی ہیں۔ ان کے فائدے سے انکار نہیں لیکن اہل ملک کی معاشی بدعادتیں کہ آمدنی سے زیادہ خرچ رکھکر اس کا تکملہ قرض سے کریں، ان کے چھڑانے کیلئے کوئی موثر کام اب تک نہیں کیا جاسکا ہے۔

کاروباری انجمنوں میں انجمن دیہی موضع کوکٹ پلی کا ذکر کرنا ضروری ہے جو ۱۳۴۵ف مطابق ۱۹۳۵ء میں قائم ہوئی یہ ایک رجسٹری شدہ انجمن ہے اور قرضۂ حسنہ کے طور پر زراعتی کاروبار کرتی ہے اور دیہات سدھار کے کام میں روز افزوں حصہ لے رہی ہے۔ باغبانی، مرغبانی، اور عام زراعت کا کام اسکی نگرانی میں

ہورہا ہے۔ گو ابھی اس کا کاروبار سینکڑوں روپے ہی میں رہے۔ ابھی ہزاروں میں نہیں آیا ہے لیکن اپنی نوعیت کا میرے علم میں یہ تا حال واحد ادارہ ہے۔

حیدرآباد کی مسلم بنک کا بھی آخر میں ذکر کیا جا سکتا ہے جو کافی بڑے پیمانے پر شروع ہوئی اور عام قرضۂ حسنہ کے ساتھ غلّے کا کاروبار بھی ہاتھ میں لیا۔ اس کا خسارہ اور سنہا لادہ معاملات ہیں جو ابھی تک زیر تسویہ ہیں۔

انجمن ہائے قرضۂ حسنہ کے اس سرسری تذکرہ سے اندازہ ہو جائیگا کہ حیدرآباد نے امداد باہمی میں ایک نیا اضافہ (ORIGINAL CONTRIBUTION) اور ایک اہم حصہ لیا ہے اور اس میں ایک خاص قسم سے ترقی دی ہے اور زراعت، تجارت، حرفت وغیرہ میں ترقی کے ساتھ ساتھ عام ضروریات کے لئے نقد قرضہ بھی بلا سودی دینے کیلئے ایک کامیاب طریقہ تیار کرلیا ہے۔ اب حیدرآباد ہی سے چل کر کم از کم مدراس میں بھی اس طرح کے کاروبار نے وسعت اختیار کرلی ہے اور ملک کو سود خواروں کے پنجوں سے ہمیشہ کے لئے چھڑانے کے لئے ایک چھوٹے پیمانے پر ہی سہی موثر کام شروع کردیا گیا ہے تین سال قبل کے موازنے میں حکومت حیدرآباد نے دو لاکھ روپئے کی رقم مجالس قرضۂ حسنہ کی امداد کے لئے رکھی ہے۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ اس سے کیا استفادہ کیا گیا لیکن ضرورت ہے کہ یہ رقم بجائے ایک بار یکمشت کے متوالی کردی جائے۔ تا آں کہ کم از کم ایک کروڑ روپئے کی رقم سرمایۂ قرضۂ حسنہ کے لئے ممالک محروسہ سرکار عالی کے لئے مہیّا ہو جائے یہ ایک ایسا کارنامہ ہوگا کہ جو تمام دُنیا کے لئے نمونہ کا کام دیگا اور اس سے پھر یہ ممکن ہو جائے گا کہ سود لینا قابل سزا جُرم قرار دیا جائے اور اس سے عوام کو کوئی دشواری نہ ہو اور جملہ سودی قرضوں کی انجمنیں برخاست کردی جائیں جیسا کہ ہر مذہب کا مطالبہ ہے۔ اور تہذیب کا مطمح نظر۔ فقط

حیدرآباد کی زرعی حیثیت

از جناب سالم بن عمر بی۔ اے

ہندوستان دنیا کے زرخیز ترین ممالک میں شمار کیا جاتا ہے اسکی زرعی پیداوار کے سبب اسے سونے کی چڑیا بھی کہتے تھے۔ مملکت حیدرآباد اسی زرخیز جزیرہ نمائے ہند میں واقع ہے ممالک محروسۂ سرکار عالی ایک نہایت ہی بلند سطح مرتفع ہے اس کے دائیں بائیں دو بڑے پہاڑوں کا سلسلہ چلا گیا ہے، ایک کو مشرقی گھاٹ کہتے ہیں اور دوسرے کو مغربی گھاٹ اسی طرح اس کے شمال و جنوب میں دو بڑے دریا بہتے ہیں ان میں سے ایک کا نام ہے گوداوری اور دوسرے کا نام ہے کرشنا۔ ان کے علاوہ اور بھی دریا اور چھوٹی بڑی ندیاں بہتی ہیں جن میں ما نجرا، ماتیر، منیر، وردھا، پورنا، بھیما، تنگبھدرا اور موسی بہت مشہور ہیں دریا اونچی نیچی اور ناہموار زمین پر آبشار بناتے ہوئے بہتے ہیں ان میں سے بعض آبشار بہت ہی خوبصورت اور بھلے معلوم ہوتے ہیں، سارے ملک میں پہاڑوں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے اس لئے اسے پتھریلا ملک بھی کہتے ہیں۔

شمالی اور جنوبی ہند کے مقابلہ میں یہاں بارش بہت کم ہوتی ہے اور جو کچھ بھی ہوتی ہے وہ زیادہ تر مغربی مان سون سے ہوتی ہے جو بحیرۂ عرب سے اٹھتی ہے اس کے راستہ میں مغربی گھاٹ پڑتے ہیں اس سے ساری بارش ساحلی علاقوں پر ہو جاتی ہے اور بچے کچے بادل یہاں برس پڑتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے بڑے اور گھنے جنگلوں کی وجہ سے پھر بھی کافی بارش ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اس سے کم یعنے ۲۸ یا ۳۰ سالانہ اوسط سے کم ہو تو پھر قحط کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ بارش کے لحاظ سے ہمارا ملک اگر بدقسمت نہیں تو خوش قسمت بھی نہیں ہے۔ اگرچہ حیدرآباد خط استوا سے بہت قریب ہے لیکن سطح مرتفع ہونے کی وجہ سے آب و ہوا میں اعتدال یعنے

یکساں رہتی ہے۔ سال میں تین موسم ہوتے ہیں اگرما سرما اور بارش مگر بعض وقت سردی یا گرمی بہت بڑھ جاتی ہے۔ ورنہ عام طور پر موسم معتدل اور خوشگوار رہتا ہے۔

قدرت نے اپنے ہاتھوں حیدرآباد کو دو حصوں میں دریائے مانجرا کے ذریعہ تقسیم کر دیا ہے۔ مانجرا کے سیدھی جانب جو علاقہ ہے وہ تلنگانہ کہلاتا ہے اور اس کے بائیں طرف جو علاقہ ہے وہ مرہٹواڑہ کہلاتا ہے تلنگانہ کی زمین لال ریتیلی اور کالی ریتیلی ہے کالی مٹی کی زمین کم ہے چونکہ ریتیلی زمین پانی چوس لیتی ہے اس لئے اس میں نمی نہیں رہتی۔ یہاں بارش مرہٹواڑی کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے اس لئے گھنے جنگل پائے جاتے ہیں پانی کی سطح بہت بلندی پر ہے تالاب زیادہ ہونے کے سبب دھان خوب پیدا ہوتا ہے۔ مرہٹواڑی میں زمین کا رنگ کالا ہے۔ اس لئے یہاں کی زمین کالی مٹی کی زمین کہلاتی ہے یہاں زمین پانی جذب نہیں کر لیتی۔ اس لئے بہت دیر تک اس میں نمی باقی رہتی ہے اگرچہ بارش کم ہوتی ہے لیکن زمین کی خاص خصوصیت کی بدولت زمین بہت زرخیز ہے کپاس جوار گیہوں باجرا شکر اور تمباکو کی کاشت اچھی ہوتی ہے۔

ممالک محروسہ سرکار عالی کی زمینات کو چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہوپیل یا کمپل زمین جس میں کالے ریتیلے ذرے ملے ہوتے ہیں اس قسم کی زمین سب سے زیادہ زرخیز ہوتی ہے اور گیہوں جوار کے لئے بہت موزوں خیال کی جاتی ہے دوسری قسم کی زمین کو ریگڑ کہتے ہیں اس کے نیچے کیچڑ جمی رہتی ہے یہ جوار اور چنے کے لئے عمدہ زمین ہے تیسری قسم کی زمین کالی چکنی مٹی کی ہوتی ہے اس کو کربی کہتے ہیں۔ یہ روئی کے لئے بہت فائدہ پہنچانے والی ثابت ہوئی ہے۔ چوتھی قسم کی زمین ریتیلی ہوتی ہے یہ عموماً دال اور نیشکر کے لئے مفید ہے سلطنت حیدرآباد میں مرہٹواڑہ میں دو فصلیں ربیع اور خریف اور تلنگانہ میں ان کے علاوہ دو فصلیں آبی اور تابی زیادہ ہوتی ہیں۔

حیدرآباد کی قابل زراعت زمینوں کے مالکوں کی تین قسمیں کی جاتی ہیں پٹہ دار شکمی دار قولدار پٹہ دار اسے کہتے ہیں جو خود اس زمین کا مالک ہو۔ یہ اس کی مرضی کی بات ہے کہ اس کو وہ خود کاشت کرے یا کسی کو قول پر دے دے شکمی دار اس شخص کو کہتے ہیں جو زمین کے اصلی مالک

یعنی پٹہ دار کے ساتھ شریک یا حصہ دار ہو اور یہ پٹہ دار کا وارث بھی ہو سکتا ہے۔ اور وہ شخص جو کسی خاص مدت مثلاً ۴-۵ سال یا ۸-۱۰ سال کے لئے معینہ رقم کے معاوضہ میں پٹہ دار سے قول پر لے کر کاشت کرے تو اندار کہلاتا ہے۔ کھیت میں ہل چلائی، کلپائی وغیرہ زیادہ تر زرعی مزدوروں کی امداد سے کی جاتی ہے۔ مرہٹواڑہ کے تقریباً تمام مزدور اندھے کر مزدوری کرتے ہیں اور نلنڈ لگانے میں ایک آنہ چھ پائی یا ایک آنہ آٹھ پائی مزدوری دی جاتی ہے۔

زراعت کے آلات نہایت ہی قدیم وضع کے ہیں یہ آلات اس قدر قدیم ہیں کہ تاریخ میں اس بات کا پتہ چلانا مشکل ہے کہ سب سے پہلے کس نے اور کب یہ ہل ایجاد کیا تھا اور اس وقت سے آج تک اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ بہرحال بعض مقاموں پر لکڑی کے ہل ہیں اور کہیں ان میں لوہے کے نوک دار حصے لگے ہوتے ہیں ان میں اتنی سکت و ہمت نہیں کہ نئی قسم کی مشین جنھیں ٹریکٹر کہتے ہیں اور دوسرے نئے ایجاد کئے ہوئے آلات استعمال کرکے پیداوار میں خاطرخواہ اضافہ کرسکیں بعض مالدار لوگوں نے کہیں کہیں ان کا استعمال بھی کیا لیکن انکے وزنی ہونے اور ملک میں سستی مزدوری پر انجنیروں کے نہ ہوسکنے کے سبب یہ غیر مفید بھی ثابت ہوچکے ہیں۔ تاہم حکومت کی جانب سے زرعی نمائش مقرر کی جاکر آن میں ان کے استعمال کرنے کے طریقے اور ان کے عملی فوائد بتلائے جاتے ہیں۔

جو بیج انھیں میسر آجائے بو دیا جاتا ہے عمدہ اور اچھی قسم کے بیج حاصل کرکے بونے کی زحمت گوارا نہیں۔ گاؤں کے ساہوکار سے قرضہ پر حاصل کئے ہوئے گھٹیا درجہ کے بیج بونے سے فصل بھی خراب اور ادنیٰ درجہ کی حاصل ہوتی ہے۔ کھاد کے استعمال اور اس کے فائدوں سے تو تقریباً ۷۵ فی صد کسان بالکل ناواقف ہیں اور جو واقف بھی ہیں تو آج کے انڈے کو کل کی مرغی پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جنگل قریب نہیں ہوتے یا لکڑی کے خریدنے کے لئے روپیہ ادا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے وہ موقتی فائدہ کی جانب زیادہ توجہ کرتے ہیں اور مویشیوں کے فضلہ جیسی قیمتی چیز سے ایندھن کا کام لیتے ہیں اور اس بڑے فائدہ کا بالکل خیال نہیں رکھتے جو کھاد کے استعمال سے ہوتا ہے

مرہٹواڑہ کے مویشی ایک حد تک تنومند اور قوی جثہ ہوتے ہیں لیکن اس کے برخلاف تلنگانے کے مویشی نہایت پست قد اور لاغر ہوتے ہیں۔ مویشیوں کے امراض عموماً گاؤں والوں کے سادے سیدھے علاج معالجہ سے دور ہوجاتے ہیں پھر بھی دورہ کرکے علاج کرنے اور جانوروں کی صحت کے متعلق مفت مشورہ دینے والے سرکاری ڈاکٹر مقرر ہیں جو وقتاً فوقتاً امراض کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں مختلف ضلعوں اور تعلقوں پر ان کے مفت علاج کے لئے سرکاری دواخانوں کی اسکیم تیزی کے ساتھ ترقی کے مدارج طے کررہی ہے۔ مویشیوں کی عمدہ نسلیں حاصل کرکے کاشتکاروں کو قرضہ پر دینے کی اسکیم نے بھی کاشتکاروں کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے۔ اور امید ہے کہ کسان اس چیز کا ایسے ہی خیر مقدم کریں تو نہ صرف ان کی فصل اچھی ہوجائے گی بلکہ ان کی خوشحالی سے ملک کی خوش حالی میں بھی کافی اضافہ ہوجائیگا

تلنگانہ میں بارش بھی خوب ہوتی ہے اور پھر زمین رتیلی ہونے سے باولیاں بھی بہت زیادہ ہیں اور چونکہ زمین ناہموار ہے اس لئے ندی نالوں پر کٹے باندھ کر تالاب بنانے میں آسانی ہے یہی وجہ ہے تالابوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے ان سے نہریں نکل رہی ہیں۔ ملک کی زراعت کو فائدہ پہنچ رہا ہے اور ملک کی دولت بڑھ رہی ہے۔ مرہٹواری کی زمین میں پانی جذب کرنے کی خاصیت ہے بارش بھی ناکافی ہوتی ہے تالاب بنانے کے امکانات بہت کم ہیں اس لئے زیادہ تر باولیوں کے تحت کاشت ہوتی ہے۔ ریاست حیدرآباد کے کل چھوٹے بڑے تالابوں کی تعداد انیتس لاکھ دوہزار تین سو اڑتیس ہے جن میں بڑے بڑے تالاب نظام ساگر عثمان ساگر حمایت ساگر، پالیر، ویرا علی ساگر، رامپا، پاکھال لکھنا رم حسین ساگر، پوچارم وغیرہ ہیں سب سے بڑا تالاب نظام ساگر ہے جو دریائے مانجرا کو روک کر چار کروڑ، ۲ لاکھ روپیہ کے صرفہ سے بنایا گیا ہے۔ اس سے کئی ہزار ایکڑ زمین سیراب ہوتی ہے۔ ایک اور تالاب دریائے تنگبھدرا کو روک کر رائچور میں بنانے کا خیال ہے اس اسکیم کے سارے مدارج تیزی کے ساتھ ترقی کررہے ہیں۔ اسی طرح ایک دوسرا بڑا تالاب دریائے مانجرا ہی کو روک کر حسن آباد کے مقام پر نظام ساگر سے بھی بڑا بنانے کی اسکیم ہے۔ حیدرآباد میں نہ صرف تالابوں سے آبپاشی ہوتی ہے بلکہ تالابوں کے علاوہ نہروں سے بھی ابپاشی کی جاتی ہے۔ نہریں یا تو

دریاؤں سے یا خود تالابوں سے کاٹ کر نکالی جاتی ہیں۔ ان میں نہر نظام ساگر خاص طور پر قابل ذکر ہے اسکا طول ساڑھے بہتر میل ہے اور سب سے بڑی نہر ہے۔ اس نہر سے پونے تین لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہوتی ہے اس کے علاوہ اور بھی نہریں مثلاً محبوب نہر، فتح نہر، آصف نہر، گنگا وتی نہر، اور بیچل نہر، وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

بہر حال ان تمام سہولتوں کے باوجود مرہٹواڑہ میں زیادہ تر خشکی کی کاشت ہوتی ہے، اور سلطنت حیدرآباد میں آبپاشی کا انتظام بھی مبارک دور عثمانی میں بہتر ہو گیا ہے لیکن پھر بھی اگر بعض مقامات پر کسی سال بارش نہ ہو تو خشک سالی اور قحط لازمی نتیجہ ہے۔ محصول مالگزاری کا تعین تلنگانہ مرہٹواڑہ اور کرناٹک میں مختلف شرح پر کیا جاتا ہے۔ تلنگانہ میں خشکی کی زمینوں پر پندرہ آنہ تین پائی فی ایکر تری کی زمینوں پر بارہ روپیہ بارہ آنہ چار پائی فی ایکر اور باغات کا محصول مالگزاری چھ روپیہ سات آنہ گیارہ پائی فی ایکر ہے۔ مرہٹواڑہ میں خشکی کی زمینوں پر ایک روپیہ دو آنہ آٹھ پائی فی ایکر اور تری کی زمینوں پر چار روپیہ نو آنے فی ایکر ہے۔

کرناٹک میں خشکی کی زمینوں پر ایک روپیہ نو پائی فی ایکڑ تری کی زمینوں پر آٹھ روپیہ پندرہ آنہ دس پائی فی ایکر اور باغات کا محصول مالگزاری چار روپیہ چار آنہ سات پائی فی ایکر ہے۔ ہماری رحمدل سرکار میں یہ طریقہ ہے کہ اگر کبھی فصل خراب ہو جائے تو محصول میں کمی کی جاتی یا معافی دی جاتی ہے۔ چنانچہ اعلیحضرت بندگان عالی متعالی کی سلور جوبلی مبارک کے موقع پر دو سال کے محصول میں جو بقایا تھا۔ بحساب ۲ر فی روپیہ کمی کر دی گئی۔ کئی مقامات پر معافیاں بھی دی گئیں اور اس طرح جملہ معافیوں کی مقدار جو اس سال عطا کی گئیں چالیس لاکھ کی خطیر رقم تک پہنچتی ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت بندگان عالی کی کسانوں پر شفقت اور مہربانی کا اندازہ اس ارشاد ہمایونی سے ہو سکتا ہے جو سلور جوبلی مبارک کے دن باشندگان و خیر طلبان سلطنت آصفیہ کے نام لطف فرمایا گیا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر ارشاد فرمایا گیا تھا کہ مد مزارعین کے سود بہبود اور ان کے مشکلات کا مجھے پورا احساس ہے۔ اس طبقہ کے معاشی اور معاشرتی ترقی کا میری گورنمنٹ اور مجھے خاص طور پر خیال اور اس طبقہ سے مجھے گہری دلچسپی ہے

اس تقریب کے موقع پر جملہ بقایا مالگزاری و تقاوی قحط چالیس لاکھ روپیہ کی حد تک اور ۱۳۴۲ ف کے ختم تک یا ستثنار بقایا پیشکش و تقاوی مال و متفرقات و بعض مدات بقایا کے وجوہاتی کی معافی کا اعلان کرتا ہوں"

حیدرآباد کی زرعی زمینوں اور زراعت کے تمام حالات پر اس قدر تفصیل سے بحث کرنے کے بعد اب ہم ممالک محروسہ سرکار عالی کی زرعی پیداوار کی جانب متوجہ ہوتے ہیں یوں تو ہماری ریاست ابد مدت میں ہر قسم کی پیداوار ہوتی ہے لیکن چاول گیہوں، مکئی، روئی، جوار، نے شکر، تمباکو، سن وغیرہ کے علاوہ ہر قسم کی دالیں، تیل نکالنے کے بیج وغیرہ کی بھی یہاں کاشت ہوتی ہے۔

چند خاص چیزوں کی کاشت کے لئے جو رقبے ہماری سلطنت میں زیر کاشت ہیں ان کے اعداد پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں سب سے زیادہ جوار کی کاشت ہوتی ہے۔ اس کے بعد روئی، چاول، گیہوں، اور نے شکر کا نمبر آتا ہے لیکن نظام ساگر کی تعمیر اور نظام شوگر فیکٹری کے قیام کے بعد سے نے شکر کی کاشت کے رقبہ میں بہت زیادہ ترقی کی توقع کی جاتی ہے۔ تعلقہ بودھن ضلع نظام آباد کے اس شکر کے کارخانہ کے قیام سے یقیناً ملک میں نے شکر کی کاشت بہت زیادہ پھیل جائے گی اور امید ہے کہ کسانوں کی حالت بھی بہت کچھ سنبھل جائے گی۔

ماکولات میں سے تو ہمارے یہاں کی پیداوار میں چاول گیہوں، نے شکر، جو، باجرا، چنا، مکئی، جوار، پھل اور ترکاری، ادرک، لہسن، ہلدی، پیاز، گنگنی، السی وغیرہ شامل ہیں، ان کے علاوہ میووں میں عالم پور کے خربوزے اور تربوز جالنہ کے سنگترے، گلبرگہ کے موز، بھونگیر کے سوہن موز، چھاونی کے انجیر بلدہ حیدرآباد کے آم، اورنگ آباد کے بیر و امرود خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ استعمال کی دوسری چیزوں میں روئی، سن، تمباکو اور تیل نکالنے کے بیج شامل ہیں۔ روئی کی کاشت مرہٹواڑہ میں خوب ہوتی ہے اور ہمارے ملک میں سوتی کپڑا بننے کے کئی کارخانے ناندیڑ اورنگ آباد، گلبرگہ اور ورنگل میں قائم ہیں اگر ملکی بنے ہوئے کپڑے کی قدر کی جائے تو پھر روئی کے کھیتوں پر کام کرنے والے ہنستے بولتے نظر آسکتے ہیں۔

سن زیادہ تر آمد ہوتا ہے تمباکو کا بھی بہت سا حصہ باہر بھیجا جاتا ہے اور جو باقی بچ رہتا ہے وہ بیڑی کے کارخانوں یا سگریٹ فیکٹریوں کو چلا جاتا ہے لیکن ہماری سگریٹ فیکٹریاں اس تمباکو کو بہت کم خریدتی ہیں۔ تیل نکال لینے کے بیجوں میں تل، کسم، ارنڈ، السی، مونگ پھلی اور کرڑ شامل ہیں۔ ان میں ارنڈ اور مونگ پھلی تقریباً اسی فیصد باہر جاتی ہے اس کو سر کے تیل، صابون، وغیرہ بنانے کی صنعتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں کے کسان اپنی پیداوار کی فروخت کے لئے کوئی باقاعدہ تنظیم یا ادارے نہیں رکھتے اس لئے اڑھتیوں پر بیوپار ہوا کرتا ہے اور اڑھتے دار کمیشن لے کر مال اپنے پاس رکھتے اور کمیشن کے معاوضہ میں کسانوں کا مال فروخت کروا دیتے ہیں اس سے کسان بہت گھاٹے میں رہتے ہیں۔ حال ہی میں ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جو بازاری کمیٹی کے نام سے اناج تلنے اور تولنے کے رتی اور باٹ پر نگرانی کرتی ہے اڑھتے داروں کے لئے لائسنس مقرر کیا گیا ہے اور یہ کمیٹی اس کی تنقیح کرتی ہے۔ لیکن پھر بھی فروخت پیداوار کے خاطر خواہ انتظامات خود کسانوں کی طرف سے نہ ہونے کے سبب کسانوں کو قریب کی اڑھتیوں پر مال لیجانا پڑتا ہے اگرچہ فصل کے وقت قیمت گرجاتی ہے لیکن چونکہ کسانوں کو رقم کی ضرورت بھی ہوتی ہے اس لئے وہ اسی گری ہوئی قیمت پر مال نکال دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور پھر اڑھتے دار بھی ایک دن سے زیادہ اپنے پاس مال نہیں رکھتے۔

ہمارے ملک کے زرعی حالت کو ترقی دینے کے لئے محکمۂ زراعت قائم ہے جو کسانوں کی صلاح و فلاح میں منہمک ہے۔ اس محکمہ کی جانب سے زرعی نمائشیں ترتیب دیجاتی ہیں۔ جن میں اچھے بیج، کھاد، نئے آلات زراعت اور نئے اصولوں سے کاشت کرنے کے طریقے اور ان کے فائدے مظاہروں اور میجک لانٹرن وغیرہ کے ذریعہ بتلائے جاتے ہیں۔ ظاہری طور پر اس وقت تک اس محکمہ کی کوششیں پوری طرح سے کامیاب نہیں ہوئیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اتنی تھوڑی سی مدت میں محکمہ کی تنظیم کامیاب زرعی نمائشوں کا انعقاد مزرعوں کا قیام وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو اس کام کی کامیابی کا یقین دلاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کا سب سے بڑا مزرعہ حمایت ساگر کے قریب

واقع ہے جہاں چاول، ارنڈی کی کاشت کے آسان اور اچھے طریقے، مرغبانی، دباغبانی کے اُصول اور کیمیائی کھاد کے استعمال کے فائدوں کی نمائش کی جاتی ہے۔ مزرعہ حمایت ساگر کی طرح سنگاریڈی اور ورنگل، پربھنی، لاتور، رائچور اور پٹن چیرو میں مزرعے قائم ہیں جہاں انہیں چیزوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ عملی تحقیق اور اجناس وغیرہ کی مختلف طریقوں سے حاصل کردہ فصلوں کا مقابلہ کیا جاکر زراعت کے مختلف اُصولوں کا تعین کیا جارہا ہے زراعت کی عملی تعلیم مشین کے استعمال کا عملی طریقہ بھی سکھایا جارہا ہے چنانچہ رُدرور پربھنی اور حمایت ساگر کے مزرعہ میں اس قسم کی تعلیم ہوتی ہے۔ پیداوار کے فروخت کرنے کی انجمنیں قائم کیجارہی ہیں۔ ابتک رائچور، اورنگ آباد، ناندیڑ، بیڑ اور پربھنی کے اضلاع وغیرہ میں ایسی انجمنوں کا انعقاد عمل میں آچکا ہے۔

کسانوں کی امداد کیلئے امداد باہمی کی انجمنوں کے قیام کیلئے محکمہ انجمن ہائے امداد باہمی قائم اور کوشاں ہے ہر سال امداد باہمی کے اس محکمہ کی جانب سے امتحانات مقرر ہوتے ہیں اور کامیاب شدہ لوگوں کو محکمہ میں جائدادیں دیجاتی ہیں۔ امتحان میں عملی اور نظری دونوں طریقوں کا امتحان لیا جاتا ہے۔ اس سے رفتہ رفتہ کسانوں کے خاطر خواہ فائدہ کے امکانات کا صاف اظہار ہوتا ہے۔ حکومت سے سالانہ پندرہ ہزار کی رقم اس انجمن کی تحریک کو عام کرنے اور اس کے فائدوں کی تشہیر کیلئے حکومت کی جانب سے عطا کی جاتی ہے۔

ہماری حکومت کو دیہی تنظیم کا خاص طور پر لحاظ ہے ہر ضلع میں دیہی تنظیم کیلئے ایک کونسل مقرر کیگئی ہے جسکے صدر تعلقدار ہوتے ہیں اور سول سرجن، مہتمم پولیس، دوم تعلقدار، ناظم زراعت، مہتمم تعلیمات، اور انجمن امداد باہمی کے اراکین ہوتے ہیں۔ ان کے ذمہ اس بات کی نگرانی ہوتی ہے کہ گاؤں کی آبادی ایک ہزار سے بڑھنے نہ پائے۔ ہر گاؤں میں ایک مدرسہ ہو جس میں اچھے تعلیم پائے ہوئے استاد تعلیم دیتے ہوں۔ پٹن چیرو کو دیہی تنظیم اور ترقی کا مرکز قرار دیا گیا ہے۔ تقریروں کے ذریعہ پروپگنڈا کیا جاتا ہے۔ یہاں دو نائٹ اسکول بھی قائم ہیں۔

کسانوں کی حالت کو بہتر بنانے کیلئے قانون قرضہ دہندگان اور قانون انتقال اراضی نافذ کئے گئے ہیں ان قوانین کے فائدوں سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ رضاکارانہ طور پر اس بات کا ارادہ کرلیں کہ وہ ملک کے کم سمجھ اور جاہل کسانوں کے کانوں تک فائدوں کو پہنچا دیں تاکہ وہ ان کی امداد سے اپنی ساری مصیبتوں کو دور کردیں۔ اور اطمینان کا سانس لینے لگیں۔

سچ بات تو یہ ہے کہ ہماری مہربان حکومت اور ہم سب ہی چاہتے ہیں کہ کسانوں کے یہ جھریاں پڑے ہوئے زرد چہرے پھر تر و تازہ ہشاش بشاش نظر آنے لگیں ہر ایک گاؤں کے مسکراتے ہوئے دل خوش کن اور حسین مناظر دیکھنے کا خواہشمند ہے لیکن ان خوشنما خوابوں کی تعبیر اسی میں ہے کہ ہمی خواہان ملک رضاکارانہ خدمت کے لئے اپنی کمر ہمت چست کرلیں۔

حقیقی معنی میں زراعت پیشہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ زراعت انکی آبائی ہوتی ہے۔ انکی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ کلیتہً زراعت ہی پر گذربسر کرتے ہیں نتیجہ یہ کہ انکی تمام تر توجہ زراعت ہی کی طرف رہتی ہے۔ انکی اراضی گو منتشر سہی لیکن کافی وسیع ہوتی ہے۔ اس قدر وسیع کہ جسکے ذریعہ وہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کی پرورش دیہاتی نکتہ نظر سے ایک اچھے معیار پر کرسکتے ہیں۔ ان کے مویشی عمدہ ہوتے ہیں۔ زراعت سے متعلق اقدام معلومات میں یہ لوگ یکتا ہوتے ہیں۔ کھیت کو بروقت اور نسبتاً بہتر طریق پر جوتتے۔ بوتے۔ کلچاتے۔ سینچتے۔ نکالتے اور کاٹتے ہیں۔ چونکہ انکے ہاں جانور زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں لہذا کھاد بھی کافی مقدار میں دستیاب ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ دیگر کاشتکاروں کے مقابل ان کی پیداوار فی ایکر زیادہ ہوتی ہے۔

ہندوستان میں عام طور پر دو خیالات کے لوگ پائے جاتے ہیں ایک وہ جو ہندوستانی کسان کی تعریف کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہمارے کسان نہایت محنتی جفاکش اور اپنے فن کی حد تک یکتا ہوتے ہیں جب وہ یہ کہتے ہیں تو ان کے پیش نظر اس قسم کے کسان ہوتے ہیں جنکو ہم نے کنبی کے نام سے موسوم کیا ہے[1]۔ برعکس اسکے ایک دوسری جماعت ایسے افراد کی ہے جو ہندوستانی کسانوں پر بری طرح تنقید کرتی ہے۔ اور پیشہ سے متعلق تمام نقصانات کا ذمہ دار کسانوں ہی کو قرار دیتی ہے۔ اس کے پیش نظر دوسری قسم کے

---

[1] کنبی واقعتاً قابل تعریف ہیں کیونکہ وہ اپنی محنت جفاکشی اور ہوشیاری سے نہ صرف اس قدر کماتے ہیں کہ اوس سے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی پرورش کرسکیں۔ بلکہ اپنی کفایت شعاری کی بدولت تھوڑے بہت سرمایہ کے مالک بھی ہوتے ہیں۔ موضع ہذا میں بہت کم کنبی مقروض نظر آتے ہیں۔ برعکس اسکے ان کی اکثریت قرض لینے کی بجائے ایک محدود پیمانہ پر قرض دہی کا کاروبار بھی کرتی ہے۔ کنبی جو مالی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے دیگر دیہاتیوں کے مقابل بہتر نظر آتے ہیں اسکی اہم وجہ یہ ہے کہ ان کی اراضیات بالعموم معاشی ہوتی ہیں ان کے بیل عمدہ اور طریقہ ہائے کاشت (گو قدیم سہی) نسبتاً اچھے ہوتے ہیں۔ فروخت کی حد تک ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کٹائی کے بعد پیداوار کو محفوظ کردیتے ہیں۔ اور اس وقت فروخت کرتے ہیں جبکہ اجناس کا نرخ گراں ہو۔ اس ترکیب کی وجہ سے اونہیں اجناس کی قیمت اچھی ملتی ہے۔ اور وہ نسبتاً اچھی زندگی گذارتے ہیں۔

کاشت کار ہوتے ہیں۔ ان کاشت کاروں کی حالت تقریباً ایسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ بیان کی جاتی ہے۔

آبادی کے بیان میں ہم معلوم کرائے ہیں کہ ۹ء ۱۹ فیصد خاندان ایسے ہیں جنکا اصل پیشہ تو کچھ اور ہے لیکن جز وقتی طور پر زراعت کرتے ہیں۔ دھوبی حجام۔ بڑوڑ۔ جلاہے۔ درزی۔ بڑھئی۔ لوہار سنار وغیرہ کو (جو اپنے آبائی پیشے کے ساتھ زراعت کرتے ہیں) مذکورہ طبقہ میں شامل کیا گیا ہے۔ ان افراد کے ہاں اراضیات بالعموم بہت مختصر ہوتی ہیں ان مختصر اراضیات پر کاشت کرنے کیلئے بیل خریدے جاتے ہیں جنکو خاطرخواہ طور پر مصروف نہیں رکھا جاسکتا۔ مزید براں ان کے ہاں کھاد کی بہت قلت ہوتی ہے اسلئے کہ ان کے پاس مویشی بہت محدود تعداد میں ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ لوگ اپنی دیگر مصروفیات کی وجہ سے زراعت کی طرف خاطرخواہ طور پر توجہ نہیں کرسکتے نتیجہ یہ کہ کنبیوں کے مقابل پیداوار فی بیگہ کم ہوتی ہے۔ دیہات کے ایسے افراد جو مفلس ہیں اخراجات کاشت میں کفایت کی خاطر ضروری کلچائی نہیں کرتے اپنی دانست میں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چار مرتبہ کلچائی کرنے کی بجائے ایک مرتبہ کلچا کر کفایت کررہے ہیں لیکن اس کفایت کا مخالف اثر پیداوار پر پڑتا ہے۔ کیونکہ جنگلی اور غیر ضروری پودوں کو اسطرح چھوڑ دینے کی وجہ سے وہ فصل کیلئے ایک طرف تو ہوا۔ روشنی اور دھوپ کو کم کردیتے ہیں تو دوسری طرف کھاد کا بڑا حصہ بھی کھالیتے ہیں لہذا پیداوار کم ہوتی ہے۔ اکثر کسان ناقص کلچائی کی وجہ سے بہت کچھ نقصان اٹھاتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی موضع ہذا میں طریقہ ہائے کاشت کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ جتائی۔ بوائی کھاد ڈلوائی۔ سینچائی۔ نکائی۔ کلچائی۔ نگرانی اور کٹائی جیسے اہم کاموں کو بہت کم کسان مناسب اور موزوں طریق پر انجام دیتے ہیں۔ دیر سے جوتنے دیر سے بونے اور دیر سے کاٹنے کا مرض عام ہے دیہات کے ہوشیار کسان ان باتوں سے ہر وقت احترا نہ کرتے ہیں۔

دھان کی حد تک نار لگائی (ٹرانجس پلانٹیشن) کا طریق بہت مفید ہے۔ اس طریق کے تحت ایک کیاری میں دھان بو دیئے جاتے ہیں۔ ۱۵۔ ۲۰ دن بعد پودوں کو اکھاڑ کر کھیت میں لگایا جاتا ہے

اس طرح کاشت کرنے سے پیداوار فی یکر بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن بہت کم کسان اس طریقہ پر عمل کرتے ہیں
موضع زیر بحث میں دھان عام طور پر چھڑک کر بوئے جاتے ہیں۔

جہاں تک کہ کھاد کا تعلق ہے اس کی قلت بہت زیادہ ہے۔ دھان۔ گنے۔ مرچ۔ اور تمباکو کے سوائے دیگر اجناس کو کسی قسم کی کھاد نہیں دیجاتی۔ مذکورہ اجناس میں بھی دھان گنے اور مرچ کو زیادہ کھاد دیجاتی ہے۔ واضح رہے کہ سب کسانوں کو کھاد یکساں طور پر دستیاب نہیں ہوتی۔ صرف چند کسانوں کو کافی مقدار میں کھاد ملتی ہے۔ دیر سے جوتنے۔ دیر سے بونے اور دیر سے کاٹنے ضروری کلچائی نہ کرنے اور مناسب کھاد نہ دینے کی وجہ سے پیداوار بہت ادنیٰ ہوتی ہے۔

۲۔ زرعی پیداوار ذیل میں ۲ کاشت کاروں کی پیداوار فی یکر کے تقابلی اعداد دیئے گئے ہیں
کاشت کار نمبر ا سے ہماری مراد ایسا کاشت کار ہے جسکے طریقہ ہائے کاشت نسبتاً بہتر ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ بروقت جوتتا۔ بوتا۔ سینچتا۔ ضروری کھاد دیتا۔ کلچاتا۔ نکاتا۔ نگرانی کرتا اور بروقت کاٹتا ہے۔ کاشت کار نمبر ۲ سے ایسا کاشت کار مراد ہے جسکے طریقہ ہائے کاشت میں توازن نہیں۔

نام جنس	کاشت کار نمبر ۲ اور پیداوار فی یکر	کاشت کار نمبر ا اور پیداوار فی یکر
دھان	۱۰ تا ۱۵ من	۱۵ تا ۲۰ من
جوار	۲ تا ڈھائی من	ڈھائی تا ساڑھے تین من

مندرجۂ بالا اعداد سے واضح ہے کہ کاشت کار نمبر ا کے مقابل کاشت کار نمبر ۲ کی پیداوار فی یکر (خواہ جوار ہو یا دھان) کم ہے جسکی اہم وجہ ہر دو کے طریقہ ہائے کاشت ہیں۔ اگر دیگر کاشت کار بھی کنبیوں کے سے طریقے اختیار کریں تو دھان اور جوار کی فی یکر پیداوار میں علی الترتیب ۵ من اور ایک من اضافے کی گنجائش ہے۔

بلحاظ پونڈ فی یکر چاولوں کی پیداوار کم سے کم ۸۰۰ اور زیادہ سے زیادہ ۱۷۰۴ پونڈ ہوسکتی ہے۔ اوسط پیداوار فی یکر بھی ۸۰۰ پونڈ ہے جب ہم ان اعداد کا مقابلہ دیگر مقامات کی

پیداوار سے کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اوسط سب سے کم ہے ۔ ذیل کے اعداد ملاحظہ ہوں

نشان	نام مقام	اوسط پیداوار چاول فی ایکر پونڈوں میں
۱	ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۱۰۹۰
۲	اٹلی	۲۱۵۱
۳	مصر	۱۴۵۶
۴	جاپان	۲۴۷۷
۵	ہندوستان[۱۵]	۹۱۱
۶	دوپلّی	۸۷۰

واضح رہے کہ دھان اور جوار موضع ہٰذا کی اہم پیداواریں ہیں ۔ سب سے زیادہ اہمیت دھان کو حاصل ہے ۔ دھان کے بعد جوار کا درجہ ہے ۔ ۱۳۴۷ف ام اکتوبر ۳۸ ۔ ۱۹۳۷ء میں جو رقبہ مختلف فصول کے تحت کاشت کیا گیا وہ حسب ذیل ہے ۔ ان اعداد سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مختلف فصلوں (یعنی خریف ۔ آبی ۔ ربیع ۔ تابی) میں کس قسم کی اجناس کاشت کی گئیں ۔ کن اجناس کو زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔

تفصیل فصل	نام جنس	رقبہ ایکر	رقبہ گنٹہ
	تمباکو	۱۱	۹
خریف	آسمانی دھان	۸	۲۷
	مونگ	۲	۱۳
	اڑد	۳	۱۵
	گھاس	۱۸	۲۱

---

۱۵ ۔ جتھار اینڈ بری ۔ جلد اول صفحہ ۱۹۲ ایڈیشن ۱۹۳۳ء

خریف	مکئی	۳	۳۴
	کودرو	۷	۱
	متفرق	۱۱	۳
آبی	آسمانی دھان	۴	۱۴
	گھاس	۸	۱
	تمباکو	۱	۵
	مونگ پھلی	۴	۳۳
	دھان	۵.۲	۳۸
ربیع	مرچ	۷	-
	ارنڈی	۲	۳۰
	جوار	۳۰.۳	۳۸
	کپاس	۲۵	۱۰
تابی	دھان	۲۹۷	۲
	نیشکر	۹	۲۶

ان اعداد سے ظاہر ہے کہ موضع زیر بحث میں چاروں فصول میں برابر کاشت ہوتی ہے۔ ان ہی اعداد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمباکو۔ آسمانی دھان۔ مونگ۔ اڑد۔ مکئی۔ کودرو۔ مونگ پھلی۔ ارنڈی۔ کپاس۔ مرچ۔ دھان اور جوار یہاں کی عام اجناس ہیں۔ دھان اور جوار کے علاوہ باقی تمام اجناس کا رقبہ کاشت محدود ہے۔ دھان اور جوار کی اس اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے ضرورت اس امر کی ہے کہ دیگر اجناس کے مقابل سب سے زیادہ توجہ انہی کی طرف کیجانی چاہیئے۔

۳۔ فروخت پیداوار یہاں تک تو ہم نے طریقہ ہائے کاشت اور زرعی پیداوار کی تشریح کی لیکن اب ہم اپنی توجہ فروخت پیداوار کی طرف مبذول کرینگے۔

مزارعین کی آمدنی میں تخفیف ایک طرف تو ادنیٰ پیداوار (جو گوناگوں حالات کا نتیجہ ہوتی ہے) کی وجہ سے ہوتی ہے اور دوسری طرف ناقص طریقہ ہائے فروخت کی بہ دولت بھی قابلِ لحاظ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

جیسا کہ ہم پیچھے بتا چکے ہیں موضع زیرِ بحث کی سب سے اہم پیداوار دھان ہے ذیل میں ہم دھانوں کی فروخت کے مختلف طریقوں کی تشریح کرتے ہوئے یہ معلوم کرینگے کہ کسانوں کے لئے کونسا طریقہ مفید ہے لیکن عام طور پر کس طریق کے تحت دھان فروخت کئے جاتے ہیں۔

دھان کی فروخت کا پہلا طریقہ ـــــ دھان کی فروخت کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ اس کو چاول کی شکل میں تبدیل کرکے نظام آباد کی مارکیٹ میں فروخت کیا جاتا ہے۔ بنظر سہولت ہم یہ فرض کرلینگے کہ ایک کھنڈی (۲۰ من) دھانوں کی فروخت عمل میں آرہی ہے۔ موجودہ حالات کے تحت ایک کھنڈی دھان کو چاول کی شکل میں تبدیل کرنے اور نظام آباد کی مارکٹ میں فروخت کرنے کیلئے حسب ذیل اخراجات لاحق ہوتے ہیں۔

(الف) صرفہ حمل و نقل از دیہات تا گرنی

	روپیہ	آنے	پائی
۱۔ کرایہ حمل و نقل	۳	۔	۔
۲۔ چیٹھی راہ داری بحساب فی بنڈی ایک آنہ	۔	۲	۔
جملہ	۳	۲	۔

(ب) صرفہ جو گرنی میں دھانوں کو چاول کی شکل میں تبدیل کرنیکی وجہ سے لاحق ہوتا ہے۔

	روپیہ	آنے	پائی
۱۔ دھانوں کو چاول کی شکل میں تبدیل کرنے کی اُجرت	۴	۱۱	۔
۲۔ اُجرت حمالی	۔	۴	۶
۳۔ دھرم داوٗ	۔	۱	۶
۴۔ بالاجی	۔	۱	۶
جملہ	۵	۲	۶

(ج) صرفہ جو چاولوں کو گرنی میں فروخت کرنے کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے۔

	روپیہ	آنے	پائی
۱۔ کرایہ منڈی از گرنی تا گنج۔	۰	۴	۲
۲۔ لوکلفنڈ	۰	۱	۰
۳۔ اڑتی بحساب فیصد ایک روپیہ آٹھ آنے	۱	۵	۶
۴۔ دھرم داؤ	۰	۰	۹
۵۔ بالاجی	۰	۰	۹
۶۔ اُجرت باردار (تولنے والا)	۰	۶	۰
۷۔ صرفہ سُتلی	۰	۱	۶
۸۔ اُجرت حمالی	۰	۱	۶
جملہ........................	۲	۵	۶

اس طرح ایک کھنڈی کو چاولوں کی شکل میں تبدیل کرکے فروخت کرنے کے جملہ اخراجات ۱۰ روپیہ ۱۰ آنے ہوتے ہیں۔ ایک کھنڈی دھان میں سواسات پلّے چاول نکلتے ہیں۔ بازاری نرخ کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی قیمت ۸۶ روپیہ ہوتی ہے۔ ۸۶ روپیہ میں سے جملہ اخراجات فروخت منہا کرنے کے بعد کسان کو ۷۵ روپیہ ۶ آنے ملتے ہیں۔

دھان کی فروخت کا دوسرا طریقہ ـــــ دھان کی فروخت کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مختلف مقامات کے تاجر دیہات آتے ہیں اور مقامی طور پر دھان خریدتے ہیں۔ دھان کی خریدی عام طور پر ۷۰ یا زیادہ سے زیادہ ۷۲ روپیہ کھنڈی کے حساب سے ہوا کرتی ہے۔ تاجر کثیر مقدار میں دھان خرید کر گرنی میں محفوظ کروادیتے ہیں۔ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ چاولوں کا نرخ بڑھ گیا ہے تو فوراً دھان کو چاولوں کی شکل میں تبدیل کرکے فروخت کردیتے ہیں۔ اس ترکیب کی وجہ سے انہیں فی کھنڈی ۷۵ روپیہ ۶ آنے سے بھی زائد قیمت ملتی ہے جسکی اہم وجہ تاجروں کی معاملہ فہمی ہے۔

دھانوں کی فروخت کا تیسرا طریقہ ـــــ دھانوں کی فروخت کا تیسرا طریقہ لاوانی کا ہے۔

کسان ابتدائے کاشت کے وقت ساہوکار سے قرض حاصل کرتا ہے۔ اور اس سے وعدہ کرتا ہے کہ کٹائی فصل کے بعد اصل و سود کی ادائی بشکل زر کرنے کی بجائے ایک مقررہ نرخ سے (جو بازاری نرخ سے کم ہوتا ہے) اسقدر غلہ فروخت کریگا کہ حساب بے باق ہو جائے۔ بعض ساہوکار ۵۰ فیصد تخفیف کے ساتھ خریدتے ہیں مثلاً یہ کہ اگر ایک ساہوکار ابتدائے فصل پر کسان کو ۳۵ روپیہ قرض دے تو وہ اس سے وعدہ لیتا ہے کہ اختتام فصل پر ایک کھنڈی دھان دے۔ اس وقت ایک کھنڈی دھان کا بازاری نرخ ۷۰ روپیہ ہوتا ہے گویا آسامی کو ساہوکار کے ہاتھ مال فروخت کرنے کی وجہ سے ۳۵ روپیہ کا نقصان ہو رہا ہے۔ (ساہوکار نہ صرف کم قیمت پر مال خریدتے ہیں بلکہ نپائی کے وقت سرکاری ناپ کے مقابل نسبتاً بڑا ناپ استعمال کرتے ہیں۔ مزید برآں انکے ناپنے کا طریقہ کچھ اس طور کا ہوتا ہے کہ اسکی بدولت زیادہ دھان نپ جاتے ہیں اگر ان امور کا پورا پورا لحاظ کیا جائے تو کسان کا نقصان ۳۵ روپیوں سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔

لیکن اس نقصان کو نقصان خام کہنا چاہیئے۔ اسلیئے کہ ۳۵ روپیوں کا سود بھی اسی میں شامل ہے ۳۵ روپیوں پر اگر ایک فیصد ماہانہ کے حساب سے سود لگایا جائے تو اسکی مقدار (۶ ماہ کیلئے) ۲ روپیہ ایک آنہ ۶ پائی ہوتی ہے۔ ۳۵ روپیوں میں سے یہ مقدار منہا کرنے کے بعد ۳۲ روپیہ ۴ آنے چھ پائی بچ رہتے ہیں۔ اور یہی نقصان خالص ہے۔ چونکہ دیہاتی تھوڑی تھوڑی رقومات مثلاً ۲۔ ۴۔ ۶۔ ۸ اور ۱۰ قرض لیتے ہیں لہذا انہیں نقصان کا حقیقی احساس نہیں ہوتا۔ مزید برآں وہ اپنی لاعلمی کی بدولت اس کا حساب بھی نہیں لگا سکتے۔

واضح رہے کہ قرض لیکر ۵۰ فیصد تخفیف کے ساتھ مال فروخت کرنے کا وعدہ صرف وہی کسان کرتے ہیں جو بہت ہی مجبور ہوتے ہیں۔ ساہوکار ان کی مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

بعض ساہوکار ایسے بھی ہیں جو ۴۲،۸۵ فیصد کی تخفیف کے ساتھ مال خریدتے ہیں مثلاً یہ کہ اگر وہ ابتدائے فصل پر کسان کو ۴۰ روپیہ قرض دیں تو اس سے وعدہ لیتے ہیں کہ اختتام فصل پر ایک کھنڈی دھان دیئے جائیں۔ اس صورت میں کسان کا نقصان خام ۳۵ کی بجائے ۳۰ ہو جاتا ہے۔ اگر ۴۰ روپیوں پر ایک فیصد ماہانہ کے حساب سے ۶ ماہ کا سود لگایا جائے تو اسکی مقدار ۲ روپے ۶ آنے ۵ پائی ہوتی ہے۔

نقصان خام میں سے یہ مقدار منہا کرنے کے بعد نقصان خالص کی مقدار ۲۷ روپیہ ۱۱ آنے ۷ پائی رہتی ہے۔

دھان کی خریدی کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ ساہوکار ابتدائے فصل پر اگر ۱۲۰ روپیہ قرض دیتے وہ آسامی سے وعدہ لیتاہے کہ ۶۰ روپیوں پر ڈیڑھ فیصد ماہانہ کے حساب سے رقمی سود ادا کرے۔ باقی ۶۰ روپیوں کے دھان ۱۰ فیصد تخفیف کے ساتھ فروخت کرے یعنے یہ کہ اگر بازار میں ایک کھنڈی دھان کا نرخ ۷۰ روپیہ ہو تو ۶۰ روپیہ میں فروخت کرے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس طریق کی وجہ سے کسان کو کسقدر نقصان ہوتا ہے۔ ساہوکار کو چاہیئے تھا کہ وہ قرض دے کر رقمی سود وصول کرتا۔ اگر وہ ۱۲۰ روپیوں پر ایک فیصد ماہانہ کے حساب سے خالص رقمی سود وصول کرے تو چھ ماہ کا جملہ سود ۷ روپیہ ۳ آنے ۴ پائی ہوتا ہے۔ لیکن ساہوکار کسان سے اصل کے علاوہ ۵ روپیہ ۶ آنے ۵ پائی (۶۰ روپیوں پر فیصد ڈیڑھ روپیہ ماہانہ کے حساب سے ۶ ماہ کا سود) جمع ۱۰ روپے (منافع بابتہ خریدی دھان) وصول کرتا ہے۔ گویا ساہوکار اصل کے علاوہ بحیثیت مجموعی ۱۵ روپیہ ۶ آنے ۵ پائی وصول کرتا ہے اگر اس میں سے ۱۲۰ روپے پر ۶ ماہ کیلئے فیصد ایک روپیہ ماہانہ کے حساب سے سود منہا کر دیا جائے تو جو باقی بچ رہے گا وہ کسان کا نقصان خالص ہوگا۔ جو کہ اسکو اپنی مجبوری کی وجہ سے برداشت کرنا پڑتا ہے۔۔ اس عمل کے بعد ۸ روپیہ ۹ آنے ۸ پائی بچ رہتے ہیں۔ گویا یہی نقصان خالص ہے۔ اگر زاید ناپ کا بھی پورا پورا لحاظ کیا جائے تو نقصان کی مقدار میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔

واضح رہے کہ فروخت پیداوار کے اوّل الذکر طریق (یعنی ۵۰ فیصد تخفیف کے ساتھ فروخت کرنے کے تحت) کسانوں کو ۴۷ فیصد حقیقی نقصان ہوتا ہے۔ دوسرے طریق کے تحت حقیقی نقصان کی مقدار ۶ء۳۹ فیصد رہتی ہے۔ تیسرے طریق میں یہ نقصان تقریباً ۶ء۶ فیصد رہتا ہے۔ اوّل الذکر دو طریقوں کے تحت نسبتاً بہت کم مال فروخت کیا جاتا ہے البتہ تیسرے طریق کے تحت سب سے زیادہ دھان فروخت ہوتے ہیں اندازاً دیہات کے جملہ فروخت شدنی دھانوں کا ۵۰ فیصد حصہ اسی طریق کے تحت فروخت ہوتا ہے۔

جب ہم بحیثیت مجموعی دیہات کے جملہ طریقہ ہائے فروخت پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کسانوں کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ دھانوں کو چاولوں کی شکل میں تبدیل کرکے فروخت کریں۔

لیکن گوناگوں مجبوریوں کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کرسکتے۔ (صرف چند کسان جو غیر مقروض ہیں اور جنکے ہاں ذاتی بنڈیاں ہیں اپنی اجناس کو نظام آباد کی مارکٹ میں فروخت کرتے ہیں) سب سے اہم دقت جو انہیں اس کام سے روکتی ہے وہ ساہوکاروں کا قرض ہے۔ چونکہ کسان ساہوکاروں کے مقروض ہوتے ہیں لہذا وہ اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ اپنا غلّہ ساہوکاروں ہی کے ہاتھ فروخت کریں۔ ورنہ وہ انہیں قرض دینے سے انکار کردیتے ہیں۔ کسان اگر اپنی پیداوار کو معاشی اصول پر فروخت کریں تو ان کی آمدنیوں میں قابل لحاظ اضافہ ہوسکتا ہے۔

صرف دھان کی فروخت کے حالات خصوصیت کے ساتھ اسلئے بیان کئے گئے ہیں کہ وہاں نہ صرف موضع زیربحث کی سب سے اہم پیداوار ہے بلکہ یہ ایک تجارتی جنس بھی ہے۔ جہاں تک کہ دیگر پیداوار کا تعلق ہے (موضع ہذا کے لئے) انکی فروخت کا مسئلہ اسقدر اہم نہیں لہذا انہیں نظرانداز کردیا گیا ہے۔

آٹھویں اور نویں فصل میں ہم مقروضیت کے حالات کی تشریح کرینگے۔ جس سے اندازہ ہوسکے گا کہ اعلیٰ شرح سود کی وجہ سے بھی کسانوں کو قابل لحاظ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

آٹھویں فصل زرعی مقروضیت[1]

اس فصل میں ہم حسب ذیل عنوانات پر بحث کرینگے۔

۱- قرض کی تقسیم ۲- مجموعی قرض اور اسکا بار

۳- قرض کی ماہیت ۴- قرض کی خصوصیات

قرض کی تقسیم | (الف) تقسیم قرض بلحاظ مذہب ——— موضع زیر بحث کا جملہ قرض[2] ۲۵٫۰۰ ہزار روپیہ ہے۔ اس کی تقسیم دو طرح پر کیجا سکتی ہے۔ ایک بلحاظ مذہب۔ دوسرے بلحاظ پیشہ۔ اولاً ہم قرض کی تقسیم مذہبی لحاظ سے معلوم کرینگے۔ ذیل کے اعداد میں ہم نے بتلایا ہے کہ مختلف مذاہب میں کتنے فیصد خاندان مقروض ہیں اور کتنے فیصد غیر مقروض۔ ہر مذہب والوں کا جملہ قرض کسقدر ہے۔ مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے ہر ایک قرض کا فیصد کیا ہے۔ ہر مقروض اور غیر مقروض خاندان کا اوسط قرض کسقدر ہے نیز اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ فی کس قرض کا بار کسقدر ہے۔

تفصیل مذاہب	خاندان		جملہ قرض	فیصد قرض بلحاظ مجموعی قرض	اوسط قرضہ		
	فیصد مقروض	فیصد غیر مقروض			فی مقروض خاندان	خاندان	فی کس
ہندو	۸۴	۱۶	۳۰۶۱۹	۷۴	۲۱۱	۱۷۸	۳۶
نیچ ذات	۹۲	۸	۹۰۹۴	۲۳	۱۵۲	۱۴۰	۳۴
مسلمان	۸۶	۱۴	۱۱۱۲	۳	۱۸۵	۱۵۹	۳۱
عیسائی	۰	۱۰۰	۰	-	۰	۰	.

۱؎ ضمنی طور پر غیر زرعی قرض کی بھی تشریح کی گئی ہے۔ ۲؎ ۱۳۴۷ف (م اکتوبر ۳۸-۱۹۳۷ء) کی قرضہ شماری کے مطابق جو بذات خود کی گئی ہے۔

مندرجہ صدر اعداد سے واضح ہے کہ قرض کا سب سے زیادہ بار (کیا بلحاظ خاندان اور کیا بلحاظ فرداً فرداً) ہندو خاندانوں پر ہے۔ اسکی ایک وجہ ہندو خاندانوں کی ساکھ اور پیمانہ کاروبار ہے۔ عمدہ ساکھ کی وجہ سے اگر ایک طرف قرض بآسانی حاصل کیا جاسکتا ہے تو دوسری طرف زاید مقدار میں بھی قرضہ لیا جاسکتا ہے۔

نیچ ذات (اچھوت) خاندانوں پر اس میں شک نہیں کہ ہندو خاندانوں کے مقابل قرض کا بار کم ہے لیکن ان کی پست معاشی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مقدار بھی زیادہ ہے۔ خصوصاً اس شرح سود کا لحاظ کرتے ہوئے جس پر کہ نیچ ذات افراد قرض حاصل کرتے ہیں۔

مسلمان خاندانوں میں اوسط قرضہ فی کس سب سے کم ہے لیکن بلحاظ خاندان قرض کا اوسط بڑھ جاتا ہے نیچ ذات خاندانوں میں فی مقروض خاندان قرض کا اوسط ۲ ۱۵ روپیہ ہے لیکن مسلمان خاندانوں میں یہ اوسط ۵ ۱۸ روپیہ ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مسلمان خاندان نیچ ذات خاندانوں کے مقابل مسرف ہیں بلکہ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ نیچ ذات خاندانوں کے مقابل مسلمانوں کا معاشی درجہ اور پیمانہ کاروبار بڑھا ہوا ہے یہی رشتہ مسلمان اور ہندو خاندانوں کے مابین ہے۔ ہندو خاندانوں کا معاشی درجہ اور پیمانہ کاروبار چونکہ مسلمانوں کے مقابل بڑھا ہوا ہے لہذا ان کا قرض بھی نسبتاً زیادہ ہے۔

مندرجہ صدر اعداد سے ظاہر ہے کہ عیسائیوں میں صد فی صد خاندان غیر مقروض ہے۔ لیکن یہ امر واضح رہنا چاہیئے کہ صرف ایک عیسائی خاندان تبلیغ مذہب کی خاطر مقیم ہے۔ چونکہ اس خاندان کی ماہانہ معینہ آمدنی ہے اور چونکہ اسکے افراد تعلیم یافتہ ہیں لہذا خرچ کو آمدنی کے حدود سے بڑھنے نہیں دیا جاتا۔ جب کہ خرچ آمدنی سے کم یا اس کے مساوی رہے تو قرض کا سوال ہی کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔

(ب) تقسیم قرض بلحاظ پیشہ — تقسیم قرض بلحاظ مذہب بتانے کے بعد اب یہ دریافت کرنا ہے کہ پیشوں کے لحاظ سے اس کی کیا نوعیت ہے۔ آبادی کے بیان میں پیشوں کی ایک عام تقسیم دو طرح پر کی گئی تھی (۱) زراعتی (۲) غیر زراعتی۔ اسی قسم کا لحاظ کرتے ہوئے قرض کا تجزیہ کیا جائیگا۔

۱- غیر زرعی قرض ـــــ ۴۰۸۲۵ روپیوں میں سے غیر زرعی قرض ۱۷۲۲ روپیہ ہے۔ بالفاظ دیگر مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے غیر زرعی قرض ۴ء۲ فیصد ہے۔ ذیل کی جدول میں مختلف نقاط نظر سے اس قرض کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

تفصیل غیر زراعت پیشہ	خاندان		جملہ قرض	اوسط قرضہ		
	فیصد مقروض	فیصد غیر مقروض		فی مقروض خاندان	فی غیر مقروض خاندان	فی کس
خالص دستکار	۲۰	۸۰	۸۷۲	۴۳۶	۸۷	۱۹
خالص ملازم سرکار	۱۰۰	۰	۱۵۰	۷۵	۷۵	۲۵
خالص تجار	۵۰	۵۰	۶۰۰	۶۰۰	۳۰۰	۱۵۰
گداپیشہ[1]	۳۰	۷۰	۱۰۰	۳۳	۲۵	۱۰

واضح رہے کہ غیر زراعت پیشہ افراد میں دستکار۔ ملازمت پیشہ۔ تجارت پیشہ اور گداپیشہ افراد کو شامل کیا گیا ہے۔ اس تقسیم کا لحاظ کرتے ہوئے قرض کا سب سے زیادہ بار تجارت پیشہ خاندانوں پر ہے ـــ لیکن اس بار کو بار نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ان کا تقریباً تمام حصہ پیداوار ہے۔ خالص ملازمت پیشہ صرف دو خاندان ہیں اور یہ دونوں خاندان مقروض ہیں اسی لئے انہیں صد فیصد مقروض بتلایا گیا ہے ـــ خالص دستکار خاندانوں میں اس میں شک نہیں کہ ۸۰ فیصد غیر مقروض ہیں لیکن مقروض خاندان بری طرح قرض میں مبتلا ہیں ـــ پیشہ کی وجہ سے نہیں بلکہ ذاتی بدروئیگی کی وجہ سے۔ گداپیشہ خاندان بھی اپنی بضاعت کے موافق مقروض نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ان خاندانوں میں اوسط قرضہ فی کس صرف دس روپیہ ہے۔

اگر ہم غیر زراعت پیشہ خاندانوں کے قرض کا مطالعہ مجموعی نقطہ نظر سے کریں تو ۴۴ فیصد خاندان مقروض اور ۵۶ فیصد غیر مقروض ملینگے۔ اوسط قرضہ فی خاندان ۹۶ روپیہ ہے۔ فی مقروض خاندان

---

[1] گداپیشہ خاندانوں کو بہ نظر سہولت غیر زراعت پیشہ خاندانوں میں شامل کیا گیا ہے۔ اصولاً انہیں بالکل علحدہ رکھنا چاہئے۔

قرض کا اوسط ۱۲۵ روپیہ ہے۔ فی کس قرض کا بار ۲۷ روپیہ ہے۔

(۲) زرعی قرض:- غیر زرعی قرض کی تشریح کے بعد اب ہم زرعی قرض کا حال معلوم کرینگے۔ مجموعی قرض یعنی ۴۰۸۲۵ روپیوں میں ۳۹۱۰۳ روپیہ زرعی قرض ہے۔ گویا مجموعی قرض کے تناسب سے زرعی قرض ۹۵٫۸ فیصد ہے۔ ذیل کی جدول میں بتلایا گیا ہے کہ یہ قرض مختلف خاندانوں میں کیونکر منقسم ہے۔

تفصیل زراعت پیشہ	خاندان		جملہ قرض	اوسط قرضہ		
	فیصد مقروض	فیصد غیر مقروض		فی مقروض	فی خاندان	فی کس
خالص زراعت پیشہ	۸۳	۱۷	۱۲۲۶۰	۲۵۷	۲۰۶	۴۱
اصل پیشہ زراعت ذیلی طور پر دیگر پیشے	۹۲	۸	۱۳۶۱۱	۲۰۶	۱۸۹	۳۶
اصلی طور پر دیگر پیشے ذیلی طور پر زراعت	۸۹	۱۱	۸۲۰۰	۱۸۶	۱۶۵	۳۶
خالص زرعی مزدور	۸۶	۱۴	۲۶۳۲	۸۵	۷۳	۲۱

مندرجۂ بالا اعداد سے واضح ہے کہ طبقہ اول (خالص زراعت پیشہ کے خاندانوں میں غیر مقروض خاندانوں کا فیصد اس میں شک نہیں کہ دیگر طبقوں کے مقابل بڑھا ہوا ہے لیکن قرض کا بار (کیا لحاظ خاندان اور کیا لحاظ فی کس) سب سے زیادہ اس طبقے پر ہے۔

دوسرے طبقے (وہ خاندان جنکا اصل پیشہ تو زراعت ہے لیکن جو ذیلی طور پر دیگر کاروبار بھی کرتے ہیں) میں غیر مقروض خاندانوں کا فی صد طبقہ اول کے مقابل بہت کم ہے لیکن جہاں تک کہ بار قرض کا تعلق ہے یہ طبقہ اسقدر زیادہ مقروض نہیں۔

تیسرے طبقے (وہ خاندان جنکا اصل پیشہ تو کچھ اور ہے لیکن جو ذیلی طور پر زراعت کرتے ہیں) میں مقروض خاندانوں کا فی صد طبقہ دوم کے مقابل زیادہ اور طبقہ اول کے مقابل کم ہے۔ بار قرض کے

لحاظ سے بھی یہ طبقہ نسبتاً کم مقروض ہے۔ البتہ اوسط قرض فی کس طبقہ دوم کے مساوی ہے۔

چوتھے طبقے (خالص زرعی مزدور) پر قرض کا بار (ہر لحاظ سے) سب سے کم ہے۔ لیکن اس کمی کا یہ مطلب نہیں کہ یہ طبقہ دیگر طبقوں کے مقابل خوش حال ہے۔ قرض کی کمی پست معاشی درجہ اور ادنی ساکھ کا نتیجہ ہے نہ کہ خوش حال زندگی کا باعث۔

جب ہم مجموعی لحاظ سے زرعی مقروضیت پر غور کرتے ہیں تو ہمیں ۲۲۸ زراعت پیشہ خاندانوں میں سے ۲۰۱ یا ۸۰ فی صد خاندان مقروض اور ۲۷ یا تقریباً ۱۲ فیصد غیر مقروض نظر آتے ہیں اوسط قرضہ فی خاندان تقریباً ۱۷۲ روپیہ ہے۔ فی مقروض خاندان قرض کا اوسط تقریباً ۱۹۵ روپیہ ہے فی کس قرض کا بار تقریباً ۳۶ روپیہ ہے۔

زرعی اور غیر زرعی قرض کی جدا جدا تشریح کے بعد ہر دو کا مقابلہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ چنانچہ ذیل میں تقابلی اعداد پیش کئے جاتے ہیں۔

تفصیل پیشہ	خاندان		جملہ قرض	فیصد قرض بلحاظ مجموعی قرض	اوسط قرضہ		
	فیصد مقروض	فیصد غیر مقروض			فی مقروض خاندان	فی خاندان	فی کس
غیر زراعت پیشہ	۴۴	۵۶	۱۷۲۲	۴٫۲	۲۱۵	۹۶	۲۷
زراعت پیشہ	۸۸	۱۲	۳۹۱۰۳	۹۵٫۸	۱۷۲	۱۷۲	۳۶

مندرجۂ صدر اعداد سے ظاہر ہے کہ غیر زراعت پیشہ خاندانوں میں صرف ۴۴ فیصد مقروض اور ۵۶ فی صد غیر مقروض ہیں۔ زراعت پیشہ خاندانوں میں نوعیت بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ صرف ۱۲ فیصد قرض سے بری اور ۸۸ فیصد مقروض ہیں۔

غیر زراعت پیشہ خاندانوں میں فی مقروض خاندان قرض کا اوسط تقریباً ۳۱ فیصد بڑھا ہوا ہے اس زیادتی کی وجہ یہ کہ غیر زراعت پیشہ خاندانوں میں بعض ناعاقبت اندیش خاندان بہت بری طرح

مقروض ہیں مان استثنائی خاندانوں کی وجہ سے قرض کا اوسط بہت بڑھ گیا ہے۔
جب ہم جملہ خاندانوں (مقروض وغیر مقروض) کا لحاظ کرتے ہوئے بار قرض پر غور کرتے ہیں تو غیر زراعت پیشہ خاندانوں کے مقابل زراعت پیشہ خاندانوں پر ۱۰۳ فیصد زاید بار نظر آتا ہے۔ غیر زراعت پیشہ خاندانوں کے مقابل زراعت پیشہ خاندانوں میں فی کس قرض کا بار بھی ۴۳ فیصد زیادہ ہے۔ جسکی ایک اہم وجہ پیشہ زراعت کی ادنی قوت پیدا آوری ہے۔

۲۔ مجموعی قرض اور اسکا بار یہاں تک تو ہم نے زرعی اور غیر زرعی قرض کے جدا جدا حالات بتلاتے ہوئے آخر میں ہر دو قرضوں کا تقابلی مطالعہ کیا لیکن اب ہم یہ دریافت کرینگے کہ بلا تفریق مذہب یا پیشہ آبادی پر قرض کا کسقدر بار ہے۔

پہلی فصل میں یہ بتایا جاچکا ہے کہ موضع زیر بحث میں جملہ ۲۴۶ خاندان ہیں۔ ان خاندانوں میں سے ۲۱۱ خاندان مقروض اور صرف ۳۵ غیر مقروض ہیں بالفاظ دیگر مجموعی خاندانوں کا لحاظ کرتے ہوئے ۸۵ فیصد مقروض اور ۱۵ فیصد غیر مقروض ہیں۔ اوسط قرضہ فی خاندان ۱۶۷ روپیہ ہے۔ فی مقروض خاندان قرض کا اوسط ۱۹۳ روپیہ ہے۔ فی کس قرض ۳۵ روپیہ ہے۔ مندرجہ ذیل اعداد کے ذریعہ بتلایا گیا ہے کہ موضع ہذا اور دیگر مقامات ہند میں غیر مقروض خاندانوں کا فی صد کیا ہے۔

نشان	نام مقام	فیصد غیر مقروض خاندان
۱	پنجاب	۱۳
۲	صوبہ جات متحدہ	۴۶
۳	بہار و اڑیسہ	۳۵ تا ۵۰
۴	صوبہ جات متوسط	۴۶
۵	برما	۱۴
۶	آسام	۱۵
۷	گجرات	۲۲

مجلّۂ طیلسانین کے مقاصد و قواعد

(۱) "مجلّۂ طیلسانین" انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا ترجمان ہے۔

(۲) اغراض انجمن کے لحاظ سے مجلّہ میں مضامین مقالے اور نظمیں شائع ہونگی۔

(الف) جامعہ عثمانیہ کے منظورہ مابعد طیلسان مقالے شائع کئے جائینگے۔

(ب) اردو مطبوعات پر تنقید و تبصرہ کیا جائیگا۔

(ج) انجمن طیلسانین عثمانیہ اور اسکے ملحقہ اداروں کی سرگرمیوں و کاروبار کے تفصیلات کی اشاعت عمل میں آئیگی

(د) علمی اور ہر جہتی ترقی کے معلومات و اطلاعات شائع کیجائینگی۔

(ھ) سیاسیات حاضرہ اور اختلافی مذہبی امور کے متعلق مضامین وغیرہ کسی صورت میں شائع نہ کئے جائینگے۔

(۳) حسب ضرورت مجلّہ کے مختلف حصّے خاص خاص علم و فن سے مختص ہونگے۔ فی الوقت مجلّہ کے دو حصّے ہونگے ایک عام حصّہ دوسرا موسوم بہ "معاشیات"

(۴) مجلّہ بہمن۔ اردی بہشت۔ امرداد۔ آبان مطابق جنوری۔ اپریل۔ جولائی۔ اکتوبر میں شائع ہوگا۔

(۵) مجلّہ کے ہر حصّہ کی ضخامت کم از کم سو صفحات ہوگی۔

(۶) مضمون یا مقالہ نگار کو ان کے مضمون یا مقالہ کے ۲۵ نسخے بلا قیمت ارسال ہونگے۔ اگر ۲۵ نسخوں سے زاید نسخے درکار ہوں تو کاغذ کی قیمت قبل از قبل ادا کرنے پر انتظام عمل میں لایا جائیگا۔

(۷) اگر مضمون یا مقالہ نگار پہلے سے مجلّہ کے خریدار نہوں تو مجلّہ کا وہ شمارہ جسمیں مضمون شائع ہو بلا قیمت ارسال کیا جائیگا۔

(۸) سال بھر میں کسی صاحب کے دو مضمون یا مقالے شائع ہونے کی صورت میں سال مابعد کے لئے اگر قواعد انجمن طیلسانین عثمانیہ مانع نہوں تو مجلّہ بلا قیمت جاری کیا جائیگا۔

(۹) اگر کوئی مضمون یا مقالہ یا نظم قابل اشاعت قرار نہ پائے تو اسکو واپس کردیا جائیگا۔

(۱۰) اگر کسی مضمون یا مقالہ کیلئے مجلّہ اپنے خرچ سے تصاویر کے بلاکس تیار کرے تو ان کو مناسب قیمت پر جسکا تعین مہتمم مجلّہ کرینگے فروخت کیا جاسکیگا۔

(۱۱) اگر مجلّہ کا کوئی شمارہ اشاعت کے مقررہ مہینہ میں وصول نہو تو اسکی اطلاع مہتمم کو دوسرے مہینہ میں کردینی چاہیئے۔

مطبوعہ مطبع نظام دکن واقع بازار علی میاں

حیدرآباد دکن

مجلّۂ طیلسانیین کا چندہ و اشتہارات کا نرخ

مجلّہ کے چندے کے متعلق حسب ذیل امور پر عمل ہو گا

(۱) (الف) مجلّہ چندہ دہندہ ارکان انجمن طیلسانیین عثمانیہ کو مقررہ قواعد کے بموجب بلا قیمت ارسال کیا جائیگا۔

(ب) مجلّہ کا حصہ موسوم بہ "معاشیات" معاشی کمیٹی انجمن طیلسانیین کے ارکان کے پاس بلا قیمت ارسال کیا جائیگا۔

اگر ان کو مجلّہ کے دونوں حصے مطلوب ہوں تو اسکے لئے انکو (عہ) ایکروپیہ سالانہ اپنے چندۂ رکنیت کے علاوہ ادا کرنا ہوگا۔

(ج) مجلّہ کے دونوں حصوں کی قیمت محصول ڈاک کے علاوہ خریداران مملکت آصفیہ سے پانچ روپے سکۂ عثمانیہ سالانہ ہوگی اور بیرون مملکت آصفیہ سے پانچ روپے سکۂ حکومت ہند۔

(د) مجلّہ کے عام حصہ کی قیمت محصول ڈاک کے علاوہ خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ تین روپے سکۂ عثمانیہ ہوگی اور بیرون مملکت آصفیہ سے تین روپے سکۂ حکومت ہند۔

(ھ) مجلّہ کے حصۂ "معاشیات" کی قیمت معہ محصول ڈاک خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ تین روپے سکۂ عثمانیہ ہوگی اور بیرون مملکت آصفیہ سے تین روپے سکۂ حکومت ہند۔

(۲) مجلّہ کے ہر حصہ کی قیمت فی نسخہ ایک روپیہ ہوگی۔ دونوں حصوں کی قیمت فی نسخہ ایکروپیہ آٹھ آنے ہوگی۔

(۳) اشتہارات کا نرخ حسب ذیل ہوگا۔

مقدار	نرخ سالانہ	نرخ فی اشاعت
پورا صفحہ پہلا ورق	صہ۱۵،	صمہ۵
" اندرونی	عہ۱۰،	سے۳
نصف صفحہ پہلا ورق	اعہ،	عالہ۲
" اندرونی	صہ،	عہ۱/۸

البتہ تبادلہ کے طور پر اشتہارات کی اشاعت مطلوب ہو تو مراسلت کے ذریعہ تصفیہ ہوسکے گا۔

(۴) مجلّہ کے سلسلہ میں ہر قسم کی مراسلت معتمد انجمن طیلسانیین عثمانیہ کمرہ ۲ مجروگاہ سرکار نظام شاہی حیدرآباد کے توسط سے کیجانی چاہیئے۔

(۵) خریداران اپنے پتہ کی تبدیلی سے مہتمم مجلّہ کو بروقت مطلع فرمائیں۔

انجمن طیلسانیین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی ترجمان

مجلّہ طیلسانیین

ساتویں جلد ۔ اردی بہشت ۱۳۵۲ف ، ربیع الاول ۱۳۶۲ھ ، مارچ ۱۹۴۳ء دوسرا شمارہ

مدیر : محمد غوث ام اے ، ال ال ، بی (عثمانیہ)

فہرست مضامین

عرض حال

مجلہ کی گزشتہ اشاعت میں یہ بات واضح کی گئی تھی کہ کابینۂ انجمن نے ۱۳۵۱ف کی ابتداء میں ہی مجلہ کی ادارت کے متعلق بعض امور طے کئے تھے لیکن جناب مولوی عبدالقادر صاحب سروری کے میسور جانے کی وجہ سے نئے انتظام کی ضرورت ہوئی اور یہ کہ کابینۂ انجمن کے تصفیہ کے بموجب سرکاری محکموں میں کارروائی عمل رہی ہے۔

واضح ہو کہ کابینۂ انجمن نے یہ طے کیا کہ مجلہ کی ادارت سابقہ مجلس ادارت کے بجائے راقم الحروف (محمد غوث) کے سپرد کی جائے۔ ادارت کی تبدیلی کے لئے ضابطہ کے چند امور عمل میں لانے ضروری ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ مراحل طے ہو کر گزشتہ شمارے کے اداریہ کی تحریر کے بعد تبدیل ادارت کی منظوری سرکار سے حاصل ہوگئی جسے سرورق پر مجلس ادارت کے بجائے مدیر کا نام لکھا گیا۔

مجلہ کی ادارت کی ذمہ داریاں بہت ہیں، گزشتہ چار چھ مہینوں میں اس بات کا کافی اندازہ ہو چکا ہے کہ مشکلات کسقدر زیادہ اور آسانیاں کسقدر کم ہیں بریں ہم خدمت کی یہ نئی ذمہ داری بھی اس توقع میں قبول کی گئی کہ عثمانیہ برادری کی اعانت اور تائید ان شاء اللہ سب مشکلات حل کر دیگی۔

اس موقع پر ان محترم برادروں کی محنت و کاوش کی سپاس گزاری ضروری ہے جن سے سابق میں مجلہ کی مجلس ادارت تشکیل پائی تھی۔ کسی چلتے ہوئے کام کو چلالینا اور بات ہے اور کسی کام کی تاسیس و ابتدا اور بات۔ مجلہ کی مجلس ادارت کے اولین ارکان نے مجلہ کو جاری کیا، اس کا معیار قائم کیا اور اس کے لئے جگہ پیدا کر دی۔ مجلہ اپنے ان ابتدائی محسنوں کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔ اور یہ توقع کرتا ہے کہ وہ بھی اسکو نہ بھلائینگے۔ خدمت چاہے کسی کے ذمہ کیوں نہ ہو، تعاون اور اشتراک عمل سب کا خاص ہونا چاہئیے۔

مجلہ کے اس نئے دور میں معاشی کمیٹی اور مجلس نمائش نے جو اعانت عمل میں لائی وہی دراصل اُمید کی کرن ثابت ہوئی، مجلہ کو پھر یہی بات دہرانی چاہئیے کہ خدا کرے کہ اسکو اپنے محسنوں کے پاس نادم نہ ہونا پڑے۔

ترتیب مجلہ

۱۔ مجلہ کے گزشتہ دو شماروں سے ابواب کی جو ترتیب قائم کی گئی ہے اور حصۂ معاشیات کا جو اضافہ عمل میں آیا اسکی وجہ سے مجلہ کو بلاشبہ طول و عرض ہندوستان کے اردو مجلات میں ایک خصوصی امتیاز حاصل ہوگا چنانچہ آہستہ آہستہ مجلہ کو ممتاز مشاہیر علم کے پاس اعتنا حاصل ہو رہا ہے۔

۲۔ مجلہ کی ترتیب کے متعلق جو امور مجلہ کی چھٹی جلد کے تیسرے اور چوتھے شمارے میں واضح کئے گئے تھے وہ کافی ہیں۔ مجلہ کچھ مدت اسی ترتیب سے شائع ہوگا۔ البتہ صفحات کی عدم گنجائش بعض وقت کسی نہ کسی باب کے ترک کر دینے پر مجبور کریگی چنانچہ بادل ناخواستہ بعض ابواب کو آئندہ اشاعت کیلئے اٹھا رکھنا اس وقت ضروری متصور ہوا۔

۳۔ یہ بات مناسب نظر آئی کہ معاشی کمیٹی کے زیر اہتمام ماہ اسفندار میں جو پانچویں معاشی کانفرنس منعقد ہوئی اسکی مکمل روئداد اس مرتبہ حصۂ معاشیات میں شائع کردی جائے تاکہ کانفرنس میں مختلف وقتی مسایل پر جو مقالات پڑھے گئے یا جو مباحثہ ہوا اس پر ملک کے اہل حل وعقد بروقت کافی غور کرسکیں۔ نیز نمایش مصنوعات مملکت آصفیہ کی بعض ضروری تفصیلات جو وقت پر اخباروں میں شائع نہ ہوسکیں حصۂ معاشیات میں شامل کردی گئیں ہیں۔ لامحالہ مجلہ کے عام حصہ میں صفحات کم کرنے پڑے تاکہ کاغذ کی مشکلات عین وقت پر سد راہ نہ ہوجائیں۔

۴۔ مجلہ کے گزشتہ شمارہ میں مولوی محمد غوث صاحب محبوب نگری ام اے (موصوف کی شخصیت مدیر کی شخصیت سے علحدہ ہے) کا مقالہ "امام غزالی کے کلامی خصوصیات" شروع کیا گیا تھا۔ اسکو اس شمارے میں بہ تمام وکمال شایع کردیا گیا ہے۔

۵۔ یہ امر محسوس ہوا کہ اس نوعیت کے مقالے قسط وار شائع ہونے سے اپنی قدر وقیمت کھو دیتے ہیں اور ان کی افادیت کم ہوجاتی ہے۔ اس لئے ارادہ یہ ہے کہ آئندہ ایسے مقالے ایک ہی اشاعت میں بہ تمام وکمال شایع کردیے جائیں لامحالہ مختصر مضامین کے لئے جگہ کم کرنی پڑیگی لیکن مجلہ کا اصلی مقصد زیادہ خوبی کے ساتھ تکمیل پاسکیگا۔ البتہ اگر کوئی مقالہ بہت طویل ہو تو مجبوراً اسکو قسط وار شائع کرنا پڑیگا۔

۶۔ مجلہ کے آیندہ شمارے میں توقع ہے کہ محمد اعظم خاں صاحب ام اے لکچرار جامعہ عثمانیہ کا مقالہ طبع ہوگا۔ اس مقالہ کا موضوع "دربار اودھ کا اثر اردو شاعری پر" ہے

۷۔ مولوی فاضل ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب کے قابل قدر مضامین کی دوسری قسط اس شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ ان مضامین کا موضوع متقابلہ علم اصول قانون ہے۔ اس موضوع پر جہاں تک علم ہے ڈاکٹر صاحب نے ہی پہلی مرتبہ اردو میں قلم اٹھایا ہے۔ اسکی افادیت مسلم ہے۔ مجلہ کو بھی یہ امتیاز حاصل ہوا کہ اس کے صفحات پر پہلی مرتبہ اردو میں اس موضوع پر یہ مضامین شائع ہوئے۔ جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ قانون میں سال حال ال ال ایم کی جماعت قائم ہوئی اسکے طلبہ کے لئے مضامین کا یہ سلسلہ جسقدر مفید ہوگا وہ ظاہر ہے۔ کاش مجلہ کے ذرایع، اس بات کی اجازت دیتے کہ جامعہ کے اس نئے اقدام میں وہ زیادہ سے زیادہ تعاون کرسکتا۔۔

فکر ونظر

انسداد گداگری۔ سب خوش تھے کہ سالہا سال کی کوشش کے بعد آخرکار انسداد گداگری کا قانون نافذ ہوگیا۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ مجلس بلدیہ نے پیش روی کے بجائے التوا پسند کیا۔ اور صدر کی فیصلہ کن رائے سے قانون کے نفاذ کو تین مہینوں کے لئے ملتوی رکھنے کی تحریک منظور کرلی۔ غالباً مجلس بلدیہ کے عذرات پر اسکی تحریک سرکار میں بھی منظور ہوگئی۔ خدا نہ کرے کہ تین ماہ کا مصلحت آمیز التوا، دائمی التوا کا پیش خیمہ ثابت ہو تصویر کا ایک رخ یہ ہوا۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ انسداد گداگری کی کمیٹی اس بات پر خوش ہے کہ قانون نافذ ہوگیا اور بلدۂ فرخندہ بنیاد کے رخ زیبا سے گداگری کا بدنما داغ مٹ گیا۔

اگر کمیٹی اس بات پر مسرور ہے کہ بیت المعذورین میں نئے ۳۶ معذور داخل ہوگئے تو غالباً مجلس بلدیہ کہیگی کہ ۸۰۰۰ معذوروں میں سے ۳۶ معذور بیت المعذورین میں داخل ہوئے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ درحقیقت قانون نافذ ہوگیا۔ غرض یہ اپنی جگہ اور وہ اپنی جگہ تاویل و دلیل کے گرداب میں سرگرداں ہیں۔ اس موقع پر اس بات کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ حیدرآباد سال ہائے سال کی کارروائی کے بعد بھی اسی جگہ رہتا ہے جہاں سے وہ پہلے چلتا ہے خود یہی مسئلہ انسداد گداگری اور قیام بیت المعذورین کم ازکم ۵۵ برس سے خود مجلس بلدیہ میں زیر کارروائی رہے۔ اگر یہ مجلس، خواہ وہ پہلے مجلس انتظام صفائی اور اب مجلس بلدیہ کیوں نہ ہو، بلدۂ حیدرآباد کے مسئلہ گداگری کو ۵۵ سال کے بعد بھی حل نہیں کرسکتی اور مزید مہلت مانگتی ہے تو نہ صرف مجلس بلدیہ بلکہ ہر شہری کو غور و خوض کرنا چاہیئے۔

۵۵ برس پہلے نواب اقبال یار جنگ مرحوم کی مرتب کی ہوئی ایک یادداشت اس وقت پیش نظر ہے۔ اس کی ساری تفصیلات بیان کرنے کے لئے مجلہ کے صفحات میں گنجایش نہیں۔ صرف دو ایک باتیں واضح کی جاتی ہیں۔

نواب اقبال یار جنگ مرحوم نے لکھا ہے کہ ۱۳۰۰ھ ہجری میں انہوں نے مجلس انتظام صفائی میں یہ تحریک کی کہ متعدی امراض میں مبتلا لوگ راستوں پر بھیک مانگتے ہیں ان کے لئے کوئی بندوبست کیا جائے۔ نواب اکبر جنگ مرحوم کوتوال بھی اس کے موید تھے۔ یہ تحریک مجلس میں بالاتفاق منظور ہوئی اور سرکار میں بھیجی گئی۔ سرکار نے بھی اسکو پسند کیا اور تفصیلات طلب کئے۔ مجلس نے اسکیم مرتب کرنے کا کام نواب اقبال یار جنگ کے سپرد کیا۔ جسے انہوں نے ایک مفصل اسکیم مرتب کی جو مطبوعہ صورت میں اس وقت پیش نظر ہے۔

بعد میں یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تا آنکہ طغیانی رود موسیٰ کے بعد موجودہ بیت المعذورین قایم ہوا۔ اسکے سلسلہ میں بھی اس وقت کچھ مواد پیش نظر ہے لیکن اسکی صراحت غیر ضروری ہے۔ عام طور سے یہ بات مشہور ہے کہ بیت المعذورین کے ایک سابق اعزازی مہتمم کے ذمہ کئی ہزار روپے جو وصول طلب تھے وہ حسابات سے خارج کردئے گئے۔ مجلس صفائی کی وہ حالت اور ابنائے ملک کی یہ حالت۔ پھر انسداد گداگری ہو تو کیونکر ہو۔ انسداد گداگری تو ایک طرف خود ملک کے ترقی نہ کرسکنے کے جو دو سبب ہیں وہ یہی سستی اور بد دیانتی ہیں۔ جب ملک کی نئی نسل ان پر غلبہ پالیگی اس وقت کامرانی اور بختیاری کی بھی نوبت بجیگی۔

یہ صفحات بالکل تیار ہو چکے تھے کہ مولانا محمد اکبر علی صاحب مدیر صحیفہ چل بسے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دو ایک سطروں میں ان کی خدمات کا خراج ادا نہیں ہوسکتا۔ مجلہ مرحوم کے محزون پس ماندوں سے مخلصانہ اظہار تعزیت کرتا ہے۔

قانون کا تحکمی نظریہ

از جناب مولوی فاضل ڈاکٹر سید سیادت علی خان صاحب

ادبیات

(۱) کرکوناف کتاب ۲ دفعہ ۲۳ ۔ جنتھر براؤن باب ۱ ۔ اور (۲)

(۳) برائیس کی نوٹ ۔ نویں لکچر اطاعت پر ۔ آسٹن باب ب سامنڈ دفعہ ۱ ۔ برائس لکچر ۵ ۔

اور ۸ ۔ آسٹن لکچر ۱ ۔ وینوگراڈ آف ۔ باب ۲ ص ۲

قانون کی ماہیت کے متعلق جو دوسرا تصور یا نظریہ ہے وہ یہ ہے کہ قانون ایک مقتدر اعلیٰ کی مرضی کا مظہر ہے یہ الفاظ دیگر قانون حکم مملکت ہے ۔ یہ انگریزی علم اصول قانون کا خصوصی تصور ہے اس کے اساتذہ علم اصول قانون کی تحلیلی اسکول کے اساتذہ کہلاتے ہیں اس کا اب بھی بڑا اثر ہے اس کی خوبی بھی کچھ کم نہیں گو ہمیں ماننا پڑیگا یہ ایک رخی یا غیر مکمل ہے

(۱) مفہوم قانون قدرتی مظاہر میں یکسانیت سے جدا مفہوم ہے ۔

پس قانون کے مفہوم کی تحلیل اس اسکول کے اساتذہ اس طرح شروع کرتے ہیں کہ ایک طرف تو شروع زمانہ سے یعنے اس وقت سے جبکہ چرواہا اپنے گلہ کو احکام دے کر یا پدر خاندان اپنے خاندان کو احکام دے کر ان کی تعمیل کراتا تھا اور تعمیل نہ ہونے پر سزا دیتا تھا، قانون کا مفہوم کم و بیش صحیح سمجھا گیا ہے تو دوسری طرف لفظ قانون کا استعمال قانون اخلاق، قانون حسن، قانون فطرت، قانون الٰہی، اور قانون مروت وغیرہ وغیرہ بیسوں مبہم الفاظ میں کیا گیا ہے ۔ یہی نہیں یورپ کے اکثر ممالک میں قانون کے لئے جو لفظ استعمال ہوتے ہیں ۔۔۔ یعنے لاٹن میں Jus جرمن میں Recht اور فرنچ میں Droit ان کے معنے نہ صرف قانون کے ہیں بلکہ حق اور انصاف کے بھی ۔ ایک ہی لفظ کو اتنے مختلف معنوں میں استعمال کرنا ۔ دینیات، طبعیات، اخلاقیات، جمالیات

اور علم اصول قانون کے مختلف مضامین کا ایک غیر معمولی خلط مبحث معلوم ہوتا۔ اگر ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ تقسیم علوم ایک جدید کارنامہ ہے جس سے قدما واقف نہیں تھے اس لئے وہ دنیا بھر کے مضامین کا ایک ہی ساتھ مطالعہ کرتے تھے۔ اب تقسیم علوم ہو گئی ہے اور علوم یا تو نظری اور طبیعاتی یا عملی اور اخلاقی قرار دیئے گئے ہیں اس تقسیم علوم کے ساتھ ہی قانون کا مفہوم بھی ان علوم میں معین ہو گیا ہے طبیعاتی علوم میں قانون سے مراد قدرتی مظاہر میں یکسانیت اور ان کا یکسان عمل ہے اور عملی یا اخلاقی علوم میں انسان کے لئے ایک قاعدہ عمل۔ اب ہمیں یہاں صاف طور پر کہنا اور سمجھ لینا چاہیئے کہ علم اصول قانون میں لفظ قانون پہلے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔

(۲) قانون محض انسانوں کیلئے قواعد عمل ہی نہیں۔

رہا عملی یا اخلاقی علوم میں قانون کا مفہوم کہ وہ انسانوں کے لئے قاعدہ عمل ہے تو یہ بھی علم اصول قانون کے مقصد کے لئے بہت وسیع اور بہت مبہم مفہوم ہے۔ صحیح معنوں میں قانون قواعد عمل کا ایک خاص حصہ ہے اس کی توضیح ہم اگلے فقرہ میں کریں گے۔ یہاں ہم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ انسانوں کے لئے قواعد عمل جن کو قوانین ہی کہا جاتا ہے کتنے مختلف قسم کے ہیں بعض تو جہاں کہیں انسان مل کر رہتے ہیں پائے جاتے ہیں بعض کسی خاص مذہب کے امتیوں پر قابل پابندی ہیں۔ بعض معاشرہ کے بنیادی اصولوں سے متعلق ہیں تو بعض رسومات کے ادنیٰ ترین تفصیلات سے بعض ایسے ہیں کہ ان کی پابندی سلطنتوں اور شاہنشاہیت کی پوری قوت سے کرائی جاتی ہے تو بعض ایسے کہ ان کی خلاف ورزی ہر وہ شخص کر سکتا ہے جسے اپنے ملاقاتیوں کے طعن و تشنیع کا خیال نہ ہو۔ لیکن ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ان تمام قواعد عمل میں چند خصوصیات مشترک ہیں یعنی وہ صریحی قضیئے ہیں۔ ان میں ذی عقل انسانوں سے خطاب ہے۔ اور وہ صرف مشورے ہی نہیں بلکہ احکام ہیں یعنی ان کی پابندی کے لئے تہدید موجود ہے۔ یہ تہدید سزا کی دھمکی نہ سہی لیکن اتنی تو ضرور ہے کہ خلاف ورزی کی صورت میں کچھ نہ کچھ اور کسی نہ کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچایا جائے گا اور یہ احکام عام ہیں یعنی ان سے کسی خاص فعل یا عمل کا حکم نہیں دیا جاتا ہے بلکہ ایک قسم کے بہت سے افعال اور اعمال کا۔ ان قواعد عمل میں سے بعض تو مثلاً قواعد مروۃ یا قواعد فیشن ایسے ہیں کہ ان کو جاہل سے جاہل عامی شخص بھی صحیح معنوں میں قانون سے مخلوط نہیں کر سکتا لیکن بعض دوسرے ایسے ہیں جن کو اکثر اساتذہ تک بھی صحیح معنوں میں قانون سے مخلوط کرتے ہیں ہماری مراد الہامی

قوانین، قوانین قدرت اور قوانین اخلاق سے ہے۔

(۳) قانون اور قواعد اخلاق میں فرق۔

اس لئے ایک فقیہہ یا علم اُصول قانون کے طالب علم کا کام ہے کہ ان دیگر اخلاقی علوم کے قوانین اور صحیح معنے میں قانون میں صاف صریح اور معین طریقہ پر فرق کرے۔ اس کام کے لئے ہمیں پہلے جاننا چاہیئے کہ تمام اخلاقی یا عملی علوم میں انسانوں کی مرضی یا ارادہ سے بحث ہوتی ہے اور ان اخلاقی یا عملی علوم میں اخلاقیات ہی ایک ایسا علم ہے جس میں زیادہ تر انسان کی مرضی یا ارادہ سے بلا لحاظ اس کے ظاہری افعال میں ظہور کے بحث ہوتی ہے۔ بقیہ اخلاقی یا عملی علوم میں جس میں علم اصول قانون بھی شامل ہے انسان کی مرضی یا ارادہ سے جس کا ظہور ظاہری جسمانی افعال میں نہ ہو بحث نہیں ہوتی۔ پس ظاہر ہے کہ ہمیں اخلاقیات کے ان قوانین سے جن میں محض انسان کی مرضی یا ارادہ سے بلا لحاظ اس کے ظاہری جسمانی افعال میں ظہور کے بحث ہوتی ہے کچھ سروکار نہیں اور علم اصول قانون میں ہمیں ان کو بھی یک لخت ترک کر دینا چاہیئے کیونکہ علم اصول قانون میں محض انسان کی مرضی سے بلا لحاظ اس کے ظاہری جسمانی افعال میں ظہور کے بحث نہیں ہوتی اس طرح پر اخلاقیات کے قوانین یا قوانین کے اخلاق میں اور صحیح معنے میں قانون میں پہلا فرق تو یہ ہوا کہ قوانین اخلاق محض انسان کی مرضی کو منضبط کرنے کے قوانین ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے ان کے متعلق کانٹ کہتا ہے کہ ان کے لئے ظاہری قانون سازی ناممکن ہے اور صحیح معنے میں قانون میں محض انسان کی مرضی کو منضبط کرنے کے کوئی قوانین نہیں ہوتے۔ علم اُصول قانون میں جب تک انسانی مرضی افعال میں ظاہر نہ ہو کوئی قواعد عمل یا قوانین نہیں بنائے جاتے۔ الحاصل ہمیں علم اُصول قانون میں قوانین اخلاق کے اس حصہ کو جس میں محض انسان کی مرضی سے بلا لحاظ اس کے ظاہری افعال میں ظہور کے بحث ہوتی ہے قطعاً ترک کر دینا ضروری ہوا۔

(۴) قانون اور اصول اخلاق میں فرق۔

اب رہا قوانین اخلاق کا وہ باقی حصہ جس میں علاوہ انسان کی مرضی کے ظاہری جسمانی افعال کو منضبط کرنے کے بھی قوانین ہوتے ہیں اور جن قوانین کو اصول اخلاق بھی کہتے ہیں۔ ان قوانین یا اصول

ماخذ ایک سیاسی ماتحت جماعت۔ علم اصول قانون میں بحث قوانین سے ہوتی ہے۔ لہذا ہمیں انہیں بھی ترک کردینا چاہیئے۔

اس طرح پر قواعد عمل کے مفہوم کی تحلیل کرکے اور یکے بعد دیگرے مختلف اقسام کے قواعد عمل کو ساقط کرکے تحکمی نظریہ کے اساتذہ بالآخران قواعد عمل تک پہونچتے ہیں جو صحیح معنے میں یعنے علم اصول قانون کے معنے میں قانون ہیں۔ اور قانون کی تفصیلی طور پر تعریف یوں کرتے ہیں۔

۸۔ قانون کی تعریف

"قانون سے صحیح معنے میں مراد انسانوں کے ظاہری عمل کا ایک عام قاعدہ ہے جس کو ایک ایسی معین انسانی قوت نافذ کراتی ہے جو ایک سیاسی معاشرہ میں مقتدر اعلیٰ ہوتی ہے۔"

مختصر الفاظ میں قانون انسانوں کے ظاہری عمل کا ایک عام قاعدہ ہے جس کو ایک سیاسی مقتدر اعلیٰ نافذ کراتا ہے یا اور بھی مختصر الفاظ میں یہ کہ قانون حکم مملکت ہے۔

تحلیلی اسکول کی قانون کی اس تعریف کے حسن و قبح پر بحث کرنے سے پہلے مختصر طور پر اس تعریف میں جو تین تصورات مملکت، مقتدر اعلیٰ، اور حکم کے مضمر ہیں ان کے متعلق کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ قانون کی اس تعریف کی پوری طرح توضیح ہو جائے۔

۹۔ مملکت

مملکت بہت سے اشخاص کے ایک اجتماع پر مشتمل ہوتی ہے جو بالعموم روئے زمین کے ایک رقبہ پر قابض ہوتا ہے اور جن میں اکثریت کی یا ایک خاص معین جماعت کی مرضی یا ارادہ اس اکثریت یا معین جماعت کی قوت کی وجہ سے اس اجتماع کے کسی رکن کی مخالف مرضی یا ارادہ پر غالب رہتی ہے۔ مملکت کی یہ روایتی تعریف ہے۔ اسی کو سامنڈ نے زیادہ مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ مملکت یا سیاسی معاشرہ انسانوں کا ایک اجتماع ہے جو چند خاص مقاصد کو چند خاص ذرائع سے حاصل کرنے کے لئے قائم کیا جاتا ہے اس میں اور انسانوں کے اور دوسرے اجتماعوں میں مثلاً کلیسا، بڑی تجارتی کمپنیوں وغیرہ میں فرق وظائف کا ہے۔

یوں تو آج کل مملکت کے وظائف گوناگوں ہیں لیکن مملکت کے دو وظیفے خصوصی اصلی اور لازمی ہیں۔ یعنے عدل گستری کے ذریعہ اندرونی امن کا قیام اور فوجی طاقت کے ذریعہ خارجی دشمنوں سے اراکین مملکت کی حفاظت۔ اس طرح پر مملکت دوسرے انسانی اجتماعوں سے اپنے ان دو خاص وظیفوں کے وجہ سے ممتاز ہوئی اور گو ان دونوں وظیفوں میں چند فرق ہیں۔ مثلاً عدل گستری عدالتی کارروائیوں کے ذریعہ عمل میں آتی ہے تو جنگ بغیر کسی عدالتی کارروائی کے۔ یا عدل گستری مقررہ قانون کے مطابق ہوتی ہے تو جنگ بقول (inter arma leges silent) بالعموم کسی مقررہ قانون کے مطابق نہیں ہوتی۔ عدل گستری میں مملکت کی طاقت کا اندرون مملکت اظہار ہوتا ہے تو جنگ میں بیرون مملکت۔ اور عدل گستری میں مملکت کی طاقت پس پردہ رہتی ہے تو جنگ میں بیرون پردہ اور نمایاں۔ ان دونوں اصلی اور لازمی وظائف کے سوا مملکت کے باقی ثانوی وظائف میں دو وظیفے بہت اہم ہیں۔ ایک قانون سازی یعنے ان اصولوں کا وضع کرنا جن کے مطابق عدل گستری ہوگی اور دوسرے لگان کا لگانا جس کے لئے مملکت کے تمام وظائف کو پورا کرنے کے لئے روپیہ فراہم ہوتا ہے۔ آج کل دنیا کی ہر مملکت نے اور بھی بہت سے ثانوی وظائف کو مثلاً پوسٹ آفس تعلیم، تعمیرات، وغیرہ وغیرہ کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ کیونکہ تجربہ سے پایا گیا ہے کہ طاقت - ذرائع اور دولت کی وجہہ سے مملکت ان امور کو بہ نسبت خانگی اشخاص کے اچھی طرح انجام دیسکتی ہے۔

۱۰۔ رکنیت مملکت

آج کل تمام متمدن ممالک میں رکنیت مملکت کی بنا ر استحقاق یا تو شہریت ہے یا سکونت۔ شہریت مملکت سے شخصی اور مستقل رشتہ ہوتا ہے۔ اور سکونت مقامی اور عارضی۔ اسی لئے آج کل مملکت کے ارکان وہ تمام اشخاص ہیں جو یا تو شہریت کے شخصی یا مستقل رشتہ کی وجہہ سے اس کے شہری یا رعایا ہوتے ہیں یا وہ اشخاص جو وقتاً فوقتاً مملکت میں سکونت پذیر ہونے کی وجہہ سے اس عارضی اور مقامی رشتہ کی بنا پر اس کے ارکان ہوتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں یہ دونوں بنائے استحقاق ایک ہی شخص میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اکثر برطانوی رعایا ر (شہری) برطانیہ ہی میں رہتے ہے

اور برطانیہ کے اکثر باشندے اس کے شہری ہوتے ہیں۔ لیکن بعض صورتوں میں ایسا نہیں بھی ہوتا ہے بعض برطانوی شہری برطانوی مملکت سے باہر رہتے ہیں اور بعض ایسے لوگ بھی برطانیہ میں رہتے ہیں جو برطانوی رعایا نہیں ہوتے بلکہ اجنبی ہوتے ہیں ان دونوں قسم کے بنائے استحقاق میں شہریت کو بہ نسبت سکونت کے زیادہ امتیازات ہوتے ہیں مثلاً شہریوں کو سیاسی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ حال حال تک صرف شہری ہی برطانیہ میں زمین خرید سکتے تھے۔ اب بھی صرف شہری ہی برطانوی جہاز یا ان میں حصہ خرید سکتے ہیں بیرون ممالک بھی شہریوں کی حفاظت کا فرض مملکت پر عاید رہتا ہے۔ ان زیادہ امتیازات کی وجہ سے شہریوں پر ذمہ داریاں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ مثلاً وہ جہاں کہیں ہیں ان پر اپنے مملکت کے قوانین کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ آج کل رجحان یہ ہے کہ رکنیت مملکت کے استحقاق بربنائے سکونت کو بہ نسبت استحقاق بربنائے شہریت کے زیادہ اہمیت دی جائے۔ تاریخ پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہو جائے گا کہ چونکہ مملکتیں قومیتوں سے نکلی ہیں یعنے مملکتوں کو ایسے اجتماع اشخاص نے بنایا ہے جو زبان مذہب یا نسل کے مشترک ہونے کی وجہ سے باہم متحد تھے۔ اس لئے پہلے شہری حقوق و امتیازات کا فائدہ ارکان قوم ہی تک محدود تھا اور قومی قوانین سے اجنبی فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے کیونکہ مملکت کے تحفظ اور بقا میں شہریوں ہی کو دلچسپی ہو سکتی تھی۔ بعد میں تجارت اور فتوحات کی وجہ سے شہریت محض شہریوں کی حد تک محدود نہیں رہ سکی۔ اجنبیوں کو بھی بشرط سکونت اس سے فائدہ اٹھانے دینا ضروری ہوا اور یہ ممکن ہوا کہ کوئی شخص باوجود ... من نہ ہونے کے رد من مملکت کا شہری بن سکے۔ ہم کہہ نہیں سکتے کہ آیندہ رکنیت مملکت محض سکونت ہی پر مبنی ہو جائے گی یا ہونی چاہئے۔ بہت ممکن ہے کہ موجودہ حالت یعنے دونوں قسموں کی رکنیت مستقل ثابت ہو۔

۱۱۔ دستور مملکت

مملکت کے وظائف کی انجام دہی کے لئے ضروری ہے کہ ان کی ایک مجموعیت یا چند ادارے ہوں۔ مملکت کے اہم وظائف کی انجام دہی کے لئے جو ادارے ہوتے ہیں انھیں

مقننہ۔ عاملہ اور عدلیہ کہتے ہیں انھیں کے تعلقات کو منضبط کرنے والے قانون کو قانون دستوری کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اداروں کا یعنی مملکت کی عضویت کا فی الواقع ان کے متعلق قانون وضع ہونے سے قبل ہونا ضروری ہے۔ واقعتہً قوم پہلے مملکت کو عملاً قائم کرتی ہے پھر مختلف جماعتوں کو مختلف مقننہ عاملہ اور عدلیہ وغیرہ کے فرائض سپرد کرتی ہے انھیں کے عمل سے قانون اور قانون دستوری پیدا ہوتا ہے جیسا کہ بغاوت کے بعد امریکہ کی نوآبادیوں کی مثال سے ظاہر ہوگا۔ قیام کے بعد دستوری قانون اور دستوری واقعہ کا ایک دوسرے پر عمل اور ردعمل ہوتا ہے اور باہم وہ متوافق ہوتے جاتے ہیں گو دستوری واقعہ اور دستوری قانون میں پھر بھی کچھ نہ کچھ فرق رہ جاتے ہیں جیسا کہ انگلستان کی مثال سے ظاہر ہوگا۔

۱۲) اقسام مملکت

مملکت کے اقسام کی تقسیم یا تو بین قومی نقطۂ نظر سے کیجا سکتی ہے یا ان کے دستور کے لحاظ سے بین قومی نقطۂ نظر سے مملکتیں یا آزاد ہیں یعنی جبکہ وہ بذاتِ خود مکمل ہوں مثلاً سلطنت برطانیہ یا ماتحت جب وہ کل کے جزو ہوں مثلاً کنیڈا۔ دستور کے لحاظ سے مملکتیں فردیہ ہوتی ہیں یعنے جبکہ وہ دوسرے مملکتوں پر شامل نہ ہوں مثلاً مملکت انگلستان یا وفاقیہ جب کہ وہ دوسرے مملکتوں پر شامل ہوں۔ مثلاً ممالک متحدہ امریکہ۔

مملکت پر اس مختصر سے تبصرہ سے ظاہر ہو گیا کہ وہ انسانوں کا ایک ایسا اجتماع ہے جو چند مقاصد کو چند ذرائع سے حاصل کرنے کے لئے قائم کیا جاتا ہے اور جس میں ایک شخص یا جماعت کی مرضی اس اجتماع کے کسی رکن کی مخالف مرضی پر غالب رہتی ہے۔ اس آخری پہلو پر آسٹن نے زور دیکر مملکت کی تعریف یوں کی ہے کہ مملکت مقتدر اعلیٰ سے مرادف ہے اور اس سے مراد کوئی شخص یا اشخاص ہے جن کو ایک آزاد سیاسی معاشرہ میں اعلیٰ ترین اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ الحاصل مملکت انسانوں کا ایک ایسا اجتماع ہوا جس میں ایک شخص یا جماعت کی مرضی اس اجتماع کے کسی رکن کے مخالف مرضی پر غالب رہتی ہے آسٹن اس شخص یا جماعت کو مقتدر اعلیٰ اور انسانوں کے اس اجتماع کو آزاد سیاسی معاشرہ کہتے ہیں پس آسٹن کے مقتدر اعلیٰ کی تعریف بروایتی الفاظ میں یہ ہوئی کہ۔

مقتدر اعلیٰ کی تعریف

"اگر ایک معین انسانی برتر (شخص یا جماعت) جو ایک ایسے ہی برتر (شخص یا جماعت) کا عادتاً مطیع نہ ہو اور جس کی کسی معاشرہ کی اکثریت عادتاً اطاعت کرتی ہو تو یہ معین برتر (شخص یا جماعت) اس معاشرہ میں مقتدر اعلیٰ ہے اور وہ معاشرہ بشمول اس برتر (شخص یا جماعت) کے ایک سیاسی اور آزاد معاشرہ ہے"۔ [1]

اگر غور سے دیکھا جائے تو آزاد معاشرہ کا وہ حصہ ہوتا ہے جو مقتدر اعلیٰ ہو نہ کہ خود معاشرہ لیکن آزاد سیاسی معاشرہ سے ہماری مراد ایسا سیاسی معاشرہ ہوتی ہے جو دونوں پر یعنے مقتدر اعلیٰ اور ماتحتوں پر شامل ہو ایسے آزاد سیاسی معاشرہ کا مندوہ معاشرہ ہوتا ہے جس میں صرف ماتحت ہوتے ہیں اور جو آزاد سیاسی معاشرہ کا ایک جزو ہو سکتا ہے مثلاً ہندوستان بشمول وائسرائے کے اور برطانوی پارلیمنٹ۔

اس طرح پر آسٹن کے نزدیک اقتدار اعلیٰ کے مفہوم میں ایک آزاد سیاسی معاشرہ ہمیشہ داخل ہوتا ہے اور اسی لئے اقتدار اعلیٰ کے مفہوم کے لئے ضروری ہوا کہ

(۱) کہ کسی معاشرہ کی اکثریت ایک ہی برتر (شخص یا جماعت) کی عادتاً اطاعت کرتی ہو۔

(۲) یہ برتر (شخص یا جماعت) ایک ایسے ہی برتر (شخص یا جماعت) کی عادتاً مطیع نہ ہو۔ پس اقتدار اعلیٰ کے دو پہلو یا معیار ہوئے ایک مثبت دوسرا منفی۔

(۱) مثبت معیار کو پورا کرنے ضروری ہے کہ

(الف) شہریوں یا ماتحتوں کی اکثریت ایک ہی معین برتر (شخص یا جماعت) کی اطاعت کرے۔ اگرچہ چند افراد یا مجموعۂ افراد حکمران جماعت کی مخالف ہو جائے تو اس سے اقتدار اعلیٰ کے وجود پر اس وقت تک اثر نہیں پڑیگا جب تک کہ یہ افراد یا مجموعۂ افراد اتنے زیادہ قوی ہو جائیں کہ قوم کے اکثر حصہ پر حکمرانی نہ ہو سکے۔

[1] If a determinate human superior not in the habit of obedience to a like superior receive habitual obedience from the bulk of a given society that determinate superior is sovereign in that society and the society including the superior is a society poltical and independent.

فرض کیجئے کہ کسی قوم یا معاشرہ میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے۔ اگر اس وقت ان دو یا زیادہ متحارب جماعتوں کی طاقت تقریباً برابر ہے تو اس معاشرہ کی دو میں سے ایک حالت ہو گی اگر ہر جماعت کی اکثریت کسی ایک ہی معین برتر شخص یا جماعت کی مطیع ہو تو اس وقت معاشرہ دو یا زیادہ آزاد سیاسی معاشروں میں منقسم ہو جائے گا اور اگر ہر جماعت کی اکثریت اس طرح پر اطاعت نہ کرتی ہو تو اس وقت معاشرہ میں حالت فطری یا بدنظمی قائم ہو جائے گی۔ اس آخری صورت میں یا تو نام کو بھی نظم یا حکومت نہیں رہے گی یا اتنے چھوٹے چھوٹے معاشرے قائم ہو جائیں گے کہ انھیں مشکل ہی سے آزاد سیاسی معاشرہ کہا جائے گا کیوں کہ آزاد سیاسی معاشرہ کے لئے رقبہ کی ایک خاص وسعت اور افراد کی ایک خاص تعداد ضروری ہوتی ہے۔

(ب) اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ شہریوں یا ماتحتوں کی اکثریت عادتاً ایسے ایک ہی معین برتر شخص یا جماعت کی اطاعت کرے۔ اگر اطاعت شاذ و نادر یا عارضی ہو تو اقتدار اعلیٰ اور ماتحتی کا تعلق نہیں پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً ۱۸۱۵ء میں احلاف نے فرانس پر قبضہ کر لیا۔ احلاف کے مقتدر اعلیٰ کے احکام فرانسیسی حکومت کو اور فرانسیسی حکومت کے ذریعہ فرانسیسی قوم کو ماننے پڑے۔ لیکن چونکہ احکام اور ان اطاعت عارضی اور شاذ تھی ان کی وجہ سے احلاف کے مقتدر اعلیٰ اور فرانسیسی قوم میں رشتۂ اقتدار اعلیٰ اور ماتحتی نہیں قائم ہوا۔ اور باوجود ان احکام اور ان کی اطاعت کے فرانسیسی حکومت مقتدر اعلیٰ اور آزاد تھی۔ اور اگر فرانسیسی قوم ان احکام اور ان کی اطاعت سے پہلے حالت فطری یا بدنظمی میں ہوتی تو ان کی وجہ سے وہ ایک آزاد سیاسی معاشرہ نہیں ہو جاتی۔

اسی طرح ایک کمزور مملکت کی آزادی معرض خطر میں یا طاقتور مملکتوں کے رحم پر منحصر ہوتی ہے کیوں کہ ایسی مملکت اور اس کے ماتحتوں کی اکثریت ان طاقتور مملکتوں کے احکام کو جو وہ کبھی کبھی صادر کرتے ہیں مانتی ہو۔ مثلاً اس کی مثال سکسن حکومت اور (Holy alliance) کے مقتدر اعلاؤں سے ملتی ہے۔ لیکن ان میں اور سکسن حکومت میں رشتہ اقتدار اعلیٰ اور ماتحتی اس لئے قائم نہیں کیا جا سکتا کہ احکام اور ان کی اطاعت شاذ و نادر ہوتی ہے اور باوجود ان احکام اور ان کی اطاعت کے کمزور سکسن حکومت مقتدر اعلیٰ اور آزاد تھی۔

(ج) اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ مقتدر اعلیٰ ایک معین شخص یا جماعت ہو کیونکہ ایک غیر معین جماعت ایک جماعتی حیثیت سے کارفرما نہیں ہو سکتی۔ اس لئے نہ وہ احکام جاری کر سکتی ہے۔ اور نہ اُس کی اطاعت کی جا سکتی ہے۔

(د) اور نیز اسی معاشرہ کے ارکان یعنے شہریوں یا ماتحتوں کی تعداد اتنی کم نہیں ہونی چاہیئے کہ ایک آزاد سیاسی معاشرہ کے لئے ناکافی سمجھی جائے ہم معین طور پر نہیں کہہ سکتے کہ کس قدر تعداد ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ تعداد اتنی زیادہ ہو کہ خاندانوں سے آزاد سیاسی معاشروں کو ممتاز کیا جا سکے۔ ورنہ خاندان بھی آسٹن کی تعریف میں مملکت اور آزاد سیاسی معاشرہ کے تحت آجائیں گے ایسے پدرسری خاندان خود آزاد سیاسی معاشرہ نہیں بلکہ آزاد سیاسی معاشرہ کے رکن ہوتے ہیں۔

(۲) مقتدر اعلیٰ کے منفی معیار کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ برتر شخص یا جماعت کسی دوسرے انسانی برتر معین شخص یا جماعت کی عادتاً مطیع نہ ہو مثلاً ہندوستان کا وائسرائے مقتدر اعلیٰ نہیں ہے کیونکہ وہ وائٹ ہال کے احکام کی عادتاً تعمیل کرتا ہے اور ہندوستان سیاسی معاشرہ ہے لیکن آزاد نہیں۔ اسی طرح نوآبادیاں بھی سیاسی معاشرہ ہیں لیکن آزاد نہیں۔

پس آسٹن کے نزدیک مقتدر اعلیٰ کل سیاسی معاشرہ نہیں بلکہ اس کا ایک معین حصہ ہوتا ہے۔ انگلستان میں اقتدار اعلیٰ آسٹن کے نزدیک بادشاہ۔ دارالعوام اور رائے دہندوں کی مخصوص جماعت کو حاصل ہے یعنے رائے دہندوں کی اس جماعت کو جسے آسٹن کے زمانہ میں رائے دینے کا حق حاصل تھا۔ آج کل تو رائے دینے کا حق کل جوان مرد اور عورتوں کو حاصل ہے لیکن آسٹن کے زمانہ میں یہ حق بہت محدود تھا۔ امریکہ میں آسٹن کے نزدیک مقتدر اعلیٰ وفاقی حکومت نہیں بلکہ وفاقی حکومتوں کے مجموعہ کی اکثریت ہے۔

۴۔ اقتدار اعلیٰ کے چند خواص

اسی طرح آگے چل کے آسٹن نے بودین۔ ہابس وغیرہ کی پیروی میں اقتدار اعلیٰ کے چند خواص گنائے ہیں یعنے یہ کہ :-

(۱) **اقتدار اعلیٰ ناقابل تقسیم ہے** ۔ وہ کہتے ہیں کہ اقتدار اعلیٰ بلحاظ اپنی نوعیت ہی کے ناقابل تقسیم ہوتا ہے ۔ ورنہ مملکت میں ایک مرضی نہیں بلکہ کئی مرضیاں ہونے کی وجہ سے دوئی ہو جائیگی ۔ یہ صحیح ہے کہ بعض مملکتوں اور حکومتوں میں اختیارات کی تقسیم ہوتی ہے لیکن تقسیم اختیارات تقسیم اقتدار اعلیٰ نہیں بلکہ اقتدار اعلیٰ کے اختیارات کی تفویض ہوتا ہے ۔ مقتدر اعلیٰ جماعت اگر چاہے تو ان اختیارات پر تصرفات کر سکتی ہے ۔

(۲) **اقتدار اعلیٰ پر کوئی قانونی روک نہیں ہوتی** ۔ گو واقعتاً بہت سے روک ہوں مثلاً خوف بغاوت یعنے احکام اگر حد سے زیادہ ناقابل برداشت ہو جائیں تو محکومین ان کی پابندی نہیں کرتے ۔ ہر برتر شخص یا جماعت اس واقعہ سے اچھی طرح واقف ہوتی ہے اسی طرح بعض افعال ہر مقتدر اعلیٰ کے لئے بھی ناممکن ہیں ، مثلاً کسی مرد کا عورت بنا دینا ۔ بین قومی تعلقات سے بھی ہر مقتدر اعلیٰ پر روک رہتی ہے ۔ مثلاً اگر کوئی مملکت محض علمی اور اخلاقی ترقی پر اپنے سارے ذرائع صرف کر دے تو ایک دوسری چھوٹی مملکت کے ہاتھوں جس نے فوجی تیاری میں کمال حاصل کیا ہو تباہ ہو جائے گی اس طرح مقتدر اعلیٰ شخص یا جماعت اپنی خصلت و کردار کے خلاف بھی کوئی فعل نہیں کر سکتی ۔ مثلاً خلیفۂ اسلام ، اسلام کو ممنوع قرار دے سکتا تھا نہ مسولینی رومن کیتھولک عیسائیت کو ۔ آسٹن ان تمام حد بندیوں یا قیود سے جو مقتدر اعلیٰ پر فی الواقع ہوتے ہیں خوب واقف تھا اور بہت متاثر بھی ان کو تسلیم کرتے ہوئے اس نے یہ فرق دکھلانا چاہا کہ مقتدر اعلیٰ پر کوئی قانونی روک نہیں ہوتی یعنے مملکت میں کوئی جماعت ایسی نہیں ہوتی جو اس کے احکام یا قوانین کو ناجائز اور خلاف قانون قرار دے سکے ۔ ججوں کا فریضہ اس کے نزدیک قانون کی تعبیر و اطلاق قوانین ہے چاہے کوئی جج ذاتی طور پر کسی قانون کو کتنا ہی ناپسند کرے لیکن اس پر عمل کرنا اس کا فریضہ ہے اگر مقتدر اعلیٰ پر کوئی قانونی روک ہو سکے تو پھر مقتدر اعلیٰ عادتاً کسی دوسرے کا مطیع ہو جائے گا اور مقتدر اعلیٰ ہی نہیں رہے گا اسی طرح آسٹن کے نزدیک ۔

(۳) **مقتدر اعلیٰ کو نہ کوئی حق حاصل ہوتا ہے اور نہ اس پر کوئی فرائض عاید ہوتے ہیں** ۔ یعنے وہ حقوق و فرائض سے بالاتر ہے کیوں کہ ہر قانونی حق اور اس کے متلازم تصور کے لئے تین فریق ضروری ہوتے ہیں شخص جس کو حق حاصل ہو شخص جس پر فرض عاید ہو اور مقتدر اعلیٰ جو حق عطا اور

فرض عاید کرسکتا ہے ایسا حق یا فرض جس کی پابندی تہدید اور سزا کے ذریعہ کرائی جاسکے۔ بہ الفاظ دیگر چونکہ مقتدر اعلیٰ حقوق و فرائض کا منبع ہوتا ہے اور ان کی حفاظت کرتا ہے اس لئے اس کے خود کوئی حقوق و فرائض نہیں ہوتے اور جس طرح مقتدر اعلیٰ حقوق و فرائض کا منبع و ماخذ ہوتا ہے۔ اسی طرح۔

(۴) مقتدر اعلیٰ تمام قوانین کا ماخذ ہوتا ہے۔ یعنے بغیر مقتدر اعلیٰ کے کوئی قانون ہو نہیں سکتا۔ مقتدر اعلیٰ ہی تمام قوانین کا ماخذ ہے۔ قانون اسی کے احکام یا اسی کی مرضی کے مظہر ہوتے ہیں۔ سارے قوانین اسی سے نکلتے ہیں اس لئے مقتدر اعلیٰ کا وجود قوانین سے پہلے ہونا ضروری ہے۔

الحاصل آسٹن کے نزدیک مقتدر اعلیٰ ایک ایسا انسانی برتر شخص یا جماعت ہے کہ جس کی کسی آزاد سیاسی معاشرہ کی اکثریت عادتاً اطاعت کرتی ہے اور جو کسی ایسی ہی برتر شخص یا جماعت کی عادتاً مطیع نہیں ہوتی۔ اقتدار اعلیٰ کی خصوصیتیں یہ ہیں کہ وہ ناقابل تقسیم ہے۔ کوئی قانونی روک اس پر نہیں اور قانونی حقوق و فرائض سے وہ بالا ہے۔ اور جس طرح وہ حقوق و فرائض کا ماخذ و منبع ہے اسی طرح تمام قوانین کا وہی معین اور تنہا ماخذ ہے۔

۱۵۔ قانون کی تین خصوصیتیں۔

قانون آسٹن کے نزدیک ایسے ہی مقتدر اعلیٰ کی مرضی کا مظہر یا اوس کا حکم ہے اسی وجہ سے آسٹن نے قانون کے بھی تین خصوصیتیں گنائے ہیں۔

(۱) یہہ کہ وہ قانون ہدایتی ہوتا ہے یعنے قانون ایک ایسا قاعدۂ عمل ہوتا ہے جس پر عمل کرنے کے لئے کسی آزاد سیاسی معاشرہ کے ارکان کو ایسے معاشرہ کا ایک معین انسانی برتر شخص یا جماعت یعنے مقتدر اعلیٰ ہدایت کرتا ہے۔ قانون کے ایسے معین انسانی برتر شخص یا جماعت کی ہدایت ہونے کی وجہ سے وہ قانون الہی اور قانون قدرت سے ممتاز ہوتا ہے۔

(۲) قانون کی دوسری خصوصیت یہہ ہے کہ وہ حکمی ہوتا ہے یعنے قانون حکم ہوتا ہے یا بہ الفاظ دیگر مقتدر اعلیٰ اپنی مرضی یا خواہش کے اظہار کے ساتھ ہی اس کی تہدید کا بھی اظہار کر دیتا ہے۔ کہ اگر اس مرضی پر عمل نہیں کیا جائے تو سزا دیجائیگی۔

(۳) تیسرے یہ کہ قانون عام ہوتا ہے یعنے اس سے بالعموم ایک قسم کے تمام افعال کرنے یا نہ کرنے کا حکم ہوتا ہے۔

اب ہمیں مختصر طور پر پہلے آسٹن کے نظریۂ اقتدار اعلیٰ پر تنقید کرنی چاہیئے پھر اس کی قانون کی (ماہیت) اور تعریف پر نقادانہ نظر ڈالنی چاہیئے اور آخر میں ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ہمیں قانون کی صحیح ماہیت دریافت کرنے میں آسٹن اور تحلیلی اسکول کے اساتذہ سے کتنی مدد ملتی ہے۔

۱۶۔ آسٹن کے نظریہ پر تنقید

آسٹن کے نظریۂ اقتدار اعلیٰ میں بہت کم صداقت اور بہت زیادہ غلطیاں ہیں۔ آپ پہلے آسٹن کے اس مقولہ پر غور کیجیئے کہ انگلستان میں اقتدار اعلیٰ۔ دارالامرا اور رائے دہندوں میں ہے۔ اس قول کی ایک غلطی تو یہ ہے کہ اگر یہ آج کل بھی صحیح ہے تو یہ لغو نتیجہ نکلتا ہے کہ آج کل جبکہ ہر بالغ شخص کو چاہیئے وہ مرد ہو کہ عورت حق رائے دہی حاصل ہے انگلستان میں کل بالغ مرد اور عورت مقتدر اعلیٰ اور کل نابالغ لڑکے اور لڑکیاں ماتحت ہیں اس سے قطع نظر مقتدر اعلیٰ کو بادشاہ دارالامرا، اور رائے دہندوں میں کہنا اور دارالعوام کو حذف کر دینا بقول برائس نہ صرف قانون بلکہ تاریخ کے بھی خلاف ہے۔ انگلستان کے قانون کی رُو سے اقتدار اعلیٰ آسٹن کی اس جماعت میں نہیں ہے۔ تاریخ کی رو سے بھی ان دونوں میں اقتدار اعلیٰ نہیں ہے۔ اور دارالعوام کو حذف کرنا بالکل حال کے خلاف ہے۔ نیز رائے دہندوں میں اقتدار اعلیٰ کہنا واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ بقول برائس انگلستان کے رائے دہندہ قانون سازی نہیں کرتے اور نہ ان کے پاس قانون سازی کے کوئی ذرائع موجود ہیں۔ انقلابی سے انقلابی قانون کے لئے ان کی منظوری درکار نہیں ہوتی۔ اور یہ انگلستان میں بالکل ممکن ہے کہ ایک ایسا قانون بنا یا جائے جو ⅔ رائے دہندوں کو سخت ناپسند ہو لیکن وہ برابر اسی طرح اور اس جیسے قانون کی قوت اور وقعت رکھے گا۔ جس کے خلاف ایک بھی رائے دہندہ نہ ہو۔ پارلیمنٹ قانوناً ایسے بھی فعل کر سکتی ہے جس کی رائے دہندوں کا پسند کرنا یا اجازت دینا تو کجا یہ فعل ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہ گذرا ہو۔ مثلاً (Septennial Act) کا وضع کرنا جس کی رو سے پارلیمنٹ نے اپنی زندگی تین سال

کی کرلی کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو رائے دہندے یقیناً اس کو شکست کر دیتے ۔

انگلستان ہی کی مثال میں جس سے آسٹن انگریز ہونے کی وجہ سے بخوبی واقف تھے اور جہاں بہ نسبت دوسرے ممالک کے اقتدار اعلیٰ کا تعین کہیں زیادہ آسان ہے جب آسٹن سے اتنی بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں تو ظاہر ہے کہ کہیں نہ کہیں اس کے نظریہ میں بہت بڑی خامی ہے اور دراصل خامی ہے بہت بڑی۔ اور اس کو شاید سب سے پہلے ڈائسی نے بتلایا ہے وہ یہ کہ آسٹن نے قانونی اقتدار اعلیٰ اور سیاسی اقتدار اعلیٰ میں فرق نہیں کیا ہے۔ عوام یا رائے دہندوں کو آج کل ہر جمہوریت میں سیاسی اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ گو وہ قانونی مقتدر اعلیٰ جماعت کو منتخب کرسکیں اور حکومتوں میں ہیر پھیر کرتے ہیں لیکن ان میں خود قانون سازی کے نہ کوئی اختیارات ہیں اور نہ اس کے لئے ان میں کوئی ذرائع حاصل ہوتے ہیں اس لئے آج کل اساتذہ سیاسی اور قانونی مقتدر اعلیٰ میں فرق کرتے اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں ۔

برائیس قانونی مقتدر اعلیٰ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں ۔

"مقتدر اعلیٰ وہ شخص یا جماعت ہے جس کی ہدایتوں کو قانون، قانونی قوت عطا کرے۔ وہ شخص یا جماعت جس میں استحقاقاً آخری قوت عام قواعد یا منفرد قواعد یا احکام کے دینے کی ہوتی ہے اور جس (شخص یا جماعت) کی قوت خود قانون کی عطا کردہ قوت ہوتی ہے ۔

مقتدر اعلیٰ کو خود قانون قوت عطا کرتا ہے غور کیجئے اور دیکھئے کہ یہ تعریف آسٹن کی تعریف سے جدا ہے۔ آسٹن کی تعریف میں مقتدر اعلیٰ کی قوت سے قانون کی قوت ہے۔ مقتدر اعلیٰ ہی کے احکام قانون ہیں۔ وہی قانون بناتا ہے اس تعریف میں مقتدر اعلیٰ کی قوت قانون سے ہے۔ اور مقتدر اعلیٰ خود قانون کا ایک حصہ ہے ۔

بات یہ ہے کہ ہر مملکت کے لئے جس کی حیثیت قبائلی حیثیت سے زیادہ ہو کوئی دستور ضروری ہے۔ عوام کو سیاسی اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے ۔ وہی دستور بناتے ہیں۔ اور وہی قانون سازی کے اختیارات ایک معین شخص یا جماعت کو سپرد کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عوام میں

بھی سیاسی اقتدار اعلیٰ کسی خاص شخص یا جماعت کو بوجہ شخصیت اور وجاہت کے حاصل ہوتا ہے۔ یہی شخص یا جماعت قانون ساز جماعت میں شریک ہوجاتے ہیں اور بمرور زمانہ کے بعد بھی جس شخص یا جماعت کو سیاسی اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے اسی کو قانون ساز جماعت میں غالب حصہ بھی ملتا ہے ہمیں مضبوطی سے ذہن نشین کرنے کی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ ہر مملکت میں ایک دستور ہوتا ہے یہ دستور وہ لوگ جنھیں سیاسی اقتدار حاصل ہوتا ہے بناتے ہیں اور ہر دستور کی رو سے ایک معین شخص یا جماعت کو قانون سازی کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں بہ الفاظ دیگر ہر دستور میں ایک معین قانون ساز شخص یا جماعت ہوتی ہے۔ یہی قانون بناتی ہے۔ اسی کی ہدایتوں یا احکام کو قانون کی قوت ہے اس کا قانون نظم۔ امن اور یکسانیت کے لئے معین ہونا ضروری ہے۔ اور آسٹن کے ایک معین شخص یا جماعت پر بار بار اصرار کرنے کا فائدہ یہی ہے پس اگر ہم آسٹن کے نظریہ قتدار اعلیٰ میں قانونی اور سیاسی اقتدار اعلیٰ کا فرق کردیں اور اس کے نظریہ کو صرف قانونی اقتدار اعلیٰ سے متعلق سمجھیں تو یہ نظریہ فائدوں سے خالی نہیں۔ بہ الفاظ دیگر آسٹن کا قانون کو ایک معین شخص یا جماعت کی مرضی کا مظہر کہنا فائدوں سے خالی نہیں۔ اس کا ایک فائدہ تو مثلاً یہی ہے یہ آج کل کے حالات کے مطابق ہے اور دوسرے یہ کہ اس سے قانون اور اخلاق وغیرہ میں واضح فرق ہوجاتا ہے نیز نظم و یکسانیت کے فوائد بھی قانون والوں کو حاصل ہوتے ہیں۔

۱۷۔ اقتدار اعلیٰ کے خواص پر ایک نظر

اب ہمیں قانونی اور سیاسی اقتدار اعلیٰ کے فرق کو نظر رکھتے ہوئے آسٹن کے بیان کردہ اقتدار اعلیٰ کے خواص پر ایک سرسری نظر ڈالنی چاہیئے سو اگر قانونی مقتدر اعلیٰ خود قانون یا نظام قانون کا ایک حصہ ہو تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں اس پر کوئی قانونی روک نہ ہو۔ بہ الفاظ دیگر مقتدر اعلیٰ پر قانونی روک ہوسکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انگلستان میں اقتدار اعلیٰ پر کوئی قانونی روک نہیں ہے۔ اور پارلیمنٹ کے قانون سازی کے اختیارات بغیر کسی قانونی روک کے ہیں لیکن سوائے انگلستان کے شاید ہی کسی ملک میں اقتدار اعلیٰ قانونی روک سے خالی ہے امریکہ میں قانونی اقتدار اعلیٰ پر یقیناً قانونی روک ہے۔

اس طرح اقتدار اعلیٰ قابل تقسیم بھی ہوسکتا ہے۔ دستور کی رو سے اس کی تقسیم کی جاسکتی ہے مثلاً امریکہ میں وفاقی حکومت اور ملکتوں کی حکومت میں قانونی اقتدار اعلیٰ منقسم ہے۔

یہ صحیح ہے کہ قانونی اقتدار اعلیٰ حقوق و فرائض سے بالا ہوتا ہے اس کے کوئی حقوق و فرائض نہیں ہوتے۔ بلکہ اسی سے حقوق کی حفاظت اور فرائض کی پابندی کرائی جاتی ہے لیکن تاہم ہمیں زیر بحث فرق کے لحاظ سے ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ مملکت میں محض اقتدار اعلیٰ ہی نہیں ہوتا۔ قانونی مقتدر اعلیٰ یہ نہیں کہہ سکتا کہ (L'Etat c'est moi) بالفاظ دیگر قانونی مقتدر اعلیٰ مملکت کا ایک جزو یا حصہ ہوتا ہے۔

۱۸۔ آسٹن کی تاریخ سے بے اعتنائی

کیا تمام قوانین کا ماخذ مقتدر اعلیٰ ہی ہے؟ کیا مقتدر اعلیٰ کا وجود قوانین سے پہلے ضروری ہے؟ بالفاظ دیگر کیا آسٹن کا یہ قول صحیح ہے؟ آسٹن نے تاریخ سے جو خوفناک غفلت برتی یہ قول اسی کا نتیجہ ہے اور اس کی یہ رائے تاریخی اساتذہ کی رائے کی بالکل ضد ہے۔ تاریخی اساتذہ کی رائے میں قانون کا وجود مقتدر اعلیٰ کے وجود سے پہلے ہوتا ہے۔ قانون کا وجود پہلے اس لئے کہ قانون معاشرتی اور سماجی ضرورتوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے آسٹن کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ اس کو معاشرہ یا سماج کی ابتدائی ضرورتوں سے بحث نہیں۔ مثلاً سامنڈ کہتے ہیں کہ مملکت یا مقتدر اعلیٰ سے پہلے اگر کوئی قواعد ہوں تو وہ قانون سے بہت مشابہ سہی، قانون کے تاریخی ماخذ سہی لیکن وہ خود قانون نہیں ہو سکتے۔ اس کی مثال یہ ہوگی کہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہزارہا سال قبل بندر اور انسان میں کوئی فرق نہیں تھا لیکن کیا ضروری ہے کہ ہم ابھی انسان کی تعریف ایسے الفاظ میں کریں جس میں بندر کا عنصر ضرور آئے ابتدائے معاشرت یا ابتدائے ارتقاء میں دو چیزوں کا ماخذ ایک ہی سہی لیکن ارتقاء کے بعد ان میں ضروری فرق پیدا ہو جاتے ہیں۔ تو کیا ماخذ کے ایک ہونے سے ان ضروری فرقوں کو نظرانداز کرنا غلطی نہیں؟ یہ صحیح ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ جدید مملکتوں میں قانون عام طور پر مقتدر اعلیٰ ہی سے نکلتا ہے۔ وہی قانون کا ماخذ ہوتا ہے۔ اسی لئے بھی تو ہم نے مانا ہے کہ آسٹن کا قانون کو ایک معین شخص یا جماعت یعنے مقتدر اعلیٰ کی مرضی کا مظہر کہنا فائدوں سے خالی نہیں۔ لیکن تاہم اگر ہمیں قانون اور مقتدر اعلیٰ کے درمیانی تعلق کو صحیح طور پر سمجھنا ہے تو ہم ہرگز اس تاریخی ترتیب کو فراموش نہیں کر سکتے کہ قوم نے پہلے معاشرتی اور سماجی ضرورتوں کی وجہ سے قانون بنانا اور پھر اپنے میں سے ایک جماعت کو قانون سازی کے اختیارات دیئے حتیٰ کہ آج کل قانون تقریباً تمام تر مقتدر اعلیٰ ہی کے ذریعہ

وضع ہوتا ہے کیونکہ اس تاریخی ترتیب کو پیش نظر رکھنے سے واضح طور پر قانونی اور سیاسی مقتدر اعلیٰ کا فرق سمجھ میں آتا ہے اور
جس فرق کا ذکر ابھی جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے نہ صرف مقتدر اعلیٰ کو کسی بھی دستور میں صحت کے ساتھ متعین یعنے (enacted
کرنے کے لئے ضروری ہے بلکہ اس کے خواص کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے بھی

۱۹ ات آسٹن کی تعریف قانون پر اعتراض

بنتھم اور آسٹن کی قانون کی تعریف پر کہ وہ حکم مملکت ہے تین زبردست اعتراض ہوتے ہیں جبکہ ہمیں یہ یاد
رکھنا چاہیئے کہ بنتھم اور آسٹن کی قانون کی اس تعریف سے یہ مراد ہوتی ہے کہ قانون کو مملکت نے بنایا ہے اور اس کی
پابندی کلیتاً مملکت کی قوت ہی پر موقوف ہوتی ہے یعنے سزا کے اس خوف پر جو خلاف ورزی کرنیوالوں کو دلایا جاتا ہے،
اور اسی لئے قانون کی جو پابندی کی جاتی ہے وہ محض سزا کے خوف کی وجہ سے ہوتی ہے پہلا اعتراض اس تعریف اور اس
نظریہ پر یہ ہے کہ اس سے قانون کے ماخذ کی غلط توجیہہ ہوتی ہے ۔ کیونکہ بہت سی قومیں ایسی گذری ہیں کہ ان میں قانون رائج
تو ہوتا ہے لیکن کوئی ایسی مملکت یا مقتدر اعلیٰ نہیں ہوتا جو اس طرح خوف سزا دلا کر قانون کی اطاعت کرائے اور
اکثر ممالک میں قواعد یا قوانین کا اکثر حصہ جس سے افراد یا جماعت ہائے اشخاص کے باہمی تعلقات منضبط
ہوتے ہیں حال حال تک رواج یعنے ایسے طویل عمل پر جس کو ہر شخص سمجھتا اور جس کی ہر شخص پابندی کرتا ہے مبنی
رہا ہے ان ممالک میں رواج قانون تھا اور ہے ۔ اور کسی مقتدر اعلیٰ کی جانب سے اس کے
اظہار اور اعلان کی اس کی پابندی کے لئے ضرورت نہیں ہوتی ۔ آسٹن کی جانب سے اس کا جواب
یہہ دیا جاتا ہے کہ آسٹن کو ایسے معاشرہ یا سماج سے بحث نہیں جس کی حالت ابتدائی ہو ۔ اس کا ایک جواب
تو یہہ ہے کہ اس جواب سے خود اُس کی تعریف قانون کے یک رخی اور غیر مکمل ہونے کا اعتراف ہوتا ہے
اور دوسرے یہہ کہ قانون کا ماخذ سمجھ میں نہیں آتا ۔

دوسرا اعتراض قانون کی اس تعریف اور نظریہ پر یہہ ہے کہ جدید مملکتوں میں بھی قوانین
کا اکثر حصہ ایسا ہوتا ہے کہ ان کی شکل اور نہ ان کے معنوں کے لحاظ سے انہیں احکام کہا جا
سکتا ہے ۔

مثلاً کسی بھی جدید ترین مملکت کے ان قوانین پر نظر ڈالئے جن سے شہریوں کے باہمی خانگی تعلقات

منضبط ہوتے ہیں مثلاً تجارتی اور دیگر معاہدات کے متعلقہ شرائط ان معاہدوں کی تعبیر۔ ان سے جو ذمہ داری پیدا ہوتی ہے یا جائداد کے حقوق، وراثت اور ورثا اور وصیتوں سے برتاؤ کے طریقے۔ قانون کے اس بڑے حصہ کو احکام نہیں کہہ سکتے یہہ بڑا حصہ احکام پر مشتمل نہیں۔ یہ تو وہ اصول ہیں جن کو مذہب رواج یا عدالتوں نے ایجاد کیا ہے۔ عوام نے اس کو پسند کیا اور ان پر عمل کرنے لگے۔ اور قانونی مقتدر اعلیٰ اپنے قیام اور مضبوطی سے قیام کے بعد ہی عوام کی پسندیدگی کی وجہ سے مملکت کی قوت سے ان کی پابندی عدالتوں کے ذریعہ کرانے لگا۔ اس طرح پر ظاہر ہے کہ قوانین کے اس حصہ کو صحیح معنی میں۔ نہ اس کی شکل اور نہ اوس کے معنے یا مواد کی رو سے احکام کہہ سکتے ہیں۔ اور یہہ واقعہ آسٹن والوں کے اس جواب سے بھی نہیں بدل سکتا کہ اس قسم کے قوانین کو احکام اس لئے کہنا چاہیئے کہ جو کچھ مقتدر اعلیٰ روا رکھے وہی اس کے احکام ہیں۔ موجودہ قوانین میں صرف تعزیراتی قوانین ہی ایسے ہیں۔ جن کی شکل گو معنی نہیں احکام کی ہے۔ اس طرح پر قانون کی یہ تعریف کہ وہ حکم مملکت ہے موجودہ قوانین کے بھی ایک بڑے حصہ پر بھی صادق نہیں آتی۔ اور اسی لئے جدید مملکتوں کے قوانین کی تعریف کی حیثیت سے بھی غلط ہے۔

تیسرا اعتراض اس تعریف پر یہہ ہے کہ یہ غلط ہے کہ قوانین کی اطاعت محض یا زیادہ تر خوف کی وجہہ سے کی جاتی ہے۔ قوت سے مملکت کا وجود نہیں ہوا ہے اور نہ مملکت کی اساس صحیح معنی میں قوت پر ہے۔ مملکت کی بنیاد تو اس صداقت پر ہے کہ انسان ایک معاشری ہستی ہے۔ وہ اپنی ساخت کے لحاظ سے باہم مل کر رہنے ایک دوسرے کی نقل کرنے بہت باتوں کو روا رکھنے اور بہت سے پسندیدہ امور کی اطاعت کرنے پر مجبور ہے۔ انسانوں کی ساخت ہی کے انہی خصوصیتوں پر مملکت کی اساس قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ صرف یہ سچ ہے بلکہ بدیہی امر ہے کہ قوانین کی اطاعت کرانے مملکت کی قوت ضروری ہوتی ہے۔ ایسی قوت کے استعمال کی قابلیت سے مملکت کی شیرازہ بندی قائم رہتی ہے۔ لیکن ہمیں پوچھنا چاہیئے کہ مملکت قوت کا استعمال کرنے پر کیوں اور کس طرح قادر ہوتی ہے اس کا جواب یہی ہے کہ ایک منظم اور معمولی مملکت میں وہی اثرات اور رجحانات جن کی وجہ سے انسان باہم مل کر رہنے لگے۔ ان کو باہم ملا کر رکھتے بھی ہیں اور ان کے ہاتھوں ان کی اپنی پسند اور مرضی اور ارادہ سے

مملکت کو وہ قوت اور قوت حاصل کرنے وہ روپیہ عطا کرتے ہیں جو مملکت کے اغراض کے لئے ضروری ہوتی ہے
تاریخ میں جن ممالک میں خودسریاں قائم بھی ہوئی ہیں اور میکسیکو اور جنوبی امریکہ کے بعض ممالک میں جو اب بھی
قائم ہوتی رہتی ہیں تو یہاں بھی ہمیں بھولنا نہیں چاہیئے کہ مملکت کی بنیاد محض قوت پر نہیں ہوتی۔ ان خودسر
حکمرانوں کو فوج کی تائید حاصل ہوتی ہے اور فوج اور نیز عوام کے ایک حصہ کی پسند اور مرضی ہی سے وہ راج
کرتے ہیں اور پھر یہ بھی ہے کہ انہیں چونکہ عوام کی اکثریت کی مرضی یا پسندیدگی حاصل نہیں ہوتی، ان کی پائیداری
بہت ہی کم ہوتی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ محض قوت در اصل مملکت یا قانون کے لئے بہت ہی ناپائیدار
اساس ہے۔

اس طرح پر ان تین اعتراضوں میں ہم نے دیکھا کہ نہ صرف تاریخ کی رو سے بلکہ نفسیاتی اور عمرانیاتی
نقطۂ نظر سے بنتھم اور آسٹن کی قانون کی تعریف اور نظریہ کچھ زیادہ وقیع ثابت نہیں ہوتا۔ مختصر اور عام
تعریفیں بالعموم وقیع نہیں ہوتے۔ گو یہ کم الفاظ میں ہوتے ہیں لیکن آسان نہیں ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت
پر زیادہ مبنی نہیں ہوتے۔ بلکہ مصنوعی ہوتے ہیں۔ اور ان کے مختصر الفاظ میں بہت سے مغالطے ہوتے
ہیں اور انسان اور معاشرت کی توجیہہ ان آسان اور مختصر تعریفوں سے ہونا معلوم۔

آسٹن کی قانون کی تعریف پر تنقید کو ختم کرنے سے پہلے ہمیں اس پر ایک اور اہم اعتراض کو
ملحوظ رکھنا چاہیئے وہ یہ کہ چونکہ بین قومی قانون اور نیز قانون دستوری کے ایک بڑے حصے یعنے
دستوری روایات کو نافذ کرنے معینہ اور علانیہ تہدید نہیں ہوتی اور نہ یہ ایک آزاد سیاسی معاشرہ
کے مقتدر اعلیٰ کی مرضی کے مظہر ہوتے ہیں، اسی لئے آسٹن بین قومی قانون اور نیز دستوری روایات
کو قانون ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس طرح ان کی تعریف سے قانون کا یہ بڑا اور اہم حصہ
بھی نکل جاتا ہے اور اس طرح پر بھی ان کی قانون کی تعریف یکرخی اور غیر مکمل ہو جاتی ہے۔

۲۔ قانون کی ماہیت کی دریافت

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارا اصلی مسئلہ قانون کی ماہیت کی دریافت ہے۔ یعنے ہمیں اس
سوال کا جواب دینا ہے کہ قانون کیا ہے اس کے متعلق ہم نے دیکھا کہ انگلستان کے سوائے یورپ کے

اکثر ممالک کے اساتذہ کے نزدیک قانون ایک مطلق عالمی اور اخلاقی اصول کا مظہر ہے یعنے قانون وہی ہے جو فطرت یا عقل انسانی کا سکھایا ہوا ہے یا اس کا مظہر ہے۔ قانون کی ماہیت میں فطرت یا عقل انسانی کے دخل سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اس سے قانون کی ماہیت کا پوری طرح پتہ نہیں چلتا۔ کیوں کہ ایک تو محض فطرت اور عقل انسانی کو قوانین کی اساس قرار دینے اور منطقی نتائج نکالنے سے قانونی نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ مفید باتیں معلوم نہیں ہوتیں۔ بلکہ ہم مجردات کے بھول بھلیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں کیوں کہ تمام قوانین کی جان تجربہ ہے نہ کہ منطق۔ اور دوسرے یہ کہ محض فطرت یا عقل انسانی کسی مجموعۂ قوانین کی اساس نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ ان کے تبلائے ہوئے اور سکھلائے ہوئے قوانین تجربہ کی کسوٹی پر بھی پورے نہ اترے ہوں۔ اس طرح پر یورپ کے اکثر اساتذہ کی قانون کی ماہیت کی یہ تعریف غیر مکمل اور ادھوری ہے۔ اور یہ ایس لئے بھی کہ اس تجربہ سے استناد ساقط ہے اسی طرح ہم نے دیکھا کہ انگریزی اساتذہ قانون کو مرضی کی پیداوار کہتے ہیں۔ یعنے قانون وہ قاعدۂ عمل ہے۔ جس سے مقتدر اعلیٰ کی مرضی کا اظہار ہوتا ہے۔ یا قانون وہ قاعدۂ عمل ہے جو حکم مملکت ہوتا ہے ان کے اس نظریہ کو حکمی نظریۂ قانون کہتے ہیں۔ اس کی خامیوں مثلاً سیاسی اور قانونی مقتدر اعلیٰ کا فرق نہ کرنے یا اس سے قانون کے ماخذ کی غلط توجیہہ ہونے یا موجودہ مملکتوں میں بھی بہت سے قوانین مثلاً معاہدہ، وراثت، وصیت یا ازدواج کے حکم مملکت نہ ہونے کے واقعہ سے اگر ہم قطع نظر کر جائیں تو اس نظریہ کا مغز یا نچوڑ یہ نکلتا ہے کہ قانون کی ماہیت جبر ہے۔ یعنے قانون وہ قاعدۂ عمل ہے جس کی بالجبر اطاعت معینہ اور معلنہ تہدید کے ذریعہ کرائی جاتی ہے۔ اس امر سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ قانون کی ماہیت میں جبر کا بھی ایک پہلو داخل ہے۔ اور یہی حکمی نظریہ قانون میں صداقت کا جزو ہے۔ لیکن قانون کی ماہیت کی دریافت میں یہ پوری صداقت نہیں۔ کیونکہ جبر یا قوت قانون کی پوری ماہیت نہیں۔ پہلے تو اس لئے اگر جبر ہی قانون کی ماہیت ہے تو وہ صرف ماتحتوں اور شہریوں پر قابل پابندی ہوگا اور مملکت کے مقتدر ترین شخص یا جماعت پر اس کی پابندی لازمی نہیں ہوگی۔ مثلاً انگلستان میں پارلیمنٹ عدالتوں کے تعزیری اور جبری احکام

کی پابند نہیں اور نہ شاہیوں میں بادشاہ قانونی کارروائیوں کی گرفت میں آسکتے یا اس کے پابند ہو سکتے ہیں ان صورتوں میں کہنا پڑتا ہے کہ قوانین جن کی پابندی ماتحتین سے جبر یا قوت کے ذریعہ کرائی جاتی ہے مقتدر اعلیٰ شخص یا جماعت اس کی پابندی اس وجہ سے کرتے ہیں کہ فی الجملہ وہ قوانین کی پابندی اور اطاعت کرنے کو اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ اس پسندیدگی کے وجوہات مختلف ہو سکتے ہیں مثلاً خوف بغاوت یا رائے عامہ کا لحاظ۔ یا اپنے قول کا پاس۔ غرض پسندیدگی کے وجوہات چاہے مختلف ہوں لیکن ان مملکتوں میں مقتدر اعلیٰ جماعت کی قانون کی پابندی پسندیدگی کی وجہ سے ہوتی ہے نہ کہ جبر یا قوت کی وجہ سے اور شاید بہت سے شہری بھی قانون کی پابندی اور اطاعت پسندیدگی ہی کی وجہ سے تہدید کو سوچے اور اس سے متاثر ہوئے بغیر کرتے ہیں۔

اس طرح جبر یا قوت قانون کی پوری ماہیت اس لئے بھی نہیں کہ قانون بین الاقوام کی پابندی کرانے کو کوئی جبر یا قوت یا تہدید نہیں ہوتی۔ اس لئے تحکمی نظریہ کے اساتذہ اس قانون کو قانون ہی نہیں کہتے بلکہ صرف یا ایجابی اخلاق کی ایک شاخ کہتے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ قانون بین الاقوام کی عملاً وقعت بہت ہوتی ہے۔ ہر صورت میں نہ سہی لیکن بالعموم اس کی پابندی کی جاتی ہے۔ اور اس پابندی یا اطاعت کی وجہ وہی پسندیدگی ہے۔ آزاد مملکتیں اس امر کو پسند کرتے ہیں کہ اثنائے جنگ میں ڈم ڈم کی گولیاں نہ استعمال کی جائیں۔ یا صلیب احمر کی جماعتوں پر آتشباری نہ کی جائے یا غیر جانبدار مملکت کی غیر جانبداری کا لحاظ رکھا جائے اور اس پسندیدگی کے وجوہات وہی اپنے قول یعنے صلحناموں کا پاس اور دنیا کی متمدن ممالک کی رائے عامہ کا لحاظ ہوتے ہیں۔ یہی حال دستوری روایات کا بھی نظر آتا ہے کہ ان کی بھی پابندی کی بنیاد زیادہ تر مقتدر اعلیٰ جماعت کے مختلف اجزا کی پسندیدگی ہے۔

اسی طرح جبر یا قوت قانون کی پوری ماہیت اس لئے بھی نہیں کہ بہت سی صورتوں میں قانون کی تہدید ناکافی ہوتی ہے۔ اور اس کا کوئی علاج یا چارہ کار نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر کسی تجارتی انجمن اتحاد (Trade Union) کے کارندوں نے الف کے کارخانہ کے مزدوروں سے ہڑتال کرا دے

اور قانوناً یہ کارندے شخصی طور پر ذمہ دار بھی ٹھہرائے جائیں تو کیا ان کی شخصی ذمہ داری سے ہڑتال کی وجہ سے الف کے لاکھوں کے نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے؟ اسی طرح اگر کوئی شخص راستہ میں الف کو ٹکر دے کر سخت جسمانی نقصان پہونچائے اور عدالت مقدمہ کے حالات کے لحاظ سے ہزاروں کا ہرجانہ بھی دیدے اور اس شخص میں اس ہرجانہ کی ادائی کی استطاعت نہ نکلے تو کیا ایسی صورت میں قانون کی تہدید ناکافی نہیں؟

۲۱۔ خلاصہ بحث

خلاصہ یہ کہ قانون کی ماہیت کو جبر یا قوت کہنا قانون کی ماہیت کی یکرخی اور غیر مکمل تعریف کرنا ہے۔ جبر یا قوت قانون کی ماہیت کا صرف ایک پہلو ہے اور گو ہم اس کو قانون کی پابندی کرانے کا مناسب ترین ذریعہ بھی سمجھیں، وہ قانون کی پوری ماہیت نہیں۔ قانون کی ماہیت کو پوری طرح بیان کرنے ضروری ہے کہ ہم اس یکرخی تصویر کی تکمیل پسندیدگی سے قانون کی معاشری ضرورتوں کی پیداوار ہونے کے واقعہ سے اور نیز قانون کے مدنظر جو مقاصد ہوتے ہیں ان کے بیان سے کریں۔

پہلے اس نظریہ کو لیجئے جس کی رو سے قانون معاشری یا سماجی ضرورتوں کی پیداوار ہے یہ علم اصول قانون کے تاریخی اسکول کا نظریہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا استاد ساوینی (۱۷۹۹-۱۸۶۱) ایک جرمن ہے۔ (Jhering) جس نے ساوینی سے اس کے قبضہ کے نظریہ میں اختلاف کیا۔ کہا ہے کہ موجودہ علم اصول قانون کی ابتداء ساوینی سے ہوتی ہے۔ قانون کی ماہیت کی بابتہ ساوینی کی رائے کو مختصر ترین الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ قانون کسی شخص کی نہیں بلکہ جمیع اشخاص کی تخلیق ہے اور وہ معاشری اور سماجی ضرورتوں کے موافق ہوتا اور اسی وجہ سے بنایا جاتا ہے۔ وہ مجرد اصول سے نشو و نما نہیں پاتا ہے کیونکہ ابتدائے معاشرت میں ایسے مجرد اصول نہیں ہوتے بلکہ اس کا نشو و نما عملی ضرورتوں کی وجہ سے ہوتا اور معمولی روزمرہ کی ضرورتوں کی وجہ سے بنایا جاتا ہے۔ ایک وقت اسی طرح پر بن جانے کے بعد اس کی پابندی۔ عادت اور نقل کی انسانی خصوصیتوں کی وجہ سے ہونے لگتی ہے۔ قانون کی اس ابتدائی حالت میں بہت زمانہ تک باقی نہیں رہتا بہت جلد اس میں

اصطلاحی عنصر شریک ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کے اطلاق دینے میں اطلاق دینے والے اشخاص ایک حد تک نئے قوانین بناتے ہیں اس طرح پر روایاتی قانون کے ساتھ ساتھ نظائر اور قانون سازی کے ذریعہ بھی قانون ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ماضی کے ساتھ ساتھ حال کی ضرورتوں کا لحاظ ہو جاتا ہے اور روایات اور تغیر کے درمیان ایک تناسب پیدا ہو جاتا ہے جو تمام قوانین کی زندگی کا اہم اصول ہے۔

ساوینی اور تاریخی اسکول کے اساتذہ کا صحیح موقف یہی ہے اور اس کی صداقت عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے چونکہ اس میں حال کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ ماضی کے تجربہ کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کو احتیاط کے ساتھ قدامت پسندانہ موقف کہہ سکتے ہیں۔ بمقابلہ اسکول کے اساتذہ کا موقف بھی یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ مین، ساوینی ہی کے کام کو کرتے اور اس میں اضافہ کرتے نظر آتے ہیں۔

قانون کی ماہیت کی پوری تصویر کھینچنے کے لئے ان مقاصد کا مختصر ذکر کرنا جو قانون کے پیش نظر رہتے ہیں اور جو قانون کے ذریعہ پورے ہوتے ہیں ضروری ہے۔ یہ مقاصد فصل خصومات کے ذریعہ حفظ امن، عدل گستری، کل کی آزادی کے ساتھ ساتھ فرد کی زیادہ سے زیادہ آزادی کا حصول اور اس کی حفاظت اور نیز زیادہ سے زیادہ اشخاص کی زیادہ سے زیادہ خوشی اور خوشحالی کا بہم پہونچانا بیان کئے جاتے اور بڑی حد تک ہوتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر قانون کو جو معاشری ضرورتوں کی پیداوار کہا جاتا ہے تو اس جملہ سے ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ یہ معاشری اور سماجی ضرورتیں واقعۃً ہوتی ہیں۔ اور قانون کے ذریعہ سے ان کو حاصل کیا جاتا ہے۔ یہی قانون کے مقاصد ہوتے ہیں۔ شعوری قانون سازی میں یہی پیش نظر رہتی ہیں۔

اردو کے اسالیب بیان

از جناب سید محمود احمد صاحب بی اے، ال ال بی (عثمانیہ)

جو لوگ کتب کا مطالعہ کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ بعض تحریریں ایسی ہوتی ہیں کہ پڑھتے وقت انسان کا دل پسیجتا ہے۔ آنکھوں میں پانی آجاتا ہو۔ کوئی قصۂ غم اس قدر موثر پیرایہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والا بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا اسی طرح بعض تحریریں ایسی ہوتی ہیں کہ پڑھتے وقت بے ساختہ قہقہہ نکل پڑتا ہے اور قریب کے لوگ دیکھنے لگتے ہیں کہ کتاب پڑھتے پڑھتے ہنسی کیوں آگئی کوئی دیوانگی تو نہیں پیدا ہوگئی؟ بات یہہ ہوتی ہے کہ بعض جگہ کتاب کی تحریر چٹکیاں لینے لگتی ہے۔ پڑھنے والا اس کا اثر قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا اور مجبور ہو کر ہنسنے لگتا ہے۔

یہہ دو متضاد اثرات مختلف اسلوب بیان کا نتیجہ ہیں۔ لکھنے والے کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ پڑھنے والے کو کبھی تڑپا دے کبھی گرما دے اور کبھی ساکت و صامت بنا دے۔

اب اُس طرز بیان کی حقیقت پر غور کیا جاتا ہے جس کا اثر فطرت انسانی پر پڑتا ہے کبھی وہ انسان کو ہنسا دیتا اور کبھی رلا دیتا ہے۔

مافی الضمیر یا دل پر جو کچھ گذرتا ہے اس کی ماہیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یا تو اس کا تعلق محسوسات سے ہوتا ہے یا دوسری ذہنی قوتوں سے حواس انسان کو معلومات حاصل ہوتی ہیں مثلاً وہ دیکھتا ہے، سنتا ہے چکھتا ہے سونگھتا ہے اور لمس سے انسان محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح ذہنی قوتوں سے بھی کام لے کر بہت سی معلومات فراہم کی جاتی ہیں کبھی حافظہ سے کام لے کر اس مواد پر جو خارجی اشیاء سے حواس کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے تخیل کی رنگ آمیزی کی جاتی ہے اور ایسی معلومات حاصل کی جاتی ہیں جو صرف حواس کے ذریعہ حاصل نہ ہو سکتی تھیں۔ گویا علم یا معلومات کے ماخذ تین قرار پائے۔ ایک کا تعلق

بالکلیہ حواس سے ہوتا ہے، دوسرے کا بالکلیہ ذہنی قوتوں سے اور تیسری قسم معلومات کی حواس اور ذہنی قوتوں کے مشترک عمل سے حاصل ہوتی ہیں حواس کے ذریعہ جو خارجی علم ہوتا ہے اس میں بھی دماغ کی بعض قوتیں کام کرتی ہیں لیکن ان معلومات میں جو تمام تر حواس پر مبنی ہوں اور ان میں جو قوای ذہنی کے مرہون ہوں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اسی لئے بعض معلومات کو خارجی اور بعض کو داخلی معلومات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(الف) ذاتی یا داخلی معلومات کے بھی مختلف اجزا ہوتے ہیں یا تو ان کا تعلق انسان کی نفسی جذبات کیفیات خواہشات اور میلانات سے ہوگا مثلاً ان میں غم، غصہ عشق، رشک، حسد، خوشی، مسرت، یاس اور امید کے جذبات کی ترجمانی ہوگی یا نفسی کیفیات کا بیان ہوگا۔ کردار نویسی ان ہی داخلی معلومات سے تعلق رکھتی ہے۔

(ب) دوسرے وہ معلومات ہیں جو بالکلیہ محسوسات سے متعلق ہوں گے مثلاً محسوسات بصر کو لیجئے، انسان باغ کو دیکھتا ہے اس میں سبزہ ہے، درخت ہیں، پھول ہیں، پھولوں میں خوشبو ہے اور اس خوشبو کو پسند کرنے والے کچھ پرندے بھی ہیں، یہ بہار تھی، اس کے بعد خزاں آتی ہے چمن سب اجڑ جاتا ہے فقط ویرانہ ہی ویرانہ رہ جاتا ہے۔ غرض کہ خوشنما مناظر دلفریب فطرتی نیرنگیاں، جھاڑ، پہاڑ، چاند تارے، ندی، نالے، جمادات، حیوانات، غرض کہ خارجی فطرت کے جملہ پہلو پیش نظر ہوتے ہیں۔

(ج) اس خارج کی دنیا کا اثر فطرت انسانی پر جو کچھ پڑتا ہے وہ بھی بیان کا موضوع بن جاتا ہے۔ انسان باغ کو دیکھتا ہے، ہر چیز سبز و شاداب ہے تو وہ خود بھی یا تو مسرت محسوس کرتا ہے یا ان مسرتوں میں اس کا غم اور بڑھ جاتا ہے۔ اس خارجی دنیا سے اس کی اندر کی دنیا میں تلاطم پیدا ہوجاتا ہے اس کے دل کی تاریکی اور زیادہ ہوجاتی ہے۔ ان حالات میں وہ جو کچھ بیان کریگا اس کا تعلق خارج اور ذات کے مشترکہ تجربہ کا نتیجہ ہوگا۔

معلومات کا تیسرا ماخذ بالکلیہ ذہنی ہوتا ہے اس کی مثال علوم ذہنی سے مل سکتی ہے۔ مثلاً فلسفہ ہے۔ فلسفہ میں مابعد الطبیعات، اخلاقیات، نفسیات، جمالیات، منطق داخل ہیں، اسی طرح سائنس نظری ہے جس میں طبیعات کیمیا و ریاضی داخل ہیں، تاریخ بھی ایک ماخذ ہوسکتی ہے جس میں علم سیاسیات و دستور وغیرہ شامل ہیں ان تمام علوم کا تعلق ذہن سے ہوتا ہے۔ ان تمام نظری اور عملی معلومات کی تقسیم میں نے مضمون

زیر بحث کی سہولت کے لئے دو عنوانوں میں کی ہے۔

۱۔ ادب، جس میں نظم، نثر، ڈرامہ، ناول، اور افسانے داخل ہیں۔

۲۔ دیگر علوم جس میں فلسفہ، سائنس، تاریخ، وغیرہ داخل ہیں۔

ادب کا لفظ اگر وسیع معنی میں استعمال کیا جائے تو ان تمام بیان کئے ہوئے معلومات پر حاوی ہوگا۔ اور اگر محدود معنی لئے جائیں تب بھی ادب میں نظم و نثر، ڈراما، ناول اور فسانے تو ضرور داخل ہوں گے، یہ تقسیم اس لئے بیان کی گئی ہے کہ ان تینوں قسم کی معلومات کے اظہار کے لئے ایک ہی طرز بیان سے کام نہیں چل سکتا۔ فلسفہ سائنس، اور تاریخ کی معلومات بیان کرنے میں ایک خاص اسلوب مناسب ہوگا اسی طرح ادب کے مختلف شعبوں میں بھی ایک ہی رنگ کا اسلوب موزوں نہ ہوگا۔

نظم، نثر ڈراما، ناول اور افسانے ان سب میں اسلوب کے رنگ جدا جدا ہوں گے۔ ہم اس وقت صرف ادب کے اسلوب بیان سے بحث کریں گے اور ادب میں بھی خاص کر نثر کا اسلوب بیان ہمارا موضوع ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اصول عام طور پر باہم متعلق ہو جائیں لیکن ہم اس وقت ان اسالیب بیان پر غور کر رہے ہیں جو زیادہ تر اردو نثر سے متعلق ہیں۔

اسالیب بیان پر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی ایک تصنیف موجود ہے۔ مگر اس میں الفاظ کے لحاظ سے اسالیب بیان پر بحث کی گئی ہے۔ اور ہم الفاظ سے زیادہ معنی کے اعتبار سے طرز بیان پر بحث کر رہے ہیں۔

طرز بیان کی قسمیں یہ ہو سکتی ہیں۔

(۱) قنوطی یا رجائی (۲) ظریفانہ یا سنجیدہ (۳) سادہ یا مغلق یا پیچیدہ (۴) فارسی یا عربی کی ترکیبیں ملی ہوئی۔ یا بھاشا و سنسکرت کی۔ (۵) عام روزمرہ کی زبان یا وہ جس میں ادبی شان ہو۔

ان مختلف طرز بیان کے نمونے دیکھیئے۔

غم کا اظہار وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت سیدہ کی حالت کا اظہار کیا گیا ہے۔

"کس کا گھر اور کہاں کا شوہر رات دن مزار مبارک پر بیٹھی آنسو بہاتی، اور جب نیند کا غلبہ ہوتا تو

وہیں باپ کے پائنتی پڑی رہتیں حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ روٹھے جاتے تو وہیں تھوڑا بہت کھالیتیں حضرت علی رضؓ تشریف لے جاتے تسکین دیتے تو ان کے ساتھ گھر آجاتیں مگر جب دل میں ہوک اٹھتی اور رسولؐ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی تو بیتاب ہوکر دیوانہ وار مزار مبارک پر گرتیں اور کہتیں۔ "وہ آج میرا باپ مجھ سے جدا ہوگیا ہے وہ شمع جس نے عرب کے جنگل روشن کر دیئے گل ہوگئی۔ اب دنیا کی مصیبتیں میرے سامنے ہیں اور میں بے ماں کی بچی فاطمہ اس وقت باپ کے فراق میں رو رہی ہوں۔" قیامت خیز تھی وہ رات جس نے میرے سر پر مصیبت کا پہاڑ ڈھایا۔ میری زندگی برائے نام ہے جو اس صدمہ سے بھی ختم نہ ہوئی اے خدا کے سچے رسول میری دعا پر آمین کہہ اے الہ العالمین مصیبت زدہ بیٹی کو اس کے باپ سے ملا دے اور اس کی آنکھیں روشن کر۔" ۵۱

جذباتی تحریر کا نمونہ غدر کے حالات کے سلسلہ میں ایک شخص کی مدح مقصود ہے

"قومیت کا خیال سالہا سال سے مٹ چکا تھا۔ اخوت اور محبت کے اثر دلوں سے محو ہو چکے تھے البتہ مذہب سے محبت ضرور تھی مگر وہ نادان دوست کی محبت سے زیادہ نہ تھی۔ حکومت جا چکی تھی۔ اقبال منہ موڑ چکا تھا۔ دولت سے بہرہ نہ تھا۔ علم پاس نہ تھا۔ اغیار تو اغیار خود یار و مددگار جان کے لیوا تھے۔ آفات کا نزول تھا، ادبار کی چڑھائی تھی ایسے آڑے وقت پر ایسے نازک زمانہ میں ایسے ہنگامہ رستخیز میں جبکہ نفسی نفسی کا عالم اور حرمت و غیرت کا ماتم بپا تھا، اپنے بھائیوں کے کام آنا عین جوانمردی اور اصل انسانیت ہے۔" ۵۲

شبلی نعمانی کا خط بنام عطیہ بیگم۔

"شعراء اور اہل ادب عموماً کنایہ سے نام لینا نہایت بلاغت اور لطافت خیال کرتے تھے جو لوگ جہانگیر بادشاہ کی مدح میں قصیدے لکھتے تھے عموماً اس میں نور جہان کا نام لاتے تھے۔ لیکن ہمیشہ کنایۃً۔ کبھی کسی نے تصریح نہیں کی مثلاً سعیدا کا ایک قصیدہ ہے جس کا ایک شعر یہ ہے۔ اے سایۂ خدا از تو پرنور شد جہاں ؛ بادا ہمیشہ نور خدا سایۂ تو

---

۵۱ ۔ ماخوذ از زہرہ تالیف راشد الخیری ص۳۵

۵۲ ۔ ماخوذ از مقدمات عبدالحق ۔ مرتبہ مولوی مرزا محمد بیگ ص۱۰

اسی اصول پر میرا یہ شعر بھی ہے اور یوں صراحتاً تمھارے لئے خیر مقدم وغیرہ سب کچھ لکھ چکا ہوں۔ اور عطیہ! لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے، میرا ہر رونگٹا اور ہر موئے بدن تمہاری توصیف و تعریف کا ایک شعر ہے۔" [1]

سادہ و رجائی تحریر کا نمونہ۔

"مدت کے بعد خط آیا تسلی بھی، تسکین بھی، خشم و عتاب بھی زخموں پر نمک رکھ دیا۔ اور وہاں نمک پاشی بھی کی۔ خط اچھے اچھے حرفوں والے پیارے پیارے مطلب والے۔ آ۔ بہت راہ دکھائی تجھ کو پہلے آنکھوں سے لگاؤں کلیجے پر رکھوں۔ آنکھوں اور دل پر بھی۔ جو ٹہر کتا ہے اور مجھ تا نکتا ہے۔ تو کس کا نامہ ہے؟ تجھ میں کیا لکھا گیا ہے؟ الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب۔ قاصد پر نثار کیا ہی اچھا پیام لایا ہے ہاں تو نے یہ تاکید کردی ہے کہ میرے مکتوب کا ادب کیا جائے۔ ناپاک ہاتھ نہ لگیں دل و جان سے منظور۔ پیارے نیارے کا خط ہے بھلا اس کی بے ادبی ہو سکتی ہے۔" [2]

ظریفانہ طرز تحریر۔ مچھر کے متعلق۔

"یہ بھنبھناتا ہوا ننھا سا پرندہ بہت ستاتا ہے۔ رات کی نیند حرام کردی ہے۔ ہندو مسلمان، عیسائی یہودی، سب بالاتفاق اس سے ناراض ہیں۔ ہر روز اس کے مقابلہ کے لئے نہیں تیار ہوتی ہیں۔ جنگ کے نقشہ بنائے جاتے ہیں مگر مچھروں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی شکست پر شکست ہوتی چلی جاتی ہے۔" [3]

"موحد دنیا میں اور سیکڑوں ہوتے چلے آئے ہیں۔ مگر توبہ توبہ خدا کسی کو میرے دوست مسٹر موحد جیسا موحد نہ کرے بندۂ خدا کو دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا تھا۔ جب دیکھو اپنے دار التجربہ میں بیٹھے ہیں جب جاؤ، اس کو توڑ اس کو جوڑ رہے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے انڈہ آجاتی ہے مگر وہ اللّٰہ کا بندہ یہ بھی نہیں پوچھتا کہ میاں خیریت سے تو ہو۔"

"اگر باپ دادا نے جائداد نہ چھوڑی ہوتی تو میرے یار کبھی کے محتاج خانہ پہنچا دیئے گئے ہوتے"

"یارمن یہ گھوڑا کہاں سے مار لائے اور لاکر کہاں رکھا ہے کہ دار التجربہ میں کیا خون کا امتحان کر رہے ہو

---

[1] ماخوذ از مقدمات عبدالحق حصہ دوم صفحہ ۱ [2] ماخوذ از سی پارۂ دل تالیف خواجہ حسن نظامی صفحہ ۳ [3] سی پارۂ دل صفحہ ۹۵

یا بجلی سے علاج" ؎

ایسی تحریر کا نمونہ دیکھنا ہو جو سنجیدگی اور ظرافت سے مملو ہو تو غالب کے خطوط" اردوئے معلیٰ" میں دیکھیئے۔ آج گویا وہی اُردو کے بہترین نمونے ہیں۔ گنجلک، ادق اور دیگر قسم کے طرز تحریر کے نمونے" اردو کے اسالیب بیان" مصنفہ ڈاکٹر زور میں مل سکتے ہیں۔ سنجیدہ طرز تحریر دیکھنا ہو تو حالی اور شبلی کی تصنیفات کا مطالعہ فرمایئے۔ ہم چاہتے تھے کہ مختلف رنگ کی تحریروں مثلاً قنوطی، رجائی، سنجیدہ، ظریفانہ وغیرہ میں جو امور تمیز پیدا کرتے ہیں ان کو تفصیل سے تحریرات کے نمونے دیکر بیان کیا جائے مگر یہ ایک مستقل مضمون ہے جس پر آئندہ کسی وقت توجہ کیجائیگی۔

مختلف مصنفین کی تصنیفات کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ ایک کا طرز بیان دوسرے مصنف کے طرز بیان سے جدا ہوتا ہے کسی تصنیف میں قنوطیت اور کسی کی تحریرات میں رجائیت پائی جاتی ہے۔ کوئی غم کے پہلو نہایت خوبی سے بیان کرتا ہے اور کسی کی تحریر میں رجائیت کا عنصر زیادہ نظر آتا ہے کسی کی عبارت بالکل سادہ اور کسی کے بیان میں طوالت اور جملوں کی ترکیب پیچیدہ ہوتی ہے۔ کسی مصنف کی تحریرات میں اضافتیں اور فارسی عربی الفاظ اور ترکیبیں ہوتی ہیں اور کسی کی عبارت میں بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ زیادہ پائے جاتے ہیں کوئی مصنف روزمرّہ کی زبان لکھتا ہے اور کسی مصنف کی تحریرات میں ادبی شان زیادہ ہوتی ہے۔ راشد الخیری کے مصنفات میں غم کا پہلو زیادہ نظر آئیگا جب وہ رنج والم کی تصویر کھینچتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا کا بہاؤ ہے کہ چلا جارہا ہے۔ الفاظ کا انتخاب جملوں کی ترتیب اور عام تحریر کا رنگ، آہ و فغان سے بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ برخلاف اس کے حسن نظامی وغیرہ کے طرز بیان کو دیکھیئے تو معلوم ہوگا کہ عام طور پر مصنف کی تحریرات میں ایک جوش مسرت اور ایک کیفیت راحت ہے جس چیز کو وہ بیان کرتا ہے اس سے مسرت ہی ٹپکتی ہے زندگی کو وہ مصیبت و تکلیف کی جگہ نہیں بلکہ مقام راحت سمجھتا ہے۔ اس کو رات کی تاریکی میں دن کا اجالا نظر آتا ہے۔ یہ ہے قنوطی اور رجائی طرز بیان ہوا۔ ظریفانہ و سنجیدہ طرز بیان کو دیکھیئے جو مصنف ظریفانہ طرز بیان رکھتا ہے اس کی تحریرات ہنسانے والی ہوتی ہیں۔ وہ واقعات کے ان پہلوؤں کو روشن کرتا ہے جن سے زندگی کے بھیانک رخ نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں ان کو پڑھکر انسان محسوس کرتا ہے کہ واقعی دنیا ہنسنے ہنسانے کے لئے ہے اسکی تحریرات سے یہ ہم ہوتا ہے

؎ مضامین فرحت حصہ اوّل ص

کہ دنیا بازیچۂ اطفال سے زیادہ نہیں۔ اس رنگ کے استاد انشاء اللہ خان ملا رموزی، فرحت اللہ بیگ ہیں برخلاف اس کے حالی شبلی وغیرہ کی تحریرات میں سنجیدگی زیادہ ہوتی ہے۔ بعض خوش قسمت مصنف ایسے بھی ہیں جن کی تحریر میں سنجیدگی اور ظرافت دونوں پائے جاتے ہیں جیسے کہ مرزا غالب کے خطوط۔

حسن نظامی کی تحریر اتنی سادہ ہوتی ہو کہ اسکو سہل ممتنع کہہ سکتے ہیں وہ روزمرہ کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ الفاظ سادہ جملوں کی ترکیب غیر پیچیدہ اور کبھی کبھی محاوروں کے چٹخارے۔ لیکن یہہ طرز جملہ اصناف تحریر میں نہیں کام نہیں آسکتا۔ اس کے برعکس، حالی شبلی اور سید کا طرز بیان ادبیات کے زیادہ موزوں ہے۔

کسی مصنف کے اسلوب بیان پر غور کیا جائے تو اس میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں ایک تو الفاظ کا انتخاب و استعمال۔ دوسری چیز ان الفاظ کے معنے اور تیسری چیز جملوں اور خیال کی ترتیب، زندگی کے معمولی واقعات بیان کئے جائیں تو ان کو صاف ستھرے الفاظ میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جہاں زندگی کے حقایق سے بحث ہوتی ہے تو وہاں مصنف کتنی بھی کوشش کرے عام فہم الفاظ اور طرز میں بیان نہیں کرسکتا۔ الفاظ اگر غیر معلق نہ بھی ہوں تب بھی تشبیہات و استعارے اس میں پائے جائیں گے۔ انگریزی زبان میں بہت سے مصنفین مثلاً برنارڈ شاہ وغیرہ ایسے ہیں کہ ان کے شاہکار تصنیفات کا سمجھنا آسان نہیں ہوتا۔ ان کے معمولی الفاظ میں مفہوم کے وہ سمندر پنہاں ہوتے ہیں کہ ان کو سمجھنے کے لئے کافی غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس مضمون میں تخیل کی گلکاریاں ہوں اس کو خواہ کتنے ہی سادہ الفاظ میں بیان کیا جائے۔ آسانی سے سمجھ میں نہیں آئے گا۔

معلوم ہو کہ ہر مصنف کا ایک خاص اسلوب بیان ہوتا ہے۔ اب یہہ امر غور طلب ہے کہ آخر یہ اسلوب بیان کیوں مختلف ہوتا ہے اس کے دو وجوہ قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ ایک وجہہ تو فطری ہوتی ہر شخص فطرتاً خاص جذبات اور خاص میلانات رکھتا ہے یا جیسے جیسے وہ زندگی کے مراحل طے کرتا ہے اس کے جذبات، خواہشات اور میلانات میں تغیر واقع ہوتا رہتا ہے اور اسی تغیر کی وجہہ سے اس کی زندگی کے نصب العین اور نقطۂ نظر میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ جس شخص کی فطرت میں غم زیادہ پیوست ہوتا ہے یا جس کی سرشت و خمیر میں غم کے اجزا زیادہ رہتے ہیں اس کا نقطۂ نظر ہمیشہ قنوطی رہے گا۔

نہ تجربہ نہ علم اس کو رجائی بنا سکتا ہے اور نہ عقل کی رہنمائی اسکو قنوطیت سے ہٹا سکتی ہے ایسے شخص کے طرزِ بیان میں ہر وقت قنوطیت کا رنگ جھلکتا رہے گا۔ اس کے بالکل برعکس رجائیت پسند کی خطرت ہوگی اسی طرح بعض لوگوں کا ذہن بہت سلجھا ہوا ہوتا ہے ان کے معلومات اور ان کے خیالات میں یکرنگی ہوتی ہے۔ ایسے اشخاص کا طرز بیان سلجھا ہوا اور مربوط ہوگا برخلاف اس کے اگر کسی شخص کی معلومات میں انتشار اور اس کے خیالات میں نظم نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ جو چیز بیان کرے گا اس میں بھی کوئی نظم و ترتیب نہ ہوگی معلومات اور تخیل میں پراگندگی ہو تو اسلوب بیان بھی پیچیدہ رہے گا۔

اسلوب بیان کے مختلف ہونے کی دوسری وجہ اکتسابی ہوتی ہے کوئی شخص چند خاص مصنفین کو پسند کرتا ہے اور ان کے اسلوب کی نقل کرنا چاہتا ہے نقالی کرتے کرتے اس کا اسلوب بیان بھی اسی طرح کا ہو جاتا ہے یوں تو کثرت مشق سے ہر شخص کا ایک خاص اسلوب بن سکتا ہے۔

اس سے پہلے بتایا گیا ہے کہ اسلوب بیان بلحاظ موضوع کے بھی مختلف ہو سکتا ہے ڈرامہ میں اسلوب کا رنگ ناول سے جدا اور ناول نویسی کا اسلوب افسانہ نگاری سے کسی نہ کسی طرح مختلف ہوگا۔ دیگر قسم کی ادبی تصانیف کے لئے جو موزون اسلوب ہو سکتا ہے وہ ان دونوں اسالیب سے کچھ نہ کچھ جدا نوعیت کا ہوگا۔

اس وقت ان تمام اسالیب پر تفصیلی روشنی ڈالنی ممکن نہیں ہے آئندہ کسی فرصت میں ان پر تفصیلی بحث کی جائے گی البتہ چند عام اصول بیان کئے جاتے ہیں جو ہر قسم کے اسلوب بیان سے متعلق ہو سکتے ہیں۔

(۱) مصنف کو فطرت کا مطالعہ نہایت غور سے کرنا چاہیئے۔ اگر واقعات کا تعلق خارج سے پایا جائے تو ان کا اسی ترتیب سے بیان ضروری ہے جس ترتیب سے وہ مشاہدہ میں آتے ہیں۔ خارج میں ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ کے ساتھ جو تعلق ہوتا ہے اس تعلق کی بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً وہ چمن کو دیکھے تو اس پر غور کرے کہ سبزہ کو پودوں سے کیا تعلق ہے اور پودوں کو پھولوں سے کیا واسطہ چمن کن چیزوں کا نام ہے اور اس کے اجزا کی ایک دوسرے کے مقابلہ میں کیا اہمیت ہے۔ اسی طرح پہاڑ، دریا، بیابان، چاند، تارے غرض کہ دنیا کی یہ سب چیزیں ایک دوسرے سے کیا تعلق رکھتی ہیں، اسلوب بیان کی عمدگی کے لئے ان سب چیزوں کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

(۲) خارجی اشیاء کا انسان سے کیا تعلق ہے اور ان کے تعلق سے انسان کے دل پر کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں اس پر بھی کافی توجہ کرنی چاہیئے۔

(۳) انسان کے جذبات خواہشات میلانات کی حقیقت کیا ہے ان سے جب کوئی متاثر رہتا ہے تو اس کی نفسی کیفیات کیا ہوتی ہیں مثلاً کسی ایسی بیوہ عورت کی تصویر کھینچنی ہو جس کا خاوند مر گیا ہو تو اس امر پر غور کرنا ہوگا کہ جب کسی عورت کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آئے تو وہ کیا محسوس کرتی ہے اس کے احساس کی جس قدر صحیح ترجمانی ہوگی اس قدر وہ بیان موثر ہوگا جب کسی واقعہ کو بیان کرنا ہو تو پہلے اس کی تصویر آنکھوں کے روبرو لائی جائے اور اس طرح بیان کیا جائے کہ پڑھنے والوں کے سامنے اس کی تصویر کھینچ جائے۔

(۴) الفاظ جہاں تک ممکن ہو سادہ، مانوس، عام فہم استعمال کئے جائیں جملے بھی ممکن حد تک مختصر ہوں اور ان کی ترکیب بھی سادہ رہے۔ زیادہ طویل جملوں سے تحریر کا لطف باقی نہیں رہتا ایسے جملے جلد سمجھ میں نہیں آتے اور پڑھنے والے بہت جلد اکتا جاتے ہیں۔

(۵) محض الفاظ کی سادگی کی خاطر معنی کو قربان نہ کیا جائے۔ الفاظ کی حالت جسم اور معنی کی حیثیت روح کی سی ہوتی ہے جسم سے زیادہ روح کا خیال ضروری ہے۔

نظم کی طرح نثر میں بھی بڑی حد تک شعریت و ادبیت ہونی چاہیئے جب موضوع تخلیقی ہو اور اس کا تعلق زیادہ تر تخیل سے ہو تو ظاہر ہے کہ الفاظ خیال کے بوجھ کو عمدگی سے برداشت نہ کر سکیں گے ان حالات میں معنی کو مقدم رکھنا ضروری ہے۔ دور حاضر کے انگریزی نثر کے بعض شاہکار ایسے ہیں کہ ان کی انگریزی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی۔ حالانکہ اس زمانہ میں انگریزی بقول شخصے پانی ہو گئی جس برتن میں چاہو ڈال دو اسکی شکل برتن کی سی ہو جائے گی معنی کے وزن اور اہمیت کو برقرار رکھتے ہوئے سادہ الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

(۶) جس قسم کا موضوع ہو انداز بیان بھی اسی طرح کا ہو۔ درد و غم کے مضمون کو قنوطی طرز میں بیان کیا جائے تو اس کا اثر ہوگا۔ اسی طرح خوشی و مسرت کے جذبات کا رجائی پیرایہ میں بیان کرنا ضروری ہے سنجیدہ مضامین کو سنجیدہ انداز میں اور ظریفانہ واقعات کو ظریفانہ طرز میں بیان کرنا چاہیئے۔

آخر پر مولانا شبلی کے خیالات کا اظہار مناسب ہوگا جو انھوں نے فن بلاغت سمجھانے کے سلسلے میں

معنی و الفاظ کی مناسبت کے عنوان کے تحت ظاہر فرما دیئے ہیں ۔

"حسن کلام کا ایک بڑا نکتہ یہہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے اور آواز کے مختلف اقسام ہیں مہیب، پر رعب، سخت، نرم، شیریں، لطیف ، اسی طرح الفاظ بھی صورت اور وزن کے لحاظ سے مختلف طرح کے ہوتے ہیں ۔ بعض نرم شیریں اور لطیف ہوتے ہیں بعض سے جلالت اور شان ٹپکتی ہے بعض سے درد اور غمگینی ظاہر ہوتی ہے، اسی بناء پر غزل میں سادہ سہل اور لطیف الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ قصیدہ میں پر زور شاندار الفاظ کا استعمال پسندیدہ سمجھا جاتا ہے ۔ اسی طرح رزم و بزم ، مدح ذم، فخر دادعا، وعظ و پند ہر ایک کے لئے جدا جدا الفاظ ہیں شعراء میں سے جو اس نکتہ سے آشنا ہیں وہ ان مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں اور یہہ ان کی کلام کی تاثیر کا بڑا راز ہے یہی نکتہ ہے کہ سعدی سے رزم اور فردوسی سے بزم نہیں نبھ سکتی ۔ رزم ، بزم ، فخر حسرت شوق ، ہر ایک مضمون کیلئے خاص خاص قسم کے الفاظ موزون ہیں اور انہی الفاظ کو استعمال کرنا چاہیئے"۔ [۵]

مولانا شبلی کے یہہ اصول نثر سے بھی اسی طرح متعلق ہیں جس طرح انھوں نے نظم کی بلاغت کے لئے ضروری قرار دیئے ہیں ۔

اسلوب بیان کی یہہ تمام خوبیاں ہر مصنف میں پائی نہیں جاتیں۔ اردو کو پیدا ہوئے کتنے دن ہوئے انگریزی ادب میں بھی شکسپیر کے سوا کسی دوسرے مصنف کو طرز بیان کی تمام خوبیاں میسر نہیں ہوئیں فقط

۵۔ مقالات شبلی جلد دوم صفحہ ۹۹۸

لیے متعلق امام صاحب نے لکہا ہے کہ یہہ علم حساب و ہندسہ اور علم ہئیت سے متعلق اور ان امور کو کوئی چیز علوم دینی سے متعلق نہیں بلکہ یہ تمام علوم ایسی مضبوط اور مستحکم دلیلوں پر مبنی ہیں کہ ان کے سمجھنے کے بعد ان کی مخالفت کے لئے کوئی راہ ہی نہیں ہے۔

علم منطق کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے مسائل کو دینیات سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

علم طبعی کے متعلق امام صاحب نے "المنقذ من الضلال" میں کم لیکن اپنی کتاب "تہافتہ الفلاسفہ" میں زیادہ لکہا ہے جس میں تشریح کی ہے کہ علوم طبعیات آٹھ اصولوں پر منقسم ہیں۔

(۱) وہ جو جسم سے بحیثیت جسم ہونے کے اوس کی تقسیم اور حرکت اور تغیر سے اور حرکت کے توابع سے یعنی زمانہ جگہ اور خلا سے متعلق ہیں۔

(۲) وہ علوم جن میں آسمانوں کا اور عناصر اربع خاک و آب۔ باد و آتش اور ان کی طبیعتوں اور ان کے اپنی اپنی جگہ پر ہونے کی وجہہ کا بیان ہے۔

(۳) وہ علم جن میں چیزوں کے وجود پانے اور فنا ہونے اور چیزوں کی پیدائش اور بڑے ہونے اور بڈھے ہونے اور ایک چیز دوسری چیز میں منقلب ہو جانے کا بیان ہوتا ہے۔

(۴) وہ علوم جن میں ان باتوں کا بیان ہے جو عناصر اربعہ کے باہمی امتزاج و ترکیب سے ظاہر ہوتے ہیں اور ان سب کے آثار علویہ۔ بادل، مینہ، کڑک، بجلی، ہالہ، قوس قزح کا ہونا بجلی کا گرنا، ہوا کا چلنا، بھونچال کا آنا ظہور میں آتے ہیں۔

(۵) علم معدنیات (۶) علم نباتات (۷) علم حیوانات (۸) علم نفوس حیوانی۔ یعنے ان قوتوں کا بیان جن سے حیوانات چیزوں کو دریافت کر سکتے ہیں اور یہ کہ نفس انسانی بدن کے مرجانے سے نہیں مرتا اور وہ ایک جوہر روحانی ہے اوس کو فنا نہیں۔

امام صاحب فرماتے ہیں کہ یہہ اٹھوں امور تو بطور اصول کے تھے۔ اون کے فروعات سات ہیں۔

(۱) طب (۲) احکام نجوم (۳) علم فراست۔ (علم قیافہ) (۴) تعبیر (۵) علم طلسمات

(۶) علم نیرنجات (۷) علم کیمیا۔ اور وہ معدنی چیزوں کے خواص کا تبدیل کرنا ہے تاکہ اس سے سونا چاندی بن جائے۔

علوم فلسفہ کے وہ چار مسائل جن سے شرعاً اختلاف لازم ہے۔

ان تمام علوم کو تفصیل وار بیان کر چکنے اور بہ شرح و بسط ان کی تعریفات سے فارغ ہونے کے بعد امام صاحب نے فرمایا ہے کہ ان علوم کے کسی امر سے شرعاً مخالفت لازم نہیں ہے البتہ صرف چار مسئلے ان علوم کے ایسے ہیں جن سے ہم کو اختلاف ہے۔

پہلا مسئلہ حکماء کا یہ قرار دینا ہے کہ دو چیزوں یعنے سبب اور مسبب کا ملنا لازمی اور ضروری ہے اور نہ تو یہ قدرت میں ہے اور نہ امکان میں ہے کہ سبب بغیر مسبب کے پیدا ہو اور مسبب بغیر سبب کے۔

دوسرا مسئلہ ان کا یہ قول ہے کہ نفوس انسانی مستقل چیزیں ہیں۔ اور خود اپنے آپ سے موجود ہیں جسم میں پیوست نہیں ہیں اور موت کے معنے بدن سے ان کا منقطع ہو جانا ہے مگر وہ بدستور ہر حال میں اپنے آپ موجود ہیں۔

تیسرا مسئلہ۔ ان کا یہہ قول ہے کہ ان نفوس کا معدوم ہونا محال ہے بلکہ جب یہہ پائے جاتے ہیں تو ابدی اور سرمدی ہو کر ان کا فنا ہونا متصور نہیں۔

چوتھا مسئلہ۔ ان کا یہہ قول ہے کہ ان نفوس کا جبکہ وہ جسموں سے علحدہ ہو جائیں تو پھر ان کا جسموں میں دوبارہ آنا محال ہے۔

علوم فلسفہ سے متعلق امام صاحب کی رائے پر تبصرہ

امام صاحب کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ بجز ان چار مسائل کے ان کے نزدیک فلاسفہ کے علوم کے کسی امر سے شرعاً مخالفت لازم نہیں ہے لیکن اگر ہم کو امام صاحب کی اس رائے سے بالکلیہ اتفاق نہ ہو تو اس کی وجہ یہہ ہے کہ ہمارے خیال میں ان علوم کے اور بھی بکثرت ایسے مسائل ہیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے قابل تسلیم نہیں۔ یونانی علم ہیئت

ہی کو لیجیے کہ اس کے مسائل کو مفسرین کی ان توضیحات سے جو انھوں نے علم ہیئت سے متعلق آیات کی کی ہیں یا احادیث و روایات مرویہ سے کیا تعلق۔ آسمانوں میں دریاؤں کا وجود۔ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو برس کی مسافت، آفتاب کا گرم پانی کے چشمے میں ڈوبنا، عرش فلک الافلاک کے گرد چار نہروں کا ہونا (ایک نور کی۔ ایک نار کی ایک برف کی اور ایک پانی کی)، یا عرش کی اتنی ہی بولیوں کا ہونا جتنی کل دنیا کے لوگوں کی ہیں یا مثلاً زمین کے گرد ہیل کے پہاڑ کا ہونا جو زمین کا محیط ہے یا مثل سات آسمانوں پر سات زمینوں کا پرتو ہونا اور ہر زمین کی دبازت پانچ سو برس کی راہ چلنے کے برابر ہونا اور ہر ایک طبقۂ زمین کو ایک دوسرے سے اسی قدر فاصلہ کا ہونا، رعد کو ایک فرشتہ اور اس کی آواز کو کڑک ماننا یا آسمانوں کو مثل ایک قبہ کے کہنا اور اس میں دروازے قرار دینا یا یہ کہنا کہ فرشتہ جب سمندر میں پاؤں رکھ دیتا ہے تو مد ہوتا ہے اور جب نکال لیتا ہے تو جزر یہ اور اسی قسم کے بیسیوں مسائل ایسے ہیں کہ جن کو علماء نے مثل مسلّمہ مذہبی روایات کے اپنی تصنیفات میں جگہ دی ہے عام مسلمان ان پر یقین رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جلال الدین سیوطی کے مرتبہ رسالۂ ہیئت اسلامی مسمی بہ "الہیئۃ السنیۃ فی الہیئۃ السُنیۃ" کو پیش کیا جا سکتا ہے جو اسی قسم کے صدہا مسائل سے پر ہے اور جن میں سے ایک کی بھی قدیم یونانی علم ہیئت تصدیق نہیں کرتا۔

ان حالات میں یہ کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے کہ ہیئت یونانی کو مسائل دین سے کوئی تعلق نہیں؟ ہماری رائے میں تو یہ مسائل علم ہیئت یقیناً ایسے ہیں کہ پیشوایان مذہب اور علمائے دین یا تو ان کی تردید و تکذیب فرمائیں یا ان سے اتفاق کی صورت میں روایات و احادیث مرویہ کی وجہ تطبیق بیان فرمائیں۔

اسی طرح علوم طبعیہ کے متعلق بھی امام صاحب کے خیال سے ہم اختلاف کرنے پر مجبور ہیں۔ کیا علوم طبعیہ کا ان تمام امور کے در توضیح سے انکار جو فوق الطبیعۃ ہیں موجودہ مسائل

مسلمہ اسلام کے کلیتاً برخلاف اور معجزات انبیاء علیہم السلام اور کرامات اولیاء اللہ سے
قطعی انکار کو مستلزم نہیں ہے اور کیا علوم طبعیہ کا امکان محض کو حجت نہ قرار دینا تاوقتیکہ ان کا
وقوع نہ متحقق ہو جائے، دلائل علم کلام کے بطلان کو مستلزم نہیں ہے ؟ اور کیا علوم طبعیہ کا
قلب ماہیت اشیاء سے انکار موجودہ اصول اسلام کے مخالف نہیں ہے؟ یقیناً طبعیات
کے اس طرح کے اور بہت سے مسائل ایسے ہیں جو اصول اسلام سے متصادم ہیں۔ اور
علمائے اسلام کا فرض ہو جاتا ہے کہ ان کی تردید کریں یا بصورت تائید وجوہ تطبیق پیش
کریں یہی حال علم نجوم اور علم طلسمات کا ہے کہ جن کے بکثرت ایسے مسائل ہیں جن کو نہ صرف
اسلام غلط اور جھوٹا بیان کرتا ہے بلکہ ان کا انکار عقلاً ہر مسلمان پر واجب ہے۔

علم کیمیا کے متعلق امام صاحب کے معلومات کی حد درجہ تحدید کا اندازہ صرف اس واقعہ
سے ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے مسائل کو صرف سونا اور چاندی بنانے پر منحصر قرار دیتے ہیں۔

فلاسفہ الٰہیین کے تین مابہ النزاع مسائل جن کو امام صاحب موجب کفر قرار دیتے ہیں۔

الٰہیات کے متعلق امام صاحب نے فرمایا ہے کہ خود فلاسفہ کے مسائل الٰہیات
میں اختلاف ہے۔ مگر ارسطو کا مذہب جیسا کہ فارابی اور ابن سینا نے بیان کیا ہے قریب
مذہب اسلام کے ہے صرف بیس مسئلوں میں غلطی ہے تین مسئلے تو ایسے ہیں جن کے سبب سے
ان کی تکفیر واجب ہے اور ۱۷ مسئلے ایسے ہیں جن کے سبب سے ان کو اہل بدع کہنا لازم ہے۔ "المنقذ من الضلال" میں امام صاحب نے صرف
ان تین مسئلوں کو مختصراً بیان کیا ہے۔

پہلے تو ان کا یہ کہنا کہ اجساد محشور نہیں ہوں گے اور ثواب یا عذاب روح مجرد کو ہوگا
اور روحانی ہوگا نہ کہ جسمانی۔

دوسرے ان کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کو کلیات کا علم ہے۔ جزئیات کا نہیں۔

تیسرے ان کا یہ کہنا کہ عالم قدیم و ازلی ہے۔ باقی مسائل جو صفات کی تقریر و تفہیم سے متعلق ہیں۔

یا ان کا یہ کہنا کہ خدا اپنی ذات سے علیم ہے اور ذات سے زیادہ نہیں جانتا اور اسی طرح کے اور مسائل ہیں۔ ان مسائل میں ان کا مذہب معتزلیوں کے قریب ہے۔ اور معتزلیوں کی تکفیر واجب نہیں۔ "التفرقہ بین الاسلام والزندقہ" میں امام صاحب نے اس کی زیادہ توضیح اور تفصیل فرمائی ہے امام صاحب نے ان مساعی کی کامل تشریح کی ہے جو وہ اپنی زندگی کے بیسویں سال سے حق تک پہونچنے کے لئے برابر کرتے رہے ہیں۔
اس وشت کی اچھی طرح خاک چھاننے اور فلاسفہ و متکلمین اور باطنین کے اصول کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد امام صاحب نے بالآخر تامل و انجذاب اور تصوف میں اپنے نفس کے لئے ہدایت کی آخری منزل دریافت کی۔

تصوف کی پناہ لے کر امام صاحب نے اطمینان کی سانس لی اور اس کے دامن میں پہنچکر پہلا کام جو انھوں نے کیا تھا وہ اصول فلسفہ اور مبادیٔ عقل پر جارحانہ وار تھا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ فلسفہ اور عقل کی دنیا میں اطمینان اور سکون کی توقع محال ہے۔ اوس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ تصوف سے اس قدر گہرا ارتباط پیدا کرکے امام صاحب نے صوفیاء کے اصول اور مبادی میں کوئی نمایاں اثر پیدا کیا۔ اس کے برعکس ان کا زبردست اثر عربی فلسفہ کی تاریخ میں اس طرح ضرور نمایاں ہوا کہ اس شک اور عام انکار کو جس کا اگرچہ کہ بطور ایک اصول موضوعہ کے انھوں نے کبھی اعلان نہیں کیا تھا تاہم اس چیز کو اصول فلسفہ پر اپنے شہرۂ آفاق حملہ کے لئے بطور حربہ استعمال کیا۔

امام صاحب کے دو معرکتہ الآراء تصنیفات
مقاصد الفلاسفہ اور تہافتہ الفلاسفہ۔

ان کی تصنیفات میں دو کتابیں زیادہ شہرت رکھتی ہیں۔

(۱) مقاصد الفلاسفہ۔ (۲) تہافتہ الفلاسفہ۔ جن سے بحث کئے بغیر سلسلہ بیان جاری رکھنا دشوار ہے۔

مقاصد کی تالیف سے امام صاحب کا مقصد علوم فلسفہ کی تلخیص تھا۔ اس میں ہم ان کو مسائل منطق و فلسفہ کی ارسطو کے اصول موضوعہ کے مطابق ہی توضیح و تشریح کرتا ہوا پاتے ہیں۔

اس کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہو چکا ہے ۱۵۰۶ء میں یہ کتاب وینس میں "منطق العرب و حکمتہم للغزالی" کے نام سے طبع ہوئی تھی۔ انسان کی حیرانی کی کوئی حد نہیں رہتی جب وہ ایک طرف تو مقاصد الفلاسفہ میں امام صاحب کو اصول فلسفہ کی توضیح و تشریح میں فلاسفہ کی وکالت کرتا ہوا پاتا ہے اور پھر تہافتہ الفلاسفہ میں انہیں اصول کے ہدم اور مسمار کرنے پر تلا ہوا۔ استعجاب کے اس جذبہ نے اکثر مفکرین کو امام صاحب کے بظاہر اس متضاد عمل کی تاویل پر مجبور کیا۔

مقاصد کے متعلق موسیو ریتر کے خیال پر تنقید

چنانچہ مشہور مستشرق موسیو ریتر نے اپنی کتاب تاریخ الفلاسفہ جلد (۸) صفحہ (۵۹) (Geschichte der philosophie) میں اس کی یہ توجیہہ کی ہے کہ مقاصد کے تالیف کے زمانہ میں امام صاحب ارسطو کے اصول فلسفہ سے متفق تھے اس کے بعد ان میں ایک فکری انقلاب پیدا ہوا جس کا نتیجہ تہافتہ الفلاسفہ ہے لیکن مقاصد کے ایک مقدمہ سے جو موجودہ عام لاطینی مخطوطات میں ناپید ہے۔ البتہ کتب خانہ سربون یونیورسٹی کے دو عبرانی قلمی نسخوں میں پایا جاتا ہے موسیو ریتر کے اس خیال کی تردید ہوئی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقاصد کی تالیف سے ان کی غرض ان تمام اصول فلسفہ کی تکذیب و تردید کے لئے خود کو تیار کرنا تھا جن کی اس درجہ بسط کے ساتھ تشریح کی گئی ہے۔

امام صاحب نے اس مقدمہ میں ایک مستفسر کے جواب میں لکھا ہے۔

لسألتنی یا اخی تالیف کتاب کامل واضح للرد علی الفلاسفة وتبیین خطأ مبادیھم لتتقی بذلك الوقوع فی الخطاء ولکن ھذا عبث قبل ان تعرف مبادیھم وتعالیمھم تمام المعرفة لان الرغبة فی الوقوف علی خطاء

لبعض الآراء قبل الوقوف عليها تمام الوقوف تعد خطأ ينتهي بالعمى والخلط تظهر لي من الضروري قبل الشروع في نقض آراء فلاسفة ان اضع كتاباً. اشرح فيه ميول علومهم المنطقة والطبيعية والالهيية دون التمييز بين الخطاء والصوب في مباديهم لان غايتي هي شرح نتائج اقوالهم دون الاسهاب في امور زائدة عن الحاجة ولا علاقة لها بالبحث فسا كتفي بشرح مباديهم مضيفا اليها الادلة التي يثبتون بها اقوالهم فغاية هذا الكتاب هي شرح مقاصد الفلاسفة ولهذا اخترت له ذالك الاسم۔

ترجمہ:- برادرم آپ نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں ایسی مکمل اور واضح کتاب فلاسفہ کے رد میں لکھوں اور ان کے مقدمات کی غلطیوں کو ظاہر کردوں جس کی وجہ سے انسان پھر غلطی میں نہ پڑ سکے۔ لیکن یہ بات بے نتیجہ ہوگی اس لئے پہلے ان کے مقدمات سے واقف ہوجانا اور ان کے علوم کو مکمل طور پر جان لینا ضروری ہے۔ بغیر اس کے دوسروں کی غلطی نکالنا خود بڑی غلطی ہے میں نے اس لئے یہ مناسب سمجھا کہ فلاسفہ کے خیالات کی تردید سے قبل ان کے علم منطق، فلسفہ طبیعی، فلسفہ الٰہی کو مفصل طریقہ پر بیان کروں۔ اور اس وقت یہ بتاؤں کہ ان کے مقدمات میں کون کون غلط ہیں۔ اور کون صحیح۔ کیوں کہ بالفعل میرا مقصد ان کے اقوال کے نتائج کی شرح ہے۔ غیر ضروری باتوں میں طول نہیں چاہتا ہوں اور نہ اس پر بحث۔ صرف ان کے مقدمات کی شرح پر اکتفا کروں گا۔ ہاں ان دلائل کا بھی اضافہ ہوگا جن سے وہ اپنے مقصد کو ثابت کرتے ہیں۔ اس لئے اس کتاب کا نام میں نے شرح مقاصد الفلاسفہ رکھا ہے تاکہ اسم اپنے مسمی پر پورے طریقہ پر دلالت کرے۔

اس سے بڑھ کر امام صاحب نے مقاصد کے خاتمہ میں بایں الفاظ تشریح فرمائی ہے

فهذا ما اردنا ان نحكميه من علومهم المنطقية والالهية والطبيعية من غير اشتغال بتميز الغث من السمين والحق من الباطل

ولنفتتح هذا الكتاب تهافتة الفلاسفة حتى يتنفع برهان ما هو باطل من هذه الجملة ـ

ترجمہ :۔ اس سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہم فلاسفہ کے علم منطق فلسفہ طبعیہ والٰہیہ کو نقل کریں اور نقل میں حق و باطل کے امتیاز کرنے میں ہم مشغول نہ ہوجائیں اور یہ کام ہم کتاب تہافت الفلاسفہ میں کریں گے اور وہاں دلیلیں بتلائیں گے کہ کون امر حق ہے اور کون باطل۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مقاصد کی تالیف کے وقت ہی تہافت کا خیال امام صاحب کے پیش نظر تھا اگر وہ فلاسفہ کے اصول سے زمانۂ تالیف مقاصد میں متفق تھے تو پھر یہ تصریح کیا معنے رکھتی ہے ۔

خود امام صاحب کی ان عبارتوں کو پڑھنے کے بعد اب یہ بات محل تعجب نہیں رہتی کہ انھوں نے مقاصد میں اصول فلاسفہ کی تشریح کی اور تہافت میں انہی اصول کو نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر رکھ کر متعارض اور متناقض آدلہ کے ذریعہ اصول عقل سے ان کی مخالفت کے اظہار کی کوشش کی ہو چنانچہ کتاب التہافتہ کے خاتمہ میں امام صاحب نے لکھا ہے

وبعد الفراغ من هذه الرسالة سنشرع في تاليف غيرها لاثبات الرائي الصحيح الذي غايته تشييد الحق كما ان غايتنا من هذا الكتاب هي هدم الباطل ـ

مطلب یہ کہ :۔ اور اس کتاب سے فارغ ہوجانے کے بعد دوسری کتاب تالیف کروں گا ـ تاکہ رائے صحیحہ کو ثابت کروں ـ اور اس کتاب کی غایت اثبات حق ہے جیسا کہ کتاب التہافت کی غایت ہدم باطل ہے ـ

اس کے علاوہ اس کے مقدمہ میں امام صاحب نے فلاسفہ کے ہم خیال اور مذہب دین سے منحرف افراد کے افکار و آراء پر تنقید کی ہے اور قواعد دین کی مخالفت میں ان کی ہرزہ سرائی کو محض لغو اور بے بنیاد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس کے بعد امام صاحب نے

بیس مابہ النزاع مسائل میں فلاسفہ کے باہمی اختلاف کے بیان اور ان کے دلائل کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے (۱۶) الہٰیات سے متعلق ہیں اور چار طبعیات سے۔

مسببات سے متعلق امام صاحب کا فلاسفہ سے اختلاف

اس ضمن میں زیادہ اہم وہ فصل ہے جو مسببات سے متعلق ہے۔ اس خصوص میں امام صاحب کے بیان کا مرجع دو ہی مسئلے ہیں (۱) اگر دو چیزیں اکٹھی پائی جائیں تو ایسی صورت میں کوئی قطعی دلیل اس کی نہیں پائی جاتی کہ پہلی چیز دوسری کی علت ہے۔ (۲) اگر کسی طبعی قانون کی بنا پر کسی ایک چیز کے ساتھ دوسری چیز کے ارتباط و تعلق کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مماثل حالات میں کسی قسم کا معین اثر مترتب ہوگا اگرچہ کہ مماثلت اشیاء میں بھی پائی جائے اس لئے حق سبحانہ تعالیٰ کے ارادہ کی بنا پر یہ ممکن ہے کہ روئی ایک ایسی شکل اختیار کرے جو اس کو آگ سے متعلق ہوتے ہوئے بھی جلنے سے بچا سکے۔ بالفاظ دیگر امام صاحب کا منشا یہ ہے کہ جس چیز کو فلاسفہ قوانین طبعیت یا قاعدہ علت و معلول قرار دیتے ہیں وہ ایک ایسی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور منشاء کے مطابق ہی واقع ہوتی رہتی ہے اور ہم اس کو امر واقعہ اور امر محقق کے طور پر اس لئے قبول کرتے ہیں کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ اپنے علم سابق میں اشیاء کے انجام کو معلوم فرما لیا تھا اور اب اس نے ہم کو اسی کا علم دیا ہے اس بناء پر امام صاحب کی رائے میں کوئی ایسا مقرر اور ثابت طبعی قانون نہیں پایا جاتا جو خالق جل و علیٰ کے ارادہ کو مقید کر سکے۔

فلاسفہ کے خلاف امام صاحب کے مساعی کی حیثیت ابن رشد کی نظر میں۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض فلاسفہ مثلاً ابن رشد اس امر کا یقین رکھتے تھے کہ امام صاحب اپنے قول میں مخلص اور صادق نہ تھے اگرچہ امام صاحب اور فلاسفہ کے درمیان بیّن اختلاف چند ہی مسائل کے متعلق تھا لیکن محض اپنے متعلق اہل سنت کی خوش عقیدگی اور اعتماد میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کے لئے فلاسفہ کے ہر خیال اور فکر کی مخالفت کو انھوں نے ضروری سمجھا۔

امام صاحب اور موسیٰ ابن ناربون

موسیٰ ابن ناربون نے مقاصد کی شرح کے ابتدا میں ابن رشد کی سابقہ رائے کا ذکر کرنے کے بعد یہ بیان کیا ہے کہ تہافت الفلاسفہ کی تالیف سے فراغت پا لینے کے بعد امام صاحب نے ایک چھوٹا سا رسالہ لکھا تھا جس سے بجز چند مقربین کے اور کوئی واقف نہ تھا۔ اس میں انھوں نے فلاسفہ کے اصول سے اپنے بعض اختلافات سے رجوع کیا ہے اور ان اصول کو تسلیم کر کے حکما کے آگے اپنے صحیح خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ اس رسالہ کے نام ہی سے اس کے محتویات پر ایک حد تک روشنی پڑتی ہے "رسالۃ وضع ابو حامد بعد التہافۃ لیکتف عن فکرہ للعلماء، وفیہا مقاصد المقاصد، البیب تخفیۃ الاشارۃ"۔ اس کتاب میں ایسے الہیاتی مباحث پائے جاتے ہیں جن کی عظیم اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا البتہ اس کا انداز بیان غامض و مشکل اور عوام کی فہم سے بلند ہے۔

امام صاحب نے اس کی ابتدا دوائر علیا، ان کے حرکات ان کے نفوس سے، اس کے بعد محرک اول اور اس کے صفات اور پھر نفس سے بحث کی ہے۔

کتاب التہافت میں فلسفہ کی تحقیر کا جو رنگ پایا جاتا ہے اس کا اس رسالہ میں شائبہ تک نہیں بلکہ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ دلائل قائم کرتے ہوئے امام صاحب نے متکلمین کی نہیں بلکہ خود حکما کی شان اختیار کی ہے۔ اس میں الہیاتی مسائل کو ان عقلی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جن کے نقد و تردید میں انھوں نے کتاب التہافت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ اس رسالہ میں امام صاحب دوائر سماویہ اور ازلیت زمان سے متعلق فلاسفہ کے ہم زبان ہیں۔ اپنے اس رسالہ کے خاتمہ میں امام صاحب نے نبی کریم صلعم کے اس ارشاد گرامی کی پناہ میں کہ "خاطبوا الناس علی قدر عقولھم"۔ بجز اہل نفوس قویہ اور اصحاب عقول سلیمہ کے عوام پر اس رسالہ کا مطالعہ حرام قرار دیا ہے۔

امام صاحب اور ابن طفیل

ابن طفیل باوجود امام صاحب سے اپنے شدید تعلق اور عقیدت کے ان کے اپنے معتقد

اصول میں تردد اور اضطراب کے اظہار پر مجبور ہوئے۔اس لئے کہ ابن طفیل کی تصنیف ”حی بن یقظان“ صفحہ (۱۹ تا ۲۱) کی طرف رجوع کرنا مناسب ہوگا۔ابن طفیل نے امام صاحب کی کتابوں سے چند اقتباسات بھی دیے ہیں کہ جس سے مترشح ہے کہ امام صاحب نے چند ایسی مخفی کتابیں بھی لکھی ہیں جن پر بجز چند خاص مقربین کے اور کوئی اطلاع نہیں پا سکتا۔یہہ وہ کتابیں ہیں جو اندلس کے کتب خانوں میں نہیں پائی گئیں۔ان میں سب سے زیادہ اہم کتاب ”المضنون بہ“ کا ایک قلمی نسخہ امام صاحب کے اور چار رسالوں کے ساتھ پیرس کے قومی کتب خانہ میں نمبر ۴۸۸ کے تحت پایا جاتا ہے جس کا مشہور مستشرق شمولڈرس نے اپنے مقالہ میں ذکر کیا ہے۔اس کتاب میں امام صاحب نے مسئلہ قدامت عالم میں فلاسفہ کے ساتھ کھلے بندوں اپنا اتفاق ظاہر کیا ہے اور فلاسفہ کی طرح اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ذات باری تعالیٰ امور کا تفصیلی نہیں بلکہ اجمالی علم رکھتی ہے۔یعنے علم باری کلیات ہے جزئیات سے اس کو کوئی سروکار نہیں اور اس امر کا بھی اعتراف کیا ہے کہ ذات باری مجرد عن الصفات ہے۔اس میں شک نہیں کہ بعض مؤلفین نے امام صاحب سے اس کتاب کو منسوب کرنا اس لئے غلط قرار دیا ہے کہ ان خیالات میں اور ان اقوال میں جن کو حجتہ الاسلام نے اپنی چوٹی کے تصانیف میں رواج دینے کی ممکنہ سعی کی ہے۔زمین اور آسمان کا فرق پایا جاتا ہے (ملاحظہ ہو فہرست حاجی خلیفہ طبقہ میبوفلوجل جلد ۵ صفحہ ۵۹)

بالاختصار یہہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر امام صاحب اپنے سے مخصوص کسی خاص اصول کے مالک تھے تو وہ ایک ایسا اصول تھا جس تک محض تامل اور انجذاب کے ذریعہ اُنھوں نے اپنی زندگی کے اس دور میں رسائی حاصل کی جس میں کہ وہ تصوف کے رنگ میں رنگ چکے تھے۔

یہہ ظاہر ہے کہ جذب و تامل کا کوئی نتیجہ نفس الامر میں کوئی فلسفی اصول نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ امام صاحب نے عمل پر بہت زور دیا ہے۔جس کو انھوں نے پھل اور علم کو شجر کے مماثل تبلایا ہے۔کتب اخلاق میں امام صاحب کی ایک اہم تصنیف میزان العمل بھی ہے جس کی ایک عبرانی شرح ۱۸۳۹ء میں بمقام لیپزگ طبع ہوئی ہے۔عربی سے عبرانی میں

شرح و ترجمہ کا کام اندلس کے مشہور یہودی ابراہیم ابن حدائی نے انجام دیا تھا۔

امام صاحب یورپ کی نظر میں

یورپ امام صاحب کو علوم فلسفہ کے ایک زبردست مخالف کی حیثیت سے جانتا ہے۔ علمائے یورپ کا بیان ہے کہ امام صاحب نے مشرق عربی میں فلسفہ پر ایک نہایت خطرناک اور مہلک وار کیا ہے۔ مغرب میں بھی فلسفہ کو اسی روز بد کی صورت دیکھنی پڑتی اگر اس کو ابن رشد کی حمایت و سرپرستی نہ حاصل ہوئی ہوتی جن کی عقلی مساعی نے تقریبًا ایک صدی تک فلسفہ کا بول بالا رکھا۔

امام صاحب اور ابن رشد

اسلامی فلسفہ کی تاریخ میں تہافتہ الفلاسفہ اور تہافتہ التہافتہ ان دونوں کتابوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے امام صاحب کے مویدین اور معتقدین نے اسی کتاب تہافتہ الفلاسفہ اور احیاء علوم الدین کی بناء پر اور اس وجہ سے بھی کہ انھوں نے اسلامی عقیدہ کی مدافعت اور فلسفہ اور فلاسفہ کے مقابل میں شریعت الٰہی کی حمایت کو اپنا النصب العین قرار دے رکھا تھا۔ امام اور حجت الاسلام جیسے وقیع القاب کا مستحق قرار دیا تھا۔ امام صاحب کی عظمت نے انسانی عقول پر کچھ اس طرح تسلط کر رکھا تھا کہ ان کے خیالات اور تصنیفات پر نقد و تبصرہ کی جرارت اگر کسی نے کی تو کتاب تہافتہ الفلاسفہ کے اشاعت کے کامل ایک صدی بعد حکیم اندلس ابن رشد نے اپنی شہرہ آفاق کتاب تہافتہ التہافتہ میں شریعت کی حمایت اور مدافعت میں جو زور امام صاحب نے تہافتہ الفلاسفہ میں دکھایا تھا تہافتہ التافتہ میں اس سے بڑھ کر ابن رشد نے فلسفہ اور فلاسفہ کی تائید و حمایت میں اپنے کس و بل دکھائے ہیں۔ ابن رشد کی اس تصنیف کو یونانی فلاسفہ سے لیکر اپنے زمانہ تک یعنی امام صاحب کی وفات سے تقریبًا ایک صدی بعد تک حکماء اور فلاسفہ کی نصرت اور اعانت ابن رشد کی زندگی کا ایک زبردست اور نمایاں کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس طرح اگر امام صاحب کو شریعت کی تائید اور مدافعت کے اعتراف میں حجۃ الاسلام جیسے ممتاز لقب سے یاد کیا جا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ فلسفہ اور فلاسفہ کی اس عدیم المثال تائید اور حمایت کے بعد ابن رشد کو حجۃ الحکمۃ والحکماء کے وقیع اور بالکل بجا لقب سے یاد نہ کیا جاتا۔

کتاب تہافۃ التہافۃ

کامل ایک صدی تک امام صاحب کی کتاب تہافۃ الفلاسفہ نے فلسفہ اور آزاد فکر پر اپنا حملہ برقرار رکھا۔ حکماء کے خیالات کا مضحکہ اڑانا، فلاسفہ کی تکفیر اور تقبیح کرنا، ان کو تنہا وارث قرار دینا اور ان کے خلاف خالق اور مخلوق کے عتاب اور غصہ کا مطالبہ، اس معرکۃ الآراء تصنیف کا نمایاں وصف رہا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس پوری مدت میں فلاسفہ کے خلاف اس کھلے اعلان جنگ اور بعض غلط الزامات کی تردید کیلئے مشرق و مغرب کی پوری وسعت میں کسی فلسفی نے جرأت نہ کی۔ اور کامل ایک صدی بعد اس طرح کے پرخطر اقدام کی اگر کسی نے ہمت و جسارت کی تو وہ ابن رشد تھا اور یہی واحد وجہ اس کو حجۃ الحکمۃ والحکماء بنا دینے کے لئے کیا کم ہے۔ واقعہ نفس الامر بھی یہی ہے کہ ابن رشد نے غزالی کی اس کتاب کی تنقید و تردید سے اپنے حکمت دوست اساتذہ سلف، تلامیذ۔ اور احباب کے سر سے بدنامی اور ننگ و عار کے اس بار کو اتار پھینکنے کی وہ کوشش کی ہے جس کی کسی اور سے توقع بھی دشوار تھی۔ اسی کوشش کے نتیجہ کے طور پر فلسفہ کی مردہ جان میں ازسر نو زندگی سرایت کر گئی اور اپنے سابقہ حسن و جمال کی درخشانی و تاب ناکی سے اس نے ازسر نو انسانی عقول کے لئے سامان ضیافت مہیا کیا۔ فلسفہ کی تائید میں ابن رشد کی انتہائی اور کامیاب سعی کا سب سے زیادہ بہتر نمونہ اس کی ایسی شہرہ آفاق تصنیف تہافۃ التہافۃ کو قرار دینا پڑیگا۔ جو امام صاحب کی تہافۃ الفلاسفہ کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس شخص کے لئے جو امام صاحب کی کلامی خصوصیات پر قلم اٹھانا چاہے ازحد ضروری ہوتا ہے کہ

تہافتہ الفلاسفہ کے ساتھ ساتھ تہافتہ التہافتہ کو بھی پیش نظر رکھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کتابوں سے کسی قدر مزید تعارف کو ہم نامناسب نہیں سمجھتے ۔ امام صاحب نے کتاب التہافتہ کے نام اور مقصد تالیف کے متعلق جو امر لکھا ہے اس کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے ۔

کتاب تہافتہ الفلاسفہ میں امام صاحب کا طریقہ بحث

ابتدات بتحریر ھذا الکتاب ردا علی الفلاسفۃ القدماء مبینا تہافت عقیدتھا و تناقص کلمتھا فیما یتعلق بالالٰھیات و کاشفا عن غوائل مذھبھم والتی ھی علی التحقیق مذاھب العقلاء عبرۃ عند الاذکیاء اعنی ما اختص بہ عن الجماھیر والدھماء من فنون العقاید والاراء ۔

مطلب یہ ہے ۔ میں نے کتاب "تہافت الفلاسفہ" فلاسفہ کی رد میں لکھنی شروع کی تاکہ ان کے عقائد کا تصادم اور ان کے متناقص اقوال جو خصوصاً الٰہیات کے مسئلہ میں ہیں معلوم ہوجائیں اور ان کے مذہب کی جو دشواریاں ہیں وہ واضح ہوجائیں ۔

امام صاحب کا طریقہ بحث یہ رہا ہے کہ فلاسفہ کے مسلک کو بلا کسی تصرف کے اپنی حقیقی شکل میں پیش کردیا جائے تاکہ ملاحدہ اور مقلدین باطل پر یہ امر بخوبی روشن ہوجائے کہ مشاہیر فلاسفہ متقدمین اور متاخرین میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو ایمان باللہ اور حشر کا قائل نہ ہو اور اسی طرح وہ لوگ بھی جو تقلیدی کفر ہی کو اپنی اصابت رائے اور ذہانت کے مظاہرہ کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں معلوم کرلیں کہ وہ تمام اساطین فلاسفہ اور اکابر حکما جن کی تقلید ہی ان کا سرمایہ امتیاز ہے شرائع الٰہیہ کے انکار سے متعلق ہر طرح کے اتہامات سے پاک ہیں ۔ اللہ پر ایمان اور انبیاء کی تصدیق ان کا شعار تھا ۔ البتہ اصول شرائع الٰہیہ کو تسلیم کرنے کے بعد تفصیلات میں پڑکر ان کے قدم ضرور ڈگمگائے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور لوگوں کی بھی گمراہی وضلالت کا باعث ہوئے ۔

التہافتہ الفلاسفہ کی تالیف سے امام صاحب کا منشاء

وجہ تالیف امام صاحب نے یہہ بیان فرمائی ہے کہ ایک ایسے گروہ کو انھوں نے دیکھا جو اپنی ذہانت کے زعم پر اپنے ہم چشموں کے مقابلہ میں ایک خاص امتیاز و افتخار کا دعویدار تھا۔ ان لوگوں نے اسلامی فرقوں سے علیحدگی اختیار کرلی عبادات سے روگردانی کی شعائر دینی کی تحقیر و تذلیل اپنا شیوہ بنالیا۔ گمراہ کن خیالات سے اتصال اور سقراط۔ بقراط۔ افلاطون اور ارسطو وغیرہ سے مرعوبیت اور ان مشاہیر کی عقل دقت علمی اور فرط ذکاوت سے متعلق انکے پیروؤں کی مبالغہ آمیز خوش عقیدگی اور یہ خیال کہ باوجود اتنی جزیل عقل اور بے مثال فضل وکمال کے انھوں نے شرائع الہیہ کا انکار کیا اور مذہب کی تفصیلات کو شعبدہ اور خرافات وافسانہ تصور کیا وغیرہ ہی اس تمام ترکفر وضلالت کی محرکات ہوئیں۔ یہی چیز تھی جس نے اس گروہ کو ان فضلاء اور مشاہیر کی متابعت اور کفر وضلال کے اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ اسا ہی فلاسفہ میں شمار کئے جانے کے شوق نے صحیح اسلامی عقیدہ سے دوری اور اپنے آبائی مذہب سے بے تعلقی پر ان کو مجبور کریا۔ ابتداء میں تو امام صاحب نے فرمایا تھا کہ ان سب کے سرگروہ ارسطو ہی کی تناقض خیالی اور متضاد آراء کے چہرہ سے نقاب چاک کرنے پر اکتفا کریں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے صرف ارسطو ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ تمام فلاسفہ کے آراء وخیالات کو خلط ملط کردیا۔ امام صاحب نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ وہ اپنی بحث مسائل الہیہ کی حد تک محدود رکھنا چاہتے ہیں اس لئے کہ حسابی ہندسی اور منطقی علوم جو یقینی ہیں اور شکوک وشبہات سے پاک ہیں، ان کے انکار کے کوئی معنی نہیں لیکن فلاسفہ کا ان علوم کی ایجاد کو اپنے مخترعہ الہیاتی علم کی حقانیت اور صداقت کی تائید میں بطور ایک حربہ کے پیش کرنا درحقیقت ضعیف العقل انسانوں کو چکما دینا ہے۔ اس لئے کہ اگر ان کی الہیات بھی اس درجہ اتقان اور کمال کو پہونچی ہوئی ہے جس درجہ کہ علوم حساب وہندسہ ومنطق تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان علوم کے برخلاف الہیات میں یہہ حضرات آپس میں اس شدت کے ساتھ مختلف الرائے دکھائی دیتے ہیں چونکہ امام صاحب

کے خیال میں اس طور کے مترجمین تبدیلی و تحریف سے نہ بچ سکتے تھے اور خود ان کے تراجم
اس درجہ تفسیر و تاویل کے محتاج قرار پائے کہ نئے نئے اختلافات اور نزاعات کا مصدر بن گئے۔ ایسے ایسی
سلامت روی انھوں نے اسی میں دیکھی کہ ابونصر فارابی، اور ابن سینا کے اُن مختار افکار و آراء کے
ابطال و تردید ہی پر اکتفا کریں کیونکہ وہ گم کردہ راہ پیش رؤں کا صحیح مسلک سمجھے ہوئے ہیں۔
امام صاحب کی نظر میں نقد و تحقیق کے لحاظ سے فلاسفہ اسلام میں انہی دونوں کو زیادہ
معتبر حیثیت حاصل تھی۔

کتاب التہافتہ الفلاسفہ کے متعلق چند ملاحظات

امام صاحب نے اپنی کتاب تہافتہ الفلاسفہ میں مندرجہ ذیل بیس مسائل کی بابتہ فلاسفہ کے تناقض
اور خطاء سے بحث کی ہے یہہ وہ بیس مسائل ہیں جن میں سے اگر چند کو مستثنٰی کر دیا جائے تو علوم الٰہیہ
اور طبیعیہ کے اُن تمام قدیم و جدید معرکتہ الآراء مسائل کو شامل اور حاوی ہیں جو اسلامی اور غیر اسلامی فرقوں کے
درمیان مابہ النزاع بنے ہوئے تھے۔ ان مسائل کی کافی توضیح و تشریح اور اپنے اصول اور خیال
کے مطابق بے شمار دلائل اور اعتراضات تفصیلات و توضیحات سے ان کی تردید و تکذیب
کر چکنے کے بعد اپنی اس عجیب و غریب تصنیف کو اس قول پر ختم کیا ہے۔

فان قال قائل قد فصلتم مذاهب هولاء افتقطون به کفرهم و
وجوب القتل لمن یعتقد اعتقادهم قلنا تکفیرهم لابد فی ثلاث مسائل
(۱) قدم العالم وقولهم ان الجواهر کلها قدیمة (۲) قولهم ان الله
تعالیٰ لایحیط علما بالجزئیات الحادثة من الاشخاص (۳) فی انکار بعث
الاجساد وحشرها۔ فهذه المسائل ثلاث۔ لا تلائم الاسلام بوجه
ومعتقدها معتقد کذب الانبیاء وانهم ما ذکروه الا علی سبیل
المصلحته تمثیلا لجماهیر الخلق وتفهیما وهذا هو الصریح السوی
لم یعتقد احد من فرق المسلمین قائما ماعراء هذه المسائل الثلاث

من تصرفهم فی الصفات الالاهیة واعتقاد التوحید فیها فمذهبهم قریب من مذاهب المعتزله ومذهبهم فی تلازم الاسباب الطبیعة هو الذی صرح المعتزلة به فی التوحید وکذالک جمیع مانقلناہ عنهم قد نطق به فریق من فرق الاسلام الا هذا الاصول الثلاث فمن یری تکفیر اهل البدع من فرق الاسلام تکفرهم ایضاً به ومن یتوقف علی التکفیر یقتصر علی تکفیرهم بهذا المسائل اما نحن فلا نؤثر الان الخوض فی تکفیر اهل البدع وما یصح منه ومالا یصح کیلا یخرج الکلام عن مقصود هذا الکتاب

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے۔ اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ جن آراء و خیالات کو تم نے تفصیلی طور پر بیان کر کے غلط ثابت کیا ہے کیا ان کے کفر کے بھی قائل ہو اور جو ان پر عقیدہ رکھتا ہو اس کو واجب القتل سمجھتے ہو تو ہم کہیں گے کہ تین مسائل ہی صرف ایسے ہیں جن کی وجہ سے ان کی تکفیر پر ہم اپنے کو مجبور پاتے ہیں یعنے (۱) ان کا یہ قول ہے کہ عالم قدیم اور تمام جواہر قدیم ہیں (۲) اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا علم نہیں ہے (۳) اور حشر اجساد کا انکار۔ اور جو ان تین مسائل پر عقیدہ رکھتا ہے وہ انبیاء کی تکذیب کرتا ہے۔ ان تین مسائل کے علاوہ اور جو مسائل ہیں ان میں اکثر اہل بدعت فلاسفہ کے ہم رائے ہیں یعنے صفات الٰہیہ کے بارے میں فلاسفہ جو مختلف صفتوں کے مختلف معنے بتلاتے ہیں کوئی نہ کوئی اسلامی فرقہ بھی (مثلاً معتزلہ) ان کا ہم خیال ہے۔ مثلاً اسباب طبعیہ کے تلازم کا مسئلہ اور معتزلہ جو توحید کے قائل ہیں ان میں معناً کوئی فرق نہیں پایا جاتا اس لئے ہم ان وجوہ کی بنا پر ان کو کافر نہیں کہتے۔ اب جو اہل بدعت کی تکفیر کے قائل ہیں وہ ان مسائل کی وجہ سے بھی فلاسفہ کی تکفیر کریں گے اور جو تکفیر پر توقف کرتے ہیں وہ ان مسائل پر بھی فلاسفہ کو کافر کہنے سے گریز کریں گے۔

ایک طالب علم اس حقیقت بدیہی سے دوچار ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ امام صاحب کے اس حد درجہ متواضع اور مبنی بر مسالمت اختتامی قول کو اس ہنگامۂ محشر سے کوئی دور کی نسبت بھی نہیں جس سے انھوں نے اپنی کتاب کی ابتداء کی تھی ابتدائے کتاب میں ایک طالب علم خواہ مخواہ

یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ مصنف نے تہیّہ کرلیا ہے کہ کچھ ہو وہ فلسفہ کی زبردست عمارت کو حکماء کے سر پر ڈھا کر ہی رہے گا جس کے بعد فدر مار فلاسفہ کی تیار کی ہوئی اس تاریخی عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا جائے گی۔ جو خدائے حکمت مزدا کی عبادت کے لئے تیار کی گئی تھی۔ اصل یہ ہے کہ قدرت نے امام صاحب میں خطیبانہ تمہید اور دفاع کا ملکہ بدرجۂ اتم ودیعت کر رکھا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے مقدمہ میں الفاظ کی عظمت اور فقروں کی چستی و سحر آفرینی اور شوکت اسلوب کا اتنے شاندار طریقہ پر مظاہرہ کیا گیا ہے جو مخالف کے قلوب لرزان و ترساں کرنے کا ضامن ہو اس کے بعد فلاسفہ سے جدل اور مناقشہ کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ منطق کے انداز پر ہو۔ موقع موقع پر اس طرح کی مذہبی عبارتوں سے اپنے اقوال کو تقویت دیجائے جن کے انکار سے کفر لازم آتا ہو اسی کے ساتھ قدم قدم پر فلاسفہ کی تحقیر ان پر سب وشتم اور ان کے کفر و ضلالت پر تحسّر اور افسوس کا اعلان ہو عوام کو فلسفہ سے بدظن کرنے میں امام صاحب کی کامیابی کی بڑی وجہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ان کا خطیبانہ طرز استدلال اور ادیبانہ اسلوب بیان ہے لیکن ایک اور اہم وجہ یہ بھی ہوئی کہ انھوں نے فلاسفہ سے مناقشہ کچھ اس رنگ میں کیا ہے گویا کہ وہ خود بھی فلسفی ہیں جن سے فلاسفہ کا کوئی راز پوشیدہ نہیں۔ اس کے باوجود وہ ان کے خلاف اعلان جنگ پر مجبور ہوئے ہیں تو یقیناً فلاسفہ میں کوئی نقص ہی ہوگا جس کو ان کے وسیع علم و واقفیت نے پالیا ہے یقینا یہ ایک ایسا انداز بیان ہے جو ایک بے لوث باحث کی نگاہ میں امام صاحب جیسے مشرق کے سرتاج مفکر اور محترم و مقبول ہستی کے شایان شان نہیں۔ خطابت و بلاغت کے اس شان دار ہیکل کے تار و پود اسی ایک عجیب اور دلکش حقیقت کے ہاتھوں بکھر کر رہ جاتے ہیں کہ جن مسائل کی بناء پر ارسطو سے لے کر ابن سینا تک تمام فلاسفہ کی تکفیر و تردید و تکذیب۔ نقد و تنقید میں امام صاحب نے کتاب کی ابتدا میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا اسی کتاب کے حد درجہ بسیط متواضع اور مسالم خاتمہ تک پہنچ کر تکفیر و تردید کے عظیم طومار سے

دست کش ہوتے ہوئے صرف تین ہی مسائل کو معیار کفر و ایمان قرار دینے میں کوئی امر مانع نہ دیکھا۔ اسی چیز نے ابن رشد کو اس خیال کے اعلان پر مجبور کیا کہ اگر ان کے پیش نظر کسی سنجیدہ اصول پر فلاسفہ کی تکفیر و تردید ہوتی تو چاہیئے تھا کہ ان کی توجہ صرف انہی تین مسائل کی حد تک محدود رہتی لیکن اس کے بجائے فلاسفہ کے خلاف اس ہنگامۂ محشر کے برپا کرنے کے بجز اس کے اور کیا معنے ہوسکتے ہیں کہ عامۃ المسلمین کی نگاہوں میں اسلام کے ایک تنہا حامی اور مدافع کی حیثیت سے خود کو پیش کیا جائے اور ایک عام ہر دلعزیزی حاصل کی جائے خواہ اس طرح اس مقصد کی قربان گاہ پر فلسفہ اور حکمت ہی کو بھینٹ چڑھانا پڑے اور فلاسفہ اور حکماء کی دل کھول کر تذلیل و تحقیر بھی ہوجائے۔

فلاسفہ کے مابہ النزاع بیس مسائل

اب ہم مشہور بیس مسائل کی ایک اجمالی فہرست پیش کرتے ہیں جن پر امام صاحب نے فلاسفہ سے اختلاف کی بنیاد قائم کی ہے۔ اور انہی پر ان کی معرکتہ الآراء کتاب کے تمام مباحث کا دار و مدار تھا۔

(۱) ازلیت عالم کے متعلق فلاسفہ کا مسلک۔

(۲) ابدیت عالم کے متعلق فلاسفہ کا مذہب۔

(۳) فلاسفہ کا یہ قول کہ عالم کا صانع اللہ ہے اور عالم اس کی پیداوار ہے۔

(۴) صانع کے ثابت کرنے میں فلاسفہ کا عجز و قصور۔

(۵) اثنینیت کے محال ثابت کرنے میں فلاسفہ کا عجز و قصور۔

(۶) صفات الٰہی کی نفی اور انکار کے متعلق فلاسفہ کا مذہب۔

(۷) فلاسفہ کا یہ قول کہ اللہ کی ذات کی جنس اور فصل سے تقسیم نہیں کی جاسکتی۔

(۸) فلاسفہ کا یہ قول کہ اللہ ایک بسیط موجود ہے جس کی کوئی ماہیت نہیں۔

(۹) اس امر کی توضیح اور بیان میں فلاسفہ کا عجز و قصور کہ اللہ کا جسم نہیں۔

(۱۰) دہر کا اعتراف اور صانع کا انکار فلاسفہ کے لئے لازم ہے۔

(۱۱) فلاسفہ یہ کہنے سے عاجز ہیں کہ خدا کو اپنی ذات کے علاوہ کسی اور چیز کا بھی علم ہے۔

(۱۲) فلاسفہ یہ کہنے سے بھی عاجز ہیں کہ اس کو خود اپنی ذات کا علم ہے۔

(۱۳) فلاسفہ کا یہ قول کہ خدا جزئیات کو نہیں جانتا۔

(۱۴) فلاسفہ کا یہ قول کہ آسمان ایک حیوان متحرک بالارادہ ہے۔

(۱۵) محرک آسمان کی غرض وغایت کے متعلق فلاسفہ کے تفصیلات۔

(۱۶) فلاسفہ کا یہ قول کہ نفوس سماویہ ان جزئیات کا علم رکھتی ہیں جو اس دنیا میں حادث ہوتے رہتے ہیں۔

(۱۷) خرق عادت کے محال ہونے کے متعلق فلاسفہ کا قول۔

(۱۸) اس امر پر کسی عقلی دلیل کے قائم کرنے سے فلاسفہ کا عجز کہ انسان کا نفس ایک جوہر قائم بنفسہ ہے جو نہ تو جسم ہے اور نہ عرض۔

(۱۹) فلاسفہ کا یہ قول کہ نفوس بشریہ کا فنا ہونا محال ہے۔

(۲۰) فلاسفہ کا حشر اجساد اور اعادۂ معدوم کو محال قرار دینا۔

بجائے خود ان میں سے ہر مسئلہ اپنی تفصیل کے لئے مستقل مقالوں کا محتاج ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف ایک مقالہ میں اس کی گنجائش کہاں پیدا ہوسکتی ہے۔ بالفعل ہم اس فہرست پر اکتفا کرتے ہیں اور آخر میں بعض خاص اسلامی معتقدات کی تشریح میں امام صاحب کے جو خاص نظریات ہیں سپرد قلم کرتے ہیں۔

امام صاحب کی کلامی خصوصیات کی نسبت ابن خلدون کی رائے سے مولانا شبلی کا اختلاف۔

اسلامی معتقدات پر امام صاحب نے جس سحر حلال اسلوب بیان اور فلسفیانہ رنگ میں قلم اٹھایا ہے اس نے ابن خلدون جیسے یگانہ روزگار فاضل مورخ کو اس رائے کے اظہار پر

آمادہ کیا تھا کہ فلسفیانہ طرز پر سب سے پہلے امام صاحب ہی نے اس فن کو مرتب کیا۔ ابن خلدون کی اس مؤثر رائے کی صداقت سے علامہ شبلی مرحوم کا محض اس لئے انکار کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا کہ امام صاحب سے پہلے باقلانی اور امام الحرمین وغیرہ نے کلامی مباحث میں بعض بعض فلسفیانہ اصطلاحیں داخل کی تھیں ظاہر ہے کہ ان مباحث میں بعض فلسفی اصطلاحات کا آجانا اور چیز ہے اور فلسفہ کو بطور ایک اصول کے پیش نظر رکھنا ایک بالکل علیحدہ چیز۔ اس دوسرے اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ امام صاحب سے پہلے اس رنگ میں کسی نے بحث نہیں کی۔ پھر اگر ابن خلدون نے امام صاحب کو اس خاص رنگ کا موجد قرار دیا تو ہمارے خیال میں کوئی غلطی نہیں کی۔

امام صاحب کے متنوع مباحث عقاید سے متعلق بعض متقدمین سے مناقشہ۔

عام اسلامی عقائد کے متعلق امام صاحب کے مباحث ایک تو وہ ہیں جو ان کے عام تصنیفات میں پائے جاتے ہیں اور ہر ایک کے دست رس میں ہیں لیکن کچھ ایسے بھی مباحث ہیں جن کی عام اشاعت کو امام صاحب نے اس لئے ناپسند کیا تھا کہ عوام کی عقل ان کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ امام صاحب کے ان مخصوص افکار و آراء نے بعض علماء کو اس درجہ مبہوت و حیران کیا کہ اس قسم کے بعض تصانیف کو امام صاحب کی طرف منسوب کرنے ہی میں ان کو تامل ہوا چنانچہ محدث ابن الصلاح اور علامہ ابن السبکی صرف اس لئے مضنون بہ علی غیر اہلہ کے امام صاحب کی طرف انتساب کو غلط قرار دیتے ہیں کہ مصنف بعض مستوجب کفر عقائد مثلاً قدامت عالم اور انکار علم جزئیات اور نفی صفات کا قائل ہے۔ لیکن اس دلیل کے سمجھنے سے ہماری عقل کچھ قاصر ہی رہی۔ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ اگر ابن الصلاح اور ابن السبکی کے خیالی مستوجبات کفر نے امام صاحب کو مرعوب کر دیا ہوتا تو آج تک دنیا کسی اور ہی حجتہ الاسلام کی تلاش میں سرگرداں ہوتی۔ لطف یہ ہے کہ جس کتاب کا خود امام صاحب

اپنی مسلمہ تصنیف جواہر القرآن میں تذکرہ فرمائیں اس کی نسبت یہ دعویٰ کہ ان کی نہیں ،
وجہ صرف یہ کہ اس میں بعض ایسے مسائل درج ہیں جو کسی کی نظر میں موجب کفر ہیں۔ واقعہ
نفس الامری تو یہ ہے کہ جن مذکورہ بالا مسائل کو موجب کفر قرار دیا گیا ہے ان کا شروع
سے آخر تک کتاب میں کہیں ذکر ہی نہیں۔ محض ذہنی اختراع معلوم ہوتے ہیں۔ اور
بالفرض اگر مذکور ہوتے بھی تو جس حیثیت سے یہ موجب کفر ہیں اس حیثیت سے امام صاحب
کا قائل ہونا یقیناً مستبعد اور غیر معقول ہے اور جس حیثیت سے امام صاحب ان کے
قائل ہوں ان کا موجب کفر ہونا باطل اور محال ہے حقیقت تو یہ ہے کہ المضنون
بہ علی غیر اہلہ کے تسمیہ میں امام صاحب نے جو احتیاط ملحوظ رکھی تھی اس کی عظیم قدر و قیمت
کا اندازہ نہ ہو سکتا اگر اس قسم کے لطیفے نہ پیش آتے رہتے اس میں کوئی کلام نہیں کہ امام صاحب
کی کلامی خصوصیات کا واقعی اندازہ جب ہی ممکن تھا کہ ان کے کلامی مباحث کا کامل طور پر
جائزہ لیا جاتا لیکن اس مختصر مقالہ میں یہ کوشش یقیناً باعث طوالت ہوگی۔ چند خاص خاص
مسائل عقائد سے متعلق ہی امام صاحب کے نقطۂ نظر اور مخصوص انداز بحث کی توضیح و تشریح
ہی پر ہم بیان اکتفا کریں گے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک حد تک امام صاحب کے خاص رنگ
کو نمایاں کرنے کے لئے کافی ہوگا۔

روح کے متعلق امام صاحب کے زاویۂ نگاہ کی تشریح اور اس پر تبصرہ۔

المضنون بہ علی غیر اہلہ میں امام صاحب نے روح سے متعلق کافی بحث کی ہے جس سے
پتہ چلتا ہے کہ وہ روح کی جسمانیت کے قائل نہیں ہیں جسم میں اس کی مثال ایسی نہیں ہے،
جیسے کہ پانی برتن میں وہ اس کو واحد مثل جز لا یتجزیٰ اور نا قابل تقسیم قرار دیتے ہیں۔
وہ اس کے عرض ہونے کے بھی قائل نہیں ہیں یعنے وہ اس کو ایسی چیز نہیں مانتے جو دوسرے
کے ساتھ قائم ہو۔ اور دل و دماغ میں اس طرح گھس گئی ہو جس طرح کالی چیز میں کالا رنگ یا عالم میں

ہیں علم اس لئے کہ وہ خود کو اور اپنے خالق کو اور معقولات کو پالیتی ہے۔ یہ صفات عرض کی نہیں
جوہر کی ہوا کرتی ہیں اس بناء پر روح کو جوہر کہنا چاہیئے عرض نہیں کہا جا سکتا۔ امام صاحب
روح کو متحیز بھی نہیں کہتے کیونکہ جو چیز متحیز یعنے جگہ گھیری ہوئی ہوگی وہ قابل تقسیم ہوگی اور
روح قابل تقسیم نہیں پھر امام صاحب فرماتے ہیں کہ روح نہ تو انسان کے بدن ہی میں
داخل ہے اور نہ اُس سے خارج اور نہ اوس سے متصل ہے اور نہ اس سے جدا ہے
کیوں کہ یہ سب باتیں ایسی چیز سے علاقہ رکھتی ہیں جس کا جسم ہو اور متحیز ہو اور روح میں ان
سے کوئی بات نہیں ہے پھر فرماتے ہیں کہ وہ کسی جہت میں بھی نہیں ہے اور نہ کسی جگہ میں
حلول کئے ہوئی ہے۔ کیوں کہ یہ صفتیں بھی جسم دار چیز سے یا ایسی چیز سے جو دوسری چیز کے
ساتھ موجود ہو یعنے عرض ہو علاقہ رکھتی ہیں اور روح نہ تو جسم ہے اور نہ عرض۔ اس مسئلہ
میں امام صاحب نے کرامیہ و حنبلیہ سے اختلاف کیا ہے جو روح کو جسم مانتے ہیں اور اشاعرہ
او رمعتزلہ سے بھی مختلف الرائے ہیں اس لئے کہ انھوں نے روح کے لئے جہت تسلیم کی
ہے لیکن جن مذکورہ بالا صفات کے ساتھ امام صاحب نے روح کو مانا ہے۔ اس پر یہ اعتراض
وارد ہوتا ہے کہ یہ تو وہی صفات ہیں جن سے واجب تعالیٰ متصف ہے۔ اس سے
یہ لازم آتا ہے کہ روح بھی خدا کے مانند ہے۔ اس کے جواب میں امام صاحب فرماتے ہیں
کہ خدا میں بھی یہ صفات ہیں لیکن یہ اوس کی مخصوص صفات نہیں بلکہ اوس کی مخصوص صفت
اس کا قیوم ہونا ہے یعنے وہ اپنی ذات سے قائم ہے اور باقی تمام چیزیں اس کی ذات
سے قائم ہیں اور وہ آپ ہی آپ موجود ہے اور سب چیزیں آپ ہی آپ موجود نہیں ہیں
بلکہ ان کا وجود عارضی ہے اور خدا کا وجود ذاتی۔ لیکن اس جواب کے بعد بھی یہ اعتراض
بہر حال قائم رہتا ہے کہ اس تعریف کی بناء پر روح کو قدیم اور غیر مخلوق ماننا پڑے گا۔ اس
اعتراض کو دفع کرنے کی امام صاحب نے اس طرح کوشش کی ہے کہ روح کو غیر مخلوق کہنے کے
یہ معنے ہیں کہ اس کا اندازہ کمیت سے نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس طرح کے اندازہ کے لئے

کسی چیز کا متحیز اور قابل تقسیم ہونا ضروری ہے اور روح نہ تو متحیز ہے اور نہ قابل تقسیم مگر اس کو مخلوق ہم اس لئے کہتے ہیں کہ وہ پیدا ہوئی ہے اور قدیم نہیں ہے اور اس وقت حادث ہوتی ہے جبکہ نطفہ میں اس کے قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو جائے۔

وجود ابدان سے قبل امام صاحب ارواح بشری کے وجود کو نہیں تسلیم کرتے بلکہ بعد حدوث ابدان ان کے حدوث کے قائل ہیں جیسے صورت آئینہ میں کیونکہ اگر قبل وجود ابدان کے موجود ہوں تو دو حال سے خالی نہیں یا تو کل انسانوں کے لئے روح واحد ہوگی یا کثیر ان دونوں صورتوں کو امام صاحب نے بدلائل باطل ثابت کیا ہے اور اس طرح اس نتیجہ تک پہونچے ہیں کہ قبل وجود ابدان روح کا کثرت سے موجود ہونا باطل ہے جہاں ایک معترض نے پوچھا کہ جب ارواح بشری کثرت سے موجود نہیں ہو سکتیں تو انسانوں کے بدن سے ان کے مرنے پر جدا ہو جانے کے بعد کیوں کر کثرت سے موجود ہو جا ئینگی اور آپس میں متغائر بھی ہوں گی۔ اس کا جواب امام صاحب نے یہ دیا کہ بدن کے ساتھ متعلق ہونے کے بعد روح نے مختلف اوصاف مثلاً علم و جہل اور صفائی اور کدورت اور حسن اخلاق اور اخلاق قبیحہ حاصل کئے ہیں۔ اسی سبب سے ایک دوسرے سے متغائر ہو گئی ہیں اور ان کی کثرت سمجھ میں آتی ہے مگر جسموں سے متعلق ہونے سے پہلے اس تغائر کے اسباب موجود نہ تھے اور اسی لئے ان کا کثیر ہونا باطل تھا لیکن یہ جواب کچھہ زیادہ تشفی بخش نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ روح کو ایک جوہر غیر متحیز ماننے اور یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ نہ وہ جسم میں داخل ہے نہ اس سے خارج نہ اس سے ملی ہوئی ہے نہ اس سے جدا ہے بلکہ اس کا تعلق بدن سے صرف ایسا ہے جیسے کہ صورت کا آئینہ میں تو پھر وہ کس طرح انسان کے اعمال سے اخلاق حسن یا اخلاق قبیح حاصل کر سکتی تھی تاکہ انسانوں کے مرنے کے بعد ان کی روح میں تغائر پیدا ہو، اور کثرت روحوں کی وجود پذیر ہو۔ علاوہ اس کے امام صاحب نے خود تسلیم کیا ہے کہ روح اس وقت حادث ہوتی ہے جبکہ نطفہ میں اس کے قبول کرنے کی

استعداد پیدا ہو جائے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ توالد و تناسل کے مسلسل اور غیر منقطع سلسلہ کے مدنظر آنِ واحد میں بہت سے نطفے روح کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کرتے رہتے ہیں اور امام صاحب کے نظریہ کی بنا پر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر ایک کے لئے روح حادث ہو اس طرح روح کا آنِ واحد میں کثرت سے حادث یعنی موجود ہونا بلا کسب کسی اختلاف کے لازم آتا ہے اور یہ دعویٰ بلا دلیل رہ جاتا ہے کہ قبل وجود ابدان روح کا کثرت سے موجود ہونا باطل ہے امام صاحب کے اس خیال کی تردید میں جب یہ حدیث پیش کی گئی کہ "خلق اللہ تعالیٰ الارواح قبل الاجساد بالفی عام" جس سے حدوث ابدان کے قبل ارواح کا کثرت سے موجود ہونا ثابت ہوتا ہے تو امام صاحب نے اس حدیث کی اس طرح تاویل کو ضروری قرار دیا کہ ارواح سے ارواح ملائکہ مراد ہیں اور اجساد سے اجساد عالم۔

روح کے متعلق اپنے اس مسلک کے بالکل برخلاف امام صاحب نے اپنی کتاب المضنون بہ علی غیر اہلہ میں روح کی تعریف یہ کی ہے کہ "وہ ایک جسم لطیف ہے اخلاط کے بخار سے مرکب اور اس کا منبع دل ہے اور اس میں قوائے نفسانی اور حیوانی دونوں ہیں اور اسی سے قوت حساسہ اور اعضا کی حرکت حاصل ہوتی ہے۔" ظاہر ہے کہ اس تعریف میں وہ روح انسانی داخل نہیں ہو سکتی جس کا ذکر امام صاحب نے المضنون بہ علی غیر اہلہ میں کیا ہے۔

امام صاحب کے نزدیک لوح محفوظ اور قلم کی حقیقت۔

لوح سے وہ ایسا وجود مراد لیتے ہیں کہ جو اس قابل ہو کہ جو چیزیں اس پر نقش کرنی چاہئیں اس پر نقش ہو جائیں اور قلم سے مراد ایسے وجود سے ہے جس سے لوح پر جو نقش کرنا چاہئیں اس سے نقش ہو جائے کیونکہ قلم معلومات کی صورتوں کو لوح پر نقش کرنے والی چیز ہے لوح وہ چیز ہے جس پر ان معلومات کی صورتیں نقش ہوتی ہیں اور یہ ضرور نہیں کہ قلم نرسل کا اور لوح لکڑی کی ہو بلکہ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ان دونوں کے لئے جسم بھی ہو کیونکہ قلم اور لوح کی ماہیت اور حقیقت میں ان کا مجسم ہونا داخل نہیں ہے بالکل ان کی روحانیت ان کی حقیقت ہے اور ان کی صورت ان کی حقیقت سے زاید جس کے کچھ معنی نہیں ہیں

پس کچھ بعید نہیں ہے کہ اللہ کا قلم اور اللہ کی لوح اس کی انگلیوں اور اس کے ہاتھ کے لائق ہو اور یہ سب چیزیں ایسی ہوں جو اس کی ذات کے لائق ہے اور وہ حقیقت جسمیت سے پاک ہو گی، بلکہ وہ سب جواہر روحانی یعنے روحانی ذاتیں ہوں گی بعض تو ان میں سے علم حاصل کرنیوالی ہیں مثل لوح کے اور بعض علم دینے والی ہیں مانند قلم کے مد دان اللہ تعالیٰ علم بالقلم" المضنون به علی غیر اہلہ میں بھی امام صاحب نے لکھا ہے کہ جواہر روحانیہ عقلیہ جن میں تمام موجودات کا نقش ہے شرع میں اسی کو لوح محفوظ سے تعبیر کیا ہے۔ امام صاحب کی اس تقریر سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوح و قلم کے ایسے وجود کے جو مجسم ہو قائل نہیں ہیں۔

صراط اور میزان کے متعلق امام صاحب کا مسلک

اپنی دو کتابوں میں امام صاحب نے صراط اور میزان کے متعلق بحث کی ہے جن خیالات کا اظہار اپنی تصنیف "الاقتصاد فی الاعتقاد" میں فرمایا ہے وہ مغائر ہیں ان خیالات سے جن کا اظہار "المضنون به علی غیر اہلہ" میں کیا ہے۔ الاقتصاد میں امام صاحب نے صراط اور میزان کے جسمانی وجود کو تسلیم کیا ہے اس میں صراط کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ یہ حق ہے اس کی تصدیق واجب ہے کیونکہ وہ ممکنات سے ہے اور وہ ایک پل جہنم کے اوپر تمام لوگ اس کو دیکھیں گے جب وہ اس تک پہونچیں گے تو فرشتے اس پر ٹھیرائیں گے تاکہ ان سے سوالات کئے جائیں۔ اون کے نزدیک اس کی صداقت میں شک کرنیوالے دو طرح کے ہی لوگ ہوسکتے ہیں ایک تو وہ جو سرے سے خدا کی قدرت کے منکر ہوں اس کے مقابلہ میں صراط کو ثابت کرنے سے پہلے خدا کو ہر ایک امر پر قادر ہونا ثابت کرنا چاہیئے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو خدا کی عام قدرت کے تو قائل ہیں لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز چیز پر سے کس طرح گذرنا ممکن ہوگا۔ تو ان کے مقابلہ میں کہا جائیگا کہ یہ بات ہوا پر چلنے سے زیادہ عجیب نہیں ہے ہوا جیسی کھلی چیز پر جب یہ بات ممکن ہے تو صراط خواہ وہ کیسا ہی باریک ہو بہرحال ہوا سے تو زیادہ مضبوط ہے۔ "المضنون به علی غیر اہلہ" میں امام صاحب تحریر

فرماتے ہیں کہ صراحت پر ایمان لانا حق ہے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ وہ بال کے مانند ہے تو بال کی باریکی کو بھی اوس سے مناسبت نہیں ہے جس طرح کہ خط مصطلح علم ہندسہ کی باریکی میں جو دہوپ اور چھاؤں کے بیچ میں فاصل ہے بال کی باریکی کو کچھہ نسبت نہیں ہے۔ صراط کی باریکی خط ہندسہ کی باریکی کے مانند ہے جس میں مطلق عرض نہیں ہوتا اس کے بعد امام صاحب نے صراط سے مراد اخلاق متضادہ میں توسط حقیقی اختیار کرنا لی ہے۔ افراط و تفریط کے جو بیچوں بیچ ہے وہی توسط حقیقی اوس خط کے مانند ہے جو دہوپ اور چھاؤں میں فاصل ہے جس کو نہ دہوپ میں کہا جاسکتا ہے نہ چھاؤں میں ایں بناء پر کمال انسانی کا انحصار امام صاحب کی نظر میں فرشتوں کی مشابہت پیدا کرنے میں ہے جن میں انسان کی طرح اخلاق متضادہ نہیں پائے جاتے اور چونکہ انسان ان اوصاف سے بالکلیہ علیحدہ نہیں ہوسکتا اس لئے وہ ایک ایسے طریقہ کے اختیار کرنے کا مکلف کیا گیا ہے جو ان اوصاف سے علیحدہ ہو جانے کے مشابہہ ہو یہی طریقہ توسط حقیقی ہے مثلاً سخاوت توسط حقیقی ہے کنجوی اور فضول خرچی کے درمیان' بہادری توسط ہے تہور اور بزدلی کے درمیان پس صراط مستقیم وہ توسط حقیقی ہے جو بال سے بھی زیادہ باریک ہے اور جو شخص ان صفات متضادہ کے دونوں سروں سے نہایت درجہ دور رہنا چاہے تو خواہ مخواہ اون دونوں سروں سے بیچا بیچ میں ہوگا۔ مثلاً ایک لوہے کے حلقہ کو آگ میں لال کر کے رکھیں اور اس میں ایک چیونٹی کو ڈال دیں تو وہ اوس کی گرمی سے بھاگے گی اور جو جگہہ سب سے دور ہوگی وہاں ٹہیرے گی پس بجز مرکز کے اوس کو کوئی اور جگہہ نہ ملے گی یہی مرکز وسط حقیقی ہے جس کو ہر طرف سے نہایت درجہ کا بُعد ہے اور اس مرکز کا مطلق عرض نہیں ہے اور وہ بال سے بھی زیادہ باریک ہے پھر جب خدا تعالیٰ قیامت میں اس صراط مستقیم کو متمثل کر دے گا تو جو کوئی اس دنیا میں صراط مستقیم پر ہوگا تو صراط آخرت پر بھی سیدھا چلا جائیگا۔ اس تقریر سے صراط کی جسمانیت کا اعتراف نہیں پایا جاتا بلکہ صرف صراط مستقیم کا جو ایک مفہوم ہے اس کا متمثل ہوجانا بیان کیا ہے امام صاحب کے خود اپنے الفاظ یہ ہیں کہ " فاذا متثل اللہ تعالیٰ لعباده فی یوم القیامته هذا الصراط المستقیم ...... الخ اس کی کوئی تشریح امام صاحب نے

نہیں کی ہے کہ یہ تمثل روحانی ہوگا یا جسمانی اور اگر روحانی ہوگا تو اس پر سے گذرنے کے کیا معنی ہونگے
اسی طرح میزان کے متعلق "الاقتصاد" میں امام صاحب نے لکھا ہے کہ میزان حق ہے اور اس پر تصدیق
واجب ہے اس پر جب یہ اعتراض ہوا کہ اعمال تو عرض ہیں جو فاعل کے ساتھ معدوم ہو گئے بعد وم
چیز کے تولنے اور جسم میزان پر ان کے پیدا ہونے اور ان کی خفت و شدت کا اندازہ کرنے کے کیا معنی
تو امام صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلعم سے جب یہ بات پوچھی گئی تو آپ نے
فرمایا کہ اعمال کے لکھے ہوئے صحیفے تولے جائیں گے کراما کاتبین کے یہ لکھے ہوئے صحیفے مجسم چیز ہیں ان کو
جب میزان میں رکھا جائیگا تو اللہ تعالیٰ ان میں اعمال کے رتبہ کے موافق ہلکا پن یا بھاری پن پیدا
فرمائے گا۔ جب اس کا فائدہ امام صاحب سے پوچھا گیا تو اوّل امام صاحب نے کہا کہ خدا کے کاموں
میں یہ سوال ہی نہیں ہو سکتا تاہم بتایا کہ یہ کیا کم ہے کہ بندے اپنے اعمال کی مقدار جان جائیں گے
اور اس بات کے اندازہ کرنے کا موقع ملے گا کہ خدا نے ان کے ساتھ عدل کیا ہے یا اپنی مہربانی
سے ان کے گناہ نظر انداز فرما دیئے ہیں۔ اس سے مترشح ہے کہ امام صاحب میزان کے جسمانیت
کے قائل ہیں اس کے برخلاف "المضنون بہ علی غیر اھلہ" میں فرماتے ہیں کہ میزان پر
ایمان لانا واجب ہے۔ جب کہ یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ نفس انسانی جوہر ہے جو اپنے آپ سے
قائم ہے اور جسم کا محتاج نہیں ہے تو وہ خود اس بات کیلئے تیار ہے کہ حقایق امور اور جو تعلق اس کو
جسد سے تھا وہ اس پر منکشف ہو جائے اور جو کچھ اس پر منکشف ہوگا اس کے اعمال کی تاثیر ہوگی بلحاظ
قرب و بعد ذات باری کے اور خدا کی قدرت میں ہے کہ کوئی ایسی راہ نکالے جس سے ایک لحظے میں
تمام خلق اپنے اعمال کی مقدار اور اس کی تاثیر دریافت کرے اس کے بعد امام صاحب فرماتے ہیں
کہ میزان حقیقت میں اس چیز کا نام ہے جس سے کسی شئے کی کمی یا زیادتی معلوم ہو پس خدا کو اختیار
ہے کہ اعمال کے اندازہ کے طریقہ کو متمثل کر دے جس سے زیادتی اور کمی اعمال کی معلوم ہو اور
اس کی صورت محسوس موجود ہو یا صرف خیال میں تمثل ہو اور خدا کو معلوم ہے کہ وہ اس کی ایسی
صورت پیدا کریگا جو محسوس ہو یا ایسی کرے گا جو تمثل خیالی ہو۔

ملائکہ جن اور شیاطین کے متعلق امام صاحب کا خیال۔

المضنون الکبیر میں ان کے متعلق امام صاحب نے فرمایا ہے کہ یہ جواہر ہیں جن کی حقیقتیں مختلف ہیں ان کا اختلاف ایسا ہے جیسا کہ کسی ایک چیز کی مختلف اقسام میں ہوتا ہے۔ مثلاً قدرت علم اور رنگ آپس میں مختلف ہیں مگر یہ تینوں چیزیں اپنے آپ سے قایم نہیں ہیں بلکہ کسی دوسرے میں ہونے کے محتاج ہیں اسی طرح ملائکہ اور شیاطین اور جن مختلف ہیں مگر خود جوہر ہیں اور اپنے آپ سے قایم ہیں ان کے اختلاف کی حقیقت کے متعلق امام صاحب لکھتے ہیں کہ یہ ہیں تو ایک ہی قسم کے مگر خیر و شر جو ان میں ہے اس سے باہم مختلف ہیں جیسے کہ انسان ناقص اور انسان کامل میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن بعد میں چل کر فرماتے ہیں کہ ان میں قسم ہی کا اختلاف ہے یعنے ایسا اختلاف جیسے گھوڑے اور انسان میں ہے۔

اس کے بعد امام صاحب نے بحث کی ہے کہ آیا ان جواہر کی صفات میں کسی نقصان کے پیدا ہوئے بغیر ان کی تقسیم ممکن ہے یا نہیں۔ اور نیز یہ کہ متحیز ہیں یا غیر متحیز۔ اس کا فیصلہ انہوں نے اس طرح کیا ہے کہ اگر جزء لا یتجزیٰ کا موجود ہونا محال ہے تو ان کا تقسیم ہونا بھی محال ہے اور اگر جزء لا یتجزیٰ کا موجود ہونا ممکن ہے تو ان کا متحیز اور غیر منقسم ہونا بھی ممکن ہے امام صاحب محض اس وجہ سے کہ ان کے غیر متحیز اور غیر منقسم ہونے کو ناجائز نہیں قرار دیتے کہ ایسا ہونے سے خدا میں اور ان میں کیا چیز ہو گی جس سے فرق کر سکے اس لئے کہ کسی دو چیزوں میں عینیت اور مماثلت کے لئے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ فلاں چیز ان دونوں میں نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ کہ امام صاحب ملائکہ کو غیر محسوس کہتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس امکان کے بھی قائل ہیں کہ وہ دکھائی دیں اور یہ ان کے نزدیک دو طرح ممکن ہے یا کوئی صورت میں بن جاویں جیسا کہ خدا نے کہا "فتمثل لها بشرا سویا" لیکن اس صورت میں امام صاحب نے اس کی توجیہ نہیں کی کہ صورت اختیار کرنے کی شکل میں ان کا غیر منقسم اور غیر متحیز ہونا کیوں کر باقی رہا دوسری صورت فرشتوں کے دکھائی دینے کی امام صاحب نے یہ بتائی ہے کہ شاید بعض ملائکہ کے لئے ایسا بدن ہو

جو محسوس ہو سکتا ہو اور اس کا محسوس ہونا نور نبوت پر موقوف ہو جیسے کہ ہمارا دنیا کی چیزوں کو دیکھنا سورج کے نور پر موقوف ہے امام صاحب کے خیال میں یہی حال جن وشیاطین کا ہے لیکن امام صاحب نے جب ان کا بدن خواہ وہ کسی قسم کا ہو تسلیم کرلیا تو پھر ان کے غیر منقسم اور غیر متحیز ہونے کے معنے سمجھ میں نہیں آتے معلوم ایسا ہوتا ہے اس کے بعد امام صاحب کے خیالات میں ترقی ہوئی چنانچہ "المضنون بہ علی غیر اھلہ" میں طویل مباحث کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ آسمان معہ اپنے تمام اجزاء کے ایک بہت بڑے انسان کے مانند ہے اور انسان کے مانند اس میں نفس بھی ہے اور اس کے تمام اجزاء ایسے ہیں جیسے کہ انسان یا حیوان کے اعضاء مختلفہ اور وہ اپنے ارادہ سے حرکت کرتا ہے اور اس حرکت کرنے سے اس کی ایک اہم غرض یہہ ہے کہ اپنے سے زیادہ اشرف ایک جوہر کے مشابہہ ہونے کا شوق پورا کرے اور اس جوہر کا قدیم حکماء اور فلاسفہ نے عقل مجرد نام رکھا ہے لیکن شرع کی زبان میں اس کو ملک مقرب کہا جاتا ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ العقول کثیرہ تو مراد اس سے ملائکہ کی کثرت ہوتی ہے پھر ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عقول مجردہ کا کثرت سے ہونا ضروری ہے یہہ ہو نہیں سکتا کہ آسمانوں کی تعداد سے کم عقول مجردہ ہوں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ یہ بات ثابت ہے کہ آسمان متعدد ہیں اور ان کی حرکتیں بھی مختلف ہیں تو ان آسمانوں کے نفوس وہی ملائکہ سماویہ ہیں کیونکہ اجسام سماوی سے خصوصیت رکھتے ہیں اور یہی عقول سماویہ ملائکہ مقربین ہیں کیوں کہ وہ مادہ کے علائق سے بری ہیں اور صفات میں رب الارباب کے قریب ہیں۔ امام صاحب کے ان خیالات سے صاف مترشح ہے کہ آسمانوں کے فلسفی وجود کے متعلق متقدین علماء اور حکماء اور فلاسفہ نے جو غلطی کی تھی اس سے امام صاحب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ اس کی تائید میں جو دلیل بھی پیش کی جاتی ہے اس کے بے بنیاد ہونے میں کلام دشوار ہے اور حقیقی مذہب اسلام کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس سے قطع نظر امام صاحب کے اس قول کا نتیجہ یہ ہے کہ عقول مجردہ وہی ملائکہ ہیں مگر وہ نہ منقسم ہو سکتے ہیں نہ متحیز ہیں نہ ہاتھ سے محسوس ہو سکتے ہیں اور نہ آنکھ سے دکھائی دے سکتے ہیں۔

" المضنون بہ علی غیر اھلہ" میں امام صاحب فرماتے ہیں کہ " جب یہ بات جان لی کہ خدا تعالیٰ کے کام دو طرح پر ہیں ایک جو اس نے بلا واسطے کئے ہیں اور دوسرے جو اس نے بالواسطہ کئے ہیں اور واسطے بلحاظ مدارج مختلف ہیں۔ "قالوسائط ھم المقربون وعنھم یعبر بالملائکۃ " اس قول کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ عالم میں جو اسباب طبعی وقوع حوادث کے ہوتے ہیں انہی اسباب پر ملائکہ کا اطلاق ہوتا ہے۔

حرارت کا ہونا اور بخارات کا جمع ہونا بادلوں کے لانے کے فرشتے ہیں۔ مگر اس میں ایسے اسباب جمع ہوئے جس سے بادل گرجے اور بجلی چمکے مینہ برسے، بادل گرجنے بجلی چمکنے، مینہ برسانے کے فرشتے ہیں۔

امام صاحب کی اس رائے کے مقابلہ میں فرض کیجیئے اگر کوئی شخص وجود کی پانچ قسموں میں سے جس کی حکیمانہ تفصیل کا سہرہ خود امام صاحب کے سر ہے کسی ایک کی بنا پر ملائکہ سے قوائے مدبر عالم اور قوائے ملکوتی انسانی مراد لے اور شیطان سے قوائے حیوانی نفسانی انسانی مراد لے تو امام صاحب کے اپنے موضوعہ اصول کے مطابق ایسا کرنے میں کوئی شرعی عذر تو لازم نہیں آئے گا۔ اس مقالہ سے مقصود صرف اس قدر تھا کہ کلامی مباحث میں امام صاحب سے مخصوص رنگ کا کسی قدر اندازہ ہو جائے ورنہ ان کے کلامی خصوصیات کے متعلق کسی تفصیل کا انحصار اس نوعیت کے تمام مباحث کا جائزہ لینے پر ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں تاہم اس مختصر سے تبصرہ سے بھی اس امر کا بآسانی پتہ چل سکتا ہے کہ فلسفیانہ اصول کی کسوٹی پر کلامی مسائل کو رکھ کر بحث و مناقشہ کے اعتبار سے امام صاحب نہ صرف اپنے ہم عصروں بلکہ متقدمین متکلمین میں ایک امتیازی شان کے مالک دکھائی دیتے ہیں فقط

مخطوطات کے خزانے

(۲)

از محمد غوث صاحب، ایم اے

(۴)

مرات الصفا

سلطنت آصفیہ اور دکن کی تاریخ کی چھان بین کی ضرورت ابھی کامل طور سے رفع نہیں ہوگئی جو چند کتابیں طبع ہوئی ہیں اور عام طور سے متداول ہیں ان سے حالات وواقعات کی جیسے چاہیے ویسے تشریح اور توضیح نہیں ہوتی تاریخ ظفرہ، توزک آصفیہ، حدیقۃ العالم، نگارستان آصفی، گلزار آصفیہ، مآثر الامراء، تاریخ رشید الدینخانی، تاریخ خورشید جاہی، اور دوسری مطبوعہ کتابوں سے طالب علموں کی پیاس نہیں بجھتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قدیم مخطوطات ڈھونڈ ڈھونڈ کر طبع کرائے جائیں افسوس اس امر کا ہے کہ تاریخ دکن کے مخطوطات طبع کرنے اور اس طرح ملک کی ایک حقیقی خدمت انجام دینے کے لئے نہ تو سرکاری علمی اداروں نے کوئی توجہ کی اور نہ کسی غیر سرکاری ادارہ نے اس ضرورت کا احساس کیا۔ کم از کم تاریخ دکن کی ایک ببلوگرافی کی ترتیب پر ہی ملک کے ارباب تاریخ توجہ کریں تو بڑی خدمت ہوگی۔

بہر حال مرات الصفا بھی ایک ایسی کتاب ہے جس سے استغنا نہیں ہوسکتا اس کتاب کے مؤلف محمد علی حسینی ہیں والد کا نام محمد صادق تھا۔ محمد علی نے مشاہیر وقت کی مصاحبت میں نام و نمود پیدا کیا تھا۔ دکن میں بود و باش تھی برہان پور وطن تھا اور صوبۂ خاندیس میں جاگیر حاصل تھی نواب صلابت جنگ مرحوم کے زمانہ میں دیوان سلطنت آصفیہ نواب صمصام الدولہ۔ میر عبد الرزاق، شاہ نواز خان کے پاس میر منشی کے فرائض انجام دیئے تھے۔ نیز اس زمانہ کے ایک دوسرے امیر میر نجف علیخان، شمشیر جنگ کے پاس بھی خدمت انجام دی تھی۔ مرات الصفا میں لکھا ہے کہ نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ کا اورنگ آباد میں انتقال ہوگیا تو اون کی عطا کردہ سند کی بنا پر پیر دھار راؤ ہول کر نے صوبۂ خاندیس کا مطالبہ کیا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا اس وقت یہ بات بھی قرار پائی کہ

کہ صوبہ خاندیس کی جاگیریں باقی نہ رہیں گی۔ چنانچہ جن لوگوں سے جاگیریں لے لی گئیں ان میں محمد علی بھی شامل تھے غرض انکے ذاتی حالات کی مزید تلاش ہو سکتی ہے۔

محمد علی حسینی نے شوق تالیف پایا تھا۔ تاریخ سے بھی ذوق تھا۔ تاریخ راحت افزا اور مرآت الصفا ان کی دو تالیفیں ہیں۔ دونوں کتابوں کا موضوع تاریخ ہے دونوں کا تقابل اس وقت پیش نظر نہیں ہے اس کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھا جاتا ہے فی الوقت مرآت الصفا کے متعلق مختصر تذکرہ پیش نظر ہے۔

مرات الصفا، ماثر الامراء کے ماخذوں میں شامل ہے لیکن جہاں تک علم ہے مابعد مورخوں نے اس سے کوئی استفادہ نہیں کیا اب جو لوگ تاریخ دکن پر کام کر رہے ہیں انھوں نے بھی غالباً اس ماخذ پر توجہ نہیں کی سراج الدین طالب مرحوم کی کتابوں میں بھی اس کتاب کا کوئی حوالہ مرقوم نہیں ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کی انگریزی تالیف "نظام الملک آصفجاہ" کے ماخذوں کی فہرست میں بھی اس کتاب کا نام شامل نہیں ہے۔ البتہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے بعض حالیہ مضامین میں صاحب مرآت الصفا کی دوسری تالیف راحت افزا کے حوالے موجود ہیں۔ مولوی ظہیر الدین صاحب ام اے نے اپنی تالیف احمد شاہ بھمنی میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

مرآت الصفا کی تالیف کا زمانہ نواب صلابت جنگ مرحوم کا عہد ہے خطبہ کتاب میں اس کتاب کو نواب شاہ نواز خاں کے نام سے منسوب کیا گیا ہے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ گو کتاب اسی وقت تالیف ہوئی لیکن بعد میں۔ مابعد سات آٹھ سال کے مزید حالات کا اس میں اضافہ عمل میں آیا سب کو معلوم ہے کہ نواب شاہ نواز خاں سنہ ۱۱۷۱ھ میں شہید ہوئے لیکن مرات الصفا میں واقعات کے بیان کرنے کا تسلسل سنہ ۱۱۷۹ھ تک قائم ہے۔

مؤلف نے خطبۂ کتاب میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اس کتاب کی تالیف سے قبل ایک دوسری کتاب بھی لکھی تھی اس کا موضوع بھی تاریخ تھا حضرت ناصر جنگ شہید کے نام سے اس کو منسوب کیا گیا تھا لیکن کوئی صلہ نہیں ملا اور اس بات کا بھی علم نہیں ہے کہ خود کتاب کیا ہوئی اس تلف شدہ کتاب میں سنہ ۱۱۵۳ھ تک کے واقعات قلمبند کئے گئے تھے غرض پہلی کتاب تلف ہو جانے کے بعد مرآت الصفا کی تالیف عمل میں آئی۔

مرأت الصفا ایک ضخیم کتاب ہے اور سترہ سطری مسطر ایک ہزار دس صفحات پر مشتمل تقطیع ۲×۲۰
اس کتاب کا موضوع ممالک مشرق کی تاریخ ہے لیکن در اصل اسکو مولف کے زمانہ کی تاریخ کہنا زیادہ درست ہوگا کتاب کے دو دفتر یا دو حصے ہیں۔ پہلا دفتر گئی ابواب میں، ہر باب فصلوں میں اور فصل ذیلوں میں منقسم ہے۔

پہلے دفتر کے مضامین کی تفصیل یوں ہے۔

مقدمہ تاریخ کی تعریف اور تاریخ دانی، پہلا باب خلقت عالم و آدم اور قبل بعثت انبیاء، بادشاہان اور حکماء، نیز ایران کے حکمرانوں کا احوال، دوسرا باب آنحضرت صلعم اور خلفاء راشدین ضمناً دوسرے کئی صحابہ کا تذکرہ۔ واضح ہو کہ کیا اس باب میں اور کیا آئندہ باب میں حالات بہت اختصار سے درج کئے ہیں۔ تیسرا باب خلفاء بنی امیہ و بنی عباس۔ چوتھا باب صاحبان خروج، پانچواں باب سلاطین عجم، طاہریہ خراسان، صفاریہ سیستان، سامانیہ، سبکتگینیہ، دیالمہ (بنی بویہ) سلجوقیہ ایران، کرمان و روم، خوارزم شاہیہ، اسمٰعیلیہ، اتابکیہ فارس، غوریہ خراسان کرت ہرات، ماژندران، سلاطین سیستان، سلاطین لار، سلاطین شیروان شاہیہ۔ چھٹا باب سلاطین عرب و حجاز ساتواں باب سلاطین چنگیزیہ، آٹھ فصلوں میں۔ آٹھواں باب شاہان صفویہ، یہ حالات نسبتاً زیادہ تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ نواں باب ملوک عثمانیہ روم، دسواں باب چنگیزیہ توران گیارہواں باب سلاطین ہندوستان حالات بہت اختصار کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ سلاطین دہلی و آگرہ قبل تیموریہ، بھمنیہ دکن، نظام شاہیہ، عادل شاہیہ، قطب شاہیہ، عماد شاہیہ، بریدیہ بیدر، سلاطین احمد آباد و گجرات، مالوہ، خاندیس، بنگالہ، جون پور، سندھ، ملتان، کشمیر، تبت، کوچ۔ ان سب فصلوں میں بادشاہوں اور حکمرانوں کے مختصر حالات اور ضروری سنین بیان کئے ہیں۔

اس کے بعد مزید چار باب اور ہیں ان کی افادیت میں بھی کلام نہیں ہو سکتا۔ ہر باب کے متعلق مختصر توضیح کی جاتی ہے۔

۱۔ علماء و فضلاء اہل اسلام بیسوں علماء اور اہل فضل و کمال کے حالات قلمبند کئے ہیں اور کوشش کی ہے کہ بالالتزام ہر صاحب تذکرہ کا سنہ وفات درج کرے۔

۲۔ مشائخ کرام اور صوفیہ۔ مقام اور علاقہ کی تخصیص کے ساتھ مثلاً قزوین کے فلاں فلاں مشائخ،

سہروردیہ کے فلاں فلاں مشائخ، اسی طرح سمرقند کے خوارزم کے ہندوستان کے مشائخوں کا تذکرہ۔

۳ - شعرائے عرب و عجم، اس باب میں بھی علاقہ کی تخصیص کے ساتھ تذکرہ لکھا ہے۔

۴ - بعض سنین کے اہم غیر معمولی اور دلچسپ واقعات۔

خاتمہ ایک تختہ پر مشتمل ہے جس میں گویا بطور خلاصہ ۶ خانوں میں حکمرانوں کے ضروری حالات واضح کئے ہیں یہ تختہ حسب ذیل ۶ خانوں پر مشتمل ہے۔

(۱) اسمار بادشاہاں - (۲) عز دالیشان (۳) دارالملک، (۴) ظہور (۵) انقراض، (۶) مدت سلطنت۔

کتاب کا پہلا دفتر یا پہلا حصہ یہاں ختم ہوجاتا ہے اور دوسرا دفتر شروع ہوتا ہے۔

دوسرا دفتر دو بابوں پر محتوی ہے۔ پہلا باب آل تیمور کے ان حکمرانوں کا تذکرہ جنھوں نے ایران در توران میں شاہی کی۔ دوسرے باب میں ہندوستان کے تیموری حکمرانوں کے زمانہ کی تاریخ قلمبند کی ہے۔ ان دونوں بابوں میں سنہ وار حالات وواقعات بیان کئے ہیں۔

کتاب کا یہ حصہ بھی ایک مستقل کتاب کے طور پر شروع ہوتا ہے۔ تمہید اور ضروری امراتب موجود ہیں۔ اس حصہ کو بھی نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خان مرحوم کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔

پہلا باب بہت مختصر ہے۔ ناقل نے غالباً سہواً دوسرے باب کا آغاز نظر انداز کر دیا ہے بہر حال، "ابوالمظفر نصیر الدین محمد ہمایوں پادشاہ" کی سرخی موجود ہے اور سمجھنا چاہیئے کہ اسی سے دوسرا باب شروع ہوتا ہے۔

دوسرے باب کے ابتدائی حصہ میں بھی حالات بہت اختصار کے ساتھ قلمبند کئے ہیں لیکن جیسے جیسے حالات اور واقعات کا زمانہ مؤلف سے قریب تر ہوتا جاتا ہے بیان میں بسط اور وسعت پیدا ہوتی گئی ہے تا آنکہ ۱۱۷۰ھ پر سلسلہ بیان ختم کر دیا گیا ہے یوں اگر دیکھا جائے تو بیان کی وسعت بہادر شاہ کے زمانہ کے حالات سے شروع کی ہے اور محمد شاہ کے عہد کے امور کو خوب پھیلایا ہے۔ اسی سلسلہ میں حضرت آصف جاہ اوّل کے حالات بھی آتے ہیں اور مؤلف نے واقعات نہ صرف سنہ وار لکھے ہیں بلکہ ماہوار اور اکثر تاریخوار، دراصل کتاب کے اس حصہ کو عہد آصفجاہ کی تاریخ دکن کہنا بالکل درست ہوگا،

ان واقعات کے بیان کرنے میں مؤلف کا قلم خوب چلا ہے۔ اس وقت کے عام رواج کے مدنظر جا بجا غالباً اپنی طبع زاد نظم بھی شامل کر دی ہے۔ اثنائے بیان میں سیوں افراد کے نام آتے ہیں، ہندو بھی مسلمان بھی بیسیوں مقامات کا حال نظر سے گزرتا ہے۔ امراء اور اہل دربار کے جوڑ توڑ، مکروفریب، سازش و دغا، غرض خود رائی، اور طوائف الملوکی کے ایسے واقعات سامنے آتے ہیں کہ پناہ بخدا۔ ملک کی زبوں حالی کا کافی اندازہ ہوتا ہے اور وہ اسباب متعین ہو جاتے ہیں کہ کیوں ملک اقوام مغرب کی اولوالعزمی کا جولان گاہ بن گیا۔

مؤلف نے اپنے ماخذوں کی تفصیل بیان نہیں کی ہے لیکن یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ انھوں نے مستند ماخذوں سے مواد اخذ کیا ہے آخری حصہ میں تو انھوں نے ذاتی معلومات اور چشم دید واقعات بیان کئے ہیں۔

کتاب کے آخری حصہ کے مقابل پہلے حصہ کی افادیت کمتر ہے لیکن بطور ایک حوالہ کی کتاب کے اس کو کافی اہمیت حاصل ہونی چاہیئے۔

کتاب کے پیش نظر نسخہ کے آخر میں حصۂ اوّل کے آخری چار ابواب مکرر نقل کئے ہیں۔ البتہ باب ہجدہم" نیا ہی کتاب کے پہلے حصہ میں وہ نہیں ہے اس کا موضوع "قبائل و شعب عرب و عجم" ہے۔ مقدمہ کتاب میں بھی مولف نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ وہ تختہ بھی ہے جو پہلے حصہ میں بھی شریک ہے۔ آخر میں "خاتمہ" درج ہے۔

پیش نظر نسخہ جو کتب خانہ آصفیہ میں مخزون ہے (نمبر ۱۰۴۰ تاریخ فارسی) ۱۲۲۲ھ میں بمقام بلدۂ حیدرآباد میر حیدر علی نے معصوم علی خان کے لئے لکھا۔ صفحۂ اوّل پر ترقیم ہے کہ ضمصام الدولہ کے نسخہ سے اس نسخہ کی تصحیح عمل میں آئی۔

غرض یہ اور ایسی بیسیو کتابیں نوجوان تاریخ دان اہل ملک کی توجہ کی طالب سرکاری اور خانگی کتب خانوں میں بند پڑی ہوئی ہیں۔

تنقید کے لئے کتابیں راست دفتر مجلہ پر بھیجی جائیں

تنقید و تبصرہ

باقیات بجنوری

چھوٹی سائز، حجم (۲۴۴) صفحات، مجلد قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ سکہ حکومت ہند کاغذ اعلیٰ درجہ کا طباعت عمدہ ٹائپ میں۔ ناشر، مکتبہ جامعہ دہلی۔

یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے بعض مضامین، مکتوبات، اور منظومات کا مجموعہ ہے۔ دنیائے اردو میں بجنوری مرحوم کو غالب کے معتقد بلکہ پرستار اور دیوان غالب کے نسخہ حمیدیہ[1] کی اشاعت کی وجہ سے اچھی طرح تعارف حاصل ہے وہ مرحوم بجنوری ہی تھے جن کی وجہ سے عصر حاضر میں غالب کو دنیائے سخن کا ایک نامور تاجدار سمجھا جانے لگا ہے۔ مرحوم کی دانست میں ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں جن میں سے ایک دیوان غالب ہے اگرچہ مرحوم نے اپنی کتاب محاسن کلام غالب میں غالب کے متعلق نہایت افراط سے کام لیا ہے اور اسکی تعریف میں بڑی حد تک مبالغہ کو جگہ دی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ مرحوم کی وجہ سے غالب سے عام دلچسپی پیدا ہوگئی اور یہ بھی بجا ہے کہ خود مرحوم بجنوری کی شہرت بھی اس سے ہوئی۔

زیر بحث کتاب میں جو مضامین وغیرہ موجود ہیں اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) گلستان جلی از صفحہ ۱ تا ۱۷ (۲) وضع اصطلاحات علمیہ ۱۸ تا ۴۵ (۳) سیر لکھنؤ ۴۶ تا ۵۲

---

[1] دیوان غالب کا ایک قلمی نسخہ بھوپال کے سرکاری کتب خانہ حمیدیہ میں موجود ہے جس کے نسبت مرحوم کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی صحت خود غالب نے کی ہے اس کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللطیف نے نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اس نسخہ کو ہم نے بھی دیکھا ہے جبکہ وہ ڈاکٹر لطیف کے لئے بھوپال سے حیدری صاحب نے طلب کیا تھا۔ اور دفتر دیوانی میں آیا تھا۔

(۴) داشتۂ آید بکار ۵۳ تا ۱۱۴ (۵) مکتوبات ۱۱۵ تا ۲۳۰ (۶) منظومات ۲۳۴ تا ۲۴۲-

اس کے علاوہ ابتدا میں (۸) صفحے کا تعارف بھی ہے جس کو پروفیسر رشید احمد نے لکھا ہے اور اپنے فرض کو عمدگی سے انجام دیا ہے۔ مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا بلکہ حق اور انصاف کو پیش نظر رکھ کر اپنا نقطہ نظر صاف صاف لکھا ہے۔

"گیتان جلی" کا مضمون جیسا کہ خود اس کے عنوان سے ظاہر ہے گیتان جلی کا تعارف ہے جس وقت یہ کتاب شائع ہوئی بجنوری مرحوم انگلستان میں موجود تھے وہاں کے تاثرات کو بڑی اچھی طرح اس مضمون میں سمایا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"جہاں میں اکثر کتابیں خرید اکرتا تھا، داخل ہوا، دکان دار نے اپنے خریداروں سے ازراہ فخر کہا کہ یہ ٹیگور کے ہم وطن ہیں، ہر طرف سے مجھ پر پرورش ہونے لگی، اور آپ کو اور ہندوستان کو مبارک ہو کی صدائیں بلند ہونے لگیں، .... اس کے بعد جب میں انگلستان سے المانیہ واپس آیا وہ عین وہ زمانہ تھا کہ نوبل انعام کو عطا ہوئے دس بارہ روز گذرے تھے ٹیگور کا نام زبان زد تھا اور ہر کہ و مہ کے لب پر بھی یہی تذکرہ تھا، علمی اور شاعرانہ دنیا میں کیا چرچے تھے، ہفتہ بھر کے اندر گیتان جلی ترجمہ ہو کر شائع ہو گئی تھی اور مہینہ کے ختم تک باغبان اور ہلال کے تراجم کے طبع ہو جانے کا اشتہار تھا، ...... ایک مہینے کے اندر اندر علاوہ باغبان اور ہلال کے تراجم کے رابندرناتھ ٹیگور کی سوانح عمری بھی شائع ہو گئی۔"

اس کے برخلاف ہندوستان میں کیا حالت تھی اس کے متعلق بھی خود بجنوری مرحوم کے الفاظ قابل ملاحظہ ہیں

"جب ہندوستان واپس آیا تو میرا خیال تھا کہ یہاں کی علمی دنیا میں بھی یہی حالت ہوگی، اور ٹیگور کے اعجاز قلم نے سب کو حیرت میں ڈال دیا ہوگا لیکن یہاں عام طور پر تعلیم یافتہ جماعت کو ٹیگور کے نام سے ناآشنا، اور خواص کو اس کی خوبیوں کا منکر پایا۔"

ان اقتباسات سے واضح ہو سکتا ہے کہ زندہ قوموں میں علم کی ترقی کی کیا حالت ہوتی ہے اور زندہ قومیں کس طرح علم کے جویا اور علم کے متوالے ہوتے ہیں۔

باقیات بجنوری میں دوسرا مضمون "وضع اصطلاحات علمیہ" کے متعلق ہے۔ اس مضمون کا بڑا حصہ اس بحث پر مشتمل ہے کہ کسی ملک کی ترقی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک تعلیم خود اس ملک کی زبان میں نہ ہو، اس کے بعد مرحوم نے اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ مضمون

جس وقت لکھا گیا تھا۔ اس وقت جامعۂ عثمانیہ ہنوز قایم نہیں ہوئی تھی، غالبًا اس مضمون اور مرحوم بجنوری کے ان ہی خیالات کا نتیجہ تھا کہ راس مسعود صاحب کا ارادہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کی صدارت پر مرحوم بجنوری کو لینے کا تھا، مگر افسوس کہ قیام جامعہ کے قبل ہی بجنوری دوسری دنیا کو سدھار گئے۔

اپنے مضمون میں مرحوم بجنوری نے سائنس کے جملہ اصطلاحات کو اردو میں ترجمہ کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے ان کی رائے ہے کہ ہر لفظ کا ترجمہ ہونا چاہیئے۔ جامعۂ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں اولاً اس خیال پر عمل بھی ہوا، چودھری برکت علی مرحوم پروفیسر کیمیا اور مولوی وحید الدین سلیم بھی اس رائے سے متفق تھے۔

اس مضمون میں صرف انگریزی زبان سے کتابوں کو ترجمہ کرنے کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ عربی اور فارسی کتابوں کے ترجمہ کی جانب بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ مرحوم نے نہایت شد و مد کے ساتھ بتایا ہے کہ عربی زبان میں بہت کچھ موجود ہے اس سے استفادہ نہ کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی، مثالوں کے ذریعہ اپنے بیان کو ثابت بھی کیا ہے، کوئی شک نہیں ہے کہ بجنوری مرحوم نے جو خیالات ظاہر کئے تھے اب ان کی بخوبی توثیق ہوتی جارہی ہے۔ مثلاً مرحوم نے لکھا ہے کہ:۔

"کیا عقل سلیم یہی مشورہ دیتی ہے کہ روما کی چار گنی چنی کتابوں کا مطالعہ قانونی علم حاصل کرنے کیلئے کافی ہے؟ اور اسلامی فقہ کی سینکڑوں کتابوں میں سے منتخب کتابوں کا مطالعہ ناکافی ہے؟ کیا عقل کا یہی تقاضا ہے کہ مسلمان طلبہ اپنے قانونی علم کی بنیاد رومائی درسیات پر رکھیں، اور اسلامی کتب کو طاق نسیان پر ہی رہنے دیا جائے روما کے قوانین کی تحقیق اور جستجو سے ہمیں کیا حاصل ہے؟ اسلامی فقہ کی چھان بین، تنقید و تحقیق سے ہم اسلامی قوانین میں ایک تازہ روح پھونک سکتے ہیں"۔

بجنوری مرحوم کی یہ آرزو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اور مولوی محمد غوث صاحب کی تصانیف سے جس طرح پوری ہو رہی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

سیر لکھنو والے مضمون میں شاہان اودھ کی تصاویر دیکھ کر ان کے متعلق خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

"داشتۂ آید بکار" ایک تفصیلی یادداشت ہے جس کو مرحوم نے انگلستان سے اپنے بھائی کے نام روانہ کیا ہے جبکہ وہ علی گڈھ میں شریک ہو رہے تھے، اس میں طالب علم کی زندگی اور اس کے مطالعہ اور

صحت کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں وہ ایک عمدہ دستور العمل اور بہترین نظام العمل ہے جس پر عمل کرنے سے ہمارے طلبہ اپنے مستقبل کو سنوار سکتے ہیں ۔

مکتوبات وہ ہیں جن کو مرحوم نے انگلستان، جرمنی اور استنبول سے اپنے والدین بھائی اور دوستوں کے نام روانہ کئے، اس میں یورپ کی زندگی اور طرز معاشرت پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ترکی کی سیاسی حالت کا بھی تذکرہ ہے، مرحوم استنبول سے روانہ ہونے کے چند روز بعد ہی جنگ بلقان کا آغاز ہوا ہے، جو خیالات ترکوں کے متعلق ظاہر کئے گئے ہیں وہ کس طرح آج صحیح ثابت ہوئے تعجب سے خالی نہیں ان خطوط سے یہ بھی واضح ہے کہ بجنوری مرحوم کو مشرق اور اسلام سے کیسی محبت تھی اور وہ کس طرح ترکی کی ترقی سے خوش ہوتے تھے اور خود ترکوں کو ہندوستان کے مسلمانوں سے کیسی ہمدردی تھی ۔

آخر پر **منظومات** ہیں جو طرز جدید پر لکھی گئی ہیں جس کی پیروی زمانہ مابعد میں عظمت اللہ خاں مرحوم نے بھی کی ۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ طرز جدید جو آج کل ترقی پر ہے ۔ بجنوری مرحوم کی ہی بنا ڈالی ہوئی ہے ۔

اس مختصر وضاحت سے باقیات بجنوری کا خاکہ ذہن نشین ہو سکتا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ مجموعہ نہایت مفید اور کار آمد مضامین پر مشتمل ہے ۔ مکتبہ جامعہ نے ان کو شائع کر کے اُردو زبان اور ادب کی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی بھی خدمت کی ہے ۔

ن ۔ ھ

ضروری اطلاع

مجلہ انجمن طیلسانین عثمانیہ کے صرف ان ارکان کی خدمت میں بھیجا جاتا ہے جن سے مجلہ کا چندہ پیشگی وصول ہو جائے ۔ کاغذ اور سامان طباعت کی بے انتہا گرانی کی وجہ سے اس قاعدہ کی پابندی بہت ضروری ہو گئی ہے ۔ امید کہ ارکان انجمن مجلہ کا چندہ جو سالانہ صرف ایک روپیہ ہے جلد ادا فرما کر ممنون فرمائیں گے

انجمن طیلسانین عثمانیہ اور اسکی ملحقہ جماعتوں کی اطلاعات
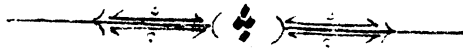
اطلاعات انجمن

۱۔ انجمن سے عثمانیہ انجینئرنگ گراجوئیٹس سوسی ایشن کے الحاق سے متعلق گفت وشنید مکمل ہو چکی ہے اور انجمن کے آیندہ جلسۂ عام میں یہ مسئلہ پیش کیا جائے گا۔

۲۔ کابینہ انجمن نے امور مندرجۂ ذیل کے متعلق ضروری کارروائی اختیار کی ہے

(۱) طیلسانین شعبۂ انجینئرنگ کے حقوق کا تحفظ۔

(۲) منتخب انجمن برار کا تعلیمی اور ثقافتی دورہ۔

(۳) انجمن اتحاد جامعۂ عثمانیہ کے تعطل کی یکسوئی۔

۳۔ کابینہ نے طے کیا کہ انجمن کے فنڈ مدرسہ خانہ سرکار عالی کے سیونگ بنک میں کھولے جائیں۔

۴۔ مولوی سید محمد اعظم صاحب کے نظامت تعلیمات پر تقرر کے سلسلہ میں کابینہ میں مندرجۂ ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

"نظامت تعلیمات پر مولوی سید محمد اعظم صاحب کے تقرر پر صاحب موصوف کو مبارکباد دیجاتی ہے اور مملکت آصفیہ کی تعلیمی ترقی کے لئے بہترین توقعات وابستہ کی جاتی ہیں۔ مولوی سید محمد اعظم صاحب اس وقت ملک میں مسلمہ ماہر تعلیم ہیں جن کو تعلیم اور انتظام تعلیم کا دیرینہ تجربہ حاصل ہے۔ کابینہ انجمن کی رائے میں سرکار عالی نے اس خدمت پر مولوی سید محمد اعظم کا جو تقرر فرمایا وہ اہل ملک کے لئے طمانیت اور مسرت کا موجب ہے"

۵۔ کابینہ اور ارکان کابینہ دسویں سالانہ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ کے انتظامات میں مصروف رہے،

اس کا انعقاد ۲۹ و ۳۰ فروردی کو عمل میں آیا۔ تفصیلات اخبارات میں شایع ہو چکے ہیں۔ مجلہ کی آیندہ اشاعت میں مکمل روئداد اور مقالات وغیرہ شایع ہوں گے۔

اطلاعات نمایش

۱۔ مجلس عاملہ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۳ اسفندار میں مجلس نمایش کے مالیات کے متعلق قواعد منظور کئے ان قواعد کی رو سے مجلس عاملہ ہر سال ایک ذیلی کمیٹی "مالیاتی کمیٹی" کے نام سے مقرر کرے گی اور تاوقتیکہ نئی کمیٹی کی تشکیل نہ ہو جائے سابقہ کمیٹی کام کرتی رہے گی۔ اس کمیٹی میں صدر، نائب صدر، معتمد اور خازن کے علاوہ اور (۵) ارکان ہوں گے ان قواعد کی رو سے مالیاتی کمیٹی کے اختیارات اور فرائض کا تعین کیا گیا ہے اور رقم کے صرف کرنے کے عام اصول متعین کئے گئے ہیں۔

۲۔ حسب سفارش مالیاتی کمیٹی حیدرآباد اسٹیٹ بنک کے (۱۰۰) حصص (۲۰ ۱۳۸) روپے میں خرید گئے۔

۳۔ آیندہ نمایش کے سلسلہ میں ضروری امور پر غور کرنے کے لئے ایک [illegible] قائم کی گئی یہ کمیٹی سابقہ [illegible] کی روشنی میں تجاویز مرتب کرکے پیش کرے گی۔ آیندہ نمایش کے بجٹ کا تخمینہ کرے گی۔ اضلاع سے بہ کثرت صناعوں کی شرکت کے وسائل فراہم کرے گی۔ تمام اخراجات پر تفصیلی طور سے غور کرکے یہ رائے پیش کرے گی کہ کن امور میں مزید کفایت ہوسکتی ہے اور بہ اغراض مجلس نمایش کن ابواب میں مزید خرچ کی ضرورت ہے۔

۴۔ اضلاع میں صنعتی نمایشوں کا انعقاد عمل میں آرہا ہے اور ان کی امداد عمل میں لانے سے مجلس نمایش کا مقصد پورا ہوتا ہے لہٰذا حسب ذیل قواعد منظور کئے گئے۔

(۱) مجلس نمایش ہر سال مناسب رقم اضلاع کی نمایشوں کے انعقاد ان کی امداد اور صناعوں کی حوصلہ افزائی کے لئے منظور کرسکے گی۔

(۲) مجلس نمایش اضلاع کی نمایشوں کے لئے اپنا مملوکہ سامان بھی بعد اطمینان بہ شرائط مناسب مستعار دے سکے گی۔

(۳) جن مقامات پر نمایشوں کا انعقاد ہو اس کے منتظمین کی جانب سے امداد کی درخواست بلحاظ حالات

متعامی بتوسط اعلیٰ عہدہ دار سررشتہ مال مجلس نمایش کے پاس مناسب عرصہ قبل بھیج جائے گی۔

(۴) جو رقمی امداد مجلس نمایش منظور کرے گی اس کا صرفہ مختص طور پر مقامی صناعوں کی امداد و اعانت کے لئے ہوگا اور اس امداد پانے والے صناعوں کو اقرار نامہ داخل کرنا ہوگا کہ وہ مجلس نمایش کے منعقد کردہ نمایش مصنوعات مملکت آصفیہ میں شرکت کریں گے یہ شرکت دو طرح سے ہو سکے گی۔

(الف) علحدہ اسٹال قائم کیا جائیگا اور اس صورت میں عام صناعان اضلاع کے ساتھ جو رعایتیں کی جاتی ہیں ان سے یہ بھی مستفید ہوں گے۔

(ب) اپنا سامان مرکز مصنوعات ملکی کے اسٹال میں داخل کیا جائے گا اور اس سے متعلقہ شرائط کی پابندی کی جائے گی۔

(۵) مقامی منتظمین کی رائے سے بمشورہ مقامی اعلیٰ عہدہ دار مال اس کا تعین ہوگا کہ صناعان مقامی کی کس قسم کی مدد دی جائے ان کی رقمی امداد کا تعین بھی حسب صراحت بالا ہوگا۔ البتہ رساید مجلس نمایش میں بھیجی جائیگی۔

(۶) مقامی منتظمین نمایش علاوہ ان تفصیلات کے کہ رقمی امداد مجلس نمایش کا صرفہ کن صناعوں پر کیا گیا مقامی نمایشوں سے متعلقہ اعداد اور دیگر تفصیلات حسب خواہش مجلس نمایش فراہم کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔

(۵) نلگنڈہ کی نمایش میں امداد صناعان کے لئے ایک سو روپے منظور کئے گئے۔

رپورٹ نمایش اطفال

عثمانیہ بلدی جماعت کی جانب سے بتاریخ ۳۰ - بہمن ۱۳۵۲ ف صلی احاطہ نمایش باغ عامہ میں نمایش اطفال منعقد ہوئی، تقریباً ایک سو پچاس بچے شریک تھے، پردہ دار خواتین کے لئے پردہ کا انتظام تھا، حکیم بارائن داس صاحب دیدیان دیداس نمایش کے داعی تھے، صدر جماعت نواب ناظر یار جنگ اور معتمد جماعت غیاث الدین خان صاحب کے علاوہ نواب خواجہ سردار اللہ خان صاحب جاگیردار اور مولوی یوسف الدین صاحب ام اے، اور مولوی حامد معین الدین صاحب یم یس سی، عثمانیہ نمایش اطفال کے ارکان تھے۔ ڈاکٹر منور علی صاحب، ڈاکٹر عبدالحی صاحب، ڈاکٹر اشفاق حسین صاحب رضوی، ڈاکٹر سر مدحیدر نائیڈو صاحب اور ڈاکٹر عبدالرحیم صاحب نے

بچوں کا طبی معائنہ کیا۔ محترمہ سنگرکیا اور محترمہ باقر علیخاں نے ڈاکٹر صاحبان موصوف کے ساتھ حسب ذیل بچوں کو انعام کا مستحق قرار دیا۔

طبقۂ اوّل

(تا ایک سال)

پہلا انعام	احمد سعید خان ولد محمد عثمان خان صاحب
دوسرا انعام	سید نعیم اللہ ملتانی ولد سید محمد مرتضیٰ صاحب
تیسرا انعام	لچمیا ولد راما سوامی صاحب
زائد انعام	لیلا پربھا بنت گنپت راؤ صاحب
" "	لیلیٰ بنت فیض محمد صدیقی صاحب

طبقۂ دوم

(ایک تا دو سال)

پہلا انعام	ذکیہ بنت قاسم عبدالوحید صاحب
دوسرا انعام	نرسنگھ جی ولد شرفن جی صاحب
تیسرا انعام	وجاہت حسین ولد یوسف حسین صاحب
زائد انعام	فرحت اللہ خان ولد خواجہ معین الدین خان صاحب

طبقۂ سوم

(دو تا پانچ سال)

پہلا انعام	مظہر الدین ولد نواب صمد یار جنگ بہادر
دوسرا انعام	محمود صدیق ولد غلام محمد صدیق صاحب
تیسرا انعام	صبیحہ دردانہ بنت ابوبکر خان صاحب خویشگی
زائد انعام	سلطان جہاں بنت محمد اسلم صاحب
" " "	شجاع الدین ولد شیخ احمد صاحب گتہ دار

حکیم نارائن داس رولنگ کپ کے احمد سعید خان کے والدین اور راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی رولنگ کپ مرکز بہبود ئی اطفال بیگم بازار اور نواب خواجہ سرار اللہ خان کپ کے ذکیہ بنت قاسم عبدالوحید صاحب

مستحق قرار پائے۔

مزید انعامات خواجہ حمید احمد صاحب بی۔اے (عثمانیہ) معتمد معاشی کمیٹی اور مولوی جلال الدین صاحب کی طرف سے دیئے گئے۔

ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی صدر نمائش مصنوعات ملکی نے بچوں کو تبایغ مرفوردی انعامات عطا کئے۔

مجلۂ طیلسانیین

حصۂ

معاشیات

شمارۂ روئداد پانچویں معاشی کانفرنس و نمائش

دوسری جلد۔ اردی بہشت ۱۳۵۲ف، ربیع الاول ۱۳۶۲ھ، مارچ ۱۹۴۳ء دوسرا شمارہ

مدیر مجلۂ طیلسانیین: محمد غوث ام اے، ال ال بی (عثمانیہ)

فہرست مضامین

صفحہ

ارشاد ملوکانہ

پانچویں نمایش مصنوعات ملکی کے افتتاح کے موقع پر

آج مجھ کو اس نمایش کا افتتاح کر کے مسرت ہوئی یہ نمایش اہل ملک میں پسندیدہ اور ہر دلعزیز ہے اس کی ابتدا سے میں ہر سال اس میں آیا کرتا ہوں۔ لیکن اس سال میں نے بانیان نمایش کی خواہش پر خود اس کا افتتاح کرنا اس لئے قبول کیا کہ اس سے لوگوں پر ملکی صنعت اور تجارت کی اہمیت ظاہر ہو اور اس کو ترقی اور فروغ دینے کی طرف اہل ملک کی توجہ مائل ہو۔

ف ۲۔ اس نمایش کے بانی جامعہ عثمانیہ کے قدیم طلبہ ہیں انہوں نے ملکی صنعتی ترقی کیلئے جو عملی کام کیا ہے اس سے ان کی ہمت اور حوصلہ کا پتہ ملتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جامعہ کی تعلیم و تربیت کے بدولت ان میں علمی ذوق و شوق کے علاوہ عملی کام کرنے کی بھی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے جو قابل قدر ہے ضمناً میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حالیہ سیاسی فسادات اور ہنگاموں میں میری جامعہ کے طلبہ نے جو نظم و ضبط قائم رکھا اور موجودہ سیاسی ہلچل میں حصہ لینے سے اجتناب کیا ان کا یہ اچھا رویہ دوسروں کے لئے قابل تقلید ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں ہز اکسلنسی وائسرائے بہادر نے مجھکو مبارکباد کا پیام بھیجا ہے۔

ف ۳۔ آج کل کی جنگ سے مختلف قسم کے اشیاء کی درآمد بند ہو جانے سے ان اشیاء کو خود ملک میں تیار کرنے کی ضرورت داعی ہوئی ہے اور اس طرح لوگوں کو ملکی صنعت کو فروغ دینے کا موقع ملا ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر اس بات کی کوشش کریں کہ خود ملک کی صنعت اور پیداوار ہماری اکثر ضرورتوں کو کافی ہو جائے۔ کیا اچھا ہو اگر ہر شخص اس بات کا عزم کر لے کہ وہ اپنے ضروریات زندگی کی چیزیں اپنے ملک کی بنی ہوئی خریدے اور صرف وہ اشیاء جو ملک میں تیار نہیں ہوتیں باہر سے خریدے بلکہ انکے بارے میں بھی یہ فکر کرے کہ کیوں نہیں وہ چیزیں ملک میں بنائی جائیں۔

ف ۴۔ جنگ کی وجہ سے جو بعض صنعتوں کو قائم کرنے کے مواقع حاصل ہو گئے ہیں ان سے میری حکومت بے خبر نہیں ہے بلکہ اس کی کوشش کر رہی ہے کہ اس ملک کے اشیائے خام کو حتی الامکان صنعتوں کے کام میں

کیا جائے تاکہ اس کا مالی فائدہ نہ صرف کارخانوں بلکہ غریب کاشتکاروں کو بھی حاصل ہو جو ان اشیاء خام کو پیدا کرتے ہیں نیز ان مزدوروں کو روزی نصیب ہو جو کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔

ف ۵۔ ہر ملک کی صنعتی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جس ملک نے اپنی فرصت اور مواقع سے فائدہ اٹھایا اور بروقت عمل کیا کامیاب رہا جو سوچتا رہا اور عمل میں پیچھے رہا اس سے میدان معیشت میں دوسرا بازی لے گیا۔

ف ۶۔ جامعۂ عثمانیہ سے متعلق ایک زرعی کالج قائم کرنے کی تجویز خود جامعہ کی اسکیم میں داخل ہے لیکن بوجہ مصارف جنگ اس پر عمل نہیں ہو سکا ہے جنگ کے اختتام پر اس میں بعجلت کام ہونا چاہیئے۔

ف ۷۔ مگر صنعتی ترقی محض حکومت ہی کے ذمہ نہیں ہے ملک کے سرمایہ داروں کا خود معاشی مفاد اس میں ہے اور ان کا اخلاقی فرض بھی ہے کہ ملک میں جن اشیاء کی کھپت ہوتی ہو ان کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور ان اشیاء کی تیاری کے اسکیم بنائیں اور حکومت سے سہولتیں اور مشوروں کے طالب ہوں۔ اس طرح ملک میں روزگار کے بڑھانے اور بے روزگاری کو دور کرنے میں ممد و معاون ہوں۔

ف ۸۔ آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ گو کہ نمائش اطمینان بخش ہے تاہم جن چیزوں کی نمائش کی جاتی ہے ان کو کافی مقدار میں بازار میں لاتے اور ان کی فروخت (اندرون و بیرون ملک) کرنے کا انتظام کافی طور پر نہیں کیا جاتا۔ یہ غرض پوری کرنے کے لئے اگر صناعوں کی ایک انجمن امداد باہمی قائم ہو تو مناسب ہے تاکہ ایک دوسرے کی مدد سے یہ کام انجام پا سکے۔

ف ۹۔ الحاصل انجمن طلبہ قدیم نے جو کام کیا ہے وہ اپنی حد تک اچھا ہے مجھے امید ہے کہ یہ انجمن اہل ملک کی مدد سے آیندہ اور زیادہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرے گی اور اسکی کوشش کرے گی کہ حیدر آباد صنعت و حرفت میں ہندوستان کے کسی حصہ سے پیچھے نہ رہے۔

ف ۱۰۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے طلبا نے بھی جو نیک کردار یا آئین کا اظہار برٹش انڈیا کے خلفشار کے زمانہ میں کیا تھا اس کے متعلق ہز اکسلنسی وی والسرائے بہادر نے جو اظہار پسندیدگی کیا تھا میں نے بہ حیثیت چانسلر یونیورسٹی مذکور یہ پیام بتوسط سر ضیاء الدین احمد طلبا تک پہونچا دیا ہے جو یقیناً ان سب کے لئے موجب حوصلہ افزائی ہوا ہوگا اور جس کی آجکل کے پر آشوب زمانہ میں سخت ضرورت ہے کہ بغیر اس کے امن و امان قائم نہیں رہ سکتا فقط
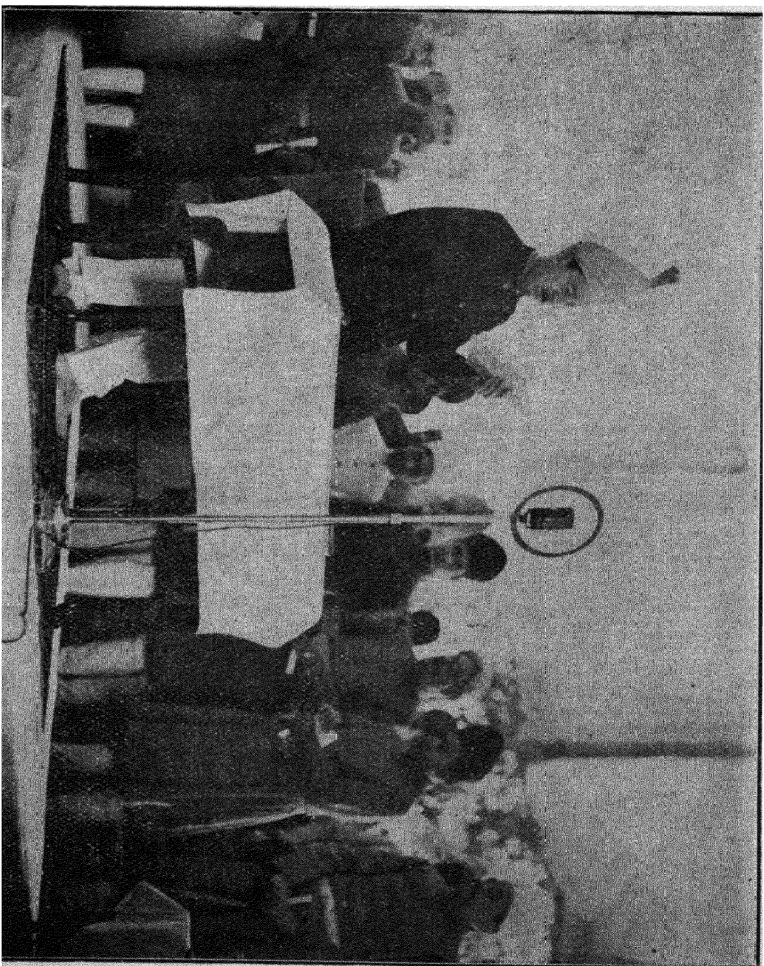
حضرت اقدس و اعلی سپاس نامہ کا جواب ارشاد فرما رہے ہیں
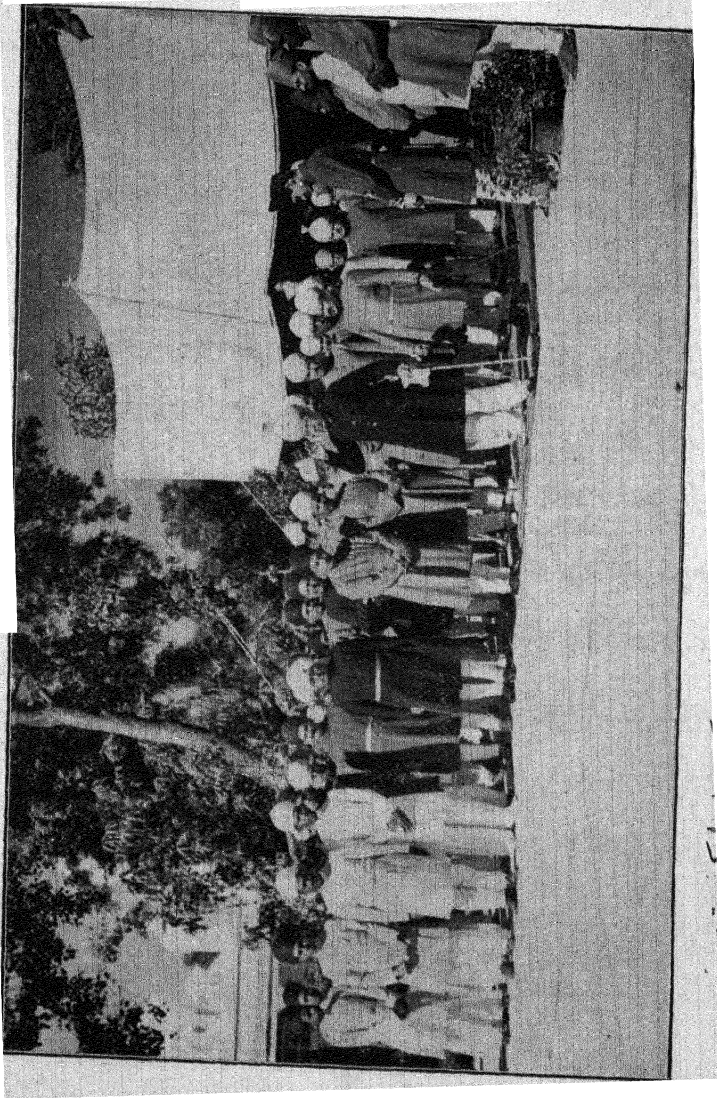
حضرت اقدس و اعلی پانچویں نمایش مصنوعات ملکی کے افتتاح کے موقعہ پر
ا۔۔ ادعطوفت شاھانہ اسکوٹ کی سلامی قبول فرما رہے ھیں

حرف آغاز

"معاشیات" کا یہ شمارہ پانچویں معاشی کانفرنس کے خطبات مقالوں اور مباحث نیز مصنوعات مملکت آصفیہ کی پانچویں نمائش کی بعض ضروری تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اسی لئے اسکو شمارہ روداد پانچویں معاشی کانفرنس و نمائش" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ نمایش کی افتتاح کے ارشاد ملوکانہ سے اس شمارہ کے اولین صفحات کو زینت دیگئی ہے۔

اس بات کا بہت افسوس ہے کہ کاغذ کی گراں قیمتی کی وجہ سے دوسرے مضامین کے لئے گنجائش کسی طرح نکالی نہیں جاسکی۔ "حیدرآباد کے مسایل معاشیات" اور "موضع دوپلّی کی معاشی تحقیق" کا سلسلہ بھی اس شمارہ میں قائم نہ رکھا جاسکا۔ اس امر کی وضاحت غیر ضروری ہے کہ اس نوعیت کے مقالوں کو قسط وار، طویل عرصہ تک طبع کرتے رہنے سے ان کی افادیت بہت کم ہوجاتی اور بسا مرتبہ اکثر ناظرین کے پاس اس کا سلسلہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہ زیادہ بہتر صورت ہوگی کہ مقالات بیک وقت طبع ہوجائیں اسی خیال کے تحت یہ انتظام کیا جارہا ہے کہ "موضع دوپلّی کی معاشی تحقیق" کا مقالہ آیندہ اشاعت میں بہ تمام وکمال شائع کردیا جائے تاکہ اسکی افادیت کم نہ ہوجائے اور دوسرے مقالوں یا تالیفات کی باری جلد آسکے۔

معاشی کانفرنس کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہونچی تو بعض حلقوں میں نہ معلوم کیوں کچھ کھٹک سی پیدا ہوئی۔ ۱۱ر جنوری کی اشاعت میں "گولکنڈہ پتریکا" نے ایک علحدہ "پیلز اکنامک کانفرنس" کی داغ بیل ڈالنے کے لئے زمین ہموار کی، اگر ملک میں نئے نئے ادارے قائم ہوتے ہیں تو چشم ما روشن دل ماشاد، لیکن کسی نئے ادارہ کے قیام کے لئے دوسرے ادارہ کو غلط طور سے مورد الزام بنانا نہ صرف مصلحت اندیشی بلکہ اخلاق و مروت کے بھی خلاف ہے۔

گولکنڈہ پتریکا نے معاشی کمیٹی کے خلاف مندرجۂ ذیل امور ظاہر کئے ہیں۔

۱۔ اس کانفرنس پر وہ توجہ مبذول نہیں ہورہی ہے جسکی وہ مستحق ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی طرح یہ کانفرنس بھی عہدہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔

۲۔ قائدین اور نیز پبلک اس میں زیادہ حصہ نہیں لے رہے ہیں۔

۳۔ تقریریں ایسی زبانوں میں نہیں ہوئیں جن کو پبلک آسانی سے سمجھ سکتی۔

۴۔ کانفرنس کی کافی تشہیر نہیں کی گئی۔

ان چاروں امور پر اگر غور کیا جائے اور حقیقت معلوم کی جائے تو صاف طور سے واضح ہوجائیگا کہ ہمارے معاصر نے اپنے خیال کی تقویت کیلئے معقول دلیلیں پیش نہیں کی ہیں۔

پہلے تو معاصر موصوف نے یہ شکایت کی ہے کہ اس کانفرنس پر وہ توجہ مبذول نہیں ہورہی ہے جسکی وہ مستحق ہے۔ اس شکایت میں مجلہ بھی ہم نوا ہے۔ سعدی نے کیا خوب لکھا ہے۔

"این شکم بے ہنر پیچ پیچ ــــــــ صبر ندارد کہ بسازد بہیچ

لیکن اسکے باوجود یہ حقیقت کس قدر تلخ ہے کہ اس مصیبت کو کم کرنے کے لئے ہم نہ تو عصری اصول معیشت سے واقف ہیں اور نہ اسکو قدیم آزمودہ تدبیر منزل سے پیوند دے سکتے ہیں۔ اپنے مسائل معاش سے اہل ملک کا تغافل روبہ زوال ہوتا جارہا تھا۔ اسی درد کے درماں کیلئے معاشی کمیٹی قائم کی گئی اور یہ محسوس ہورہا ہے کہ عامتہ الناس اپنی معاشی پستی کا نہ صرف احساس کررہے ہیں بلکہ اس پستی کو دور کرنے کی فکر بھی کررہے ہیں۔ گول کنڈہ پتریکا کا یہ خیال کہ لوگ اس کانفرنس پر اس لئے توجہ نہیں کرتے کہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی طرح یہ کانفرنس بھی عہدہ داروں کے ہاتھ میں کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے۔

عہدہ داروں کے ہاتھ میں کانفرنس ہونے یا نہ ہونے کی بحث تو خیر علحدہ ہے لیکن اگر بالفرض تسلیم بھی کرلیا جائے کہ یہ کانفرنس عہدہ داروں کے ہاتھ میں ہے تو اس میں قباحت کیا ہے۔ اس مسئلہ پر کچھ صراحت کرنے کی ضرورت ہے۔

برطانوی ہند کے برخلاف حیدرآباد میں حکومت اور رعایا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا مقصد مملکت کی ترقی اور خوشحالی ہے۔ مملکت کے بادشاہ اور ان کی حکومت نے کبھی یہ دعوی نہیں کیا کہ ان کے اغراض رعایا کے اغراض سے جدا ہیں۔

اعلیحضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہ نے جشن سیمیں کے موقع پر رعایا کے سپاسنامہ کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ

"میری بقیہ زندگی اپنی عزیز رعایا کی آسایش کے لئے وقف ہے اور خادم خلق اللہ ہونا میرا سب سے بڑا طرۂ امتیاز ہے اور از منۂ گزشتہ سے میرے خانوادہ کا یہ وتیرہ رہا ہے کہ رئیس وقت اپنی رعایا کا دل سے خیرخواہ اور بلا تخصیص قوم و ملت ان کی فلاح و بہبودی کو اپنی زندگی کا بہترین مقصد سمجھنے والا ہوتا ہے۔ میں بھی اپنے اس آبائی نقش قدم پر گامزن ہوں اور اگر میرے زمانہ میں ترقی کی رفتار مقابلتہً کچھ تیز رہی ہے تو یہ بھی خدا کا فضل ہے اور مجھ سے اگر تھوڑی بہت خدمت ملک کی عامل ہوئی ہے تو اس کا سب سے بہتر صلہ میری رعایا کی قناعت اور خوش حالی ہے۔"

یہ ارشاد ملوکانہ حکومت آصفیہ کے اصول حکمرانی و ملک داری کو جس خوبی سے واضح کرتا ہے وہ اپنی آپ شرح ہے۔ اس مبارک اصول کے پیش نظر مملکت آصفیہ میں ایسے روایات قائم ہوئے جو بلا شبہ قابل رشک ہوسکتے ہیں۔ مملکت آصفیہ میں قومی مفاد کے کاموں کی انجام دہی کے لئے غیر سرکاری اداروں میں شرکت کے لئے ملازمین سرکاری پر کبھی کوئی بندش عائد نہیں کی گئی۔ اس وقت ہمیں تاریخ کی ورق گردانی کرنی نہیں ہے خود مبارک دور عثمانی میں بعض رفاہی کاموں کی مثالیں ہمیں ایسی مل جاتی ہیں کہ جنکی تکمیل میں سرکاری ملازموں اور عامۃ الناس نے مشترکہ طور پر جد و جہد کی۔ حکومت بلکہ خود حضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہ نے اپنی صریح منظوری سے اسکو درست قرار دیا۔ اسکی مثال میں ہمیں خود حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی مثال پیش کرنے میں بھی کوئی خوف نہیں ہے۔ اس میں اگر سرکاری ملازمین شریک رہے تو انہوں نے سرکاری اعلیٰ ترین حکام کی موجودگی میں سرکاری تعلیمی پالیسی پر کھلی اور کھری تنقید میں کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ البتہ یہ تنقید تعمیری نقطۂ نظر سے ہوتی تھی اسکے مخلصانہ ہونے میں سرکار نے بھی کوئی شبہ نہیں کیا۔ کانفرنس میں رکاوٹ اسی وقت پیدا ہوئی جب کہ بعض لوگوں نے تنقید کو تنقیص اور تشویش کی صورت دینی شروع کی۔ مختصر یہ کہ اس مملکت کے روایات قدیمہ کے بموجب کبھی راعی اور رعایا میں ایسا فرق نہیں کیا گیا کہ دونوں کے اغراض و مقاصد علحدہ قرار پائیں۔ عہدہ داران سرکار بھی آخر اسی ملک کے باشندے ہیں اسی ملک میں

وہ پیدا ہوئے اور اسی ملک میں وہ تادم آخر رہینگے۔ انکے اغراض و مقاصد ملک کی عام صلاح و فلاح کے کسی طرح مغائر نہیں ہو سکتے۔ البتہ رائے کا اختلاف، طریقہ کار کا اختلاف اور نقطۂ نظر کا اختلاف ہو سکتا ہے، وہ عام رعایا کو سمجھ سکتے اور عام رعایا ان کو سمجھ سکتی ہے۔ وہ لوگ جو عہدہ داروں اور عام رعایا میں فرق کرتے ہیں ملک کی کچھ اچھی خدمت انجام نہیں دے رہے ہیں۔ یہ جو خیال پیدا ہو رہا ہے کہ عہدہ دار عام اداروں سے الگ رہیں۔ یہ خیال چاہے کسی حلقہ میں کیوں نہ پیدا ہو۔ بہت خطرناک ہے اسکی وجہ سے ایسی خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے جس سے سود و بہبود ملک کے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہو جائیگی۔ یہ بحث بعض اور دوسرے نقاط نظر سے اور بھی تفصیل کی محتاج ہے۔ کسی دوسرے وقت اس پر تفصیل سے لکھا جائیگا۔

غرض اگر معاشی کانفرنس سرکاری عہدہ داروں کے ہاتھ میں ہے تو اس میں کوئی خرابی نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسکے کاروبار میں غیر سرکاری اصحاب کا بھی کافی حصہ ہے اور اسکی تاسیس و ترقی میں انہوں نے بھی بہت گراں قدر حصہ لیا ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ بیان کی گئی ہے کہ قائدین اور پبلک اس میں زیادہ حصہ نہیں لے رہے ہیں۔ قائدین سے کیا مراد ہے؟ معاشی کمیٹی کے قواعد کے رو سے کسی پر کوئی بندش نہیں ہے۔ ملک کا ہر باشندہ جسکو اپنے عزیز ملک کی معاشی ترقی سے انس ہے اس میں شریک ہو سکتا ہے۔ اگر ملک کے بعض نام نہاد قائدین اس میں حصہ نہیں لیتے ہیں تو قصور معاشی کانفرنس کا نہیں ہے۔ قصور تو ان قائدوں کا ہی ہے کہ ان کو اپنی قائدی برقرار رکھنے کے لئے چھوٹے چھوٹے کاروبار میں اس قدر الجھ جانا پڑا ہے کہ ملک کے اہم معاشی مسایل پر توجہ کرنے کیلئے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ اگر پبلک زیادہ حصہ نہیں لیتی تو معاشی کانفرنس کا کیا قصور۔ یوں اس نوعیت کی کانفرنسوں میں مشتعل پبلک کے ہزارہا افراد کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس سے قطع نظر کانفرنس میں قائدین بھی تھے اور عامۃ الناس بھی۔

۳۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس کانفرنس میں تقاریر ایسی زبان میں نہیں ہوئیں جنکو عامۃ الناس آسانی سے سمجھ سکیں۔ کانفرنس میں دو تقریروں کے سوا ساری تقریریں اردو میں ہوئیں۔ اردو میں

تقریر نہ ہو تو پھر کس زبان میں ہو، اگر اردو کو چھوڑ کر کسی اور زبان میں تقریر کی جائے تو اس وقت ہی یہ دعویٰ صحیح ہو گا کہ اس کانفرنس میں تقریریں ایسی زبان میں نہیں ہوئیں جنکو عامتہ النّاس آسانی سے سمجھ سکیں۔

۴۔ بیان کیا گیا ہے کہ کانفرنس کی نسبت کافی تشہیر نہیں کی گئی۔ اشتہار، پوسٹر، ہورڈنگ رقعۂ دعوت، ریڈیو، اخبار بھی ذرایع تشہیر کے ہیں اور ان سب سے پورا پورا استفادہ کیا گیا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ منتظمین کانفرنس شہر میں ڈھنڈورہ پیٹتے پھریں۔

گول کنڈہ پتریکا نے آخر میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ پبلک کو معاشی کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت دی جانی چاہیئے اور مختلف جماعتوں کے قائدوں کو بھی مدعو کرنا چاہیئے اگر یہ ممکن نہ ہو تو پیپلز ایجوکیشنل کانفرنس کی طرح ایک علیحدہ پیپلز اکنامک کانفرنس شروع کرنی چاہیئے۔ واضح ہو کہ معاشی کمیٹی میں شریک ہونے کیلئے کسی پر کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اس میں ہر محب وطن شریک ہو سکتا ہے اور ملک کی معاشی ترقی میں اپنے مقدور بھر حصہ لے سکتا ہے۔ اسی طرح معاشی کانفرنس میں عامتہ النّاس اور قایدوں کی شرکت کے لئے تشہیر و دعوت پہلے سے بھی جاری ہے اور آیندہ بھی اس پر پوری طرح عمل کیا جائیگا۔

اتنے سے عذر سے یہ تہیہ کرنا کہ پیپلز ایجوکیشنل کانفرنس کی طرح ایک علیحدہ پیپلز اکنامک کانفرنس شروع کی جائے کچھ امر معقول نہیں ہے۔ پیپلز ایجوکیشنل کانفرنس کس عذر کی بنا پر قائم ہوئی وہ ہمیں معلوم ہے۔ اس کی کچھ وضاحت ضروری ہے تاکہ معلوم ہو کہ کتنی چھوٹی باتوں پر لوگ مخالفت کی بنیاد قائم کر لیتے ہیں۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد قائم ہوئی تو اس نے اپنے دائرۂ عمل میں ملک کے سب طبقات کو جمع کر لیا۔ سرکاری حکام اعمال، اور عامتہ النّاس سب اسکے پلیٹ فارم پر جمع ہوئے مسلمان اور ہندو بلا امتیاز شریک ہوئے۔ اس طرح ملک کی تعلیمی ترقی کے لئے باہمی سعی و کوشش کا ایک مبارک دور شروع ہوا۔ عامتہ النّاس کی جانب سے سرکاری تعلیمی کاروبار پر جو مخلصانہ تنقید ہوتی اس کا جواب خود کانفرنس کے پلیٹ فارم پر سرکاری حکام کی جانب سے دیا جاتا۔ اس طرح غلط فہمیاں دور ہو جاتیں اور باہمی اعتماد کی فضا پیدا ہوتی۔ ایجوکیشنل کانفرنس کو تعلیمی مقاصد میں جو کامیابی حاصل ہوئی اس سے تقویت پاکر کانفرنس کے مقاصد میں معاشی ترقی کا مقصد بھی لاتور کے اجلاس کانفرنس میں شریک کر لیا گیا اور کانفرنس کا نام

"حیدرآباد ایجوکیشنل اینڈ اکنامک کانفرنس" قرار پایا۔ مقاصد کی توسیع کے بعد کانفرنس کا پہلا اجلاس پربھنی میں منعقد ہوا۔ ضرورت تھی کہ اس ابتدائی موقع پر حزم و احتیاط کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا اور باہمی اعتماد اور اشتراک عمل کی پہلی فضا برقرار رہتی لیکن بعض ممتاز اصحاب نے اس موقع سے غلط طور پر فائدہ اٹھانا چاہا اور گرم بیانی کی ایسی روایات قائم کرنی چاہیں جنکو کانفرنس سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس کا اعتماد زائل ہوگیا اور شبہات پیدا ہوگئے۔ اعتماد حاصل کرنے کیلئے کانفرنس نے جو سعی کی اس میں پورے پانچ برس گزر گئے۔ پانچ برس کے بعد کانفرنس کا اجلاس پھر حیدرآباد میں منعقد ہوا۔ اور ثابت ہوگیا کہ اعتماد حاصل کرنے کیلئے کانفرنس کی سعی پھر کامیاب ہوئی۔ اس تلخ تجربہ کے بعد لازمی تھا کہ کانفرنس حزم و احتیاط پر پہلے سے زیادہ عمل کرے۔ اس جائز احتیاط کو بعض لوگوں نے پسند نہیں کیا۔ اس اثنا میں کانفرنس کے بانی اور پہلے معتمد مولانا محمد مرتضی مرحوم کا انتقال ہوگیا اور کانفرنس کی کارفرمائی دوسرے ہاتھوں میں آئی۔ کانفرنس کے اجلاس کا زمانہ آیا تو بعض اصحاب نے یہ سوال اٹھایا کہ کانفرنس کسی تہوار میں منعقد نہ ہو۔ حالانکہ اب تک کانفرنس کے سلسلہ میں اس قسم کا سوال اٹھایا ہی نہیں گیا تھا۔ ہندو اور مسلمانوں کی تعطیلات میں کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوتے رہے تھے۔ کانفرنس کا اجلاس کبھی ہولی کی تعطیل میں ہوا تو کبھی بقرعید کے موقع پر۔ جمعہ کے دن بھی کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا ہے۔ بہرحال جو سوال اٹھایا گیا تھا وہ صرف اسی قدر تھا کہ کانفرنس کا اجلاس ایک خاص تعطیل میں منعقد نہ ہو۔ یہ معمولی سی بات ایسی نہیں تھی کہ باہمی سمجھوتہ سے طے نہ ہو جاتی لیکن اس وقت کے ارباب کانفرنس اور احتجاج کرنے والے دونوں نے ناواجبی شدت اختیار کی۔ ایک فریق نے اسی تعطیل میں جلسہ کرنا چاہا اور دوسرے فریق نے "اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا" کے مصداق "تعلیمی کانفرنس رعایا سرکار عالی" کے نام سے اپنا ادارہ علیحدہ قائم کرلیا۔ اگر اب بھی لوگ علیحدہ ادارے قائم کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی باتوں کا عذر پیدا کیا کریں تو ملک کی ترقی معلوم۔

پانچویں معاشی کانفرنس کے متعلق ضروری صراحت اس تمہید سے ہوگی جو معتمد معاشی کمیٹی مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی اے (عثمانیہ) نے لکھی ہے اور اس حرف آغاز کے بعد درج ہے۔

پانچویں معاشی کانفرنس

تمہیدِ روئداد

از جناب مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی اے (عثمانیہ) معتمد معاشی کمیٹی

۱۳۵۲ ف

معاشی کمیٹی انجمن طیلسانیین عثمانیہ کے زیر اہتمام پانچویں معاشی کانفرنس کا انعقاد بتواریخ ار و ۱۲ اسفندار عمل میں آیا۔ اور بحمد اللہ یہ کانفرنس پوری طرح کامیاب رہی۔ گذشتہ پانچ سال کے دوران میں اس کانفرنس نے بتدریج ترقی حاصل کرکے ملک میں اپنا ایک خاص مقام حاصل کرلیا ہے۔ چارسالہ سرگزشت چوتھی معاشی کانفرنس کی روئداد کے ساتھ شایع کردی گئی ہے۔ اس وقت ناظرین کے سامنے پانچویں معاشی کانفرنس کی مختصر کیفیت پیش کرنی مقصود ہے۔ مجلس عاملہ معاشی کمیٹی نے پانچویں معاشی کانفرنس کے انعقاد کے انتظامات کے سلسلہ میں حسب ذیل ارکین کی ایک کمیٹی مقرر کی۔

۱۔ لکشمی ناراین صاحب گپتا ایچ سی ایس صدر معاشی کمیٹی　　۲۔ عبد القیوم صاحب ایچ سی ایس نائب صدر معاشی کمیٹی

۳۔ میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر　　۴۔ ظہیر الدین احمد صاحب ام اے ایچ سی ایس

۵۔ میر محمود علی صاحب لکچرار سٹی کالج　　۶۔ عبد القادر صاحب بی ایس سی (آنرز) لندن لکچرار جامعہ عثمانیہ

۷۔ خواجہ حمید احمد معتمد کانفرنس

اس کمیٹی نے کافی غور و خوض کے بعد کانفرنس کے انعقاد و انصرام کے متعلق ضروری امور انجام دیئے طے پایا کہ کانفرنس کا افتتاح آنریبل مولوی غلام محمد صاحب صدر المہام فینانس سے کرایا جائے۔ کانفرنس کے دونوں اجلاسوں کی صدارت کیلئے مولوی محمد الیاس برنی صاحب (سابق صدر شعبۂ معاشیات جامعہ عثمانیہ) ناظم سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ سے درخواست کی گئی۔ لکشمی نارائن صاحب گپتا صدر معاشی کمیٹی کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر قرار پائے۔

کانفرنس میں مباحث کے لئے حسب ذیل چار موضوعوں کا انتخاب کیا گیا۔

۱۔ حیدر آباد میں محاصل اندازی کا مسلک۔

۲۔ حکومت اور زمانۂ جنگ کے معاشی مسایل

۳۔ کاشتکار اور زمانۂ جنگ کے اثرات

۴۔ حیدرآباد میں صنعتی سرمایہ کا مسئلہ

ملک کے مشہور ماہران فن اور اہل قلم حضرات سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے گراں قدر خیالات سے مستفید کریں۔ چنانچہ کانفرنس میں جو خطبات اور مقالات پڑھے گئے ان کا مجموعہ اہل ملک کے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔ قبل ازیں ملک کے جملہ روزانہ و ہفتہ وار اخبارات کے ذریعہ کانفرنس کے خطبات کی کافی تشہیر ہوچکی ہے۔ اخبار رہبر دکن۔ مملکت اور سلطنت نے خاص معاشی نمبر بھی شایع کئے ہیں۔ لیکن مجموعتہً ان سب کو ایک ساتھ شایع کرنا بہرطور ضروری متصور ہوا۔ عوام اور ارباب حکومت نے اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں جو حصہ لیا معاشی کمیٹی اس کی بے حد ممنون ہے۔

کانفرنس کے لئے فضیلت مآب نواب سر محمد احمد سعید خاں بہادر۔ بالقابہ صدر اعظم باب حکومت نے اپنی نوازش سے جو پیام مرحمت فرمایا وہ حسب ذیل ہے۔

"بعض ناگزیر مصروفیات کی بنا پر میں پانچویں معاشی کانفرنس کے اجلاس میں شرکت نہ کرسکا لیکن میں کانفرنس کی کامیابی کا دلی تمنی ہوں اور مجھے توقع ہے کہ اس کانفرنس کے مباحث ملک کی معاشی جدوجہد میں شمع ہدایت کا کام دینگے۔"

اس کانفرنس کے نتیجہ کے طور پر معاشی کمیٹی جو عملی تجاویز اختیار کر رہی ہے ان کی تفصیل کسی اور موقع پر پیش کی جائے گی۔

مطبوعہ انتظامی پریس

پانچویں معاشی کانفرنس

استقبالیہ تقریر

از جناب لکشمی نارائن گپتا صاحب، بیچ سی، ایس

عالیجناب محترم غلام محمد صاحب و معزز حاضرین!

بحیثیت صدر عثمانیہ معاشی کمیٹی آج میرا یہ خوشگوار فریضہ ہے کہ آپ حضرات کو معاشی کانفرنس کے اس پانچویں سالانہ جلسہ میں خوش آمدید کہوں میں جانتا ہوں کہ اس سالانہ اجلاس کا ہم سب کو انتظار رہتا ہے اسلئے کہ نہ صرف اس سے ماہرین معاشیات کو تبادلہ خیالات کا موقع ملتا ہے بلکہ ان تمام حضرات کو جنہیں اپنے ملک کی معاشی بہبودی عزیز ہے اپنے معلومات میں اضافہ اور خیالات میں اصلاح کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ عثمانیہ معاشی کمیٹی نوجوان طیلسانین عثمانیہ و دیگر بہی خواہان ملک کی توجہ اپنے ناچیز طریقہ پر وقت کی اہم ترین ضرورت یعنی ملک کی معاشی ترقی کی جانب منعطف کراتی رہی ہے۔ یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ اپنے اس فریضہ کی انجام دہی میں اس کمیٹی نے اپنے کو تمام مسائل نزاع و تصادم سے محفوظ رکھا ہے جسکا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو جہاں ملک کے ہر مکتب خیال سے معاونت حاصل ہے وہاں سرکاری حلقوں کی کامل تائید و سرپرستی بھی میسر ہے۔ چنانچہ چند سررشتہ جات سرکاری نے پوری پوری امداد و اعانت فرمائی ہے۔ اس کے لئے ہم بطور خاص مولوی احمد محی الدین صاحب ناظم سررشتۂ صنعت و حرفت کے ممنون احسان ہیں جو ہمیشہ ہمارے مشیر و رہبر رہے ہیں۔ میری یہ قوی امید ہے کہ ان حوصلہ افزا حالات کے تحت یہ کانفرنس سال بسال نمایاں ترقی کرے گی اور ان مسائل کے سلجھانے اور حل کرنے میں جن سے ان وسیع ممالک محروسہ کی معاشی فلاح و بہبود وابستہ ہے خضر راہ کا کام کرے گی۔

ہماری معاشی کمیٹی کی نمایاں ترین کارگذاری نمائش کمیٹی کا قیام ہے جو چند نوجوانوں کی قابل تحسین کوششوں

سے متواتر چار سال سے ایک صنعتی نمایش کا ایسے وسیع پیمانہ پر محض رضاکارانہ خدمات کے ذریعہ انتظام کر رہی ہے
نمایش کمیٹی کی کارگذاری کی اس سے بہتر اور کیا قدر افزائی ہوسکتی ہے کہ ہمارے آقائے ولی نعمت اعلیحضرت
خلداللہ ملکہٗ فرمانروائے دکن نے اسکو بنظر استحسان ملاحظہ فرمایا ہے۔ جس کیلئے ہم سب بارگاہ خسروی میں تہ دل سے
خراج تشکر و احسان پیش کرتے ہیں۔

حضرات! اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے جامعہ کے طیلسانیین نے ہر شعبۂ علم میں تحقیق و تجسس کے
ایسے ایسے مراحل طے کئے ہیں اور زندگی کی راہ عمل میں اپنی لیاقت اور قابلیت کا ایسا سکہ بٹھایا ہے کہ بیساختہ
دل سے کلمۂ تحسین و آفرین نکلتا ہے اور ہمیں امید بندھتی ہے کہ مدنی زندگی کی اہم ترین ضرورت یعنی معاشی
تحقیق و تجسس کی جانب بھی اب یہ ضرور اپنی توجہ معطوف کرینگے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اہم ضرورت کی تکمیل
کی طرف ابھی وہ اہل کوئی تشفی بخش قدم نہیں اُٹھایا گیا اور معاشی تحقیقات کیلئے ہمارا یہ وسیع ملک بالکل اچھوتا
پڑا ہوا ہے میں اس لئے اپنے جامعہ کے نوجوان طبقہ سے یہ عرض کروں گا کہ اپنے مادر علمی جس کی ترقی و
نیکنامی کا ولولہ ان کے نوجوان دلوں میں جوش زن ہے اور اپنی مادر وطن جس کی بہبودی و خوشحالی کے
وہ ہمیشہ خواہاں ہیں ہر دو کی خدمت کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ معاشی مسائل کی تحقیق اور چھان بین
میں دل و جان سے لگ جائیں کہ اس سے جہاں ذخیرۂ علم میں مفید اضافہ کے باعث اُس ادارۂ علمی کی نیکنامی
ہوگی جس نے آپ کو اپنی آغوش میں پرورش کر کے دولت علم سے مالا مال کیا ہے۔ وہاں آپ کے برادران
وطن کی زندگی کے اہم ترین گتھیوں کے سلجھنے سے ملک کی عام طور پر بہترین فلاح و بہبودی اسی میں مضمر ہے۔

حضرات! اس موقع پر میں ضرور سمجھتا ہوں کہ آپ کی توجہ سررشتۂ اعداد و شمار کے اس کام کیطرف
معطوف کراؤں جو چند سال سے وہ ایسے اعداد و شمار کے فراہم و طبع کرنے کی صورت میں انجام دے رہا ہے
جن سے نہایت مفید معاشی معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے گذشتہ اجلاسوں کے
صدر صاحبان اور دیگر معززین کا بھی ہم پر احسان ہے کہ اُن سے ہمارے معاشی علمی ذخیرہ میں کافی اضافہ
ہوا ہے۔ حیدرآباد معاشی انجمن (Economic Association.) کا بھی ہم پر احسان ہے
جس نے جناب مولوی سید محمد اعظم صاحب و جناب مولوی حبیب الرحمن صاحب کی سرکردگی میں مفید کام

انجام دیا ہے ۔ آپ حضرات کو یہ معلوم کرکے مسرت ہوگی کہ یہ معاشی انجمن اب عثمانیہ معاشی کمیٹی میں ضم ہوگئی ہے ۔ ہمارے یہاں جناب عبدالرحمن صاحب، نواب احسن یار جنگ بہادر اور مولوی عارف الدین صاحب جیسے اکثر اصحاب موجود ہیں جنھوں نے باوجودیکہ ان کا دائرۂ عمل معاشی نہیں ہے ۔ حیدرآباد کی صنعتی ترقی کیلئے بہت جامع اور وسیع مواد فراہم کیا ہے جس سے طلباء معاشیات کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔

حضرات ! میں ہمارے ملک کے معاشی مسائل کی تفصیلات میں جاکر آپ کا زیادہ وقت نہیں لونگا ۔ یہ کام میں جناب صدر کے ماہر ہاتھوں کیلئے چھوڑتا ہوں ۔ میں صرف عام دستور کے مطابق ان مسائل میں سے چند کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤنگا اس وقت خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔

حضرات ! ہمارے تمام معاشی مسائل اسوقت بالواسطہ یا بلاواسطہ موجودہ جنگ عظیم سے متاثر ہیں اس لئے کہ اس جنگ نے ہماری زندگی کے سماجی ۔ سیاسی اور معاشی ہر پہلو کو گھیر رکھا ہے ۔ ایسی صورت میں پہلا سوال جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ تلاطم و پریشانی کی حالت میں حکومت معاشی نقطۂ نظر سے رعایا کی کس حد تک حفاظت و اعانت کرسکتی ہے ۔ اس ضمن میں میں اُن بزرگوں سے متفق الرائے نہیں ہوں جو طلب و رسد کے عام قانون کو موجودہ معاشی طوفان کی رہنمائی کے لیے کافی سمجھتے ہیں ۔ دور جدید میں حکومت کے فرائض کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا ہے ۔ اب اس کے فرائض صرف اس پر ختم نہیں ہوتے کہ ملک کی بیرونی دشمن سے محافظت کیجائے اور ملک میں امن و امان قائم رکھاجائے بلکہ رعایا کی سماجی ضروریات اور معاشی حاجتوں کی تکمیل بھی اس کے فرائض میں داخل ہے یعنی رعایا کی ہر جہتی خوشحالی، بہبودی اور ترقی کا انتظام بھی اس پر فرض ہے کوئی حکومت جس قدر ان ہمہ گیر فرائض کی تکمیل میں کامیابی حاصل کرتی ہے اسی قدر اس کو استحکام اور قوت حاصل رہتی ہے ۔ جب زمانہ امن میں حکومتوں کے لئے یہ فرائض ہیں تو ظاہر ہے کہ زمانۂ جنگ میں جبکہ ہر طرف تلاطم بپا ہوا ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں پریشانی نمایاں ہے حکومت کے فرائض وسیع تر ہوجاتے ہیں اور عملاً حکومت کی امداد سے ایسا ربط اور ہم آہنگی پیدا ہونا محال ہے جس سے رعایا کی ہر جہتی ضرورتوں کی موثر اور سریع الاثر تکمیل ہوسکے ۔

یہ مقام مسرت و فخر ہے کہ زمانہ امن میں بھی ہماری حکومت اس جدید نظریہ کے مدنظر کسی سے پیچھے نہیں رہی

ہے۔ گذشتہ (۲۵) سال کے عرصہ میں ہمارے نامدار شہریار دکن اعلیٰحضرت قدر قدرت کے دور فیض برکت میں قومی استعماری کاموں میں ہماری حکومت نے روز افزوں دلچسپی لی۔ اور اب یہ کام خاصے وسیع پیمانہ پر چل رہے ہیں اور اس وقت بھی حکومت محاربۂ اعظم سے پیدا شدہ حالات سے جو فرائض اس پر عائد ہوتے ہیں اُن سے غافل نہیں ہے۔ اب یہ ماہران معاشیات کا کام ہے کہ اپنی ماہرانہ رائے سے حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔

جنگ نے معاشی سرگرمیوں کی ضرورت کو شدید کر دیا ہے جس کیلئے وسیع موقعے اور امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ بالخصوص صنعت و حرفت کے میدان میں ضرورت ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اور محض ہنگامی طور پر نہیں بلکہ مستقل طور پر ایسی صنعتوں کا قیام عمل میں لایا جائے جو ہمارے حالات اور ماحول کیلئے ضروری ہیں اور جن کیلئے ہم ہمیشہ دوسروں کا منہ تاکتے رہے ہیں۔

حضرات! جنگ کی وجہ پیدا شدہ معاشی سرگرمیوں کا ایک قدرتی نتیجہ INFLATION عوام کی قوت خرید میں غیر معمولی اضافہ ہے۔ لیکن جہاں آجکل دولتمندوں کی دولت میں وافر اضافہ ہو رہا ہے وہاں غریب تباہ ہوتے جا رہے ہیں۔ گرانی جو آسمان سے باتیں کر رہی ہے روزمرہ کی ضرورتوں کے سامان کی بڑھتی ہوئی کمی اور قوت پیداوار کا روزمرہ ضرورت کے اشیاء کی پیدائش کی بجائے دوسری اشیاء پر زیادہ مائل ہونے کی وجہ ایسی گتھیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ جنھیں اگر دانشمندی اور تدبر سے نہ سلجھایا جائے تو رعایا کی معاشی اور سماجی زندگی میں بڑی سراسیمگی پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ ایسی صورت میں حکومت کیلئے یہ ضروری ہے کہ قیمتوں کی روک تھام اور کھانے پینے کی چیزوں اور پہننے اوڑھنے کے سامان سب کو مہیا ہونے کی تدابیر کرے۔ ان میں سے اکثر انتظامات سرکار عظمت مدار اور ہماری سرکار ہر دو کر رہے ہیں ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ بہت اہم اور پیچیدہ ہے۔ اس لئے معاشی کمیٹی نے "اثرات جنگ اور فرائض حکومت" پر جو مضامین طلب کئے ہیں امید ہے کہ اُن سے ان مسائل پر کچھ مفید روشنی پڑے گی۔

اس موقع پر مجھکو یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضرات کی توجہ اُن تدابیر کی طرف مبذول کراؤں جو ختم جنگ پر ہمارے سماجی اور معاشی بگڑے اور بکھرے ڈھانچہ کو از سر نو بنانے

سنوارنے میں ہمیں اختیار کرنے پڑینگے۔ ہمارے گذشتہ تلخ تجربات ہمیں بتارہے ہیں کہ ان تدابیر کی تہ میں ایسے نئے خیالات اور نئے نظریئے ہونے چاہئیں جو ملکی اور قومی تحدیدیں اور تنگ نظری پر نہیں، بلکہ انسانیت کے اعلیٰ نصب العین پر مبنی ہوں اور جن پر عمل کرنے سے ہر ایک کو تکمیل ضروریات آرام و آسائش اور ترقی و نشو نما کے مساوی موقع حاصل ہوں۔ تحدیدوں کو مٹاکر ہمیں ساری دنیا کو ایک سمجھنا پڑے گا اور اپنے غور و فکر کو ایسی تدبیروں اور کوششوں پر مرکوز کرنا پڑے گا جس سے دنیا بھر کی دولت اور نعمت سے دنیا بھر کے آدمی بلا تفریق رنگ و قوم مذہب و ملت متمتع اور فیضیاب ہوسکیں۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں سیاسی اور معاشی امن استحکام کے ساتھ قائم ہو تو ہم کو خود غرضی کو چاہے ذاتی ہو یا قومی ملکی ہو یا ملی مٹاکر فراخدلی اور وسیع النظری کو جگہ دینا پڑے گا جس میں صرف انسانیت کا خیال اور جذبہ کارفرما ہو۔ ہر ملک کے داخلی انتظام میں بھی اس نئے زاویۂ نظر پر عمل کرنا ہوگا اور ملک کی پوری آمدنی وہاں کے بسنے والوں میں منصفانہ طریقہ سے تقسیم کرنی ہوگی یعنی ہر ایک کو اسکی ضروریات فراہم کی جائینگی اور ہر ایک سے وہ کچھ لیا جائیگا جو وہ دے سکتا ہے۔ اس طرح آدمی انسان کے سماجی امتیاز و تفوق کی چیز باقی نہ رہے گی۔ پیداوار کے کارخانے اور معاشی قوت کے ذرائع چند افراد کے ہاتھ میں نہ رہنے دیئے جائیں۔ بلکہ عوام کی فلاح و بہبود کے مدنظر ان پر حکومت کا قبضہ رہے اور جیسا کہ (منشور اوقیانوس)۔ اٹلانٹک چارٹر میں تجویز ہے۔ ایسا انتظام کرنا پڑے گا کہ کل سماج کی معاشی اور ہر قسم کے احتیاج سے حفاظت ہو۔ برطانیہ جیسے ملک نے بھی جہاں مدتوں سرمایہ گری اور قدامت پسندی کا دور دورہ رہا ہے اور جہاں برسوں سے انیسویں صدی کے لبرل اسکول کے معاشئین نے اپنا سکہ جمار کھا تھا آج تخیل شدت سے کام کر رہا ہے کہ جنگ کے بعد سماجی اور معاشی معاملات کا انتظام بالکل انصاف اور مساوات پہ ہو۔ حال حال میں جو بیوریج پلان (BEEVERIDGE PLAN.) شائع ہوا ہے اور جس کے چار بنیادی اصول یہ ہیں کہ پوری قوم کے ہر فرد کیلئے کام کی فراہمی، گذر اوقات کے لائق اجرت، رفع بیکاری کی ضمانت اور وظیفہ پیرانہ سالی و طبی امداد کا انتظام مہیا کیا جائے اسی نئے سطح نظر کو ظاہر کرتے ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ جنگ کے بعد ان ممالک میں بھی جہاں سرمایہ داری کا دور دورہ ہے جو معاشی نظام قائم ہوگا وہ سوشلزم

یا کمیونزم (اشتراکیت یا اشتمالیت) سے زیادہ مختلف نہ ہوگا۔ سوائے اس کے کہ اُس میں ذاتی جائداد کی ملکیت ممنوع ہوگی۔

حضرات! اس موقع پر قدرتاً مجھکو ہمارے موجودہ معاشی نظام کے بے ڈھنگے پن کا خیال آتا ہے۔ یہاں ایک طرف فاقہ کشی اور انتہائی بدحالی میں مبتلا کاشتکار اور بیکار بھیک منگے ہیں تو دوسری طرف ایسے دولت مند بھی ہیں جن کے پاس بے قیاس دولت ہے اور جن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنی دولت کو کسطرح صرف کریں اور جو ہمیشہ اس تلاش میں رہتے ہیں کہ اپنی دولت ایسے کاروبار میں لگائی جائے جس میں زیادہ سے زیادہ منافع حاصل ہو۔ یہاں شہری اور دیہی معاشیات کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ صدیوں سے ہم دیہاتوں کی دولت شہروں کو منتقل کرتے رہے ہیں۔ شہر جو خوش حال اور آراستہ نظر آتے ہیں تو دیہاتوں کی دولت پر۔ میرے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ شہر کے لوگ دیہات والوں کی فلاح و بہبود پر روپیہ صرف کریں۔ اگر ہم دیہات والوں کے حق میں اتنا بھی نہ کرسکیں کہ اُن سے اس وقت تک جو کچھ حاصل کیا ہے اُس کا کچھ حصہ ادا کردیں تو میرے خیال میں دیہات سدھار کی باتیں محض فضول اور بے معنی ہیں۔ دیہاتی جن مصائب و مشکلات میں مبتلا ہیں اس کی وجہ ذہنی پستی اس قدر نہیں ہے جس قدر کہ اقتصادی تنگدستی۔ لہذا ہم پر واجب ہے کہ دیہات کا ہم پر جو قرضہ ہے اُس کو اس طرح بے باق کریں کہ اُن کو اچھی سڑکیں دیں پینے کیلئے صاف پانی میسر کریں اُن کے حفظان صحت اور علاج معالجہ کا انتظام کریں اُن کی پیداوار اچھی قیمت پر خرید و فروخت کیلئے مارکٹ مہیا کریں اور انھیں اپنے آلات و کھاد وغیرہ کیلئے کچھ سرمایہ فراہم کریں۔ ظاہر ہے کہ ان تمام انتظامات کیلئے روپیہ کی ضرورت ہے اور دولت مندوں کا فرض ہے کہ اس نیک کام میں روپیہ دیں بالخصوص جبکہ جنگ کا اثر موجودہ حالات کے تحت یہ ہوا ہے کہ سرمایہ داروں کی دولت بڑھ گئی ہے لیکن غریب کاشتکار اور بھی پامال اور تباہ حال ہوگئے ہیں۔

ہم نے ماہرین معاشیات سے اس لئے یہ استدعا کی ہے کہ اس اہم مسئلہ پر دو مختلف عنوانات سے غور کیا جائے۔ ایک تو یہ کہ حیدرآباد میں محاصل کن اصول پر قائم ہوں اور دوسرے یہ کہ کاشتکاروں پر جنگ کے کیا اثرات مترتب ہوئے ہیں۔ میں یہاں پر پھر ایک بار اس طرف اشارہ کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم ابھی ایسی حالت میں ہیں کہ جہاں ہماری معاشی سرگرمیوں میں کافی اضافہ کی ضرورت ہے اور عام طور پر ہماری سماجی زندگی کے معیار کو بھی

بہت کافی ابھارا ہے۔ اس لئے ہم کو اُن تمام طریقوں سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے جن سے ہماری معاشی
ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہو۔ ہمیں اس غرض کی تکمیل کیلئے تخفیف کی بہ نسبت توسیع پر زیادہ نظر رکھنی ہوگی گو جو لوگ
نئے محاصل سے بچنا چاہتے ہیں تخفیف پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

حضرات! معاشی ترقی کی گفتگو کے سلسلہ میں سب سے اہم چیز جو قابل توجہ ہے وہ ملک کی صنعتی ترقی و
نشوونما ہے۔ میرے لئے اس وقت یہ زرین موقع حاصل ہے کہ میں آپ حضرات کی توجہ اعلیحضرت ظل سبحانی کی اُس
گہری دانشمندی و تدبر و حکمت سے پُر ارشادات ہمایونی کی جانب مبذول کراؤں جو اس سال صنعتی نمائش کے
افتتاح کے موقع پر ارشاد فرمائے گئے اور جن میں حضرت بندگان اقدس اعلیٰ نے نہایت روشن اور واضح طریقہ پر
صنعتی ترقی و توسیع کی ضرورت اور اہمیت ہمارے ذہن نشین فرمائی تھی۔ جہاں تک کہ حکومت کا تعلق ہے وہ
اس ضمن میں اپنا فرض ادا کر رہی ہے اور آئندہ بھی کرے گی۔ لیکن ملک کی صنعتی ترقی زیادہ تر ہمارے سرمایہ داروں
ہی کی کوشش و معاونت کی محتاج ہے اور ہمارے آقائے ولی نعمت نے اسی امر کی جانب اشارہ فرمایا ہے۔
حکومت کے متعلق آپ حضرات کو یہ معلوم ہے کہ باوجود اس کے کہ اس کے ہاتھ پر اس وقت اسکیم آبپاشی،
ہائیڈرو الکٹرک و کارہائے معدنی جیسے بڑے بڑے کام موجود ہیں جن پر کثیر رقمیں صرف ہو رہی ہیں حکومت
سرکار عالی نے بڑے صنعتی کارخانوں میں معتدبہ رقمیں لگا رکھی ہیں اور ملک کے بڑے بڑے صنعتی کاروبار اپنے
استحکام و کامیابی کیلئے حکومت کی مالی امداد و اعانت کی رہین منت ہیں اس طرح راستہ صاف کر دینے کے بعد
حکومت اب بجا طور پر سرمایہ داروں سے توقع کرتی ہے کہ وہ صنعتی ترقی کی طرف متوجہ ہوں اور ملک کو خوشحال
اور فارغ البال بنانے میں اپنا حصہ ادا کریں۔ میرا مدعا یہ ہرگز نہیں کہ حکومت کو اب صنعتی کاروبار میں امداد سے
دست کشی کر لینی چاہیئے بلکہ میرا یہ یقین ہے کہ ابھی اس قسم کی امداد کے جاری رکھنے کا کافی موقع ہے۔ ہمارے
یہاں عرصہ سرکار عالی کا پروگرام ابھی تک بہت محدود رہا ہے۔ اب جبکہ جنگ کی وجہ سے سرمایہ داروں کو
معتدبہ مالی فائدہ ہوا ہے تو موقع ہے کہ حکومت ایک زبردست پروگرام ان غیر متوقعہ آمدنیوں سے استفادہ
کا مرتب فرمائے جیسا کہ برطانیہ عظمیٰ اور ممالک متحدہ امریکہ کے ماہرین معاشیات مختلف اسکیمیں تیار کر رہے ہیں یا
کہ رعایا کی مقدرت پس اندازی سے نہ صرف موجودہ جنگ کے اخراجات کی پابجائی کیلئے بلکہ بعد از جنگ صنعتی

ضرورتوں کی تکمیل کے لئے بھی پوری پوری طرح استفادہ کیا جائے۔ امریکہ کے ماہرین معاشیات کا حالیہ اسکیم جس میں یہ تجویز ہے کہ بعد از جنگ جس سامان کی ضرورت ہوگی اس کی خریدی کیلئے پیشگی بہ اقساط رقمیں ادا کیجائیں ہمارے غور و مطالعہ کے قابل ہے۔ اُن ممالک کے تجربوں سے ہم فائدہ اٹھاسکتے ہیں اور ان کی روشنی میں ایسے وسائل اختیار کرسکتے ہیں جو ہمارے ملک کیلئے ضروری اور مناسب حال ہیں۔ ان امور کے پیش نظر معاشی کمیٹی نے اس سال صنعتی سرمایہ کے مسئلہ پر بھی مضامین طلب کئے ہیں اور مجھکو امید ہے کہ ہمیں ان مضامین سے بہت مفید اور کارآمد معلومات حاصل ہونگے۔

حضرات! اب میں آپ کا زیادہ وقت نہ لونگا۔ میں اب ہمارے آپ کے محترم مہمان آنریبل عالیجناب غلام محمد صاحب سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ کانفرنس کا افتتاح فرمائیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ موصوف کی ہستی میں آج ہمیں ایک ایسے ماہر فن معاشیات کا فیض صحبت حاصل ہے جو ماہر مالیات و حکومت کے رکن کی حیثیت سے بھی بے پایاں شہرت کے مالک ہیں۔ میں اس باب میں مزید کچھ عرض نہ کرونگا سوا اس کے کہ ممدوح کے ساتھ میرے سرکاری اور ذاتی تعلقات کے مدنظر کوئی غلط فہمی کا امکان ہو۔ بس یہ کہنا کافی ہوگا کہ اس موقع پر ہم کو ممدوح سے بہتر کوئی شخص میسر نہیں آسکتا تھا جو آج کی ہماری گفتگو و غور و خوض میں ہماری صحیح رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتا۔ ہماری یہ بھی خوش قسمتی ہے کہ آج ہمارے اس اجلاس کی صدارت پر جناب مولوی الیاس برنی صاحب جیسے مشہور و معروف ماہر معاشیات متمکن ہیں۔ جن سے قدرتی طور پر ہمارے یہ توقعات ہیں کہ موصوف موجودہ معاشی مسائل پر نہایت واضح روشنی ڈالیں گے اور ان کی پیچیدگیوں کو کمال خوبی سے سلجھانے کے تدابیر کا اظہار فرمائینگے۔

اب میں جناب سے استدعا کرتا ہوں کہ از راہ کرم کانفرنس کا افتتاح فرمائیں۔

اس تقریر کے ختم ہونے پر جناب آنریبل غلام محمد صاحب نے افتتاحی تقریر انگریزی میں فرمائی بعد میں اس کو جناب ممدوح کے حسب ہدایت اردو میں مرتب کیا گیا یہ اردو ترجمہ دوسرے صفحات پر درج کیا گیا ہے۔

عالی جناب آنریبل غلام محمد صاحب کی

افتتاحی تقریر

حضرات! معاشی کمیٹی کی پانچویں سالانہ کانفرنس کے افتتاح کے لئے مجھے طلب کر کے آپ کی کمیٹی نے مجھ پر جو احسان کیا ہے میں اس کا بیحد ممنون ہوں اس کے ساتھ اس امر نے کہ اس اجلاس کی صدارت کے لئے آپ نے میرے قدیم استاد سے خواہش کی ہے جن سے علی گڈھ کے ایام تعلیم میں معاشیات کے ابتدائی درس میں نے لئے میری خوشی کو دوبالا کر دیا ہے میں کانفرنس کو نہایت اہم ادارہ تصور کرتا ہوں۔ جسے مملکت دکن کی ازسر نو تعمیر میں ایک اہم حصہ ادا کرنا ہے۔ ماہرین معاشیات ماسبق اور خصوصاً ہندستانی معاشیں حقیقتوں سے ہمیشہ دور رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا بے تعلق مطالعہ ان کی رہنمائی اور ان کی آراء جو حقیقی نظم و نسق کے تعلق سے بے نیاز ہو کر ظاہر کی گئیں اس قابل نہ تھیں کہ ان سے معاشی پالیسی کے قیام میں وہ مدد ملی جاتی جن کی وہ مستحق تھیں۔ اس لئے میں اس امر کا پرجوش خیر مقدم کرتا ہوں کہ جامعۂ عثمانیہ کے چند نوجوانوں میں اتنی ہمت اور عوام کی خدمت کا اتنا جذبہ موجود ہے۔

خواتین و حضرات! ایک ماہر معاشیات اور خصوصاً وہ فرد جو متعلقات سے بے نیاز ہو۔ اس کا میدان عمل صرف درسی کتابیں ہیں بے تعلق نظریے اس وقت تک کچھ ایسے کارآمد ثابت نہ ہوں گے جس وقت تک کہ ماہر معاشیات ان نظریوں کو اپنی زندگی کے حقایق پر منطبق کرنے کی کوشش نہ کرے۔ انسان کو اس کی زندگی کے اجزائے سے بے تعلق نہیں کیا جا سکتا۔ انسان ایک پیچیدہ قسم کا حیوان ہے اس لئے آپ کو اس کے جذبات اور اندرونی تحریکات کا تجزیہ کرنا ضروری ہے انسان کے یہ جذبات اور تحریکات ایک دوسرے پر رد عمل پیدا کرتے رہتے ہیں اس لئے آپ جب تک معاشی سوالات کو ان کے تمام سیاسی اور سماجی متعلقات کی روشنی میں حل نہ کریں کسی

منطقی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے ۔ اسی لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ ماہر معاشیات کو نہ صرف نظم ونسق کی امداد ہی کرنی چاہیے
بلکہ اس کی رہنمائی بھی اسے اپنے مقام خلوت سے نکل کر زندگی کے ان تمام حقایق کو دیکھنا چاہیئے جن کا
صحیح معنے میں صرف وہی تجزیہ کرسکتا ہے اس کے اخذ کردہ نتیجے نظم ونسق کی ہر وقت امداد کے لئے تیار رہنے چاہیں۔

حضرات ! مجھے یقین ہے کہ کوئی شخص بھی جو نظم ونسق کو موجودہ پیچیدگیوں کے باوجود پرانے
ناحقیقت آشنا طریقہ سے چلانے کی کوشش کرے گا ۔ ناکام رہے گا ۔ جو شخص معاشی زندگی کے تمام
تعلقات اور عالمگیر اثر رکھنے والے اجزا سے بے اعتنائی برتے گا ۔ سماج کے مختلف حالات
غربت وغیرہ پر گہری نظر نہ رکھے گا اس کا ناکام ہونا بھی یقینی ہے اس لئے میری تجویز ہے کہ اگر
آپ کی کانفرنس ایک طالب علم اور ماہر سائنس کے درمیان ایک حقیقی درمیانی کڑی جسے میں
ماہر معاشیات اور ماہر نظم ونسق کہہ سکتا ہوں ۔ پیدا کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو آپ ملک
کی ایک نہایت کارآمد خدمت انجام دیں گے ۔ میں نے جو تحقیقات کی ہے ان سے معلوم ہوا کہ آپ کا
کام ابھی ابتدائی دور میں ہے میں زیادہ تعریفوں کا عادی نہیں اس لئے آپ ناراض نہ ہوں
اگر میں کسی قدر ناقدانہ رویہ اختیار کروں ۔ اگر آپ صرف ایک چھوٹا سا تماشا اور اس کے ساتھ
ہی مصنوعات دکن کی کامیاب نمایش ہی پر اکتفا کرتے ہیں تو مجھے ڈر ہے کہ آپ کا دائرہ عمل بہت
محدود ہے آپ کو وسیع تر اور بڑے مسائل پر بھی توجہ کرنی چاہیئے ۔ ڈیڑھ کروڑ انسانوں کی آبادی ہزارہا
مربع میل کے رقبہ اور آیندہ ترقی کے نہایت وسیع امکانات کی موجودگی میں آپ کو موجودہ مسائل
سے کہیں زیادہ بڑے اور کہیں زیادہ پیچیدہ مسائل کا سامنا کرنا ہے ۔ آپ کو محض اس ڈر سے
پیچھے نہ ہٹنا چاہیے کہ کہیں آپ کسی کے احساسات کو ٹھیس یا کسی کے مفادات کو متاثر نہ کردیں ۔
کاروان علم و ترقی کو آگے بڑھنا چاہیئے آپ وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھ حیدرآباد کا معاشی مستقبل ہے
اس لئے آپ کی ذمہ داریاں بہت بڑی ہیں ۔

حضرات ! مجھے ڈر ہے کہ شاید میں ایک عام افتتاحی خطبہ سے ہٹ کر اس کی سرحدوں کو
عبور کر رہا ہوں اور یہ وہ مقام ہیں جن پر صدر صاحب کا قبضہ ہونا چاہیئے تھا ۔ آپ حضرات مجھے

معاف کریں کہ ایک ماہر معاشیات کی حیثیت سے میں بعض اہم مسائل پر آپ سے گفتگو کیے بغیر نہیں گزر سکتا جن پر میرے خیال میں آپ کو بہت توجہ مبذول کرنی پڑے گی۔

آنریبل صدر المہام مالیہ نے چار اہم مسائل پر روشنی ڈالی جن میں پہلا مسئلہ قیمتوں پر جنگ کا اثر اور نگرانی قیمت کا ہے آپ نے مشکلات کو پیش کرتے ہوئے بتلایا کہ ان کے نتیجہ کے طور پر ہمارے اہل ملک کے دلوں میں دو جذبے پیدا ہو رہے ہیں۔ ایک جذبۂ نفع اندوزی اور دوسرا ڈر۔ افراد میں ایک حصہ ان کا ہے جو ہر انسانی پریشانی سے فائدہ اُٹھانا جانتا ہے اور دوسرا وہ حصہ ہے جو آیندہ کے نامعلوم ڈر سے خائف ہو کر ضروری اشیاء کو ذخیرہ کرنا یا بچانا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہر وہ چیز جو انسانی زندگی کے لئے ضروری اور لازمی ہے اس سے متاثر ہوئی آپ ان مشکلات سے واقف ہیں جو برطانوی ہند میں پیدا ہو چکی اور دکن میں بھی پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ آپ کے معاشین کو چاہیئے کہ ان ہی مشکلات کو پیش نظر رکھیں اور اس کا ایسا حل تلاش کریں جس سے نظم و نسق کو صحیح معنے میں فائدہ پہنچے خفیہ نفع اندوزی شروع ہو چکی ہے ہر چیز پر کڑی نگرانی کی کوشش کی گئی۔ برآمد کو محدود کر دیا گیا لیکن یہ تمام تدابیر اب تک اصلی مسئلہ کو حل کرنے میں ناکامیاب رہیں آپ کو ان کا کھوج لگانے اور ممکنہ حل معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ قیمتوں کی نیم دلانہ نگرانی سے بہتر یہ ہے کہ کوئی نگرانی ہی نہ کی جائے۔ میں اس نقطۂ نظر کی طرف مائل ہوں کہ موجودہ تدابیر نگرانی قیمت کی ناکامی اصل میں یہ ہے کہ اس کے لئے محدود تدابیر اختیار کی گئیں اور موثر اقدام عمل نہ مل سکا آپ کو اس کا خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہیئے کہ ہندوستان کے مختلف صوبجات اور ریاستوں میں کیا تدابیر اختیار کی گئیں اور کیا نتائج نکلے ہو سکتا ہے کہ ان کے غور و فکر سے ایک ایسی راہ عمل مل جائے جس سے نگرانی کے وہ مابہ الاشتراک اصول ممکن العمل ہو سکیں۔ جو تمام انتظامیہ پر بیک وقت جاری ہو سکتے ہوں ایک کل ہند پالیسی کی غیر موجودگی میں انفرادی تدابیر کا کامیاب ہونا ممکن نظر نہیں آتا دوسرا سوال خفیہ نفع اندوزی کا ہے جو اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک کہ تدابیر مکمل نہ ہوں۔ اس کے علاوہ راشننگ کا مسئلہ بھی ہے جس پر آپ کو غور کرنا ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ مملکت دکن کو ایک صنعتی ملک میں تبدیل کر دینے کا سوال ہے اس کے لئے معاشی خود مکتفیت لازمہ ضروری ہے میں نے عوام کی رائے کا اخبارات سے کافی مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ تصور کر لینا کہ حیدرآباد اپنے باشندوں کی ہر ضرورت کو پورا کر دے گا غلط ہو گا آپ مصنوعی رکاوٹوں کے ذریعہ بین الاقوامی معاشی اثرات کی رو کو نہیں روک سکتے ہاں اگر معاشی خود مکتفیت سے مراد یہ ہو کہ قدرت کے ہر دیئے ہوئے خزانہ سے اتنا مکمل فائدہ اٹھایا جائے کہ بیرونی صناعوں کا مقابلہ بھی ہو سکے اور اپنے اہل ملک کے ضروریات کو کسی معقول معاشی بنیاد پر پورا بھی کیا جا سکے تو البتہ یہ ممکن العمل نقطۂ نظر ہے اگر ہم نے معاشی خود مکتفیت کے متعلق ہر خاص و عام کے نقطۂ نظر کو صحیح تسلیم کر لیا تو ہم عوام کی غلط رہنمائی کرنے کے مجرم ہوں گے میں سمجھتا ہوں کہ اس خصوص میں عوام کی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے اور یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔

آپ نے صنعتوں کے اجراء کے متعلق کہا کہ جنگ کے مصنوعی حالات کی بنا پر صنعت میں جو بڑے بڑے منافع حاصل ہو رہے ہیں۔ اس سے کم فہم افراد کی غلط امیدیں بندھ سکتی ہیں صنعتوں کے جاری کرنے میں ملک کے قدرتی ذرائع مابعد جنگ کے حالات، مقابلہ کے امکانات اور اشیاء کی تیاری کے جدید ترین طریقوں کی ضرورت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ حکومت سرکار عالی صنعتوں کے اجراء پر غور کر رہی ہے اس سلسلہ میں آپ کی تحقیقات نہایت کامیاب ثابت ہوں گی۔ آپ نے حکومت کی صنعتی پالیسی پر ماہرانہ تبصرہ فرماتے ہوئے کہا کہ اس کا احتیاط سے تجزیہ کرنا چاہیئے حکومت کی پالیسی بعض کمپنیوں کی امداد اور بعض کو اجارہ دینے پر محدود رہی ہے۔ ایسی پالیسی کو کب تک جاری رہنا چاہیئے اور یہ کہاں تک کامیاب ہو گی یہ وہ سوالات ہیں جن پر آپ کی خاص توجہ ہونی چاہیئے

عام طور پر یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ حیدرآباد کی کمپنیوں کے حصص حیدرآبادیوں کے ہاتھ میں رہنے چاہئیں میں مشورہ دوں گا اس نقطۂ نظر کو فوراً تسلیم کرنے میں تامل کیجئے۔ اسلئے کہ مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کے حصص کی فروخت کسی خاص مقام کیلئے محدود نہیں ہوتی حال ہی میں حصص کی بڑھی ہوئی قیمت کے پیش نظر حیدرآبادیوں نے باہر والوں کو منافع کی خاطر اپنے حصص فروخت کر دیئے وقت آچکا ہے کہ ہم گزشتہ تجربوں کی روشنی میں ایک نئی معاشی پالیسی وضع کریں اور ایک بہتر انتظامی اصول کی بنیاد ڈالیں

جس سے کم از کم ہم اپنے شرائط پر بیرونی سرمایہ اور فنی امداد بھی حاصل کرسکیں لیکن جہاں ہم خود اپنی ضرورت پوری کرسکتے ہیں وہاں میں آپ کے خیال کی تائید کرتا ہوں کہ بیرونی امداد طلب نہ کی جائے میری خواہش ہے کہ آپ محسوس کریں کہ ملک میں صنعتوں کے رواج کے مسئلہ کے اس پہلو کے متعلق بہت زیادہ غلط فہمی موجود ہے کہ آپ دکن کے اندرونی حصہ میں بیٹھے بیٹھے ہی کسی بالراست یا بالواسطہ طریقہ سے ملک میں بیرونی سرمایہ کی آمد و رفت پر بندش عاید کرسکتے ہیں مقامی سرمایہ سے صنعت رائج کرنے کا خیال ممکن ہے عہد ماضی میں قابل عمل رہا ہو لیکن کیا ان خیالات سے حقیقی ترقی ممکن ہے ؟

اگر بیرونی سرمایہ آپ کی مدد کے لئے آرہا ہو اور اوس میں کوئی پیچیدگیاں پیدا نہ ہوتی ہوں تو آپ کے لئے کیا خطرہ ہے موجودہ حالات میں جبکہ سرمایہ ذرائع پیداوار نہایت محدود مقداروں میں حاصل ہوسکتے ہیں تو بیحد ضروری ہے کہ کامیاب صنعتی ترقی کے لئے اس مسئلہ پر غور کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے غور و فکر سے عوام کو بھی اور حکومت کو بھی اچھا فائدہ پہنچیگا ۔

ساتھ ہی دیہی ترقیوں کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے آپ جانتے ہوں گے کہ حکومت نے حال ہی میں اس کے لئے ایک فنڈ کا آغاز کیا ہے اور یہ تو حکومت کے ارادوں کی صرف ابتدا ہے اسکی خواہش تو اس پورے مسئلہ کو کامیابی سے حل کرلینے کی ہے لیکن دیہات کا ایک اہم اور بڑا مسئلہ اس کے سامنے ہے میں معاشی کمیٹی کے اراکین سے جن کی توجہ چھوٹے پیمانوں کی صنعتوں نظر فریب نمائشوں اور چند مقالات تک محدود رہتی ہے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی توجہ آبادی کی اکثریت کی طرف مبذول کریں جو دیہات میں رہتی ہے اگر آپ کی مجلس دیہی حالات کے مطالعہ اور اون کے مسائل کا ایک کامیاب حل دریافت کرسکے تو آپ حیدر آباد کی ایک صحیح خدمت انجام دے سکیں گے آپ اپنے معاشی سرگرمیوں کو عمارت کے اونچے برج یعنے حیدر آباد تک ہی محدود نہیں رکھ سکتے آپ کو تو عمارت کی بنیاد ہی سے اصلاح کرنی چاہیئے دیہی مسئلہ ایک مشکل مسئلہ ہے جس کا گہری نظر سے صبر آزما مدت تک مطالعہ کرنا پڑے گا۔ جہالت معیار زندگی کی پستی، مواصلات کی خرابی اور مواضعات کے کارکن کی زندگی کے مصائب و مشکلات ہیں جو آپ کی

تحقیقات میں پیش آئیں گی لیکن ان کا مقابلہ کرنا ہوگا اور آپ نے اپنی نگرانی میں تحقیقات کا آغاز کیا تو مجھے یقین ہے کہ آپ کو دیہی ترقی کے مد سے امداد کی توقع رکھنی چاہیے حکومت کے پیش نظر ایک اور مسئلہ دیہی صنعتوں کی تنظیم کا ہے یہ خود بڑا اور پیچیدہ مسئلہ ہے یہاں خام اشیاء کی کمی فنی اور مادی امداد کی فراہمی کی مشکلات حائل ہیں اس کو امداد باہمی کی بنیادوں پر ہی حل کرنا چاہیئے اگر آپ نے گزشتہ (۴) سال کے دوران میں چین کی دیہی ترقی ممالک متحدہ امریکہ میں تحریک امداد باہمی کی رفتار کا مطالعہ کیا، تو سمجھ سکیں گے کہ دیہات میں تعمیری کام کا وسیع میدان موجود ہے۔

آنریبل صدر المہام مالیات نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں اور شعبوں پر روشنی ڈالتے ہوئے، تنظیم صنعت، خام اشیاء کی فراہمی، سائینسی تحقیقات کی امداد اور تیار شدہ مال کی فروخت کے مختلف اجزا پر بحث کرتے ہوئے اس کے گہرے مطالعہ پر زور دیا آپ نے کہا یہ معمولی آغاز سے بھی بڑے نتائج پیدا ہو سکتے ہیں جو آگے چل کر کاشتکار کی خوش حالی اور مملکت کی ترقی کا ذریعہ ثابت ہوں۔ آپ نے اس بات پر زور دیا کہ معاشیات اور سائنس کے وہ طلباء جو گاؤں کے مشکلات پر اپنے جذبۂ خدمت سے غالب آسکیں اور محنت کرنے پر آمادہ ہوں وہ ایک خوش حال دیہی نظام کے بانی کہلائیں گے۔

اب میں آپ کی توجہ مابعد جنگ کی تعمیر پر مبذول کرانا چاہتا ہوں آپ کی حد تک یہ مسئلہ ہندستان یا کسی یورپی ملک کی بہ نسبت زیادہ سادہ اور آسان ہے آپ کو مابعد جنگ تعمیر جدید پر نہیں بلکہ اس تعمیری کام پر توجہ کرنی چاہیئے جو جنگ سے پہلے ہی آپ کو کر دینا چاہیئے تھا افسوس ہے کہ رقم کے اس قدر رستے ہونے کے وجہ میں ہمارے پاس وہ فنی امداد اور ضروری مشنری موجود نہیں جو ضروری ہے تاہم اگر ہم نے پہلے ہی سے کچھ اسکیمیں تیار کر لیں جو جنگ کے ختم پر روبہ عمل لائی جا سکتی ہوں تو ہم کچھ مفید کام انجام دے سکیں گے آپ کا مابعد جنگ مسئلہ ان ہی تربیت یافتہ فن کاروں اور میکانی خدمات انجام دینے والے سپاہیوں کے روزگار کا مسئلہ ہے مجھے جو مختصر سا موقع آپ کے مطالعہ کا ملا ہے اس بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ کو برقابی صنعتوں کی ترقی کے اچھے مواقع حاصل ہیں شیشہ سازی، آہنی اور فولادی

صنعتوں میں بھی ترقی کی بڑی گنجایش ہے اور بھی امکانات ہیں جن کا مطالعہ بیحد ضروری ہے آپ کو چاہیئے کہ سب کا اچھی طرح سے مطالعہ اور ٹھوس تجاویز حکومت کے سامنے پیش کریں تاکہ صرف خیالات ہی خیالات نہ ہوں ۔

ایک اور مسئلہ جس پر میری خواہش ہے کہ آپ کی کانفرنس غور کرے اب جبکہ رقم سستی ہے حکومت قبل جنگ شرح کی نسبت کم شرح پر قرض حاصل کرسکتی ہے تو کیوں نہ ہم ان کاموں کی طرف توجہ کریں جواب کئے جاسکتے ہیں میں جانتا ہوں کہ اس کا جواب یہ ہوگا کہ ہمارے پاس مشنری اور ضروری مسالہ موجود نہیں تاہم ہم ان کاموں کی فہرست تیار کرسکتے ہیں جن میں موجودہ گراں اشیاء کی کم سے کم ضرورت پڑے ۔ مثلاً گاؤں کو ملانے والی پکی نہ سہی نیم پکی یا کچی سڑکیں ایسی عمارت جو سمنٹ یا فولاد کے بغیر تیار ہوسکتی ہوں بہتر ہوگا کہ ان کاموں کا ابتدائی حصہ ابھی مکمل کرلیا جائے ۔ جن کا آخری حصہ جنگ کے بعد مکمل ہوسکتا ہے ۔ ہمارے ذرائع مواصلات کی بھی استطاعت بڑھانے کے لئے وہی مواصلات کی تکمیل بے حد ضروری ہے ۔

اب میں ایک ایسے موضوع کی طرف آرہا ہوں جس پر گذشتہ مہینوں کے دوران میں گرماگرم بحثیں ہوتی رہیں یعنے حیدرآباد کا نظام محصول یہ موقع نہیں ہے کہ میں اس متنازعہ بحث میں حصہ لوں میں آپ کو ان مباحث میں لیجانا بھی نہیں چاہتا جو اخبارات میں ہوتے رہے ہیں اور وہ حقیقی نقطۂ نظر پیش نہیں کرتے جو مشاہین دیکھنا چاہتے ہیں موجودہ نظام محصول کی ایک روایاتی بنیاد اور تاریخی پس منظر ہے ۔ مسٹر گیتیلے نے اپنے خطبہ میں مستوراوقیانوس کا ذکر کیا ہے لیکن ایک اور مکتب خیال ہے جو پرانی روایات کو زیادہ اہمیت دیتا ہے موجودہ یورپ اور امریکہ کے روح روان جو خیالات اور میلانات ہیں ان کو حیدرآباد کے حقائق پر منطبق کرنا اور آبادی کے بعض حصوں کی گہری طرف داریوں کو ملانا بہت مشکل ہے ایک اور مکتب خیال ہے جو بہ یک وقت نئے خیالات کا احترام بھی کرتا ہے اور ان ہی کے بنیاد پر جو تدابیر اختیار کی جائیں ان کے مخالفت بھی سائنسی اصولوں پر کام کرنے والوں کے لئے ذہنی مکتاری بڑی خطرناک ہے اور کم ازکم ان لوگوں کو جو ان مسائل تک واتفیت پسندانہ طریقوں سے

پہنچنا چاہتے ہوں اپنے دماغوں سے یہ مکڑی کے جالے دور کر دینے چاہئیں جن کے بغیر آپ کسی قطعی نتیجہ تک نہ پہنچ سکیں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ طولانی دلائل کی رو میں بہ نہ جائیں گے حکومتوں کو اپنی اسکیموں کے لئے رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ کسی نہ کسی صورت رقم حاصل کر لیتی ہیں حکومت کے عہدہ داروں اور سیاست دانوں کو اپنی پبلک زندگی میں ناکامیاں بھی ہوتی ہیں اور کامیابیاں بھی آپ کو ان سے کسی صورت بھی متاثر نہ ہونا چاہیئے اگر حیدرآباد میں پبلک زندگی کامیاب بنانا ہے اور اگر آپ کو جو ایک عظیم تر حیدرآباد کی تعمیر کے لئے اپنی مساعی صرف کر رہے ہیں نتیجہ خیز اور مفید عمل کا میدان حاصل کرنا ہے تو آپ کو اس امر کی کوشش کرنی چاہیئے کہ فضا صاف ہو تاکہ پبلک سوالات پر معاشی سوالات حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے زیر غور آئیں نہ کہ طرفداری سے ۔ اور کبھی اسی پر یقین کر لینے کی فضا میں وہ لوگ جنھیں سرمایہ کا بڑا اقتدار حاصل ہے بڑے سے بڑے منافع حاصل کر لینے کی طلب میں مٹھیاں بند کئے عام فائدہ کے لئے کسی قربانی اور اپنی کسی رعایت کے کھول دینے کے خطرے ڈر ڈر کر ہمیشہ یہی کوشش کریں گے کہ عوام کی بہتری کی ہر تدبیر کو صحیح یا غلط دلائل سے پاش پاش کر دیں۔ معاشین ہونے کی بناء پر آپ دوسرے ممالک کے ایسے ہی حالات سے ناواقف نہیں ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ ساری دنیا میں خودغرض تنگ نظر، اور اندھی سرمایہ داری اپنی جگہ ایک روشن پالیسی کے لئے چھوڑ رہی ہے جس سے ملک کی بہتری اور عام شہری خوشحالی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے آپ کو چاہیئے کہ رائے عامہ کی صحیح رہنمائی کریں تاکہ پہلے حیدرآباد جن کے وسائل صنعت بہت کم ہیں اور جنھیں پہلی مرتبہ صنعتی بے چینی کے حقایق سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اپنے خیالات اور مساعی کو صحیح اور کامیاب اصولوں پر چلا سکیں۔ اس امر کو مخصوص کر لینا چاہیئے کہ ٹیکس کے تمام تدابیر کو اب ، مالیہ عامہ کے تمام اقدامات پر سماجی انصاف کے نقطۂ نظر سے پرکھنا چاہیئے۔ ایک اوسط حیدرآبادی ترقی پسند ہوتا ہے اور آپ کو خوش قسمتی سے وہ بادشاہ ملا ہے جس نے ہمیشہ ترقی کی طرف رہنمائی کی اور ملک کی معاشی خوشحالی و صنعتی ترقی میں گہری دلچسپی لیتا رہا۔ آپ کو اہل حیدرآباد کی فہم عامہ پر بھروسہ رکھنا چاہیئے کہ وہ کبھی ان قدیمی امور کے روادار صرف اس بناء پر نہیں ہوں گے کہ

چند صدیوں پہلے انہیں سچا تسلیم کر لیا گیا تھا۔ وہ ترقی پسند ہیں اور آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور آپ کو وہ علم اور پس منظر مہیا کرنا ہے جس کی بنا پر وہ کوئی انفرادی قدم اٹھائیں۔ ایک رکن حکومت ہونے کی حیثیت سے میں آپ سے یہ خواہش نہیں کرنا چاہتا کہ آپ حکومت کی کسی خاص پالیسی کی تعریف کریں یا دوسری پالیسیوں کی تنقید کریں آپ کو چاہیئے کہ ان سب کو چھوڑ کر محض معاشی نقطۂ نظر سے غور کریں تاکہ اپنے ٹھنڈے دل سے کیئے ہوئے فیصلوں سے قوم کو بہترین مشورہ حاصل ہوسکے مجھے یقین ہے کہ آپ کے یہ مشورے باشندگان ریاست کی اکثریت کے لیے نفع بخش ہوں گے نہ کہ چند افراد کی حفاظت کے لیئے۔

ایک اور مسئلہ جس پر ہم بحث کریں گے وہ کرنسی اور تبادلہ کا مسئلہ ہے میں خوش ہوں کہ حیدرآباد میں کرنسی کی پوزیشن برطانوی ہند کے مقابلہ میں بہتر ہی ہے اور میرا یہ مطلب نہیں کہ برطانوی ہند کی پوزیشن خراب ہے یا ناقابل اطمینان بلکہ ہمارے کاغذی سکہ کی حالت پر غور کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم کسی قدر بہتر حالات میں ہیں کاغذی سکہ کی حد تک اجرائی رقم زیادہ ہو رہی ہے لیکن اس کی کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ گلانے یا ذخیرہ کرنے کی وجہ سے دھاتی سکہ کم ہو گئے ہیں۔ اس میں بھی نفع اندوزی اور ڈر، کے وہی دو محرکات ہیں ہم اس مسئلہ کے عملی حل نکالنے میں مصروف ہیں۔ تاہم معاشین کی حیثیت سے آپ لوگ موجودہ میلانات کی بنا پر حکومت کے لیے کارآمد نتیجہ حاصل کر سکیں گے۔

حضرات! میں اسٹیٹ بنک کے متعلق بھی دو باتیں کرنا چاہتا ہوں مجھے توقع ہے کہ دوسرے مسایل پر غور کرتے ہوئے آپ اس پر بھی غور کریں گے، اسٹیٹ بنک ہمارے آیندہ انتظامات میں کس مقام پر ہو۔ اسٹیٹ بنک کو حکومت کا بنک بننے اور ہمارے سکہ قرطاس کے محفوظات کا حامل ہونے کے علاوہ حیدرآباد کا سب سے بڑا تجارتی اور صنعتی بنک بھی بن نکلنا ہے میں خوش ہوں کہ اپنی حیات کے اس قلیل دور میں بھی اس کی ترقی اطمینان بخش رہی ہے اور بنک ۱۲ ماہ قبل کی بہ نسبت بہتر پوزیشن میں ہے عوام اور حکومت کے امداد اور تعاون سے بنک کو یقیناً حیدرآباد کے کاشتکار اور تاجر کے لیے مفید ثابت ہونا چاہیئے۔

قبل اس کے میں اپنی تقریر کو ختم کروں مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ آپ نے میرا خطبہ بڑے سکون سے سنا اور مجھے امید ہے کہ آپ ان تمام مسائل پر بہترین طریقہ سے غور و فکر کر سکیں گے جن سے ہم آج دوچار ہیں۔"

خطبۂ صدارت

از جناب مولوی محمد الیاس صاحب برنی

شکریہ

علمی اور مذہبی جلسوں میں تقریر کرنا، اک زمانہ میں چند سال اپنا یہ معمول بہت مقبول رہا لیکن بعض مصروفیتوں کے سبب مدت ہوئی کہ یہ معمول ترک ہو گیا تاہم اس دوران میں فرمایشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ عذر خواہی کام نہ آئی اور کنارہ کشی کی شکایت پیدا ہو گئی جب تقریر کی تقصیر کسی صورت معاف نہ ہوئی تو تلافی کسی نہ کسی حد تک ناگزیر ہو گئی۔ چنانچہ انجمن طیلسانین جامعہ عثمانیہ کی معاشی کمیٹی نے اصرار کیا تو میں پہلے کی طرح عذر نہ کر سکا اور کچھ عذر کیا گیا تو وہ قبول نہ ہوا۔ بہر حال تعمیل فرمایش کے واسطے حاضر ہو گیا۔ معاشی کانفرنس ممالک محروسہ سرکار عالی کا یہ پانچواں سالانہ جلسہ ہے۔ اس کانفرنس کی صدارت ممتاز حضرات سے مزین ہوتی رہی ہے اور اس مرتبہ بھی بہتر انتخاب ممکن تھا تاہم امسال (سنہ ۱۳۵۲ف) عہدۂ صدارت جو میرے تفویض ہوا میں قدر افزائی کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

استادی و شاگردی

انجمن کی معاشی کمیٹی میں غالباً معاشیات کے تعلیم یافتہ عثمانیین زیادہ شریک ہیں۔ یوں بھی شاید انھوں نے اپنے قدیم استاد کی یاد معاشی کانفرنس کی روئداد میں محفوظ کر لینا ضروری سمجھا۔ شاگردوں کی ایسی دوامی محبت بڑی نعمت ہے اور یہ نعمت خلوص کے صلہ میں خوش بختی سے نصیب ہوتی ہے۔ اس خوش بختی نے اس موقع پر جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد سے چمک کر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ تک اپنی جھلک دکھا دی کہ برادر عزیز آنریبل مسٹر غلام محمد (علیگ) صدر المہام فینانس مملکت آصفیہ نے

اس کانفرنس کا افتتاح فرمایا تو اس محبت میں برادر موصوف نے اپنی شاگردی کی یاد تازہ فرمائی ہے
اور اپنے حسن خلق سے اس کو درخشاں کر دیا۔

خاص ہستیوں کی فضیلت کا تو کیا کہنا۔ لیکن بالعموم اعلیٰ تعلیم میں اچھے سے اچھے استاد کی
بڑی استادی یہ ہے کہ اس کے فیض تربیت سے شاگرد کمال میں بالآخر اس پر سبقت لے جائیں۔
علمی و عملی ترقی کی یہی صورت ہے اور اسی میں استاد کی بھی عظمت ہے اگر کوئی استاد اپنے قابل
شاگرد کی فوقیت سے دلگیر ہو تو وہ استادی کے ذوق سے محروم ہے۔ خود ستائی مقصود نہیں
البتہ شکر الٰہی واجب ہے کہ اپنے برادران عزیز علیگ ہوں یا عثمانین الحمد للہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں
مثلاً برادر موصوف نے ابتداءً بڑی خوبی سے مسلم یونیورسٹی میں اپنے استاد کی جانشینی فرمائی اور ترقی کرتے
کرتے اب وہ ماشاء اللہ حکومت آصفیہ میں مال و دولت کے امین ہیں۔ علیٰ ہذا خدمت عامہ
کی زندگی جو انگریزی میں پبلک لائف کہلاتی ہے اس کے مختلف شعبوں میں بھی عثمانین کی سرگرمیاں
ممتاز نظر آتی ہیں۔ چنانچہ یہی نمایش مصنوعات ملکی ان کی حوصلہ مندی کی زندہ مثال آنکھوں
کے سامنے موجود ہے۔ عثمانین کی سب سے بڑی کامیابی یہ کہ تعلیم و تصنیف کی علمی زندگی میں بھی وہ
مادر جامعہ کا نام دور دور تک روشن کر رہے ہیں اور ابھی تو ابتدا ہے تاہم ع

سالے کہ نکوست از بہارش پیداست

پس اس محبت کے تعلق سے جو استادی و شاگردی کی نعمت ہے میری یہی دعا ہے
اور دعا کے سوا اپنے ہاتھ میں کیا ہے کہ عثمانیہ برادری اور علیگ برادری کو سب کے ساتھ بارگاہ
آصفی کے ظل عاطفت میں ملک و ملت کی خدمت گزاری کی توفیق و عزت بفضلہ تعالیٰ
روز افزوں حاصل رہے۔ آمین۔

جلسے اور تقریریں

موتمر، مجلس، بزم، انجمن، سبھا، سوسائٹی، ایسوسی ایشن، کانفرنس، لیگ، کانگریس،
ہر عنوان سے ملک میں جلسے منعقد ہوتے ہیں۔ تقریریں ہوتی ہیں، تحریکیں منظور ہوتی ہیں،

خوب رونق اور چہل پہل رہتی ہے جوں جوں تعلیم پھیلے گی یہ اثر پھیلے گی جلسوں کا رجحان بڑھے گا اور یہ
رجحان حیات ملی کا مقتضا مانا جاتا ہے۔ چنانچہ ترقی یافتہ ممالک میں جلسوں کا یہ رجحان بہت
قوی پایا جاتا ہے لیکن ساتھ ہی اس رجحان میں ایک خطرہ بھی چھپا رہتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر قول
کی عادت اس درجہ بڑھ جائے کہ قول ہی مشغلہ بن جائے۔ قول ہی قول پر اکتفا کیا جائے
اور فعل کی نوبت کم آئے تو جلسوں اور تقریروں کی کثرت دراصل بے عملی کی علامت ہے
کہ کام کے کرنے میں زیادہ کلام کی فرصت اور ضرورت نہیں ہوتی۔ ترقی یافتہ ممالک میں
کام کی جو رفتار و مقدار ہے اس کے حساب سے کلام کا تناسب کچھ زیادہ نہیں رہتا لیکن
ہندوستان جیسے کم کار بلکہ بے کار ملک میں کام کے مقابل کلام کا تناسب بہت بڑھا نظر آتا
ہے۔ کلام میں تخفیف تو شاید ممکن اور مناسب نہ ہو لیکن کام میں اضافہ بہر صورت لازم
ہے ورنہ دماغ پاشی و شمع خراشی سے دردِ سر کے سوا کیا حاصل۔

قوت کے مرکز۔

فطرت انسانی کا ایک مشاہدہ ہے وہ یہ کہ جسم میں عمر کی مناسبت سے قوت اپنا
مرکز بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً لڑکپن میں ٹانگیں قوت کا مرکز بنی رہتی ہیں۔ لڑکے خوب دوڑیں لگاتے
ہیں، نہ تھکنے میں جوانوں کو ہراتے ہیں موقع ملے تو دوڑ میں لڑکیں بھی کسی سے ہیٹی نہیں رہتیں
لیکن جوانی میں کمر قوت کا مرکز بن جاتی ہے فی الجملہ کمر کی قوت ہی جوانی کہلاتی ہے۔ اس عمر
میں کام کی امنگ آتی ہے۔ ذمہ داری کا بار سہارنے سنبھالنے کی ہمت بڑھ جاتی ہے۔
بالآخر بڑھاپے میں کہتے ہیں ساری قوت کھینچ کر زبان میں آجاتی ہے گویائی بہت بڑھ جاتی
ہے۔ زبان قرار کم پاتی ہے چنانچہ بڑے بوڑھوں کی باتیں مشہور ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔
اکابر کے ممتاز مستثنیات ہمیشہ سے معروف و مسلم ہیں۔ کمزوری بھی بڑھاپے کی ایک شکل ہے
چنانچہ کمزور بھی طول کلام کی طرف مائل رہتے ہیں اور باتوں کو اپنی بے عملی یا بے بسی کا بدل
سمجھتے ہیں۔

قوم جو افراد کا مجموعہ ہوتی ہے وہ بھی افراد کی طرح اپنی قوت کا مرکز بدلتی ہے۔ بڑی بڑی سلطنتوں کی تاریخ شاہد ہے کہ بالعموم کوئی قوم ترقی کرتی ہے تو ابتدا عروج میں وہ دور دراز ممالک تک پھیل جاتی ہے کمال عروج میں وہ اپنے گوناگوں سیادت و حکمرانی سے سطوت و شوکت کا سکہ بٹھاتی ہے۔ دنیا بھر کا کام بناتی ہے۔ بڑی بڑی ذمہ داریوں کا بار اٹھاتی ہے۔ زوال و عروج میں قوت عملی سے وہ حکمت عملی پر اتر آتی ہے زیادہ تر باتوں سے کام چلاتی ہے اور اس میں کمال دکھاتی ہے اس طرح وضعداری نبھاتی ہے علیٰ ہذا کمزور قومیں بھی عمل سے معذور یا محروم ہونے کے سبب جلسوں اور تقریروں کی بہت شایق ہوتی ہیں اور موقع ملے تو اسی طرح اپنی دل کی بھڑاس نکال کر تسکین پاتی ہیں۔

ایک ضروری احتیاط

پھر تقریریں کی جائیں تو ان میں ایک امر قابل احتیاط ہے طب کا اصول ہے اور عام تجربہ بھی شاہد ہے کہ کوئی اشتعال انگیز غذا یا دوا استعمال کی جائے تو ابتدا میں ضرور فوری تقویت محسوس ہوتی ہے لیکن اگر وہ اکثر استعمال کی جائے تو طبیعت عادی ہو کر بتدریج اس کی متحمل اور محتاج ہو جاتی ہے نتیجہ یہ کہ بصورت استعمال اس کی تقویت کمتر محسوس ہوتی ہے لیکن بصورت عدم استعمال اس کی احتیاج سخت تر معلوم ہوتی ہے چنانچہ اکثر منشیات اور بعض مقویات و مفرحات کی بالعموم یہی کیفیت ہے کہ استعمال کے بغیر چین نہیں اور جس قدر استعمال کرو کم۔

علیٰ ہذا اشتعال آمیز تقریر کا بھی سامعین پر یہی اثر پڑتا ہے خواہ اشتعال کا نتیجہ حسب منشا و یا خلاف منشا نیک ہو یا بد، اصلاح ہو یا فساد، خیر ہو یا شر، ایسی تقریریں کبھی کبھی کان میں پڑیں تو رنگ لاتی ہیں، دل میں جوش بڑھاتی ہیں کام کر جاتی ہیں لیکن پر جوش تقریریں اکثر سنیئے تو بے اثر ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ جو خطیب وقت ناوقت فوری ہل چل کے لالچ میں تقریر سے اپنے سامعین کو اکثر جوش دلاتے رہتے ہیں وہ بالآخر پچھتاتے ہیں، سامعین میں عادتاً بے حسی اور بد ذوقی پیدا ہو جاتی ہے۔ جوش کی تقریر سننے سے ان میں جوش تو کم پیدا ہوتا ہے لیکن

تقریر میں جوش نہ ہو تو وہ اس کو مردہ سمجھتے ہیں۔ خواہ وہ تقریر بجائے خود کتنی ہی معقول اور مفید کیوں نہ ہو
وہی صورت ہے جو لوگ نشہ کے عادی ہو جاتے ہیں منشیات کے بغیر اچھی سے اچھی غذا میں
لطف کم پاتے ہیں۔ کلام میں بھی عادت اسی طرح پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ غالب نے کہا ہے اور
خوب کہا ہے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ؎ بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

قول و فعل

جلسوں اور تقریروں کے متعلق میں نے جو کچھ عرض کیا اس کا منشا یہ کہ قول و فعل کا باہمی تناسب
ملحوظ رہے اصول یہی ہے قول فعل کا محرک و معین ہوتا ہے فعل کا بدل نہیں ہو سکتا یعنے قول
کی محویت میں فعل فراموش نہ ہونا چاہئے لیکن ملک وملت کی راہ ترقی میں جس عمل کو عمل
کہتے ہیں وہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ خاص کر ترقی کے موجودہ دور میں کارگزاری کا معیار بڑے
عزم و اہتمام کا طالب ہے۔ ہمیشہ سے زیادہ آج کارگزاری کے واسطے صفات کی ہمہ گیر جامعیت
لابد ہے۔

جسمانی صحت و قوت

کارگزاری کے واسطے سب سے قدیم اور سب سے مقدم شرط جسمانی صحت و قوت ہے۔ روگی،
بیمار، کمزور و نحیف انسان زندگی کے معرکوں میں کیا کام آسکتے ہیں۔ بالفرض اگر وہ صاحب علم اور ماہر فن
بھی ہوں تو گویا فرسودہ و شکستہ کشتیوں میں سونا لدا ہوا ہے اور ہر دم خوف لگا ہوا ہے کہ پانی کی موجوں
میں کہاں تختہ ٹوٹتا ہے اور کہاں کشتی ڈوبتی ہے یوں تو ہر قوم میں کچھ بیمار اور کمزور رہیں لیکن جماعت
کثیر کو تندرست اور توانا ہونا ضرور ہے۔ کشمکش حیات میں بقا کی یہ پہلی شرط ہے اور اس کے بغیر کسی
ترقی کی توقع رکھنا عبث ہے۔ کچی اینٹوں سے شاندار محل تعمیر نہیں ہو سکتے۔ ترقی یافتہ قوموں میں جسمانی
صحت و قوت پر کس قدر علم و دولت صرف کرتے ہیں۔ تندرستی و توانائی کی بدولت محنت اور
برداشت کا معیار کس درجے بلند ہو رہا ہے۔ آنکھوں کے سامنے کارنامے موجود ہیں۔

دماغی تعلیم و تربیت

الحاصل جسم کی صحت و قوت قومی ترقی کی جد و جہد میں سب لوازم سے قدیم اور سب شرائط پر مقدم ہے۔ اس کے بعد دماغی تعلیم و تربیت کا نمبر آتا ہے کہ اس کی بدولت انسان کی کارگزاری میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے یوں تو ہر شعبۂ زندگی پر علم و فن کا جھنڈا لہراتا ہے لیکن تمدن و معاشرت کے نظامات اور صنعت و حرفت کے ایجادات میں علم و فن کے کمالات سب سے زیادہ عظیم الشان نظر آتے ہیں۔ اس اہمیت کے مدنظر بیدار اقوام علوم و فنون کی تعلیم و تربیت پر پانی کی طرح بیدریغ دولت بہاتی ہیں۔ بہ کثرت بڑے بڑے جامعات اور علم و فن کے ادارے کتب خانوں تجربہ خانوں معلموں اور متعلموں سے بھرے پڑے ہیں۔ اور وہاں کی سرگرمیاں قوم کی رگِ حیات کی حرکت شمار ہوتی ہیں۔

قلبی تہذیب و اخلاق

لیکن جسمانی صحت و قوت ہو یا دماغی تعلیم و تربیت۔ سب کمالات اکارت بلکہ منبع شرارت ہیں اگر ان پر قلبی تہذیب و اخلاق کی نگرانی نہ ہو۔ مثلاً بڑے بڑے توانا تندرست نوجوان اگر بے قابو ہوں مثل حیوان۔ بڑے بڑے بارسوخ پیشوا جو ہزاروں دلوں پر حکمران ہوں اگر تقوے سے غافل ہوں۔ بڑے بڑے حاذق ڈاکٹر جو قیمتی جانوں کے نگہبان ہوں اگر اخلاقی امانت میں ناقص ہوں۔ بڑے بڑے ماہر انجینئر جو لاکھوں کروڑوں روپیہ صرف کریں اگر رقمی امانت میں فاسد ہوں۔ بڑے بڑے با اختیار حکام جو سیاہ سفید میں دخیل ہوں اگر فرائض منصبی میں قاصر ہوں تو ان کی زیادتی یا کوتاہی سے بڑے بڑے نقصانات پہنچ سکتے ہیں۔ علی ہذا ترقی یافتہ اقوام کو لیجئے جسمانی تقویت اور دماغی تربیت میں کمال حاصل کرکے قلبی تہذیب کو نظرانداز کرنے کا جو لازمی نتیجہ ہو سکتا ہے وہ موجودہ جنگ کی صورت میں ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔

لیکن جو اخلاق موثر و مطلوب ہے وہ قلبی اخلاق ہے یعنے وہ خوش اخلاقی جو دل میں پیدا ہو۔ ورنہ یوں تو اخلاق لسانی بہت عام ہے۔ زبان سے باتیں بنانا کچھ بھی دشوار نہیں ہے لیکن ایسے اخلاق زیادہ کام نہیں دیتے۔ بریں ہم جو اخلاق زبان سے اوپر دماغ تک رسائی رکھتا ہے وہ اخلاقیات کہلاتا ہے

اگر وہ دل تک رسائی پیدا کرلے تو تقویت پاکر وہ دینیات بن جاتا ہے۔ دل و دماغ کے حدود گویا دینیات واخلاقیات کے حدود ہیں گرچہ ان حدود کے تعین میں قطعیت ممکن نہیں۔ تاہم امتیاز بیں چنداں دشوار نہیں۔ پھر خوش اخلاقی کی طرح بد اخلاقی بھی قلبی ہوسکتی ہے اور وہ بھی اسی طرح قوی الاثر ہوتی ہے بہرحال اخلاق قلبی کے بہت سے شعبے ہیں مثبت و منفی، اور ہر شعبہ اپنے اپنے محل پر قابل توجہ ہے۔ لیکن سرسری حوالے سے زیادہ یہاں بحث کی گنجائش نہیں اور ضرورت بھی نہیں۔

برطانیہ کی مثال

تفاصیل کے قطع نظر قوموں کی جدید کشمکش حیات میں فرض شناسی مستعدی اور استقلال یہ تین اخلاقی صفات بہت درکار ہیں اور بڑے بڑے معرکوں میں نازک موقعوں پر ان صفات کے جوہر کھلتے ہیں چنانچہ موجودہ جنگ کو لیجیئے قوت کی غفلت میں بڑی بڑی کوتاہیوں اور ناکامیوں سے سابقہ پڑا۔ تاہم برطانیوں کے ان ہی صفات نے برطانیہ عظمیٰ کا دم خم قائم رکھا۔ اور ان کے یہی صفات قومی نصرت وبقا کے ضامن معلوم ہوتے ہیں۔ سچ پوچھیئے تو وزیراعظم مسٹر چرچل کی شخصیت نے قوم میں اثر کی برقی لہر دوڑا کر بحالت سراسیمگی ان صفات کو پیدا کیا اور کام سے لگایا شخصیت کا یہ کارنامہ بھی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اور یوں بھی پوری جنگ چند شخصیتوں کا جادو معلوم ہوتی ہے

عناصر کارگزاری کی پرداخت

حاصل کلام یہ کہ جسم کی تقویت، دماغ کی تربیت اور قلب کی تہذیب یہ تینوں عناصر انسان کی اعلیٰ کارگزاری کے جزو لاینفک ہیں جسم کی صحت و قوت کا عمل تو پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہوجاتا ہے اور آخر دم تک ساتھ رہتا ہے۔ آب وہوا کا بے شک اثر پڑتا ہے۔ پھر بھی صحت و قوت زیادہ تر انسان کی اپنی کوشش سے تعلق رکھتی ہے اس کی ترقی میں دوسروں کی امداد کم مددگار ہوتی ہے قلب کی تہذیب و اخلاق کا بھی یہی حال ہے یہ کسی نہ کسی شخصیت کا فیضان ہوتا ہے جو عقیدت و تقرب سے حاصل ہوسکتا ہے پھر اپنی استعداد اور اپنے عزم پر ترقی کا مدار رہتا ہے۔ چنانچہ حضرت اکبر الہ آبادی مذہبی رنگ میں فرماتے ہیں۔

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا ہے دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

البتہ دماغ کی تعلیم و تربیت میں بڑے اہتمام کی ضرورت ہے علوم کی تعلیم اور فنون کی مہارت مطلوب ہو تو ابتدائی مکاتب سے لے کر مدارس کلیہ جات اور جامعات تک جس قدر بھی اہتمام کیا جائے کم ہے ترقی اس شعبہ میں خصوصیت سے قوم کی اجتماعی سعی در کار ہے۔ انفرادی اہتمام تقریباً لاحاصل ہے۔ چنانچہ ترقی پسند ممالک میں حکومتیں اور ان سے بڑھ کر قوم کے دولت مند مخیر جو بہبودی و خوشنودیٔ عامہ کی قدر و قیمت سے واقف ہیں۔ دل کھول کر تعلیم گاہوں کی امداد کرتے ہیں اور خوب سمجھتے ہیں کہ خود ان کی مرفہ الحالی بھی بالآخر قوم کی تقویت و ترقی پر منحصر ہے۔ ممکن نہیں کہ کسی قوم میں ضعف و زوال نمودار ہو اور متمول طبقے اس کی زد سے محفوظ رہیں۔ بلکہ سچ پوچھیے تو وہی سب سے زیادہ معرض خطر میں رہتے ہیں۔ پس دور اندیشی واجب ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ کارگزاری کے تینوں شعبے جو جسم و دماغ اور قلب سے وابستہ ہیں قوم کی ترقی کے واسطے لابد ہیں۔

ترقی کا مرکز

قوم کی گوناگوں ترقیات کے منجملہ معاشی ترقی کے مفہوم میں بالعموم خارج پر نظر دوڑتی ہے، مثلاً، پہاڑ، دریا، جھیل، میدان، سمندر، ساحل، معدنیات، نباتات، جنگلات، حیوانات زراعت، صنعت و حرفت، کارخانے، سکہ، نوٹ، بنک، بازار، ریل، جہاز، معاشی زندگی کا یہی نقشہ ذہن میں جمتا ہے۔ لیکن ادنیٰ تامل سے ظاہر ہے کہ در اصل انسانی کوشش ان تمام شعبوں کی روح رواں ہے۔ انسانی کارگزاری کے بغیر سب قدرتی شعبے انسان کی حد تک لاحاصل ہیں اور سب کاروباری شعبے سراسر معدوم۔ پس جب انسان ہی تمام ترقی کا مرکز و منبع ٹھیرا۔ اسی کی کارگزاری پر ترقی کا دار و مدار رہا تو اس کی تقویت و تربیت و تہذیب میں جس قدر اہتمام کیا جائے کم ہے۔ چنانچہ ترقی پسند اقوام کا یہی مسلک ہے اور ہمارے ملک میں بھی یہی اہتمام سب پر مقدم ہے۔

طالب علم کی حیثیت

بچپن، لڑکپن، نوجوانی، انسانی زندگی کا یہ زمانہ سب سے زیادہ نتیجہ خیز ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو یہی

اسی زمانہ میں اس کے مستقبل کا نقشہ بن جاتا ہے۔ دل، دماغ، جسم، اسی زمانہ میں نشو و نما پاتے ہیں جو رخ اختیار کرتے ہیں اسی پر بڑھتے چلے جاتے ہیں اور فطری استعداد کے حدود میں جتنا موقع ملے کمال دکھاتے ہیں، پس بچے لڑکے نوجوان بشمول طبقۂ نسواں۔ ہر قوم کا سب سے بیش قدر سرمایہ ہیں۔ ترقی پسند اقوام میں یہ جماعتیں مجموعی طور پر طالب علم کہلاتی ہیں۔ ان کی فلاح و ترقی پر بیدار قومیں بے حد توجہ اور بے حساب دولت صرف کرتی ہیں اور ان ہی کے دم سے بڑے بڑے عروج پاتی ہیں چنانچہ اگر کسی قوم کی بیداری اور دور اندیشی کا اندازہ کرنا ہو تو یہ معلوم کرنا کافی ہے کہ اس قوم میں معاشی اور معاشرتی حالات کے پیش نظر طالب علموں کا کیا تناسب ہے اور طالب علموں کی کیا حیثیت ہے خلاصہ یہ کہ ہر قوم کی گوناگوں عظمتوں کے سنگ بنیاد اس قوم کے طالب علم ہوتے ہیں واضح رہے کہ مضبوط بنیادوں کے بغیر عالیشان عمارتوں کے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتے۔ البتہ تعلیم گاہوں کو سیاسی سازشوں کی آڑ بنا کر طالب علموں کو شورش کا آلۂ کار بنانا خطرناک کوتاہ اندیشی ہے اور ملک کے حق میں دشمنی۔

معاشی کانفرنس

جلسوں اور تقریروں کے ذکر میں قول و فعل کے تناسب پر کارگذاری کے شرائط اور، انسان کی مرکزیت اور طالب علم کی اہمیت پر ہیں نے متعدد کسی قدر اصرار سے توجہ طلب کی۔ بظاہر ممکن ہے کہ یہ بحث کسی حد تک گریز معلوم ہو لیکن فی الحقیقت بہ اعتبارات قومی حیات و بقا کے لابدی عناصر میں اور گرچہ ان کا ذکر کچھ انوکھا نہیں تاہم ان پر جس قدر اصرار و تواتر سے توجہ طلب کی جائے کم ہے خاص کر جب عام طور پر بے توجہی غالب ہو۔

حاصل کلام یہ کہ معاشی کانفرنس کے سالانہ جلسے اور جلسوں میں خطبے، مقالے، تقریریں، تحریکیں یہ سب مراحل بجائے خود طے ہونے ضرور ہیں اس طریق سے ملک میں معاشی بیداری پھیلنے کی توقع ہے لیکن یہ کوشش بحث کے دائرہ میں محصور رہ جائے تو کیا حاصل گویا ع نشستند و گفتند و برخاستند۔ عمل کی بھی نوبت آنی چاہیے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ معاشی امور سے تعلق اور دلچسپی رکھنے والے محکمے اور ادارے بشمول کانفرنس سب مل کر کوئی لائحہ عمل مرتب کریں جو جامعیت کے ساتھ معاشی ترقی کا ضامن ہو، یوں تو

کسی نہ کسی حد تک مختلف طریق پر معاشی اصلاح و ترقی کا یہ کام پہلے سے ملک میں جاری ہے۔ تاہم اگر کسی اتحاد کے تحت تقسیم عمل میں تنظیم ہو جائے تو معاشی ترقی میں بھی جامعیت پیدا ہو جائے معاشی زندگی کے گوناگون شعبے باہمی لزوم اور انحصار سے اس درجہ مربوط ہیں کہ معاشی ترقی میں ہمہ گیری لابد ہے۔ اسی سبب تقسیم عمل میں اتحاد کے ساتھ تنظیم کی ضرورت ہے۔

معاشی تنظیم میں جامعیت

اتحاد کے ساتھ تقسیم عمل کی تنظیم میں اول سرکار عالی کے وہ محکمے ہیں جن کو ملک کی معاشی زندگی سے قریبی تعلق ہے۔ خاص کر سررشتۂ تعلیمات، جامعۂ عثمانیہ، محکمہ جات معدنیات، جنگلات، آبکاری، مالگذاری، امداد باہمی، تعمیرات، آبپاشی، صنعت و حرفت، دارالضرب، طباعت کروڑگیری، ریلوے اور فینانس، دوسرے معاشی نوعیت کے نیم سرکاری ادارے جن کو سرکار عالی کی مالی امداد اور انتظامی نگرانی حاصل اور جن کے سرمایہ انتظام میں عوام کو بھی شرکت حاصل ہے۔ مثلاً حیدرآباد اسٹیٹ بنک، نظام شگر فیکٹری، سرلور پیپر ملز، عثمان شاہی ملز، اعظم جاہی ملز، تیسرے اور چوتھے بڑے بڑے کارخانہ اور کاروبار جو مشترکہ سرمایۂ عامہ سے یا انفرادی سرمایہ خانگی سے قائم ہیں، مثلاً دیوان بہادر رام گوپال ملز، حیدرآباد کمیکل اینڈ فارماسوٹیکل ورکس یعنے کیمیاوی دواویاتی کارخانہ حیدرآباد و زیر سلطان تمباکو کمپنی گولکنڈہ سگریٹ فیاکٹری، رگھوناتھ مل بنک اور، پانچویں متفرق مقامی صنعتیں جو قلیل سرمایوں سے چھوٹے چھوٹے پیمانوں پر جاری ہیں اور اکثر کس مپرسی کی بدولت خستہ حال ہیں لیکن امداد ملنے پر کافی ترقی کرسکتی ہیں مثلاً چوڑی کی صنعت، بٹن کی صنعت، کمبل اور قالین کی صنعت، ہمرو مشروع کمخواب کی صنعت، ہر مد میں بطور نمونہ چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا ورنہ مثالوں کی طویل فہرستیں پیش کرنا یہاں مقصود نہیں۔ مطلب یہ کہ ملک میں بڑے چھوٹے پیمانوں پر کسی نہ کسی نوعیت کی جو معاشی جدوجہد ہر چہار طرف جاری ہے یا جس کے جاری ہونے کا امید افزا قرینہ ہے۔ ان سب کا جائزہ لیا جائے، ملک کے ذرائع اور ملک کی ضروریات پر نظر دوڑائی جائے اور سب پہلو پیش نظر رکھ کر متحدہ طور پر بطریق تقسیم عمل جامعیت کے ساتھ معاشی اصلاح و ترقی کا کوئی لائحۂ عمل مرتب کیا جائے۔ جب تک یہ اہتمام نہ ہوگا ملک کو وہ مرفہ الحالی نصیب نہیں ہوسکتی جو دوسرے ممالک کو حاصل ہو چکی ہے اور جس کے

حاصل کرنے کی ملک میں کافی استعداد موجود ہے۔

معدنیات و جنگلات

معاشی اصلاح و ترقی کا لائحۂ عمل یوں تو بہت تفصیل طلب ہے لیکن اجمالی خاکہ مطلوب ہو تو اس میں بعض مدات خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ مختصر کیفیت یہ کہ سب سے پہلے معدنیات بڑی دولت ہیں دنیا میں آج ان کی جو قدر و قیمت ہے، اظہر من الشمس ہے، سچ پوچھیے تو معاشی ترقی کے لوازم میں انسانی کارگذاری کے بعد ازمی معدنیات ہی کا نمبر ہے جس ملک کو معدنیات حاصل ہیں اس کو بڑی قوت حاصل ہے جو معدنیات بھی ملک میں قدرتاً موجود ہوں۔ کم از کم ان پر ملک کا قبضہ و تصرف رہنا لازم ہے۔ تھوڑے منافع کے لالچ میں معدنیات دوسروں کے حوالہ کر دینا بڑی کمزوری اور کوتہ اندیشی ہے اس سے بہتر ہے کہ موافق حالات نمودار ہونے تک وہ دھرتی ماتا کے آغوش میں محفوظ رہیں۔

علیٰ ہذا قدرتی انعامات میں جنگلات بھی بڑی دولت ہیں اوّل تو موسم اور بارش پر ان کا مفید اثر پڑتا ہے دوسرے ان میں وحشی جانوروں کے سوا پالتو جانور بھی پرورش پاتے ہیں۔ مثلاً بھیڑ بکری گائے بھینس جو خود مجموعۂ دولت ہیں۔ تیسرے ان کی پیداوار بہت کار آمد ہوسکتی ہے خاص کر جو بینہ جو عمارت و فرنیچر میں کام آسکے۔ مثلاً ساگوان وغیرہ بہت قیمتی ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا بانس بھی بہت خاص پیداوار ہے یوں تو اس کے بہت سے مصرف ہیں لیکن کاغذ کی صنعت نے اس کی قدر و قیمت بہت بڑھا دی ہے۔ چنانچہ سرپور پیپر ملز حال میں کثیر سرمایہ سے بڑے پیمانہ پر بہ سرپرستی سرکار عالی ضلع آصف آباد میں قائم ہوئی ہیں جہاں قرب و جوار میں بانس کے گھنے جنگل محفوظ ہیں۔ بصورت ضرورت ملک کے دوسرے جنگلوں کے بھی بانس مہیا ہوسکتا ہے۔ مثلاً امرآباد کا بانسواڑہ بھی امید افزا ہے اور کاغذ کی صنعت کو جو روز افزوں اہمیت حاصل ہے محتاج بیان نہیں۔ حاصل کلام یہ کہ معدنیات و جنگلات یہ دونوں محکمے خاص توجہ اور اہتمام کے مستحق ہیں کہ ان کا قوم کی مرفہ الحالی سے قریبی تعلق ہے۔

زراعت

زراعت ملک کا عام پیشہ ہے کاشتکاروں کی آبادی ملک میں سب سے زیادہ ہے کچھ تو اس کے

قدرتی اسباب ہیں اور کچھ معاشی پس ماندگی اس صورت حال کی ذمہ دار ہے۔ بہر حال کاشتکاروں کی خوشحالی ملک کی خوشحالی کا بڑا جزو ہے۔ کاشتکار مالک زمین نہ ہوں تو بھی زمین پر ان کا قبضہ دیرپا ہونا چاہیئے ورنہ ممکن نہیں کہ زمین کی درستی میں وہ دل کھول کر کوشش کریں۔ پھر بصورت ضرورت ان کو مناسب شرائط پر رقم قرض ملنی چاہیئے کہ کثرت سود سے وہ زیر بار نہ ہوں ۔ چنانچہ اس غرض سے دیہاتی انجمن امداد باہمی قائم ہو رہی ہیں کہ کاشتکار ساہوکاروں کی دستبرد سے محفوظ ہو جائیں۔ علیٰ ہذا زمین کا لگان اور زمین کی مالگذاری بھی اتنی نہ بڑھنے پائے کہ کاشتکار مفلس رہ جائیں کہ بالآخر اس میں لگان اور مالگزاری کا بھی نقصان ہے ۔ کاشتکاروں کو تخم منتخب کرنے اور کاشت کرنے میں مشورہ دیا جائے پیداوار فروخت کرنے میں مدد دی جائے چنانچہ اس غرض سے محکمۂ زراعت قائم ہے اور مارکٹ آفیسر مقرر ہیں۔ زراعت کی سب سے بڑی ضرورت پانی ہے بارش تو اختیار میں نہیں۔ البتہ دریا، نالے، ساگر، کنٹے، تالاب، باولیاں ان ذرائع سے مدد مل سکتی ہے اور محکمۂ آبپاشی کا یہی کام ہے۔
پس زراعتی ملک میں آبپاشی کا جس قدر بھی اہتمام ہو سکے کم ہے۔ خوراکی غلوں کے سوا۔ روئی نیشکر السی ایکرنڈ اور مونگ پھلی کی کاشت بہت امید افزا معلوم ہوتی ہے ۔

صنعت وحرفت ۔

نباتات وحیوانات کی پیداوار میں قدرتی تصرف زیادہ دخیل رہتا ہے۔ اس کے برعکس صنعت وحرفت میں انسانی کوشش کا دخل بڑا ہوا ہے۔ ایک سادہ مثال لیجیئے کہ روئی بنولہ سے پیدا ہوتی ہے، اون بھیڑ سے، ریشم کیڑے سے حاصل ہوتا ہے اور ان کی پیداوار میں کیفیت وکمیت کی ایک حد ہے لیکن صنعت کے ذریعہ پارچہ بافی میں اتنی ترقی ممکن ہے کہ کپڑا چاندی سونے کے مول فروخت ہو پس علم وفن کے زور سے مصنوعات میں افادہ بڑھا بڑھا کر زراعتی ممالک کے مقابل صنعتی ممالک بہت زیادہ دولت مند بن جاتے ہیں۔
اور یوں بھی مصنوعات معاشرت وتمدن کی ترقی کا جزو لاینفک ہیں پس ملک کے قدرتی ذرائع اور کاروباری مواقع کے لحاظ سے صنعت وحرفت کا کوئی جامع پروگرام بننا چاہیئے۔ ورنہ یوں منتشر کوششیں خاطر خواہ کامیاب نہیں ہو سکتیں سب سے مقدم تو صنعت وحرفت کی تعلیم اور مہارت ہے۔ عثمانیہ ٹکنیکل کالج، دارالضرب سرکار عالی۔ ریلوے ورکشاپ ایسے چند اداروں میں جدید طرز پر صنعت وحرفت کی تعلیم ومہارت کا لحاظ بہت

انتظام ہے اسی طرح سررشتہ تعلیم صنعت وحرفت بھی چند سال سے قائم ہے اور اس کی نگرانی میں صنعت وحرفت
کے چند مدارس جابجا جاری ہوچکے ہیں جہاں معمولی مقامی صنعتوں کی تعلیم ہوتی ہے کچھ خانگی مدارس بھی کام کررہے
ہیں لیکن ملکی ضروریات کے مدنظر یہ اہتمام سراسر ناکافی ہے اور بہت ترقی و توسیع کا طالب ہے۔ سررشتۂ تعلیمات
اور جامعہ عثمانیہ کی ادہر خاص توجہ درکار ہے۔

سرکاری امداد اور مالیہ

ترقی صنعت وحرفت کے لئے ملک میں چھوٹے بڑے کارخانے بھی قائم ہونے ضرور ہیں چنانچہ گو رفتار
سست ہے تاہم ان کا سلسلہ شروع ہوچکا ہے اور بعض مرکزی کارخانوں کا ذکر کیا جاچکا ہے اوّل تو محکمۂ صنعت وحرفت سے ایسے کارخانوں کو مشورے
کی مدد مل سکتی ہے دوسرے سرکاری مالیہ سے بھی بطور مستقل اصل معتبر کارخانوں اور کاروباروں کو مالی امداد ملتی
رہتی ہے اور سب سے بڑھ کر تیسرا انتظام یہ کہ سرکار عالی نے حیدرآباد انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کے نام سے کثیر رقم
باقاعدہ مختص کردی ہے کہ امداد کی جاسکے چنانچہ اس فنڈ کی امداد سے کاروبار میں خاصی جان پڑگئی ہے
اور بہت کچھ ترقی کی توقع ہے لیکن آخرکار سرکار عالی کے مالی ذرائع بھی محدود ہیں اور صدہا مصارف اس کے ذمہ
لگے ہوئے ہیں اور ہر طرف اضافوں کے مطالبے بڑھ رہے ہیں۔ اگر اس سے ملک کی ترقیات میں بیش از بیش مالی
امداد دینی مقصود ہو تو متمول طبقوں کو محاصل کے واجبی اضافوں میں عذر نہ ہونا چاہیئے اور ان کی روایتی
فیاضی سے امید ہے کہ اضافۂ محاصل کی واجبیت واضح ہوجانے پر کوئی عذر نہ ہوگا ورنہ پھر روزافزوں مصارف
کے مدنظر محکمۂ فینانس کو کیمیا کا کوئی نسخہ بتادیا جائے کہ وہاں تانبے سے سونا بنتا رہے یا اس سے بھی آسان
تدبیر یہ کہ کہیں سے پارس پتھر حاصل کرکے محکمۂ فینانس کو دیدیا جائے کہ حسب ضرورت چھومنتر سونا بن جائے
ورنہ ممکن ہے کہ کیمیا کے سونے میں ایک آنچ کی کسر رہ جائے بہرحال محکمۂ فینانس کی حالت پانی کے
ساگر کی ہے جس قدر روپیہ جمع ہوگا اس قدر تقسیم ہوسکے گا۔ البتہ اصول وقاعدہ سے روپیہ جمع کرنا تقسیم
کرنا محکمہ کا کام ہے اور یہ کام بجائے خود ایک بڑا علمی فن ہے ۔

دولت مند طبقوں کی امداد

دولت مند طبقے کئی طرح ملک کی مرفہ الحالی میں مدد دے سکتے ہیں۔ اوّل تو توقع ہے کہ ذ

دیگر ممالک کی طرح خوش دلی سے ترقیات ملک کے واسطے واجبی محاصل برداشت کریں گے۔ اگر اپنے اطمینان کی خاطر وہ مصارف میں شریک رہنا چاہیں تو حال ہی میں مجلس مشاورت کی ابتدا ہو چکی ہے۔ دوسرے بڑی بڑی رقمیں جو ان کے پاس خزانوں میں بیکار پڑی ہوں ان کو کاروبار میں لگائیں اور نگرانی میں شریک رہیں چنانچہ اعلیٰ طبقوں میں کاروبار کی ایسی مثالیں نمودار ہو رہی ہیں اور امید ہے کہ وہ نظیریں قابل تقلید ثابت ہوں گی۔ تیسرے رفاہ عامہ کے کاموں میں بطریق عطیات راست امداد دی جائے مثلاً، مدارس، اقامت خانہ، شفاخانہ، یتیم خانہ وغیرہ قائم کئے جائیں کہ خلق خدا ان سے مستفید ہو چنانچہ انسداد گداگری کا جدید قانون و انتظام اسی اصول کی ایک قابل تقلید مثال ہے گرچہ مقصود بہبودی عامہ کے سوا کچھ نہ ہو پھر بھی تقدیراً خوشنودی عامہ عود کرتی ہے جو اخلاقی اور نفسیاتی اعتبار سے بڑی نعمت ہے ماشاء اللہ مملکت آصفیہ میں ہمدردی اور فیاضی کی روایات ہمیشہ شاندار رہی ہیں اور ان کی شان میں جدید طریق پر مزید ترقی اغلب و ممکن ہے بلکہ پہلے سے جاری ہے

ملکی بنک

کاروبار کی رقمی امداد کے سلسلہ میں ضرور ہے کہ ملک میں کافی بنک مقامی سرمایہ سے قائم ہوں۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ بہت سا بیرونی سرمایہ ملک میں منافع کمارہا ہے۔ باہر لیجا رہا ہے اور خود ملک کی بڑی رقمیں باہر کی بنکوں میں بغرض حفاظت جمع ہو کر باہر فائدہ پہنچا رہی ہیں۔ یہ حالت فلاح ملک کے منافی ہے خاص کر اس دور میں جس دور سے اپنا ملک گذر رہا ہے ضرورت ہے کہ اعلیٰ اور متوسط طبقے سب کے اندوختے بنکوں میں جمع ہو کر قلت سرمایہ کی دشواری رفع کریں اور بنکوں کے ذریعہ کاروبار کو مالی امداد ملے۔ یہ سچ ہے کہ بنک چلانا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن جو کام دوسرے ملکوں میں کامیابی سے انجام پا رہے ہیں وہ یہاں کیوں محال سمجھے جائیں۔ رہی سود اور منافع کی بحث جو اہل اسلام سے خاص تعلق رکھتی ہے وہ دراصل زیادہ پیچیدہ نہیں ہے کاروبار کی مالی شرکت میں اگر معاوضہ کی شرح پہلے سے معین نہ کی جائے بلکہ حسب حال کمی و بیشی کے ساتھ نفع و نقصان میں شرکت رہے تو سود کی صورت باقی نہیں رہتی جو کچھ ملتا ہے منافع ہوتا ہے اور منافع ہر طرح جائز ہے بلکہ بلحاظ مذہب عملی

تجربہ سے بھی دنیا سود کی مضرت و منافع کی منفعت کی قایل ہو رہی ہے۔

معاشی مباحث

معاشیات خواہ نظری ہو یا عملی کتابوں میں اس کے مباحث فی الجملہ ایک خاص ترتیب سے پیش کئے جاتے ہیں اور وہ ترتیب مباحث کی تفہیم میں معین مانی جاتی ہے مثلاً معاشی جد و جہد کے شعبوں میں اوّل پیدایش دولت، پھر تقسیم دولت پھر مبادلۂ دولت اور پھر آخر میں صرف دولت۔ بالعموم یہی ترتیب ملحوظ رہتی ہے گرچہ اس ترتیب میں چنداں لزوم نہیں ہے۔ مثلاً بعض صرف دولت کا شعبہ مقدم سمجھتے ہیں کہ انسان اس شعبہ سے معاشی زندگی شروع کرتا ہے یعنے پیدا ہوتے ہی صرف دولت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے پیدایش دولت کی نوبت بعد کو آتی ہے اور یہ نوبت یقینی بھی نہیں ہے خدانخواستہ کوئی کم عمری یا نوجوانی میں چل دیا تو ہاتھ ملنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور جو پیدایش دولت میں مصروف ہیں وہاں بھی یہ بحث تصفیہ طلب ہے کہ آیا انسان کھانے کماتا ہے یا کما کر کھاتا ہے یہ وہی بحث ہے کہ آیا پہلے انڈا پیدا ہوا یا مرغی۔ اس کا تصفیہ جو کچھ بھی ہو سکتا ہے ظاہر ہے بہرحال لزوم نہ ہو تو بھی بالعموم مباحث کی ایک خاص ترتیب مروج ہے۔ علی ہذا پیدایش دولت کے تحت عاملین پیدایش میں زمین، محنت، اصل اور نیز تنظیم تا تقسیم۔ دولت کے تحت پیداوار کے حصوں میں لگان اجرت، سود یا منافع اور معاوضۂ تنظیم، یا مبادلۂ دولت کے شعبہ میں قدر و قیمت، زر، بنک، بازار وغیرہ یا صرف دولت کے شعبہ میں ضروریات اور معیار زندگی وغیرہ یہ جملہ مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ مزید برآں ایک اعتبار سے مالیات کا شعبہ بھی مندرجہ بالا تفصیل میں جا بجا شامل رہتا ہے پھر بھی اس سے جداگانہ بحث کی جاتی ہے۔ مباحث کی طویل تفصیل نظرانداز کر کے اجمالی خاکہ پیش کیا گیا تو بھی اس میں تفصیل کافی نظر آتی ہے اور ہر مسئلہ اپنی جگہ اہم اور قابل توجہ معلوم ہوتا ہے۔

خطبات کے حدود

لیکن عام جلسوں کے مواقع پر خطبات میں اگر جامعیت کی خاطر اکثر معاشی مباحث ترتیب کی پابندی سے پیش کئے جائیں خواہ وہ کتنے ہی اختصار سے پیش کئے جائیں خطبہ اگر کتاب نہیں تو کتابوں کا خلاصہ ضرور بن جائیگا پھر معاشی مباحث کے دو پہلو رہ جاتے ہیں ایک نظری دوسرا عملی مثلاً جس طرح کہ ریاضی یا کیمیا یا طبیعات میں دو پہلو ہیں ایک نظری دوسرا عملی بیان میں اگر نظری پہلو پر اکتفا کیا جائے تو وہ اچھا خاصا درس بن جائیگا۔

نظری پہلو نظر انداز کرکے عملی پہلو پیش کیا جائے تو فنی امور میں مثلاً مسائل قدر و قیمت میں یا مسائل زر و سکہ میں جہاں بعض نظر آنے
حالانکہ ایسے ہی فنی امور سمجھنے کا اشتیاق عام پایا جاتا ہے دونوں پہلوؤں کو یکجا رکھا جائے تو موقع کے مدنظر طوالت
حد سے بڑھ جائے یہ مشکل وہاں اور بھی زیادہ پیش آتی ہے جہاں عام طور پر معاشیات کے نظریات سے واقفیت کم ہو اور معاشیات کے عملیات سمجھنے کا اشتیاق زیادہ ہو

جنگ کے اثرات

پھر موجودہ جنگ کے گوناگوں غیر معمولی اثرات نے تمام کاروبار تہ و بالا کرکے معاشی قوانین کا عمل بڑی حد تک
معطل کر دیا ہے نتیجہ یہ کہ معاشی حالات میں معاشی نظریات سے بعد نظر آتا ہے خلاصہ یہ کہ معاشی زندگی مدت سے
عدم مداخلت کے اصول و عمل پر بڑی حد تک جاری تھی اور معاشیات کے نظریات بھی بیشتر اس مفروضہ پر مبنی
تھے لیکن جنگ کی بدولت مسلک الٹ گیا اور سرکاری مداخلت کی یہ نوبت پہنچی کہ معاشی زندگی کی تقریباً تمام ضروریات
منظوری کی محتاج ہوگئیں مداخلت کے عمل سے معاشی زندگی پامال ہوگئی اور معاشیات کے نظریات بھی کتابوں میں گذشتہ
کی یادگار معلوم ہونے لگے تاہم توقع ہے کہ یہ صورت حال مدت تک باقی نہ رہ سکے گی اور تباہی عام ہونے سے
قبل اصلاح کی صورت نمودار ہو جائے گی۔

معاشی کانفرنس کے مباحث

مندرجہ بالا اعتبارات کے مدنظر میں نے کسی رسمی ترتیب کی پابندی غیر ضروری سمجھ کر اول ان ہی امور پر
اصرار کے ساتھ توجہ طلب کی جو امور اساسی یا ضروری ہونے کے سبب اور عام عدم التفات کے سبب خصوصیت سے
توجہ کے طالب ہیں خطبہ میں تفصیل کی طوالت سے ایک مفر یہ بھی نکل آیا کہ بعض اہم مسائل پر جلسہ میں جداگانہ مقالے پڑھے
جائیں گے اور ان پر بحث مباحثہ بھی ہو سکے گا اس لئے ان کے متعلق خطبہ میں کچھ بیان کی ضرورت باقی نہیں رہی
چنانچہ مذکورہ مباحث درج ذیل ہیں۔

(۱) حیدرآباد میں محاصل اندازی کا مسلک (۲) حکومت اور زمانہ جنگ کے معاشی مسائل
(۳) کاشتکار اور زمانہ جنگ کے اثرات (۴) حیدرآباد میں صنعتی سرمایہ کا مسئلہ

مندرجہ بالا مباحث کی علمی اور عملی اہمیت محتاج بیان نہیں ہے اور توقع ہے کہ مقالوں سے کافی وضاحت
حاصل ہو سکے گی ان کے سوا بعض دیگر معاشی مسائل جو عام توجہ جذب کر رہے ہیں بقدر گنجائش مختصراً ذیل میں پیش ہوں گے۔

منشاء یہ کہ موجودہ معاشی حالات کی سرسری تفہیم ہو کر کسی نہ کسی حد تک عام حیرانی رفع ہو جائے

جنگ میں اتلاف دولت

یوں تو دولت صرف کرنے کے لئے ہی پیدا کی جاتی ہے اور صرف کرنے ہی میں لطف آتا ہے گویا اصطلاحی زبان میں افادہ حاصل ہوتا ہے جو دولت صرف میں نہ آئے اس کے پیدا ہونے سے کیا حاصل لیکن دولت صرف ہونے اور دولت تلف ہونے میں بڑا فرق ہے ۔ مثلاً کھانا کپڑا یہ عام ابتدائی ضروریات ہیں کھانا کھانے میں آئے تو الحمد للہ، کپڑا پہننے میں آئے تو الحمد للہ لیکن اگر کھانا جل کر کوئلہ ہو جائے کپڑا جل کر راکھ ہو جائے تو اس کو کیا کہئے۔ پھر جب دولت صرف میں آتی ہے تو بالعموم وہ پیدائش دولت میں مدد دیتی ہے چنانچہ دولت میں پیدائش و صرف و صرف پیدائش کا یہ تواتر ہر طرف جاری ہے ۔ البتہ اگر تواتر کا رخ جانب اعلیٰ ہے کہ صرف دولت میں اضافہ ہوا اور پیدائش دولت میں اس سے زیادہ اضافہ ہو یہ معاشی ترقی کی صورت ہے اور اگر جانب اسفل ہے کہ صرف دولت میں کمی ہوا اور پیدائش دولت میں اس سے زیادہ کمی ہو تو یہ معاشی نزول کی صورت ہے، لیکن جب دولت تلف ہوتی ہے تو نہ وہ صرف دولت کا مقصد پورا کرتی ہے اور نہ وہ پیدائش دولت میں مدد دیتی ہے بلکہ اس کے برعکس پیدائش دولت میں رکاوٹ اور دشواری پیدا کرتی ہے ۔ مثلاً آدمی کھانا کھا کر تازہ دم ہو کر کام میں لگ جاتا ہے لیکن کھانا جل کر کوئلہ ہو جائے تو بھوکا آدمی کیا کارگذاری دکھائے بلکہ ادھر کھانا جلا تو ادھر یہ دل جلا ہو گیا ۔ بھوکا سو رو کھا، بھوک میں صبر نہ آسکا تو غصہ آجائے گا بہر حال کام میں خلل پڑ جائے گا ۔ اس سادہ مثال سے بڑی بڑی پیچیدہ صورتیں واضح ہو سکتی ہیں ۔

حاصل کلام یہ کہ دولت صرف کرنے کی غرض سے پیدا کی جاتی ہے اور صرف کرنے ہی سے دولت پیدا ہوتی ہے لیکن دولت تلف ہو کر اس تواتر میں خلل ڈالتی ہے معاشی ترقی کا راستہ روکتی ہے اور معاشی تنزل کا راستہ کھول دیتی ہے ۔ چنانچہ جنگ کی غارت گری سے دنیا اس آفت میں مبتلا ہو رہی ہے ۔ صدیوں کی دولت بے حساب دولت بے نظیر دولت دھواں بن کر ہوا میں غائب ہے یا خاک بن کر زمین پر پڑی ہے یا ڈوب کر سمندر کی تہہ میں لا پتہ ہے جہاں پیدائش دولت اور صرف دولت کی بدولت دنیا جنت بنی ہوئی تھی اور بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے ۔ اگر فردوس بر روئے زمین ست ؛ ہمین ست و ہمین ست و ہمین ست

وہاں اتلاف دولت کی بدولت اب ویرانی دیکھی نہیں جاتی پھر بھی شدت جاری ہے ۔ الامان !

کہہ رہا ہے آسمان یہ سب سماں کچھ بھی نہیں ؎ پیش دونگا ایک گردش میں جہاں کچھ بھی نہیں

اعصاب کا کھیل

غرض کہ جان تلف، مال تلف، پیدائش دولت کے سامان تلف اور تلف کرنے کے نت نئے سامان بڑے سے بڑے پیمانے پر ہر طرف بڑی مستعدی سے تیار ہو رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ تباہ کرنے اور تباہ ہونے کے سوا انسان کے واسطے دنیا میں کوئی مشغلہ باقی نہیں رہا، یہ جنگ دراصل جنگ اعصاب ہے تہذیب جدید کا سب سے زیادہ اعصاب پر بار ہے ۔ اسے اعصاب گرم ہوتے ہیں اور جب گرم ہوتے ہیں تو تعدی اور تشدد سے زیادہ انسان کوکوئی مشغلہ پسند نہیں ہوتا ہے۔ انتہا پر کشت و خون کی نوبت آتی ہے موقع نہ ہو تو خودکشی پر گذر جاتی ہے بہرحال اعصاب کی گرمی تباہی ضرور لاتی ہے قوم بھی افراد کا مجموعہ ہے جنگ کی شدت اعصاب کا کھیل ہے لیکن فی الفور جوش میں پتہ نہیں چلتا سکون ہونے پر زخموں کا تکلیف شروع ہوتی ہے، درد، بیماری، کمزوری، تیمارداری یہ مراحل بعد کو سخت گذرتے ہیں پھر بھی صحت کی بات کہاں حاصل ہو سکتی ہے دنیا کی محویت کے ساتھ آخرت بھی یاد رہے تو اعصاب غیر معمولی بار سے محفوظ رہتے ہیں، استغنی، قناعت عفو، صبر، رضا، ایسے مذہبی اعتبارات اعصاب کو گرمی سے بچاتے ہیں لیکن ساتھ ہی دنیوی جد و جہد بھی اعتدال پر آجاتی ہے چنانچہ اس نتیجہ کے سبب دنیا پرست دین و مذہب کو اپنی ترقی کے حق میں مضعف سمجھتے ہیں۔

قلت و ناداری

دولت تلف ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ کہ وہ صرف کے واسطے میسر نہیں آتی اور جو کچھ میسر آتی ہے خریداروں کے حق میں اس کی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ الحاصل قلت و ناداری کا دور شروع ہو جاتا ہے نوبت یہ کہ نہ تن بھر کپڑا نہ پیٹ بھر روٹی اس مصیبت میں نظم برقرار رکھنے کے لیے طرح طرح کی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں جن میں عام تدبیر آج کل راشن کھلاتی ہے مثلاً یہ کہ فی المجموع سامان کم ہے تو نگرانی لابد ہے کہ کوئی حصہ سے زیادہ نہ لے سکے سب کو مطلوبہ سامان تھوڑا تھوڑا میسر آتا ہے لیکن سامان ہی باقی نہ رہے یا جنگ کے واسطے مختص ہو جائے تو پھر عوام کو کیا میسر آئے۔ بہرحال راشن سے بدنظمی میں ایک نظم نظر آنے لگتا ہے اور اس کے سوا چارہ کار بھی کیا ہے۔

جہاں زراعت جاری رہ سکے کاشتکار کو خاصی آمدنی حاصل ہو سکتی ہے کہ پیداوار کی مانگ ہے اور قیمتیں بڑھی ہوئی ہیں۔ جنگ کی ضرورتوں سے صنعت و حرفت کے کام بھی پھیل رہے ہیں۔ مزدوروں کی اجرتیں

میں بہ شرط گنجایش کم و بیش اضافہ ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے لیکن سرکاری ملازموں کو بالعموم گرانی کا پورا بار برداشت کرنا پڑتا ہے بلکہ الٹا خوف لگا رہتا ہے کہ سرکاری مالیہ میں خدانخواستہ کمی آئے یا جنگی مصارف کا تناسب بڑھ جائے تو کہیں الٹی تخفیف ماہوار کی نوبت نہ آئے تاہم کم تنخواہ ملازمین کو گرانی کا جو تھوڑا بہت الاؤنس ملتا ہے اس سے کچھ نہ کچھ ان کی تسلی ہو جاتی ہے۔

لیکن شکایت کی کوئی گنجایش نہیں دشواری کے موقعوں پر صبر و تحمل سے اور ہو سکے تو گرم جوشی سے ایثار کرنا قومی مفاد کے واسطے لازم ہے۔ البتہ یہ ایثار حصہ رسد عام ہونا شرط ہے چنانچہ ہر قوم اپنی اپنی حیثیت اور بساط کے موافق اپنے اپنے ملک کے واسطے جانی و مالی ایثار دکھا رہی ہے لیکن وہی ایثار ایثار ہے اور اسی ایثار میں برکت ہے جو جبر و بددلی سے نہیں بلکہ صبر و تحمل سے برداشت کیا جائے اور اگر فطری تعلق سے گرم جوشی پیدا ہو جائے تو پھر کیا کہنا لیکن فطری تعلق کے بغیر یہ صورت ممکن نہیں۔

تجار و ساہوکار

ایثار کے معاملہ میں تجار و ساہوکار کا سوال پیچیدہ ہے۔ معمولی حالات میں طلب و رسد کے کسی معاشی قانون کے موجب اشیا کی قیمتیں بہ رضامندی فریقین قرار پاتی ہیں۔ چنانچہ قدر و قیمت کے مسائل معاشیات میں خاص علمی اور عملی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن جبکہ عدم مداخلت کا مسلک ترک ہو کر معاشی زندگی کے اکثر بلکہ تقریباً تمام شعبوں پر سرکاری مداخلت و نگرانی کا تسلط ہو جائے تو پھر قیمتیں بھی معاشی اصول و قوانین سے آزاد ہو جاتی ہیں جہاں سرکاری حکم سے مقرر ہوتی ہیں وہاں طرح طرح سے گریز کی راہ نکالتی ہیں جہاں مقرر نہیں وہاں من مانے اضافے پاتی ہیں جب مال کی قلت ہو اور خریدار بیقرار ہوں تو دکاندار جس قدر بھی قیمت وصول کریں کم ہے۔ چنانچہ بہ قدر گنجایش ہر طرف یہی عمل جاری ہے تاجروں کی عید ہے پیسہ کا مال روپیوں میں اور روپیوں کا مال اشرفیوں میں فروخت ہو رہا ہے عوام زیر بار ہو رہے ہیں۔ تاجر اپنی اپنی خرید کے حساب سے غیر معمولی نفع کما رہے ہیں۔ لیکن ایسی نفع اندوزی نہ صرف عام ایثار کے منافی ہے بلکہ مصلحت اندیشی کے بھی خلاف ہے جس زمانہ میں دولت بڑھ رہی ہے اسی زمانہ میں خوشنودی عامہ حاصل رہنا بھی ضروری ہے اور اس کے واسطے ایثار و ہمدردی شرط ہے۔ تجار اتحاد کر کے کوئی معتدل طریق اختیار کریں تو خریداروں، دکانداروں سب کے حق میں بہتر ہو گا۔

رہا منجانب سرکار قیمتیں مقرر ہونے کا سوال علمی اعتبار سے انسانی ضروریات کی چار قسمیں ہیں، ضروریات
حیات، ضروریات کارکردگی، ضروریات راحت، ضروریات عیش و عشرت، ہر ایک کی نوعیت نام سے
ظاہر ہے مزید تفصیل کی گنجایش نہیں۔ فطری قانون یہ ہے کہ ضروریات راحت اور ضروریات عیش و عشرت میں
ربڑ کی طرح بست و کشاد ہے یعنے قیمت گھٹنے سے ان کی طلب بڑھتی ہے اور قیمت بڑھنے سے طلب
گھٹتی ہے اسکے برعکس ضروریات حیات میں نہیں اور ضروریات کارکردگی میں بھی بست و کشاد کم ہے۔ مثلاً پانی، غلہ، نمک، مرچ
ایندھن، دوا، کفن یہ ایسی ضروریات حیات ہیں کہ سستے ہونے پر ان کی طلب میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہو سکتا
اور مہنگے ہونے پر بھی ان کی فروخت برابر جاری رہتی ہے گویا بڑی حد تک بلا لحاظ قیمت ان کی طلب
مستقل ہے۔ پس رسد، طلب، مقامی حالات سب پہلو ملحوظ رکھ کر ایسی ضروریات کی قیمت مقرر کر دینا،
رفاہ عامہ کے مد نظر بہت ضرور ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کی قیمتیں حد سے تجاوز کر جائیں اور عوام جو ان کی
خریدی پر مجبور ہیں حد درجہ زیر بار ہوں چنانچہ ادویہ کی قیمتیں بہت توجہ طلب ہیں دیگر ضروریات کی قیمتیں
اول تو خود ہی طلب گھٹنے کے خوف سے کسی نہ کسی حد تک اعتدال پر رہتی ہیں دوسرے بہتر صورت یہ ہے
کہ خود تاجر ہی دور اندیشی سے کام لے کر نفع اندوزی میں اعتدال ملحوظ رکھیں اور اپنی ہمدردی و ایثار سے عوام کی خوشنودی
ملحوظ رکھیں وہ بھی وقت پر کام آنے والی دولت ہے۔

ساہوکاروں کو تاجروں سے بھی زیادہ عوام کے ساتھ ہمدردی اور ایثار دکھلانے کی ضرورت ہے
کہ یہ طبقہ فی الجملہ نقد رقم کا مالک اور محافظ مانا جاتا ہے۔ گو بالعموم قرض دے کر سود سے دولت کماتا ہے
تاہم کاروبار میں بھی اس طبقہ سے بہت مدد ملتی ہے اور خیر خیرات میں یہ طبقہ بالعموم اچھی فیاضی دکھاتا ہے
ملکی ترقی کے واسطے ضرور ہے کہ عوام کے تعلقات اس طبقہ کے ساتھ بھی خوشگوار رہیں یہ تو فرمایش بیجا
ہوگی کہ جان بوجھ کر وہ قرضوں میں جوکھم سے نقصان اٹھائے، پھر بھی معتبر قرض خواہوں کی مجبوریوں سے بیجا فائدہ
نہ اٹھانا چاہیے کہ سود ہی سود میں ان کا کام تمام ہو جائے کہ اس سے بددلی پیدا ہونا یقینی ہے۔ آج کل خردہ اور
چلر کا جو قحط پڑا ہوا ہے یہ بھی ساہوکاروں کی تنگ نظری ہے۔ اول تو گلانے میں یا تبادلہ گھٹانے میں
چنداں فائدہ نہیں اور بالفرض فائدہ ہو بھی تو وہ رفاہ عامہ کے منافی ہے تھوڑے فائدہ کی لالچ میں

بہت سی ناگواری اپنے ذمہ لینا کوئی اچھا بیوپار نہیں ہے۔

تجارت میں عام طور پر اور روپے پیسے کے لین دین میں خاص طور پر تاجروں اور ساہوکاروں کی بھیڑ چال مشہور ہے اور ترقی یافتہ ممالک میں بھی یہی رجحان موجود ہے۔ جب بھیڑ چال شروع ہوتی ہے تو کسی غور و فکر کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مثال اتباع کے واسطے کافی سمجھی جاتی ہے۔ جنگ کی افواہوں سے یہ بھیڑ چال بہت عام ہو جاتی ہے یوں تو انسان کو سب ہی دولت عزیز ہے لیکن روپیہ پیسہ کی محبت ہو تو بہت قوی ہوتی ہے۔ جنگ و بدامنی کے زمانہ میں روپیہ ہر طرف سے سمٹ کر اپنے اپنے مقام پر جمع ہونے لگتا ہے لوگوں کو اس کی جدائی خلاف احتیاط معلوم ہوتی ہے اس سبب سے بھی بازار میں روپیہ پیسہ کی قلت ہو جاتی ہے۔ اس کے اور بھی اسباب ہو سکتے ہیں لیکن یہاں تفصیلات کی ضرورت نہیں۔ بہرحال تاجروں اور ساہوکاروں پر بھی دورانِ جنگ میں رفاہ عامہ کی خاص ذمہ داری عاید ہوتی ہے اور ان سے بھی حسب حیثیت ایثار و ہمدردی کی توقع کی جاتی ہے۔

خلاصہ

انسان کی زندگی تمامتر گورکھ دھندا ہے جس کا اور چھور ملنا بہت دشوار ہے اور درمیان کے بیشمار حلقے ایک دوسرے میں داخل ہیں کہ جہاں تک نظر ڈالو جال ہی جال نظر آتا ہے پس کسی بحث میں احاطہ محال ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ موقع محل کے لحاظ سے کسی بحث کے چند خاص نکات اجمال یا تفصیل کے ساتھ بیان ہو جائیں لیکن ساتھ ہی لازم ہے کہ متصلہ نکات نظر انداز ہو جائیں ورنہ سلسلہ لا متناہی کیونکر ختم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے معاشی نقطۂ نظر سے حالات حاضرہ ایک بہت ہی سادہ اور سرسری عام فہم خاکہ اختصار سے پیش کیا۔ پھر بھی خطبہ شاید زیادہ طویل ہو گیا۔

شکریہ

بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اعلیٰ حضرت حکیم السیاست آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ کی حکمرانی میں اپنا ملک فتنے و فساد سے بہت کچھ محفوظ ہے البتہ جنگ کے جو عالمگیر اثرات ہیں حصہ رسدان کو برداشت کرنا ناگزیر ہے اور سلطنت برطانیہ کا یار وفادار جو امداد و اعانت کا طریق اختیار فرمائے رعایا پر بھی مستعدی سے

اس کا اتباع واجب ہے۔ چنانچہ مملکت آصفیہ سے جو امداد ہوتی رہی اور ہو رہی ہے وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے، ہمیشہ سے اب تک اس کا اعتراف ہو رہا ہے۔ مملکت کی فلاح و بہبود اور گوناگوں ترقیات کی جو شرط سب سے مقدم ہے وہ مرکز پر استقامت ہے۔ بارگاہ آصفی جو ملک کا واحد مرکز ہے اس کے مرکز کے تحفظ و استحکام میں جس قدر بھی کوشش صرف ہو کم ہے اور بالفرض اگر کوئی تحریک بال برابر بھی اس مرکز میں تقسیم و تفریق پیدا کرنے کا رجحان ظاہر کرے تو وہ ملک کے حق میں سراسر سم ہے۔ بارگاہ آصفی کے ظل عاطفت میں خدا کرے ملک دن دونی رات چوگنی ترقی کرے اور یہ دعا ہے کہ ورد زبان رہے۔ ے

تا ابد خالق عالم یہ ریاست رکھے ✤ تجھ کو عثمان بصد اجلال سلامت رکھے

آل و اولاد کو اللہ دے عمر خضری ✤ ان سے آباد ترا خانۂ دولت رکھے

آمین ثم آمین

تحریک اظہار عقیدت

خطبۂ صدارت کے ختم ہونے پر جناب مولوی میر اکبر علیخاں صاحب نے حسب ذیل تحریک عقیدت پیش کی:۔

"ممالک محروسہ سرکار عالی کی یہ پانچویں معاشی کانفرنس بہ کمال ادب و احترام اپنے آقائے ولینعمت سلطان العلوم اعلیحضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہ کی بارگاہ میں جذبات عقیدت و وفاداری پیش کرنے کی عزت حاصل کرتی ہے حضرت پیرو مرشد مدظلہ العالی کی دوربین نظر نے یہ محسوس فرمایا کہ ملک کی ترقی و خوشحالی کا اصل راز معاشی ترقی میں مضمر ہے۔ اور اس غرض کے لئے نمائش مصنوعات ملکی کے افتتاحیہ خطبۂ عالیہ میں جو ارشادات بالخصوص سرمایہ دار طبقہ کے متعلق فرمائے ہیں اس کے متعلق یہ کانفرنس بہ صد ادب ہدیہ تشکر پیش کرتی اور یقین واثق رکھتی ہے کہ اس شاہانہ رہنمائی و سرپرستی سے معاشی ترقی کے ایسے وسائل بہت جلد مہیا ہو جائیں گے۔ جن سے زمانۂ حال کے گوناگون مشکلات رفع ہو سکیں اور سرزمین دکن زیر سایہ ہمایونی دیگر ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش بام ترقی پر پہونچ سکے"۔

حاضرین نے اس کو احتراماً استادہ ہو کر منظور کیا۔

رپورٹ معاشی کمیٹی

سنہ ۱۳۵۱ف کی کارگزاری

(جو مولوی خواجہ حمید احمد صاحب معتمد معاشی کمیٹی نے پانچویں معاشی کانفرنس میں پڑھی)

معاشی کمیٹی حیدرآباد کی تشکیل دراصل انجمن طیلسانین عثمانیہ کی رہین منت ہے لیکن ممالک محروسہ سرکار عالی کی معاشی جدوجہد میں عثمانین کے ساتھ ابنائے ملک کے تعاون عمل نے اس کمیٹی کو تمام ملک کے اجتماعی معاشی مسائل کے مرکزی ادارہ کا درجہ عطا کردیا ہے جس میں بلا قید مذہب و ملت ملک کے تمام مکاتیب خیال کے افراد تقریباً ۸۰ سال سے باہمدگر ملک کی مرفہ الحالی اور معاشی ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ چنانچہ اس کمیٹی کے عملی مظاہرے نمائش مصنوعات ملکی کی شکل میں پانچ سال سے اہل ملک سے خراج تحسین حاصل کررہے ہیں۔ اور ان کے ساتھ معاشی کانفرنس اس کی علمی تحقیقات اور فنی تجاویز کی داغ بیل ڈال رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے اس کانفرنس کو سرکاری اور غیر سرکاری طبقوں کی پوری امداد حاصل ہے اور محکمۂ تحصیل معیشت کی جانب سے مولوی خان فضل محمد خان صاحب کی تحریک کی بنا پر اس کانفرنس کو دو ہزار روپیہ سالانہ کی امداد مل رہی ہے اس وقت معاشی کمیٹی کی سال ۱۳۵۱ فصلی کی کارگذاری کی رپورٹ پیش کی جارہی ہے دوران سال کے لئے جو مجلس عاملہ تشکیل پائی اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

صدر: مولوی میر اکبر علی خان صاحب بی اے، ال، ال، بی بار ایٹ لا۔

نائب صدر: مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔

معتمد: مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی اے

نائب معتمد: مولوی شہاب الدین صاحب ید اللہی

خازن: ماہور راؤ صاحب لونی منیجر حیدرآباد کواپریٹیو بنک

ارکین! مولوی محمد غوث صاحب ۔ مولوی عبدالعلی صاحب ، مولوی جمیل احمد صاحب فاروقی ، رگھوبیر لی صاحب ، راجہ گردداس صاحب ، سید محمد عسکری جعفری صاحب ، مولوی صابر علی صاحب ہاشمی مولوی عزالدین صاحب ، مولوی محمد علی صاحب موسوی ۔ خواجہ محمد احمد صاحب نائب ناظم آثار قدیمہ ،

سال زیر رپورٹ میں جو کام انجام پائے ان کی مختصر کیفیت حسب ذیل عنوانات کے تحت درج ذیل ہے:

۱۔ چوتھی نمایش مصنوعات ملکی کا انعقاد   ۲۔ چوتھی معاشی کانفرنس کا انعقاد

۳۔ معاشی سروے کا کام   ۴۔ معاشی کتب خانہ کا قیام

۵۔ زرعی کمیٹی کی تشکیل

چوتھی نمایش مصنوعات

حسب فرمان خسروی چوتھی نمایش مصنوعات ملکی کا انعقاد یکم ذیحجہ ۱۳۶۱ھ سے کیا گیا ہے ۔ جو ۲۹ ذیحجہ سنہ ۱۳۶۱ھ تک جاری رہی اس نمایش کا افتتاح عالیجناب کرنل نواب سر محمد احمد سعید خاں بہادر صدر اعظم نے فرمایا اور نواب میر اکبر علیخاں صاحب بارایٹ لا صدر معاشی کمیٹی و مجلس نمایش نے سپاسنامہ پیش کیا یہ نمایش پہلے تین سالوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ کامیاب رہی ۔ چنانچہ اس تقریب میں جو پروانہ خوشنودی شاہانہ سے سرفراز کیا گیا ہے زیب قرطاس ہے ۔

"اس سال بھی میں نے سالانہ نمایش صنعت ملکی باغ عامہ کا بغور مطالعہ کیا اور اس امر سے محظوظ ہوا کہ الحمد للہ ہر سال اس میں بہت ترقی نمایاں ہے جو کہ ایک قابل اطمینان امر ہے اور ملک کیلئے ایک فال نیک ہے! متعلقہ عہدہ داران جو کہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں منہمک یا مستعد دکھائی دے رہے ہیں یہ بھی ضرور قابل ستایش ہے کہ بیداری کے آثار چوطرف رونما ہیں اور اگر واقعات کی رفتار یہی رہی تو وہ زمانہ دور نہیں ہے کہ ملک خوش حالی اور ارتقا کے منازل سرعت سے طے کرتے ہوئے کہاں سے کہاں پہونچ جائیگا جس کی تمنا ہر بہی خواہ ریاست کو ہے "

۲۹ ۔ ذیحجہ سنہ ۱۳۶۰ف   بقلم آصف سابع

۶ - اس کانفرنس کی رائے میں حکومت سرکار عالی کی طرف سے مناسب حال معاشی لائحہ عمل کی ترتیب و نفاذ جلد از جلد ضروری ہے۔

۷ - معاشی کانفرنس حکومت سرکار عالی کو متوجہ کرتی ہے کہ صنعتی ریسرچ بورڈ میں معاشی کمیٹی کے نمائندہ کو جگہ دی جائے تاکہ معاشیات میں خاص تربیت یافتہ جماعت کا تعاون قائم رہے۔

۸ - اس کانفرنس کی رائے میں اسٹیٹ بنک کے قیام سے ایک اہم معاشی ضرورت پوری ہوئی۔

اس کانفرنس میں ممالک محروسہ سرکار عالی کے ممتاز شخصیتوں کے علاوہ بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی کے بھی معزز مہمانوں نے شرکت فرمائی جس میں صوبہ سندھ کے وزراء قابل ذکر ہیں۔

چونکہ چوتھی معاشی کانفرنس کی مکمل روئداد شائع کی جارہی ہے اس لئے کانفرنس کے متعلق مزید تفصیلات روئداد مذکور سے معلوم کئے جاسکتے ہیں۔

معاشی سروے کا کام

معاشی کمیٹی کے تحت ایک معاشی سروے کمیٹی کی تشکیل عمل میں لائی گئی جس کے لئے حسب ذیل شعبے قائم کئے گئے۔ شعبہ زرعی، شعبہ معدنی، شعبہ تجارتی، شعبہ صنعتی، شعبہ مالیاتی۔ اس سلسلہ میں جو مواد جمع کیا گیا اور تحریکات محکمہ سرکار میں پیش ہوئیں ان کی ایک تفصیلی کیفیت ہے۔ اس موقع پر چند نمایاں کاموں کی جانب اشارہ کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

تحریک معاشی سروے کمیٹی برائے قیام کارخانہ موٹر سازی

" " " " برائے قیام کارخانہ ٹوپی سازی

" " " " برائے قیام کارخانہ پنسل سازی

" " " " برائے امداد اعانت صابن سازی و دیاسلائی

معاشی سروے کمیٹی نے اجارہ داری مجلس مصنوعات کے قیام کے اثرات پر غور وخوض کرکے اپنی رائے سے حکومت سرکار عالی کو مطلع کیا۔

انڈین انڈسٹریل ریسرچ بورڈ کے حیدرآباد کے اجلاس کے موقع پر بھی کمیٹی مذکور نے ایک تحریک حکومت سرکار عالی

کی خدمت میں پیش کی جس کے ذریعہ حکومت سے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس کے نتائج سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے۔

کتب خانہ

ملک کی بڑھتی ہوئی معاشی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے معاشی کمیٹی ایک معاشی کتب خانہ کے قایم کرنے کے لئے کوشاں ہے اور اس سلسلہ میں کمیٹی کی جانب سے فنی کتب کے حصول کی مہم شروع کر دی گئی ہے لیکن معاشی کمیٹی کے مالی وسائل ابھی اس قابل نہیں ہوئے ہیں کہ وہ کسی موزون عمارات میں اس کا افتتاح کر سکے۔ معاشی کمیٹی کو محکمۂ تحصیل معیشت کی جانب سے دو ہزار کی جو امداد مل رہی ہے وہ اس کے دفتری انتظامات اور ذیلی کمیٹیوں کی امداد میں صرف ہو رہی ہے فنی کتب کی خریدی اور کتب خانے کے لئے الماریوں کی خریدی کے لئے کمیٹی کو لازمی طور پر حکومت اور ملک کے علم دوست حضرات کی بلا دریغ مالی امداد کی ضرورت ہے۔

مجلۂ معاشیات

کتب خانہ کے ساتھ معاشی کمیٹی کے علمی آرگن یعنے مجلۂ معاشیات کے اجرائی کا مسئلہ بھی معاشی کمیٹی کے زیر غور ہے۔

زرعی انجمن

زرعی ترقی کے ضمن میں معاشی کمیٹی کے پیش نظر ایک زرعی کمیٹی کی تشکیل کا سوال بھی ہے جس کے لئے منضبط قواعد ترتیب دیئے جا رہے ہیں۔ توقع ہے کہ سال رواں میں بہت جلد ایک زرعی کمیٹی کا قیام عمل میں آئیگا۔ اور ملک کے زرعی وسائل کا عملی طور پر جائزہ لیا جا سکے گا۔

غرض سال ۱۳۵۱ف میں معاشی کمیٹی کی سرگرمیوں کی ایک مختصر روداد بیان کر دی گئی ہے اور اب ۱۳۵۲ف کے لئے کمیٹی کا پروگرام روبہ عمل ہے جس کے تحت پانچویں نمایش مصنوعات ملکی بحمد اللہ خیر و خوبی سے تکمیل کو پہونچ رہی ہے اور پانچویں معاشی کانفرنس کا آغاز ہو رہا ہے۔ اور ملک کی بہت سی امیدیں اس سے وابستہ ہیں۔

مسئلہ سرمایۂ صنعتی

از جناب نواب احسن یار جنگ بہادر

تمام ہندوستان میں سرمایۂ صنعتی کے متعلق عام رجحان بوجہ سالہا سال کی غربت و حکومت کی دست نگری کے یہ رہا کہ سرمایہ داروں نے اپنی قوت بازو و تدبیر پر بھروسہ نہیں کیا اور محض خود غرضی و اندیشۂ نقصان کی وجہ سے کمر ہمت نہیں باندھی۔ ہمیشہ اس امید میں رہے کہ حکومت مثل اور شعبوں کے صنعتوں کو بھی قائم کرے۔ دنیا میں ہر ایک ملک کی صنعتی ترقی قوم کے مالدار افراد و سرمایہ داروں سے ہوتی ہے نہ کہ محض حکومت کی امداد سے۔

ان ہی خیالات عامہ کی وجہ سے ہماری حکومت نے صنعتی ترقی کے لئے سرمایۂ صنعتی یعنی (انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ) ایک کروڑ روپیہ سے قائم کیا۔ اس فنڈ کا اصلی مقصد یہ ہے کہ مختلف صنعتیں جلد از جلد ملک میں قائم ہو جائیں اور فراہمی سرمایہ سے متعلق جو دقتیں بوجہ عام رجحان متذکرۂ بالا پیش آتی ہیں ان کا انسداد ہو جائے اور صناعوں کو کافی امداد بطور قرض یا بہ خریدی حصص کمپنی ہو سکے اس سرمایۂ صنعتی سے سرکار کا مقصد محض نفع اندوزی نہ ہونا چاہیئے بلکہ مختلف ضروری صنعتوں کا قیام۔ افسوس کہ اس پالیسی پر عمل جیسا کہ ہونا چاہیئے نہیں ہو رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ باوجود ایک کثیر صنعتی فنڈ کے سرمایہ کی کمی محسوس ہو رہی ہے اس میں شک نہیں کہ اس فنڈ کی وجہ سے بہت سے صنعتی کارخانہ اور کمپنیاں قائم ہو گئی ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل کارخانے قابل ذکر ہیں

(۱) سمنٹ سازی (۲) شکر سازی (۳) الکحل صنعتی (۴) کاغذ سازی (۵) عثمان شاہی ملز برائے پارچہ سازی (۶) اعظم جاہی ملز برائے پارچہ سازی (۷) سگریٹ سازی (۸) ان کے علاوہ کئی چھوٹی صنعتیں مثلاً بٹن سازی و رنگ سازی وغیرہ۔

ان صنعتوں میں حکومت نے کافی سرمایہ بطور خریدی حصص یا قرض لگا دیا ہے یہ صنعتیں اچھی طرح قائم ہو گئی ہیں اور کافی نفع سرکار کو ہو رہا ہے مگر جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے منشائے حکومت نفع اندوزی نہ ہونا چاہیئے

اب یہ مناسب ہے کہ حکومت اُن صنعتوں میں سے جو اپنے پیر پر کھڑے ہونے کے قابل ہو چکی ہیں اپنا سرمایہ جو بطور حصص ان کمپنیوں میں لگایا ہے وہ نکال لے اور اپنے حصص جن کی قیمتیں اس وقت کافی بڑھی ہوئی ہیں رفتہ رفتہ فروخت کردے تاکہ دوسرے جدید ضروری صنعتوں کے لئے سرمایہ اسی فنڈ سے فراہم ہو جائے اور بغیر کسی جدید گنجائش کے صنعتوں کی ترقی میں اضافہ ہوتا رہے اس طریقۂ عمل پر حکومت کو فوری توجہ کرنا ضروری ہے ۔

(۲) موجودہ جنگ صنعتی ترقی کے لئے ایک فرشتۂ رحمت ہے ہخدا شرے برانگیزد کہ خیرے ما دراں باشد۔ فراہمی اشیائے مایحتاج کی مشکلات کی وجہ سے عام بیداری ملک میں پیدا ہو گئی ہے اور یہی وقت ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے دیگر ممالک میں بھی غیر معمولی صنعتی ترقیاں ایسی ہی آفات کے بعد رونما ہوئیں ۔ لہذا یہ نہایت ضروری ہے کہ اس وقت ایک لائحہ عمل بنیادی صنعتوں کے قیام کے لئے فوراً مرتب کیا جائے اور حسب ذیل بنیادی صنعتوں کے اجرائی کی جانب ہمہ تن کوشش کی جائے ۔

ا۔ فراہمی ارزاں قوت برقی بہ ذریعہ آب یا بھاپ ۔ (۲) فولاد آہنی کی تیاری (۳) بنیادی اشیائے کیمیا کی تیاری (۴) انجن و آلات صنعتی و زراعتی کی تیاری ۔

(۳) فراہمی ارزاں قوت برقی کی نسبت یہ عرض ہے کہ حکومت نے باوجود معتد بہ مواقع ملک میں ہونے کے ابھی تک کافی توجہ نہیں فرمائی ہے ۔ حکومت میسور کی صنعتی ترقی کا راز فراہمی ارزاں قوت برقی ہے جنگ سابق کے بعد مملکت کنیڈا میں جو غیر معمولی صنعتی ترقی ہوئی اس کی بھی اصلی وجہ قوت برقی تھی ۔ اسی طرح مملکت اٹلی میں بھی ترقی کا باعث فراہمی قوت برقی ہوا ۔ ہمارے ملک میں بفضلہ تعالیٰ پانچ بڑے بڑے دریا جاری ہیں اور نیز کوئلہ کے معدن موجود ۔ ایسے عمدہ اور کافی وسائل موجود ہوتے ہوئے کوئی چھوٹی چھوٹی تجویز بھی اس وقت تک عمل میں نہیں آئی ۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ باوجود مصائب جنگ میسور نے اس وقت ساڑھے تین کروڑ لاگت کی تجویز کو جاری کر دیا ہے اور امید ہے کہ بدوران جنگ یہ تکمیل کو پہنچ جائے مگر یہاں صرف (۵۰) لاکھ کی ایک چھوٹی سی اسکیم محض جنگ کے عذرات کی وجہ سے جاری نہ ہو سکی ۔

ہمارے ملک میں تخمیناً تین چار لاکھ گھوڑوں کی برقی قوت (یعنے ہارس پاور) بہ ذریعہ آب پیدا ہو سکتی ہے اور نیز ان تجاویز کے تحت تقریباً ۳۰ ۔ ۴۰ لاکھ ایکر زراعت تری ممکن ہے ۔

(۴) فولاد و آہن کی تیاری کی نسبت یہ عرض ہے کہ ہمارے ملک میں تاریخ شاہد ہے کہ بہترین فولاد تیار ہوتا تھا اور ایک زمانہ تھا کہ ہماری حکومت توپیں اور فولادی ہتیار تیار کر کے فرانسیسیوں اور انگریزی افواج کو دیتی تھی اور اب یہ حالت ہے کہ ہم چھوٹے سے چھوٹے فولادی ہتیار اور آلات کے لئے محتاج اور دوسرے ملکوں کے دست نگر ہیں موجودہ جنگ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جس ملک میں فولاد فراہم نہ ہوسکے اس ملک کی حکومت کسی طرح قائم نہیں رہ سکتی۔ علاوہ اس کے صنعتی ترقی بغیر مقامی فولاد و آہنی پیداوار کے ہرگز ممکن نہیں مگر یہ امر قابل ستایش نہیں کہ حکومت نے اس ضروری صنعت کے متعلق اب تک کافی توجہ نہیں فرمائی حالانکہ ریاست میسور نے باوجود مشکلات کے ایک عرصہ سے اور قبل از قبل اس صنعت کو قائم کیا اور ترقی دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت حکومت اور ملک کو کثیر فائدہ ہو رہا ہے اور صنعتی تعمیر میں سہولتیں ہورہی ہیں۔

اضلاع عادل آباد اور کریم نگر میں معدن آہنی ہماری مقامی ضروریات کے لئے کافی مقدار میں موجود ہیں اور بہ فضل خدا ان ہی مقامات کے قریب قوت برقابی بھی کافی پیمانہ پر مہیا ہوسکتی ہے و نیز کوئلہ کی معدن بھی کچھ بعید فاصلہ پر نہیں ہے اس کے علاوہ ریاست بستر جو صرف گوداوری پار واقع ہے اور ہمارے کوئلہ کی معدن کتاگوڑم سے قریب ہے۔ لاکھوں ٹن لوہے کا معدن موجود ہے۔ لہذا ضرورت اس کی ہے کہ ہماری حکومت اس بنیادی صنعت کی طرف فوری توجہ مبذول فرمائے۔

(۵) بنیادی اشیائے کیمیائی کی نسبت یہ عرض کرنا ہے کہ کوئی صنعت خواہ چھوٹی ہو یا بڑی بغیر اشیائے کیمیائی کے جاری نہیں ہوسکتی چنانچہ ٹاٹا نے (۵) کروڑ روپیے کے سرمایہ سے ریاست بڑودہ میں ایک وسیع کارخانہ قائم کیا ہے اور ہمارے یہاں ایک کروڑ کے سرمایہ سے ایک کارخانہ موسومہ ”حیدرآباد کیمیکل اینڈ فرٹی لائزر لمیٹیڈ“ بہ مقام بیلم پلی، سرپور کاغذ نگر کے قریب قائم کیا جارہا ہے اور امید ہے کہ جلد بنیادی کیمیائی اشیاء جو اس وقت دوران جنگ میں تیار ہوسکتی ہیں فراہم ہوجائیں۔ اس صنعت میں بھی ریاست میسور اور بڑودہ نے ہماری حکومت سے قبل پیش قدمی کی اور اگر ہم جنگ سے پہلے اس صنعت کو قائم کر لیتے تو اس وقت جو مشکلات فراہمی اشیاء میں درپیش ہو رہی ہیں وہ رفع ہوجاتیں اور کثیر فائدہ ہوتا۔ یہ بھی ظاہر کردینا مناسب ہے کہ یہ صنعت ترقی زراعت کیلئے بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ کیمیاوی کھاد اس صنعت کی بدولت ملک میں ارزاں داموں پر

دستیاب ہو سکے گی۔

(۶) انجن و آلات صنعتی و زراعتی کی تیاری کا مسئلہ تمام ہندوستان کے لئے نہایت اہم ہے جب تک کہ کسی ملک میں مشنری و آلات جو صنعتی کارخانے کے لئے لازمی ہیں تیار نہ ہو سکیں اوس کا دوسرے ممالک میں جہاں مشینیں اور آلات تیار ہوتے ہیں مقابلہ کرنا نہایت مشکل ہے چنانچہ جاپان کا راز ترقی یہی ہے کہ وہاں جتنی مشنری و آلات کی صنعتی کارخانوں میں ضرورت لاحق ہے وہ دہیں اسی ملک میں تیار ہوتے ہیں تاکہ دوسرے ممالک کا دست نگر نہ رہنا پڑے جیسا کہ ہندوستان اس وقت ہے لہذا اس کی شدید ضرورت ہے کہ ایک وسیع کارخانہ ایسے مقام پر جہاں تو لاد و آہن مہیا ہو سکے قائم کیا جائے جس میں ہمہ قسم کے بڑے بڑے مشین و انجن و آلات وغیرہ ہمارے ہی ملک میں تیار ہو سکیں۔

(۷) آخر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ کسی ملک اور قوم کی ترقی بغیر توازن زرعی و صنعتی ممکن نہیں ہے اور یہ امر مسلمہ ہے کہ ہمارا ملک حقیقتاً زرعی ہے مگر اس کے معنے یہ نہیں کہ ہم محض غلاحین ہی رہیں اور جب تک کہ زرعی ترقی کے ساتھ ساتھ صنعتی ترقی بھی نہ کی جائے نتیجہ معاشی لحاظ سے ہرگز اچھا برآمد نہیں ہو سکتا۔ موجودہ جنگ میں اس کا ثبوت ظاہر ہو چکا ہے اور جو ملک محض صنعتی ہیں ان کو اس وقت غذا کی فراہمی میں کافی مشکلات لاحق ہو رہی ہیں اور اسی طرح جو ملک محض زراعتی ہیں ان کو بھی متعدد دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ لہذا توازن زرعی و صنعتی ایک حد تک قائم رکھنا فلاح و بہبودی ملک کے لئے نہایت لازمی ہے پس حکومت کو چاہیئے کہ اس اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھے اور نہ صرف زرعی ترقی کے لئے کوشاں رہے بلکہ صنعتی ترقی کے لئے بھی خاص طور سے ذرائع پیدا کرے۔ دنیا میں جو جنگ مہیب جاری ہے اسکی وجہ فطرت حیوانی یعنی بغض حسد معاشی ہے کیونکہ ہر ایک حیوان اپنی بقائے زندگی کی کوشش میں رہتا ہے اور افسوس ہے کہ باوجود تعلیم و تربیت کے اس وقت انسان جو حقیقتاً حیوان ناطق ہے اپنے فطرتی اصول کی کارفرمائی میں بغیر کسی غور و فکر کے منہمک ہو کر ایک دوسرے کی تباہی میں کوشاں ہے اور صحیح معنوں میں زمرۂ انسانیت سے خارج اس دور حیوانی کا علاج صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ خالق مطلق نے جو اصول اخوت انسانی بہ ذریعہ مذاہب قائم کئے ہیں اس پر گامزن ہو جائے اور اپنے پروردگار کو کسی حالت میں فراموش نہ کرے۔

حیدرآباد میں صنعتی سرمایہ کا مسئلہ

از جناب مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی۔اے (عثمانیہ) معتمد معاشی کمیٹی

حیدرآباد میں صنعتی ترقی کی صلاحیتوں اور مواقعوں کے باوجود اطمینان بخش طور پر صنعتی ترقی کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں کے صنعتی نظام میں ابھی وہ کاروباری تنظیم پیدا نہیں ہوئی ہے۔ جو صنعتی فروغ کے لئے ازبس ضروری ہے اور کاروباری تنظیم کے لئے جہاں منظم آجروں کی ضرورت ہے وہاں صنعتی سرمایہ کا سوال اولین توجہ کا محتاج ہے۔

ہمارے ملک کے صنعتی مسائل کے ضمن میں اب تک جو رپورٹیں سرکاری غیر سرکاری مرتب ہوئیں اُن میں صنعتی سرمایہ کی بابتہ بہت کم توجہ کی گئی ہے اور ہمیں کوئی ایسا مواد نہیں ملتا جس سے ہمارے سوالات کا کوئی تشفی بخش جواب مل سکے۔

تقریباً دس سال قبل ایک رپورٹ مولوی احمد محی الدین صاحب موجودہ ناظم تجارت وحرفت نے سرکاری طور پر مرتب کی تھی جس میں ان مسائل کی جانب کچھ مواد ملتا ہے۔ لیکن اس طویل عرصہ میں حالات بالکل بدل گئے ہیں اور ایک نئی رپورٹ کے بغیر مناسب طور پر کوئی عملی اقدام نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مذکورۂ بالا امور کی بابتہ اشارۃً ظاہر کرتے ہوئے اس مسئلہ کی بابت صرف چند تجاویز پیش کرنے پر اکتفا کرنا ہوگا۔

ایک سرسری اندازہ کے مطابق ممالک محروسۂ سرکار عالی کی بڑے پیمانہ کی صنعتوں میں فی الوقت ۱۰ کروڑ کے قریب سرمایہ مشغول ہے جس میں معتدبہ حصہ سرکار عالی کی امداد پر مشتمل ہے جس کے چند اعداد ناظرین کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔

۶ فی صدی سنگارینی کالریز ڈبنچرز (۵۰۰۰۰۰) حصص شاہ آباد سمنٹ کمپنی (۱۷۷۰۰۰۰)، عثمان شاہی ملز ڈبنچرز (۶۰۰۰۰۰) ایجنسی اعظم جاہی و عثمان شاہی ملز (۲۱۰۰۰۰۰) قرضہ اورنگ آباد ملز (۵۰۰۰۰۰) حصص عثمان شاہی ملز (۵۰۰۰۰۰) دکن ماربل اینڈ مائننگ کمپنی (۲۱۴۰۰) حیدرآباد سلک ملز ڈبنچرز (۱۵۰۰۰۰) حصص حیدرآباد آئرن اینڈ اسٹیل ورکس لمیٹڈ (۲۵۰۰۰) ڈبنچرز حیدرآباد آئرن اینڈ

اسٹیل ورکس لمیٹڈ (۳۷،۰۰۰) حصص تمباکو کمپنی (۱۶،۰۰۰) حصص اعظم جاہی ملز (۵۵۶،۰۰۰) دکن ماربل اینڈ مائننگ ڈبنچرز (۲۴،۵۰۰) دکن ماربل اینڈ مائننگ قرضہ (۶۹۹۹۹) حصص سرپور پیپر ملز (۱۵۰۰،۰۰۰) قرضہ سرپور پیپر ملز (۱۵۰۰،۰۰۰) قرضہ بہ اعظم جاہی ملز (۲۱۱۶۶۶۷) قرضہ عثمان شاہی ملز (۷،۱۶۶۶۷) نظام شوگر فیاکٹری (۳۶۰،۹۵۰) قرضہ بہ شوگر فیاکٹری (۲۳۳،۷۷،۴۰) عملہ برائے پاور الکحل پلانٹ (۶۶،۰۰۰،۸) حصص دکن فلور ملز (۲۵،۰۰۰) چھوٹی صنعت کے لیے جو قرضہ جات دیئے گئے (۴،۰۶۹۹۶)

مشترکہ سرمایہ دار کمپنیاں جو قانون کمپنی سرکار عالی کے تحت رجسٹر شدہ ہیں ان کی تعداد اب سو کے قریب ہو گئی ہے اور ان کا سرمایہ مجوزہ کی مقدار ۷ کروڑ کے قریب ہے جس میں سرکاری حصص کے قطع نظر عوام کے حصص کی مقدار تقریباً ۳ کروڑ کے قریب ہوتی ہے۔ بیرونی رجسٹر شدہ کمپنیوں کا سرمایہ اس وقت ممالک محروسہ سرکار عالی میں مشغول ہے اس کے متعلق کوئی صحیح مواد دستیاب نہ ہو سکا لیکن ایک عام تخمینہ کے مطابق بیرونی سرمایہ کی مقدار ۴ کروڑ سے کچھ زائد نہیں معلوم ہوتی۔

مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں کی بابتہ ہماری قلمرو کا مقابلہ بعض برطانوی ہند کی ریاستوں یا صوبوں کی کمپنیوں سے کیا جانا نامناسب نہ ہوگا جن کے اعداد حسب ذیل ہیں:۔

	کمپنیوں کی تعداد	مجوزہ سرمایہ
ممالک محروسہ سرکار عالی	۱۰۰	۷۰۰۰۰۰۰۰
ریاست میسور	۲۰۰	۷۵۰۰۰۰۰۰
ریاست بڑودہ	۶۰	۴۰۰۰۰۰۰۰
ریاست گوالیار	۴۰	۷۰۰۰۰۰۰۰
ریاست اندور	۳۰	۳۰۰۰۰۰۰۰
ریاست ٹراونکور	۵۰۰	۱۲۰۰۰۰۰۰۰
صوبۂ بنگال	۵۱۰۰	۳۰۰۰۰۰۰۰۰۰
صوبہ بمبئی	۱۴۰۰	۲۱۰۰۰۰۰۰۰۰

ٹراونکور اور میسور جیسی چھوٹی ریاستوں میں مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں کی تعداد اور ان کے سرمایہ کی مقدار

ہماری قلمرو کے مقابلہ میں اس قدر زاید ہونا ہمارے لئے یقیناً قابل رشک ہے۔

ہماری اس حالت کا مقابلہ صوبہ بنگال سے کیا جائے جو کہ رقبہ کے لحاظ سے ہماری قلمرو کے مماثل ہے تو یہ فرق بہت عبرت کی حد تک واضح ہوتا ہے جہاں ہماری سو کمپنیوں کے مقابل پانچ ہزار سے زائد کمپنیاں موجود ہوں اور ۷ کروڑ کے سرمایہ کے مقابل ۲۳ ارب سرمایہ مشترکہ کام کر رہا ہو۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے یہاں ابھی کاروباری ذہنیت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں جہاں عوام کی عدم دلچسپی کی شکایت ہے وہاں ہمارے تجاویز قوانین کی اصلاح درپیش ہے خصوصاً ممالک محروسہ سرکار عالی کا قانون کمپنی بطور خاص اصلاح کا طالب ہے۔ کیونکہ یہ قانون تقریباً ۵۰ سال قبل کی ضروریات کا کفیل تھا اور اب حالات بالکل بدل چکے ہیں اور موجودہ ضروریات کے تحت اس میں ترمیمات ضروری ہوگئی ہیں۔ علاوہ ازیں بیرونی کمپنیوں پر بھی کوئی ایسی بندش عاید نہیں کی گئی جن سے ہماری کمپنیاں بغیر کسی مسابقت کے کام کرسکیں اور ان کی وجہ سے ہماری کمپنیوں کے کاروبار کو نفع بخش حالت میں جاری رکھنے میں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

خانگی طور پر انفرادی سرمایہ سے صرف چند بڑے کارخانے ملک میں کام کر رہے ہیں جن میں روغن کشیدگی دیاسلائی، صابن سازی اور ٹین سازی کے کارخانے قابل ذکر ہیں البتہ جننگ فیکٹری کی کافی تعداد ہے جو انفرادی سرمایہ سے کام کر رہی ہے۔ بر پیمانہ صغیر اور گھریلو صنعتیں اس قدر منتشر حالت میں ہیں کہ ان کے سرمایہ کے متعلق کوئی اطمینان بخش تخمینہ نہیں کیا جاسکتا۔

اب یہ سوال کہ سرمایہ کی موجودہ حالت کہاں تک صنعتی ترقیات کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ دے سکتی ہے تشریح طلب ہے۔ ہمارے خیال میں اس وقت ملک میں سرکاری امداد کے علاوہ کوئی ایسی صنعتی بنک یا ایجنسیاں موجود نہیں ہیں جو موجودہ ضروریات کے تحت کما حقہ تکمیل کرسکیں ملک میں جو ساہوکارہ موجود ہے وہ زراعت اور دیگر پیشوں میں اپنا سرمایہ استعمال کرتے ہوئے اور صنعتی کاروبار میں اس کے مشغول کرنے کی کوئی ضمانت نہیں دیتا۔

سرکاری طور پر جو امداد کی جارہی ہے اس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اس سلسلہ میں جو ٹرسٹ فنڈ سرکاری طور پر ایک کروڑ کے سرمایہ سے قایم ہوا تھا اب اس کا سرمایہ ڈھائی کروڑ سے زائد ہوگیا ہے اور باوجود اس کے کہ اس سرمایہ سے ملک کی کئی صنعتوں میں ایک حیات نو پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن پھر بھی ملک کی عام ضروریات کا خیال کرتے ہوئے

امداد کی یہ رقم بالکل ناکافی ہے۔

کلیدی صنعتوں کے قیام کے لئے جو کثیر سرمایہ کی ضرورت ہے وہ ایسا سوال ہے جسے ٹرسٹ فنڈ حکومت کے سرکاری خزانے کسی طور پر تن تنہا برداشت نہیں کرسکتے ان اسکیموں کو روبہ عمل لانے کے لئے ایک خاص مالی نظام کے قیام کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جس میں حکومت کے ساتھ ملک کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کا اشتراک عمل ضروری ہے۔

نیز ایسے کاموں کے لئے بیرونی سرمایہ سے بھی مدد لی جانی ضروری معلوم ہوتی ہے اور بڑی مشترکہ سرمایہ دار کمپنیاں ہی اس کام کو بخوبی انجام دے سکتی ہیں۔

البتہ ان امور کے لئے کافی جانچ پڑتال کرنے کی ضرورت ہوگی اور بیرونی سرمایہ کی حد تک ایسے اصول مقرر کرنے ہوں گے جس سے ملکی مفاد کی پوری حفاظت ہو سکے۔

نیز ٹرسٹ فنڈ کے جن قواعد کے تحت جو قرضہ جات دیئے تھے وہ بھی نظر ثانی کے محتاج ہو گئے ہیں اس موقع پر ہم تفصیلی طور پر ان قواعد پر کوئی تبصرہ نہیں کرسکتے ہیں البتہ چند امور کی بابتہ اشارہ ضروری سمجھتے ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ ٹرسٹ فنڈ سے جو قرضہ دیا جاتا ہے اس پر سود کی شرح تقریباً دس سال قبل ۷ فیصد مقرر کی گئی تھی اس زمانہ کے لحاظ سے یہ شرح حالات ملک کے لئے ممکن ہے کہ مناسب ہو لیکن اس زمانہ میں یہ شرح بازار کے نرخ کا مقابلہ کرتے ہوئے زائد معلوم ہوتی ہے ظاہر ہے کہ صنعتی ترقی کے لئے اس شرح سے کم ہونا ضروری ہے۔ دیگر ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جہاں ایسی صورتوں میں ۲ یا ۳ فی صد سے زیادہ شرح مقرر نہیں کی جاتی۔

علاوہ ازیں قرضہ دینے کی صورت میں جائداد کے مکفول کئے جانے کے جو قواعد ٹرسٹ فنڈ کے تحت مقرر ہیں وہ بڑے پیمانہ کبیر صنعتوں کے لئے مناسب ہیں لیکن چھوٹی صنعتیں جاری کرنے والے افراد اس سے کماحقہ مستفید نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کے پاس اتنی جائداد نہیں ہوتی کہ وہ اس کو مکفول کرسکیں۔ یہ وہ دشواری ہے جس کے لئے ہمیں صنعتی بنکوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ صناع اپنی جائداد کے بجائے اپنا تیار کیا ہوا مال مکفول کرسکیں چنانچہ صنعتی بنکوں کی ترویج کی ضرورت پر جس قدر زور دیا جائے وہ کم ہے۔

صنعتی بنکوں سے ملک کے صنعتی سرمایہ میں متعدد قسم کی اور سہولتیں پیدا ہو جائیں گی اور ہم بجا طور پر یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ہمارے ملک کے وہ مالدار طبقے جو اپنا مال راست صنعتوں میں داخل کرنے میں تامل کرتے ہیں وہ بنکوں کے ذریعہ یہ کام شروع کر سکتے ہیں اور ہمارے ملک کے بہت سے اندوختے کام میں آسکیں گے ۔

صنعتی بنکوں کے علاوہ چھوٹے کاموں کے لئے انجمن ہائے امداد باہمی کے اصول پر چھوٹی انجمنوں کی تشکیل کی بھی ضرورت ہے جو مقامی طور پر چھوٹے صناعوں کی مدد کر سکے ۔ ہمارے محکمۂ امداد باہمی کے تحت کئی ہزار زرعی انجمنیں قائم ہو گئی ہیں لیکن اب صنعتی سرمایہ کی غرض سے صنعتی قرضے کی انجمنوں کا قیام ازبس ضروری ہے کیونکہ ان کے ذریعہ مختلف گھریلو صنعتوں کے احیار اور ترقی کی صورت نکل آتی ہے ۔ مثال کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ضلع رائچور میں اگر چند ایسی انجمنیں قائم ہو جائیں تو وہاں نمک کی نکاسی کی جا سکتی ہے اسی طرح دیگر ضلعوں میں بھی کام کیا جا سکتا ہے اس قسم کی ایک بڑی انجمن کی تکمیل کی جانب افتتاح نمایش کی تقریب میں اعلیحضرت قدر قدرت کا ارشاد گرامی موجب رہبری ہے ۔

ہمارے جدید صدر المہام بہادر فینانس سے بھی ہماری یہ توقع بیجا نہ ہو گی کہ ان کے عہد میں ہمارے صنعتی سرمایہ کا انتظام مضبوط اصولوں پر قائم کیا جا کر ملک کی صنعتی ترقی میں نہ صرف ممد و معاون ہو گا بلکہ اس کی وجہ سے ہمارا صنعتی مستقبل شاندار بن سکے گا ۔

جیسا کہ قبل ازیں میں بتا چکا ہوں اس مختصر مضمون میں اس مسئلہ پر پوری طرح بحث ناممکن ہے اگر ممکن ہو سکا تو انشاء اللہ عنقریب ایک تفصیلی رپورٹ یا کتاب کی صورت میں اس پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکوں گا ۔

اس مقالہ کے ختم ہونے پر اس موضوع کے متعلق عام مباحثہ کی اجازت دی گئی چنانچہ جناب اسد اللہ صاحب مددگار رشتہ صنعت و حرفت اور جناب مادھو راؤ صاحب انوری مینجر کواپریٹو انشورنس سوسائٹی نے اپنے خیالات ظاہر کئے ۔

صفحات مابعد پر ان اصحاب کی تقریروں کا ماحصل قلمبند کیا گیا ہے ۔

حیدرآباد میں صنعتی سرمایہ کا مسئلہ

از جناب اسد اللہ صاحب مددگار مشیر صنعت و حرفت

جناب صدر و حضرات! مجھے معاشیات سے بہت ہی کم واسطہ رہا ہے ۔ میرے دوست گپتا صاحب نے مجھ سے اچانک فرمائش کی کہ میں بھی کچھ کہوں ۔ ان کے اصرار پر میں یہاں موجود ہوں ۔ گزشتہ آٹھ دس مہینوں میں معاشیات کے جن عملی پہلوؤں پر میری نظر پڑتی رہی ہے ان کا اظہار شاید آپ کی دلچسپی کا باعث ہو۔

ہمارا ملک معاشیات اور صنعت و حرفت کے میدان میں جس قدر پیچھے ہے اس سے آپ واقف ہیں ۔ سنین ماضیہ میں اس خصوص میں تھوڑی بہت جو کچھ جد و جہد رہی وہ کس قدر ناکافی اور ناقص تھی وہ ہماری موجودہ زبوں حالی سے ظاہر ہے یا تو یہ کاوشیں بے اصولی تھیں یا ان میں شدت و قوت آٹے میں نمک کے برابر تھی ۔ اس کی تفصیل کے لئے نہ یہ موقع ہے اور نہ وقت میں گنجائش ہے ۔

ہمارے ملک کا اکثر و بیشتر حصہ زراعتی ہے ، ہمارے کسان ، ہماری کاشتکاری ، ہماری پیداوار پر نظر ڈالئے تو زمانہ حال اور قرون ماضیہ میں بالکل تھوڑا سا فرق نظر آئے گا ۔ مشینوں کے استعمال اور کاشت کے جدید اصولوں اور بہتر طریقوں سے اب بھی ہمارا کسان کچھ زیادہ واقف نہیں ۔ ایک طرف تو یہ لکیر کا فقیر ہے اور دوسری طرف ہم بھی شاید لکیر ہی کے فقیر رہے ہے ۔ زمین کے محاصل کو فصول اور پیداوار کے اعتبار سے کسان کی محنت و عرق ریزی اور حقیقی لاگت سے اب بھی کوئی دور کا بھی تعلق نظر نہیں آتا ۔ طلب و رسد کے بدلتے ہوئے حالات کے تحت ہمارے بھولے بھالے کسان کو ہر وقت رہبری کی ضرورت ہے ان ہی وجوہ سے ہمارا کسان لاکھ ایڑی چوٹی کا زور لگائے اس کی سرگرمیاں بار آور نہیں ہوتیں ۔ خاص کر جبکہ اس دور جدید میں حسن عمل اور قوت مسابقت کامیابی کے اصلی راز ہیں ۔ پھر اس تگ و دو اور کش مکش میں ہماری کھیتیاں لہلہاتی نظر نہ آئیں تو کوئی تعجب نہیں ۔ ہمارے ملک میں نہ اشیار روغنی کی کمی ہے اور نہ ریشہ دار پیداوار کی لیکن خام اشیار اور صنعتی پیداوار کی برآمد و درآمد کے اعداد

ہماری بے توجہی اور غفلت کو بے نقاب کئے دیتے ہیں۔ ارنڈی کی کاشت دنیا میں سب سے زیادہ ہمارے ملک میں ہے۔ ولایتی مونگ کی پیداوار کے اعتبار سے ہمارا ملک دنیا میں تیسرے درجہ پر ہے ہمارے ملک کا کثیر رقبہ السی کے زیر کاشت ہے۔ باوجود اس کے ان سے ہمارے ملک میں تیل بہت کم کھینچا جاتا ہے۔ یہ چیزیں جیسی کی ویسی برآمد کی جاتی ہیں ان پیداواروں سے ہمارے ملک اور ابنائے ملک کو بہت زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ ان کی طرف توجہ کی جائے۔

ہمارے جنگلات کچھ لق و دق میدان نہیں۔ ان سے کافی چوب سینہ نکلتا ہے اور اگر کوشش کی جائے تو اس سے بہتر اور زیادہ مقدار میں چوبینہ نکل سکے اس کے علاوہ اگر سائنٹفک طریقوں سے لکڑی اور کوئلے کو جھنجوڑا اور نچوڑا جائے تو ان سے کیا کچھ ہاتھ نہ آئے۔ ایسی اشیا جن کے لئے ہم اس وقت دوسرے ممالک کے دست نگر ہیں۔

معدنیات میں کوئلہ، لوہا، تانبا، سیس، سونا، گندھک، اور خدا جانے کتنے اور دفینے ہماری سرزمین کی آغوش میں چھپے ہوئے ہیں ان کی تلاش جستجو، پہچان، اور ان سے تمتع حاصل کرنا ہنوز ہماری توجہات کے منتظر ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ صنعتی ترقیوں کے لئے پہلا قدم اور نہایت اٹل مسئلہ سستے داموں پر قوت کا میسر آنا ہے۔ قوت پیدا کرنے کے ذرائع سے قدرت نے اس ملک کو محروم نہیں رکھا ہوا اور پانی موج موج اور دریا دریا یہاں بھی ہیں۔ ان سے استفادہ نہ کرنا سراسر ہمارا قصور ہے۔

مختصر یہ کہ نہ سامان کی ہمارے ہاں کمی ہے اور نہ سرمایہ کی لیکن ان کو فراہم کرنے اور ان سے ملک کو مالامال کرنے کے لئے قوی دست و بازو، قابل دماغ اور بلند حوصلوں کی ضرورت ہے اس کمی کے بھی وجوہ ہیں عوام میں صنعت و حرفت کا مذاق جیسا ہونا چاہیئے نہیں ہے۔ یہی حال سرمایہ داروں کا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ کسی کو کسی پر اعتماد نہیں۔ جہاں ایسا ناموافق ماحول ہو نہ کسی صنعت کا آغاز ہو سکتا ہے اور نہ کوئی چالو صنعت چالو رہ سکتی ہے۔ جب تک کہ حکومت شریک کار نہ ہو جائے۔ ریاست میسور کی صنعتی ترقیوں کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔ اکثر کارخانے

حکومت کے سرمایہ سے اور حکومت کی سرپرستی میں قائم ہوئے اور چالو ہیں اس کے علاوہ اور دیگر ریاستوں میں بھی ایسی مثالوں کی کمی نہیں ۔ ہماری حکومت نے بھی اسی اصول کو مدنظر رکھ کر کچھ عرصہ قبل صنعت وحرفت میں جان ڈالدی کچھ نئے کارخانے قائم ہوگئے ۔ جس قدر کارخانے قائم ہوئے وہ ہمارے ملک کے امکانات کا لحاظ کرتے عشر عشیر بھی نہیں ۔ ابھی عرصہ تک اس کی ضرورت رہے گی کہ حکومت دامے ، درمے ، قدمے صنعتی اداروں کی مدد ومعاون رہے ۔ اس تدبیر سے عوام کا رجحان صنعتی کاروبار کی طرف بڑھتا جائے گا اور ان کی نظروں میں صنعتی اداروں کی ساکھ قائم ہوتی جائے گی ۔ فی الوقت ہمارے ملک میں صنعت وحرفت کی مثال ایک صغیر سن بچے اور وہ بھی کمزور بچے کی سی ہے ۔ اس کو کچھ عرصہ تک سہارے کی ضرورت ہے ۔ اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ اس بچے کو آیندہ مشکل سے مشکل نشیب وفراز طے کرنے ہیں اس لئے اس کو ابتدا ہی سے سہارے کا عادی نہ بنانا چاہیے تو یہ صحیح نظریہ نہیں ۔ ہر بچہ کو سہارے کی ضرورت کچھ عرصہ تک ہوتی ہے ۔ جب وہ اپنے پیر پر کھڑا ہوجائے تو سہارے کو الگ کردیجئے اور وہی سہارا کسی اور صغیر سن بچے کو دیجئے ۔ تب تو یہ بچے نہ ٹھوکریں کھائیں گے اور نہ صدمے اٹھائیں گے سرے سے سہارا نہ دینے کا اصول ہمارے ملک کی موجودہ فضا میں بہر ناقص رہے گا کوئی صحیح اصول نہیں ۔

ایک اور اہم عملی پہلو موجودہ حالات میں جدید کارخانوں کے قیام سے متعلق قابل غور ہے دوران جنگ میں جدید صنعتی کارخانوں کا قیام مشکل سے مشکل تر ہوگیا ہے اشیاء تعمیر ازحد گران ہوگئی ہیں مشین اول تو ملتی ہی نہیں اور ملتی بھی ہے تو بیحد گراں مختصر یہ کہ اس وقت ایک روپیہ کی جگہ چار روپیہ خرچ کرنے پڑتے ہیں پھر ان غیر معمولی گران مشینوں کو جنگ کے بعد بدلنا الگ ہے گویا کارخانوں کے قیام میں قبل جنگ جو مصارف ہوتے تھے ان سے کئی گنا مصارف اس وقت زیادہ ہوتے ہیں ۔ بے شک دوران جنگ میں کارخانوں کے منافع بھی بڑھے ہوئے ہیں لیکن اس منافع سے نہ صرف غیر معمولی ابتدائی مصارف کو برداشت کرنا ہے بلکہ ختم جنگ پر از سر نو نئی مشینوں کو خریدنا بھی ہے اور پھر اتنا سرمایہ پس انداز کرنا ہے کہ ہمارے کارخانے ختم جنگ کے بعد بیرونی بیرحمانہ مسابقت و مقابلہ کی تاب لاسکیں ۔ ہماری حکومت ان اہم مسائل اور ان کے اہم نتائج سے بیخبر نہیں پھر بھی ماہرین معاشیات کے مشورے نہایت مفید ہوں گے کہ یہ ناؤ کس طرح پار لگے ۔

حیدرآباد میں صنعتی سرمایہ کا مسئلہ
تقریر

جناب ایف. ہورائڈ صاحب الغزری

سرمایہ صنعتی کے سلسلہ میں میں صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بیرون ممالک وصوبجات کے متعلق جو اعداد پیش کیئے گئے ہیں اور ان کا مقابلہ ہمارے یہاں کے اعداد سے کیا گیا ہے۔ اس میں اس قدر تفاوت کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے لئے ایک بندرگاہ (Seaport) نہیں ہے۔ آج کل کے کاروباری دنیا میں (Seaport) کی جو اہمیت ہے۔ وہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اکثر بڑی بڑی صنعتیں اور کارخانہ جات انہیں مقامات پر قایم ہوتے ہیں جہاں بحری اور بری ارسالات کے جملہ سہولتیں موجود ہوں۔ سوائے بمبئی۔ مدراس کلکتہ، اور کراچی کے دیگر اندرون ملک کسی مقامات پر جو صنعتی ترقی نظر آرہی ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ وہاں کے سرمایہ دار اپنے سرمایہ کے بیشتر حصہ کو صنعتوں میں لگانا زیادہ منفعت بخش سمجھتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے جملہ مارکیٹوں پر بیرونی تسلط کی یہی وجہ ہے اور اس طرح ہم سرمایہ صنعتی میں اضافہ نہیں کرسکتے۔

اعداد پیش شدہ میں انجمن امداد باہمی کے ذریعہ فراہم کردہ سرمایہ کو شامل کرلیا جانا مناسب ہے، جن کی تعداد اس وقت لگ بھگ دو کروڑ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا بیشتر حصہ زرعی انجمنوں میں لگا ہوا ہے۔

حکومت نے انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کو جس مقصد کے تحت قایم کیا تھا وہ اب تک پورا نہیں ہوسکا۔ ابتداء میں ٹرسٹ فنڈ نے چند بڑے بڑے کارخانہ جات میں کثیر سرمایہ کو لگا دیا

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ٹرسٹ فنڈ اس وقت مقروض ہے۔ یہ ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ حکومت کو بطور خود کاروبار نہیں کرنا چاہیئے۔ یعنی مستقل طور پر چند صنعتوں میں ٹرسٹ فنڈ کا کثیر سرمایہ بشکل حصص محفوظ کردینا مناسب نہیں کیوں کہ ایک تو عوام کو ایسے ادارہ جات میں اپنا حصہ لینا ممکن نہیں ہو سکتا۔ اور دوسرے نئے صنعتوں کو کافی مدد انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ سے نہیں مل سکتی۔ حکومت کا اصل مقصد ان صنعتوں کو ترقی دینا اور پبلک میں اعتماد پیدا کرنا ہے تو ایسی صنعتیں جب اپنی حالت اطمینان بخش بنا لیتی ہیں تو حکومت کو اپنی مداخلت کم کر دینی چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں حصص کو پبلک کے لئے کھول دینا چاہیئے۔ اب اس وقت ایسے حصص کو بازار میں فروخت کرنے سے ٹرسٹ فنڈ اپنی لگائی ہوئی رقم سہ گنا رقم حاصل کر سکتی ہے۔ جس سے موجودہ قرضہ ادا کرنے کے بعد دوسرے صنعتوں کی کافی مدد ہو سکتی ہے۔

اس طرح ملک کے صنعتی سرمایہ میں کئی گنا اضافہ ہو سکتا ہے۔

اس تقریر کے ختم ہو جانے پر کانفرنس میں ایک دوسرے موضوع پر کارروائی شروع ہوئی۔ یہ موضوع "حیدرآباد میں محاصل اندازی کا مسلک" تھا۔

اس موضوع پر علاوہ مقالوں کے پرجوش مباحثہ بھی ہوا۔ مباحثہ میں حصہ لینے والے اصحاب میں جناب پنڈت ام نرسنگراؤ صاحب مدیر رعیت، جناب راجہ لکشمی نواس صاحب گنیرِوال اور جناب مولوی حسن الدین صاحب، بی، اے، ال، ال، بی (عثمانیہ) مدیر ملکت بھی تھے سب مقالات اور راجہ لکشمی نواس صاحب گنیرِوال کی تقریر کا ماحصل آئندہ صفحات پر ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے۔ لیکن جناب پنڈت نرسنگراؤ صاحب اور جناب مولوی حسن الدین صاحب نے اپنی اپنی تقریر قلم بند کرکے نہیں بھیجی اس لئے افسوس کہ ان کو اس روئداد میں شامل نہ کیا جا سکا

حیدرآباد کیلئے محاصل اندازی کا مسلک

از ڈاکٹر ین ایم اجے، سوریا نایڈو صاحب

(ترجمہ)

اصل مقالہ انگریزی میں تھا یہ اس کا آزاد ترجمہ ہے۔

جناب صدر اور دوستو! جب سے کہ مسٹر اکبر علیخاں نے مجھے مملکت حیدرآباد کیلئے محاصل اندازی کی پالیسی پر تقریر کرنے کے لئے مجبور کیا۔ میں سات دن تک بڑی الجھن میں رہا۔ جب کبھی میں اپنا مقالہ لکھنے بیٹھتا تو (۳۰) صفحوں سے بھی بڑھ جاتا گو میں نے اس کو مختصر کرنے کی ممکنہ کوشش کی۔ ایک طویل و بسیط مقالہ جو واقعات اور اعداد و شمار سے معمور ہو کسی حکومت۔ انجمن یا علمار کی جماعت کے سامنے باحسن وجوہ ایک یادداشت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے لیکن وہ بدقسمتی سے ایک عام کانفرنس کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہوسکتا جس میں (۲۰) منٹ کی تقریر بھی ایک شخص کے لئے سخت تکلیف دہ ہو جاتی ہے علاوہ ازیں ہم یہاں صرف واضح اور عام اصولوں سے بحث کریں گے جن کی رہبری میں ہم ان تدابیر پر غور کریں گے جو ہم پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ایک نئے اصول کو قائم کرنے کے لئے اس کی تفصیلات بیان کرنی ہوتی ہیں اور اس کی وجہ جواز پر بحث کرنی ہوتی ہے جس کے لئے کئی صفحوں کے استدلال کی ضرورت ہے۔ گو کسی اصول کو فنی طور پر منطبق کرنا معمولی بات ہوتی ہے اور اس کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ لیکن اصول کو ایسی مناسب بنیاد پر قائم کرنا پڑتا ہے کہ وہ آیندہ بگڑ کر آمرانہ فرمان یا ناقابل تنسیخ عقیدہ نہ بن جائے۔

قطع نظر اس کے معاشیات ایک سائنس (علم) ہونے کا مدعی ہے اس لئے ایک معاشی انجمن کو سنجیدہ افراد کی ایک ایسی سائنٹیفک (علمی) جماعت بننا پڑتا ہے جو انسانی فلاح و بہبود پر اثر انداز ہونے والے اہم مسائل کے مطالعہ کے لئے اکٹھا ہوتی ہے۔ اس جماعت کے سامنے جو چیز بھی پیش کی جائے وہ سائنٹیفک (علمی) بحث اور تحقیقات پر مبنی ہونی چاہیئے اور اس کی تکمیل اور پیش کش کے لئے کافی وقت درکار ہوتا ہے ورنہ تقریر ایک جامعہ کے خطبۂ تقسیم اسناد کی سطح پر اتر آتی ہے جس میں دقیانوسی اور فرسودہ باتیں ہوتی ہیں جن کو ہر دفعہ نیا مسالہ لگا کر پیش کیا جاتا ہے۔
ان قیود اور بندشوں کے باوجود آپ نے مجھے جو عزت بخشی ہے اس کا پورا احساس رکھتے ہوئے میں اس مقالہ کو انتہائی دلگیری اور بے اطمینانی کے ساتھ پڑھ رہا ہوں اور اس بات کو جانتا ہوں کہ اس کو سن کر آپ کسی فیصلہ کن نتیجہ پر نہ پہونچ سکیں گے کیوں کہ اس کی بنیادی شرطوں اور دعووں کو ثابت کرنے کے لئے نہ وقت ہے اور نہ لکھنے کی گنجایش کہنا بہت ہے اور وقت بہت کم ہے۔
لیکن آپ مجھ سے واقف ہیں اور آپ میرے ان تصورات اور تخیلات سے بھی ضرور روشناس ہوں گے جو میں زندگی اور سائنس کے بارے میں رکھتا ہوں۔ ایک سائنس داں اور ایک طالب علم کی حیثیت سے میں صرف ان واضح اور روشن اصولوں کی تلاش کرتا رہتا ہوں جو زندگی اور ان مظاہر پر حاوی ہوں جو ہمارے اردگرد موجود ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے اپنے مستقبل کی کبھی کوئی فکر نہیں کی میرے ذاتی منصوبے چند ہی ہیں اور وہ بھی من موجی ہیں میں کسی جماعت یا افراد کا حلقہ بگوش نہیں ہوں بلکہ صحیح یا غلط طور پر زندگی کے مخصوص اصولوں کے تابع ہوں جن کو میں اس لئے عزیز رکھتا ہوں کہ میں کہیں خشک مزاج بن کر دنیا اور اس کے لوازم سے نفرت نہ کرنے لگوں۔ میں اپنے اور نہ کسی فرد یا جماعت کے اغراض پورے کرنا چاہتا ہوں میں کسی شخص یا شخصیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔
کیوں کہ وہ میرے مسلک کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے میں اس وقت مخصوص بنیادی اصولوں کو اپنے ضمیر کی روشنی میں اور اپنے مبلغ علم کی حد تک کھول کر بیان کرنا چاہتا ہوں جن کو میں اپنے نزدیک اس مملکت کے لئے بھی مفید سمجھوں تو عقلمندی سے بعید ہوگا آپ مجھ سے اتفاق نہیں کریں گے۔

اور مجھے بھی اس کی توقع نہیں ہے لیکن مجھے آپ سے اتنی توقع ضرور ہے کہ آپ میرے خلوص اور نیت عزمِ صمیم کو ضرور تسلیم کریں گے اگر یہ بھی نہ سہی تو کسی شخص کے نقطۂ نظر سے آگاہ ہونا بعض اوقات مفید ہی ہوتا ہے۔

اصول کی دریافت ان تمام مسائل کو تین نقاط نظر سے جانچا جا سکتا ہے۔ (۱) قانونی نقطۂ نظر (۲) سائنٹیفک نقطۂ نظر اور (۳) وہ نقطۂ نظر جو معقولیت یا عقلِ سلیم سے متعلق ہے۔ میں آخری نقطۂ نظر اختیار کرنا مناسب سمجھتا ہوں کیوں کہ قانون زندگی کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ صرف مصنوعی پیداوار ہے۔ سائنٹفک نقطۂ نظر۔ نظریوں اور افکار کی بھول بھلیاں میں گم ہو سکتا ہے۔ اور حقائق سے منحرف ہو کر محض درسی اور جامعاتی بن جاتا ہے۔ اس لئے آخری نقطۂ نظر سب سے بہتر ہے۔

مزید برآں تمام مسائل کو دو طریقوں سے حل کیا جا سکتا ہے۔ پہلا یہ کہ حل عجلت معلوم کیا جائے۔ ضرورت اس قدر شدید ہو سکتی ہے کہ کچھ نہ کچھ جلد کیا جانا ضرور ہوتا ہے۔ یہ مرض میں تخفیف پیدا کرنے والا طریقۂ علاج ہے۔ طبیب کو سوچنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ بسا اوقات ایسی صورت میں پہلے علاج کیا جاتا ہے اور بعد میں سوچا جاتا ہے۔ پیچیدگیوں کو سلجھانے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ طبیب کا اولین مطمحِ نظر مریض کو بچانا ہوتا ہے۔ وہ مریض کو بچانے کی فکر میں اس قدر جلدی کرتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس کو بچانے کے بجائے نیک نیتی سے ہلاک کر ڈالے۔ ایسا علاج بیماری سے زیادہ مہلک ہوتا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مرض کا سکون کے ساتھ تجزیہ کیا جائے اور اپنے وسیع تجربہ کی روشنی میں کسی علاج کا تعین کیا جائے۔ وہ ڈاکٹر بہت اچھا ہوتا ہے۔ جو مذکورۂ بالا دو طرح کے مریضوں کے علاج کے بارے میں رائے قائم کر سکتا ہے۔

معاشیات اور طب میں جو سرکاری طریقۂ کار استعمال کیا جاتا ہے اس کی وجہ سے ایک بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً یہ کہ طبیعات کے ریاضیاتی قوانین کو زندگی کے مظاہر پر منطبق کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ غلط اور بالکل غلط ہے۔ انسانی زندگی ریاضی کے قوانین کی تابع نہیں بلکہ قوانینِ حیاتیات کے تحت ہے۔ اشیا کی تیاری ریاضی کے قوانین کے تابع ہو سکتی ہے۔ اور ان کا صرفہ عامتہ الناس کی انفرادی ضروریات پر منحصر ہو سکتا ہے۔ ریاضی کے قوانین

انسانی سماج کی بناوٹ پر حکم نہیں چلا سکتے۔ قوانین حیاتیات اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ انسانی زندگی کا ضروری جزو اس کا تاریخی کردار ہے۔ غیر نامیاتی نظام میں اس کی ابتدائی تاریخ غیر اہم ہے۔ اگر کوئی قلم میز سے گر جائے تو یہ کہنا یہ میز پر کس طرح آیا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ غیر جانداروں کا یہی نظام ہے جانداروں میں رجحان کا تصور یا ترتیب زندگی کے تاریخی کردار پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لئے میری رائے میں چونکہ معاشری نظام کا تمام تر انحصار زندگی کے تاریخی کردار پر ہے اس لئے کوئی معقول حل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم ان مظاہر کا تاریخی تجزیہ نہ کریں جو ہمارے سامنے موجود ہیں خواہ وہ کچھ ہی ہوں لیکن اگر ان کا تعلق زندگی کے حقائق سے ہے تو ہم کو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ ہمارے مستقبل کے پودے کے نشوونما ماضی ہی کی آبیاری سے ہوتی ہے انسان اور انسانی اداروں کے بغیر کوئی محصول اندازی نہیں ہو سکتی اور اس لئے کوئی مملکت محصول اندازی کا لزوم نہیں کر سکتی۔

اس کا انطباق طب پر زیادہ ہو سکتا ہے جس نے پارسی لس کی حسب ذیل نصیحت پر کبھی غور نہیں کیا۔

"کوئی علم مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اس میں اس کی بنیاد کی وضاحت نہ کی جائے یعنی اس کی ابتدا کو نہ بتایا جائے۔ چونکہ تمام انسانوں کے امراض ان کے جسم میں پیدا ہوتے ہیں اس لئے ان کے امراض کو جاننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان کی جسم کی تشریح سے واقف ہوں"

پارسی لس کے مشہور پیرو گراد گل نے مندرجۂ بالا نصیحت میں حسب ذیل اضافہ کیا۔

"کسی مرض کو سمجھنا یا اوس کا علاج کرنا قطعی ناممکن ہے جب تک کہ کوئی طبیب مرض کے تدریجی طور پر بڑھنے کی تاریخ سے واقف نہ ہو۔ لیکن علم تشخیص الامراض اور علم علاج الامراض کے متعلق تاریخی علم کہاں سے حاصل کیا جائے جبکہ ان علوم کے پاس ان تاریخی معلومات کی کمی موجود ہے جو مرض کے تدریجی طور پر ظاہر ہونے سے متعلق ہیں۔ کسی کلینک (جراحی اور طب کی عملی تعلیم) میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس بارے میں پروفیسر خاموش ہیں۔"

آخری بات جو نہایت اہم ہے وہ یہ ہے۔

"شدید امراض جس راستہ پر چلتے ہیں وہ گویا جسمانی ساخت کے نقش قدم پر بنا ہوتا ہے"

اگر ہم ان اصولوں کو اپنی معاشیات پر منطبق کریں تو ہمیں کیا نتائج حاصل ہوں گے؟ وہ طبیب کس مصرف کا ہے جو ایک کہنہ مرض کی نوعیت کی تشریح نہ کر سکے؟ سرکاری مکتب طب کا کوئی طبیب آج ایسا موجود نہیں ہے جو ایک کہنہ مرض کی نوعیت کو سمجھ سکے چہ جائے کہ اس کا علاج کر سکے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے زندگی کی تاریخیت (تاریخی کردار) سے تجاہل برتا۔

معاشی امراض کے ماہر طبیب اسی طرح ہمارے معاشی امراض کے سرکاری اطباء بھی حاذق کسی کہنہ مرض کا علاج کرنے سے قاصر معلوم ہوتے ہیں ہم جانتے ہیں کہ سنہ ۱۹۲۹ء سے دنیا میں ایسی معاشی کساد بازاری پھیلی ہوئی ہے جو پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ وقفہ وقفہ سے آثار چڑھاؤ ہو رہا ہے جس کو سرمایہ داری کا "اترنے چڑھنے والا ابھار" کہا جا سکتا ہے جس کی تشریح مینارڈ کینس اپنے "مقالہ زر" میں کرنے کی کوشش کرتا ہے بالفاظ دیگر یہ ایک کہنہ مرض ہو گیا ہے۔ اس کو ماہرین معاشیات نے معاشی "زلزلہ" اور "شدید معاشی طوفان" سے تعبیر کیا ہے جو اسی طرح آتا جاتا رہتا ہے جس طرح کہ ہیضہ و چیچک کی وبائیں انسانی جسم ڈاکٹروں کی مدد کے بغیر یا ان کی مدد کے باوجود صحت یاب ہو جاتا ہے لیکن "طوفان" اور "زلزلے" ایک دو گھنٹہ سے زیادہ نہیں رہنے پاتے گو وہ کافی نقصان اور تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ کچھ ایسی چیز پیدا ہو گئی ہے جو ایک کہنہ مرض کی طرح ہے۔ کیا یہ ہمارے معاشی نظام کا ناسور ہے؟ کیا یہ کوئی شدنی چیز ہے یا ہمارے ناقص معاشی جسد کا لازمی نامیاتی نتیجہ ہے؟ نظام سرمایہ داری کے سرکاری طبیبوں نے اس مرض کی حسب ذیل عجیب و غریب تشخیص کی ہے۔

لندن اسکول آف اکنامکس کے پروفیسر رابنس جو مجلس اقوام کے بڑے ماہر اعداد و شمار ہیں اپنی کتاب موسومہ "عظیم کساد بازاری (۱۹۳۴ء)" میں لکھتے ہیں "ایسی نمایاں کساد بازاری کی مثال نہیں ملتی"۔ مجلس اقوام کے "ورلڈ اکنامک سروے بابتہ سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء" میں بیان کیا گیا ہے۔ "۱۸۶۰ء کے بعد سے کوئی اعداد و شمار ایسے نہیں ملتے جس سے اس امر کا انکشاف ہو کہ خام پیداوار یا مصنوعات میں ایسی تیز یا شدید کساد بازاری رونما ہوئی ہو"

اس ناقص معاشی نظام میں جو کہنہ مرض موجود ہے اس کی سرکاری ماہر معاشیات پروفیسر رابنس نے
اپنی کتاب موسومہ "معاشیات کی نوعیت اور اہمیت" میں ان الفاظ میں تشخیص کی ہے "یہ
ایک ایسا بچا کچا حصہ ہے جو ہر طرح ناقابل تشریح ہے"۔ واقعی کیا تشخیص ہے اور کیا علاج جب
یہ ہو چکا تو اینگلو سکسن قوم (یعنی انگریز) کے ماہروں نے ایک غیر ملکی ماہر کی خدمات حاصل کیں
ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ ہم باہر سے کسی لایق نہیں بلکہ زیادہ شہرت یافتہ انگریز کو بلاتے ہیں
اس غیر ملکی ماہر کا نام ھاٹاک تھا اس نے "نظریہ زر اور تجارت کے دور" اور "قیمت اور
پیداوار" پر مقالے لکھے انگریزوں نے اس سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں لیکن ڈاکٹر
ھاٹاک کی عقل کے حدود اس جملہ پر ختم ہو گئے کہ "ایک (معاشی) نازک صورت حال پیداوار
کے کم سرمایہ دارانہ طریقوں میں عبوری طور پر بدلنے کا نام ہے"۔ اس طرح فاضل ڈاکٹر نے
گاڑی کو اگلے گھوڑے کے آگے رکھ دیا فرض کیجئے کہ ہم معاشی امراض کے ان درباری طبیبوں سے
یہ کہیں کہ بندہ پرور کیا اس کہنہ مرض کا سبب آپ کے مریض کے جسم کی ناقص حالت نہیں ہے
تو کیا یہ کوئی سرکشی یا گستاخی ہوگی؟

جناب صدر اور دوستو! آج کل یہی موقف ہے اور میں تاریخی کردار کی اس طرح چھان بین
کرنا چاہتا ہوں کہ استدلال سے ان باتوں کو دیکھوں جو برائیوں کی جڑ ہیں۔ اور اسی جڑ کو ہم اکھاڑ پھینکنا
چاہتے ہیں چونکہ تاریخ کے تجربہ پر اپنی تحقیقات کے نتائج کو مبنی کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ اس لئے
یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم جو نتائج حاصل کریں ان کو ایک سخت منطقی استدلال سے جانچیں۔

محصول اندازی کی آئندہ مجوزہ پالیسی کو ہم کس بنیاد پر رکھیں گے؟ کیا ہم اپنے موجودہ محصول
اندازی کی تاریخی بنیاد کا مطالعہ کریں گے؟ کیا ہمارے لائحہ عمل کا تعلق صرف فوری مسائل سے ہوگا
یا یہ مسائل ایک صحیح اور معقول محصول اندازی کے بنیادی اصولوں پر حاوی ہوں گے؟ کیا یہ ایک طویل
لائحہ عمل ہوگا۔ اور بالآخر کن اخلاقی اور معاشی بنیادوں پر ہم اس کو ترتیب دیں گے؟ ہمارے
موضوع بحث کا خاکہ یہی ہے۔

محصول کی تعریف ایک برطانوی درسی کتاب میں "محصول" کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ محصول ایک ایسی رقم ہوتی ہے جو کوئی شخص کسی حکومت کو ادا کرنے پر مجبور ہوتا ہے جو رفاہ عامہ کے لئے سرکاری خدمات کے لئے اخراجات برداشت کرتی ہے اور اس رقم کی ادائی میں انفرادی فائدہ کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔ اس تعریف میں ایسی اخلاقی شان نظر آتی ہے کہ وہ قزاقی اور ہلاکت آفرینی کو بھی حق بجانب ٹہرا سکتی ہے۔ بشرطیکہ آپ اس قاعدہ کو نہ بھولیں کہ "ہم یہ سب کچھ آپ کی فلاح وبہبود کے لئے کر رہے ہیں"۔ رفاہ عامہ کے لئے جو خدمات انجام دی جاتی ہیں وہ دراصل اس بات پر منحصر ہوں گی کہ محصول دہندہ کو "رفاہ عامہ کے لئے خدمات" کا تعین اور مطالبہ کرنے کا کس قدر اختیار حاصل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رفاہ عامہ کی جو خدمات انجام دی جائیں گی وہ ایک طرف حکمران طبقہ کے سماجی شعور اور اخلاقی حالت اور دوسری طرف محکوم طبقہ کے قانونی حقوق اور سیاسی شعور پر منحصر ہوگی تا کہ حاکم اور محکوم طبقوں کے مفادات میں یکسانیت اور مماثلت پیدا کی جائے۔ یہہ بھی ہوسکتا ہے کہ حکومت کی مشنری اور محکوم افراد کے مفادات میں کوئی تصادم نہ ہو وہ بنیادی طور پر متضاد بھی ہوسکتے ہیں۔ درحقیقت محصول ایک طرح کا خراج ہوتا ہے جو محکوم حاکم کو خاص خدمات کی انجام دہی کے لئے ادا کرتا ہے یا محکوم کی توقع ہوتی ہے کہ حاکم ایسے خدمات انجام دیگا یا انجام دینے پر مجبور ہوگا۔ لیکن محصول ایک ایسا خراج بھی ہوسکتا ہے جو محکوم سے ایک غارت گر اور مخالف سماج جماعت کے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے جبراً وصول کیا جائے۔ جیسا کہ قرون وسطیٰ کے یورپ میں ہوتا تھا۔ مثلاً رابرٹ برنیس نے ایک ایسے جاگیردارانہ سماجی نظام کے لئے محاصل عاید کئے تھے جو فرانسیسی نظام کے مثل تھا اور جس کو بعد میں انقلاب فرانس نے مٹا دیا تھا۔ (فرانس میں جاگیرداری نظام کا زوال مصنفہ ہربرٹ) لیکن یہ آج تک ہندوستان کے مختلف حصوں میں موجود ہے۔ معاشی نقطۂ نظر سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا نظام جاگیردارانہ ہے۔ محاصل اندازی آنریبل جان ایسٹ انڈیا کمپنی کے مسلک کے مطابق اور کیمبرج کی تاریخ ہند کے بموجب

بھی ہو سکتی ہے یعنی یہ کہ "مالگذاری وصول کرنا بلاشبہ حکومت کا اولین مقصد ہے"۔ یہ آخری جملہ کہ "مالگذاری وصول کرنا حکومت کا اولین مقصد ہے"، حیدرآباد میں بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ حکومت ہند کی مالیاتی اور محاصل اندازی کی پالیسی گو اس میں وقتاً فوقتاً ردوبدل کیا گیا۔ تاہم اس کے عہد سے اب تک اس اصول پر مبنی ہے۔ اور چونکہ ہم حیدرآباد میں ہمیشہ برطانوی ہند کی نقل کرتے ہیں اور اکثر اوقات اچھی باتوں کی بجائے بری باتوں کی نقل کرتے ہیں اور اس نقالی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم کو برطانوی ہند کی صف میں برابر کی جگہ مل گئی اور چونکہ ہم نے اپنی مالگذاری اور بندوبست کی پالیسی بھی کے نظام ولگان پر مرتب کی ہے۔ اس لئے ہمیں اندیشہ ہوتا ہے کہ قدرتاً ہم بھی ان ہی برائیوں کا شکار ہو جائیں گے جو برطانوی ہند میں موجود ہیں اگر اصل اصول ہی خراب ہو تو ترمیم و ردوبدل سے کیا حاصل۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ چند برائیوں کو کم کر دیں اور دوسری نمایاں اور سخت ناانصافیوں پر پردہ ڈال دیں۔ صدہا ماہرین معاشیات نے جو وسیع مطالعہ کیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ محاصل اندازی کا طریقہ ہندوستان کی زرعی آبادی کی اقتصادی حالت اور فلاح و بہبود کے لئے غیر موزوں اور مضرت رساں ہے۔ اس ضمن میں جو لٹریچر دستیاب ہوتا ہے اس سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ زراعت کا پیشہ مالگذاری کے نقطۂ نظر سے اور لگان ناقابل ادائی ہونے سے دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں معافیات کو ایک اچھی علامت سمجھا جا سکتا ہے جو بے غرضانہ مقاصد کے تحت نہیں بلکہ محض مجبوری کے تحت دی جاتی ہیں کیوں کہ ہماری محاصل اندازی کی اصل اصول اور بنیاد یہ ہے کہ "مالگذاری وصول کرنا بلاشبہ حکومت کا اولین مقصد ہے"۔ اس لئے میں ضخیم مقالوں اور شاہی زرعی کمیشن کی طویل رپورٹوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ میں نے ان سب کا مطالعہ کیا ہے اور ان کو جس قدر پڑھتا جاتا ہوں اسی قدر مجھے اس بات کا یقین ہوتا جاتا ہے اور یہ بات میں اپنے پورے احساس ذمہ داری اور پوری سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ جہاں تک دیہی امور کا تعلق ہے ہمیں اس نظام سے دست بردار ہونا پڑے گا اور اس نظام کو اختیار کرنا پڑے گا جو ہمارا اخلاقی و معاشی معیار پر

پورا اترتا ہے اور آج بھی اس قابل ہے کہ ہر شخص اور خود ہماری حکومت کا محکمہ مالگزاری اس کا گہرا مطالعہ کرے ۔ یہ نظام سلطنت مغلیہ کا طریقہ مالگزاری ہے جو آئین اکبری میں بیان کیا گیا ہے جس کے ترجمہ کی ایک نقل وارن ہسٹنگز نے ۱۷۸۳ء میں آنریبل جان ایسٹ انڈیا کمپنی کے آنریبل نظما کو ارسال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ " یہ تصنیف خصوصاً اس لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے کہ اس میں سلطنت مغلیہ کا حقیقی دستور شامل ہے جس کو بیان کرنے میں اس کے بانیوں نے اپنی پوری توجہ صرف کی ہے " جب نارتھ نے ۱۸۰۳ء میں اپنا ریگولیٹنگ ایکٹ اور بٹ نے ۱۸۸۷ء اپنا قانون ہند نافذ کیا جو " ہندوستان کے قوانین اور دستور یعنی ہندستان کے قدیم قوانین پر مبنی تھا " تو انھوں نے ان الفاظ میں آئین اکبری کے اس قانون کا ذکر کیا تھا ۔

اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے اپنی مالگزاری اراضی کی پالیسی میں بھی ملک کے قدیم قوانین کی تائید کی تھی مگر کانوالس نے بٹ کے قوانین ہند بابتہ ۱۸۸۷ء کی دفعہ (۳۹) کے خلاف علانیہ موجودہ نظام مالگزاری کو نافذ کیا جس نے ہمارے کاشتکاروں کو تباہ کر دیا جس سے دیر یا سویر ہماری مالگزاری بھی ختم ہو کر رہ جائے گی ہم جس مالگزاری کی پالیسی کو اختیار کریں اس کے لئے کچھ اخلاقی جواز ہونا چاہیئے ۔ یہ کہنا کہ " مالگزاری وصول کرنا بلاشبہ حکومت کا اولین مقصد ہے " ہماری پالیسی کی اخلاقی بنیاد نہیں ہو سکتی ۔ اور نہ ایک صحیح اور معقول معاشی مسلک ہے جس کو ہم آیندہ اختیار کر سکتے ہیں ۔ بمبئی کے پروفیسر وکیل کہتے ہیں کہ " محکمہ مالگزاری ہندستانی کسان کے لئے ایک ہتوا ہے " ۔ اسی طرح خود مملکت کے لئے کسی مقدس اصول کی ضرورت نہیں صرف اخلاقی اصول کے اطلاق یا اوس کا اطلاق کرنے کی کوشش سے مملکت اپنا صحیح درجہ اور نمایندہ کردار حاصل کر سکتی ہے ۔ ہندستان میں عیسائی قوت کے عروج سے پہلے ہندو اور مسلمان مملکت کا یہی تصور رکھتے تھے لیکن عیسائی اقتدار کے بعد ہمارا سماجی اور معاشی نظام تباہ ہو کر رہ گیا ۔ ہماری محصول اندازی مملکت کے جس سماجی شعور کی آئینہ دار ہے اس کا اندازہ ہمیں محصول اندازی کی نوعیت کے مطالعہ سے ہوگا ۔ بدقسمتی سے ٹننگ اپنی کتاب " اصول معاشیات " میں بتلاتا ہے ۔

محصول اندازی میں انصاف پسندی کے سوال پر نا فذ الوقت سماجی نظام سے قطع نظر کرکے بحث نہیں کی جاسکتی"۔ حکومت کے آلۂ کار اور اس کو چلانے والی جماعتوں میں سماجی شعور موجود نہ ہو تو کیا ہم محصول اندازی کی ایک معقول اور منصفانہ پالیسی اختیار کرسکتے ہیں؟ اور ایک جدید معاشی شعور کیسے پیدا ہوسکتا ہے جب تک کہ انتہائی نشاۃ ثانیہ رونما نہ ہو یعنے ایک نیا اخلاقی فلسفہ جو حکومت کے ذمہ دار افراد کو جن کے ہاتھوں میں معاشی اقتدار ہوتا ہے اس قدر متاثر کردے کہ وہ ایک غفلت شعار قوم کو گہری نیند سے جگا سکیں۔ جو ایک صدی کی احتیاجوں اور کمزوریوں کی وجہ سے بے اعتنائی و بے توجہی کی اس منزل پر پہنچ گئی ہے کہ گویا وہ اپنے زبان حال سے کہہ رہی ہے "زندگی کا خاتمہ موت پر ہی تو پھر اس محنت و کاوش کی کیا ضرورت ہے ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دو"۔ ہم بڑی صفائی کے ساتھ اپنی مجوزہ کفایت شعاری کا ذکر کرتے ہیں یعنے پانچ دس اور پچاس سال کے لئے تجاویز پیش کرتے ہیں گویا ہمارے ہی حکم سے ہر سال ایک محفوظ ارتقاء اور پرسکون نشو ونما ہو رہا ہے۔ میں نے ہندوستان کے ایک قابل ماہر معاشیات سے دریافت کیا کہ آیا وہ آیندہ دس سال کے حالات کے بارے میں کچھ کہہ سکتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ صرف ایک احمق ایسا کرسکتا ہے۔ میری رائے میں جنگ کے بعد تعمیر نو کے متعلق جو گرما گرم بحثیں کی جاتی ہیں وہ محض شیخی کی باتیں اور آرزو مندانہ خیالات ہیں کیوں کہ ہم یہ نہیں جانتے کہ ہماری سماجی اور سیاسی ہیئت ترکیبی کی بنیاد کیا ہوگی لیکن مجھے صرف اس بات کا علم ہے کہ کرۂ ارض ہماری زندگی کا مدار ہے اور ایسی مملکت کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا جو زائد محصول اندازی کی ناعاقبت اندیشانہ اور مہلک پالیسی کے ذریعہ اراضی کو برباد کردے یا اس سے اپنی قوت حیات حاصل کرے جس کے نتیجہ کے طور پر زراعت اور زرعی معاملات غیر منفعت بخش ہوجائیں اور لگان کی ادائی بھی ناممکن ہوتی جائے۔ جیسا کہ آج کل ہندوستان میں "برابر کی کفایت شعاری" کے اصول کے تحت ہو رہا ہے۔

کسانوں کے قدیم محفوظ ذخائر قریب الختم ہیں۔ ایک تعلقدار نے مجھ سے کہا کہ اگر ایک فصل خراب ہوجائے تو کسان کی حالت قابل رحم ہوجاتی ہے اور سارے مواضعات کے باشندے

ہراساں و پریشان ہو کر خانہ بدوش ہو جاتے ہیں۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ساری مغربی معاشیات جو آپ کو جامعات میں آپ کے فاضل معاشین پڑھاتے ہیں وہ غیر متبدل خیالات (مثلاً دقیانوسی مارشل سینور کے خیالات) اور یورپ کی صنعتی ترقی کے تجربہ پر مبنی ہے۔ لے دے کر روس کے سوائے کسی جگہ زرعی معاشیات موجود نہیں ہے اس لئے اگر محصول اندازی کی کوئی بنیا ہو سکتی ہے جو اخلاقی اور معاشی طور پر کسان کی فلاح بہبود کی بھی بنیاد ہو تو وہ ہمیں ان قدیم قوانین میں ملے گی جو رگ وید سے اخذ کئے گئے ہیں اور جو ہندستان کے مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں بھی نہیں بدلے گئے۔ کیوں کہ دونوں حکومتوں (ہندو اور مسلم حکومتوں) نے اخلاقی بنیاد کو اپنی محصول اندازی کی پالیسی کا اساسی اصول قرار دیا تھا جو غیر معمولی طور پر اتنے مماثل اور مشابہ تھے کہ ہمارے نئے فرقہ واری محبان وطن کی اس بکواس کو سن کر کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے نصب العین مختلف ہیں ذہنی تکلیف ہوتی ہے اور ان کی تاریخ سے لاعلمی ظاہر ہوتی ہے میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ قدیم اہم قوانین زرعی ہندستان پر منطبق کئے جاسکتے ہیں کیوں کہ ہماری دیہی معاشیات میں گذشتہ ایک ہزار سال سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

آپ پوچھیں گے کہ ہندو اور مسلم ہندستان کے یہ عظیم الشان قوانین کیا ہیں؟ میں ان کو تفصیل کے ساتھ نہیں بتلا سکتا۔ بلکہ صرف خاص نکات کو جو ان کے مطالعہ سے حاصل ہوئے ہیں بیان کروں گا۔ زمین کسان کی ملکیت ہوتی تھی۔ وہ کسان بھی ہوتا تھا اور زمین کا مالک بھی۔ بادشاہ زمین کا مالک نہیں ہوتا تھا۔ یہ نظریہ کہ "زمین بادشاہ کی ہوتی ہے" ہندستان میں عیسائی اقتدار کے ساتھ داخل ہوا۔

منو سمہتیا میں بیان کیا گیا ہے کہ "وہ زرعی پیداوار کا چھٹا حصہ وصول کرسکتا تھا" اس کے شارحین سپانا اور جے منی کہتے ہیں کہ "راجہ زمین کسی کو نہیں دے سکتا کیوں کہ وہ سب کی مشترکہ ملکیت ہوتی ہے" ساورا اس کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے "راجہ پیداوار کی ایک مقررہ مقدار حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے کیونکہ وہ فصلوں وغیرہ کی حفاظت کرتا ہے۔ لیکن زمین پر اس کا حق نہیں ہوتا" اس ضمن میں منو یہ فیصلہ کن بات کہتا ہے "زمین اس شخص کی ملکیت ہوتی ہے جو اس پر پہلے کاشت کرتا ہے" ہمیں چندرگپت کے عہد میں کوٹلیا کے قوانین ملتے ہیں۔ جو

۳۰۰ قبل مسیح میں نافذ تھے جن میں راجہ کے مخصوص فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ ریاست کی جانب سے مویشیوں کے لئے کافی تعداد میں مفت چراگاہیں مہیا کرے۔ ان تمام تشریحات سے چار نکات حاصل ہوتے ہیں جن کو کسان کی خوشحالی کی بنیاد سمجھنا چاہیئے۔

(۱) کسان اپنی زمین کا مالک ہے۔ ہندو قانون نے اس کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ "زمین ناقابل تقسیم ناقابل انتقال اور ناقابل فروخت ہے"

(۲) محصول اندازی جنس کی شکل میں کی جاتی تھی اور وہ حقیقی زرعی پیداوار کے چھٹے حصہ سے زیادہ نہیں ہوتی تھی جنس کی شکل میں محصول عائد کرنے سے دیہی معاشیات پر اہم و مفید اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

(۳) راجہ اخراجات وصول کئے بغیر نقصانات کی تلافی کرے۔

(۴) مویشیوں کے لئے کافی تعداد میں چراگاہیں مہیا کرنا ریاست پر لازم ہے۔

اس آخری نکتہ کا ڈاکٹر ذاکر حسین کے اس بیان سے مقابلہ کیجیئے جس میں انھوں نے حکومت کی موجودہ پالیسی اور ہمارے محکمہ جنگلات کی بیہدی پالیسی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور ہمارے ملک کے کسانوں کی دولت یعنے مویشیوں کی خرابی اور تباہی سے جو خطرناک نتائج برآمد ہوئے ہیں ان کو گنایا ہے کوٹلیا کا قانون تحط اور اس سے زیادہ شہنشاہ اکبر کا قانون قحط قابل مطالعہ ہے اور بنگال میں مرشد قلی خان نے جو طریقے اختیار کئے تھے وہ بھی اس قابل ہیں کہ ان کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے۔ جب تک میں نے ان کو نہیں پڑھا تھا۔ اپنے آپ کو ایک خون آشام بولشویک سمجھتا تھا لیکن جب کوٹلیا کہتا ہے کہ راجہ قحط کے زمانہ میں مالدار افراد سے زیادہ سے زیادہ مالگزاری (کرسنم) وصول کر سکتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ ان کو اپنی جمع کی ہوئی دولت (ومنم) اگلنے پر مجبور کر سکتا ہے اور جب میں اسٹوارٹ کی تاریخ بنگال میں پڑھتا ہوں کہ "مرشد قلی خاں نے ہر قسم کے اجاروں کو ممنوع قرار دیدیا تھا۔ نفع اندوزوں کو سخت سزائیں دی تھیں اور ذخائر کو باہر نکال کر انہیں جبراً بازار میں بھجوایا تھا" تو مجھے

محسوس ہوتا ہے کہ میلر بولشویزم دراصل نہایت فیض رسان قسم کی حریت پسندی ہے۔ بہرکیف ہیں ہندو اور مسلم قانون میں یہ نظیر ضرور ملتی ہے کہ جب مالیات میں خسارہ ہو یا اشیائے خوردنی کی قلت ہوجائے تو مالداروں پر زیادہ سے زیادہ محصول عاید کرکے ان کی دولت کے انبار کو گھٹایا جاسکتا ہے (اس کو کرسنم کہتے ہیں) ان کو اپنی جمع کی ہوئی دولت اگلنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے (اس کو ومنم کہتے ہیں) جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا۔ ہندستان میں عیسائی قوت کے اقتدار سے پہلے آئین اکبری سلطنت مغلیہ کے نظام محصول اندازی کے متعلق ایک مستند تصنیف ہے اس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ محصول زمین کا کرایہ (مالگذاری) نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک طرح کا "خراج" ہوتا تھا اور یہ کہ وہ حقیقی پیداوار کے تیسرے حصہ سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اگر زمیں کو افتادہ رکھنا مقصود ہوتا تو کوئی محصول عاید نہیں کیا جاتا تھا اور یہ کہ چراگاہوں کی فراہمی حکومت پر لازم ہوتی تھی۔ نیز قحط کے انسدادی تدابیر کو بہترین طریقہ پر منتظم کیا جاتا تھا اور حکومت زمین پر اپنا حق ملکیت نہیں جتاتی تھی۔ درحقیقت اسلامی فتوحات کی امتیازی خصوصیت جس کا مسٹر امیر علی نے اپنی "تاریخ عرب" میں ذکر کیا ہے یہ تھی کہ عرب فاتح ہمیشہ کسانوں کے لئے زمین حاصل کرتے تھے۔ اور یہ بالخصوص خلیفہ عمرؓ کی عاقبت اندیشانہ تدبیر کی عظیم الشان کامیابی تھی۔ بعد کے حکمرانوں میں یہ اعلیٰ وصف مفقود تھا۔ خلیفہ عمرؓ نے اس بات کو بخوبی محسوس کرلیا تھا کہ سلطنت کا استحکام اور اس کی مادی ترقی کا انحصار زرعی طبقہ کی خوشحالی پر ہوتا ہے۔ امیر علی کی کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

غیر زرعی طبقات مختصراً زرعی ہندستان اور زرعی حیدرآباد کے لئے میں اس پالیسی کا علمبردار ہوں۔ اس کو کس طرح روبہ عمل لایا جائے اور دور مجبوری میں ہمیں کیا عارضی انتظامات کرنا چاہئے یہ مسائل اس وقت حل کئے جاسکتے ہیں جبکہ ہم بنیادی اصول کو تسلیم کرلیں۔ یہ ایسا مشکل نہیں ہے جیسا کہ نظر آتا ہے کیوں کہ ہمارا ملک لازمی طور پر ایک زرعی ملک ہے لیکن اس کے ساتھ ہی

ایک پر شور اقلیت بھی موجود ہے یعنے غیر زرعی طبقہ جو اپنے سیاسی شعور اور معاشی قوت کی وجہہ سے کافی طاقتور ہے ان کے لئے ہم محصول اندازی کی کیا پالیسی اختیار کریں گے ؟ یہ ایک آسانسی بات ہے کہ برطانوی مالیات اور مالگذاری کی تاریخ کو لے لیجئے کیا اس تاریخ کے پس منظر میں بجز مصلحت کوشی اور شدید ضرورت کے کوئی فلسفیانہ یا اخلاقی نظریہ موجود ہے آج ہماری ہندستان میں وہی حالت ہے جو ۱۸۷۱ء میں پٹ اور لنسی ٹارٹ کے عہد میں اہل انگلستان کی تھی۔
جب انگلستان میں انکم ٹیکس نافذ کیا گیا تو اسی طرح وہ قابل نفرت " " شرمناک " " مفسدیبان " اور " خلاف اخلاق " کی صدائیں بلند ہونے لگیں ۔ جس طرح کہ آج ہمارے مستقل مفاد رکھنے والی جماعتیں شور مچا رہی ہیں۔ لارڈ جان رسل نے انکم ٹیکس کی ان الفاظ میں مذمت کی ہے " اس (انکم ٹیکس) کا جاری رہنا اس ملک کے لئے ایک مصیبت عظمیٰ ہے ۔" یہاں بھی ہم نے یہی باتیں سنی ہیں۔ انگلستان میں انکم ٹیکس کی زندگی نے کئی رنگ بدلے لیکن آخر کار اس کو ایک ضرورت تسلیم کر لیا گیا کیوں کہ حکومت کے مصارف بڑھ رہے تھے جیسا کہ آج کل ہمارے یہاں ہو رہا ہے ۔ اخلاقی پہلو سے قطع نظر کرکے انکم ٹیکس کی اہمیت اور افادیت کو گلیڈ اسٹن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے " انکم ٹیکس نے اس مقصد کو پورا کیا یعنے ایک مہلک کشمکش کے زمانہ میں اس (انکم ٹیکس) سے آپ اپنے ملک کی آمدنی میں اتنا اضافہ کر سکے کہ آمدنی ان اخراجات سے بڑھ گئی ۔ جو جنگی اور غیر جنگی حکومت کے زمانہ میں عائد ہوتے ہیں (مالیاتی بیانات ۱۸۵۳ء - ۱۸۶۰ - ۱۸۶۳ء) معاشیات کے ایک پروفیسر ایسے بھی ہیں جو قرض لینے کی تائید کرتے ہیں لیکن اس کے خلاف ایک عمدہ بیان بھی موجود ہے۔
" ایک نیا قرض محض اس لئے لینا کہ پرانے قرض کو ادا کریں۔ نیا اسٹاک اس لئے ارزاں فروخت کرنا کہ پرانے اسٹاک کو گراں قیمت پر خریدیں ۔ بڑی شرح سود پر قرض لینا تا کہ کم شرح سود پر لئے ہوئے قرض کو ادا کریں ۔"
سیلی نے قومی قرضوں کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کو بھی یاد رکھیئے ۔" ایک دوامی

ضمنی لگان (زر پٹہ) قومی سرمایہ میں روپیہ لگانے والوں کے مفاد کے لئے عوام پر عاید کیا گیا۔ یہ لازمی طور پر ایک ایسا معاہدہ تھا جو حقوق یافتہ جماعتوں نے۔ جو ملک کے حقیقی حکمراں ہیں۔ خود اپنے افراد کے لئے کیا تھا۔ بالواسطہ محاصل اس اصول پر مبنی ہوتے ہیں کہ "سانپ مرجائے اور لاٹھی نہ ٹوٹے" اور یہ محض مصلحت کوشی ہے۔ ہر وزیر مالیات کو بعض اوقات زاید مطالبات کی تکمیل کرنی ہوتی ہے اور ایک ایسا قلیل زائد محصول بالواسطہ عائد کرنا اس کے لئے قرین مصلحت ہوتا ہے۔ جس کے خلاف کم از کم سیاسی شعور رکھنے والی جماعتیں صدائے احتجاج بلند نہ کریں اس کو مصلحت کوشی یا حکمت عملی کہا جاتا ہے لیکن غریب ممالک میں جہاں آمدنی کی سطح بہت پست ہوتی ہے اس کے لئے ایک حد مقرر ہے۔ ریاست کا سارے ملک کی دولت کے ایک حصہ پر متصرف ہوجانے اور مزید محصول (جو انکم ٹیکس کے علاوہ مقررہ حد سے زیادہ آمدنی رکھنے والوں پر عاید کیا جاتا ہے) کے متعلق بہت کچھ بحث مباحثہ ہوچکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امریکہ کی قومی دولت تقریباً دو فیصد اشخاص کے ہاتھوں میں ہے اور ان پر کم از کم بلاواسطہ محصول عاید کیا جاتا ہے۔ میں آپ سے قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا یا صحیح امداد و شمار نہیں پیش کرسکتا۔ کیوں کہ کسی۔ نے اب تک اس کا حساب نہیں لگایا ہے۔ البتہ ہم اتنا بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ حیدرآباد کی قومی دولت کا (۹۵) فیصد تقریباً ایک فیصد افراد کے ہاتھوں میں ہے اور یہ دولت ایسی ہے جس کا سوت اب تک نیند ہے۔ معاشری انصاف کے نقطہ نظر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جمع شدہ دولت کے سوتے کو کھولنا چاہیئے۔ لیکن یہ ایک امر متناقص ہے آج کل موقف یہ ہے کہ حکومت اور اس کے مصارف ایک ایسی منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ حکومت اراضی اور زرعی طبقوں پر عاید کردہ بالواسطہ اور بلاواسطہ محاصل سے جو آمدنی حاصل کرتی ہے ان سے وہ اپنے مصارف کی پابجائی نہیں کرسکتی۔ زمانہ امن میں حکومت کچھ جوڑ توڑ کرکے اور محفوظات سے قرض لے کر مالی خسارہ کو پورا کرتی تھی۔ لیکن اب وہ ایسا نہیں کرسکتی۔ ہم آج کل یہ عجیب غریب منظر دیکھ رہے ہیں کہ خود حکمراں طبقہ ضروریات سے مجبور ہوکر مالی خسارہ کو پورا کرنے کے لئے بالواسطہ یا بلاواسطہ محصول عاید کررہا ہے۔ چونکہ کسانوں کو

محصول اندازی کے لئے قانون سازی کا اختیار نہیں ہوتا اس لئے حکمران طبقہ کو یہ کام خود کرنا پڑتا ہے اور اس کو انجام دینے کے دو طریقے ہیں ایک تصوریت بالارادہ دوسرا تصوریت بالجبر۔ میں اس فریب خیال میں نہیں رہ سکتا کہ اس کام کو بالارادہ انجام یا جائیگا یہ امر یقینی ہے کہ اراضی پر جو محصول اندازی کی جاتی ہے اس کی انتہا ہو چکی ہے اب اس پر محصول اندازی کا مزید بار نہیں ڈالا جاسکتا۔ ایک مرتبہ محکمہ مالگذاری نے بڑے فخر کے ساتھ محکمہ فینانس کو اطلاع دی تھی کہ اس کی (۹۰) فیصد توقعات پوری ہوگئیں "۔ ہاں ٹھیک ہے لیکن یہہ توقعات نہایت غیر انسانی طریقوں سے پوری کی گئیں"۔

یہہ الفاظ مجھ سے ایک تعلقدار نے کہے جن کے آنکھیں فرط مایوسی سے اشکبار تھیں محصول اندازی اس لئے نہیں ہے کہ موازنہ کے خسارہ کو پورا کیا جائے بلکہ وہ سماجی اصلاح کے لئے بھی ہوتی ہے لیکن زائد محصول اس وقت تک عائد نہیں کرنا چاہیئے جب تک مصارف میں ممکنہ حد تک تخفیف نہ کرلی جائے آمدنی کا بہت کچھ حصہ رس جاتا اور خورد برد ہوجاتا ہے ایسے نااہل اور بلا ضرورت عہدہ دار بھی ہیں جو کوئی کام نہیں کرتے۔ ان حالات کو بدلنے کا صرف ایک موثر طریقہ ہے۔ یعنے حکمران جماعتیں ایک جدید اخلاقی اور روحانی نظریہ اختیار کریں جو تصوریت بالارادہ ہو یا تصوریت بالجبر۔ اس کا انتخاب وہ خود کرلیں اس جدید روحانی نظریہ کے بغیر ساری اصلاحات بے سود ہیں۔

ایک طبیب کی حیثیت سے میرا یہ جائز منصب نہیں ہے کہ میں ایسی تجاویز مرتب کروں جن کا تعلق میرے دائرہ عمل سے نہ ہو۔ میرا مقصد حیات یہ ہے کہ ہمارے دیہی باشندگان کے لئے طبی امداد کا ایک نظام ترتیب دوں۔ باوجودیکہ اس سے حوصلہ شکن بے اعتنائی و بے حسی برتی جارہی ہے لیکن میں گزشتہ سات سالوں سے کسی مدد کے بغیر یہی کر رہا ہوں قبل ازیں ہمارے محکمہ طبابت نے بھی اس کی سخت مخالفت کی۔ یہہ محکمہ خود تو اس مسئلہ کو حل نہ کرسکا لیکن دوسروں نے اس کو حل کرنے کی سعی کی تو وہ معترض ہوا۔ اب زمانہ نے کروٹ لی ہے اور گذشتہ چند سالوں کے تخریبی زمانہ کی بہ نسبت جبکہ ہماری عظیم الشان توقعات مایوسی میں بدل رہی تھیں۔ اب زیادہ صاف تازہ اور امید افزا ہوائیں چل رہی ہیں

حیدرآباد میں محاصل اندازی کا مسلک

از جناب محمد عطاء الرحمن صاحب علوی صدر بزم معاشیات جامعہ عثمانیہ

اس دنیا میں انسانی زندگی جب عالم وجود میں آئی اور ایک خاندان سے قبیلہ کی تشکیل ہوئی شہر قومیں اور نسلیں ترتیب پائیں تو اس کی سماجی شیرازہ بندی اور تمدنی ترقی کے لئے ضروری قرار پایا کہ ہر شخص اجتماعی زندگی کے مفاد کے لئے اور کسب معاش کے انفرادی حقوق کی آزادی اور تحفظ کے لئے اپنی مکسوبہ املاک سے ایک جز اس ادارہ کے اخراجات کے لئے دے جو سماجی ضبط و نظم اور افراد میں ان کی صلاحیتوں کے اعتبار سے ایک طرح کا توازن برقرار رکھے۔ یہ محافظ ادارہ رفتہ رفتہ حکومت کے نام سے موسوم ہوا اور قوم کی اجتماعی زندگی کو درست اور منظم رکھنے کے لئے ہر فرد نے جو قربانی کی اور ایثار دکھایا وہ محاصل کہلائے۔ تاریخ عالم کے ابتدائی دور میں جب تک سکہ رائج نہ ہوا تھا یہ محاصل خدمات اشیاء وغیرہ کی صورت میں ادا کئے جاتے تھے۔ مگر پھر وہ زمانہ آیا جبکہ سکے چلنے اور محاصل کی ادائی گی کا ذریعہ بھی وہی قرار پائے یہاں تک کہ عہد حاضر اقوام کے تمدنی ارتقاء کا ثبوت اس کے جائز اور صحیح محاصل کی زیادتی سے دیا جانے لگا اور جس طرح فضا کی گرمی معلوم کرنے میں مقیاس الحرارت کام دیتا ہے اسی طرح کسی ملک کی حکومت اور تہذیب کا بلند پایہ ہونا اس کے محاصل سے منکشف ہوتا ہے۔ محاصل یہ بتاتے ہیں کہ قوم کی اجتماعی زندگی کو استوار رکھنے اور بہتر بنانے کے لئے اس کے افراد کا جذبہ قربانی کتنا ہے۔

ان محاصل کی نوعیت مختلف نظام ہائے حکومت میں جدا گانہ ہے۔ اسلامی نظام میں

عشر، زکواۃ، خمس، جزیہ کے طریقے شامل ہیں۔ ازمنۂ وسطی کے یورپ میں دوسرے امور کی طرح محاصل میں اس قدر ترتیب و تنظیم نہ تھی جتنی کہ آج پائی جاتی ہے اور اکثر شاہان مغرب اجاروں اور عہدوں کی خرید و فروخت پیش کش اور جبری قرضوں کے ذریعہ سے روپیہ کی کمی کو پورا کرتے تھے۔ زمانۂ حال کے متمدن ممالک کی آمدنی کا دار و مدار عام طور پر علاوہ تحصول درآمد و برآمد و محصول چنگی کے فوتی محصول محاصل آمدنی مکانات و جائداد پر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اکثر مملکتوں میں بعض ایسے کاروبار انجام دیئے جاتے ہیں جن سے حکومت کو خاصہ منافع ہو جاتا ہے مثلاً تار، ڈاک، ٹیلیفون، کاغذ ممہور وغیرہ۔ بعض ممالک میں حکومت ہی کو چند مخصوص اشیاء کے تیار اور فروخت کرنے کا واحد اجارہ ہوتا ہے جیسے فرانس میں سگریٹ دیا سلائی اور ہندوستان میں افیون۔ ہمیں یہاں دیکھنا یہ ہے کہ ہماری حکومت آصفیہ مملکت کے کاروبار کی انجام دہی کے لئے حصول آمدنی کے کیا طریقے اختیار کرتی ہے۔ اور موجودہ ذرائع آمدنی حکومت آصفیہ کے کیا ہیں۔

حضرات! آپ یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں اعداد و شمار کا ایک لامتناہی سلسلہ یا طویل فہرست پیش کروں گا بلکہ اس کے برعکس حتی الوسع میری کوشش ہوگی کہ یہ ناگوار بار آپ کی سماعت پر نہ پڑے۔ ہماری حکومت کی موجودہ آمدنی (۱۳ کر ۴۴۳ ۹ لاکھ) اور خرچ (۱۳ کر ۹۴۳۱) لاکھ ہے۔ آمدنی کی کمی کے باعث یا خرچ کے مدات میں اضافہ کے باعث ہماری حکومت کے خرچ کا موازنہ اس سال آمدنی سے زاید ہے۔ میں یہاں اس کے مختلف اسباب و علل پر بحث نہ کروں گا۔ آگے ممکن ہے کسی مناسب جگہ پر اس کا ذکر آئے۔ منجملہ (۱۳ کر ۴۴۳ ۹ لاکھ) آمدنی کے اس میں سب سے بڑی مد تحصیل یا مالگزاری کی ہے۔ اس کے بعد آبکاری کا نمبر آتا ہے اور تیسرے ریل چوتھے کروڑگیری پانچویں کاروباری منافع کا نمبر آتا ہے۔ چھٹے برار کا محصول ساتویں زر کاغذی کی آمدنی آٹھویں اسٹامپ اس کے بعد اور مدات کا نمبر آتا ہے جس میں جنگی جنگلات وغیرہ کی آمدنی شامل ہے۔ اس وقت ہر ہی خواہ مملکت آصفیہ کے پیش نظر سال حال کے موازنہ میں خسارہ ہے اور موجودہ اخراجات میں بڑھتی ہوئی ضروریات شامل ہیں۔ یہاں غیر مناسب نہ ہوگا اگر ایک

سرسری خاکہ پیش کرتے ہوئے آمدنی کے جدید ذرائع معلوم کرنے کے لئے حکومت کے موجودہ محاصل اندازی کے مسلک پر غور کیا جائے۔ اس نظریہ میں اگرچہ کہ بہت کچھ اختلاف رہا ہے کہ حکومت کو آمدنی کے لحاظ سے اخراجات کی مدات کا تعین کرنا چاہیئے یا اخراجات کی بناء پر آمدنی کے ذرائع تلاش کرنا چاہیئے۔ اس موضوع کو اس مختصر صحبت میں زیر بحث نہ لاتے ہوئے ثانی الذکر نظریہ کو اہمیت دوں گا۔ یعنے ہماری حکومت کو اپنی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر جدید ذرائع آمدنی پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ اس لئے معلوم کریں کہ آج کل حکومت کے فرائض اور اخراجات میں کس قدر اضافہ ہوگیا ہے اور اس میں مزید اضافہ کے کیا امکانات ہیں۔

حضرات! اب حکومت کے فرائض میں چونکہ ملک کی حفاظت اور اندرونی تنظیم ہی نہیں داخل ہے بلکہ ملک کی معاشی فلاح وبہبود کے انتظامات بھی ضروری ہوگئے ہیں۔ اس لئے اخراجات میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔ مسٹر جی، ڈی اتچ، کول اکسفورڈ یونیورسٹی کے ریڈر نے (The Growth of Public Expenditure) کے عنوان پر جو مضمون لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی مختلف حکومتوں کے اخراجات میں اضافہ ہوجانے کی وجہ سے صرف مد محاصل میں بمقابلہ سنہ ۱۹۱۳ء کے ۲۹-۱۹۲۸ء میں برطانیہ عظمیٰ کے محاصل میں چار گنا اضافہ ہوا۔ اب اس جنگ کے آغاز سے جو غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اس کا کوئی حد شمار ہی نہیں۔ ہندوستان میں بھی بمقابل ۱۹۱۳ء کے آج بہت ہی کثیر اضافہ ہوا ہے حکومت آصفیہ کے مصارف میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔

سامعین کرام پر واضح ہوا ہوگا کہ دن بدن حکومت کے اخراجات کس طرح بڑھتے جارہے ہیں اور ہر حکومت لمحہ بہ لمحہ اضافۂ آمدنی کے ادھیڑبن میں کس طرح مصروف ہے ہمیں یہاں دیکھنا یہ ہے کہ ہماری حکومت کے مصارف میں جو تدریج اضافہ ہوتا گیا اور اب حالت اس نوبت پر آگئی کہ آمدنی وخرچ کا توازن بگڑ گیا اور عدم توازن کی کیفیت نمودار ہوگئی۔ آخر اس کا حل کیا ہے اور ہماری حکومت کن مدات آمدنی کے ذریعہ اپنے بڑھتے ہوئے اخراجات کی

پابجائی کرے۔ جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے ہماری حکومت کے موجودہ ذرائع آمدنی محدود ہیں۔ مثلاً مالگذاری کا موجودہ بار ہی زمیندار اور کاشتکار طبقہ پر کیا کم ہے جو اس میں کسی مزید اضافہ کی گنجائش نکالی جائے۔ اسی طرح آبکاری جس میں افیون گانجہ اور سیندھی کی آمدنی شامل ہے عموماً مفلوک الحال اور غریب رعایا کی جیب سے نکلی ہوئی آمدنی ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ اس مد میں بھی حکومت کے بڑھتے ہوئے اخراجات کے پیش نظر کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کے برخلاف حکومت نے ترک مسکرات کی مہم کا آغاز کیا ہے۔ مالگذاری اور آبکاری کے بعد جس تیسری مد پر ہماری نظر پڑتی ہے وہ ریل کی آمدنی ہے۔ اگرچہ کہ اس میں اضافہ کا امکان ہے مگر کچھ لگانے کے بعد۔ ریل کی آمدنی کے بعد کروڑگیری کی آمدنی اس طرح معین ہو جاتی ہے کہ حکومت ہند کے معاہدات کی رو سے موجودہ محصول در آمد کی انتہائی شرح یعنے پانچ فیصد میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح برار کا محصول ہے اس کی مقدار بھی معین ہے۔ غرض کہ موجودہ مدات آمدنی میں اس نسبت سے کوئی زائد رقم نہیں حاصل کی جا سکتی جس نسبت سے اس وقت حکومت کو مختلف النوع ضروریات کی انجام دہی کے لئے روپیہ درکار ہے۔

سوال یہ ہے کہ کس طرح حکومت اپنی آمدنی میں اضافہ کرے اس کے جواب کے لئے ہیں حکومت کے موجودہ محاصل اندازی کے مسالک پر غور کرنا ہوگا کیسی مسئلہ کی جانچ پڑتال اس وقت بہتر نتائج کی حامل ہوتی ہے جبکہ اس کو اصول کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ حکومت کے اچھے مالیہ کے لئے نہ صرف قوانین محاصل کا لحاظ ضروری ہے بلکہ محاصل بلاواسطہ اور محاصل بالواسطہ میں ایک خاص قسم کا توازن بھی قائم رکھنا ضروری ہے یہاں قطعی طور پر یہ بیان کرنا مشکل ہوگا کہ ان دونوں میں کون سا اصول بہتر ہے۔ مگر ہر ترقی یافتہ اور اچھی حکومت کے مستحکم مالیہ کی بنیاد ان دونوں محاصل کے ایک خاص توازن پر ہوتی ہے جو حق و انصاف پر مبنی ہو۔ معاشیین کی اکثریت اس سے متفق ہے کہ بالواسطہ طرز کے محاصل کا بار زیادہ تر عوام پر پڑتا ہے اور اس سے ان کی اقتصادی حالت بحیثیت مجموعی متاثر ہوتی ہے۔ اس طرز کے محاصل عوام کے ایثار کا ثبوت دیتے ہیں اور محاصل بلاواسطہ کا بار بہت بڑی حد تک صرف طبقۂ امرا اور مالداروں پر ہوتا ہے۔ یہ محاصل خواص کے جذبہ خدمت

اور ایثار کا ثبوت پیش کرتے ہیں جو اپنی خصوصی حیثیت کے باعث منظم حکومت کے ثمرات سے سب سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں۔ اب یہاں دیکھنا یہ ہے کہ ہماری حکومت ابد مدت میں ان دونوں محاصل کی کیا صورت حال ہے اور کس حد تک حکومت کا مسلک محاصل اندازی اصول و انصاف پر مبنی ہے۔ اگر محاصل کا ایک مقصد حکومت کے اخراجات کے لئے روپیہ کی فراہمی ہوتا تو دوسرا اہم مقصد باشندگان ملک کے مابین دولت کی تقسیم میں ایک خاص قسم کا توازن رکھنا ہوتا ہے آج عالمی بے چینی اور مختلف النوع معاشی تحریکات کا باعث یہی عدم توازن تقسیم آمدنی ہے۔ اس ضمن میں مزید کچھ عرض کئے بغیر حکومت آصفیہ کے محاصل بلا واسطہ اور بالواسطہ کی تشریح ضروری ہے جیسا کہ ہر معاشی مسائل سے دلچسپی رکھنے والا واقف ہے کہ وہ محصول جس کا بار صرف ادا کرنے والے پر قایم ہے اور دوسرے شخص پر منتقل نہ ہوسکے محصول بلا واسطہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس کی بہترین مثال محصول آمدنی محصول نوتی اور محصول وراثت ہے۔ اس کے برعکس اگر محصول کا بار ادا کرنے والے پر قائم نہ رہے بلکہ کسی اور شخص پر منتقل کیا جاسکے تو اسے محصول بالواسطہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال کروڑگیری جنگی اور آبکاری ہے جیسا کہ اوپر اپنی حکومت کے مدات آمدنی کا ذکر کیا گیا ہے یہاں محاصل صرف آبکاری جس میں سیندھی افیون گانجہ شامل ہے اور جنگی جس میں تمباکو چائے شکر اور سگریٹ شامل ہے عاید کئے گئے ہیں ان محاصل آبکاری اور جنگی کا شمار محاصل بالواسطہ میں ہے علاوہ ان محاصل کے مملکت حیدرآباد میں کوئی محصول نہیں ہے۔ اگر مالگزاری کو ٹیکس مان لیا جائے جو معاشین کے درمیان بہت ہی مابہ النزاع مسئلہ ہے تو صرف یہ آمدنی راست محاصل یا بلا واسطہ محاصل میں شمار کی جاسکتی ہے۔ اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ملک میں محاصل اندازی کا مسلک یکطرفہ ہے اور جو بھی محاصل بالواسطہ عائد ہیں ان کا بار زیادہ تر عوام پر ہے اور وہ طبقہ جو ملک کے عوام کے خون پسینہ ایک کی ہوئی دولت سے وقت اور حالات کی مجبوری سے پورا فائدہ اٹھا کر حکومت کے عمدہ نظم و نسق سے مستفید ہوتا ہے حکومت کی کوئی رقمی معاونت نہیں کرتا ہے۔ حکومت مالگذاری اس طبقہ سے وصول کرتا روا رکھ سکتی ہے جس کی آمدنی توکل علی اللہ ہے اور

جسے مالگذاری اور لگان ادا کرنے کے بعد نہ شکم سیر ہو کر دن کے چوبیس ساعتوں میں کھانا نصیب ہوتا ہے اور نہ تن پوشی کے لئے کافی کپڑا۔ اس ضمن میں ہمارے درد و کرب کے نباض اور اس مملکت ابد مدت کے تاجدار خسرو دکن حضرت بندگان عالی کے ارشادات جو اخبار صبح دکن مورخہ ۵ر آذر ۱۳۵۲ ف میں طبع ہوئے ہیں ملک کے غافل طبقوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں جو دوسرے مفلوک الحال طبقوں یا افراد کا بہت کم خیال کرتے ہیں۔ پس مالگذاری کے آبکاری اور کروڑگیری کا بھی بار ملک کے عوام پر پڑ رہا ہے۔ اور اس کے اثرات کے احساس سے سرمایہ دار طبقہ بالاتر ہے۔ بہ قول کسے ہم یہ تو کہتے نہیں کہ عہدہ داران حکومت میں روایتی مرعوبانہ ذہنیت کا یہ نتیجہ ہے کہ حکومت کے نزدیک محاصل اندازی کے ضمن میں نظر خواص پر شاید اس لئے نہیں پڑتی کہ ان کی دلگیری مقصود نہیں مگر اس الم انگیز منظر سے ہمارا دل بھر آتا ہے جب ان معاشی ٹھیکہ داروں کی ٹھکرائی ہوئی پست حال مفلس گرسنہ و نیم برہنہ اولاد آدم کو سسک سسک کر دم توڑتے دیکھتے ہیں۔ اب آپ حضرات پر یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ ہمارے یہاں محاصل بلا واسطہ اور بالواسطہ میں نہ صرف عدم توازن ہے بلکہ بلا واسطہ محاصل کا بڑی حد تک وجود ہی نہیں ہے اور جو طریقۂ محاصل ہماری حکومت نے رائج کر رکھا ہے اس کا ہدف زیادہ تر غریب رعایا اور عوام ہیں اگر آپ حضرات اجازت دیں تو میں دور حاضر کے چند متمدن ممالک اور ترقی یافتہ قوموں کے یہاں ان دونوں محاصل میں جو تناسب ہے بیان کروں میکڑول اپنی کتاب (The Intelligent Man's Guide Through World Chaos) میں لکھتے ہیں سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء میں برطانیہ عظمیٰ کے کل محاصل کا اکاون فیصد صرف محصول آمدنی تھا۔ اور وراثتی محصول نو فیصد اس طرح جملہ محاصل بلا واسطہ کا تناسب ساٹھ فیصد تھا اور بالواسطہ محاصل صرف چالیس فیصد اسی طرح ممالک متحدہ امریکہ میں محاصل بلا واسطہ کا تناسب ۶۸ء۳ فیصد اور بالواسطہ محاصل کا تناسب ۳۱ء۷ ہے برطانوی ہند میں بھی محاصل بلا واسطہ اور بالواسطہ کی نسبت ۴۸ء۵ اور ۵۱ء۵ سے اب غالباً میرے سابقہ بیان کی حقیقت آپ حضرات پر منکشف ہو گئی ہو گی کہ کس طرح ہمارے یہاں ایک طرف محاصل کی پالیسی پر عمل درآمد ہو رہا ہے اور سرمایہ دار طبقہ محاصل سے آزاد ہے

اور حکومت نے ابتک کوئی ایسے محاصل عائد نہیں کئے جن کا بار اس طبقہ پر بھی پڑے اور اس سے ملک کے
نظم ونسق اور رفاہی امور کی انجام دہی کے مصارف کی پابجائی ہو سکے۔ ہمارے سرمایہ داروں کی روایتی
فیاضی کے دامن پر نہایت بدنما داغ ہے انہیں وقت کی ضرورت کا احساس کرنا چاہیئے۔
اور حکومت کی رسمی تعاون سے اپنے کو بیگانہ نہ رکھنا چاہیئے۔ مگر آثار و قراین کہہ رہے ہیں کہ
ہمارے ملک کے اکثر سرمایہ داروں میں یہ شعور اس وقت تک نہ پیدا ہوگا جب تک کہ حکومت
جرارت آمیز پالیسی کے ساتھ مندرجۂ بالا روشنی میں محاصل اندازی کے مسلک پر نظر ثانی نہ کرلے۔
ہماری حکومت کو چاہیئے کہ وہ زیادہ دیر اس مسئلہ میں تساہل نہ برتے اور بلا واسطہ محاصل جو ہمارے
ملک میں یکسر مفقود ہیں انہیں جاری کرے اگر فی الوقت وہ تمام بلا واسطہ محاصل جو متذکرۂ بالا
ممالک میں جاری ہیں نہ عائد کر سکے تو کم از کم محصول آمدنی اور محصول وراثت کو جلد از جلد جاری
کرے ورنہ ملک کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور نظم ونسق کے ناگزیر مصارف نہ صرف حکومت
کے لئے پریشان کن ثابت ہوں گے بلکہ سرمایہ دار طبقہ ان کاروباری سہولتوں سے محروم
ہو جائے گا جو ایک اچھے نظم ونسق کی بدولت اس کو اب تک ملتی رہی ہیں۔ اگر ملک
بلا واسطہ محاصل کی ادائی پر کمربستہ ہو جائے تو اس پر آشوب زمانہ میں حکومت کی مالیاتی
دشواریوں میں بڑی حد تک کمی ہو جائے گی اور جہاں دیگر ممالک میں اقتصادی بے چینی کا
انقلابی ہاتھ سرمایہ داری کا گلا گھونٹنا چاہتا ہے وہاں ہمارا سرمایہ دار اپنے قومی ایثار کے
باعث سرمایہ داری کی لعنتوں سے آزاد ہو کر ملک و مالک کا سچا خیر خواہ ثابت ہوگا۔

اس مقالہ کے ختم ہونے پر اصل موضوع کی ایک ذیلی بحث "مقامی محاصل" کے
متعلق جناب محمد فاروق صاحب بی، اے (عثمانیہ) ایچ سی ایس نے اپنے ایک مقالہ کا خلاصہ سنایا۔
پورا مقالہ صفحات مابعد پر درج ہے۔

مقامی محاصل انکی اقسام اور نوعیت

از جناب محمد فاروق صاحب بی اے (عثمانیہ) پی سی ایس، دوم تعلقدار بودھن

جناب صدر!

مجھے اس عنوان پر کچھ لکھنے کا خیال نمایش مصنوعات مملکت آصفیہ کے کارکنوں کی اس گفتگو کے بعد پیدا ہوا جو افتتاح نمایش کے بعد اس موضوع پر ہو رہی تھی کہ سال حال مجلس بلدیہ نے کیوں اس نمایش کے لئے دو ہزار کا مقررہ عطیہ منظور نہیں کیا۔ کارکنان نمایش میں سے بعض جو مجلس یا محکمۂ بلدیہ سے متعلق ہیں یہ عذر کر رہے تھے کہ اب کی دفعہ ہماری مجلس بلدیہ کی آمد و خرچ میں بڑا فرق پڑ گیا ہے۔ گفتگو اس کے بعد اس موضوع پر ہونے لگی اور جلد ہی ختم ہو گئی کہ مجلس بلدیہ اپنے موازنہ کی کمی کو پورا کرنے کے سب ذرائع استعمال کر چکی ہے۔ میرا منشاء آج حیدرآباد میں محاصل اندازی کے موضوع کے تحت آپ کو یہ بتانا ہے کہ ہماری مجلس بلدیہ کی آمدنی کے کیا ذرائع ہیں۔ ساتھ ساتھ اضلاع ملک سرکار عالی کی مجالس بلدی اور مجالس قصبات کی آمدنی کے وسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے میں برطانوی ہند کی بلدیات کے عمل کی وضاحت کروں گا۔ دوسرے الفاظ میں مقامی محاصل ان کی اقسام اور نوعیت سے متعلق مجھے آج تقابلی بحث کرنی ہے۔

جناب صدر! بعض محکمہ آمدنی کے محکمے ہوتے ہیں۔ مثلاً محکمۂ آبکاری یا محکمہ کروڑگیری ان محکموں میں صرف انتظامی اخراجات کے لئے صرفہ ہوتا ہے اور بس۔ اس کے مقابل بعض محکمے مثلاً محکمۂ تعلیمات یا محکمۂ طبابت و حفظان صحت صرف خرچ کے محکمے ہیں۔ ہمارے محکمۂ تعلیمات کو فیس کی شکل میں کچھ آمدنی وصول ہو جاتی ہے لیکن محکمۂ طبابت میں جہاں ادویہ کے دینے میں دواخانے برطانوی ہند کی طرح فی نسخہ کچھ رقم وصول نہیں کرتے کہ کسی قسم کی آمدنی نہیں ہوتی

بجز اس کے خصوصی کمروں کے کرایہ کو آمدنی سے تعبیر کیا جائے ۔ محکمۂ بلدیہ کو اب نہ تو محض آمدنی کا
محکمہ کہتے ہیں اور نہ صرف خرچ کا محکمہ ۔ واقعہ یہ ہے کہ محکمۂ بلدیہ اپنی جگہ ایک حکومت ہے جس کے اختیارات
محدود اور جس کے حدود محض مقامی ہوتے ہیں۔ گو یہ سچ ہے کہ بعض شہروں مثلاً بمبئی، کلکتہ کے بلدی محکمہ کا
مقابلہ ان کی آمدنی ان کے خرچ کی حد تک بہت سے ریاستوں اور صوبوں سے بآسانی کیا جاسکتا ہے ۔ اور
حکومت کے ان مقامی اداروں میں ان کی متعلقہ امور کی تکمیل کے لیے نہ صرف مصارف کرنے کی ضرورت
ہے بلکہ ان کے لئے مقامی محاصل کے ذریعہ گنجایش بہت فراہم کرلی جاتی ہے کسی محکمۂ بلدیہ کے متعلقہ
امور کیا ہیں ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان کی نوعیت بھی
قسم قسم کی ہے مختصر یہ کہ ان سے کسی شہر میں رہنے والے کو پوری پوری شہری آسایش فراہم
ہوتی ہے لیکن یہ انتظام اس پر مشروط ہے کہ اس محکمۂ بلدیہ کی آمدنی کس قدر ہے اور اس کے
محاصل کیا ہیں اور کتنے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ جتنی زیادہ آمدنی ہوگی اتنی ہی زیادہ آسائشوں کا انتظام
محکمۂ بلدیہ کرسکے گا ۔ لیکن ہمارے شہر حیدرآباد کا کچھ عجیب حال ہے یہاں وہ سارے شہری
آسائش شہریوں کو حاصل ہیں کہ جو ہندستان کے کسی بھی شہر کے رہنے والوں کو حاصل نہیں ہے
اس کے باوجود ہمارا محکمۂ بلدیہ ان میں سے بہت ہی کم آسائشوں کو خود فراہم کرتا ہے اور
اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی آمدنی کے ذرائع محض چند محاصل ہیں جن سے بہت ہی معمولی
مقدار میں رقم جمع ہوتی ہے ۔

جناب صدر! محکمۂ بلدیہ حیدرآباد جو چند محاصل وصول کرتا ہے ان میں سے سب سے اول
محصول جائداد ہے یہ کہنے کو محصول جائداد ہے مگر صرف مکانات پر وصول کیا جاتا ہے ۔ کھلے میدانوں
پر وصول نہیں ہوتا اور اس کی شرح سالانہ کرایہ کی مقدار سے دس فیصدی رقم وضع کرلینے کے
بعد صرف ساڑھے سات فیصدی ہے یہ آٹھ آنہ کنسروینسی ٹیکس یعنے محصول خاشاک برداری سے
موسوم ہیں حساب لگایا گیا ہے کہ اس طرح ایک ماہ کے حقیقی یا متوقع کرایہ کا بشکل دو تہائی حصہ
مالکان مکان ادا کرتے ہیں ۔ سرکار عالی کے مکانات پر بھی یہ محصول ادا ہوتا ہے ۔

دوسری اور آخری قسم محصول ہر قسم کی سواریوں پر ادا کی جاتی ہے۔ لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ کسی سواری کو چالو رکھنے کے جو سالانہ مصارف ہوتے ہیں اس کا ایک دھا بھی محکمۂ بلدیہ کو وصول نہیں ہو رہا ہے۔

جناب صدر! محکمۂ بلدیۂ حیدرآباد چونکہ کھانے پینے کی اشیا ء نیز ایسی اشیاء کی کہ جو مضر صحت ہیں یا خطرناک ہیں تجارت کی اجازت دینے کا قانوناً ذمہ دار ہے لہذا اس طرح کے اجازت ناموں کی اجرائی سے بھی اسے کچھ رقم ملتی ہے لیکن یہ رقم اس لئے زیادہ نہیں ہے کہ یہ فیس محض رسمی طور پر لی جاتی ہے تاکہ اجازت نامہ کی قدر و قیمت ملحوظ رکھی جائے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ قانون بلدیۂ حیدرآباد میں ایسے قواعد بنانے کی کارروائی بہت ہی مختصر تھی ان قواعد کی اشاعت عام طور پر کرنے کا کوئی لزوم نہ تھا اور اس طرح ۱۳۴۸ف میں بہت کچھ قواعد بن سکے۔ لیکن حکومت سرکار عالی نے ایک حکم جاری کر کے یہ طریقہ قائم کر دیا کہ ایسے قواعد منظوری سے پہلے منجانب سرکار عالی عام طور پر شائع ہوں اور اس کے بعد ان کی منظوری پر غور کیا جائے بلاشبہ اس طرح رائے عامہ سے مشورہ لینے کی تکمیل ہوئی لیکن اس طرح سے ایسے قواعد کی منظوری بھی تاخیر سے ہونے لگی کہ جس سے بلدیہ کو اپنے اختیارات نگرانی میں خاصی توسیع کے ساتھ کچھ نہ کچھ آمدنی بھی ہو جا رہی تھی۔

جناب صدر! محکمۂ بلدیہ حیدرآباد دکن کو اپنی جائداد سے بھی کچھ آمدنی ہے۔ مثلاً اس کی زمینات ہیں جن پر لوگوں نے مکانات بنائے ہیں اور اب وہ ان کے استعمال کے معاوضہ میں نزول ادا کرتے ہیں ہمارے محکمۂ بلدیہ کے کچھ مارکٹ اور مسلخ بھی ہیں جہاں کے کاروبار کی بابت معاوضہ کے طور پر محکمۂ بلدیہ کو کچھ رقم مل جاتی ہے نیز بعض راستوں پر سرراہ جو عارضی دکانات لگی ہوئی ہیں ان کا بھی کچھ کرایہ وصول ہوتا ہے محکمۂ بلدیہ حیدرآباد کو کچھ آمدنی ایسی بھی ملتی ہے جسے معاوضہ محنت کہا جا سکتا ہے اس میں محکمۂ آبرسانی بلدہ اور محکمۂ صرف خاص کے محاصل وصول کرنے کا معاوضہ شامل ہے۔ جو محاصل کی جملہ رقم کا دسواں حصہ ہوتا ہے۔ نیز حدود بلدہ میں مختلف کاروباریوں کے اشتہارات لگانے کی خدمات کا صلہ بھی شامل ہے۔

جناب صدر! اس کے سوا محکمۂ بلدیہ حیدرآباد کو یا تو خاکروبوں سے (۲-۲ روپیہ) فی خاکروب وصول ہوتے ہیں تاکہ ان کے لائے ہوئے فضلے کو جمع کرکے دوبارہ باہر پھینکا جائے اور بلاشبہہ ہمارا محکمۂ بلدیہ اس فضلے کو نیز اسی کچرے کو جو اس کی بنڈیاں اُٹھا رہی ہیں کھاد بنا کر کچھ معمولی رقم جمع کر رہا ہے یا پھر مرے ہوئے جانوروں کے اُٹھالے جانے کا کچھ معاوضہ ملتا ہے اگرچہ بعض اوقات مالکوں کا پتہ نہ چل کر یہ رقم حساب سے خارج کرنی پڑتی ہے۔

سنہ ۱۳۴۳ف میں محکمۂ بلدیہ حیدرآباد نے مکانات تعمیر کرنے والوں سے مکان کی تعمیر کے اجازت نامہ کی اجرائی پر بھی جو قانون بلدیہ کی رو سے ہر تعمیر کرنے والے کو حاصل کرنا لازمی ہے کچھ رقم مکان کی حیثیت کے لحاظ سے بطور فیس اجازت نامہ وصول کرنا شروع کیا تھا لیکن اس کو بھی سرکار عالی نے بلا اجازت اور خلاف اختیار قرار دیکر بند کر دیا۔

سرکار عالی سے محکمۂ بلدیہ کو سالانہ چار لاکھ روپیہ بھی مل رہا ہے۔ کہنے کو تو یہ بہت بڑی رقم ہے لیکن جس چنگی کی وصولی کے عوض یہ روپیہ ادا ہو رہا ہے اس سے کئی گنا زیادہ رقم کی وصولی کا موقع تھا۔

جناب صدر! اب مجھے اضلاع ملک سرکار عالی کے مقامی ادارات کے وسائل کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ آپ یقین کریں کہ اضلاع کے ایسے ایسے قصبوں میں بھی جہاں کہ آبادی سات ہزار آٹھ ہزار رہے بلدہ کے مقابل نہ صرف گھر پٹی بلکہ روشنی پٹی بھی وصول ہوتی ہے۔ یعنے نہ صرف محصول جائداد بلکہ محصول روشنی بھی وہاں مساوی مقدار میں وصول ہوتا ہے۔ اس طرح وہاں کی آمدنی دوگنی ہو چکی ہے۔ وہاں روشنی کے لئے روشنی پٹی کے آدھے یا تین چوتھائی حصہ کو صرف کرکے بقیہ رقم دوسرے کاموں میں لگائی جاتی ہے۔ البتہ وہاں سرکاری مکانات پر کوئی محصول ادا نہیں ہوتا اور یہ وصول ہونے لگے تو ان مجالس کو بڑی امداد ملنے لگے گی۔ علاوہ گھر پٹی روشنی پٹی کے جس کی شرح سالانہ کرایہ کے ہر روپیہ پر (۳ پائی سے لے کر ۹ پائی تک) بلکہ ۱۲ پائی) ہوتی ہے۔ بعض قصبات اور شہر جہاں نل لگائے گئے ہیں نل پٹی بھی وصول کر رہے ہیں

اور اس طرح یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اضلاع کے قصباتی اور شہری بلدہ حیدرآباد کے رہنے والوں کے مقابلہ میں زیادہ بار اٹھا رہے ہیں حالانکہ ان کے مکانات کی مالیت کرایہ کے اعتبار سے اتنی زیادہ نہیں ہے۔ سواریوں پر بھی انھیں ٹیکس وصول ہوتا ہے۔

اضلاع کی مجالس قصبات و بلدیات کو اپنے مارکٹوں سلخوں کے سوا اپنے ہاں کی ہفتہ واری بازارات میں دکان لگانے والوں سے کرایہ کے طور پر کچھ رقم مل جاتی ہے۔ حالانکہ محکمۂ بلدیہ حیدرآباد کو جمعرات بازار یا منگل ہاٹ سے کوئی رقم نہیں ملتی۔ سب سے بڑے مسلخ واقع بیگم بازار یا سب سے بڑے مارکٹ (معظم جاہی مارکٹ) کی آمدنی اسے غیر علاقوں کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ وہ حدود صفائی کے کچرے کو بھی کچھ نہ کچھ رقم پر فروخت کر دیتے ہیں ان میں بعض نے فضلہ اور کچرے کو ملاکر کھاد بنانا بھی شروع کیا۔ لیکن ان کی سب سے بڑی آمدنی کا ذریعہ حدود صفائی میں مال اور سامان لے کے داخل ہونے والی وہ گاڑیاں ہیں جو بار برداری پٹی ادا کرتی ہیں۔ اضلاع کے بعض شہروں میں اس بار برداری پٹی کا ہراج سالانہ (۷۵,۰۰۰ روپیہ (۸۰,۰۰۰ روپیہ) پر ہوتا ہے۔ اگر محکمۂ بلدیہ حیدرآباد کو بھی بار برداری پٹی کی وصولی کی اجازت مل جائے تو بآسانی کئی لاکھ روپیہ محکمۂ بلدیہ حیدرآباد کو وصول ہوسکتا ہے۔

واضح رہے کہ یہ آمدنی محکمۂ کروڑگیری کی آمدنی کے سوا ہوگی۔

جناب صدر! اضلاع سرکار عالی کے مجالس قصبات اور بلدیات کو ان کی مجالس ضلع سے بھی امانت ملتی ہے تاکہ انھیں سہارا ہو اور اپنی ضرورتوں کو پورا کریں۔ ان مجالس ضلع کا اکیلا ذریعہ آمدنی زر مالگزاری کے ہر روپیہ پر ایک آنہ کی وہ زائد رقم ہے جو ہر مالگذار ادا کرتا ہے۔ کسی ضلع میں یا ایسی پلوں سے محروم ہوں اُن کو پار کرانے کے حقوق عبور و مرور کے ہراج سے بھی کچھ رقم جمع ہوتی ہے۔ کونڈواڑہ سے بند سرانہ بھی وصول ہوتا ہے۔ ان مجالس نے آبادی کی توسیع کے لئے زمینات خرید کر ان کے پلاٹ بناتے ہوئے انہیں ہراج کرکے زمینات کی خریدی اور پلاٹ بندی کے وہ مصارف جو توسیع آبادی کے لئے انھوں نے برداشت کئے حاصل کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے۔ بعض اضلاع

ہیں جہاں مویشیوں کے بازار ہوتے ہیں مویشی کی فروخت پر بجانب تعلقدار داخلۂ فروخت اجرا ہوتا ہے۔ اور اس کی بابت فی داخلہ چار آنہ جمع کرکے مویشی کے آرام کا انتظام کیا جاتا ہے ورنہ مقدمان دیہی یہ رقم بطور معمول خود جمع کرلیتے تھے۔

سرکار عالی نے سنہ ۱۳۴۳ ف میں پانچ لاکھ روپیہ ان مجالس قصبات و بلدیات پر تقسیم کیا ہے ایسی قصبات میں نلوں کے قیام اور موریوں کی تعمیر کے مصارف تین چوتھائی حصہ کی سرکار عالی سے بھی ادا ہوگی ہے کہ جن کو سرکار عالی کی مجلس آبرسانی اضلاع نے ان کی اہمیت کے لحاظ سے ان آسائشوں کا مستحق قرار دیا ان مجالس کو بقیہ چوتھائی رقم بھی بطور قرضہ اس مجلس کی اختیاری گنجائش سے ملتی ہے! اور اقساط میں واپس ہوتی ہے بعض قصبات میں محکمۂ تعمیرات عامہ سرکار عالی نے اپنے ان سڑکوں کو مانع گرد تعمیر کرکے جو حدود و صفائی سے گذرتی ہیں ان مجالس کے رہنے والوں کی آسائش کا اہتمام کیا ہے مگر یہ سب مصارف سرکار عالی کے ان مصارف کے مقابل میں جو بلدۂ حیدرآباد کی صحت و عافیت نیز آرائش اور سلامتی کے لئے صرف ہوئے یا ہو رہے ہیں بالکل ہیچ ہیں۔

یہاں تک آپ کو بلدہ اور اضلاع کے ادارات مقامی کے متعلق تفصیلات سنائی گئیں تا آپ مقابلہ کریں اور اندازہ فرمائیں کہ محکمۂ بلدیۂ حیدرآباد اور اضلاع ملک سرکار عالی کے مقامی نظم و نسق کا وصولی محاصل کی حد تک کیا فرق ہے اور ایک دوسرے کو کن امور کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سے پہلے برطانوی ہند کے مختلف شہروں کا جستہ جستہ حال قابل سماعت ہے۔

جناب صدر! بمبئی، مدراس اور کلکتہ وغیرہ میں جائدادوں پر بلا اس فرق کے کہ کیا وہ مکانات ہیں یا زمینات ان کی حالت پر محصول جائداد وصول کیا جاتا ہے اور اس میں گھر پٹی درشنی پٹی کچرا پٹی شریک رہتی ہے۔ اس لئے ان کی شرح اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ اندازاً ہر مالک مکان اپنے مکان کے حقیقی یا متوقع سالانہ کرایہ کا چھٹا حصہ ادا کردیتا ہے دوسرے الفاظ میں کم و بیش دو ماہ کا کرایہ اپنی محکمۂ بلدیہ کو ادا کرنا اس پر لازمی ہے پھر یہ متزاید طور پر بھی وصول ہوتا ہے یعنے کوئی مکان مالیت میں ایک خاص رقم سے بڑھا ہوا ہے تو اس پر محصول کی شرح ایک آدھ درجہ زیادہ ہوگی۔

ساتھ ہی وہاں حکومتی مکانات بلا کسی خصوصیت کے محاصل ادا کرتے ہیں اور بہت بڑی رقومات تو ریلوے کمپنیاں اور بندرگاہوں کے اداروں سے ہی ملتی ہیں۔

بلدیۂ مدراس میں حدود شہر کے مکانوں کی خرید و فروخت کے رجسٹری کے موقع پر کاغذ مہور کی قیمت کا دو فیصدی خود رجسٹرار جمع کر کے حکام بلدیہ کے سپرد کرتا ہے۔

۔ ان مقامات میں سواریوں پر بھی ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اور آپ یقین کریں کہ جس موٹر پر بلدۂ حیدرآباد میں (۴۲ روپیہ) سالانہ لیا جاتا ہے اس پر احاطہ مدراس میں (۲۵ روپیہ کلدار) ہر سہ ماہی پر ادا کر دینا لازم ہے۔ یہاں پر بھی حکومت سرکار عالی نے کچھ اضافہ طے کیا تھا۔ مگر ملک کے موٹر نشین طبقہ کے احتجاج نے اسے ملتوی کر دیا۔ اس خصوص میں ایک روایت بہت پر لطف ہے، وہ یہ کہ احتجاج زیادہ تر ہمارے ہاں کے بڑے گھرانے کی ان بیٹیوں نے کیا جو غریب شوہروں سے بیاہی ہوئی تھیں اور جن کے شوہر جہیز میں ملی ہوئی موٹروں کو چار و ناچار اپنی بیگمات کی خاطر چالو رکھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی محاصل میں اضافہ کا چرچا ہوا انھوں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے اپنی بیگمات کو اطلاع دی کہ اب موٹر رکھنا ان کی بساط سے باہر ہو رہا ہے وغیرہ وغیرہ جس پر بیگمات میدان عمل میں نکل آئیں اور ان کی فریاد نے آخر اضافۂ محصول کو ہی ختم کر دیا۔

۔ برطانوی ہند کے اکثر مجالس محصول روزگار بھی وصول کرتی ہیں۔ کوئی شخص جو حدود صفائی میں سکونت رکھتے ہوئے کسی پیشہ سے اپنا روزگار کما رہا ہو۔ خواہ وہ ملازم سرکار ہو۔ یا ڈاکٹر، وکیل یا تاجر اس کو اپنے روزگار کے وسعت کے لحاظ سے یہ محصول ادا کرنا پڑتا ہے۔

کارآموزان سیول سرویس کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ شہنشاہی حکومت ہند کے عائد کیے ہوئے محصول آمدنی سے اپنی کار آموزی میں معاف ہیں مگر محصول روزگار سے انھیں بھی معافی نہیں ہے احاطۂ مدراس کی مجالس ضلع ان سب لوگوں سے جو شہروں اور قصبوں میں سکونت نہیں کرتے بلکہ مواضعات میں رہتے ہوں یہ محصول روزگار وصول کر لیتے ہیں۔

جناب صدر! برطانوی ہند کے مجالس مقامی نے سینماؤں، تھیٹروں، اور گھوڑ دوڑ کے

احاطوں نیز کھیلوں کے مقابلوں سے بھی جو ان کی حدود میں تفریح کا انتظام کرتے ہیں آمدنی کی سبیل کرلی ہے اور یہ محصول تفریحات کہلاتا ہے اس کا بار تفریح حاصل کرنے والے ناظرین پر۔ ان کی ٹکٹ میں دی ہوئی رقم کے لحاظ سے پڑتا ہے اب تو حکومتوں نے بھی اس میں حصہ بانٹ لیا ہے اور وصولی اپنے ذمہ لے لی ہے یہ رقم اس کے علاوہ ہے جو تفریح گاہوں کے مالکوں سے بشکل محصول جائداد یا فیس اجازت یا معاوضہ تشہیر کے طور پر وصول ہوتا ہے۔ ہمارے محکمۂ بلدیہ میں کئی سال سے یہ امر محض زیر کارروائی ہے!

کلکتہ، مدراس، بمبئی کی بلدیات کو اپنے مارکٹوں اور مسلخوں سے لاکھوں روپے سالانہ وصول ہوتا ہے حالانکہ ان کا ان مارکٹوں مسلخوں پر صرفہ بہت ہی کم رہا انھوں نے ان کی تعمیر میں افادیت کے پہلو کو زیادہ ملحوظ رکھا۔ خوش منظری کی چنداں پروا نہیں کی گئی اس کے سوا وہ اپنے جمع کئے ہوئے کچرے سے نشیبی مقامات کو بھر بھر کر ان زمینات کو لاکھوں روپیوں میں فروخت کرتے ہیں۔ ان کے ہاں کا فضلہ انھی کے زیر زمینی نالیوں میں بہ جاتا ہے گو وہ غور کر رہے ہیں کہ کیوں نہ اس غلیظ پانی سے آمدنی حاصل کی جائے۔ مثلاً اس کو زراعت کے لیے دیا جائے۔ یا اس سے گیاس پیدا کرکے موٹروں کے چلانے میں استعمال ہو۔ ساتھ ساتھ ان بلدیات نے توسیع آبادی کے لئے مختلف مقامات میں وسیع رقبے سستے داموں پر حاصل کئے انھیں درست کیا ان کے پلاٹ بنائے وہاں سڑکیں تعمیر کیں اور روشنی کے لئے قنادیل اور برقی تار نصب کئے سستے ذرائع آمدورفت فراہم کئے کہ جس کے بعد لاکھوں روپیوں کا انھیں نفع ہو رہا ہے اس خصوص میں تو ہمارے اضلاع نے بھی کچھ رقم جمع کی ہے۔ محکمۂ بلدیہ حیدرآباد کی حدود میں آبادی کی توسیع ہر چہار جانب ہوئی۔ مگر اس سے ہمارا محکمۂ بلدیہ زیر بار رہی ہوا ان جدید حصوں میں آسائشوں کی فراہمی کے اخراجات اس کے لئے سوا ہو گئے نفع کا کیا ذکر ہے۔

جناب صدر! علاوہ محاصل کے برطانوی ہند کی بلدیات کو چنگی سے بہت معقول آمدنی ہو رہی ہے کبھی صرف چوبینہ پر تو کہیں اناج گھی تیل نمک شکر پر بھی چنگی لی جاتی ہے۔ اور اس میں ریلوے کمپنیاں اور مجالس انتظام بندرگاہ ان سے تعاون عمل کر رہے ہیں۔ اس کے سوا

شہر کے حدود میں داخل ہونے کی فیس شہر کے سب ناکوں پر لینے جانے کا عمل وہاں جاری تھا۔ یہ فیس اگر گاڑیوں اور سواریوں پر عام طور پر لیجاتی ہے تو ان شہروں اور قصبوں میں کہ جہاں مذہبی اجتماعات جاتراؤں اور عرسوں کی وجہ زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ فیس داخلہ اشخاص پر لی جاتی ہے اور اسے محصول جاتریاں کہا جاتا ہے اس طرح کی فیس داخلہ گرمائی تفریح کے ایسے مقامات میں بھی لی جاتی ہے۔ جہاں کی آب و ہوا صحت بخش اور ٹھنڈی ہوتی ہے اور انکی وصولی میں ریلوے اور بسیں مقامی اوارات کا ساتھ دیتی ہیں۔ برطانوی ہند میں حکومت کی طرف سے ابتدائی تعلیم، شاہراہوں کی درستی آب رسانی ڈرنیج کے لئے عطایا بھی ملتے ہیں حکومتی امکنہ کے محاصل کی ادائی بر وقت اور ایک مشت ہو جاتی ہے۔ بلدیہ کے بل کلکٹروں کی طرح ان کو پیروی کی زحمت نہیں ہوتی۔

غرض کہ جناب صدر! یہ ہے اس کی تفصیل کہ ہم شہریان بلدۂ حیدرآباد فرخندہ بنیاد کیا کچھ آسائش و آرام کتنے حقیر بدل کی ادائی کے ساتھ حاصل کر رہے ہیں آپ یقین کریں کہ برطانوی ہند کے اکثر احباب اس تفصیل کو سن کر بے ساختہ کہہ اٹھتے تھے کہ پنشن لے کر ہم حیدرآباد میں آبسیں گے۔ کیا یہ امر قابل غور نہیں کہ کب تک ہم اہل حیدرآباد سرکار عالی کے دست نگر رہیں گے تاکہ وہ اپنی محاصل کی رقم سے ہماری آسائش کے ساماں نہ صرف تعمیر کرے بلکہ ان کی نگہداشت کا بار بھی اپنے ہی ذمہ لے۔

واقعہ یہ ہے کہ بعض جاگیرات نے اس خصوص میں جو عمل اختیار کیا وہ کتنا ہی غیر معمولی کیوں نہ ہو ضرور توجہ کے قابل ہے۔ وہاں چاکنا ٹی وصول کی جاتی ہے یعنے جاگیر کے کلال خانوں میں چاکنا تیار کر کے فروخت کرنے کا حق ہراج ہوتا ہے۔ باجہ پٹی کے نام سے باجہ بجانے والے رقم ادا کرتے ہیں محترقہ کے عنوان سے جلانے کی لکڑی کے گٹھوں پر معمول وصول ہوتا ہے نکاح پڑھانے کے لئے فی عقد رقم داخل کرنے پر ہی رسم ادا ہو سکتی ہے۔ کمھاروں کو اپنی تیار کردہ صراحیوں کی کچھ تعداد جاگیردار کو دینا لازم ہے۔ دھنگر بھی چند جانور

گذرانتے ہیں تعمیر مکان پر مویشی اور جائداد کی خرید و فروخت پر، مورثوں کی وفات ہو جائے تو وراثت کی منظوری کے لئے بھی نذرانہ گذرانا لازم ہے ساتھ ہی جاگیردار کے ہاں کی تقاریب پر جاگیری رعایا دامے درمے شرکت کرتی ہے۔ میں چاکنا پٹی کو ٹکس تفریحات کے مرادف سمجھتا ہوں باجہ پٹی یا نکاح پڑھانے کی فیس ٹکس تقاریب ہے۔ محترفہ ایک قسم کی چنگی ہے۔ کمہار، دھنگر فیس لائیسنس ادا کر رہے ہیں۔ اجازت نامہ تعمیر داخلہ فروخت جائداد و نیز محصول فوتی کے لئے تو متمدن ممالک میں بھی رقوم وصول ہو رہی ہیں۔ اور اجتماعی ضروریات پر صرف ہوتی ہیں بھرطور اس کانفرنس کے مباحث کا جو حاصل انداز کے مسلک سے متعلق ہوں یہ اثر ہونا چاہیئے کہ ملک میں اقسام محاصل اور ان کی نوعیت پر غور و فکر زیادہ سے زیادہ ہونے لگے تاکہ ملک کی ترقی اور سرسبزی کے لئے زیادہ سے زیادہ گنجایش فراہم ہو۔ سچ مچ اب وقت آگیا ہے کہ شہر کے لوگ اولاً اپنے اسباب آسایش خود فراہم کریں اور ان کا انصرام کریں اور اس کے ساتھ ان کو دیہات والوں کی فلاح و بہبود پر بھی روپیہ حکومت کو فراہم کرنا چاہیئے ورنہ دیہات سدھار نہیں ہیں جیوں سدھار اور ترقی ملک کی باتیں فضول ہیں۔

مولوی محمد فاروق صاحب کا مقالہ ختم ہونے پر جو مباحثہ ہوا۔ اس کا تذکرہ گذر چکا ہے جناب لکشمی نواس جی صاحب نے جو تقریر کی اس کا خلاصہ انھوں نے قلمبند کر کے ارسال فرمایا۔ یہ دوسرے صفحہ پر درج ہے۔

حیدرآباد میں محاصل اندازی کا مسلک

از جناب لکشمی نواس جی صاحب گنیروال

مجھے کانفرنس میں متعدد تقاریر سننے کے بعد خصوصاً مسٹر نرسنگ راؤ ایڈیٹر رعیت کے اس اظہار خیال کے بعد جس میں انھوں نے موازنہ کے مدات آمدنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سال حال کے موازنہ میں خسارہ کا ذکر فرمایا ہے، میں اس کے متعلق چند امور کی جانب آپ اصحاب کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس میں اس امر کے متعلق روشنی ڈالی جائیگی کہ موازنہ میں خسارہ نہیں ہے اور ساتھ ہی میں اس امر پر بھی تبصرہ کروں گا کہ کیا اس وقت جدید محاصل کے عاید کرنے کی ضرورت ہے! مندرجۂ ذیل اعداد و شمار اس امر کو ظاہر کرتے ہیں کہ موازنہ میں خسارہ نہیں ہو سکتا :-

۱۔ مبلغ (۹۵) لاکھ مد متفرقات اور مبلغ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ جنگ کی ناگہانی ضروریات کے لئے محفوظ کئے گئے ہیں۔ جو دوامی نہیں ہیں۔

۲۔ سنہ ۱۳۵۲ ف میں بطور واقعی (۴۸) لاکھ کا خسارہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں سنہ ۱۳۵۱ ف کی خرچ شدنی رقومات بھی شریک ہیں، مثلاً سرکاری ملازمین کے لئے گرانی الونس مد میں (۸۴) لاکھ روپیہ جمع کئے گئے ہیں جس میں سال گزشتہ کے (۷) لاکھ بھی شریک ہیں۔

۳۔ غربا کے لئے کم قیمتوں پر خریدی چاول کے لئے موازنہ مذکور میں ساڑھے آٹھ لاکھ روپیہ مختص کئے گئے ہیں یہ رقم بطور سرمایہ کاروبار منظور کی گئی ہے۔ لیکن کامل رقم بمد خرچ درج کی گئی ہے جو غیر صحیح ہے۔

۴۔ مد کروڑ گیری میں درآمد و برآمد اشیاء میں کمی کا اندازہ کرتے ہوئے (۲۰) لاکھ کی کمی ظاہر کی گئی ہے لیکن قیمتوں میں اضافہ کی وجہ بمقابل سال گزشتہ سال حال تین کروڑ کا زائد مال درآمد و برآمد ہوا اسی تناسب سے محاصل آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا۔ کپاس اور مونگ پھلی کی قیمتوں میں اضافہ کی وجہ توقع رکھنی چاہیئے کہ صرف انہیں اشیاء کے محصول برآمد سے کروڑ گیری کی کمی پوری ہو جائے گی۔

۵۔ آمدنی آبکاری میں جو کمی ظاہر کی گئی ہے وہ بھی درست نہیں ہو سکتی کیوں کہ وصول شدہ اطلاعات سے ظاہر ہے کہ سال حال سررشتہ کی آمدنی میں (۱۰) لاکھ کا اضافہ ہوا ہے کیوں کہ مزدوریوں میں اضافہ کی وجہ اضافہ آمدنی کی توقع یقین کامل کے ساتھ کی جاتی ہے۔

۶۔ آمدنی ریلوے میں سے (۲۰) لاکھ روپیہ مختص برائے حصہ داران کیا جا کر شریک موازنہ نہیں کئے گئے ہیں جو درست نہیں ہے یہ رقم بطور سرمایہ خرچ ہوگی۔ اس لیئے آمدنی میں شریک نہ کرنا صحیح طریق عمل نہیں ہے۔

۷۔ ایسی صورت میں جبکہ ریلوے ہماری ہے تو اس کی آمد و خرچ کے تفصیلی حسابات عوام کے سامنے پیش ہونا ضروری ہے جہاں تک میرے معلومات ہیں ریلوے کے پاس ایک کروڑ سے زائد رقم محفوظ ہے بریں ہم ریلوے کے متعلق تفصیلی تبصرہ اس وقت کیا جا سکتا ہے جبکہ کامل اعداد و شمار عوام کو مہیا کئے جائیں۔

۸۔ برقی اور ٹیلیفون میں جو نقصان موازنہ میں ظاہر کیا جا رہا ہے اس کو نہایت آسانی کے ساتھ دور کیا جا سکتا ہے اگر حکومت سرکار عالی برطانوی ہند کے مماثل یہاں بھی بہ تعین مدت ابتدائی طور پر ان امور سے متعلق خانگی اشخاص اور کمپنیوں کے ذریعہ اجارہ دے کر رواج دے اور منافعہ کی صورت میں مناسب اور واجبی معاوضہ کی ادائی کے بعد سرکار اس کو حاصل کر لے البتہ اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ اس قسم کی کمپنیاں یا اشخاص صارفین سے منفعت ناجائز نہ حاصل کرنے پائیں اس موقع پر میں اس امر کا اظہار بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ مقامی سربرآوردہ

اشخاص نے قدیم رسومات و عطیات کو تبدیل کرنے پر اپنی آمادگی ظاہر کی تھی۔ بشرطیکہ حکومت اپنی عاید کردہ پابندیوں اور احکامات میں مناسب تبدیلی کرے۔ نیز حکومت سرکار عالی کے ملاحظہ میں ایک کمرشیل کالج کھولنے کی درخواست بھی دی گئی تھی۔ باین شرط کہ جامعہ عثمانیہ کے مقررہ نصاب کی پابندی کی جائے گی۔ اور مجلس انتظامی میں حکومت سرکار عالی کے ایک نمایندہ کو شریک کرنے پر بھی ہم کو کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن تاحال سرکار عالی کی جانب سے کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملا۔ ہمارے پاس تعلیم پر جس قدر رقم صرف کی جاتی ہے اس کے مقابلہ میں دیگر دیسی ریاستوں میں باوجود کم رقم خرچ کرنے کے وہاں کا معیار تعلیم ہمارے پاس سے بڑھا ہوا ہے۔

ان تمام امور کے مدنظر اگر حکومت سرکار عالی دیہی سدھار کے لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنائے اور مزارعین کے محاصل میں کمی کرے تو ہم دیگر مفادات سے تعلق رکھنے والے طبقات پر محاصل کے عاید کرنے پر اعتراض نہ ہوگا لیکن بلا اظہار پروگرام جدید محاصل کا عاید کرنا حق بجانب نہیں قرار دیا جا سکتا۔

آخر میں جناب صدر کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے وقت عنایت فرما کر اظہار خیالات کا موقع عنایت فرمایا۔ نیز میں آپ تمام اصحاب کا بھی شکر گذار ہوں کہ نہایت دلچسپی سے آپ نے میری تقریر سنی۔

اس تقریر کے بعد "کاشتکار اور زمانہ جنگ کے اثرات" کے موضوع پر مقالے سنائے گئے۔ جناب غلام محمد صاحب نائب صدر بزم معاشیات جامعہ عثمانیہ اور جناب عبداللہ صاحب متعلم ایم۔ اے نظام کالج نے مقالے سنائے۔ علاوہ ازیں حافظ محمد محسن صاحب وکیل اورنگ آباد نے بھی مقالہ بھیجا تھا۔ یہ تینوں مقالے آیندہ صفحات پر درج ہیں۔

کاشتکار اور زمانہ جنگ کے اثرات

از جناب غلام محمد صاحب بی، اے ۔ نائب صدر بزم معاشیات جامعہ عثمانیہ

جنگ کے اثرات ہمیشہ سے دور رس اور ہمہ گیر رہے ہیں۔ موجودہ جنگ جس نے ایک عالمگیر حیثیت حاصل کرلی ہے نہ صرف ہر گوشہ ارض کو متاثر کر رہی ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبہ پر بالراست یا بالواسطہ اس کے اثرات مترتب ہوئے ہیں۔ ہندوستان جو کہ ایک زرعی ملک ہے یہاں کا کاشتکار طبقہ اسکے اثرات سے کیوں کر محفوظ رہ سکتا تھا۔ یہاں ہمیں کل ہند کاشتکار طبقہ سے زیادہ سروکار نہیں بلکہ دیکھنا ہے کہ حیدرآباد کا کاشتکار طبقہ موجودہ جنگ سے کیوں کر متاثر ہو رہا ہے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء سے اس ہولناک جنگ کی ابتدا ہوئی جوں ہی جنگ چھڑی ہمارے ہاں مختلف اجناس کی قیمتوں میں اضافہ شروع ہوا لیکن ابتداً یہ اضافہ جنگ کے اثرات کی بنا پر نہیں بلکہ زیادہ تر تخمین یا سٹہ کا نتیجہ تھا۔ دلالوں اور درمیانی افراد (middle man) نے آیندہ صورت حال کے پیش نظر اجناس پر قابو پا لیا اور رسد کو طلب کے متوازن ہونے سے باز رکھا یہی وجہ تھی کہ یکایک قیمتیں بڑھنے لگیں۔ ان ابتدائی چند ماہ کو چھوڑتے ہوئے جنگی اثرات کے تحت قیمتیں متواتر بڑھتی گئیں۔ چنانچہ دو تین سال کے عرصہ میں زرعی اجناس کی قیمتوں میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ درمیانی قسم کے چاول جو ستمبر ۱۹۳۹ء میں ۱۶ روپیہ پلہ کے حساب سے دستیاب ہو سکتے تھے ستمبر ۱۹۴۲ء میں ان کی قیمت ۲۲ روپیہ پلہ ہو گئی۔ گیہوں جو ۱۹۳۹ء میں ۲۰ روپیہ ۸ آنہ فی پلہ کے حساب سے حاصل کئے جا سکتے تھے ستمبر ۱۹۴۲ء میں ۲۷ روپیہ ۱۲ آنہ میں دستیاب ہونے لگے۔ البتہ اس اثنا میں جوار کی قیمت میں اتنا اضافہ نہ ہوا یعنے جس قسم کی جوار جنگ کے آغاز کے وقت ۱۲ روپیہ کے حساب سے ملتی تھی ستمبر ۱۹۴۲ء میں ۱۲ روپیہ ۴ آنہ کے حساب سے ملنے لگی۔ اسی طرح دیگر اجناس کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوا۔ قیمتوں میں اضافہ کے اس رجحان کو دیکھ کر یہ سمجھا جانے لگا کہ موجودہ جنگ کاشتکاروں کے

حق میں بہت منفعت بخش ثابت ہو رہی ہے اور کاشتکار کو منافع کمانے کا اچھا موقع ہاتھ آگیا ہے لیکن حقیقی صورت حال معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح ہم نے اجناس کی قیمتوں کا مطالعہ کیا اسی طرح کاشتکار کے اخراجات کا بھی اندازہ لگائیں۔

یقیناً کاشتکار کو بہت فائدہ ملتا اگر صرف قیمتیں بڑھتیں اور اخراجات میں کسی قسم کا اضافہ نہ ہوتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاں اضافۂ قیمت کی وجہ سے کاشتکار کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا ہے ساتھ ہی ساتھ بعض مخالف اثرات بھی ہیں جو اس میں کمی کا باعث بن رہے ہیں۔ کاشتکار کے مدات خرچ کی دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے:— (۱) مصارف پیدائش۔ (۲) مصارف رہائش

مصارف پیدائش پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں پہلے کی بہ نسبت کافی زیادتی ہو چکی ہے۔ تخم کی قیمتوں میں اضافہ ہو چکا ہے۔ آلات زراعت میں چمڑے اور لوہے کا استعمال ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر دو کی قیمتیں کافی بڑھ چکی ہیں۔ مثلاً اگست ۱۹۳۹ء میں چمڑے کی قیمتوں کا اشاری عدد ۶۳ تھا اور فروری ۱۹۴۲ء میں (۸۳) ہو گیا۔ اسی طرح قوت محرکہ یعنی بیلوں کی قیمت میں بھی معتدبہ اضافہ ہو چکا ہے۔ رکھنا د پہلے کی بہ نسبت گراں ہو چکی ہے چارہ کی قلت محسوس کی جا رہی ہے۔ نقل و حمل میں نہ صرف قیمتیں بڑھ گئی ہیں بلکہ شرح نقل و حمل میں بھی اضافہ ہو چکا ہے۔ مصارف پیدائش کی یہ زیادتی لازماً کاشتکار کی آمدنی کا باعث ہو رہی ہے۔

جب ہم اس کے مصارف رہائش پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس مد پر بھی کاشتکار کو پہلے سے زیادہ رقم صرف کرنی پڑ رہی ہے اجناس خوردنی کی حد تک ہمارا کاشتکار دوسروں کا دست نگر نہیں البتہ بعض دیگر ضروریات کی چیزیں اُسے خریدنی پڑتی ہیں مثلاً تن ڈھانکنے کے لئے اسے دھوتی اور چادر کی ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ جنگلوں میں پیدل پھرنا پڑتا ہے اس لئے چپل کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اس کی بیوی کے لئے ساڑی خریدنی پڑتی ہے موسم سرما کے اثرات سے بچنے کے لئے کمل بھی خرید لیتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک چیز کی قیمت میں معتدبہ اضافہ ہو چکا ہے۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں دھوتی ۹ آنے، چادر ۸ آنے اور ساڑی ۱۰ آنے فی پونڈ کے حساب سے خریدی جا سکتی تھی لیکن ستمبر ۱۹۴۲ء تک ان کی قیمتیں بڑھ کر علی الترتیب

۱ روپیہ ۲ ر، ۱ روپیہ ۳ ر، اور ۱ روپیہ ۵ ر فی پونڈ ہو گئی کمبل جو جنگ سے قبل دو، سوا دو روپیہ تک مل جاتی تھی اب تین روپیہ سے کم میں نہیں مل رہی ہے چپل ایک یا سوا روپیہ میں خریدی جاسکتی تھی لیکن اب اسی کے لئے ڈیڑھ پونے دو روپیہ خرچ کرنے پڑ رہے ہیں۔ ان چیزوں کے علاوہ کاشتکار کچھ نمک اور مختلف قسم کے تیل بھی استعمال کرتا ہے۔ جنگ کے آغاز پر نمک ۲ روپیہ پلہ کے حساب سے دستیاب ہو سکتا تھا اور اب ۱۳ روپیہ ۱۴ کے حساب سے مل رہا ہے۔ ارنڈی کا تیل، کاشتکار روشنی کے لئے استعمال کرتا اسکی قیمت بھی بڑھ چکی ہے غرض مصارف رہائش کا بار بھی اس کی آمدنی میں کمی پیدا کر رہا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا درست نہیں کہ کاشتکار کو بہت منافع مل رہا ہے کاشتکار کو پہلے کی بہ نسبت ضرور منافع مل رہا ہے لیکن اتنا نہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔

شہروں میں جو بڑھی چڑھی قیمتیں ہیں ان کے مدنظر یہ تصور کرنا کہ ان میں اور کاشتکار کی فروخت کی قیمتوں میں جو تفاوت ہے، وہ پورے کا پورا یا اس کا بڑا حصہ کاشتکار کے جیب میں اترتا ہے، ایک مغالطہ ہے اصولاً قیمتوں کے فرق کا بڑا حصہ بطور منافع کے کاشتکار کو ملنا چاہیئے تھا۔ لیکن ہمارے کاشتکار کی لاعلمی اس میں حائل ہو رہی ہے۔ وہ فروخت پیداوار کے پیچیدہ مسائل سے ناآشنا ہے۔ اس کی بے مایہ گی اسے مجبور کرتی ہے کہ پیداوار بیک وقت جس قیمت پر بھی بکے، فروخت کر دے، اس کی انہی کمزوریوں سے درمیانی افراد فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ صرف بازاری نرخ سے بہت ہی ادنیٰ داموں پر غلہ حاصل کرتے ہیں بلکہ اوزان اور پیمانے اس قسم کے استعمال کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ غلہ حاصل کیا جاسکے۔ غرض طرح طرح سے کاشتکار سے استحصال کیا جاتا ہے۔ چونکہ کاشتکار کو روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے وہ ان تمام چیزوں کی پروا کئے بغیر یک لخت تمام پیداوار فروخت کر دیتا ہے اور اس طرح حقیقی منافع سے محروم رہتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ دلال چونکہ بازاری شرح سے واقف ہوتے ہیں اسلئے جب آئندہ قیمتیں بڑھنے کا رجحان پاتے ہیں تو فصل اگانے سے قبل ہی کاشتکار کو پیشگیاں دیتے ہیں اور ارزاں ترین قیمت پر تمام پیداوار کی خریدی کا تصفیہ کر لیتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فصل پختہ ہونے پر بازار میں

قیمت بڑھ جاتی ہے اس سے پورا کا پورا نفع انہی درمیانی افراد کو حاصل ہوتا ہے۔ اور جاہل کاشتکار اس سے محروم رہتا ہے غرض قیمتوں کے تفاوت کا بڑا حصہ درمیانی افراد کو ملتا ہے اور کمتر حصہ بطور منافع کاشتکار کو میسر آتا ہے۔

باوجود ان تمام دھوکا بازیوں کا کاشتکار ہونے کے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ حالات کی وجہ سے ہمارے کاشتکار کو کچھ بچت ضرور ہو رہی ہے۔ لیکن بغور دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس بچت سے کاشتکار کا زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔ ادھر کاشتکار کو کچھ آمدنی ہوئی اور ادھر ساہوکار نے اپنا دست شفقت دراز کیا۔ ایسے موقع پر وہ کوشش کرتا ہے کہ نہ صرف کاشتکار کا بلکہ اس کا آبائی قرضہ بھی وصول کر لے۔ رسم و روایت کی بنا پر کہیئے یا مذہبی رجحانات اور توہمات پر محمول کیجئے۔ ہمارا کاشتکار ان قرضوں کی ادائی اپنا فرض عین تصور کرتا ہے۔ اس طرح ساہوکار کے لئے ایک اچھا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ حالانکہ دستور العمل قرض دہندگان دفعہ ۱۰ کی رو سے کسی ایسے قرضے کے متعلق جو دستور العمل ہٰذا کے نفاذ سے قبل دیا گیا ہو بقایا سود کے تحت زر اصل سے تجاوز رقم وصول نہیں کی جا سکتی۔ لیکن بہرحال کاشتکار اپنی سادگی کی وجہ سے ساہوکار کا صید بن جاتا ہے اور اس طرح اس کی بچت ساہوکار کے ہاں محفوظ ہونے لگتی ہے۔ ساہوکار اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ موقع کو غنیمت سمجھ کر کاشتکار کو مزید قرض دیتا چلا جاتا ہے کہ مبادا وہ اس کی چنگل سے نکل نہ جائے اور اس کی آمدنی میں کمی ہو۔

بہرحال اگر یہ بھی فرض کر لیں کہ ساہوکار، کاشتکار کی بچت پر دست درازی نہ کریگا تو بھی یہ بچت کوئی زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتی۔ کاشتکار جو صدیوں سے مفلس چلا آرہا ہے جو روپیہ کے صحیح مصرف سے ناآشنا ہے، یہ توقع رکھنا کہ وہ اس رقم سے صحیح فائدہ اٹھائیگا ایک دھوکا ہے اس کے نزدیک اس بچت کا مصرف سوائے شادی بیاہ کے رسومات کے اور کچھ نہیں یہ محض قیاس آرائی نہیں بلکہ اس کا بارہا تجربہ کیا جا چکا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کاشتکار کے ہاں شادی اسی وقت ہوتی ہے جبکہ فصل بک چکتی ہے، وجہ کیا ہے؟ صرف یہی کہ اس وقت اسکے ہاتھ میں کچھ ٹکے آجاتے ہیں۔ جن کا مصرف وہ اس سے بہتر کچھ نہیں جانتا کہ ان کو رسومات شادی پر صرف کر دے۔ کم روپیے ملتے ہیں تو مجبوراً رسومات میں تخفیف کرنی پڑتی ہے اور اگر جیب زیادہ گرم ہوتا ہے تو رسومات کی

تحمیل کردی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ کہنا کہ وہ بچت کا صحیح استعمال نہ کرے گا نہ صرف قرین قیاس بلکہ مبنی برحقیقت ہے۔ یہ بچت صرف اسی وقت کار آمد ثابت ہوسکتی ہے جب کہ کاشتکار اس کو آیندہ کی شرد بازاری کے خیال سے محفوظ رکھے۔ لیکن ابھی ہمارے معصوم کاشتکار میں اتنا شعور کہاں!

موجودہ عالمگیر جنگ کی وجہ سے زرعی اجناس کی طلب بہت بڑھ گئی ہے۔ کاشتکار جتنا منافع اس وقت کمارہا ہے اس سے کہیں زیادہ کماسکتا اگر حکومت بروقت نگرانی قیمت کی حکمت عملی پر کاربند نہ ہوتی۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ کاشتکار سے کہیں زیادہ درمیانی افراد کو منافع ملتا۔ نگرانی قیمت کی وجہ سے نہ صرف درمیانی طبقہ اور کاشتکار کو حد سے زیادہ منافع حاصل کرنے سے باز رکھا گیا۔ بلکہ صارفین کی پریشانیوں کا بڑی حد تک ازالہ کیا گیا ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ پیدا کرنے والے طبقے اور صارفین میں توازن ہونا ضروری ہے بصورت دیگر معاشی توازن قائم نہ رہ سکیگا۔ اور ممکن ہے کہ اس صورت میں خود کاشتکار اتنا نفع حاصل نہ کرسکے جتنا توازن کی صورت میں حاصل کررہا ہے۔

حال ہی میں موجودہ حالات کے پیش نظر "غلہ زیادہ اگاؤ" کی مہم کا آغاز کیا گیا ہے۔ اب جبکہ برآمد بند ہوچکی ہے کاشتکار کا خود مفاد اسی میں ہے کہ بجائے تجارتی فصلوں کے اجناس خوردنی کی کاشت کریں۔ صارفین کے نقطۂ نظر سے اس تحریک کی اچھائی اور اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ چنانچہ مرہٹواڑی میں جہاں روئی کی کاشت ہوتی تھی اجناس خوردنی کی کاشت کی طرف توجہ کیجارہی ہے اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۳۶۰۰۰ ایکر قبہ روئی کی کاشت سے نکل کر خوردنی اجناس کی کاشت کے تحت آچکا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے کاشتکار اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ موجودہ حالت میں کاشتکار طبقہ اور کاشت کی کیا اصلاحی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں؟

اصلاحی تدابیر کئی ہوسکتی ہیں جن پر عمل کرنے کے لئے کافی روپیہ صرف کرنا ہوگا لیکن موجودہ صورت حال کے مدنظر جبکہ ہمارا مالیہ غیر معمولی اخراجات کی وجہ سے زیر بار ہوچکا ہے اس قسم کی تدابیر پیش کرنا یا ان پر عمل کرنے کی کوشش کرنا قرین مصلحت نہیں۔ اس لئے ہم چند ایسی تدابیر پیش کریں گے جن پر کم سے کم روپیہ

صرف ہو اور زیادہ سے زیادہ بہتر نتائج حاصل ہوں۔

زیادہ غلہ اگانے کی طرف حکومت جو کاشتکاروں کو متوجہ کر رہی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ کاشتکار کو سرمایہ کی فراہمی میں سہولتیں بہم پہنچائی جائیں ہم نے اوپر تفصیلی طور پر بیان کیا ہے کہ کس طرح کاشتکار کے اخراجات پیدائش میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ایسی صورت کی سرمایہ کی سہولتیں بہم پہنچانا ضروری ہے ورنہ وہ ساہوکار کے استحصال کا شکار ہو جائے گا۔ حکومت بالواسطہ طور پر انجمن امداد باہمی کے ذریعہ کاشتکاروں کی دستگیری کر سکتی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ غلہ اگایا جاسکے اور طلب و رسد میں توازن پیدا ہو۔

یہی وقت ہے کاشتکار خود کو انجمن امداد باہمی کے تحت منظم کریں اور اپنے کاروبار کو وسیع اور مستحکم کریں۔

جس طرح ہماری حکومت نے صارفین کے مفاد کے پیش نظر اجناس خوردنی کی دکانیں قائم کر دی ہیں اسی طرح کاشتکاروں کے لئے معیاری تخم کی فراہمی کی دکانیں بھی کھولدی جائیں تو بہت مفید ثابت ہونگی یہ چیز نہ صرف "غلہ زیادہ اگاؤ" کی مہم کو کامیاب بنائے گی۔ بلکہ بالواسطہ طور پر صارفین کے لئے اور جنگی ضروریات کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

حالات حاضرہ کے پیش نظر مصالحت قرضہ کے بورڈ کا فریضہ ہے کہ وہ اپنا کام پورے انہماک سے انجام دے کاشتکار اور ساہوکار میں معقول تصفیہ کرائے تاکہ جس صورت حال کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اس سے کاشتکار محفوظ رہ سکے۔ نیز قوانین قرضہ جو کاشتکاروں کے لئے مفید ہیں۔ ان پر سختی سے پابندی کی جائے۔

جہاں تک کاشتکار کی بچت کا تعلق ہے اس کو محفوظ رکھنے کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انجمنہائے امداد باہمی کے تحت ایک فنڈ قائم کیا جائے جس میں کاشتکار کی یہ بچت محفوظ رہ سکے۔ محض فنڈ کا قیام کافی نہیں بلکہ انجمنوں کی طرف سے کوشش کی جائے کہ کاشتکار فضول خرچی سے احتراز کریں موجودہ گرم بازاری کے بعد جو سرد بازاری کا دور آنیوالا ہے اس سے ان کو آگاہ کیا جائے اور تلقین کی جائے کہ موجودہ بچت کو اس وقت کے لئے محفوظ رکھیں۔

ہم نے ابتداءً بتلایا کہ کس طرح موجودہ اضافۂ قیمت کا بڑا حصہ بجائے کاشتکاروں کو ملنے کے درمیانی افراد کی جیب میں اتر رہا ہے۔ اس نقص کو دور کرنے کے لئے حکومت ان افراد کے کاروبار پر سخت نگرانی رکھے تاکہ یہ کاشتکار کی لاعلمی سے زیادہ فائدہ نہ اٹھاسکیں۔

جسطرح گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد انجمنہائے فروخت پیداوار نے اپنی حالت مستحکم کرلی تھی اسی طرح اب بھی ایک زرین موقع ہاتھ آگیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انجمن ہائے فروخت پیداوار اپنی حالت مستحکم کریں اور کاشتکاروں پر اپنی ساکھ قائم کریں تاکہ خود بخود کاشتکار اپنی پیداوار انہی کے توسط سے فروخت کرائیں جس سے نہ صرف کاشتکار کو زیادہ منافع ملے گا بلکہ بازاری طلب کے ساتھ ساتھ اجناس کی رسد مہیا کی جاسکے گی۔ اس طرح صارفین کو بھی یک گونا سکون ہوگا اور اجناس کی قلت محسوس نہ ہوگی۔

اس مقصد کے حصول کے لئے ہر جگہ غلہ کے گوداموں کا قیام ضروری ہے۔ اس قسم کے غلہ کے گودام بعض جگہ موجود ہیں لیکن حالات حاضرہ اس کے مقتضی ہیں کہ ان میں وسعت دیجائے تاکہ ان میں غلہ محفوظ رکھ کر حالات کے اعتبار سے بازار میں لایا جاسکے۔ اس طرز عمل سے درمیانی افراد کا زور بھی ٹوٹ جائے گا اور فروخت پیداوار کا مسئلہ سلجھ جائے گا۔

الحاصل ان تمام حقائق کے پیش نظر کاشتکاروں کے مفاد کے نقطۂ نظر سے کانفرنس کے آگے میری یہ چند تجاویز ہیں:-

(۱) زرعی مالیہ کی سہولتیں دو طرح سے فراہم کی جائیں۔

(ا) انجمن ہائے امداد باہمی کی وسعت کے ذریعہ (ب) تقاوی قرضوں کی زیادتی کے ذریعہ

(۲) "غلہ اگاؤ" کی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے باضابطہ تشہیر کی جائے نیز معیاری تخم آلات زراعت اور کھاد کی تقسیم کا معقول انتظام کیا جائے۔

(۳) محکمۂ فروخت پیداوار کو وسعت دی جائے اور اس کے ذریعہ فروخت پیداوار کے نقائص پر حدبندی کی جائے۔

(۴) انجمن ہائے فروخت پیداوار کو وسعت دیجائے کیونکہ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ انجمن کاشتکاروں

کی زیادہ خدمت سے زیادہ انجام دے سکتی ہیں اور مقبول ہوسکتی ہیں ۔

(۵) اب جبکہ کاشتکار کو تھوڑی بہت آمدنی ہو رہی ہے سابقہ قرضوں کی ادائی کی طرف توجہ کی جائے ۔ مصالحت قرضہ کے بورڈس اس وقت پوری توجہ سے کام کریں اور کاشتکار کو خسارہ سے بچائیں ۔

(۶) قوانین قرضہ جات پر سختی سے عمل کیا جائے ۔ تاکہ ساہوکار کاشتکاروں سے بیجا فائدہ نہ اٹھاسکیں اور اس طرح کاشتکاروں کی زندگی کسی قدر خوش حال ہوسکے ۔

ان تجاویز پر عمل کرنے سے صورت حال کی بڑی حد تک اصلاح ہوسکے گی ۔

رہبر نمائش مصنوعات ملکی بابتہ سنہ ۱۳۵۱ف

تالیف

مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی، اے (عثمانیہ)

سر ایم وشویشرایا کے ہی، آئی، ای، کی رائے کا اقتباس حسب ذیل ہے

"میں نے رہبر نمائش بابتہ سنہ ۱۳۵۱ف ۱۹۴۲ء کا خاص دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا اس میں اعلیحضرت حضور نظام کی قلمرو کی چوتھی صنعتی نمائش کی بعض موثر خصوصیات درج ہیں ۔

"رہبر مذکور میں نمائش کے مقاصد اس وسیع سلطنت کی معاشی صلاحیتیں نمائش میں سرکار عالی کے مختلف محکموں نے جو دلچسپی لی ہے اور انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی کاوشیں اجمالی طور پر واضح کی گئی ہیں اس ضمن میں انجمن طیلسانئین عثمانیہ نے جو ایک باعزم ادارہ ہے اپنی مساعی سے اس تحریک کی جو رہبری کی وہ عامۃ الناس سے خراج تحسین حاصل کرنے کی مستحق ہے"۔

رعایتی قیمت دو روپیہ سکہ عثمانیہ ۔ ملنے کا پتہ دفتر مجلس نمائش معاشی کمیٹی معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

کاشتکار اور زمانہ جنگ کے اثرات

ار

جناب احمد عبد اللہ صاحب متعلم ایم، اے (نظام کالج)

ایک موقع پر پریذیڈنٹ روزولٹ نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ ہٹلریت کے خلاف جنگ کرنیکے لئے جس طرح آلات حرب اہمیت رکھتے ہیں اسی طرح غذا بھی ایک اہم حربہ ہے اور آیندہ بھی دنیا میں تنظیم خوشحالی اور امن قائم رکھنے کے لئے غذا کا مسئلہ بھی سب سے زیادہ اہم ہوگا، آنریبل ین آر سرکار نے بھی ایسے ہی ایک سلسلہ میں وضاحت کی ہے کہ دو زمانہ جنگ میں زراعت کو بہت ہی ضروری کام انجام دینے پڑتے ہیں۔ مثلاً بیحد مشکلات کے باوجود تمام سیول اور فوجی آبادی کو غذا بہم پہنچانا تاکہ ان کی ہمت گرنے نہ پائے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر فوجیں پیٹ کے بل چلتی ہیں تو قوم کی ہمت کا انحصار غذا کی فراہمی پر ہے جنگ جیتنے کی کوشش کا ایک اہم جزو یہ ہے کہ پیدائش اغذیہ سے متعلق ہمارا انتظام کار یا رویہ بہت ہی جچا تلا ہو"

ان دو بیانات کے پیش کرنے سے میرا مطلب یہ تھا کہ زراعت اور اس طرح مزارعین کی اہمیت کو ظاہر کردوں۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ زرعی پیداوار پر جنگ نے کیا اثر کیا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے ہمیں زرعی پیداوار کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔ ایک صنعتی اور تجارتی فصلیں اور دو غلہ کی فصلیں پہلی قسم میں، روئی، سن، موٗنگ پھلی اور دوسری قسم میں تیل کے بیج شامل ہیں ہم ہر ایک پر علحدہ علحدہ غور کریں گے۔

(۱) روئی کی کاشت ہندوستان میں زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے اور اسکی صنعت بھی کافی قدیم ہے برطانوی دور میں پارچہ بافی کے کارخانہ قائم ہونا شروع ہوئے اور ان کی تعداد بڑی سرعت کے ساتھ بڑھتی گئی یہاں تک کہ ۱۹۳۹ء میں ان کی تعداد ۳۸۹ ہوگئی اور ہماری روئی کی پیداوار کی ایک بڑی مقدار انہی میں صرف ہونے لگی۔ چونکہ ہندوستان کی روئی چھوٹے ریشہ کی ہوتی ہے اس لئے انگلستان میں

اس کی مانگ بالکل کم تھی لیکن جاپان اس کے ایک بڑے حصہ کا خریدار تھا۔ اب جاپان کی مارکٹ کے بند ہو جانے کی وجہ سے اس پر بہت بڑا اثر پڑا ہے گو اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے کارخانوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات اس کے ایک حصہ کو مصرف میں لا رہی ہیں لیکن پھر بھی ایک بہت بڑا جزو رہ جاتا ہے اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس سال کی فصل ۴۸ لاکھ گٹھوں Bales پر مشتمل ہوگی جس میں سے ہندوستان کے کارخانوں میں زیادہ سے زیادہ ۲۴ لاکھ کی کھپت ہو سکے گی اور ۵ لاکھ برآمد اور ۵ لاکھ Bales کی نکاسی گھریلو پارچہ بافی کی صنعتوں کے لئے ہو سکے گی لیکن اس کے باوجود ۲۵ لاکھ Bales بچ رہتے ہیں جس کی نکاسی نہ ہونے پر کاشتکاروں کو ایک بڑے نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یہ چیز روئی کے کاشتکاروں کے لئے بہت ہی بے چینی کا باعث بن گئی ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کی صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ اس کے لئے کوئی نئی مارکٹ پیدا کی جائے دوسرے یہ کہ روئی کے بجائے اغذیہ کی کاشت کی جائے جس میں سے حکومت دوسرے طریقہ پر زور دے رہی ہے۔

(۲) سن کی فصل ہندوستان کے کل زرعی رقبہ کے ۱½ فیصد حصہ کی پیداوار ہے ابتداءً اس کو عام طور پر خام حالت میں برآمد کیا جاتا تھا اور براعظم یورپ اس کے پچاس فیصد حصہ کا خریدار تھا لیکن اب یہ ساری مارکٹ بالکلیہ بند ہو چکی ہے پہلے جنگی سال میں اس پر زیادہ اثر نہیں پڑا کیونکہ برطانیہ اور امریکہ اس کی ایک بڑی مقدار کے خریدار بن گئے تھے لیکن بتدریج بحری رسائل کی مشکلات نے اس نئی مارکٹ کا بھی خاتمہ کر دیا۔ ہم کاشتکاروں کے اس زبردست نقصان کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں فی الحال سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ نقصان برداشت کر لیا جائے لیکن آیندہ انھیں کسی نہ کسی طرح اس کے رقبہ کو محدود کر دینا پڑیگا۔

(۳) مونگ پھلی حیدرآباد اور مدراس کے ایک بڑے رقبہ کی پیداوار ہے اور تقریباً اس کی برآمد کا پورا انحصار براعظم یورپ تھا۔ ہر سال ۹ کروڑ روپیہ کی مونگ پھلی ہندوستان سے برآمد کی جاتی تھی لیکن اب جنگ کی وجہ سے اس کا جو بھی حال ہوا ہے سب پر عیاں ہے۔ ان کاشتکاروں کی حالت سب سے زیادہ تشویشناک ہو گئی ہے کیونکہ نہ تو ہندوستان یا کسی اور قریب کے ممالک میں اس کے لئے کسی نئی مارکٹ کا امکان ہے اور نہ ہی اس کو کسی دوسرے مصرف میں لایا جا سکتا ہے سوائے اس کے کہ

مقامی طور پر اس کا تیل نکالا جائے یا اس کی مانگ کو کسی قدر بڑھانے کی کوشش کی جائے اور کوئی چارہ نہیں کسانوں کو چاہیئے کہ فوراً اس کاشت سے ہٹ کر اشیاء خوردنی کی کاشت اختیار کریں لیکن پھر بھی جو نقصان ہو چکا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے۔

(۴) تیل کے دوسرے بیجوں کی بھی ایک بڑی مقدار برآمد کی جاتی تھی لیکن ان پر مارکٹ کے بند ہونے کے کوئی زیادہ ناخوشگوار اثرات نہیں پڑے کیوں کہ اس کی ایک بڑی مقدار ہماری مقامی جنگی ضروریات کو پورا کر رہی ہے۔

ان مختصر اعداد و شمار سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جنگ نے صنعتی اور تجارتی فصلوں کا کیا حشر کیا اور یہ کہ کاشتکاروں کو کس قدر مالی نقصان برداشت کرنا پڑا ان میں سے جو فصل کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور تبدیل کر رہے ہیں ان کے لئے بھی مالی مشکلات رکاوٹیں پیدا کر رہی ہیں جب تک حکومت اُن کی خاطر خواہ امداد نہ کرے اور ضروری ہدایات نہ دے ایک بڑے پیمانہ پر غلہ کی پیداوار بہت مشکل ہے۔ گو حکومت نے اس طرف اقدام کیا ہے لیکن یہ کام اس قدر چھوٹے پیمانے پر ہو رہا ہے کہ عام حالات درست کرنے کے لئے کسی طرح کافی نہیں حکومت کو چاہیئے کہ جن کسانوں نے غلہ کی کاشت شروع کر دی ہے ایک خاص قیمت پر ان کے اجناس کے نکاسی کی ذمہ داری لے لے۔

اب ہم ان کاشتکاروں کا حال معلوم کریں گے جو غلہ کی کاشت کرتے ہیں۔ ہندوستان کی غذا میں چار چیزیں بہت اہمیت رکھتی ہیں، چاول، گیہوں، جوار باجرا، اور چنا اور یہ چاروں ہمارے غلہ کی فصلوں کا ۸۰ فیصد ہیں اور ان کی پیداوار علی الترتیب ۲۶۵ لاکھ۔ ۱۰۰ لاکھ۔ ۹۲ لاکھ اور ۳۵ ½ لاکھ ٹن ہے۔ چاول کی اتنی بڑی پیداوار کے باوجود ہر سال چودہ لاکھ ٹن برما سے درآمد کیا جاتا تھا ظاہر ہے کہ یہ آمد فی الحال بند ہو چکی ہے گیہوں کی نکاسی صرف ۹۹ لاکھ ٹن تھی اور تقریباً برآمد کیا جاتا تھا۔ جوار باجرا اور چنا مقامی طور پر مارکٹ پیدا کر چکے تھے ان کے علاوہ دوسری اشیاء خوردنی مثلاً سبزی، گڑ، شکر، دالیں، مٹر، ارہر وغیرہ کی جنگ کی وجہ سے بہت مانگ بڑھ گئی ہے ایک تو یہ کہ حکومت ہند کثیر مقدار میں ان اشیاء کو خرید رہی ہے اور دوسرے قریب کے ممالک سیلون ایران اور مصر وغیرہ کو ان کی برآمد بہت بڑے پیمانہ پر کی جا رہی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مانگ کی غیر معمولی زیادتی کی وجہ سے بعض اشیاء کی کمی

محسوس ہونے لگی اور تمام کی قیمتوں میں اضافہ ہونے لگا اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا غریب کاشتکار قیمتوں کے اس اضافہ سے کچھ فائدہ بھی اٹھا سکے یا ان کی حالت بدستور قائم رہی کسان قرض کے بوجھ سے جس قدر بھی دبا ہوا ہے اس سے کون واقف نہیں اور اسی بوجھ کی وجہ سے وہ ساہوکار کا غلام بن کر رہ گیا ہے اس کو اتنی آزادی تک باقی نہیں رہی کہ اپنی پیداوار کو مارکٹ کے نرخ پر فروخت کر سکے چنانچہ آج بھی ساہوکار اسی پرانے نرخ پر خریدی کرتا ہے اور مارکٹ کے حالیہ داموں پر فروخت کرتا ہے گو یہ چیز بعض حالات کے تحت کسان کیلئے فائدہ مند ثابت ہوتی ہے مثلاً سنہ ۱۹۳۱ء کے زمانہ میں جبکہ قیمتیں بہت گری ہوئی تھیں کسان کو زیادہ نقصان برداشت نہیں کرنا پڑا لیکن اس زمانہ میں یہ چیز ان کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔ تمام نفع ساہوکاروں کے نذر ہو رہا ہے حکومت اشیا رخوردنی کی قیمتوں کا جو تعین کر رہی ہے وہ گو ہمارے نقطۂ نظر سے فائدہ مند ہے لیکن کاشتکاروں کا مفاد ملحوظ نہیں رکھا گیا تعین قیمت کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ صرف مارکٹ میں قیمتوں کی نگرانی کی جاتی ہے لیکن ساہوکار کے بیچنے کے نرخ پر کسی قسم کی نگرانی نہیں رکھی گئی اس سے یہ ہو رہا ہے کہ چھوٹے بیوپاری نقصان میں ہیں کیونکہ وہ بڑھیا داموں میں ساہوکار سے خریدی کرتے ہیں اور انہیں ایک معین قیمت پر بیچنا پڑتا ہے۔ مجھے ان تفصیلات میں جانے کی فرصت نہیں کیونکہ یہ چیز میرے عنوان کے حدود سے باہر ہے۔

اب ہمیں کسان کی قرضداری کے متعلق غور کرنا ہے کہ جنگ نے اس میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ اس موضوع پر بحث کرنے کے لئے ہمیں ابھی بیان کئے ہوئے حالات کو اچھی طرح ذہن میں رکھنا چاہیئے چونکہ کسان کی مالی حالت میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا۔ اس لئے یہ نتیجہ بلا تامل قبول کر لیا جا سکتا ہے کہ کسان کے لئے قرضداری کے جال سے چھٹکارا پانے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ اس کی قرضداری اتنی بڑھ چکی ہے کہ جب تک اس کی مالی حالت میں کوئی معتدبہ فرق پیدا نہ ہو قرضداری کا بوجھ سر سے علحدہ ہونا ایک ناممکن سا امر ہے جنگ بجائے اس کی بہتری کے سامان پیدا کرنے کے اس کو مالی حیثیت سے اور زیادہ ابتر کرنے کی ذمہ دار ہو رہی ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہوگا کہ کافی، چائے اور ربر کے کاشتکار اس کے برخلاف بہت فائدہ اٹھا رہے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت

منظم حالت میں ہیں اور مارکٹ کے نرخ سے بخوبی واقف ہوتے ہیں لیکن ان کی تعداد اتنی قلیل ہے کہ عام کاشتکاروں کے متعلق کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں اثر نہیں رکھتے ۔

ایک بڑی مصیبت یہہ ہے کہ اعلیٰ قسم کا اناج بونے کیلئے کاشتکاروں کے پاس سرمایہ بالکل مفقود ہے سرمایہ حاصل کرنے کے تمام ذرائع بھی فی الحال تقریباً بند ہیں گو ظاہرا ساہوکارہ (Money market) کی حالت ٹھیک ہے لیکن حکومت ہند جنگی اغراض کے سلسلہ میں اتنا قرض لے رہی ہے کہ دوسروں کے لئے مواقع بہت کم ہیں اس سلسلہ میں بینک رہن اراضیات (Land mortgage Bank) کی جانب سے بھی کوئی خاطرخواہ امداد ملنے کا امکان نہیں ہے ان بنکوں نے کاشتکاروں کو جو بھی سرمایہ بہم پہنچایا وہ صرف ان کا قرضہ کم کرنے کی حد تک تھا نہ کہ ان کے کسی تعمیری کام کے لئے اب تو خود ان بنکوں کے ہاں سرمایہ کی کمی محسوس ہونے لگی ہے۔ اس کی وجہ یہہ ہے کہ ساہوکار اپنا روپیہ سرکاری بنکوں اور اداروں میں محفوظ کرانا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ ان کو (Land mortgage Bank) کی بہ نسبت سرکاری بنکوں کی ضمانت کا زیادہ اطمینان ہے ۔

جیسا کہ ہندوستان میں دوسرے ممالک کی بہ نسبت فی ایکر پیداوار بہت ہی قلیل ہے اب سخت ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ اس مقدار کو جلد از جلد بڑھانے کی کوشش کی جائے لیکن یہاں بھی سرمایہ کا سوال درپیش ہے جب تک کاشتکار کے ہاں سرمایہ نہ ہو اس کے لئے ایسے اصول جو زیادہ پیداوار نکال سکتے ہیں اختیار کرنا محال ہے ۔

یہاں یہہ بہتر ہوگا کہ ہم حیدرآباد کے مزارعین کی حالت پر ایک سرسری نظر ڈالیں اور اسی سلسلہ میں یہاں کی زراعت کے متعلق کچھ غور کریں حیدرآباد کے گیہوں اور چاول کی پیداوار یہاں کی ضروریات کے لئے ناکافی ہوتی ہے ہر سال ہمیں بجواڑہ سے چاول اور پنجاب سے گیہوں کی ایک بڑی مقدار درآمد کرنی پڑتی تھی۔ سنہ ۱۳۵۰ ف میں ۲۰۸۳۵۷ پلے چاول اور ۱۸۱۲۸ پلے گیہوں درآمد کئے گئے لیکن جب سے حکومت پنجاب نے گیہوں کی برآمد کو ممنوع قرار دیا ہے ہمارے ہاں گیہوں کی بہت کمی محسوس ہونے لگی ہے۔ حیدرآباد اس کمی کو پورا کرنے کا بندوبست بآسانی کرسکتا ہے ہمارے ہاں تری کی زمینات نظام آباد اور کیسل وغیرہ میں کافی موجود ہیں اور یہاں گیہوں کی کاشت بہت کامیاب ثابت ہوسکتی ہے اس سلسلہ میں ہماری حکومت اقدام کرچکی ہے

اور بہت کامیابی کے امکانات موجود ہیں۔ یہ امر بے حد مسرت کا باعث ہے کہ حکومت نے کاشتکاروں کیلئے جو غلہ کی زراعت شروع کریں ۵۰ فیصدی ٹیکس میں کمی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اس سے بہت جلد احساس کی کمی کی تلافی ہو جائے گی۔

حیدرآبادی کاشتکاروں کے مسائل بلا کم و کاست وہی ہیں جو برطانوی ہند کے ہیں جو حل ان مسائل کا ہے ان کا بھی وہی حل ہے غلہ کی پیداوار بڑھانے کے سلسلہ میں ہماری حکومت دو بڑے اچھے طریقے اختیار کر سکتی ہے وہ یہ کہ زرعی نو آبادیات قائم کی جائیں جس میں ہمارے نوخیز تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو پھلنے پھولنے کے بہت وسیع ذرائع مل سکتے ہیں ایک تو وہاں اعلیٰ زندگی کا ماحول پیدا کر سکتے ہیں اور دوسرے اپنی قابلیت سے تعلیمی حالت اور انتظامی امور کو بھی درست کر سکتے ہیں ان نو آبادیات کی کاشت ان لوگوں کے ذمہ کیجا سکتی ہے جو اس وقت دیہاتوں میں کاشتکاری کے علاوہ دوسرے غیر ضروری پیشوں میں مصروف ہیں اس طرح ملک کی پیداوار بھی بڑھے گی اور بیروزگاری بھی ایک حد تک دور ہو جائے گی جیسا کہ برطانوی ہند کے کاشتکاروں کے متعلق بیان کیا جا چکا ہے حیدرآباد کے کاشتکاروں کی قرضداری بھی جنگ سے کسی طرح متاثر نہیں ہوتی اس وقت ضرورت ہے کہ ان کی مالی حالت کی طرف توجہ کی جائے جس طرح حکومت رعایا کی شدید ترین ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسٹیٹ بنک کا قیام عمل میں لائی ہے اور اس کے کاموں میں بجا طور پر سرگرمی دکھلا رہی ہے اسی طرح ہمیں امید ہے کہ حکومت بہت جلد دوسرے قسم کے بنکوں، (Landmortgage Bank) کی جانب بھی اپنی توجہ منعطف کرے گی تاکہ کسانوں کو اعلیٰ قسم کی فصلیں بونے اور (Intensive cultivation) کرنے کے مواقع حاصل ہوں نہ صرف اسی حد تک بلکہ یہ چیز ہمارے کاشتکاروں کے قرض کے بوجھ کو جو مسٹر بھروچہ کی تحقیق کے مطابق ۶۴ کروڑ روپے ہے ہلکا کرنے میں مدد دے گی۔ کاشتکاروں کی چند اور ضرورتیں ہیں جو ہم سمجھتے ہیں کہ حکومت کے زیر غور ہیں اور یقیناً بہت جلد ان پر عمل ہونے والا ہے ایک تو یہ کہ ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں جن سے کاشتکار بالراست اپنی پیداوار مارکٹ میں لاکر فروخت کر سکیں اور جنگ کے ان غیر معمولی حالات سے فائدہ اٹھا سکیں دوسرے یہ کہ کسانوں پر سے ٹیکس کا بوجھ کسی قدر ہلکا کر دیا جائے اور اس کی وجہ سے موازنہ میں جو کمی واقع ہوگی

اس کو انکم ٹیکس یا ایسے ٹیکسوں سے جن کا بار مالدار طبقہ پر پڑے پورا کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ سائنٹفک طور پر پیمائش کرائی جائے اور زرعی مسئلوں کی تحقیقات کے لئے ایک مستقل محکمہ قائم کیا جائے۔ گو اس سلسلہ میں ہمارے ہاں کافی کام ہوچکا ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس کام کو اور زیادہ ترقی دیجائے۔

کاشتکار اور زمانۂ جنگ کے اثرات

از جناب حافظ محمد مستحسن صاحب وکیل ہائیکورٹ اورنگ آباد

زمانۂ جنگ میں کاشتکار پر جنگ کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں اس کے متعلق امور ذیل خاص توجہ کے محتاج ہیں۔ جنگ کے اثرات کاشت اور کاشتکار کی ضروریات پر بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں کاشتکار کی آمدنی کا ذریعہ اس کی پیداوار ہے۔ جس کو وہ اپنی محنت و مشقت سے اپنی زمین سے حاصل کرتا ہے۔

اس کو سب سے پہلے پیداوار حاصل کرنے کے لئے زمین کی درستی اور اپنی تندرستی کی ضرورت ہے۔ زمین کی درستی کے لئے حسب ذیل آلات کشاورزی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

ناگر۔ بکھر۔ راھگی۔ کولیا۔ ڈبا۔ کھرپی۔ کودالی۔ کلہاڑی۔ پہاوڑہ پیداوار کے حمل و نقل کے لئے گاڑی۔

آلات کشاورزی لوہے اور لکڑی سے مرکب ہوتے ہیں۔ لکڑی کی بہم رسانی میں تو کوئی دقت زمانۂ جنگ میں نہیں ہوتی۔ البتہ لوہا جو سب سے زیادہ ضروری جز آلات کشاورزی کا ہے اس کی بہم رسانی میں زمانۂ جنگ کے پہلے کے مقابلے میں چوگنا۔ پچگنا۔ خرچ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے زمین کی درستی کے لئے ناگر کا استعمال ضروری ہے اس زمانہ میں ناگر لوہے کا استعمال ہوا کرتا ہے۔ جس سے لکڑی کے ناگر کے مقابلے میں دو چند سے زیادہ کام نکلتا ہے جنگ سے پہلے ایک ناگر کی قیمت (۲۳) سے (۲۸) روپیہ تک تھی۔ اسی ناگر کی قیمت اب (۵۰) سے (۶۲) روپیہ تک ہے اب اس ناگر کو تو کاشتکار اگر ایک مرتبہ خریدلے تو پھر پانچ سات سال تک خریدنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے اجزا ہر سال گھس کر خراب ہو جاتے ہیں جن کو سالانہ بلکہ اس سے بھی کم مدت میں بدلنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ مثلاً ناگر کا پھال اور اس کے کیلے تقریباً ہر سال بلکہ پھال کو تو ایک مہینہ استعمال کے

بعد ملکی زمینوں میں لازمی طور پر بدلنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ جنگ کے زمانہ سے پہلے اس کی قیمت ایک روپیہ چار آنے فی پیال تھی۔ اب اس کی قیمت تین روپیہ چار آنے سے تین روپیہ بارہ آنے تک ہے ان کیلوں کی قیمت جو پیال کے لئے ہمیشہ ضروری ہوا کرتے ہیں پہلے ایک آنہ سوا آنہ تھی اب اس وقت سات آٹھ آنے ہے۔ ناگرکا رمنا جو پہلے چار یا پانچ روپے کو ملتا تھا۔ اس وقت پندرہ روپیہ بیس روپیہ اس کی قیمت ہے۔ ناگر کے بعد زمین کی درستی کے لئے بکھر کا استعمال کیا جاتا ہے اس میں جو لوہا ہوتا ہے اس کو پاس کہتے ہیں وہ پہلے سات آنے سے دس آنے تک ملتا تھا۔ اب وہ ڈھائی روپے سے ساڑھے تین روپے تک مل رہا ہے۔ اسی طرح ایک کھرپی کلہاڑی وغیرہ آلات کشاورزی مذکورالصدر کی یہی حالت ہے۔ جس کو بخوف طوالت ترک کیا جاتا ہے۔

دوسری ضرورت اسکو اپنی تندرستی کیلئے سب سے پہلے غلہ کی ہوتی ہے اسکو کاشتکار اگر خدانخواستہ فصلیں خراب نہ ہوں تو آسانی سے مہیا کرلیتا ہے۔ مگر غلہ کے ساتھ ترکاری۔ بھاجی کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس کی قیمت بھی اس کو چوگنی پچگنی ادا کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً مرچ، نمک، تیل، گڑ، وغیرہ یہ سب چیزیں مقابلتاً بہت گراں ہیں۔ اسکے بعد کپڑے کی ضرورت ہے کپڑا ایک مرد کاشتکار کو سال میں بیس ہاتھ دھوتی کے لئے دو پٹی جس کو وہ بطور کرتے کے استعمال کرتا ہے۔ ایک پگڑی ایک کمبل ایک جوتا۔ اس کی عورت کے لئے دو ساڑیاں یا چار چولیوں کی ضرورت ایک سال میں ہوا کرتی ہے۔ بیس ہاتھ دھوتی کے لئے کپڑے کی قیمت پہلے (۳-۴) روپیہ ہوا کرتی تھی۔ وہ اب (۱۰) روپیہ سے زیادہ میں مہیا ہوتی ہے اسی طرح ساڑی جو پہلے ڈھائی روپیہ تین روپیہ میں ملتی تھی وہ اب سات آٹھ روپیوں سے کم نہیں ملتی۔ جوتا جو پہلے ایک روپیہ بارہ آنے میں ملتا تھا۔ اب اس کی قیمت چار سے پانچ تک ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جس کے بغیر ایک کاشتکار کی زندگی محال ہے۔ جس کو وہ مقابلتاً اتنی زیادہ قیمت ادا کرکے مہیا کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کو پینے کے لئے تمباکو اور کار چی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن کی قیمتیں بھی بہت زیادہ ہیں۔ اس زمانہ میں بجائے

ارنڈی کے تیل کے گیاس کے تیل کا استعمال ہوا کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ کلڑی اور ارنڈی کے مقابلہ میں زیادہ سستا اور آسانی سے بہم پہنچتا تھا۔ مگر اب اس کی صرف قیمت ہی بہت زیادہ نہیں بلکہ اس کا ملنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔

گرانی کی زیادہ قیمت وہ کس طرح پورا کرے وہ اپنی ضروریات خوردنی میں اگر کمی کرتا ہے تو اس کی صحت پر اثر پڑتا ہے اور کمزور ہو جاتا ہے جس کی وجہ مشقت میں بھی لازمی طور پر کمی ہوگی اور اب مشقت میں کمی ہوگی تو لازمی طور پر زمین کی پیداوار میں بھی کمی ہوگی۔ اس طرح اس کی دولت کی کمی اور عدم دستیابی آلات کشاورزی اس کی تباہی کا باعث ہو رہے ہیں۔ اور اس کی تباہی کا اثر عام طور پر ضروریات جنگ پر بالواسطہ پڑ رہا ہے۔ ہماری سرکار دولت مدار کو سب سے پہلے اس کی ضروریات کے پورا کرنے پر توجہ کرنی چاہیئے۔

تیسری ضرورت کاشتکار کو آلات کشاورزی کے استعمال کے لئے مویشی کی ہوا کرتی ہے۔ مویشی یعنے بیل سابق کے مقابلے میں دو چند سے زیادہ قیمت پر مل رہے ہیں۔ یعنے جو بیل کی جوڑی کاشت کے کام کرنے کے قابل پچاس روپیہ میں مل سکتی تھی انہیں بیلوں کی اب قیمت سو روپیہ سے کم نہیں ہے۔ مویشی کو سنبھالنے کے لئے چارہ اور سرکی یا کھلی کی ضرورت ہے۔ اس زمانے میں چارے کی قلت ہے اور سرکی جو پانچ روپیہ میں فی پلہ ملا کرتی تھی اب وہ بارہ روپیہ اور کھلی پہلے پانچ روپیہ فی پلہ ملتی تھی وہ اب تیرا روپیہ فی پلہ مل رہی ہے۔ سرکی اور کھلی کی قیمت کی زیادتی برآمد زیادہ ہونے سے ہوگئی ہے۔ اور اس کا اثر بیلوں کی تندرستی پر پڑ رہا ہے اور جس طرح سے کاشتکار کی تن درستی میں کمی کا اثر فوری طور پر پیداوار پر پڑتا ہے اسی طرح بیلوں کی کمزوری کا اثر بھی فوری طور پر پیداوار پر پڑتا ہے۔ اور پیداوار کی کمی کا لازمی نتیجہ کاشتکار کی تباہی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ اس زمانہ میں فیصدی پچہتر سے زیادہ کاشتکار ایسے ہیں جو اپنی سال بھر کی پیداوار سے سال بھر کیلئے ضروریات کاشت اور قوت لایموت مہیا کرتے ہیں اور پچیس سے کم کاشتکار ایسے ہیں جو اپنی سال بھر کی پیداوار سے سال بھر کی ضروریات پوری کر کے کچھ بچا سکتے ہیں جو اپنی اور اپنے عیال و اطفال کی دکھ بیماری شادی غمی کے اخراجات پورے کر سکتے ہیں۔

اب دوسرا سوال کاشتکار کی اجناس خوردنی اور کپاس و اشیاء روغن دار کی قیمتوں کے اضافہ سے فائدہ یا نقصان کا ہے۔ سال حال مجملہ پیداوار اور خریف کی کپاس کی قیمت سال گذشتہ کی قیمت کے مقابلے میں دوچند سے کچھ زیادہ ہے لیکن پیداوار نصف سے بھی کچھ کم ہوئی ہے اس طرح کوئی خاص دولت کاشتکار کے پاس کپاس سے نہیں آئی۔ اب خریف میں مونگ پھلی کی پیداوار بھی آٹھ آنے سے زاید نہیں ہے اگرچہ اس کی قیمت بھی سال گذشتہ کے مقابلہ میں دوچند کے قریب ہے اس کے علاوہ اشیاء خوردنی میں باجری اور تور اور مونگ وغیرہ ہے باجری کی پیداوار مرہٹواڑی میں دس آنے بارہ آنے سے کسی طرح زیادہ نہیں ہے۔ اور قیمت سال گذشتہ کے مقابلے میں سوا آنے سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کے بعد تور کا نمبر ہے۔ تور کی قیمت سال گذشتہ کے مقابلے میں اس وقت سہ گنی ہے۔ مگر پیداوار کسی طرح آٹھ آنے سے زیادہ نہیں ہے۔ اسی طرح تلی کی پیداوار بھی ہے جس سے کاشتکاروں کو خاص منفعت یا دولت حاصل نہیں ہوتی۔ اس کی پیداوار بھی آٹھ آنے سے زائد نہیں ہے۔ اگرچہ قیمت سال گذشتہ کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ ہے بغرض اس اضافۂ قیمت سے اس سال کاشتکار کی دولت میں اضافہ نہیں ہوا۔ بلکہ اس کو اپنی لازمی و لابدی ضروریات مہیا کرنے میں ہر طرح خسارہ رہا۔

اشیاء خوردنی کی کاشت کے لئے ہماری سرکار نے کاشتکاروں کی ترغیب و تحریص اور منفعت پہونچانے کے لئے احکام جاری کئے ہیں کہ جو کاشتکار سال گذشتہ کی کپاس کے مقابلے میں اشیاء خوردنی کی کاشت زیادہ کرے تو اس کی اشیاء خوردنی کی کاشت کی مالگذاری کم کی گئی ہے لیکن یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے فائدہ حاصل کرنا کاشتکار کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے اختیار میں ہے جو تختہ بنانے والے اور رپورٹ کرنے والے ہیں۔ یعنے پٹواری صاحبان۔ پٹواریوں کو صرف اپنی منفعت کا خیال رہتا ہے۔ اگرچہ ان کی منفعت سے کاشتکار کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ اس لئے اس حکم میں تبدیلی کی فوری ضرورت ہے۔ اشیاء خوردنی کے مقابلے میں اشیاء روغن دار کی قیمتیں زیادہ ہوتی ہیں اور اس کی وجہ سے

نقد روپیہ کاشتکار کے ہاتھ میں آتا ہے۔ اس لئے وہ ان کی تخم ریزی پر مجبور رہتے ہیں۔ اور بعض موسم اور بعض قسم زمین کی ایسی ہوتی ہے کہ جو بجائے اشیاء خوردنی کے اشیاء روغن دار کے لئے زیادہ مناسب ہوا کرتی ہے۔ اور اسی قوت نمو کو برقرار رکھنے کے لئے تخم ریزی میں جنس کی تبدیلی کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کی قوت نمو کم ہو کر زائل ہو جاتی ہے۔

زمین کی قوت نمو کو زیادہ کرنے کے لئے کھاد کی ضرورت بھی لازمی طور پر ہوا کرتی ہے۔ جس کو کاشتکار عموماً جانوروں کے گوبر سے بہم پہنچاتے ہیں۔ اور جب چارے کی کمی یا گرانی ہو تو وہ اپنی ضرورت کاشت سے زیادہ جانور مثلاً گائے بھینس وغیرہ نہیں رکھتا۔ اور اس کی وجہ سے اس کے نہ رکھنے سے کھاد مہیا نہیں ہو سکتی اور عدم دستیابی کھاد سے بھی پیداوار کی کمی ہوا کرتی ہے یہ اثرات موجودہ جنگ کے راست کاشتکار پر پڑ رہے ہیں اس سے قبل کی جنگ میں کاشتکاروں کو اپنی پیداوار کی زیادہ قیمت آنے کی وجہ سے دولت جمع کرنے کا موقع ملا تھا۔ کیونکہ سابقہ جنگ کے زمانہ میں پیداوار کاشت کی قیمت بہت زیادہ ہو گئی تھی اور دیگر ضروری اشیاء کاشت کی قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔

گرانی نرخ اشیاء کے سلسلہ میں اگر حسب ذیل امور جاری کئے جائیں تو میری ناقص رائے میں کاشتکاروں کو فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

آلات کشاورزی کا ایک اسٹور قائم کیا جائے ہر ہر تعلقہ میں ایک اسٹور قائم کیا جائے جہاں سے بہت ہی کم کرایہ پر ہر کاشتکار کو آلات دیئے جائیں۔

اچھے بیل فراہم کرنے کے لئے کاشتکاروں کو قرض دیا جائے۔

دیگر ضروریات کاشت مثلاً نیلی اور کھرپی وغیرہ کے لئے کاشتکاروں کو ہر وقت بہ قدر ضرورت قرض دیا جائے۔ مگر جو طریقہ کاشتکاروں کو بذریعہ تقاوی قرض دینے کا رائج ہے وہ مناسب نہیں ہے۔ کیوں کہ اس طریقہ سے کاشتکاروں کو قرض حاصل کرنے میں ان کی ضرورت کے وقت روپیہ میسر نہیں آتا ہے اس کے لئے دیہی بنکنگ کا طریقہ

رائج کیا جانا چاہیئے ۔ نیز فوری طور پر کاشتکاروں کی ضرورت کا کپڑا کم داموں میں ان کو مہیا کرنا چاہیئے تاکہ اُن کی تن پوشی ہو ۔

گودام کا طریقہ رائج کرنا چاہیئے جس میں ایک سال تک کاشتکار کا غلہ محفوظ رہے اور کوسالی کی کفالت پر مال کی قیمت سے کم روپیہ میسر آنے کا انتظام کیا جائے تاکہ کاشتکار اپنے مال کو کم قیمت پر بیچنے پر مجبور نہ ہو۔

مالگذاری کی ادائی بجائے اسفندار از خورداد کے اسفندار فروردی ، اردی بہشت خورداد تک کی جائے ۔ (اور ان چار مہینوں میں جو کاشتکار جتنی رقم لائے اتنی ہی وصول کرنا چاہیئے) اشیاء خوردنی کی تخم ریزی کے متعلق جو رعایت سرکار نے رکھی ہے اس میں اس طرح ترمیم کرنی چاہیئے جو کاشتکار اپنی زمین میں اشیاء خوردنی کی کاشت کرے گا اس قدر زمین کے محاصل میں بہ حساب فی روپیہ چار آنہ کمی کی جائے گی ۔

جس طرح بیوپاریوں کو پرمٹ دے کر ملک سرکار عالی سے علاقہ انگریزی میں برآمد کرنے کی اجازت دیجا رہی ہے اسی طرح کاشتکاروں کو اپنی پیداوار برآمد کرنے کی بھی اجازت ملنی چاہیئے ۔

ان امور پر اگر فوری توجہ کی جائے تو ممکن ہے کہ دوران جنگ میں قیمتوں کے اضافہ سے کاشتکاروں کو کافی منفعت حاصل ہوسکے فقط

معاشی کتب خانہ

معاشی کمیٹی کی جانب سے ایک معاشی کتب خانہ قائم کیا گیا ہے ۔ یہ کتب خانہ حیدرآباد میں اپنی نوعیت کا اکیلا ادارہ ہے ۔ عامتہ الناس بھی اس کتب خانہ سے استفادہ کرسکیں گے
ہمدرد اصحاب کتب خانہ میں اضافہ کتب وغیرہ پر توجہ فرمائیں تو
باعث شکریہ ہوگا ۔

حکومت اور زمانۂ جنگ کے معاشی مسائل

از جناب احمد عبدالعزیز صاحب ایم اے لکچرار معاشیات گلبرگہ کالج

آج کل حکومت حیدرآباد کو زمانۂ جنگ کے معاشی مسائل سے فراہمی اور تقسیم اجناس خوردنی کے مسئلہ کو حل کرنے کی سخت ضرورت پیش آرہی ہے، جس کی وجہ سے حکومت سرکار عالی نے ایک باقاعدہ نگرانی نرخ اشیاء کا علحدہ محکمہ قائم کردیا ہے جو اپنے فرائض کو ممکنہ حد تک خوش اسلوبی سے انجام دینے کی سعی میں مصروف نظر آتا ہے مگر یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ اجناس خوردنی کی فراہمی اور تقسیم کے انتظامات ابھی وہ اطمینان بخش صورت اختیار نہ کرسکے کہ جن کی بناء پر رعایائے سرکار عالی سکون کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوسکے۔ مہذب اور متمدن ممالک میں جو جنگ کی آگ کی لپیٹ میں آچکے ہیں ایسی موثر تدابیر فراہمی و تقسیم غلہ کے متعلق اختیار کی گئی ہیں کہ جن کی وجہ سے ہر امیر و غریب شخص کچھ نہ کچھ قوت لایموت حاصل کرہی لیتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مساعی جنگ میں مناسب حصہ لینا جب حکومت سرکار عالی نے اپنا مسلک قرار دیا ہے تو مساعی جنگ کو صحیح اصول پر جاری رکھنے کے لئے سب سے زیادہ موثر تدبیر کون سی ہوسکتی ہے؟ ہمارے خیال میں بہ حالات موجودہ سب سے زیادہ موثر تدبیر غلہ کی فراہمی اور مقررہ قیمت پر اس کی مناسب تقسیم بھی ہے، آج کل حکومت سرکار عالی نگرانی نرخ اشیاء کی حکمت عملی پر عمل کررہی ہے، لیکن حالات جنگ اس سے زیادہ آگے قدم بڑھانے کے مقتضی ہیں، عام طور سے نگرانی نرخ اشیاء کا یہ مفہوم سمجھا جاتا ہے کہ صرف اشیاء خوردنی کے نرخ کی نگرانی کی جائے اور اس سے زیادہ تجارتی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ خیال بالکل مضحکہ خیز ہے کیوں کہ محض نگرانی نرخ سے وہ

اصلی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جس کو حکومت رعایا میں امن و امان برقرار رکھنے کے لئے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اشیائے مایحتاج کی فراہمی کے علاوہ ان کی مناسب تقسیم اور پھر مقررہ قیمت پر ان کی فروخت ہی وقت کا سب سے زیادہ قابل توجہ مسئلہ ہے، نگرانی نرخ اشیار کا مطلب صرف قیمتوں کی نگرانی نہیں بلکہ ان کی مناسب فراہمی اور بخوبی تقسیم کا انتظام بھی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک مرکزی نظام کے قیام کی ضرورت ہے جس کو عام طور سے محکمہ ماکولات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ابھی تک یہہ محکمہ حکومت سرکار عالی کے جانب سے قائم تو نہ ہو سکا، البتہ بطور بدل محکمہ نگرانی نرخ اشیار کا قیام عمل میں آیا ہے۔ جو اپنا کام بہر حال انجام دے رہا ہے واضح رہے کہ مسائل ماکولات کو حل کرنے کے لئے ایک باقاعدہ محکمۂ ماکولات کا قیام ہی نہایت مناسب ہوگا۔ خود انگلستان میں اور حال ہی میں حکومت ہند نے محکمۂ ماکولات کے قیام کی منظوری دیدی ہے۔ اب تک مسائل اشیائے قوتی کو حل کرنے کی جو منتشر کوشش کی گئی وہ بالکل ضرویات ملک کے لحاظ سے ناکافی ثابت ہوئی کیونکہ ان تمام تدابیر کو بیک وقت اختیار کرنے کی مستقل کوشش نہیں کی گئی جو فراہمی و تقسیم غلہ کے لئے ضروری تھیں اب ذیل میں وہ تمام تدابیر تفصیل سے بیان کی جاتی ہیں جو فراہمی و تقسیم غلہ کے مسائل کے حل کے لئے ضروری ہیں۔

اوّل فراہمی غلہ کا جہاں تک تعلق ہے کاشتکاروں کو بجائے صنعتی پیداواروں کے قوتی پیداواروں کی کاشت کی زیادہ سے زیادہ ترغیب دی جائے اور کیمیاتی اصول پر کاشت کے لئے مناسب کھاد کے استعمال کے طریقے منجانب محکمۂ زراعت عمل میں لائے جائیں۔ کاشتکار کو مالی امداد اس طریقے پر دیجائے کہ امداد کا مقصد فوت نہ ہونے پائے مثلاً یہہ کہ محکمۂ زراعت کے ناظروں کی نگرانی میں تقاوی قرضوں کی تقسیم عمل میں آئے اور ایسے کھیتوں کی روزآنہ نگرانی کی جائے جن کی فصل کو سرکاری امداد دی گئی ہے۔ آبپاشی کی سہولتوں کی فراہمی بھی اس سلسلہ میں ضرور قابل ذکر ہے جہاں جہاں چاہیے آبپاشی کی جائے وہاں حیوانات زرعی کے چارہ کی فراہمی اور ان کے امراض متعدی کے بروقت علاج و انسداد کی جانب بطور خاص توجہ کی جائے۔ ”زیادہ غلہ اگاؤ“ کی مہم صرف ایسی ہی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے جبکہ کاشتکار کے ساتھ مخلصانہ اشتراک عمل کیا جائے اس کے بعد پھر یہہ سوال پیدا ہوتا ہے،

کہ فصل تیار ہونے کے بعد کیا کاشتکار کو ساہوکار کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے یا حکومت خود فصل خریدے؟ ہمارے خیال میں اگر حکومت سرکار عالی مثل ممالک متحدہ امریکہ کی حکومت کے مقررہ قیمت پر راست کاشتکار سے غلہ خرید لینے کی مستحسن کوشش کرے تو فراہمی غلہ کا مسئلہ ایک مرکزی نظام محکمۂ ماکولات سرکار عالی کی نگرانی کے تحت صحت بخش اصولوں پر حل ہو سکے گا اور غریب کاشتکار ساہوکار کی نفع اندوزی کا بری طرح شکار نہ ہوگا۔ حال ہی میں حکومت ہند نے فراہمی گیہوں کے لئے ایک کمشنر کا تقرر کرکے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ جملہ پنجاب کی تیار ہونے والی گیہوں کی فصل کو خود خرید لے گی اور محکمۂ ماکولات حکومت ہند کے زیر نگرانی گیہوں کی فراہمی و تقسیم کا مسئلہ حل کیا جائے گا یہ واقعہ ہے کہ درمیانی تاجر اور غلہ فروش بنیوں کے گماشتے من مانی قیمت پر کاشتکار سے غلہ خریدتے ہیں اور معقول قیمت پر اس کو فروخت کرتے ہیں اس نازک صورت حال کا مناسب انسداد نہایت ضروری ہے ورنہ "زیادہ غلہ اگاؤ" کی مہم کا کوئی خاطر خواہ مقصد حاصل نہ ہوگا۔

دوم غلہ کی فراہمی کے سلسلہ میں سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ملک کے قوتی اشیاء کے ذخائر کے صحیح اعداد و شمار حاصل کئے جائیں یعنے اس امر کا پتہ چلایا جائے کہ کس تعلقہ یا ضلع یا صوبہ میں کتنے ہزار یا کتنے لاکھ انسان کس قسم کے غلہ کی کاشت کرتے ہیں اور اس غلہ کی فصل کی کیا سالانہ مقدار ہوتی ہے اور اس علاقہ میں بسنے والے باشندے خود کس قسم کی غذا کے عادی ہیں۔ سالانہ مقدار پیداوار کو آبادی کے تعداد پر تقسیم کیا جائے تو کتنا غلہ کم یا زیادہ ہو سکتا ہے۔ زیادہ غلہ کسی قریبی تعلقہ یا ضلع میں منتقل کیا جاتا ہے یا بطور ذخیرہ کاشت کار مناسب قیمت کے حاصل ہونے تک جمع رکھتا ہے۔ الغرض ان مذکورۂ بالا مسائل کا بہترین حل ضرور دریافت کرنا چاہئے۔ جب تک غلہ کے ذخیروں کے صحیح اعداد و شمار دریافت نہ کئے جائیں، فراہمی غلہ اور تقسیم غلہ کی کوشش کبھی بھی سرسبز نہ ہو سکے گی۔ اس سلسلہ میں اس امر کا اظہار بھی بیجا نہ ہوگا کہ سرکاری طور پر اس امر کا سختی سے اعلان کر دیا جائے کہ اگر کوئی ساہوکار یا کاشتکار غلہ کے ذخیروں کو پوشیدہ رکھے اور ان کی صحیح مقدار سے حکومت کو مطلع نہ کرے تو ایسے دشمنان ملک و ملت شخص کو اس جرم کی پاداش میں چھ ماہ کی سزائے قید دیجائے گی۔ اس کے

علاوہ محکمۂ کوتوالات کی جانب سے جو بھی عملہ مقرر ہو اس کو اس امر کی ہدایت کیجائے کہ وہ عوام میں ایسے خیالات کی نشر و اشاعت کرے کہ جن کی بنا پر لوگوں میں جنگ کے مصائب اور پریشانیوں کا مقابلہ کرنے کی اخلاقی قوت پیدا ہو جائے خصوصاً غلہ فروش ساہوکار طبقے کو ناجائز نفع اندوزی سے پرہیز کرنے کی اس لئے ترغیب دی جائے کہ ملک میں امن و امان قائم رہ سکے اور مفلس، نادار اور بھوکے لوگ لوٹ مار اور ڈکیتی کے جرائم کا ارتکاب نہ کر سکیں، یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ بھوکا آدمی قیام امن و امان کے حق میں بے حد خطرناک ہوتا ہے اور ایک بھوکے آدمی کے ہمسائے میں کبھی ایک مالدار ساہوکار امن اور آسودگی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ بہت ممکن ہے کہ بھوک سے تنگ آکر ایک غریب آدمی ایک خودغرض ساہوکار یا مہاجن کے غلہ گودام کو دن دہاڑے لوٹ لے۔ اور اس طرح امن و امان میں خلل پیدا کرے۔ یہ واقعہ ہے کہ ریاست سرکار عالی کے اکثر مقامات پر لوٹ مار اور ہنگاموں کے جو واقعات پیش آئے ہیں وہ زیادہ تر غلہ کے ذخیروں پر حملوں کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں اس لئے ملک کے امن و امان کو بحال رکھنے کی شدید ضرورت کے مدنظر نہ صرف غلوں کے ذخیروں کے صحیح اعداد و شمار حاصل کئے جائیں، بلکہ ذخیرہ پوشیدہ رکھنے والوں کے خلاف موثر تدابیر بھی اختیار کی جائیں۔

سوم ذرائع رسل و رسائل میں سہولت پیدا کرنے کا غلہ کی فراہمی سے بہت ہی گہرا تعلق ہے۔ اس خصوص میں محکمۂ ریلوے کے تعاون عمل کی شدید ضرورت ہے یہ بالکل ظاہر ہے کہ لاکھوں ٹن غلہ بعجلت ممکنہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک صرف اسی صورت میں منتقل ہو سکتا ہے جبکہ ریلوے واگنوں کے غلہ کی منتقلی کے لئے بر وقت فراہمی عمل میں آسکے۔ اس موقع پر اس امر کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ محکمۂ ریلوے کی ناگزیر خدمات حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے غلے کی صحیح مقدار سے ریلوے بورڈ کو واقف کرایا جائے وہ اس طرح کہ اگر ایک تعلقے کے مستقر سے دوسرے تعلقے کے مستقر یا ضلع کے مستقر یا صوبہ کے مستقر پر تیزی کے سے منتقل کیا جانا ضروری ہے تو فوراً مقدار غلہ کے علاوہ کس وقت کس مقام پر کون سا غلہ منتقل کیا جائے۔ الغرض اس قسم کی

صراحت کی بھی سخت ضرورت ہے، یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ غلہ منتقل کرنے کے کم از کم پندرہ روز پیشتر ریلوے حکام کو واگنوں کی فراہمی کے متعلق منجانب عہدہ داران محکمۂ ماکولات مطلع کردیا جائے تاکہ ہر کام اطمینان اور سہولت کے ساتھ انجام پائے۔

چہارم غلے کی فراہمی کے سلسلہ میں یہ بات بھی بہت زیادہ غور طلب ہے کہ جب ملک کے قوتی ذخائر کے صحیح اعداد و شمار حاصل کرلئے جائیں اور ملک کے باشندوں کی سالانہ قوتی پیداواروں کے مقداروں کے صرفے کا صحیح اندازہ معلوم کرلیا جائے تو اس وقت زائد غلہ بیرون ملک روانہ کرنے کے مسئلہ پر غور کیا جاسکتا ہے چونکہ حکومت سرکار عالی میں ابھی جملہ قوتی پیداواروں کے صحیح اعداد و شمار کا پورا پتہ چل نہ سکا اور بہت ممکن ہے کہ پورا پتہ ملنے تک کافی عرصہ درکار ہو، اس لئے ہمارے خیال میں یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یک لخت بحالت موجودہ بیرون ملک غلے کی برآمد کو فوراً روک دیا جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض حکام ضلع کی ناعاقبت اندیشی کی بدولت کثیر مقدار میں غلہ ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں پہونچکر وہاں سے سرحدی جاگیراتی علاقوں کے حکام کی چشم پوشی کی وجہ سے بیرون ریاست سرکار عالی غلے کی کثیر مقدار منتقل ہوگئی اور اس طرح سرکار عالی کے اکثر اضلاع میں قحط غلہ کی صورت پیدا ہوگئی جس کا نتیجہ غلہ فروش دکانوں کی لوٹ مار کی صورت میں ظاہر ہوا لہذا اب ضرورت اس امر کی ہے کہ آئندہ لوٹ مار کے ناخوشگوار واقعات کے مناسب سد باب کے لئے فی الحال ہر قسم کے غلے کی برآمد کو ممنوع قرار دیا جائے اور اگر ہمسایہ صوبوں کی امداد بوجہ قحط غلہ ضروری سمجھی جائے تو بطور انسانی ہمدردی ایسا ہی غلہ برآمد کیا جائے جس کی مقدار علاقہ سرکار عالی میں ضرورت سے زیادہ ہو اور جس کے برآمد کرنے سے خود رعایا سرکار عالی کو فاقہ کشی کی زندگی بسر کرنا نہ پڑے۔

پنجم فراہمی غلہ کے سلسلہ میں مقررہ قیمتوں پر نگرانی بھی نہایت ضروری ہے۔ اگر مناسب قیمت پر غلہ خریدنے کی نگرانی کی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص مقررہ قیمت پر اپنی ضرورت کے لحاظ سے غلہ خرید سکے گا اور خود حکومت کو فراہم شدہ غلے کی فروخت کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی جس طرح مساعی جنگ میں حکومت سرکار عالی نے دل کھول کر لاکھوں کروڑوں روپیوں کی امداد کرکے حصہ لے رہی ہے

اسی طرح مساعی جنگ کو کامیابی سے جاری رکھنے کی خاطر غلے کو خود خرید کر بلدہ حیدرآباد میں ایک مرکزی گودام تقسیم غلہ قائم کرے اور اگر یہ ناممکن ہو تو کم از کم ہر مستقر تعلقہ، مستقر ضلع، مستقر صوبہ پر ضرور اس علاقہ میں پیدا ہونے والے غلے کے گودام قائم کئے جائیں اور اس طرح مقامی ضروریات فراہمی و تقسیم غلہ کی خوشگوار طریقہ پر تکمیل کی جائے اگر موثر نگرانی اشیاء کے نرخ پر قائم کرنا ضروری ہے تو بغیر غلہ کے ذخائر کے ایک مرکزی نظام کے قیام کے یہ تخیل عملی صورت اختیار نہ کرسکے گا۔ الغرض یہی وہ تجاویز ہیں جن پر خلوص دل کے ساتھ عمل کیا جائے تو فراہمی غلہ کا دشوار مسئلہ آسانی کے ساتھ حل ہوسکے گا۔

جہاں تک غلہ کی مناسب تقسیم کا تعلق ہے اس امر کا اظہار نامناسب نہ ہوگا کہ سب سے پہلے اس خصوص میں ذرائع حمل ونقل کی امکانی سہولتیں پیدا کی جائیں جیسا کہ اس سے پیشتر کہا جاچکا ہے کہ صحیح اعداد وشمار مقدار غلہ کی فراہمی کے بعد حمل ونقل کی امکانی سہولتوں کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ حالیہ واقعات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ محض غلہ کا پیدا کرنا ناکافی نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ غلہ کی مناسب تقسیم نہایت ضروری ہے۔ صوبہ جات متحدہ آگرہ واودھ اور صوبۂ پنجاب میں غلہ کثیر مقدار میں بطور ذخیرہ موجود ہے لیکن جنگ کی وجہ سے حمل ونقل کی دشواریاں غلہ کی نامناسب تقسیم میں زبردست مزاحمت پیدا کررہی ہیں اس لئے اس خصوص میں سب سے زیادہ محکمہ ریلوے کے تعاون عمل کی سخت ضرورت ہے جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے بھوکی پبلک سے امداد جنگ کے کاروبار کی انجام دہی میں کوئی مناسب اور طمانیت آفریں حصہ نہیں لے سکتی اس لئے کم از کم مساعی جنگ کو کامیاب منزل تک پہنچانے کی خاطر نہ صرف فوجی ضروریات کے تحت ماکولات کی منتقلی محاذ جنگ کو کشوری ضروریات فراہمی ماکولات پر ترجیح نہ دی جائیں بلکہ محکمۂ ماکولات کے تحت ایک ایسا مرکزی نظام فراہمی وتقسیم غلہ قائم کیا جائے جو نہ صرف فوجی بلکہ کشوری ضروریات اجناس خوردنی کا مناسب لحاظ رکھے اور جو نہ صرف میدان جنگ میں لڑنے والوں کی ضروریات خوراک کا لحاظ نہ کرے بلکہ لڑنے والوں کی مدد کرنے والے دیہات کے کاشتکار اور شہروں میں فوجی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور ماہرین انصرام جنگ کی شکم سیری کی احتیاجات کا لحاظ مناسب کرے یہ بالکل ایک بدیہی بات ہے کہ دشمن سے کہیں

زیادہ بھوکی رعایا جنگ کی کامیابی کے معاملہ میں خطرناک ہوتی ہے۔ لہذا جنگ کو کامیابی سے ختم کرنے کی شدید ضرورت کے مدنظر فراہمی اشیائے ماکولات سے کہیں زیادہ تقسیم اشیائے ماکولات کا مسئلہ اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے اب وقت آگیا ہے کہ غلہ کی مناسب تقسیم کے مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے برائے نام غلہ کی قیمتوں پر نگرانی بر حالت کی جائے اور اجناس خوردنی پر صد فی صد نگرانی قائم کی جائے تقسیم غلہ کی موجودہ مشکلات کے مناسب حل اور خاطر خواہ انسداد کے لئے ذیل میں تین تدابیر بیان کی جاتی ہیں جن پر اگر پرخلوص طریقے سے عمل کیا جائے تو تقسیم کی مشکلات یقیناً رفع ہو جائیں گی۔

اوّل کل ہند نظام تقسیم غلہ کے اصول پر کل حیدرآباد نظام تقسیم غلہ کے قیام کی سخت ضرورت ہے اور یہ نظام محکمہ ماکولات کے تحت قائم کیا جا سکتا ہے اس نظام کے قیام سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ نہ صرف شہری ضروریات بلکہ دیہی ضروریات اشیائے ماکولات کا بھی کافی لحاظ رکھا جا سکے گا اب تک تو ایسا ہوتا آیا ہے کہ حکومت سرکار عالی نے زیادہ تر بلدۂ حیدرآباد اور تقریباً صوبہ جات ریاست سرکار عالی کی حد تک فراہمی و تقسیم غلہ کے انتظامات کی جانب اپنی توجہ مبذول کی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ دیہات جو غلہ کی پیداوار کا مرکز سمجھے جاتے تھے اب غلہ کی مقدار کی کمی کو بری طرح محسوس کر رہے ہیں اور پریشان حال بھوکی آبادی تدریجاً شہروں کی جانب منتقل ہوتی جا رہی ہے حالانکہ شہری آبادی دیہی آبادی کے مقابل میں ۱/۱۰ حصہ بیں نہیں ہے پس یہ کسی طرح قرین انصاف تصور نہیں کیا جا سکتا کہ قلیل شہری آبادی کے خاطر کثیر دیہی آبادی کے اجناس خوردنی کی سربراہی پالیسی و عمل سے کام لیا جائے۔

دوّم کسی مخصوص قوتی پیداوار کی فراہمی اور تقسیم کے جملہ مدارج کی سہولت بخش تنظیم کا فی تصور نہیں کی جا سکتی بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے تمام اجناس خوردنی کی فراہمی پر موثر نگرانی اور تقسیم کے انتظامات کی موجودگی ضروری ہے جن کے استعمال کے مختلف اضلاع سرکار عالی میں بسنے والے عوام سالہا سال سے عادی ہو چکے ہیں اس خصوص میں اس امر کا اظہار بھی نامناسب نہ ہوگا کہ عوام کو ترغیب دی جائے کہ وہ اشیائے ماکولات کی مناسب پیداوار کے اصول کی دقتوں کے مدنظر

بطور بدل بجائے شکر کے گڑ کا اور بجائے جوار کے باجرہ کا استعمال شروع کردیں اور اسی طرح بجائے گرنی میں صاف کئے ہوئے چاول کے ہاتھ سے کوٹے ہوئے چاول کو ترجیح دیں ۔

سوم طلب و رسد کے مسائل حل کرنے والے افراد میں کامل ہم آہنگی اور تعاون عمل کی شدید ضرورت ہے ۔ اور یہہ بات محض کانفرنسوں کے انعقاد سے حاصل نہیں ہوسکتی ۔ اس کے لئے ہمدردی ایثار اور جوش عمل کی فراوانی کی سخت ضرورت ہے ۔ تقسیم اشیائے خوردنی کا مسئلہ ایک موثر نگرانی کا طالب ہے اس لئے محکمۂ ماکولات کے تحت ایک مرکزی تقسیم غلہ مجلس کے قیام کی بلدہ میں سخت ضرورت ہے جس کے اراکین میں نہ صرف محکمۂ ماکولات کی وزارت کے ذمہ دار ارکان ہوں بلکہ جاگیرات صرفِ خاص سمستان ، اور پائیگاہوں کے نمایندے بھی ہوں اس مرکزی مجلس غلہ کے اراکین میں ایوان تجارت حیدرآباد کا ایک نمایندہ بھی ہو اور محکمۂ ریلوے کا ایک ماہر حمل و نقل عہدہ دار بھی ہو اور اس مرکزی مجلس تقسیم ماکولات کا یہہ فرض ہوگا کہ وہ روزآنہ جنگ کی وجہ سے تغیر پذیر حالات کا بغور مطالعہ کرتی رہے ۔ اور تقسیم ماکولات کی پیچیدگیوں کو رفع کرنے کے لئے کم از کم ہر ماہ دو مرتبہ اپنا اجلاس منعقد کرتی رہے ۔ واضح رہے کہ صدر مجلس تقسیم ماکولات کا ہر وہ رکن جو اپنے اپنے صوبہ یا ضلع کی نمایندگی کرنے کے قابل ہو اور دیگر یہہ کہ ہر وہ رکن جو سمستان ، مجلس جاگیرداران اور پائیگاہوں کی طرف نمایندگی کرتا ہو اس کا بھی یہہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے متعلقہ علاقہ کی ذیلی مجلس تقسیم ماکولات سے باقاعدہ ربط قائم رکھے اور اپنے ضلع یا صوبہ یا جاگیراتی سمستانی پائیگاہی علاقہ کے مسائل تقسیم ماکولات کی دقتوں یا سہولتوں سے بخوبی واقف ہو کر اپنے سنجیدہ خیالات کو بطور مشورات مرکزی مجلس ماکولات بلدہ کے اجلاس میں وقتاً فوقتاً پیش کرتا رہے اسی طرح ہر تعلقہ یا تعلقہ واری مجلس فراہمی و تقسیم اشیائے خوردنی کی جائے پھر مجلس ماکولات تعلقہ کا نمائندہ ہر تعلقہ ضلع کی مجلس ماکولات میں اپنے اپنے تعلقہ کے مسائل ماکولات کو وضاحت کے ساتھ پیش کرے اور مجلس ضلع میں کل ضلع بھر کے تعلقہ جات کے مسائل فراہمی و تقسیم غلہ کے متعلق کافی غور و خوض کیا جائے اسی طرح ہر مستقر صوبہ پر اس صوبہ کے جملہ اضلاع کے مجالس ماکولات کے نمایندے کم از کم مہینے میں دو مرتبہ زیر صدارت صوبہ دار وقت مجلس ماکولات صوبہ کے

اجلاس میں شرکت کریں اور اپنے اپنے ضلع کے مشکلات فراہمی غلہ کو وضاحت کے ساتھ پیش کرے اسی طرح ہر مستقر صوبہ کا ایک ذمہ دار نمائندہ صوبہ بھر کی مشکلات فراہمی و تقسیم غلہ کو صدر مجلس ماکولات مستقر بلدہ میں بوقت انعقاد اجلاس پیش کرے۔ الغرض اس طرح ایک مربوط اور مستحکم نظام ماکولات کے قیام سے وزارت ماکولات سرکار عالی کو ملک بھر کے ماکولاتی مسائل سے بہترین طریقے سے واقف ہونے کا موقع ملتا رہیگا جس طرح ہر ضلع اور تعلقہ میں مجالس امداد جنگ قایم کی گئی ہیں۔ وران مجالس کے ارکان میں وکیل، تاجر، مالکان کارخانہ جات مختلفہ اور سرمایہ دار شامل ہوکر رہا جن ہیں اسی طرح مجلس ماکولات تعلقہ و ضلع کے ارکان میں ساہوکار، زمین دار اور صاحب حیثیت، پٹہ دار، کاشتکار افراد کے علاوہ عہدہ داران مال ضرور شامل ہوں جب تک ایسا مکمل نظام اشیائے ماکولات کی تنظیم کے لئے قائم نہ ہوگا اس وقت تک محض عملی یا حیدرآباد میں بیٹھ کر کوئی وزارت ماکولات اپنے فرائض مفوضہ کو صحت بخش طریقہ پر انجام نہیں دے سکتی۔ ہمارے خیال میں حسب ذیل قوتی اور غیر قوتی اشیاء کی قیمتوں پر سرکاری نگرانی فوراً قائم کرنا ضروری ہے۔ خصوصاً مذکورہ ذیل قوتی پیداواروں کی برآمد اگر ختم جنگ تک ممنوع قرار دیجائے تو نہایت مناسب ہوگا تاکہ ریاست سرکار عالی کی رعایا اپنی ضروریات زندگی کی فراہمی میں غیر معمولی مشکلات سے نجات حاصل کرسکے گیہوں، جوار، چاول، شکر، باریک دانے والا غلہ جیسے باجرا، مونگ، چنا، تور، مسور، گھی، گڑ، تل مونگ پھلی، کرڑ کے تخم، کاغذ، گیاس کا تیل، دیا سلائی، صابن، انڈے، خشک شدہ سوتی پارچہ یا ارزاں معیاری پارچہ، ہیزم سوختنی، کوئلہ زغالی، آج کل اضافہ اجرت مزدوروں کا مسئلہ بیحد اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنیکی واحد صورت یہ ہے کہ اشیائے ماکولات کی فراہمی اور تقسیم میں سہولت پیدا کی جائے۔ غلہ کی قیمت مقرر کردی جائے اور ناجائز نفع اندوزی کی مناسب روک تھام کی جائے۔ ان تدابیر کے اختیار کرنے سے یقین ہے کہ صنعتی مزدوروں کی بے چینی جو گرانی کی وجہ سے بڑھتی جا رہی ہے بہت بڑی حد تک گھٹ جائیگی۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اجرتوں کی کمی زیادتی کا معیار غلہ کی ارزانی و گرانی ہے۔ اگر غلہ ارزاں رہا تو کم اجرت پر کام کرنے کے لئے مزدور تیار ہوجاتے ہیں لیکن اگر غلہ گراں ہوجائے تو مزدور زیادہ اجرت کا طلبگار ہوتا ہے اور جب مزدور کے اضافہ اجرت کے مطالبہ کو مسترد کیا جاتا ہے تو ہڑتالوں کی صورت پیش آتی ہے۔ بہرحال اضافہ قیمت پیداوار کی مناسب روک تھام کیلئے غلے کی قیمت کا مقرر کردیا جانا نہایت ضروری ہے اس سے نہ صرف کاشتکار کو مناسب فائدہ حاصل ہوگا بلکہ ساہوکار بھی ناجائز نفع اندوزی کی جرارت نہ کرسکیگا کیونکہ مقررہ قیمت پر اگر خود حکومت کاشتکار کا غلہ اس کے کھیت ہی پر خریدنے

تیار ہو جائے اور کھاد کی فراہمی تقاوی رقم کی امداد اور آبپاشی کی سہولتیں مہیا کر دیجائیں تو یقین ہے کہ "زیادہ غلہ اگاؤ" کی مہم کامیاب طریقہ پر جاری کی جا سکتی ہے۔ صحیح اعداد و شمار ذخائر غلہ کی فراہمی کے ساتھ ہی ساتھ محکمہ ریلوے کے اشتراک عمل سے غلہ کی کثیر مقدار ایک مقام سے دوسرے مقام تک بہ آسانی منتقل کی جا سکتی ہے راتب بندی یعنی راشننگ کا طریقہ بھی اشیائے خوردنی کی مناسب تقسیم کے سلسلہ میں نہایت مفید اور موثر ثابت ہوا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ جب کبھی تو لی پیداوار پر راتب بندی کا قانون جاری کیا جائے تو اس پیداوار کی فراہمی اور تقسیم میں ممکنہ سہولتیں پیدا کرنا نہایت ہی ضروری ہوگا۔ اس سلسلہ میں اس امر کا اظہار بیجا نہ ہوگا کہ زیر نگرانی سرکار غلہ کی ارزان فروشی کی دکانات کا قیام بھی نہایت مفید ثابت ہوا ہے حکومت بمبئی نے اس خصوص میں نہایت ہی مستحسن اقدام کیا ہے۔ یعنی غریب شہری آبادی کی سہولت کے لئے مقررہ قیمت پر شہر کے مختلف محلوں میں سرکاری دکانیں قائم کی گئی ہیں جہاں مقررہ قیمت پر غلہ فروخت کیا جاتا ہے اور اس طرح غلہ فروش ساہوکار طبقہ کو ناجائز نفع اندوزی سے روک دیا گیا۔ بہرحال یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ جنگ کے زمانے میں گرانی کی وجہ عوام کے جذبات ہر وقت مشتعل رہتے ہیں اس لئے گرانی کے مسائل کو حل کرنے کی سخت ضرورت ہے اور اس خصوص میں اشیاء خوردنی و ضروریات حیات کی فراہمی اور مقررہ قیمتوں پر ان کی تقسیم اور فروخت کا طریقہ عمل دراصل جنگ کو کامیاب منزل تک پہنچانے کا بہترین حل ثابت ہوگا پس حکومت سرکار عالی کا فرض اولین یہ بات ہونی چاہیئے کہ مسائل ماکولات کو صحت بخش اصول پر حل کرنے کے لئے وزارت ماکولات کا قیام عمل میں لائے جس کے تحت فراہمی و تقسیم اشیائے خوردنی و دیگر ضروریات حیات کی سربراہی کے صحت بخش انتظامات کا عمل ہو۔ اس خصوص میں کسی قسم کی نامناسب تاخیر کو گوارا نہ کیا جائے۔

ہماری بارگاہ رب العزت میں یہی دعا ہے کہ رعایائے سلطنت آصفیہ آقائے ولی نعمت اعلیحضرت بندگان عالی کے زیر سایہ اس ہولناک عالمگیر جنگ کے پر آشوب دور میں امن و امان کی زندگی بسر کرے!

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

صدر معاشی کانفرنس کی اختتامی تقریر

از جناب مولوی محمد الیاس برنی صاحب

پانچویں معاشی کانفرنس میں جو مقالے پڑھے گئے اور تقریریں کی گئیں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے دوسرے اجلاس کے اختتام پر صدر جلسہ مولوی محمد الیاس برنی صاحب نے جو تقریر فرمائی اس کو مختصر نویس جستہ جستہ قلمبند کر سکے چنانچہ اس کا مختصر خلاصہ بعض خاص عنوانات کے متعلق ذیل میں درج ہے۔

معاشی مباحث کے جلسوں میں عام شرکت کا ذکر کرتے ہوئے فاضل صدر نے فرمایا کہ :-

عمرانی زندگی کے جو دیگر شعبے ہیں مثلاً قانونی۔ یا سیاسی۔ ان شعبوں سے صرف خاص خاص موقعوں پر خاص خاص افراد یا طبقوں کو راست سابقہ پڑتا ہے۔ لیکن عمرانی زندگی کا معاشی شعبہ سب سے زیادہ عام ہے۔ امیر، غریب، بوڑھے، بچے، عالم، جاہل، سب کو اس شعبہ سے ہر وقت راست سابقہ رہتا ہے اور یہ سابقہ عادت میں داخل ہو جانے کے سبب کسی خاص توجہ کا محتاج اور مستحق نہیں سمجھا جاتا۔

واضح ہو کہ جسمانی زندگی کی تین حالتیں ہیں ایک اوسط حالت جو صحت کہلاتی ہے اور دو انتہائی حالتیں ہیں ایک بیماری اور کمزوری دوسری ورزش و شہ زوری، اوسط حالت یعنے صحت کا علم عام ہوتا ہے اور عام ہونا چاہیئے البتہ انتہائی حالتوں کا علم خاص طبقوں تک محدود رہتا ہے۔ چنانچہ بیماری اور کمزوری اور ورزش و شہ زوری کا علم طبی کالجوں، طبیبوں، ڈاکٹروں، ورزشی اداروں، اور فن ورزش کے ماہروں، سے تعلق رکھتا ہے۔ شفاخانوں دواخانوں، ورزش گاہوں، اور بازی گاہوں میں ان علوم کا عمل نظر آتا ہے۔ عام لوگوں کو یہ علوم حاصل نہیں رہتے۔ البتہ وہ اہل علم کے مشوروں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اٹھاتے ہیں۔ یہی حال معاشی زندگی کا بھی ہے یعنے اوسط حالت عام مرفہ الحالی ہے۔

اور انتہائی حالتیں دو ہیں۔ پراگندہ ناداری، یا کثیر سرمایہ داری، عام طبقوں میں معاشی بیداری پھیلانے کے واسطے عام مرفہ الحالی کے عام اصول عام فہم پیرایہ میں پیش کرنا مفید مطلب ہو سکتا ہے۔ خاص کر ابتدائی مراحل میں جبکہ معاشی ناواقفیت عام ہو یہ طریق ناگزیر ہے۔ رہیں باقی دو حالتیں یعنی پراگندہ ناداری، اور کثیر سرمایہ داری، یہ مباحث علمی اور عملی جہت سے دقیق اور دشوار ہونے کے سبب معاشی واقفیت کے طالب ہیں۔ یوں دل بہلانے کی دوسری بات ہے، ورنہ ان مباحث کی تعلیم و تفہیم معاشیات کے معلمین اور متعلمین کا حصہ ہے یہ سچ ہے کہ تینوں حالتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ پھر بھی ان کی تفہیم میں تفریق کی گنجائش ہے۔

مفروضات اور ان کی دقتیں ۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ معاشیات کے نظریات مفروضات پر مبنی رہتے ہیں۔ مفروضات جس حد تک غائب ہوں عملی اعتبار سے نظریات اس حد تک بے اصل رہ جاتے ہیں۔ اس ہی سبب سے بعض صورتوں میں نظریات اور عملیات میں نمایاں بُعد نظر آتا ہے جو باعث حیرانی ہو جاتا ہے۔ موجودہ معاشی نظریات تمام تر مغربی ممالک میں مغربی غور و فکر سے صورت پذیر ہوئے ہیں اور اس ہی مناسبت سے ان میں مفروضات مضمر ہیں۔ یہ لازم نہیں کہ وہ مفروضات مشرقی ممالک میں بھی اسی درجہ اصلیت رکھتے ہوں ممکن ہے کہ یہاں دوسرے مفروضات زیادہ قریب حقیقت ہوں اور ان مفروضات کی بناء پر نظریات بھی کم و بیش مختلف شکل اختیار کریں۔ بہرحال مفروضات کے تعلق سے نظریات میں لازمی اضافیت رہتی ہے۔ لیکن عام طور پر مفروضات نامعلوم یا نظر انداز ہونے کے سبب نظریات کے بے محل انطباق کی توقع اور کوشش کی جاتی ہے جس سے لامحالہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔

پھر نظریات کے ساتھ عملیات کو لیجیئے تو ان میں وہی تعلق قائم ہے جو اصول کو علاج الامراض سے تعلق حاصل ہے۔ بہرحال درمیانی اجتہاد کی ضرورت ہے۔ مزید برآں ہندوستان کی معاشیات عملی میں سیاسیات کی آمیزش معمول سے بڑھی رہتی ہے اور فنی نظر کے بغیر اس آمیزش کا پتہ چلانا دشوار ہے۔ اس لئے معاشیات کے عملی وسائل کا سلجھاؤ خاص بصیرت کا طالب رہتا ہے۔

ورنہ مفروضات کی اصلیت اور سیاسیات کی آمیزش کا علم و اندازہ نہ ہونے کے سبب معاشی مباحث اور مشوروں میں خاصی الجھن پڑجاتی ہے۔ خاص کر جبکہ ناواقفیت کے ماحول میں ان کی اشاعت ہو۔

حاصل کلام یہ کہ اگر معاشی اصول و مسائل سے عام دلچسپی اور واقفیت پیدا کرنی مقصود ہو کہ ملک میں معاشی بیداری پھیلے تو فن کے دقیق اور پیچیدہ مسائل سطحی رنگ میں پیش کرنا چنداں مفید مطلب نہیں ہوتا کہ اس سے ناواقفوں میں یا تو نافہمی کی مایوسی پیدا ہوتی ہے یا کم فہمی کی مرعوبیت یا بہرخوش فہمی کا مغالطہ پھیلتا ہے۔ بہرحال استفادہ کی گنجایش کم رہتی ہے اس کے برعکس معاشیات کے عام اصول جو عام مرفہ الحالی سے تعلق رکھتے ہوں عام فہم پیرایے میں عام واقفیت کے واسطے شائع ہوتے رہتے ہیں تو معاشی بیداری کی علمی اور عملی رفتار میں ترقی کی امید ہوسکتی ہے۔ ترقی کے ساتھ ساتھ البتہ ممکن اور ضرور ہے کہ مباحث میں نسبتاً وسعت اور رفعت پیدا ہو۔ بہرحال مباحث کی تفہیم میں ذہنیت اور واقفیت کا تناسب ملحوظ رکھنا لازم ہے۔

محاصل بالواسطہ اور بلاواسطہ محاصل اندازی کے سرکاری مسلک پر جو خصوصیت سے بحث کی گئی اس میں چند علمی اعتبارات قابل توجہ ہیں محاصل عائد کرنا، وصول کرنا، اور صرف کرنا یہ جملہ امور فن مالیات میں داخل ہیں اور مالیات کا فن معاشیات میں خاص اہمیت رکھتا ہے اس فن کے ماہر کم دستیاب ہوتے ہیں۔ تفاسیر تو بہت طویل ہیں مختصر یہ کہ محصول اندازی میں چند اصول معیار شمار ہوتے ہیں۔ بالخصوص یہ کہ محصول پیدائش دولت میں مانع اور مزاحم نہ ہو یا یہ کہ وصول کرنے میں محصول کا کوئی قابل لحاظ حصہ ضائع نہ ہو۔ اور مصارف بھی کم لاحق ہوں۔ پھر محصول اندازی کے دو طریق ہیں۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ بصورت اول جس طبقے پر محصول عاید کرتے ہیں اس سے راست وصول نہیں کرتے۔ بلکہ دوسروں کے توسط سے وصول کرتے ہیں۔ بصورت دوم لیا بلا راست عمل میں آتی ہے کن کن صورتوں میں کونسا طریق موزوں و مناسب ہے۔ بجائے خود یہ بھی ایک اہم سوال ہے۔ پھر یہ اطمینان کرلینا بھی ضرور ہے کہ کہیں خلاف منشاء بالواسطہ محصول عادم منتقلی کے سبب بلاواسطہ محصول کی شکل نہ اختیار کرے یا اس کے برعکس بلاواسطہ منتقلی کے

سبب بالواسطہ نہ بن جائے کہ ہر دو صورت میں نادانستہ طور پر ان طبقوں سے محصول وصول ہونے لگے گا جن سے وصول کرنا مقصود نہیں۔ اور وہ طبقے محصول کے بار سے بچے رہیں گے جن سے وصول کرنا مطلوب ہے۔ محصول میں منتقلی اور عدم منتقلی کی یہہ خاصیت اصطلاحات تحدیہ محصول کہلاتی ہے اور اس خاصیت کا عملی مشاہدہ کرنے میں دوربینی اور باریک بینی کی ضرورت پڑتی ہے۔

محصول اندازی کا مسلّمہ مسلک یہہ ہے کہ ملک کے مختلف طبقوں پر حسب حیثیت بار عائد ہونا چاہیئے۔ دولت مندوں پر زیادہ متوسطوں پر کم اور غریبوں پر بہت کم۔ لیکن اگر آمدنی کے حساب سے بیک شرح محصول عاید کیا جائے مثلاً دو فیصد یا چار فیصد وغیرہ تو گرچہ بظاہر اس میں مساوات نظر آتی ہے تاہم جو لوگ قانون تقلیل افادہ اور قدر زر کے مسئلہ سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس نمایشی مساوات میں کس درجہ عدم مساوات مخفی ہے۔ اس ہی سبب محصول آمدنی میں خاص طور پر محصول متناسبہ کے بجائے محصول متزائدہ کا طریقہ رائج ہے۔ یعنے آمدنی زیادہ ہونے کی صورت میں شرح محصول میں بھی اضافہ ہوتا ہے مثلاً ہزار کی آمدنی تک دو فی صد اس کے بعد پانچ ہزار تک چار فیصد اس کے بعد دس ہزار تک پانچ فیصد وقس علیٰ ہذا۔ اس اجمال سے زیادہ تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں۔

مصارف کا مسئلہ پھر محاصل عاید کرنے اور وصول کرنے کے ساتھ محاصل صرف کرنے کا مسئلہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ تو فیر آمدنی سے کیا حاصل اگر صرف آمدنی میں باقاعدگی نہ ہو۔ بڑی سے بڑی رقم اسراف اور فضولیات میں تلف ہوسکتی ہے کہ ملک کو قابل لحاظ فائدہ نہ پہونچے۔ گویا کسی ساگر کا پانی اس طرح بہا دیا جائے کہ اس سے زراعت کی آبپاشی نہ ہوا ور آبادی کی آب رسانی نہ ہو۔ المختصر تحصیل محاصل کا مقصد ہی صرف محاصل ہے اور اس کی باقاعدگی کا معیار یہ ہے کہ ملک کو زیادہ سے زیادہ امداد ملے۔ فائدہ پہونچے اور ظاہر ہے کہ جب تک رفاہ عامہ کی شکلیں پیدا نہ ہوں یہ معیار پورا نہیں ہوسکتا مثلاً پوری مملکت میں دارالسلطنت کا آراستہ و پیراستہ ہوجانا کافی نہیں بلکہ قصبات و دیہات کو بھی زندگی کی واجبی سہولتیں اور راحتیں میسر آنی چاہئیں کہ آبادی کا بڑا حصہ وہیں مقیم ہے اور وہاں سے محاصل کا بڑا حصہ وصول ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے دیہات سدھار اور قصبات سدھار کی تحریکیں بہت ہمدردی اور امداد کی مستحق ہیں۔

کاشتکاروں پر ہمدردی کی جو بارش ہر طرف ہو رہی ہے وہ بڑی حد تک حق بجانب ہے لیکن اس بارش کے بادلوں میں سیاسیات کی بجلیاں بھی روپوش ہیں۔ جو کبھی کبھی چمک کر کڑک سناتی ہیں۔ آیا حکومت زمین کی مالک ہے یا زمیندار مالک ہیں یا کاشتکار مالک ہونا چاہیئے۔ ملکیت کی یہ بحث تاریخی، سیاسی، اور معاشی اعتبار سے اتنی سہل اور سادہ نہیں ہے جتنی کہ کاشتکاروں کی حمایت میں قطعیت سے پیش کی جاتی ہے۔

بہر حال اگر زمین پر کسی کو حق ملکیت حاصل ہو سکتا ہے تو ملک میں قومی مرکز ہونے کی حیثیت سے حکومت سب سے زیادہ اس امانت کی مستحق ہے۔ تاہم کاشتکار کا تعلق بھی زمین کے ساتھ مستحکم رہنا ضرور ہے اور اس کی عملی صورت یہ ہے کہ کاشتکار مالک زمین نہ ہو تو بھی اوس کا زرعی زمین پر قبضہ دیرپا ہونا چاہیئے۔ اگر اس کو زمین سے جلد سے جلد بے دخل کیا جائے یا قبضہ کے معاملہ میں مذبذب رکھا جائے تو زراعت کی ترقی نہ صرف معاشی بلکہ نفسیاتی اعتبار سے بھی دشوار ہے۔ بہر حال قبضہ کے معاملہ میں کاشتکار کو مطمئن رکھنا ناگزیر ہے۔

رہا لگان اور مالگذاری کا سوال اس سے کاشتکار کی تباہ حالی جس درجہ منسوب کی جاتی ہے اس میں ممکن ہے کہ مبالغہ ہو لیکن اصلیت بھی ضرور ہے۔ اور حالات حاضرہ کے مد نظر ترقی زراعت کے خاطر اس میں تخفیف کی ضرورت عام طور پر مسلم ہے۔ تاہم کاشتکار کی تباہ حالی میں زمیندار یا سرکار کو جو الزام دیا جاتا ہے تو ساہوکار کی دست برد بھی کچھ کم قابل انسداد نہیں ہے۔ کاشتکاروں کو اعلیٰ شرح سود پر قرض دینا اور ادنیٰ نرخ پر ان سے زرعی پیداوار خرید نا گاؤں گاؤں ساہوکاروں کا یہی کاروبار ہے اور خستہ حال دیہات اور قصبات میں ساہوکاروں کی خوش حالی گویا اون کے کاروبار کا عملی نتیجہ آنکھوں کے سامنے موجود ہے پس اگر واقعی کاشتکار کی ہمدردانہ امداد مقصود ہے تو ساہوکار سے بآسانی ابتداء ہو سکتی ہے۔ اور ہونی چاہیئے البتہ زمیندار اور سرکار کی شرکت بھی ضرور ہے۔

زمانہ کا تقاضا زمانہ کی جو افتاد ہے اس کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے کہ معمولی حالتوں میں جو غیر معمولی تفاوت پیدا ہو گیا ہے وہ بڑی حد تک رفع ہو کر کم و بیش مساوات کی شکل پیدا ہو۔ خیر یہ تو ایک بڑا سوال ہے۔ تحصول اندازی کی حد تک یہ امر مسلم ہے کہ دولت مند طبقوں کو ملک کی

روزافزوں ضروریات کے مدنظر محاصل کا واجبی بار حوصلہ مندی سے برداشت کرنا ملک کے اور خود ان کے حق میں ہر طرح بہتر ہے اور ان کی رعایتی فیاضی اور بہی خواہی سے ایسے ہی ایثار کی توقع ہے۔ رہا نگرانی مصارف میں شرکت کا سوال مشاورتی مجالس کے ذریعہ اس طریق کی ابتدا ہو چکی ہے ترقی کے ساتھ توسیع ممکن ہوگی۔ لیکن نمایندگی جس پر بیجا طور سے اس قدر زور دیا جاتا ہے اس ہی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جبکہ نمایندوں کا علمی اور خاص کر اخلاقی معیار بلند ہو ورنہ الٹی الجھن پیدا ہونی ممکن ہے۔ چنانچہ ملک میں جا بجا اس کے تجربے بھی ہو چکے ہیں ۔

ایک نمایندگی پر کیا موقوف ہے۔ ملک اور قوم کی ترقی کے سب شعبے جن میں معاشی زندگی کا شعبہ بھی شامل ہے کارگزار انسانوں کے محتاج ہیں۔ کارگزار انسانوں سے مفلس ملک مالا مال ہو گئے اور کارگزاری غائب ہوئی تو بڑی بڑی قدرتی دولتیں بھی ہاتھ سے نکل گئیں۔ وہبی جسمانی صحت دماغی تربیت اور قلبی تہذیب انسانی کارگزاری کے عناصر ہیں ہر قوم میں طالب علم کارگزاری کا سرمایہ ہیں قبل از قبل ان کو سیاسیات میں گھسیٹ کر تلف کرنا ملک کے حق میں بڑا ظلم ہے۔ اور اس ہی وجہ سے تعلیم گاہوں پر نگرانی کی ضرورت بڑھ گئی ہے کہ وہ ایسے مضر اثرات سے محفوظ رہیں اور طلباء تکمیل پاکر نکلیں تو ملک اور قوم کی خدمت دقت پر خوبی سے انجام دیں ۔

بہرحال صحیح طریق پر ملک میں معاشی بیداری پھیلانے کی ضرورت ہے اور بیداری کے ساتھ معاشی زندگی میں اصلاح اور ترقی بھی شروع ہو جانی چاہیئے کہ حصول مقصد کے واسطے قول و فعل کا اتحاد لازم ہے ۔

اس سلسلہ میں فاضل صدر نے مقالوں کے دیگر معاشی مباحث پر بھی تنقیدی روشنی ڈالی اور تقریباً ایک گھنٹہ تبصرہ ہونے کے بعد معاشی کانفرنس کا آخری جلسہ بخیر و خوبی برخاست ہوا ۔

نمایش مصنوعات مملکت آصفیہ
پیامات

ہر ہائینس شہزادی درشہوار دردانہ بیگم صاحبہ پرنسس آف برار

نمایش مصنوعات مملکت آصفیہ کے ملاحظہ سے میں بہت محظوظ ہوئی۔ نمائش کا ایک علمی ادارہ کے زیر اہتمام منعقد ہونا اور جامعۂ عثمانیہ کے فرزندوں کا اس کے استحکام اور ترقی کے لیے کوشاں ہونا ذات شاہانہ کی اس سرپرستی کا ثمرہ ہے جس کے بدولت ملک شاہ راہ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔

مملکت آصفیہ کے معدنی ذخائر صنعتی وسائل اور فنون لطیفہ پر کامل توجہ کئے بغیر نہ قدیم صنعتوں کا احیا ممکن ہے اور نہ جدید صنعتیں قایم ہو سکتی ہیں۔

میری تمنا ہے کہ انجمن طیلسانیین عثمانیہ کی کوششیں بار آور ہوں اور صنعتی ترقی کی توقعات شاہ جم جاہ کے سایۂ عاطفت میں پوری ہوں۔"

ہز ہائی نس حضرت والا شان ولی عہد بہادر دولت آصفیہ

"ممالک محروسہ کے بعض اضلاع سے نمائش کے لئے مصنوعات آنے میں حالات حاضرہ کی مشکلات حائل رہیں لیکن ان کے باوجود اس سال بھی نمایش کا کامیابی کے ساتھ منعقد ہونا اور صوبہ برار کی مصنوعات کا نمائش میں شریک ہونا صنعتی اور معاشی ترقی کے جذبہ اور اس کے ہمہ جہتی ترقی کا بیّن ثبوت ہے جو اس عہد مسعود کا طغرائے امتیاز ہے۔ توجہات شاہانہ ہی تمام برکتوں کا سرچشمہ ہیں۔

مجھے امید ہے کہ حکومت سرکار عالی کے سررشتوں کے تعاون سے صنعتی اور معاشی ترقی کیلئے نوجوانان ملک کی کوششیں ضرور کامیاب ہوں گی۔"

حضرت والا شان جنرل شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر

"صنعتی ترقی معاشی برتری کا زینہ ہے اور معاشی برتری سے قومی فلاح کے دروازے کھلتے ہیں۔

اس مسلمہ نظریہ کی رو سے آج وہی ممالک خوش حال ہیں جنھوں نے اپنی صنعتوں کو آگے بڑھایا۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارا ملک خارجی اسباب کی بنا پر اب تک صنعتی ملک نہیں بن سکا لیکن ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں خود ہماری غفلت پسندی کو بھی دخل ہے۔ موجودہ حالات میں زندگی کے تقاضے بدل رہے ہیں اور ایک عالمگیر کشمکش کا صحیح احساس یہ واضح کر رہا ہے کہ ہم بغیر صنعتی ترقی کے دوسرے ممالک کی صف میں کھڑے نہیں ہو سکتے اور اس ضرورت کو محسوس کئے بغیر اپنا قومی وقار قائم نہیں رکھ سکتے۔

میں ان سرگرم عمل نوجوانوں کو مستحق مبارکباد سمجھتا ہوں جنھوں نے ملکی صنعت کی ترقی کیلئے نمائش جیسے مفید طریق کار کی بنا ڈالی۔ اس طرح تمام ملک کی صنعتیں ایک جگہ جمع ہو سکتی ہیں اور بہ یک نظر ہم اپنی صنعتی رفتار کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اس سال کی نمائش کا معائنہ میرے لئے گذشتہ سالوں کے مقابلہ میں زیادہ مسرت بخش تھا۔ نمائش کی تنظیم اشیاء کی ترتیب اور دوسرے انتظامات سے کارکنوں کی خوش سلیقگی کا پتہ چلتا تھا لیکن یہ نمائش بھی ترقی کا کمال نہیں کہی جا سکتی اس میں بہت کچھ اضافے ممکن ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ سالوں میں اس طرف توجہ کی جائے گی۔

ملک میں بہت سی صنعتیں ایسی ہیں جو بڑی حد تک کس مپرسی اور گمنامی کے اندھیرے میں پڑی ہوئی ہیں۔ اورنگ آباد، ورنگل، بیدر، پیٹن، سدی پیٹھ اور کپل وغیرہ اس قسم کی صنعتوں کے مراکز ہیں، ارباب نمائش کا فرض ہے کہ ان کی ترقی کے راستے پیدا کریں بین الاقوامی کشمکش نے حمل ونقل کے ذرائع کو بری طرح متاثر کیا ہے اور ہر ملک خود مکتفی بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس ہنگامہ میں ہماری قدیم دستکاریوں کا زندہ ہونا بھی ممکن ہے

میں تمام باشندگان ملک عموماً نوجوانان دکن سے خصوصاً یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اس سلسلہ میں استقلال اور عالی ہمتی کے ساتھ آگے بڑھتے رہیں گے اور ملک کی صنعتی ترقی کو معراج کمال

پر پہونچا کر معاشی برتری حاصل کریں گے ۔

حضرت صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر

اس عہد ہمایونی میں جبکہ ملک ترقی کے ہر زینہ پر گامزن ہے ہمارا یہ پیدا ہونا ہی باعث افتخار ہے ۔ ہر ملک کی ارتقاء کا انحصار اس کی معاشیات واقتصادیات پر ہے اور ان کا دارومدار ملکی صنائع پر ۔ حکیم السیاست کی دوربین نظروں نے اس حقیقت کو محسوس فرمایا اور جن الفاظ میں حضرت اقدس و اعلیٰ نے اس مسئلہ پر تبصرہ فرمایا ہے وہ ہر ایک کے لئے نقش کالحجر کا کام دیں گے ۔ میری ذاتی رائے بھی یہی ہے کہ عوام کو بالخصوص تعلیم یافتہ گروہ کو چاہیئے کہ اس جانب توجہ کرے اور مجھے یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی کہ یہ گروہ اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور عوام کے لئے مصنوعات ملکی کی نسبت کافی معلومات مہیا کر دیئے ہیں ۔ مجھے توقع ہے کہ ان کے یہ مساعی ضرور بار آور ہوں ۔

سپاس نامہ

بہ پیشگاہ اعلیحضرت بندگان عالی حکیم السیاست سلطان العلوم حضور پرنور شہریار حیدرآباد و برار خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

بعد از آستان بوسی ــــــــــــ مودبانہ عرض ہے

آج کا دن ہم جاں نثاران موروثی کے لئے باعث صد عز و افتخار ہے کہ اعلیحضرت بندگان عالی بہ نفس نفیس قدم رنجہ فرما کر اس نمائش کا افتتاح فرما رہے ہیں اور ہم جاں نثاروں کی ناچیز مساعی کو شرف قبولیت بخش رہے ہیں۔ اس عزت اور سعادت کے لئے ہم جاں نثاران موروثی حضور والا کی خدمت فیضدرجت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں۔

"کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید ❊ کہ سایہ بر سرش افگند چوں تو سلطانے"

یوں تو ہر سال سرکار والا تبار نمائش میں تشریف فرما ہو کر بانیان و کارکنان نمائش اور صناعان مملکت کی ہمت افزائی فرمایا کرتے ہیں لیکن اس مرتبہ حضور پر نور کے رسم افتتاح ادا فرمانے سے اس نمائش کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ ہم جاں نثاروں کو یقین ہے کہ اعلیحضرت بندگان عالی کی شاہانہ سرپرستی نہ صرف اس نمائش کی کامیابی کی ضامن ہے بلکہ مملکت آصفیہ کی صنعتوں اور حرفتوں کی ترقی کی کوششوں میں نئی روح پھونک رہی ہے۔

اس مبارک موقع پر نہایت ادب کے ساتھ نمائش اور اس کے بانیوں اور کارکنوں کے متعلق چند امور گوش گذار ہمایونی کرنے کی اجازت چاہی جاتی ہے۔

اعلیحضرت بندگان عالی نے تخت نشینی کے بعد جب ملک کی فلاح و بہبود اور ترقی کے ذرائع تلاش کئے تو حضرت سلطان العلوم کی نظر حکمت شناس نے وقت کی سب سے زیادہ اہم ضرورت کو فوراً پہچان لیا اور علم وفن کے ایک حقیقی مربی کی حیثیت سے جامعۂ عثمانیہ کے قیام کا فرمان صادر فرمایا۔ مبارک دور عثمانی کا یہ ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جو اس سلطنت ابد مدت کی تاریخ میں سونے کے حروف سے لکھا جائیگا۔
اس جامعہ کے قیام سے قبل ملک کے اکثر افراد کے لیے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا تقریباً محال تھا۔ اوّل تو اہل ملک کو بیرونی جامعات کا دست نگر رہنا پڑتا تھا اور حیدرآباد جیسی عظیم مملکت کے لیے شایاں نہیں تھا کہ یہاں کے باشندے اپنی تعلیم کے لیے غیروں کے محتاج رہیں۔ سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ایک غیر زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے طالب علموں کو خود علم وفن کی دقتوں کے علاوہ زبان کی دشواریوں سے بھی سابقہ پڑتا تھا اور اکثر طلبا اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچنے سے محروم رہ جاتے تھے ۔
تشنگان علم کی یہ تمام دقتیں اعلیحضرت بندگان عالی کی ایک جنبش قلم سے رفع ہوگئیں شاہ ذیجاہ نے دور رس اور نکتہ بیں نظر سے کام لے کر نہ صرف جامعۂ عثمانیہ کے قیام کا فرمان نافذ فرمایا بلکہ اپنی زبان اُردو کو ذریعۂ تعلیم مقرر فرماکر ہندستان کے نظام تعلیم میں ایک خوش آیند انقلاب پیدا کردیا جس کی صحت کو رفتہ رفتہ تمام ماہران فن تعلیم اور بزرگان قوم تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے۔ چنانچہ اب اکثر جامعات اعلیٰ حضرت کی پیروی میں اپنی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی طرف مائل ہیں۔
اپنی زبان میں تعلیم پانے کی وجہ سے جامعۂ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبا نے علوم وفنون میں کماحقہٗ مہارت حاصل کی اور ملک میں تصنیف وتالیف اور تحقیق و ایجاد کا دور آغاز کیا۔ چنانچہ خداوندکریم کے فضل اور اعلیٰ حضرت کے اقبال سے حیدرآباد کا نام اب دنیائے علم وفن میں بھی عزت واحترام کے ساتھ لیا جانے لگا ہے۔

جامعۂ عثمانیہ کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آستانۂ جہاں پناہی کے جاں نثاروں کا نصب العین لازماً یہ ہوا کہ ملک و مالک کی خدمت کو اپنا شعار بنائیں۔ اس جذبہ کے تحت جامعۂ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبہ نے کوئی دس سال قبل "انجمن علیسانیمؔین عثمانیہ" کے نام سے ایک مرکز قائم کیا تاکہ منظم طور پر ملک و مالک کی خدمت کما حقہٗ انجام دے سکیں۔ ملک کی ہمہ جہتی ترقی میں سعی و کوشش کی خاطر اور تقسیم کار کے آزمودہ اصول پر انجمن نے اپنی تنظیم سے ملحق مختلف ذیلی کمیٹیاں مقرر کیں جن میں جامعۂ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبا کے علاوہ ملک کے دوسرے کارکن حضرات کا تعاون اور اشتراک عمل بھی حاصل کیا گیا۔

انہی کمیٹیوں میں سے ایک معاشی کمیٹی ہے جس کے قیام کا اصلی مقصد مملکت آصفیہ کی معاشی ترقی میں جد و جہد ہے۔ اس سلسلہ میں انجمن کی ہمت افزائی اعلیٰ حضرت بندگان عالی کی اس بصیرت افروز تقریر سے ہوئی تھی جو گھریلو صنعتوں کے مرکز کا افتتاح فرماتے ہوئے ارشاد فرمائی گئی تھی۔ غرض آج سے پانچ سال قبل معاشی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اور دوسرے ہی سال چند نوجوان اور گمنام عثمانیین نے کل مملکت آصفیہ کی مصنوعات کی نمائش کے انعقاد کا بیڑا اٹھایا۔ اگرچہ آغاز کار نہایت حقیر سرمایہ سے کیا گیا تھا لیکن ان نوجوانوں نے اس قدر مستعدی، سرگرمی اور خلوص کے ساتھ کام کیا کہ بحمد اللہ پہلی نمائش ہی کامیاب رہی۔ اس کامیابی سے ہمت پاکر معاشی کمیٹی نے مجلس نمائش کے نام سے ایک علحدہ جماعت قائم کی اور باضابطہ طور پر اس کی رجسٹری کردی تاکہ حسابات اور دوسرے کاروبار کے متعلق تحت احکام قانون باقاعدگی حاصل ہوجائے۔

خدا کا شکر ہے کہ یہ نمائش سال بہ سال ترقی کرتی گئی۔ چنانچہ اگر پہلے سال تقریباً ایک سو اسٹال قائم ہوئے تھے، ایک لاکھ روپیوں کی مالیت کا سامان فروخت ہوا تھا

اور پچاس ہزار اشخاص نے نمائش دیکھی تھی تو گذشتہ سال چوتھی نمائش میں تین سو اسٹال قائم ہوئے دو لاکھ سے زیادہ مالیت کا سامان فروخت ہوا اور تین لاکھ افراد نے نمائش دیکھی اعلیٰحضرت بندگان عالی کی شاہانہ سرپرستی اور خسروانہ الطاف و نوازشات اس ترقی میں بے حد ممد و معاون ہوئے اور آج یہ نمائش بام ترقی کی چوٹی پر ہے کہ جہاں پناہ بہ نفس نفیس اس کا افتتاح فرمارہے ہیں۔

اس نمائش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگرچہ اس کا انعقاد بالکلیہ ایک پبلک ادارہ یعنے مجلس نمایش معاشی کمیٹی (انجمن طیلسانین عثمانیہ) کے زیر اہتمام ہوتا ہے لیکن اس کی کارکردگی اور افادیت کے مدنظر اس میں سرکاری محکمہ جات اور سرکاری عہدہ دار کامل طور پر تعاون اور اشتراک عمل کرتے ہیں اور انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ وغیرہ سے مالی امداد بھی ملتی ہے۔ جس کا اعتراف تہ دل سے کیا جاتا ہے۔

مجلس نمائش کی اس جد و جہد کے باعث مملکت آصفیہ کی معاشی ترقی کے امکانات زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوتے جا رہے ہیں اور بفضل الٰہی وہ دن دور نہیں کہ حضرت بندگانعالی کی رہبری میں یہ سلطنت ابد مدت معیشت و ثروت کی ہر شاخ میں ترقی کے امکانی بلند مدارج تک پہنچ جائے۔

اعلیٰحضرت حکیم السیاست پر یہ امر بخوبی روشن ہے کہ اب دنیا میں سائنس اور مکانیت کا دور دورہ ہے اور قوموں کی ترقی صنعت و حرفت کے فروغ پر منحصر ہے اس بنا پر ضروری ہے کہ اہالیان ملک کثیر تعداد میں صنعت و حرفت کی طرف متوجہ ہوں اور کوشش کی جائے کہ تمام چھوٹی اور بڑی مشنیں حتی الامکان یہیں تیار ہوں۔ جنگ کی وجہ سے ضروریات زندگی مثلاً ادویہ، اغذیہ، اور ملبوسات کی دستیابی میں جو مشکلیں پیش آرہی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود ممالک محروسہ میں ان

اشیا کی فراہمی اور تیاری کی مہم پوری سرگرمی اور ہمت کے ساتھ آگے بڑھائی جائے۔ خدا کے فضل سے مملکت آصفیہ کی وسعت، ہندستان میں اس کا محل وقوع اور اس کے وسائل و ذرائع کی بہتات ان اسکیموں کو ممکن العمل بنادیتی ہے۔

اعلیحضرت بندگان عالی کی دوراندیشی اور تدبیر صائب کی بدولت انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ اور سررشتۂ تعلیم صنعت و حرفت قائم ہیں، ملک میں کئی ایک صنعتیں پیدا ہوچکی ہیں اور مختلف کارخانے کھل رہے ہیں۔ اگر ان سررشتوں کا لائحۂ عمل بہ تمام و کمال جلد از جلد بروئے کار آجائے تو ترقی کی نئی صورتیں پیدا ہوجائیں گی اور ملک میں نئی صنعتوں کا جال پھیل جائے گا تاکہ ایک طرف تو ملک اپنی ضرورت کی اشیا خود مہیا کرسکے اور اس کی دولت و ثروت میں اضافہ ہوا اور دوسری طرف ملک کے اہل فن اور اہل ہنر طبقہ کے لئے روزگار کے نئے میدان ہاتھ آئیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جامعۂ عثمانیہ سے کام لیا جاسکتا ہے۔ جو دور ہمایونی کا سب سے زیادہ اہم اور عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اگر جامعۂ عثمانیہ میں مختلف عملی سائنسوں اور زراعت و صنعت و حرفت کے مختلف شعبوں کا قیام عمل میں آئے تو یقین ہے کہ ملک صنعتی میدان میں بھی ترقی کے زینے سرعت کے ساتھ طے کرنے لگے گا۔

گذشتہ نمائشوں میں حضور والا ملاحظہ فرماچکے ہیں اور اس نمائش میں بھی ملاحظہ فرمائیں گے کہ اہل ملک میں صناعی اور کاریگری، ایجاد و تحقیق کی کیا کیا صلاحیتیں موجود ہیں۔ جو باضابطہ تعلیم و تربیت سے اور زیادہ اجاگر ہوسکتی ہیں۔ جس کے بعد ملک کی مصنوعات نہ صرف ہندستان میں بلکہ بیرون ہند بھی اپنے لئے ایک اہم مقام حاصل کرسکتی ہیں۔ اس امر کے مدنظر اگر رائے ہمایونی کا یہ اقتضا ہو کہ قومی تعمیر کے تمام سررشتے باہمی اشتراک عمل اور سوچ بچار کے بعد مملکت آصفیہ کے جملہ وسائل اور ذرائع سے کام لینے کے لئے ایک باضابطہ لائحۂ عمل مرتب کریں تو

توقع ہے کہ بندگانعالی کی مملکت میں خوش حالی اور آسودگی کا عہد زریں آغاز ہوگا۔

اس موقع پر یہ معروضہ کرنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ مجلس نمائش کے ذرائع آمدنی محدود ہیں وہ صناعوں سے کرایہ اور دوسرے مصارف کی بابت بہت کم رقم وصول کرتی ہے اور نمائش کا انتظام بالکل رضاکارانہ طور پر انجام پاتا ہے لیکن کاروبار کی وسعت اب اس بات کی متقاضی ہے کہ مفلوک الحال صناعوں اور اہل حرفہ سے مال خریدنے اور پھر فروخت کرنے کا وسیع پیمانہ پر انتظام کیا جائے۔ ان کی امداد و اعانت کا بندوبست کاروباری نقطۂ نظر سے ہو۔ مجلس نمائش کے دفتر کا مستقل انتظام رضاکارانہ اصول کے تحت قلیل معاوضہ کے ساتھ قابل افراد کی نگرانی میں کیا جائے۔ نمائش گاہ کسی موزوں مقام پر مستقل طور سے تعمیر پائے جہاں وقت بوقت توسیع اور اضافہ کی گنجائش ہو جہاں مجلس نمائش کا دفتر بھی موجود رہے۔ جس کے ساتھ ایک معاشی کتب خانہ اور میوزیم بھی ہو اور جہاں ایسے ذرائع بھی مہیا ہوں کہ اصحابِ ذوق اعلیٰ تحقیقاتی کام سہولت اور اطمینان کے ساتھ انجام دے سکیں۔

اعلیٰ حضرت بندگانعالی کے فیض کرم کی بدولت عثمانیین نے ملک کی ہر جہتی خدمت کی صلاحیت کا کافی ثبوت پیش کیا ہے۔ آقائے ولی نعمت سے کامل وفاداری اور دامن دولت سے وابستگی کی بنا پر جان نثاران موروثی کی تمنا ہے کہ بہتر سے بہتر خدمت گذاری کے مواقع حاصل کریں۔ عثمانیین کی یہ تمنا ادنیٰ توجہ شاہانہ سے پوری ہوسکتی ہے۔

اب دُعا معروضہ ہے کہ اس نمائش کا افتتاح فرما کر سرفراز اور کامران فرمایا جائے۔ زیادہ حد ادب۔

الٰہی آفتاب عمر و اقبال و اَلْمَاتًا بان و درخشان باد

معروضہ ۲ فروری جان نثار موروثی۔ رضی الدین صدیقی صدر مجلس نمائش معاشی کمیٹی دانجمن طیلسانیین عثمانیہ)

نمائش مصنوعات مملکت آصفیہ میں ورودِ خسروی

از جناب شرف الدین صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) معتمد مجلس نمائش

"قدم حضور کے آئے میرے نصیب کھلے" کے مصداق نمائش مصنوعات مملکت آصفیہ گزشتہ چار سال سے موکب ہمایونی کی قدم رنجہ فرمائی سے سرفراز ہو رہی ہے اور نمائش کی رونق ہر مرتبہ کی تشریف فرمائی کے بعد دوبالا ہوتی رہی۔ اس سال اعلیٰحضرت سلطان العلوم مدظلہ العالی نے اولاً نمائش کا افتتاح فرما کر کارکنان نمائش کو سرفراز فرمایا۔ اس کے بعد ۲۹۔ ذیحجہ سنہ ۱۳۶۱ھ کو نمائش کا ڈھائی گھنٹہ تفصیل سے معائنہ فرمایا۔ ذیل میں ان دونوں مواقع کی روداد قلمبند کی جاتی ہے۔

افتتاح نمائش یکم ذی الحجہ سنہ ۱۳۶۱ھ کو صبح سے باغ عامہ کی مسجد کے سامنے شامیانوں میں مملکت آصفیہ کے تمام عمائدین امرائے عظام اراکین باب حکومت اور عالیجناب صدر اعظم بہادر رونق افروزی شاہانہ کے منتظر اور اراکین مجلس نمائش خوش و خرم اپنے مالک مجازی کی تشریف فرمائی کا اہتمام کر رہے تھے۔

حضرت شہزادہ والاشان ولی عہد بہادر، حضرت دردانہ در شہوار بیگم صاحبہ اور صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر کی تشریف آوری کے بعد تمام حاضرین کی شاہانہ کا جیب جوں ٹھیک دس بجے حضرت اقدس و اعلیٰ شاہی لباس میں ملبوس تشریف فرما ہوئے۔ سری چتر گپت رو درس نے پیانو کا ترنم شروع کیا اور سلامی دی۔ سرور افزا موسم صبح کا وقت، سکوت و اطمینان کا سماں، سادگی اور شاہانہ کرم و التفات سب مسرت اور خوشی کا ایک ایسا عالم پیدا کر رہے تھے کہ جس نے افتتاح نمائش کی اہمیت کو دوبالا کر دیا۔ شاید ہی کوئی غیر سرکاری تقریب کا اس طور پر افتتاح ہوا ہو۔ سلامی ادا ہونے کے بعد سر اکبر علی خان صاحب سابق صدر مجلس نمائش نے ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی صدر نمائش اور دیگر اراکین و عہدہ داران نمائش کو پیش فرمایا۔ حضور پر نور نشست پر رونق افروز ہوئے تو ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی نے ادب و احترام کے ساتھ سپاسنامہ پڑھا۔ یہ سپاسنامہ ڈاکٹر صاحب نے جہاز کی وضع کے نقروی کاسکٹ میں پیش کیا۔ جواب شاہانہ سے سرفراز فرمانے کے لئے ارادہ ہمایونی ہونے پر تمام حاضرین بہ کمال ادب کھڑے ہو گئے

حضرت اقدس و اعلی پانچویں نمایش کا افتتاح فرما رہے ہیں
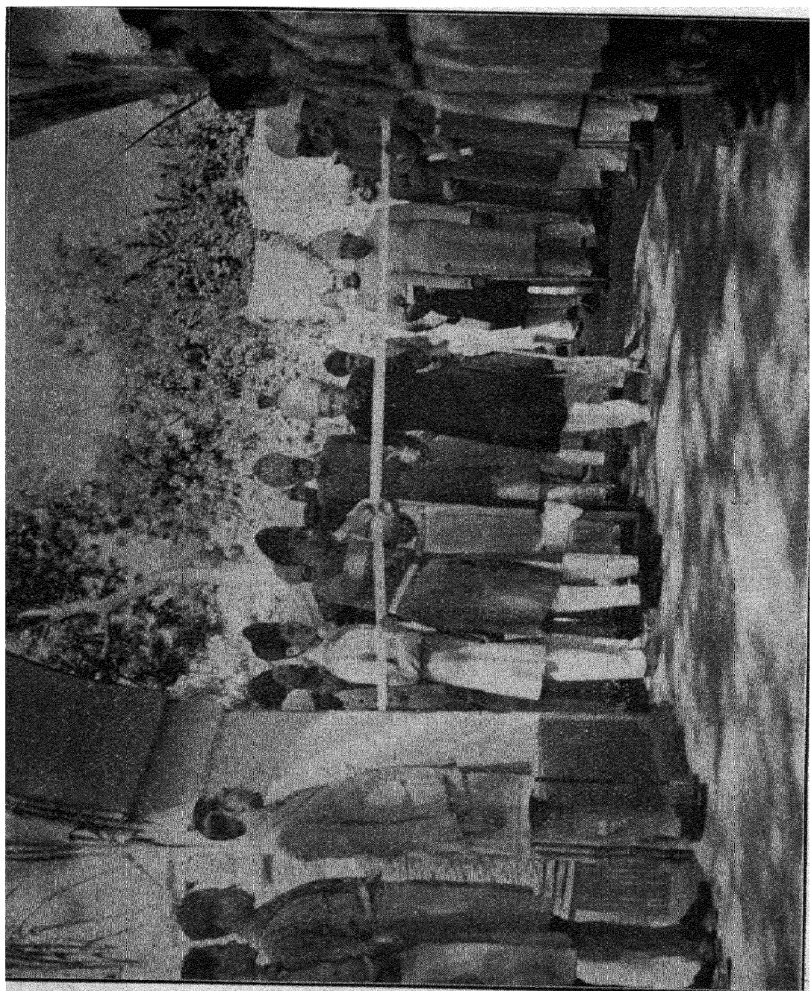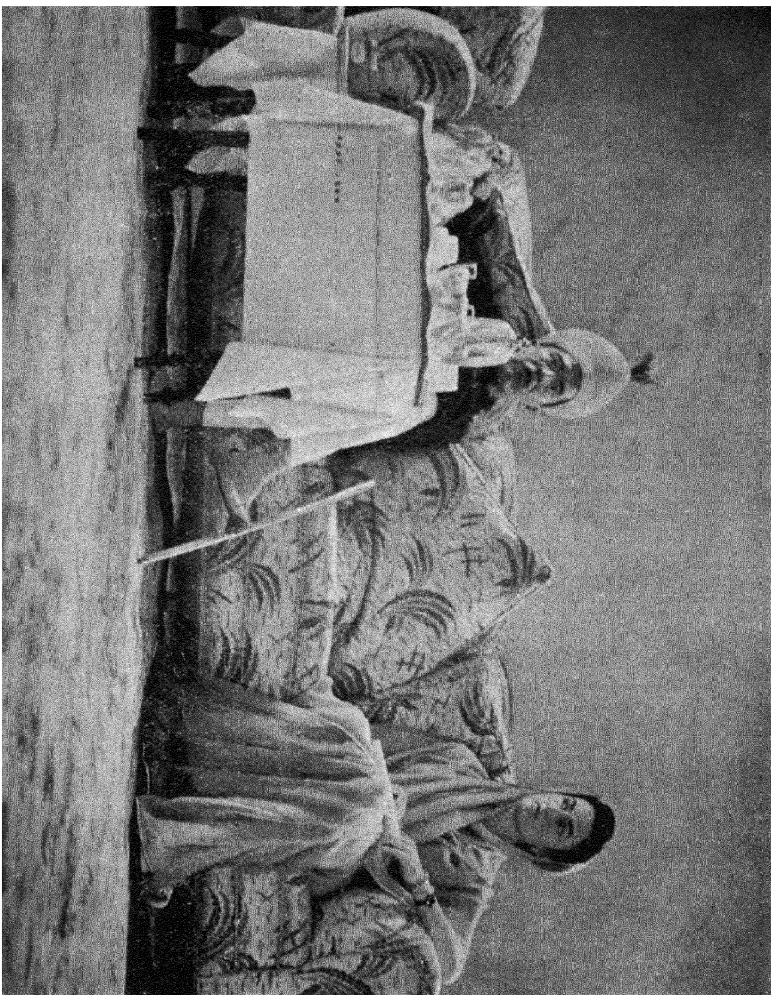
حضرت اقدس و اعلیٰ نمائش کلب میں

جواب شاہانہ کے ختم ہونے کے بعد موکب ہمایونی نمائیس مصنوعات ۔ کی طرف متوجہ ہوئی شکر گرتی
یودھن کی جانب سے تیار شدہ کمان پر زرد فیتہ بندھا ہوا تھا اسے اس نقرئی قینچی سے جو نائب صدر اور
معتمد مجلس نمائش نے پیش کی تھی بسم اللہ کہتے ہوئے کتر دیا اور اس کے ساتھ ہی افواج باقاعدہ اور
بائے اسکوٹس کے بیانڈ نے سلامی ادا کی ۔ روشن چوکی اور نوبت نے بھی اپنا فرض ادا کیا ۔ یہ وہ سماں تھا
کہ کم اس کے مواقع آتے ہیں ۔ اس کے بعد نمائش کلب کی طرف سواری شاہانہ متوجہ ہوئی اور یہ حکم ہوا کہ
۲۹ ۔ ذی الحجہ کو نمائش کے تفصیلی معائنہ کے لئے مکرر رونق افروزی ہوگی ۔ نمائش کلب تک پہونچتے ہوئے
راستہ میں جو اسٹال تھے ان پر نظر غائر مبذول رہی ۔ احاطۂ تفریحات اور سبزہ زار کے پاس علی الترتیب
اے ۔ آر ۔ پی کے رضا کاروں اور کشافوں نے سلامی دی نمائش کلب میں تشریف فرما ہونیکے بعد فرط نوازش
سے عہدہ داران و اراکین مجلس کو بھی تخت نشین پر استادہ ہونے کی اجازت سرفراز ہوئی حضرت اقدس و اعلیٰ
نے یہ یاد فرمایا کہ سال گزشتہ یہاں چار نوشی فرمائی گئی تھی اور نمائش کلب کی تعمیر کا حکم دیا گیا تھا چنانچہ
کنے بعد مراجعت عمل میں آئی ۔ حضرت اقدس و اعلیٰ کی مراجعت کے بعد حضرت شہزادہ برار اور معزز اراکین
باب حکومت نمائش کی طرف بہ غرض معائنہ متوجہ ہوئے ۔

۲۹ ۔ ذی الحجہ کی تشریف آوری ۲۹ ۔ ذی الحجہ کو صبح گیارہ بجے حضرت اقدس و اعلیٰ بہ غرض معائنہ
رونق افروز ہوئے صدر مجلس نمائش ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی عہدہ داروں اور اراکین مجلس
عاملہ و مجلس مشاورت کے ساتھ استقبال کے لئے منتظر تھے ۔ اسٹاف شاہی حاضر تھا ۔ سواری شاہانہ
کی رونق افروزی پر کشافہ نے سلامی دی جس کو قبول فرمانے کے بعد سواری شاہانہ پختہ اسٹالوں کے احاطہ میں
داخل ہوئی ۔ بٹن کے کارخانوں میں بھارت بٹن فیاکٹری محمدیہ بٹن فیاکٹری ، پرکاش بٹن فیاکٹری کا ملاحظہ
فرماتے ہوئے سواری شاہانہ جوہریوں کی دکان ایس کے موتی لال ، ایس ۔ اے جبس کے طرف گذری ۔ ریلوے
اسٹال پر سرکار کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ ریلوے نے یہاں کے صناعوں کے سامان لانے لے جانے
کے لئے احاطۂ نمائش میں ہی پارسل آفس قائم کر دی ہے شعبۂ صنعت و حرفت کے اس اسٹال کی طرف
بھی نظر قدرشناس مبذول ہوئی جس میں اس ریاست سے جو سامان جنگ کے لئے فراہم ہو رہا ہے ،

نمایاں تھا۔ اس کے بعد تاجران زیورات۔ یم، چندولعل، محمد چاند، زینت گولڈ مینوفیاکچرنگ کمپنی اور حاجی شیخ بابے شیخ جہانگیر اور راگھولو انجلو کی قائم کردہ چوڑیوں کے اسٹال ملاحظہ فرمائے گئے۔ مرکز مصنوعات ملکی معاشی کمیٹی پر توقف فرمایا گیا۔ یہاں عبدالرؤف صاحب دوم تعلقدار نگراں تھے اور انھوں نے خدمت عالی میں یہہ عرض کیا کہ یہہ اسٹال ان صناعوں کے لیے جو علحدہ اسٹال قائم نہ کرسکتے تھے نیز غریب بیواؤں اور خواتین کی گھریلو صنعتوں کو نمایاں کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ یہاں نیاز سنگھ آرٹسٹ کی تیار کردہ شاہان آصفی کی شبیہیں پسند فرمائی گئیں۔ اور فرمایا گیا کہ بہت ہی مشابہ ہیں۔ اس کے متعلق عبدالرؤف صاحب نے یہہ گزارش کی کہ نواب معین یار جنگ بہادر نے ان شبیہوں کو دارالحکومت برار کے لئے پسند کیا ہے۔ اس کے بعد وہ گھڑیال ملاحظہ ہوئی کہ جس میں ریت ایک گھڑی سے دوسری گھڑی میں خالی ہونے پر گھنٹہ بجتے ہیں اور وقت معلوم ہوتا ہے۔ اس کو ملاحظہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا کہ یہہ قدیم زمانہ کا طریقہ ہے۔ اس گھڑیال کو گلبرگہ کے ایک غریب طالب علم احمد علی نے بنایا تھا۔ عبدالکریم کا کارچوبی سامان ملاحظہ ہوا۔ اور علاقہ برار کے اسٹال پر توقف فرمایا گیا۔ یہاں خواجہ محمد احمد صاحب صدر برار اسودیشی انجمن نے یہہ گزارش کی کہ پیوستہ سال کے ارشاد شاہانہ کے مطابق پہلی مرتبہ اس سال برار کی تمام مصنوعات ایک جا جمع کی گئی ہیں۔ اس کے بعد ریشمی پارچوں، جیوتی ٹکسٹائل ملز، نارائن داو ماکوڑکی قورباتی اور اور نگ آباد کی ہمرو کی دکانوں میں شیر سلک فیاکٹری، ہمرو کمخواب فیاکٹری، اورنگ آباد سلک ملز اور، بی، ڈبلیو ملز، ایم، یس ملز، جی تاراچند کے کمپنی کے اسٹال پر سے گزرتے ہوئے یم قیصر کی دوکان پر عورتیں چوٹیوں کے ساتھ جو پھوندنے لگاتی ہیں ان کے استعمال کی بابتہ دریافت فرمایا گیا۔ اور ارشاد ہوا کہ نئے نئے فیشن نکل رہے ہیں۔ سلک میوزیم پر توقف فرمایا گیا۔ جہاں مالکہ اسٹال نے آداب بجالانے کی عزت حاصل کی۔ وہاں کے قوروں کو دیکھ کر یہہ ارشاد ہوا کہ یہہ قورین اب زیادہ چوڑی ہونے لگی ہیں۔ پھر مدرسہ نسیفیہ النسواں کا اسٹال ملاحظہ فرماتے ہوئے بلوز امپوریم کے بلوز ملاحظہ کئے گئے۔ یوسفی مصالحہ گلبرگہ کی دوکان کے بعد گلبہار کمپنی کی سجاوٹ پسند کی گئی۔ اسلامیہ اگربتی ورکس پر بعدہ امر حضور اقدس و اعلیٰ کے علم میں لایا گیا کہ پہلے ممالک سرکار عالی میں اگربتی میسور سے آتی تھی اور اب یہہ ملک ہی

حاضر تھے۔ خواجہ حمید احمد صاحب بی، اے (عثمانیہ) مددگار ناظم امداد شمار نے دور عثمانی کی صنعتی اور تعلیماتی ترقی کے چارٹ نیز ملک سرکار عالی کے بارانی نقشے کو ذات شاہانہ کے روبرو واضح کیا۔ یہاں سے سررشتۂ ٹپہ کے قائم کردہ ہنگامی ٹپہ خانے کو جو اس سال جدید طور پر قائم ہے۔ ملاحظہ فرماتے ہوئے آرٹ گیالری میں ذات شاہانہ رونق افروز ہوئی۔ تصاویر کا معائنہ فرمایا گیا اور یہ رائے ظاہر فرمائی کہ ابھی بہت کچھ ترقی ہونی ہے اور مہاراجہ ٹیگور کے ذخیرہ کا تذکرہ کیا گیا۔ بی بی زینت صاحبزادی نواب حسن نواز جنگ بہادر کنٹرولر نواب معظم جاہ بہادر کی تیار کی ہوئی تصویر بھی ملاحظہ کی گئی۔ جو سال حال کی بہترین تصویر قرار دی گئی تھی۔ یہاں سے آرائش اضلاع و آرائش بلدہ کے اسٹالس پر نگاہ عطوفت مبذول فرماتے ہوئے گورنمنٹ کالج آف فزیکل ایجوکیشن کے اسٹال کی طرف رخ فرمایا گیا۔ مسٹر ویبر دستار اور بگلوس میں حاضر تھے۔ انھوں نے تفصیل سے صحت و تندرستی قائم رکھنے کے طریقے واضح کئے جو ان کی درس گاہ میں ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد سرکاری محکموں کے قائم کردہ اسٹال دیکھے گئے۔ سررشتۂ سمکیات پر ڈاکٹر داس اور رحیم اللہ صاحب مہتمم سمکیات حاضر تھے۔ انھوں نے یہ واضح کیا کہ ذات شاہانہ کی توجہ فرمائی سے یہ سررشتہ بہت جلد سرکار کی رعایا کی خدمت کے قابل ہو جائے گا۔ اس کے بعد تعمیرات نظام ساگر پر محمد فاروق صاحب دوم تعلقدار نے یہ عرض کرنے کی عزت حاصل کی کہ نظام ساگر سات کروڑ کے صرفہ سے تعمیر ہو کر نظام آباد سے قحط کو دور کر چکا ہے۔ وہاں اب سالانہ ۲۲ لاکھ روپے مالگزاری کا اضافہ ہوا ہے۔ سوا لاکھ ایکڑ سے زائد خشک زمینات تری میں مبدل ہو گئے ہیں۔ جدید صنعتیں قائم ہوئی ہیں۔ مثلاً صنعت شکر سازی اور کارخانۂ الکحل۔ حضرت اقدس و اعلیٰ نے اس کو سماعت فرما کر اپنی رعایا نوازی کا اظہار فرمایا۔ یہاں سے سررشتۂ آبکاری کے اسٹال پر قاضی زین العابدین صاحب ناظم آبکاری کو شرف تکلم عطا ہوا۔ دیگر سرکاری سررشتوں یعنی سررشتۂ ہائے ڈرینج، علاج حیوانات، صحت عامہ، بندوبست، جنگلات، معدنیات، زرعی اشاعت، دار الترجمہ، طباعت، مجلۂ عثمانیہ، اور بلدیہ بھی ملاحظہ فرمائے گئے۔ سررشتہ حفظان صحت پر میاں محمد صدیق صاحب ملیریا افسر، سررشتۂ بندوبست پر مسٹر جہانگیر جی جہتا،

ناظم بندوبست ۔ دارالترجمہ پر مولوی الیاس برنی صاحب اور دارالطبع پر مسٹر ملے، اور عبدالقیوم صاحب مددگار ناظم حاضر تھے۔ اسٹال بلدیہ پر پریم محی الحسن جی صاحب نائب صدر مجلس بلدیہ حاضر تھے۔ دارالطبع کے اسٹال پر مسٹر ملے نے اسٹال پر اسی وقت کی طبع کردہ ایک غزل شاہانہ پیش کرنے کی عزت حاصل کی۔ اسی احاطہ میں کشافان سرکار عالی نے اس مناسبت سے کہ یہاں سرکاری سررشتوں کے اسٹالس قائم تھے سلامی ادا کی جس کو قبول فرمایا گیا۔ وہاں سے سنگر فیاکٹری کا اسٹال ملاحظہ ہوا جہاں پر الکحل نیز سرپور کا کاغذ بھی موجود تھا۔ یہاں سے مولوی سجاد مرزا صاحب کا ایجاد کردہ جدید بنیادی اردو ٹائپ دیسی کاغذ ساز سید اسمٰعیل اینڈ سنس کے اسٹال پر قدوم شاہانہ کا گذر ہوا۔ مجوبیہ کارخانہ جلدسازی اور حمیدیہ کارخانہ جلدسازی کے کام کو ملاحظہ فرمایا گیا۔ کیمیکل اینڈ فارماسیوٹیکل کمپنی کی تیارکردہ ادویات جسے مسرس عبدالرزاق نے قائم کیا ہے، ملاحظہ ہوئیں۔ پھر ترک مسکرات مشیر عالم ڈائرکٹری دکن اسکول چاک فیاکٹری نیز پارچہ بافی کے کارخانہ جات حیدرآباد اسپننگ و ویونگ ملز، اورنگ آباد ملز، اعظم جاہی ملز، عثمان شاہی ملز، رام گوپال ملز کا ملاحظہ عمل میں آیا۔ سررشتہ اے، آر، پی کے کمانڈر علی رضا صاحب کنٹرولر کا سلام قبول فرمایا گیا۔ روز بسکٹ، چاشنی کمپنی، اور دکن اسٹور کے ملاحظہ کے بعد سرکار کی خدمت میں تلجا بائی سنگاریڈی والی کا ذکر کیا گیا کہ کس طرح سال بہ سال اس کا سامان بڑھتی ہوئی مقدار میں فروخت کے لئے آرہا ہے۔ محمود حسین مشتاق حسین جوہری، ین کے جوہری اور جینی لعل کے تیارکردہ زیورات کے متعلق عرض کیا گیا کہ یہاں حالات حاضرہ کے لحاظ سے معمولی چاندی کے زیورات نمائش کے لئے رکھے گئے ہیں، پی، دی لنگم کے ہاتھی دانت کے سامان پر نظر نوازی ڈالی گئی اور محمد لیاقت علی کی بنائی ہوئی چھتریاں خاص التفات کی موجب ہوئیں۔ مہاج ورکس، دکن شو فیاکٹری، محمد جیلانی اینڈ سنس، گولکنڈہ سگریٹ اور وہاں کے متصلہ اسٹالس یعنی عثمن یا یوریا مخزن دیسی صنعتی گرانڈ اسٹور ہمارا اسٹال، دکن آچار کمپنی، ریاض اسلام فیاکٹری، دیسی مٹی کے کھلونے، دکن فروٹ ورکس، دکن ٹائر فیاکٹری، ٹاٹے امپوریم ملاحظہ ہوئے۔ احاطہ تفریحات کے سامنے سید محمد ہادی صاحب ناظم بائے اسکوٹس کشافوں کے دو رویہ صفوں کے ساتھ استادہ تھے سلام قبول فرمایا گیا۔ جاگیرات کے اسٹالس

میں راجہ دھرم کرن بہادر، مصنوعات مسلم پارچہ بافندگان الندشریف، اسٹیٹ بہادر یار جنگ بہادر اسٹیٹ بھوم ہستان، حیتہ ہستان گڑ وال اور اقبال احمد صاحب علوی کے اسٹالس پر نظر شاہانہ مبذول ہوئی۔ اس کے بعد افواج باقاعدہ کے اس اسٹال پر قدوم شاہانہ متوجہ ہوئے۔ جہاں مختلف زمانہ کی عسکری تدریجی ترقی واضح کی گئی ہے۔ یہاں سے حضرت شہزادہ برار کے شکار خانہ میں ذات شاہانہ رونق افروز ہوئی۔ یہ امر سرکار کی اطلاع میں لایا گیا کہ یہ اسٹال نمایش میں سب سے زیادہ شوق سے دیکھا گیا اس شکار خانہ سے مراجعت پر سامنے سبزہ زار پر سررشتہ اے، آر، پی کی طرف سے آگ بجھانے کے جو مظاہرے ہو رہے تھے۔ وہ ملاحظہ فرمائے گئے۔ یہاں پر سرکار کی خدمت میں یہ عرض کیا گیا کہ اس سررشتہ نے بہت ہی قلیل مدت میں بڑے کام کر لیے ہیں۔ اور جو کچھ سامان اس نے فراہم کیا ہے اس میں سے بہت زیادہ ایسا ہے جو بعد جنگ آگ بجھانے اور سفری دواخانہ کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے۔ یہ امر بھی سرکار والا تبار پر واضح ہوا کہ اس سررشتہ نے بہت بڑی تعداد میں اہل ملک کو شہری حفاظت کی ترتیب دے دی ہے۔ یہاں سے مرکزی مدرسہ فنون لطیفہ نیز دیگر مدارس تعلیم صنعت و حرفت کے اسٹال کی طرف قدوم شاہانہ متوجہ ہوئے۔ یہاں ایک تصویر شاہانہ کی نقاب کشائی فرمائی گئی۔ اور ایک دستخطی پروانہ مرکزی مدرسہ فنون لطیفہ کو سرفراز ہوا۔ اس مدرسہ کے طلبہ نے جو تصویریں اور دیگر مصنوعات تیار کی ہیں، نیز یہاں سینگ سے جو چیزیں بنائی جاتی ہیں ان پر بھی نظر التفات مبذول ہوئی۔ اس اسٹال کی جانب تشریف بری کے وقت حضرت اقدس و اعلیٰ نے آٹو موبیل گیاس پلانٹ کی موٹر کے متعلق بھی دریافت فرمایا۔ اس کے بعد سواری شاہانہ نمایش کلب کی طرف متوجہ ہوئی۔ میر اکبر علی خاں صاحب نے جو شروع سے نمایش کی تفصیلات گوش گذار ہو رہے تھے یہ گذارش کی کہ اس جانب مختلف صنائع اور اداروں مثلاً کارخانہ ہائے قلم سازی، مٹی کے کھلونے، قدیم اسلحہ، مدرسہ کور و کنگ، زرعی تحقیق، اعظم دیونگ ورکس، گھریلو صنعتیں، ابراہیم علی قلی پٹن، کھادی دیاسلائی، عثمانیہ ٹکنیکل ٹریننگ اسکیم، بورڈ آف ٹکنیشن، کشیدہ زرگر کریم نگر، مدرسہ صنعتی خیریت آباد، مصنوعات دیہاتی مشیر آباد حسین خان فرخ نگر نے عملی مظاہروں کا انتظام کیا ہے۔ نمایش کلب میں شہ نشین پر رونق افروزی کے بعد صاحبزادگان بلند اقبال کو بھی جو ہمراہ تھے یاد فرمایا گیا۔ اور چائے نوشی فرمائی گئی۔ اس موقع پر

حضرت اقدس و اعلیٰ نے نمایش کلب کی تعمیر کا تذکرہ فرمایا۔ جس کے متعلق گزشتہ مرتبہ حکم فرمایا گیا تھا۔ نیز یہ ارشاد ہوا کہ شکار خانۂ حضرت ذی عہد بہادر اس قابل ہے کہ اُسے رعایا کے اشتیاق اور ان میں شوق شکار اور شوق ورزش جسمانی پیدا کرنے کے لئے مستقل عمارت میں جو بعد جنگ تعمیر ہوگی۔ معائنہ عام کے لئے کھول دیا جائے۔ اس کے بعد یہ بھی ارشاد ہوا کہ حضرت والا شان شہزادہ برار اپنے جد امجد حضرت غفران مکان کی طرح شکار کے شوقین ہیں۔ ساتھ ہی حضرت اقدس اعلیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ خود بدولت کا شکار کے متعلق یہ رجحان ہے کہ اگر کوئی شیر یا جانور مردم آزار ہو تو اس کے شکار کئے جانے کا ضرور انتظام ہونا چاہیئے کہ نوع انسانی آزار و اذیت سے بچے لیکن ان مردم خواروں کو چھوڑ کر بقیہ جانوروں کو اپنے حال پر آزاد رہنے دینا چاہیئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی صدر مجلس نمایش و اراکین مجلس نمایش معاشی کمیٹی و مجلس مشاورت نیز ممبران کلب اور مالکان اسٹالس و عہدہ داران سررشتہ جات نے یکے بعد دیگرے نذرین پیش کیں۔ اس کے بعد سواری شاہانہ ٹھیک ۱/۲ ۲ گھنٹے کے بعد مراجعت فرما ہوئی۔ نواب زین یار جنگ بہادر کو حکم ہوا کہ شام میں مختلف مصنوعات جو پسند فرمائی گئی ہیں کنگ کوٹھی مبارک لیتے آئیں۔

اس مختصر سے مضمون میں شاہانہ توجہ و التفات کا کماحقہ تذکرہ نہیں ہو سکتا جو مصنوعات ملکی کی نسبت مرکوز خاطر والا ہے۔ حضرت بندگان عالی کا بنفس نفیس نمایش کا افتتاح فرمانا، اس موقع پر سپاس نامہ قبول فرمانا اور بکمال نوازش و ذرہ نوازی جواب شاہانہ ارشاد فرمانا۔ نیز نمایش کے تفصیلی معائنہ کے لئے دوبارہ تشریف آوری کی زحمت فرمانا ساتھ ہی کلمات استحسان ہمت افزائی ظاہر فرمانا ایسے امور ہیں کہ نہ صرف کارکنان نمائش کے لئے پشت ہا پشت تک سرمایۂ فخر و مباہات رہیں گے بلکہ مملکت آصفیہ کی صنعتی ترقی میں چار چاند لگائیں گے۔

دعا ہے کہ سایہ ہمایونی دیرگاہ سلامت باکرامت رہے۔ آمین۔ فقط

نمایش مصنوعات مملکت آصفیہ

روداد انعامات و اسنادات

از جناب مولوی شرف الدین صاحب، بی، اے (عثمانیہ) معتمد مجلس نمایش

خدا کا شکر ہے کہ مملکت آصفیہ کے مصنوعات کی پانچویں نمایش بخیر و خوبی اور کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچ گئی حقیقت یہ ہے کہ اعلحضرت بندگان عالی متعالی مدظلہم العالی کی شاہانہ توجہات کی ہی ساری نمایش مظہر ہے۔ مبارک عہد عثمانی میں مملکت نے ترقی کے جو مراتب طے کئے ہیں وہ ہر نمایش دیکھنے والے پر بخوبی ظاہر ہیں۔ کارکنان نمایش کیا اور ان کی بساط کیا۔ پیشگاہ خسروی میں توجہات ملوکانہ کے متعلق کوئی اظہار تشکر بھی چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق ہے۔

ہز ہائنس شہزادۂ والاشان ولی عہد بہادر اور ہر ہائی نس پرنسس آف برار نے بھی جو کرم گستری فرمائی اس کے لئے ساری نمایش مرہون مکارم ہوئی۔ نمایش کے افتتاح کے وقت تشریف آوری نیز نمایش کے معائنہ کے لئے دوبارہ رونق افروزی، پیام بہت افزا کا مرحمت ہونا اور پھر ۲۹۔ بہمن ۱۳۵۲ف کے جلسہ تقسیم انعامات و اسنادات کی صدارت کی زحمت گوارا فرمانا اس کے علاوہ فوج کا اسٹال قائم کرنے اور فوج کے مظاہرات کے لئے حکم صادر فرمانا اور سب سے بڑھ کر اپنے خاص ٹرو فیز سے اہل نمایش کو مستفید فرمانا۔ غرض ایک کرم کے بعد دوسرے کرم سے نمایش کو اور اہل نمایش کو نوازا گیا۔

اسی طرح حضرت والاشان شاہزادہ نواب معظم جاہ بہادر اور شہزادی صاحبہ نیلوفر فرحت بیگم کی توجہات کی بھی نمایش ممنون ہے۔ باغ عام جیسے مقام کا نمایش کے لئے حاصل ہونا حضرت والاشان معظم جاہ بہادر کی توجہ اور التفات کی بدولت ہے کارکنان نمایش اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتے۔

حضرت شہزادۂ نواب بسالت جاہ بہادر اور صاحبزادی صاحبہ نفیس النسا بیگم نے بھی اپنے کرم سے نمایش میں تشریف آوری اور پیام روانہ فرمانے کی زحمت گوارا فرمائی اور جس دلچسپی کا اظہار فرمایا اس سے

سارکنوں اور صناعوں کی ہمت افزائی ہوئی ۔

نمایش میں نہ صرف ایسی اشیاء پیش ہوئی تھیں جن کو خود اہل ملک نے بنایا تھا بلکہ ملک کے سامان خام سے ہر قسم کی مصنوعات تیار کرنے کے عملی مظاہروں کا بھی انتظام کیا گیا ۔

عملی اعتبار سے نمایش گویا سات شعبوں پر مشتمل تھی ۔

(۱) تیار شدہ مصنوعات (۲) سرکاری سررشتوں کی ترقیات اور افادیت (۳) مرکزی اشتمال مصنوعات ملکی

(۴) فنون لطیفہ (۵) جاگیرات (۶) مظاہرات (۷) معصوم و دلکش تفریحات ۔

۱ ۔ تیار شدہ مصنوعات کے ضمن میں مملکت آصفیہ کی ہر قدیم و جدید صنعت نمایش میں دیکھی جا سکتی تھی ۔ تیار شدہ مصنوعات کے ضمن میں صنعتوں کو (۳۸) ذیلی نوعیتوں میں تقسیم کیا گیا تھا ان میں (۲۷) نوعیتوں کی صنعتیں پیش ہوئیں ۔ اس سلسلہ میں سرپور کا کاغذ پہلی مرتبہ نمایش میں پیش ہوا ۔ اردو کا جدید بنیادی ٹائپ بھی عام طور سے پہلی مرتبہ نمایش میں دیکھا گیا ۔ برار اسوسی ایشن کی کوشش سے مصنوعات علاقہ برار کا پہلی دفعہ نمایش میں داخلہ ہوا ایسر جیکل ڈریسنگ ورکس، حیدرآباد کیمیکل اینڈ فارماسوٹیکل ورکس، حیدرآباد میاچ اسوسی ایشن، انجمن ہائے اسلامیہ تیرتی، آلوین میٹل ورکس، دکن ہایٹ ورکس کے جدید کارخانوں نے نمایش میں پہلی دفعہ شرکت کی ۔

اس شعبہ میں طلائی تمغوں کے جو مستحق قرار پائے وہ یہ ہیں ۔

(۱) سنگھار کا سامان یوسفی مصالحہ گلبرگہ — (۲) روغنیات گلبہار کمپنی

(۳) صابون سازی نیشنل سوپ فیاکٹری — (۴) ادویہ سازی ایسر جیکل ڈریسنگ ورکس

(۵) ادویہ سازی حیدرآباد کیمیکل اینڈ فارماسوٹیکل ورکس — (۶) شکر سازی نظام شکر فیاکٹری

(۷) دیاسلائی حیدرآباد میاچ اسوسی ایشن — (۸) سگریٹ سازی ۔ حیدرآباد دکن سگریٹ فیاکٹری

(۹) بسکٹ سازی ۔ روز بسکٹ ورکس — (۱۰) مربہ و آچار سازی ۔ چاشنی کمپنی

(۱۱) پارچہ بافی جیوتی ٹکسٹائل ملز — (۱۲) پارچہ بافی ۔ بشیر سلک فیاکٹری

(۱۳) پارچہ بافی اورنگ آباد ہمرو فیاکٹری ۔ — (۱۴) پارچہ بافی ۔ اورنگ آباد سلک ملز

(۱۵) پارچہ بافی ۔ بی، ڈبلیو ملز
(۱۶) پارچہ بافی، یم ایس، ملز
(۱۷) پارچہ بافی ۔ دیوان بہادر رام گوپال ملز
(۱۸) پارچہ بافی ۔ عثمان شاہی ملز
(۱۹) پارچہ بافی ۔ اعظم جاہی ملز ۔
(۲۰) پارچہ بافی اورنگ آباد ملز
(۲۱) پارچہ بافی ۔ حیدرآباد اسپننگ اینڈ ویونگ کمپنی
(۲۲) گنڈیاں سازی ۔ محمدیہ بٹن فیاکٹری
(۲۳) صنعت بیدری ۔ گلزار دکن
(۲۴) آہنی سامان آلوین سٹیل ورکس
(۲۵) آہنی سامان ۔ یل، جی، ہوسیال اینڈ سنس
(۲۶) طباعت اردو جدید بنیادی ٹائپ
(۲۷) مصنوعات برار ۔ برار اسوسی ایشن
(۲۸) مصنوعات یتیم خانۂ انیس الغربار
(۲۹) مصنوعات یتیم خانۂ انجمن خادم المسلمین
(۳۰) جلدسازی ۔ محبوبیہ کارخانہ جلدسازی
(۳۱) نجاری ۔ ڈیو نار کمپنی
(۳۲) خطاطی اعظم پن کمپنی ۔
(۳۳) کاغذسازی ۔ سرپور پیپر ملز ۔
(۳۴) چوڑی سازی ۔ حاجی شیخ بابے
(۳۵) کارچوب ۔ محمد اینڈ عبدالکریم ۔

بیدری تمغوں کے مستحقوں کی تفصیل حسب ذیل ہے ۔

(۱) سنگھار کا سامان ۔ اسلامیہ اگربتی ورکس
(۲) سنگھار کا سامان ۔ محمد عبدالغنی گلبرگہ ۔
(۳) صابون سازی ڈائمنڈ سوپ فیکٹری
(۴) کمبل سازی ۔ جے تاراچند
(۵) کلاہ سازی دکن ہاٹ ورکس
(۶) گنڈیاں سازی ۔ بھارت بٹن فیاکٹری
(۷) صنعت بیدری ۔ تاج دکن
(۸) گیتی سازی ۔ شیخ احمد جان محمدؐ ۔
(۹) شیشہ سازی ۔ کوہ نور گلاس فیاکٹری
(۱۰) ادارت ۔ مجلۂ عثمانیہ
(۱۱) صفائی ۔ سررشتۂ بلدیہ
(۱۲) چرم سازی ۔ دکن شوز فیاکٹری
(۱۳) چرم سازی ۔ محمد جیلانی اینڈ سنس
(۱۴) مٹی کی صنعتیں ۔ ریاض اسلام فیاکٹری
(۱۵) جلدسازی ۔ حمیدیہ کارخانہ جلدسازی
(۱۶) کاغذسازی محمد اسمٰعیل اینڈ سنس
(۱۷) چوڑی سازی ۔ شیخ جہانگیر
(۱۸) زیورات ۔ محمد چاند ۔

(۱۹) زیورات ۔ محمود حسین مشتاق حسین ۔

نقرئی تمغوں کے مستحق حسب ذیل اسٹال قرار دیئے گئے ۔

(۱) پرکاش ہٹن فیاکٹری (۲) ایس ، جے ، موتی لعل (۳) ایس ، اے حسین
(۴) یم ، چند لعل (۵) زینت کمپنی (۶) راگھو لو انجلو
(۷) یم قیصر (۸) سلک میوزیم (۹) بلوزا میوریم
(۱۰) سنجن شفیع (۱۱) فیشن ہوز (۱۲) مدرسۂ عثمانیہ صنعت و حرفت نامپلی
(۱۳) دکن اسٹور (۱۴) آنجا بابائی (۱۵) کریمیہ ورکس
(۱۶) بن لکھے جوہری (۱۷) یم جیتی لعل (۱۸) پی ، وی ہلنگم
(۱۹) محمد لیاقت علی (۲۰) خوشبو گھر (۲۲) یم ایس ما اندرو دیدیہ
(۲۳) گرانڈ اسٹور (۲۴) سردار سنگھ (۲۴) ٹائے امپوریم
(۲۵) یس ، اقبال احمد علوی (۲۶) دکن ہن ہولڈر کمپنی (۲۷) دکن فریٹ ورکس
(۲۸) نرسملو ۔ کارخانہ کھلونا سازی (۲۹) محمد میر خان (۳۰) محمد خاں
(۳۱) محمد لعل خاں (۳۲) محمود خاں (۳۳) حیدرآباد ڈائز کمپنی
(۳۴) محمد مصطفیٰ خاں (۳۵) ایرین ہولڈر کمپنی (۳۶) ہری رام مانک لعل
(۳۷) کارخانہ نفیس کھلونا سازی (۳۸) میر معین الدین علی (۳۹) محمد حسین ۔ کارخانہ قدیم صنعتی اسلحہ
(۴۰) محمد یوسف خاں (۴۱) دکن اسکول چاک فیاکٹری (۴۲) صدر انجمن ترک مسکرات

۲ ۔ نمایش کا دوسرا شعبہ سرکاری سررشتوں کی ترقیات اور افادیت کو نمایاں کرتا تھا ۔ ہر سال نئے نئے سررشتے نمایش کے ذریعہ اپنے مفید اور سودمند کام سے عامۃ الناس کو واقف ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں ۔ سال حال ۲۴ سرکاری سررشتوں نے نمایش کے ساتھ تعاون عمل کیا اور اپنے اسٹال قائم کئے ۔
مندرجۂ ذیل سررشتہ جات نے پہلی مرتبہ اپنے اسٹال قائم کئے

(۱) سررشتۂ افواج باقاعدہ سرکار عالی (۲) حیدرآباد دوائے اسکوٹس

(۳) مدرسہ وسطانیہ مشقی (عثمانیہ ٹریننگ کالج) (۴) بورڈ آف امپلائمنٹ فارٹیکنیشن
(۵) سررشتہ تحفظ حملہ ہوائی (۶) سررشتہ سمکیات
(۷) ترقیات نظام ساگر (۸) سررشتۂ ٹپہ

اس شعبہ میں طلائی تمغہ کے مستحق حسب ذیل اسٹال قرار دیئے گئے۔

(۱) گراف ۔ سررشتۂ اعداد و شمار (۲) منتخبہ مصنوعات ۔ فروخت گاہ مصنوعات ملکی
(۳) کشافی منظاہرات حیدرآباد بوائے اسکوٹس (۴) منتخبہ مصنوعات ۔ سررشتۂ تعلیم صنعت و حرفت
(۵) مصوری مرکزی مدرسہ فنون لطیفہ (۶) مشتری حیدرآباد ٹکنیکل ٹریننگ اسکیم
(۷) منظاہرات مرکزی تعلیم مصنوعات دیہاتی (۸) فوجی منظاہرات ۔ افواج باقاعدہ سرکار عالی
(۹) منظاہرات تحفظ حملہ ہوائی سررشتہ اے آر پی (۱۰) طباعت ۔ سررشتہ دارالطبع
(۱۱) تالیف و ترجمہ سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ (۱۲) جنگلات کی پیداوار ۔ سررشتۂ جنگلات
(۱۳) زراعت ۔ سررشتۂ زرعی اشاعت (۱۴) پیمائش و بندوبست ۔ سررشتۂ بندوبست سرکار عالی
(۱۵) ٹپہ رسانی سررشتۂ ٹپہ (۱۶) قدیم مصنوعات ۔ عجائب خانہ سرکار عالی
(۱۷) منظاہرہ پیداوار ۔ ترقیات نظام ساگر۔

بیدری تمغوں کا مستحق حسب ذیل اسٹالوں کو قرار دیا گیا۔

(۱) نقل و حمل سررشتۂ ریلوے ۔ (۲) ابری سازی مدرسۂ وسطانیہ مشقی
(۳) پرورش سمکیات ۔ سررشتۂ سمکیات سرکار عالی (۴) صحت عامہ ۔ سررشتۂ طبابت و صحت عامہ
(۵) آبکاری ۔ سررشتۂ آبکاری (۶) علاج حیوانات ۔ سررشتۂ علاج حیوانات
(۷) آرائش اضلاع سررشتہ ٹون پلاننگ اضلاع لوکل فنڈ (۸) منظاہرہ صحت جسمانی ۔ گورنمنٹ کالج آف فزیکل ایجوکیشن
(۹) آرائش ۔ سررشتہ آرائش بلدہ سرکار عالی

نقروی تمغوں کا مستحق حسب ذیل اسٹالوں کو قرار دیا گیا۔

(۱) شعبہ باغبانی ۔ (سررشتۂ زراعت (۲) مدرسۂ کورتہ کر گنگ ۔

(۳) بورڈ آف امپلامنٹ فارٹیفکیشن (۴) سررشتۂ معدنیات (۵) سررشتۂ ڈرینج۔

اس موقع پر اس بات کا بھی بہ تشکر اظہار کیا جاتا ہے کہ سررشتۂ افواج باقاعدہ حیدرآباد بوائے اسکوٹس اور سررشتۂ تحفظ حملہ ہوائی کی مختلف سروسیوں نے اپنے مظاہرات سے نمائش میں چہل پہل پیدا کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی۔

۳۔ نمائش کا تیسرا شعبہ مرکزی اسٹال مصنوعات ملکی تھا۔ اس میں خواتین اور ان صناعوں کا سامان رکھنے کے لئے جو علحدہ اسٹال حاصل نہ کرسکتے ہوں ایک عام اسٹال قائم کیا جاتا ہے۔ اس شعبہ میں (۳۶) خواتین و اصحاب نے اپنی اشیاء داخل کیں۔ اس شعبہ میں زنانہ دستکاری و مصوری اور دیگر مصنوعات پر حسب ذیل افراد کو اسناد تقسیم کئے گئے۔

(۱) مسز تقی الدین	(۲) بی کے آہنگار	(۳) محبوب فاطمہ
(۴) مس موئدالدین حسن	(۵) واصف النسا بیگم	(۶) مسز یم شمس الدین
(۷) مسز صلاح الدین	(۸) امیر النسا بیگم	(۹) لطیف النسا بیگم
(۱۰) انجیا کماری	(۱۱) عسکری بیگم	(۱۲) بشیر سلطانہ
(۱۳) چندریش کماری	(۱۴) اسمارٹ انجینیرنگ ورکس	(۱۵) احمد علی گلبرگہ
(۱۶) نیک سنگھ فنا آرٹسٹ	(۱۷) احمد علی خانصاحب آرٹسٹ۔	

۴۔ نمائش کا چوتھا شعبہ فنون لطیفہ پر مشتمل تھا جس میں مصوری، نقاشی، عکاسی اور خطاطی جیسے فنون کے متعلق اہل ملک کی محنت و ذہانت کے نمونے فراہم کئے گئے۔ اس شعبہ میں (۱۵۸) افراد نے اپنی اشیاء داخل کیں۔ انعامات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مضمون	نام آرٹسٹ	انعام
(۱) بلاک اینڈ وہائٹ ہیڈ اسٹڈی	سید محمد مسلم	پہلا انعام
(۲) لینڈ اسکیپ خلد آباد کا منظر	وٹھل راؤ	پہلا انعام

کبوتر خانہ	گوئید سوامی	دوسرا انعام
(۳) اسٹل لائف	میر محمد باقر	
اسٹل لائف		پہلا انعام
(۴) ماڈلنگ موسم گرما	راج کمار	دوسرا انعام
پنہارن	آگار کر	پہلا انعام
بُدھ	گنگا رام	دوسرا انعام
(۵) کمپوزیشن		
فصل	زینت حسن نواز جنگ	پہلا انعام
پوجا	لکشمی بائی	دوسرا انعام
(۶) فوٹوگرافی		
دریائے مانیر	زکیہ بیگم	پہلا انعام
میرہ پونچی	دہرم پوری	دوسرا انعام
(۷) پوسٹر		
جانئن آئی، اے ایف	بی، وی پٹواری	پہلا انعام

۵ - نمائش کا پانچواں شعبہ جاگیرات پر مشتمل تھا - سات جاگیرات نے اپنے علحدہ علحدہ اسٹال قائم کئے - ادارہ مصنوعات پارچہ مسلم بافندگاں انجمن مصنوعات پارچہ مسلم بافندگان انجمن مصنوعات دستی پارچہ بافی نے پہلی دفعہ نمائش میں شرکت کی - مجلس جاگیرداران کی توجہ سے اس قدر اسٹال شرکت کر سکے - مزید جاگیرات کو توجہ کی ضرورت ہے

۶ - نمائش کے چھٹے شعبہ میں اس امر کا اہتمام کیا گیا تھا کہ مملکت کے خام اشیا سے مصنوعات تیار کرنے کے مختلف طریقوں سے اہل ملک کو روشناس کیا جائے - یہ شعبہ عام دلچسپی کا مرکز ہوتا ہے توقع ہے کہ رفتہ رفتہ اس شعبہ کے کام کی بدولت ملک میں نئی نئی صنعتیں وجود میں آئیں گی -

اور موجودہ صنعتیں اور زیادہ ترقی پائیں گی اس شعبہ میں (۳۶) اسٹال قائم ہوئے ان میں سر رشتہ جات سرکاری کا انجمن ہائے مفاہی اور عام صناع اپنے اپنے کام کا مظاہرہ کرتے تھے ۔ اس شعبہ میں سرکاری سررشتہ جات کو جدا کر کے انعامات کے استحقاق کی تفصیل یہ ہے

طلائی تمغہ

(۱) مشری صدیق موٹر ورکس　　(۲) روغنیات ۔ ٹام ٹام کمپنی

(۳) خطاطی اعظم بن کمپنی　　(۴) گیاس پلانٹ سید محبوب علی صاحب

نقرئی تمغہ :۔ (۱) کھادی ودیالیہ　　(۲) نیو الکٹرک ورکس

نقرئی تمغہ :۔ (۱) محمد عبدالرحمن　(۲) شیخ اسمٰعیل　(۳) ابراہیم علی قلی　(۴) اعظم ڈیوینگ ورکس

(۵) کلیہ اناث　(۶) اسپرے پرنٹنگ

۶ ۔ نمایش کا چھٹا شعبہ تفریحات سے متعلق تھا ۔ اس موقع پر اس بات کا اظہار نامناسب نہیں کہ تفریحات نمایش کا اصلی مقصد نہیں رہتا ہے ۔ ان کی غرض بس اس قدر ہے کہ نمایش میں آنے والے بکثرت افراد کی تفریح و دلبستگی کا بھی کچھ نہ کچھ سامان ہو جائے ۔ اس شعبہ میں (۲۷) اسٹال قائم ہوئے اس شعبہ میں کسی اسٹال کو مستحق سند قرار نہیں دیا جاتا ۔

سال حال فینسی ڈریس شو کا مظاہرہ بھی کیا گیا ۔ اس میں جس لباس پر انعام دیا گیا ۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے ۔

(۱) خضر محمد خاں ۔ نقیب نمایش　　(۲) بہاؤ الدین حسن دانیال شہزادہ راجپوتانہ

(۳) محمد علی خان ۔ مارواڑی　　(۴) محمدی بیگم ۔ مارواڑنی

(۵) حلیمہ بیگم ۔ حجابی　　(۶) سید محی الدین ۔ پنڈت

(۷) اختری بیگم　چینی　　(۸) اکبری بیگم ۔ صفائی والی

(۹) خواجہ فرید الدین ۔ چاؤش　　(۱۰) واجد سلطان ۔ قاضی

نمایش اطفال کے انعامات کے لئے عثمانیہ بلدی جماعت کو ایک سو روپیہ کی امداد دی گئی ۔

بہر حال نمائش میں (۲۲۷) اسٹال قائم ہوئے اگر جگہ کی تنگی مانع نہ ہوتی تو اس تعداد میں اتنا ہی اضافہ بالکل ممکن ہوتا۔ اکثر صناع اور سررشتہ جات مزید اسٹالوں کے متقاضی تھے لیکن کارکنان نمائش کی مجبوریاں بالکل ظاہر تھیں۔

سررشتۂ صنعت و حرفت نے نقد انعامات کے لئے مبلغ (۶۰۵/) چھ سو پانچ روپیہ مرحمت فرمائے۔ اس کا شکریہ بھی ضروری ہے۔ علاوہ ازیں انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ سے نمائش کے علم فنڈ میں آٹھ ہزار روپیہ کا عطیہ منظور ہوا۔ بہر حال نمائش سرکاری و غیر سرکاری تعاون عمل کا ایک حقیقی مظاہرہ ہے۔ اور اس کی کامیابی میں جو ہاتھ بٹایا جاتا ہے۔ اس کا دلی شکریہ ادا کیا جاتا ہے سررشتۂ صنعت و حرفت کی نقد رقم حسب ذیل صناعوں اور ادارہ جات کو تقسیم کی گئی۔

(۱) ہمارا اسٹال	۲۵	(۲) اعظم ویونگ ورکس	۲۰
(۳) محمد ابراہیم علی قلعی پٹن	۲۰	(۴) حسین خاں فرخ نگر	۲۰
(۵) دکن ہائٹ ورکس	۵	(۶) شیخ احمد جان محمد گیتی ساز بیڑ	۲۰
(۷) انجمن ہائے اسلامیہ سیپرتی	۵	(۸) نیوالکٹرک ورکس	۵
(۹) مدرسہ فیض النسواں صنعت و حرفت	۵	(۱۰) احمد علی گھڑی ساز گلبرگہ	۵
(۱۱) کھادی ودیالیہ	۲۰	(۱۲) عزیز احمد پدا پلی	۲۰
(۱۳) ٹام ٹام کمپنی	۵	(۱۴) صدیق موٹر ورکس	۵/
(۱۵) ایڈڈ انڈسٹریل اردو اسکول کار	۲۰	(۱۶) تکارام کھام گاؤں برار	۲۰

صناعوں میں تقسیم کرنے کے لئے جن اصحاب و خواتین سے تمغہ جات اور کپ وصول ہوئے ان کی تفصیل نہایت مخلصانہ شکریہ کے ساتھ درج ذیل ہے

اسمائے معطی صاحبان	مراحمت عطایا	معطی لہ
ہز ہائی نس حضرت والا شان ولی عہد نواب اعظم جاہ بہادر	طلائی تمغہ	سید محبوب علی صاحب آٹو موبائیل گیاس پلانٹ

نمبر	نام	انعام	انعام یافتہ
۲	حضرت والاشان نواب اعظم جاہ بہادر	طلائی تمغہ	سکھ دیو پرشاد صاحب آٹو موبائل گیاس پلانٹ
۳	حضرت والاشان نواب اعظم جاہ بہادر	طلائی تمغہ	غلام جیلانی صاحب آرٹسٹ
۴	حضرت شہزادی درشہوار دردانہ بیگم صاحبہ	طلائی تمغہ	لیلیٰ بیگم حسن نواز جنگ
۵	ہز ایکسلنسی نواب میر احمد سعید خان صاحب بہادر صدر اعظم باب حکومت	طلائی تمغہ	محمد ابراہیم صاحب آرٹسٹ
۶	ہز ایکسلنسی نواب سر احمد سعید خان صاحب بہادر صدر اعظم باب حکومت	طلائی تمغہ	عبدالغفور صاحب علی قلی پٹن
۷	نواب عقیل جنگ بہادر نائب صدر اعظم	طلائی تمغہ	صدیق موٹر ورکس
۸	نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات	طلائی تمغہ	غیاث الدین صاحب آرٹسٹ
۹	راجہ دھرم کرن بہادر صدر المہام تعمیرات	کپ	ڈیونار فرنیچر ورکس
۱۰	مولوی سعید العزیز صاحب صدر المہام عدالت	طلائی تمغہ	مس آبھا گنگولی
۱۱	نواب ظہیر یار جنگ بہادر امیر پائیگاہ	طلائی تمغہ	سمتان امر چنتہ
۱۲	نواب کمال یار جنگ بہادر	طلائی تمغہ	اسٹیٹ راجہ دھرم کرن بہادر آصف جاہی
۱۳	رانی گیرا بائی والیہ اسٹیٹ بوم		لال گڑھی جاگیر نواب بہادر یار جنگ بہادر
۱۴	رانی صاحبہ راجہ دھرم کرن بہادر	نقرئی تمغہ	ادارہ مصنوعات مسلم پارچہ بافندگان الندرشریف
۱۵	" " " " " "	" "	انجمن مصنوعات دستی پارچہ بافی الندر شریف
۱۶	" " " " " " " "	کپ	دیوی اشیا کماری اسٹیٹ امر چنتہ
۱۷	" " " " " " " "	" "	خورشید بیگم (داشال مرکز مصنوعات ملکی)
۱۸	" " " " " " " " "	" "	دھرم کرن انڈسٹریل گرلز اسکول
۱۹	نواب میر اکبر علیخاں صاحب بیرسٹر	طلائی تمغہ	سرور پیپر ملز
۲۰	" " " " " " " "	نقرئی تمغہ	ادشدھی ساڑا ابرار

۲۱۔ نواب غوث یار جنگ بہادر	کپ	اسٹیٹ ہموم	
۲۲۔ نواب دوست محمد خاں صاحب جاگیردار	طلائی تمغہ	ہمرو کمخواب فیاکٹری اورنگ آباد	
۲۳۔ نواب اکبر یار جنگ بہادر	کپ	کارخانہ گلزار دکن بیدر	
۲۴۔ " " " " "	"	کارخانہ تاج دکن بیدر	
۲۵۔ نواب داؤد جنگ بہادر	طلائی تمغہ	حیدرآباد کیمیکل اینڈ فارماسیوٹیکل ورکس	
۲٦۔ حکیم نارائن داس صاحب وید ان وید	کپ	سررشتۂ افواج باقاعدہ سرکار عالی	
۲۷۔ " " " " "	" "	سررشتہ اے، آر، پی سرکار عالی	
۲۸۔ " " " " " "	نقرئی تمغہ	عبدالقادر عطر ساز برار	
۲۹۔ سید محمد ہادی صاحب ناظم بوائے اسکوٹس	کپ	گورنمنٹ کالج آف فزیکل ایجوکیشن	
۳٠۔ پریم جی لال جی صاحب نائب صدر مجلس بلدیہ مجلس نمائش	" "	گوکل داس صاحب کنٹراکٹر	
۳۱۔ راجہ گرو داس صاحب جاگیردار	" "	اردو اینڈ ہیڈ انڈسٹریل اسکول دارادہ برار	
۳۲۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر	طلائی تمغہ	مس لیلا ہارڈی کر	
۳۳۔ نواب بہادر یار جنگ بہادر	بیدری تمغہ	انجمن ہائی اسکول کہام گاؤں برار	
۳۴۔ " " " " " "	" "	اردو اینڈ ہیڈ انڈسٹریل اسکول دادادہ برار	
۳۵۔ غلام علی محمدی صاحب ناظم صنعت وحرفت وظیفہ یاب	۲٠ روپیہ	اردو اینڈ ہینڈ انڈسٹریل اسکول دارادہ برار	
۳٦۔ " " " " " " "	نقرئی تمغہ	لکشمی آئل ملز اکولہ	
۳۷۔ " " " " " " "	" "	دی ودھربا ملز ایلچ پور	
۳۸۔ " " " " " " "	" "	دی مہتا ملز اکولہ	
۳۹۔ " " " " " " "	۱٠ روپیہ	محمد شجاعت شطرنجی ساز برار	
۴٠۔ خواجہ محمد احمد صاحب مددگار آثار قدیمہ	بیدری تمغہ	محمد علاؤالدین جمال برار	

نمبر	نام	انعام	پانے والا
۴۱	خواجہ محمد احمد صاحب مددگار آثار قدیمہ	نقرئی تحفہ	آرجی کہا لو، آرٹسٹ
۴۲	؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍	؍؍ ؍؍	نارمل اسکول امراوتی
۴۳	ڈی، وی، لبسواکر	زیورات	کملانی بابستے امراوتی
۴۴	خواجہ حمید احمد صاحب مددگار اعداد شمار	نقرئی تحفہ	پرائمری اسکول کارنجہ
۴۵	محمد عبد العلی صاحب نائب معتمد مجلس نمایش	کپ	میر محمود علی صاحب مہتمم موجد نظام پینٹ
۴۶	حاجی شیخ بابے صاحب	؍؍ ؍؍	گلبہار ہیر آئیل کمپنی
۴۷	؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍	کپ	مرزا محمود الحسن صاحب مہتمم نشرگاہ نمایش
۴۸	مسٹر مدن گوپال	؍؍ ؍؍	کماری لشیا دیوی مرکزی اسٹال
۴۹	فصیح الدین احمد صاحب معتمد دارالمطالعہ نامپلی	؍؍ ؍؍	محبوبیہ کارخانہ جلد سازی
۵۰	رائے بہادر سری کشن سکھدیو مالیانی	نقرئی تحفہ	آٹو موبائل گیاس پلانٹ
۵۱	خان بہادر احمد علاؤالدین صاحب	۱۰۰ روپیہ	دنکٹا کشنیا زرگر ۲۵ روپیہ
			ناکوڑ نارائن تورنا ۲۵ روپیہ
			سیدہ کور وکنک ۵۰ روپیہ
۵۲	مولوی محبوب علی صاحب سابق ناظم لاسلکی	کپ	گوکل داس الکٹرک کنٹراکٹر
۵۳	مجلس نمایش معاشی کمیٹی	کپ	حیدرآباد بلے اسکوائش
۵۴	؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍	کپ	خلیل اللہ صاحب آرٹسٹ
۵۵	؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍	کپ	سری چتر گپت ر و درس
۵۶	؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍	کپ	شیخ حسین متعلم دفتر مجلس نمایش
۵۷	؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍	کپ	قاضی آصف الدین صاحب دفتر مجلس نمایش
۵۸	؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍	سگریٹ کیس نقرئی	آغا خلیل الرحمن صاحب صدر [illegible] کوتوالی بلدہ
۵۹	؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍	نقرئی ڈبیہ	امین صاحب کوتوالی بلدہ

۶۰ - مجلس نمائش معاشی کمیٹی سگریٹ کیس نقروی محمد نعیم الحق صاحب امین بلدیہ

۶۱ - " " " " " " نقروی ڈبیہ محمد سعید صاحب امین بلدیہ

۶۲ " " " " " " " " ونکٹ چاری صاحب اورسیر بلدیہ

۶۳ - " " " " " " " " ونکٹ گوپال نائیڈو صاحب اورسیر بلدیہ

ان کے علاوہ رضا کاروں کو مجلس نمائش کی جانب سے ۴۰ نقروی تمغہ جات عطا کئے گئے ۔ مزدوران بلدیہ حیدرآباد ۔ جوانان سررشتۂ کوتوالی اور مالیان باغ عامہ کو پانچ سو روپیہ سے زائد کے پارچہ جات تقسیم کئے گئے ۔

اس بات کا اظہار بھی بے محل نہیں ہے کہ نمائش میں بیرون بلدہ کے صناع بھی اپنے اسٹال قائم کرتے ہیں ۔ لیکن موجودہ زمانہ کی گوناگوں مشکلات کی وجہ سے اضلاع سے صناعوں کی خاطر خواہ تعداد نمائش میں شریک نہیں ہوسکتی ۔ بہرحال اس جانب توجہ کی جارہی ہے کہ بلدۂ حیدرآباد کے علاوہ اضلاع میں بھی صنعتی نمائشوں کا انعقاد عمل میں لایا جائے ، اور چونکہ بعض مقامات میں عرس اور جاتراؤں کے مواقع پر نمائشوں کا انعقاد بھی عمل میں آرہا ہے ۔ اس لئے وہاں کی نمائشوں کی امداد کی جارہی ہے ۔ چنانچہ گزشتہ دو سال سے پربھنی کی نمائش میں ایک ایک سو روپے کی امداد دی جارہی ہے ۔ اور صنعتی و زرعی نمائش ضلع نلگنڈہ کو بھی ایک سو روپے کی امداد دی گئی ۔ یہ رقم ان صناعوں میں تقسیم ہوجو مقامی ہوں اور جو بلدہ کی نمائش میں شرکت کا وعدہ کریں ۔ امداد نمائش ہائے اضلاع سرکار عالی کے ذیلی قواعد مجلس نمائش سے منظور ہو چکے ہیں ۔

رضاکارانہ اصول پر نمائش منعقد کرنے کا خیال اب اس قدر مستحکم ہوگیا ہے کہ چند سال پہلے اس کا خیال بھی نہیں ہوسکتا تھا ۔ نمائش کی جیسی بڑی تنظیم میں کسی نہ کسی خامی کا رہنا ضروری ہے ۔ توقع ہے کہ رفتہ رفتہ خامیاں دور ہوجائیں گی اور حقیقی تنظیم اور خوش اسلوبی جلد قائم ہو جائے گی ۔

یہ بات بہت مشکل ہے کہ کارکنان نمائش میں سے ہر ایک کے کام کا تفصیلی تذکرہ کیا جاسکے حقیقت یہ ہے کہ ان کے کام کا کوئی صلہ نہیں ہوسکتا ۔ رسمی شکریہ سے ان کا کام بالاتر ہے ۔

شبانہ روز محنت برداشت کرنا اپنے خانگی ضرورتوں کو ایک بڑے عرصہ کے لئے بالائے طاق رکھ دینا۔ اٹھتے بیٹھتے نمایش کے دہن میں لگے رہنا، شکایتوں کو سننا مشکلات سے نہ گھبرانا اور نمایش کی کامیابی کو اپنی ذاتی کامیابی سمجھنا تعریف اور شکریہ سے بالاتر ہے۔ بیسیوں دماغ اور بیسوں ہاتھ نمایش کی کامیابی کے لئے دن رات مصروف رہتے ہیں۔ خدا کرے کہ خدمت ملک کا یہ جذبہ اور رضاکارانہ کام کا یہ ذوق و شوق سب برادروں میں اور زیادہ مستحکم ہوتا جائے اور بڑے سے بڑا کام ان سے انجام پائے فقط

انجمن طیلسانیین عثمانیہ کی مطبوعات

۱۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیان ریاست عادل شاہی دور تولیت کی بسیط اور محققانہ تاریخ۔ مولفہ سید علی محسن صاحب ایم، اے (عثمانیہ) قیمت بارہ آنے ۱۲/

۲۔ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی مفصل محققانہ اور مستند تاریخ۔

مولفہ ظہیر الدین صاحب ایم، اے (عثمانیہ) قیمت عہ

۳۔ امام غزالی کے کلامی خصوصیات۔

از محمد غوث صاحب (محبوب نگری) ام اے قیمت عہ

۴۔ موضع ودپلی کی معاشی تحقیق۔

از محمد ناصر علی صاحب، ایم، اے (عثمانیہ) زیر طبع

ارکین انجمن اور خریداران مجلہ طیلسانیین عثمانیہ سے نصف قیمت کتب نیز وشوق کے ساتھ خاص علیت بغرض سہولت کتابیں نہایت دلچسپی بھی دیجاتی ہیں!

ملنے کے پتے {
(۱)۔ دفتر مجلہ طیلسانیین (انجمن طیلسانیین عثمانیہ) حیدرآباد دکن نظام شاہی روڈ
(۲) مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن!

آموں کی نمائش

زیر سرپرستی مجلس نمائش معاشی کمیٹی (انجمن طیلسانین عثمانیہ)

من ابتدائے ۳ر امرداد سنہ ۵۲ف لغایتہ ۵ر امرداد سنہ ۵۲ف

بمقام

باغ عام بلدہ حیدرآباد

صدر انتظامی کمیٹی

پروفیسر سعید الدین صدر شعبۂ نباتیات جامعہ عثمانیہ

تفصیلی قواعد حسب ذیل پتہ سے طلب فرمائے جائیں فقط

محمد نجم الدین بی۔ اے

اعزازی معتمد

دفتر انجمن طیلسانین عثمانیہ

معظم بلڈنگ

روبروئے معظم جاہی مارکٹ

ٹیلیفون نمبر ۲۵۵۳

حیدرآباد دکن

مجلۂ طیلسانین کا چندہ و اشتہارات کا نرخ

مجلۂ کے چندہ کے متعلق حسب ذیل امور پر عمل ہوگا

(۱) (الف) مجلہ چندہ دہندہ ارکان انجمن طیلسانین عثمانیہ کو مقررہ قواعد کے بموجب بلاقیمت ارسال کیا جائیگا۔

(ب) مجلہ کا حصہ موسوم بہ "معاشیات" معاشی کمیٹی انجمن طیلسانین کے ارکان کے پاس بلاقیمت ارسال کیا جائیگا۔

اگر مجلہ کے دونوں حصے مطلوب ہوں تو اس کے لئے (عہ) ایک روپیہ سالانہ اپنے چندہ کی قیمت کے علاوہ ادا کرنا ہوگا۔

(ج) مجلہ کے دونوں حصوں کی قیمت محصول ڈاک کے علاوہ خریداران مملکت آصفیہ سے پانچ روپیہ سکۂ عثمانیہ سالانہ ہوگی اور بیرون مملکت آصفیہ سے پانچ روپیہ سکۂ حکومت ہند۔

(د) مجلہ کے عام حصہ کی قیمت محصول ڈاک کے علاوہ خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ تین روپیہ سکۂ عثمانیہ ہوگی۔ اور بیرون مملکت آصفیہ سے تین روپیہ سکۂ حکومت ہند۔

(ہ) مجلہ کے حصۂ "معاشیات" کی قیمت مع محصول ڈاک خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ تین روپیہ سکۂ عثمانیہ ہوگی۔ اور بیرون مملکت آصفیہ سے تین روپیہ سکۂ حکومت ہند۔

(۲) مجلہ کے ہر حصہ کی قیمت فی نسخہ ایک روپیہ ہوگی۔ دونوں حصوں کی قیمت فی نسخہ ایک روپیہ آٹھ آنے ہوگی۔

(۳) اشتہارات کا نرخ حسب ذیل ہوگا۔

مقدار	نرخ سالانہ	نرخ فی اشاعت
پورا صفحہ پہلا ورق	۱۵ عہ	صہ
" اندرونی	۱۰ عہ	۳ سے
نصف صفحہ پہلا ورق	ہحہ	۲ عا
" اندرونی	صہ	۱ عصہ

البتہ تبادلہ کے طور پر اشتہارات کی اشاعت مطلوب ہو تو مراسلت کے ذریعہ تصفیہ ہوسکے گا۔

(۴) مجلہ کے سلسلہ میں ہر قسم کی مراسلت معتمد انجمن طیلسانین عثمانیہ کمرہ نمبر ۲۰ مجردگاہ سٹرک نظام شاہی حیدرآباد کے نام کی جانی چاہیئے۔

(۵) خریداران اپنے پتہ کی تبدیلی سے مہتمم مجلہ کو بروقت مطلع فرمائیں۔

انجمن طیلسانیین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی ترجمان

مجلہ طیلسانیین

ساتویں جلد ۔ امرداد ۱۳۵۲ف ۔ جولائی ۱۹۴۳ء ۔ جمادی الثانی ۱۳۶۲ھ ۔ تیسرا شمارہ

مدیر ۔ محمد غوث ایم ۔ اے ۔ ال ال بی (عثمانیہ)   مہتمم ۔ محمد عبد العلی بی ایس سی ال ال بی (عثمانیہ)

معاون مدیر ۔ اکبر علی [illegible] (عثمانیہ)

فہرست مضامین

عرضِ حال

مولوی محمد یوسف الدین مرحوم بی۔ اے مہتمم کتب خانۂ جامعۂ عثمانیہ کے انتقال کی وجہ سے عثمانیہ برادری کا جو نقصان ہوا اس پر صبر کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ مرحوم جامعۂ عثمانیہ کی اس جماعت میں شامل تھے جس نے سب سے اول طیلسان حاصل کیا۔ طیلسان حاصل کرتے ہی ان کا انتخاب کتب خانہ کی مہتممی پر عمل میں لایا گیا اور ٹریننگ کے لئے لاہور بھیجے گئے۔ واپسی کے بعد سے تقریباً ۲۰ سال گزرے کہ کتب خانہ تھا اور وہ تھے۔ جامعہ کے کتب خانہ کو اس درجہ پر پہونچانے میں ان کی سرگرمی کو بھی بڑا دخل تھا۔ ان کے جیسا خلیق و ملنسار، ہنس مکھ اور زندہ دل صحت مند اور توانا آدمی دق کا شکار ہو کر یوں آناً فاناً دنیا سے اُٹھ گیا۔ انتقال سے چند ہفتے قبل دواخانہ میں ملاقات ہوئی تھی گو ضعف و نقاہت نے غلبہ پالیا تھا لیکن کتب خانہ کی ادھیڑ بن میں ہی تھے۔ اپنے کام کی فکر دامن گیر تھی اور یہ خواہش کہ ان سے اور زیادہ خدمت سرانجام پائے۔ مرنے والا تو خیر دنیاوی تفکرات و آلام سے نجات پا جاتا ہے لیکن دوستوں کو پس ماندوں کی بےبسی اور بےکسی بہت تڑپاتی ہے۔ خدا کرے کہ مرحوم کی کم سن اولاد کی کفالت اور پرورش کا کوئی ایسا انتظام ہو جائے کہ یتیمی کے پرشفقت ماہ و سال اطمینان اور دلجمعی سے گزر جائیں۔

ترتیبِ مجلّہ

۱۔ مجلّہ کو اپنے مشکلات سے ابھی کامل طور پر رہائی نصیب نہیں ہوئی ہے لیکن خدا کا احسان ہے کہ خدمت گذاری کا سامان ہو رہا ہے۔

۲۔ مجلّہ کی اس اشاعت میں نظموں کا بھی جزو شریک ہے۔ مجلّہ میں ابتدا سے ہی اچھی نظمیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اب جو سلسلہ شروع ہوا ہے توقع ہے کہ وہ جاری رہیگا اور مجلّہ میں ایسی نظمیں شائع ہونگی جو دلوں کو گرماتی اور آگے بڑھنے کی ہمت دلاتی ہیں۔

۳۔ اس شمارے میں امتحان ام۔ اے کیلئے لکھا ہوا ایک اور مقالہ بہ تمام و کمال شائع ہو رہا ہے۔ اس مقالہ کا موضوع "دربارِ اودھ کا اثر اردو شاعری پر" ہے۔ اسکے مولف مولوی محمد اعظم خانصاحب ام۔ اے لکچرار

جامعۂ عثمانیہ ہیں۔ ادبیات کے سلسلہ میں اس سے قبل ایک مقالہ جس کا موضوع "اردو ادب بیسویں صدی میں" تھا اور جس کے مولف مولوی سید حسینین صاحب زیبا ام۔اے (عثمانیہ) تھے، شائع کیا گیا تھا۔ ادبی حلقوں میں اس کا اچھا اثر پیدا ہوا تھا۔ توقع ہے کہ اب یہ نیا مقالہ بھی علمی حلقوں میں اپنی جگہ حاصل کریگا۔

۴۔ "موضع دوپلی کی معاشی تحقیق" کے موضوع پر محمد ناصر علی صاحب ام۔اے لکچرار جامعۂ عثمانیہ کا جو مقالہ ایک عرصے سے قسط وار شائع ہو رہا تھا وہ بھی مجلّہ کی اس اشاعت کے حصۂ معاشیات میں بہ تمام و کمال شائع کر دیا گیا ہے۔ اس مقالہ کی طباعت ایک بڑے عرصے سے جاری تھی اسلئے ممکن ہے کہ بعض ناظرین کے پاس اسکے اوراق مکمل طور سے موجود نہ ہوں۔ شائقین اس مقالہ کو مکمل صورت میں رعایتی قیمت سے حاصل کر سکتے ہیں۔

۵۔ مجلّہ کی آئندہ اشاعت کو گزشتہ کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ کے مقالات، خطبات اور دیگر تفصیلات کے لئے مختص کر دیا گیا ہے۔

فکر و نظر

جنگ کے اختتام کے بعد ہر ملک کے حالات میں جو تغیر واقع ہوگا اسکو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کیلئے ہر جگہ غور و خوض ہو رہا ہے۔ خیال یہ کیا جا رہا ہے کہ تغیر بہت ہی عام ہوگا اور زندگی و معاشرت کا کوئی پہلو اس سے بچ نہ سکیگا۔ نیز حکومت کی مشنری اور نظم و نسق کا نظام بھی بدل جائیگا۔ اس سلسلہ میں اس امر پر بھی غور ہو رہا ہے کہ نظم و نسق کو چلانے والوں کو آئندہ کس قسم کے سانچہ میں ڈھالا جائے۔ انگلستان کے ارباب فکر بھی اس بارے میں غور کر رہے ہیں چنانچہ (New states man and nation) نے اپنی ایک حالیہ اشاعت میں انگلستان کی "سول سروس" کے متعلق یہ خیالات ظاہر کئے ہیں کہ:۔

۱۔ اگر برطانوی سلطنت کو ترقی پذیر رجحانات کے ساتھ چلانا پیش نظر ہے۔ اگر برطانیہ کے معاشرہ کو نئے سانچہ میں ڈھالنا مقصود ہے اور اگر برطانوی دولت عامہ کے دوسرے ممالک کے تعلقات کے سلسلہ میں نیا دور شروع کرنے کا منشا ہے تو سول سروس کے لئے بھرتی، تربیت اور تنظیم کے بالکل نئے طریقے اختیار کرنے ضروری ہیں۔

۲۔ سول سروس کے موجودہ ارکان اور بالخصوص وہ ارکان جو بالاتر خدمات پر مامور ہیں۔ بلند خیالی سے خالی ہیں۔ ان اصحاب میں معاشرہ کی نئی تنظیم و سلطنت کو نئے سانچہ میں ڈھالنے کے لئے نہ تو کوئی جوش ہے نہ سرگرمی۔

ملک کی روایات ہیں کسی تبدیلی کا خیال ان لوگوں میں خوف و ہراس پیدا کر دیتا ہے اور کسی تبدیلی کیلئے کوئی تجویز پیش کی جاتی ہے تو اس کو سرد مہری کے ساتھ رد کر دیا جاتا ہے۔

۳۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نو آبادیات اور ماتحت ممالک کے معاملات میں بلکہ خود برطانیہ عظمیٰ کے قومی معاملات میں نہ تو کوئی بلند پروازی کا اظہار ہوتا ہے اور نہ کوئی تعمیری پالسی اختیار کی جاتی ہے۔ تعمیر مکانات، انشورنس، ٹاؤن پلاننگ مجرموں سے جو سلوک روا رکھنا چاہیئے ان سب امور میں سول سروس کے ارکان نے نہ تو جوش کا اور نہ تعمیری قابلیت کا اظہار کیا۔

۴۔ سول سروس کیلئے بھرتی اور تربیت کے اصول آج بھی وہی ہیں جو ایک صدی قبل میتھم کے ہم خیالوں نے قرار دیئے تھے۔

۵۔ اب دنیا بدل چکی ہے اور حکومت کے فرائض اور مشاغل قرار دینے میں ایک انقلاب عظیم ہو چکا ہے۔ لیکن سول سروس کے لئے قدیم اصولوں پر ہی عمل پیرائی جاری ہے۔

کلکتہ کی جامعہ کے سرکاری ترجمان کلکتہ ریویو نے اپنی اشاعت بابتہ ماہ جون ۱۹۴۳ء میں اسکے متعلق یہ اظہار خیال کیا ہے کہ خود ہندوستان کی سول سروس کے متعلق بھی اس روشنی میں غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ حکومت کو اپنے نئے فرائض اور مشاغل میں ناکامی کا سامنا نہ ہو۔

حیدرآباد کے تعلق سے اس مسئلہ پر غور و خوص کرنے کے لئے نہ معلوم ہمارے جدید سررشتۂ اصلاحات بعد جنگ کو کوئی ہدایت دی گئی ہے یا نہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ حیدرآباد کے وہ افراد جو آئندہ حکومت کی کرسیوں کو زینت دینگے سب سے اول خود حضرت بندگانعالی متعالی مدظلہ العالی کی متابعت میں "خادم خلق اللہ" ہوں۔

اعلیحضرت بندگان عالی مدظلہ العالی نے اپنی سلور جوبلی کے موقع پر جو پیام تہنیت فرجام اپنی عزیز رعایا کیلئے صادر فرمایا تھا۔ اس میں حضرت نے خود بدولت کو "ساعی خدمت خلق اللہ" قرار دیا تھا۔ خود پیام کے متن میں یہ ارشاد سراپا رشاد ہوا تھا کہ

"میں مخلوق خدا کی خدمت کما حقہ ادا کر کے اپنے بعد اپنے ملک و خاندان کیلئے ایسی یادگار چھوڑ جاؤں جو کہ میرے آئندہ آنیوالی نسلوں کیلئے باعث صد فخر و نازش و قابل تقلید بن سکے"۔

جشن سیمیں کے ہی موقع پر رعایا کے سپاس نامہ کے جواب میں یہ ارشاد گہر ریز ہوا تھا کہ

"خادم خلق اللہ ہونا میرا سب سے بڑا طرۂ امتیاز ہے"

جامعۂ عثمانیہ کے دار المطالعہ میں جو شبیہ مبارک آویزاں ہے اس پر حضرت آصف سابع نے اپنے قلم

صداقت رقم سے "خادم قوم وملت" تحریر فرمایا ہے۔

حیدرآباد کے موجودہ اور آئندہ عہدہ داروں کیلئے بھی زندگی کا ماٹو اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ یوں مشرق میں شروع سے ہی یہی روایات ہیں کہ "سید القوم خادمھم" اگر مغرب اور وہ ممالک جو مغرب کی تقلید کرنا چاہتے ہیں یا امن وچین کے متلاشی ہیں تو ان کیلئے مشرق کے روایات اخلاق وسیاست میں ابھی بہت سے گر تلاش کرنے ہیں۔

مجلّہ کی گذشتہ اشاعت میں انسداد گداگری کے متعلق اظہار خیال کیا گیا تھا۔ یہ توقع تھی کہ معاشرہ سے اس مرض کے ازالہ کے لئے گرم جوشی کا اظہار ہوگا اور آنریبل مولوی بی۔ عبدالعزیز صاحب کی سعی ایک وقت مشکور ہوکر پھر رائیگاں نہ جائیگی لیکن بہت ہی افسوس ہے کہ دو ایک سال کے دوران میں سعی وکوشش کے جو مراحل طے کئے گئے وہ گلدستۂ طاق نسیاں ہوتے جارہے ہیں۔ اگر اہل حیدرآبادیوں ہر دوڑنے والے کے ساتھ کچھ دور دوڑ کر تھک جائیں اور ایسے تھکیں کہ پھر منزل مقصود کا پتہ بھی نہ چلے تو ترقی کے زیادہ مشکل اور پُرخطر مراحل کیونکر طے ہونگے۔

انسداد گداگری کے قانون کے ذریعہ یہ توقع قائم کی گئی تھی کہ حیدرآباد کی بلدیہ اس بار کو برداشت کریگی اور اپنی تنظیم کے ذریعہ گداگری کے ناسور کو دور کردیگی۔ لیکن "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" اب تو یہ خطرہ ہے کہ گذشتہ ۹ سال کے دوران میں خود بلدیہ حیدرآباد سے جو آرزوئیں وابستہ کی گئی تھیں وہ بھی "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" کی مصداق ہوتی جارہی ہیں بلدیہ میں جو خلفشار پیدا ہوا ہے وہ سب اہل ملک کی آنکھیں کھولنے کا باعث ہونا چاہیئے اہل ملک غور کریں کہ آیا ان میں عصری عمومی اداروں کو چلانے کی کوئی قابلیت نہیں ہے؟ کیا ان میں اتنی صلاحیت بھی نہیں ہے کہ بلدیہ حیدرآباد کے محدود عام انتخابات کی مہم ہی سر کرسکیں؟ بحالیکہ جنوبی افریقہ میں مقننہ کے عام انتخابات بخیر وخوبی وبخوش اسلوبی عمل میں آتے ہیں اور آسٹریلیا میں انکی تیاری ہورہی ہے۔ حیدرآباد کے ہر اس شخص کو جو عامتہ الناس کی خدمت کا سودا رکھتا ہے، بلدیہ کے حالات اور واقعات پر بہت ٹھنڈے دل اور حزم واحتیاط سے غور کرنا چاہیئے۔ اگر آج بلدیہ ناکام ہوجائے تو کل مقننہ کی کامیابی کی کیا ضمانت ہے؟ بلدیہ کے تجربہ سے ہی اس حیثیت کے عمومی اداروں کی کامیابی یا ناکامی کا حقیقی معیار قائم ہوگا۔

دربار اودھ کا اثر لکھنؤ کی شاعری پر

از

محمد اعظم خاں، ایم۔ اے (عثمانیہ)

تعارف

مجلس علمیہ انجمن طیلسانین عثمانیہ اس غرض سے قائم ہے کہ عام طور پر تعلیم یافتگان جامعۂ عثمانیہ اور بالخصوص طیلسانین کے علمی و ادبی کارناموں کو منظر عام پر لائے اور اس طرح اردو زبان کی خدمت انجام دے اور اردو میں اعلیٰ علمی کتابیں فراہم کرے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے فی الحال یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ ام اے۔ اور ام ایس سی کے لئے مختلف موضوعات پر جو مقالے جامعۂ عثمانیہ کے مابعد طیلسان طلبہ سے لکھائے جاتے ہیں اور جن کو خود جامعۂ عثمانیہ اور بیرونی جامعات کے اساتذہ بہ حیثیت ممتحن تنقیدی نظر سے دیکھ کر منظور کرتے ہیں۔ ان کو انجمن کے ترجمان مجلۂ طیلسانین میں طبع کرنے کے علاوہ کتابی صورت میں بھی شایع کیا جائے توقع ہے کہ ان مقالوں کی اشاعت سے صحیح معنوں میں علم و ادب کی خدمت انجام پائے گی۔

زیر نظر مقالہ اپنے موضوع کے متعلق معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

اس مقالہ کے مؤلف مولوی محمد اعظم خاں صاحب ہیں۔ ۱۳۴۲ف میں موصوف جامعۂ عثمانیہ کے امتحان ام اے، میں اول رہے۔ فقط

محمد غوث

مدیر مجلۂ طیلسانین

دربار اودھ کا اثر لکھنؤ کی شاعری پر

فہرست ابواب

دربار اودھ کا اثر لکھنو کی شاعری پہ

تمہید

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ شاعری نام ہے جذبات ومحسوسات کی ترجمانی کا تو خود بخود یہہ لازم آتا ہے کہ ہر قوم کی شاعری کو اس کے ماحول کا تابع ہونا چاہیئے کیونکہ ماحول ہی وہ عظیم الشان درس گاہ ہے جہاں قلب انسانی کے صفحۂ سادہ پہ جذبات ومحسوسات کے نقوش ثبت ہوتے ہیں۔ یہہ ماحول کوئی مجرد شئے نہیں بلکہ مجموعہ ہے ان جغرافی، تاریخی، سیاسی، عمرانی، معاشی اور مذہبی حالات کا جو ہر ملک میں مختلف ہوتے ہیں اور جن کے اثر سے ایک ملک کے باشندوں کے طبعی خصوصیات دوسرے ملک کے باشندوں سے بالکل نہیں ملتے، اسی لئے ان کی شاعری میں بھی باہم فرق عظیم ہوتا ہے۔ پس کسی قوم یا اس قوم کے کسی خاص عہد کی شاعری کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے ان حالات سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے۔ جس میں اس نے نشو ونما پائی ہو۔

اردو شاعری پیدا وار ہے مسلمانوں کے دور انحطاط کی جبکہ وہ اپنے اگلے فضائل ومحاسن ہند کی "مایۂ نازش اقوام" اور "اکمال الامم" خاک کو سونپ چکے تھے۔ اسلام کی ابتدائی جمہوریت وآزادی یہاں آکر مطلق العنان حکومت اور غلامانہ فطرت سے بدل گئی تھی۔ قرون اولی کی سادگی کی جگہ تکلف ونمائش، جرأت وہمت کی جگہ بزدلی ونسوانیت اور محنت وجفاکشی کی جگہ عیش پرستی وتن آسانی نے لے لی تھی۔ مغل سلاطین کے اقبال کا ستارہ گہنا رہا تھا اور ان کی سیاست کی بساط الٹ چکی تھی۔ چنانچہ ان حالات کا عکس لازمی طور پر اردو شاعری کے آئینہ میں بھی جلوہ گر ہوا۔ پس اردو شاعری پر قلم اٹھانے والے کے لئے لازم ہوا کہ ان تمام تاریخی، جغرافی، معاشرتی اور مذہبی حالات سے بحث کرے۔ لیکن چونکہ یہ مختصر سا مضمون اس بار گراں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ

اسے اردو شاعری کے کسی ایک دور تک محدود کر دیا جائے چنانچہ لکھنؤ کی شاعری کو اس مقالہ کا موضوع قرار دیا گیا اور چونکہ لکھنؤ کی شاعری شروع سے آخر تک دربار اودھ سے وابستہ رہی اس لئے اس میں یہہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس درباری تعلق سے لکھنؤ کی شاعری پر کیا اثرات مترتب ہوئے۔ دربار اودھ ۱۷۳۲ء میں برہان الملک سے شروع ہو کر ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ پر ختم ہو گیا اس لئے غدر کے بعد کی شاعری ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

شعرا کی دربار سے وابستگی اور اس کے نتائج کے متعلق مولانا حالی مقدمۂ شعر و شاعری میں تحریر فرماتے ہیں کہ " قومی سلطنتوں میں جہاں بادشاہ حاکم علی الاطلاق نہیں ہوتا ایسی قدردانیوں سے شاعری بے انتہا ترقی پاتی ہے۔ شاعر جب تک تمام قوم میں مقبول نہیں ٹھہر جاتا سلطنت سے اس کی تقویت اور امداد نہیں ہوتی اور قوم میں وہی شاعر مقبول ہو سکتا ہے جو شاعری کے فرائض بغیر امید و بیم کے نہایت آزادی کے ساتھ ادا کرتا ہے نہ اس کو سلطنت کی دستگیری کی کچھ پروا ہے اور نہ بادشاہ کے مواخذہ کا کچھ خوف ہے۔ لیکن خود مختار سلطنتوں میں شاعر کو ہر حال میں دربار کی رضاجوئی کا لحاظ رکھنا اور آزادی سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سچے جوش اور ولولے جن کے بغیر شعر کو ایک قالب بے روح سمجھنا چاہیئے سب رفتہ رفتہ خاک میں مل جاتے ہیں نہ وہ اپنے دل کی امنگ سے کسی کی مدح کر سکتا ہے نہ سچے جوش سے کسی کی ہجو لکھ سکتا ہے۔"

بدقسمتی سے لکھنؤ کی شاعری میں دربار اودھ کے تعلق کی وجہ سے وہ تمام خصوصیات بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ جن کا مولانا حالی نے مندرجۂ صدر اقتباس میں ذکر فرمایا ہے اس لئے اگر اس دور کی شاعری پر تبصرہ کرتے وقت ہمارا قلم ان زبون اثرات کے دکھانے پر مجبور ہو جائے جو درباری تعلق کی وجہ سے اس پر مترتب ہوئے تو امید ہے کہ ہمیں معذور رکھا جائے گا۔

۲۔ سلطنت مغلیہ کا زوال

مغل بادشاہوں کا اقبال واقتدار اور دربار دہلی کی شان و شوکت اورنگ زیب عالمگیرؒ کے ساتھ ۱۷۰۷ء میں ختم ہو گئی۔ اس اقبال مند بادشاہ کی وفات کے بعد غدر ۱۸۵۷ء تک اگرچہ پورے

ڈیڑھ سو سال ان کے خاندان میں حکومت رہی اور بارہ سلاطین انہیں کی نسل سے تخت نشین ہوئے لیکن عالمگیرؒ کے انتقال کے ساتھ ہی آل تیمور کے شجر اقبال میں گھن لگنا شروع ہوا اور ایک ربع صدی کے اندر یہ صدیوں کی عظیم الشان سلطنت پارہ پارہ ہوگئی۔ سطوت وجبروت شاہی بغاوتوں اور خانہ جنگیوں سے نظم و نسق سلطنت سازشوں اور بدعنوانیوں سے اور ملک کا امن وامان غارتگری اور کشت وخون سے بدل گیا۔ وہ سلطنت جس کے حدود کشمیر سے راس کماری اور گجرات سے بنگال تک پھیلے ہوئے تھے دیکھتے دیکھتے دہلی کی چار دیواری تک محدود ہوگئی۔ دہلی جو ایک عظیم الشان سلطنت کا پایہ تخت ایک قدیم تہذیب کا گہوارہ بے قیاس زر وجواہر کا معدن اور بے شمار علماء وکملاء کا مخزن تھی اب بیرونی حملہ آوروں اور ملکی باغیوں کی جولان گاہ بن گئی۔ ایک طرف مرہٹے راجپوت اور سکھ اس پر دھاوے کر رہے تھے تو دوسری طرف ایران وافغانستان کے حملہ آور اس کی ساری دولت سمیٹ سمیٹ کر باہر لے جا رہے تھے خاندان شاہی کے مختلف ارکان تخت وتاج کے لئے باہم دست وگریباں تھے تو ہر صوبہ کا حاکم اپنی خود مختاری کی تدبیریں کر رہا تھا۔ ان ہی تدبیر کرنے والوں میں ایک برہان الملک سعادت خاں تھے جنھوں نے اس سلطنت کی بنیاد ڈالی جس کی بدولت ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا اور جہاں کی شعر وشاعری ہمارے اس مقالہ کا موضوع اصلی ہے۔

۳۔ برہان الملک۔ بانی سلطنت اودھ

(۱۷۳۲ء۔ ۱۷۳۹ء)

یہی اس زمانہ میں جب کہ عالمگیرؒ کا وصال ہوا (۱۷۰۷ء) نیشاپور سے میر محمد نصیر نام ایک شیعہ بزرگ اپنے بڑے بیٹے میر محمد باقر کے ساتھ تلاش معاش میں ہندوستان آئے اور عظیم آباد (پٹنہ) میں سکونت اختیار کی۔ لیکن وہاں دو سال نہ رہنے پائے تھے کہ انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے میر محمد امین سعادت خاں بھی ہندوستان آئے اور اپنے بھائی محمد باقر کے ساتھ دہلی کا رخ کیا۔ یہ زمانہ حضرت اورنگ زیبؒ کے جانشین شہزادہ محمد معظم بہادر شاہ اوّل کا تھا

خوش قسمتی سے محمد امین کی رسائی دربار میں ہوگئی اور شہزادوں کی جاگیر کا اجارہ مل گیا۔ یہ خدمت انھوں نے اس حسن و خوبی سے انجام دی کہ منصبداران شاہی میں شامل کر لئے گئے اور برہان الملک بہادر جنگ کا خطاب پایا۔ اس کے بعد انھیں مختلف کام تفویض ہوئے اور انھوں نے ان سب کو بڑی قابلیت کے ساتھ انجام دیا۔ آخر ان خدمات کے صلہ میں ۱۷۳۲ء میں اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔

اس زمانہ میں صوبۂ اودھ کا مستقر لکھنؤ تھا جہاں شیخ زادوں کی حکومت تھی۔ یہ شیخ زادے شیخ عبدالرحیم نام ایک بزرگ کی نسل سے تھے جنھیں اکبر اعظم کے عہد میں یہاں موروثی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ اس آبائی اثر سے فائدہ اُٹھا کر یہ لوگ ایسے خیرہ و سرکش ہو گئے تھے کہ کسی صوبہ دار کو جو دربار دہلی سے مقرر کیا جاتا خاطر میں نہ لاتے بلکہ خود شہنشاہ کے احکام کی بھی پروا نہ کرتے ان کی ان سرتابیوں سے تنگ آکر محمد شاہ نے (جو اس زمانہ میں تخت دہلی پر متمکن تھے) برہان الملک کو یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا۔ کیوں کہ اس سے قبل وہ کئی مہیں ایسی سر کر چکے تھے۔ جو دوسروں کے بس کی نہ تھیں ۔ چنانچہ بادشاہ کا یہ انتخاب بھی کامیاب ثابت ہوا۔ برہان الملک نے اس حکمت عملی سے لکھنؤ پر قبضہ کیا کہ کشت و خون کی نوبت ہی نہ آئی۔ اور رفتہ رفتہ شیخ زادوں کی قوت بالکل ٹوٹ گئی۔

اب برہان الملک نے صوبۂ اودھ کا مستقر فیض آباد کو قرار دیا جو دریائے گھاگرا کے کنارہ پر ایک چھوٹی سی قدیم آبادی تھی۔ اس کا نام جنگلہ مشہور ہوا اور یہیں قلعہ برج اور سپاہیوں کے مکانات تعمیر ہونے لگے۔ جب اسے شاہی کیمپ کی حیثیت حاصل ہوئی تو اکثر امرا نے بھی یہیں مکانات اور باغات بنوانے شروع کئے اور رفتہ رفتہ یہ ایک چھوٹا سا شہر بن گیا لیکن برہان الملک کے زمانہ میں اسے زیادہ رونق اس لئے حاصل نہ ہو سکی کہ ان کی تمام تر توجہ لشکر کی اصلاح اور فوجوں کی ترتیب و تنظیم کی طرف تھی اور وہ شہر کی آرائش پر اپنا وقت صرف نہیں کر سکتے تھے۔

غرض برہان الملک ان ہی سپاہیانہ مشاغل میں مصروف تھے کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا اور یہ دربار دہلی سے کمک کے لئے طلب کئے گئے اور اسی سال دہلی میں پیوند خاک ہو گئے ۔

برہان الملک کے زمانہ میں لکھنؤ اور فیض آباد جن باکمالوں کا مرکز رہا وہ اکثر و بیشتر اہل سیف تھے۔ اہل قلم کی اس پر آشوب فضا میں نہ ضرورت تھی نہ قدر۔ شعرائے دھلی اودھ کو اپنا ملجا و ماوا بہت بعد کو بنایا اور ان ہی کے ہاتھوں اس سرزمین میں شاعری کی داغ بیل پڑی جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

برہان الملک کی وفات تک خود دھلی میں اردو شاعری بالکل ابتدائی حالت میں تھی کیوں کہ دربار کی زبان فارسی تھی اور عام طور پر لوگ تمام علمی ضرورتوں کے لئے فارسی ہی استعمال کرتے تھے۔ اردو میں شعر کہنا اہل دہلی اوس وقت تک اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے اور اوسے ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے رہے جب تک کہ ولی اورنگ آبادی نے ۱۷۲۲ء میں دہلی کا دوسرا سفر نہ کیا۔[۱] اس سفر میں جب ولی اپنا دیوان ساتھ لائے مشاعروں میں اپنا اردو کلام سنایا اور عام طور پر لوگوں کو دکھایا تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ اردو زبان بھی شعر و شاعری کے قابل ہے۔ یہہ نکتہ ہمیشہ پیش نظر رہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ولی دکنی جو شاعری دکن سے لائے تھے وہ دلی میں مقبول نہیں ہوئی۔ ان کی وہ شاعری مقبول ہوئی جو انھوں نے حضرت شاہ گلشن رح کی اس ہدایت کی پابندی میں اختیار کی کہ تغزل میں فارسی تغزل کا رنگ بجائے ہندی تغزل کے داخل کرنا چاہیئے۔ اس طرح وکی دتی کے فیض یافتہ بھی تھے اور فیض رسان بھی چنانچہ خود کہتے ہیں:-

دل وَلی کا لے لیا دِتی نے چھین :: جا کہو کوئی محمد شاہ سون

اس کے بعد دھلی والوں کو بھی اردو میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا اور وہاں کے کئی شاعروں نے اس کی طرف توجہ کی جن میں قابل ذکر آبرو، ناجی، یکرنگ، مضمون اور احسن ہیں۔ برہان الملک کی وفات تک یہہ سب بقید حیات تھے اور دھلی میں ان کے اس نئے کلام کی بڑی قدر ہو رہی تھی محمد شاہ کا عہد حکومت تھا (۱۷۱۹ء - ۱۷۴۸ء) جو اپنی رنگ رلیوں اور بیفکریوں کی بدولت

---

[۱] ملاحظہ ہو تاریخ ادب اردو مصنفہ پروفیسر گراہم بیلی صفحہ ۳۹ و ۴۰

ہندوستان کی تاریخ میں "رنگیلے" کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کا عہد حکومت عیش پرستی میں ایسا ہی مشہور ہے جیسا کہ ان کے مورث اعلیٰ حضرت اورنگ زیب کا سادگی نیک نفسی اور تقدس میں۔ ظاہر ہے کہ عاشقانہ شاعری اور غزل گوئی کے لئے اس سے زیادہ مساعد فضا اور کون سی ہو سکتی تھی۔ اس لئے ایسے بے فکر بادشاہ کے زیر سایہ دہلی کے تمام شعرا راحت و آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور شعر و سخن کے نشہ میں مدہوش تھے کہ یکایک نادر کے قیامت خیز حملہ نے راعی و رعایا رسب کو خواب غفلت سے چونکا دیا اور جس کا جہاں سینگ سمایا بھاگ کھڑا ہوا۔

۴۔ صفدر جنگ (۱۷۳۹ء۔ ۱۷۵۲ء)

دربار اودھ دربار دہلی کا جانشین بنتا ہے۔

نادر شاہ کا حملہ (۱۷۳۹ء) اور دہلی کا قتل عام تاریخ ہند کے ان المناک واقعات میں سے ہے، جس نے عملی طور پر سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل کر دیا۔ اور اس کے دارالسلطنت پر ایسی تباہی نازل کی جس سے وہ پھر نہ پنپ سکا۔ سیکڑوں گھر بے چراغ ہوگئے ہزاروں باشندے بے خانماں پھرنے لگے اور بڑے بڑے باکمال ترک وطن کر کے کسی ایسی جگہ جانے کے آرزومند ہوئے جہاں وہ اطمینان سے دم لے سکیں۔ یہ مامن ان کے لئے قدرت نے اودھ کی سرزمین میں مہیا کر دیا۔

برہان الملک کی وفات پر ان کے بھانجے اور داماد ابو المنصور خاں صفدر جنگ نے نادر کو دو کروڑ روپیہ کا پیش کش کر کے دربار دہلی سے اپنے آپ کو اودھ کا صوبہ دار مقرر کرا لیا۔ [۵] اور مزے سے حکومت کرنے لگے۔ ان کے زمانہ میں صوبہ کا مستقر جو "جنگلہ" کہلاتا تھا اب فیض آباد کے نام سے مشہور ہوا اور اس کی رونق دن بدن بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ برہان الملک کے زمانہ کی چھوٹی سی بستی چند ہی سال میں ایک بڑا بارونق شہر ہو گیا اور صوبہ اودھ کا صدر مقام قرار پایا جہاں

---

[۵]۔ ملاحظہ ہو تاریخ اودھ جلد اول صفحہ (۵۶) مصنفہ مولوی نجم الغنی صاحب رام پوری۔

فوجوں کے کیمپ۔ امرا و روسا کے عالیشان محل۔ پرفضا باغ اور بارونق بازار قائم ہو گئے۔ برہان الملک کے حسن انتظام کی وجہ سے صوبہ کے نظم و نسق اور خزانہ کی حالت بھی بہت اچھی تھی۔

تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب صفدر جنگ اپنے خسر کے جانشین ہوئے ہیں تو صوبہ اودھ کا رقبہ تیئیس ہزار نو سو تیس میل اور آمدنی ایک کروڑ سات لاکھ تھی۔ اس کے علاوہ خزانہ میں نو کروڑ روپیہ نقد جمع تھا۔ [1] اس خوش حالی کے ساتھ اودھ کے مرکز توجہ بننے کا ایک اور سبب یہ ہوا کہ ۱۷۴۵ء میں صفدر جنگ نے اپنے ولی عہد نواب شجاع الدولہ کی شادی موتمن الدولہ محمد اسحٰق خان کی لڑکی امت الزہرا بیگم سے کی جنھیں محمد شاہ نے اپنی منہ بولی بیٹی بنایا تھا۔ محمد اسحٰق خاں دہلی میں دیوانی خالصہ کی خدمت پر مامور تھے اور بادشاہ کے مقربین خاص میں شمار ہوتے تھے۔

امت الزہرا بیگم جو بعد میں چل کر بہو بیگم کہلائیں اپنے وطن سے بڑی محبت رکھتی تھیں۔ ان کے بھائی نواب سالار جنگ اور نواب مرزا علی خاں بھی (جو اپنی بہن کے ساتھ فیض آباد میں آ بسے تھے) اہل دہلی کی امانت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ تیسری کشش اودھ میں اس کے قرب کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ یعنی دہلی سے جتنا قریب اودھ تھا اتنا کوئی اور ایسا مقام نہ تھا۔ جہاں دہلی کے خانماں برباد جا کر پناہ گزین ہو سکتے اور چونکہ اس زمانہ میں آمد و رفت کی وہ سہولتیں موجود نہ تھیں جو آج ہیں اس لئے اودھ کی سرزمین دہلی والوں کو بہت غنیمت معلوم ہوتی تھی۔ اودھ کی چوتھی خصوصیت یہ تھی کہ خوش حالی اور فارغ البالی کے سبب وہاں علوم و فنون اور شعر و سخن کا چرچا روز بہ روز بڑھ رہا تھا اور اہل کمال کی قدردانی خوب ہو رہی تھی۔ ان وجوہ سے اودھ میں دہلی کا جانشین بننے کی قدرتی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ دہلی جتنی اجڑتی گئی۔ اودھ اتنا ہی بستا گیا اور وہاں کے علوم و فنون تہذیب و تمدن اور شعر و شاعری کی بساط بتدریج یہاں منتقل ہوتی گئی۔

---

[1] ملاحظہ ہو۔ قیصر التواریخ صفحہ (۳۹ و ۴۲ و ۴۳)

شجاع الدولہ کا عہد (۱۷۵۴ء - ۱۷۷۵ء)

اودھ میں شاعری کی ابتداء

جس زمانہ میں شجاع الدولہ اودھ میں مسند نشین ہوئے۔ تخت دہلی پر محمد شاہ کے بیٹے احمد شاہ متمکن تھے (۱۷۴۸ء - ۱۷۵۴ء) لیکن عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی وہ اہل دربار کی سازشوں میں پھنس گئے اور پورے چھ سال بھی حکومت نہ کرنے پائے تھے کہ بعض امرا نے انھیں اندھا کر کے شہزادۂ معظم کے ایک پوتے کو عالمگیر ثانی کے لقب سے برائے نام تخت پہ بٹھا دیا اور خود حکمراں ہو گئے اس طوائف الملوکی کی خبر افغانستان پہنچی تو نادر شاہ کے جانشیں احمد شاہ ابدالی نے پھر ہندوستان پر لشکر کشی کی اور ابھی دہلی نادر کی تاخت و تاراج سے سنبھلنے نہ پائی تھی کہ اسے دوبارہ اچھی طرح لوٹا۔ اس بدنظمی کے سیلاب میں بڑے بڑے مستقل مزاجوں کے قدم ڈگمگا گئے اور جو باکمال اب تک دہلی سے نکلنے کا نام نہ لیتے تھے اب سراسیمہ ہو کر اودھ کا رخ کرنے لگے جہاں شجاع الدولہ حکمراں تھے ان ترک وطن کرنے والوں میں چند شاعر بھی تھے جن میں آرزو، فغاں، ضاحک، سوز، ضیا اور سودا قابل ذکر ہیں۔ آرزو کے متعلق شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد لکھتے ہیں کہ :-

"خان آرزو کو زبان اردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفۂ منطق پر ہے جب تک کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہل اردو خان آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے ..... خان آرزو وہی شخص ہیں جن کے دامن تربیت سے ایسے فرزند پرورش پا کر اٹھے جو زبان اردو کے اصلاح دینے والے کہلائے .... یعنے مرزا جان جاناں، مرزا رفیع، میر تقی، خواجہ میر درد وغیرہ"

شجاع الدولہ کے ماموں نواب سالار جنگ نے انھیں دہلی سے بلوایا اور بڑی تعظیم و تکریم سے اپنے پاس رکھا سرزمین اودھ میں شاعری کا بیج انہی کا بویا ہوا ہے لیکن اوس نامساعد فضا کے باعث جس کی تفصیل آگے آئے گی اس کی نشو و نما نہ ہو سکی اور خود خان آرزو شجاع الدولہ کی مسند نشینی کے چار ہی سال بعد یعنے ۱۷۵۶ء میں رحلت کر گئے۔

[illegible] کے ساتھ شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد آئے۔ خود نواب سالار جنگ کے

دامن دولت سے وابستہ ہوگئے۔ اور بیٹے کو سالار جنگ کے صاحبزادہ مرزا نوازش علی خان کی مصاحبت پر مامور کرا دیا۔ آخر عمر تک یہیں رہے اور آصف الدولہ کے عہد میں انتقال کیا۔ ان کا نہ تو آج کلام ملتا ہے اور نہ یہ اپنے دور کے شعرا میں کوئی خاص درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی شہرت یا تو ان ہجووں کی وجہ سے ہوئی جو سودا نے ان کی شان میں کہی تھیں یا ان کے بیٹے میر حسن کی وجہ سے ہوئی۔ جن کی مثنوی بے نظیر بر صغیر اردو زبان میں بہت مشہور رہی ہے۔ سودا اس وقت فیض آباد آئے جب شجاع الدولہ کا عہد ختم ہو رہا تھا یعنے ۱۱۸۳ھ میں۔ اس طرح ان کے بمشکل دو برس شجاع الدولہ کے عہد میں کٹے اور زیادہ تر زمانہ آصف الدولہ کے دور حکومت میں بسر ہوا اس لئے ان کا شمار در حقیقت عہد آصف الدولہ کے شعرا میں ہونا چاہیئے نہ کہ عہد شجاع الدولہ کے۔ اس وجہ سے ہم ان کا تفصیلی ذکر آیندہ باب میں کریں گے۔ اب اس عہد کے تین شاعر یعنے سوز، ضیا اور فغاں رہ گئے۔ ان میں سے کوئی بھی فیض آباد میں مستقل طور پر سکونت پذیر نہ ہوا اور سب چند روز یہاں رہ کر کہیں نہ کہیں چلے گئے تذکرہ نویسوں نے اس کے مختلف وجوہ لکھے ہیں۔ اور فی الواقع یہ بہت غور طلب اور بڑا دلچسپ مسئلہ ہے کہ اودھ کی بساط ادب نے ان اساتذہ سخن کو جو اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت باکمال مانے جاتے تھے۔ سر آنکھوں پر کیوں نہ بٹھایا اور کیوں ان کی ایسی ناقدری کی کہ وہ باہر جانے پر مجبور ہو گئے۔

عام طور پر اس کے جو وجوہ بیان کئے جاتے ہیں وہ چنداں قابل قبول نہیں مثلاً اشرف علی خان فغاں جو شعرائے دہلی میں نامور گذرے ہیں فیض آباد میں چند روز رہ کر پٹنہ چلے گئے تھے۔ اس کی وجہ مولوی محمد حسین آزاد یہ لکھتے ہیں کہ شجاع الدولہ کے ہاتھ سے اتفاقاً ایک روز ان کا کپڑا جل گیا تھا جس سے وہ ناراض ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ ایسی معمولی بات اودھ جیسے مامن کو چھوڑ کر پٹنہ کا دور دراز سفر اختیار کرنے کی محرک کسی طرح نہیں ہوسکتی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ایک دل برداشتہ آدمی کے لئے یہ بہانہ بن جائے لیکن اصلی سبب فغاں، سوز اور ضیا جیسے شعرا کی ناقدری کا یہ ہے کہ شجاع الدولہ کا عہد شعر و سخن کے لئے سخت نامساعد واقع ہوا تھا۔ شاعری اور اس پر بھی خصوصیت کے ساتھ عاشقانہ شاعری کے لئے ضرورت ہے ایسی فضا کی جہاں سکون و اطمینان۔ مال و دولت اور عیش و عشرت ہو۔

اس کے برخلاف شجاع الدولہ کا عہد ہندوستان کی تاریخ میں انتہائی پر آشوب زمانہ تھا۔ ایک طرف دہلی کی عظیم الشان سلطنت اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ دوسری طرف انگریزی تسلط ہندوستان کے طول وعرض میں روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ تیسری طرف مرہٹے سارے ملک میں ایک ہنگامہ برپا کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا نام ہند کی سرزمین سے مٹا دیں۔ چوتھی طرف افغانی حملہ آور رہ رہ کر شکر کشی کر رہے تھے۔ ان حالات میں شجاع الدولہ جیسے جنگجو فرماں روا کو (جو اسم بامسمیٰ تھا) اس کی کہاں فرصت تھی کہ وہ عیش وعشرت کی محفلوں یا شعر وسخن کی مجلسوں میں اپنا وقت گذارتا۔ اس نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی فوجوں کی اصلاح وتنظیم شروع کر دی اور جتنے اہم معرکے اس کے عہد میں ہوئے۔ ان میں سے اکثر میں حصہ لیا۔ ۱۷۶۱ء میں جب احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کی روز افزوں قوت توڑنے کے لئے پانی پت کے میدان میں صف آرا ہوا تو شجاع الدولہ بھی اسی کے ساتھ شریک ہوئے اور پانی پت کی وہ مشہور تیسری لڑائی ہوئی جس نے ہمیشہ کے لئے مرہٹوں کی قوت کا خاتمہ کر دیا۔

اس کے تین سال بعد ۱۷۶۴ء میں میر محمد قاسم ناظم بنگالہ اور انگریزوں کے درمیان بکسر میں معرکہ کارزار گرم ہوا تو شجاع الدولہ انگریزوں کے مقابلہ میں محمد قاسم کے ساتھ شریک ہوئے جس میں انھیں شکست ہوئی اور پچاس لاکھ روپے تاوان دینا پڑا۔ اس کے علاوہ انگریزوں سے ایک معاہدہ کرنا پڑا جس کی رو سے انگریز ریذیڈنٹ دربار اودھ میں مقرر ہوا اور کانپور وفرخ آباد میں انگریزی چھاؤنیاں قائم کی گئیں ان چھاونیوں کے چوبیس لاکھ روپیے سالانہ اخراجات بھی نواب ہی کے ذمہ لگائے گئے۔

۱۷۷۴ء میں شجاع الدولہ نے روھیلکھنڈ پر چڑھائی کی اور انگریزی فوج کی مدد سے سارے ملک کو ایسا تباہ وبرباد کیا کہ اس کی دردناک داستان آج تک زبان زد عام ہے۔ غرض شجاع الدولہ کی ساری عمر انھی فوجی مہمات میں گذری اور انھیں ان علمی مشاغل کی طرف توجہ کرنے کی مہلت نہ ملی جو امن واطمینان کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہی سبب تھا کہ جو اہل قلم اس عہد میں دہلی سے آئے ان کی کما حقہ قدر نہ ہو سکی اور میر حسن بھی جو آخر عمر تک اودھ میں رہے صرف سالار جنگ کی فیاضیوں کے سہارے جیا کئے اور ان کی حوصلہ افزائی میں شجاع الدولہ کا بہت ہی کم حصہ رہا۔ باوجودیکہ خان آرزو جیسے با کمال شاعر اور ان کے تلامذہ نے اودھ کی سرزمین میں شاعری کا بیج بویا تھا لیکن ناموافق فضا کی وجہ سے اس زمانہ میں اس کی نشو و نما پوری طرح نہ ہو سکی اور اصلی فروغ اسے اسی وقت حاصل ہوا جب شجاع الدولہ کے جانشین آصف الدولہ کے فیض کی گنگا نے اس کی آبیاری کی۔ اس طرح یہہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ کہ شجاع الدولہ کے عہد میں اردو شاعری درباری اثرات سے بالکل متاثر نہیں ہوئی تھی۔ حکمران وقت اور اہل دربار کے سپاہیانہ مشاغل کی جھلک بھی اس دور کی شاعری میں نہیں پائی جاتی۔ اس لئے کہ یہہ ایسے قدردانوں کے سایہ عاطفت میں پلی جو اس زمانہ کی سیاسی الجھنوں سے دور اطمینان و فراغت اور لطف و مسرت کی زندگی گذار رہے تھے۔ جس طرح اودھ کی ادبی تاریخ میں شجاع الدولہ کا کہیں ذکر نہیں ملتا اسی طرح اس کی سیاسی تاریخ میں سالار جنگ اور مرزا علی خان کا نام نہیں دکھائی دیتا اسی وجہہ سے اس عہد کی شاعری رزم کی بجائے بزم کی آئینہ دار ہے یعنے شجاع الدولہ کی بجائے سالار جنگ کی یادگار ہے۔

۴۔ آصف الدولہ کا عہد۔ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء)

سودا۔ میر و سوز کا دور۔

۱۷۶۵ء کے عہد نامہ کے بعد سے انگریز اودھ کی فوجی سرگرمیوں پر سخت نگرانی رکھنے لگے تھے۔ اور یہہ شجاع الدولہ ہی کا حق تھا کہ وہ اس جکڑ بند کے باوجود آخر وقت تک اپنی فوجی طاقت برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے لیکن آصف الدولہ باپ کی طرح سپاہی منش نہ تھے اس لئے انگریزوں نے نہایت آسانی سے انھیں اپنے ڈھب پر لگا لیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں دربار کا رنگ بالکل بدل گیا جو روپیہ برہان الملک اور شجاع الدولہ کے عہد میں قلعوں کی تعمیر و ترمیم پر صرف ہوتا تھا آصف الدولہ کے زمانہ میں شہر کی آرائش و زیبائش پر صرف ہونے لگا

اور جو دقت پہلے فوجوں کی اصلاح وتنظیم میں صرف ہوتا تھا۔ اب عیش وعشرت کے جلسوں کی نذر ہونے لگا۔ اس صورت حال نے اودھ کی سیاسی پوزیشن کو خواہ کتنا ہی کمزور کر دیا ہو لیکن دربار کی ظاہری رونق کو بے انتہا ترقی دیدی۔ اب دربار اودھ کی حالت اس مسرف سی ہو رہی تھی جو اندر سے تو کھوکھلا ہو لیکن اس کی ظاہری شان وشوکت لوگوں کے لئے مقناطیسی کشش رکھتی ہو ان ہی فضول خرچیوں کی وجہہ سے چند ہی سال میں آصف الدولہ اور ان کی بیدار مغز ماں بہو بیگم میں سخت ناچاقی ہوگئی اور ۱۷۷۵ء میں پایہ تخت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کر دیا گیا تاکہ ماں کی مداخلت کے بغیر بادشاہ آزادی کے ساتھ اپنے مرغوب طبع مشاغل میں منہمک رہ سکے آصف الدولہ کو اگرچہ ان تمام مشاغل سے دلچسپی تھی جو شاہان دہلی کی تباہی کا باعث ہوئے تھے لیکن شاعری سے انھیں جتنا شغف تھا اتنا کسی اور چیز سے نہ تھا وہ آصف تخلص کرتے تھے اور بڑے پُرگو شاعر تھے جس کی یادگار آج بھی ایک ضخیم دیوان کی صورت میں باقی ہے۔ جب خود بادشاہ کے ذوق کا یہ حال ہو تو پھر شعرا کی قدردانی کا کیا عالم ہوگا۔ اب لکھنؤ دہلی کی تہذیب وتمدن اور علم وفضل کے ساتھ وہاں کے عیش وعشرت اور شعروسخن کا بھی پورا پورا جانشین بن گیا اور دہلی کے کئی مشہور شاعر لکھنؤ میں جمع ہوگئے۔ جن میں قابل ذکر سودا (۱۷۱۳ء۔ ۱۷۸۱ء) میر (۱۷۲۴ء۔ ۱۸۱۰ء) سوز (۱۷۲۰ء۔ ۱۷۹۸ء) اور مصحفی (۱۷۵۰ء۔ ۱۸۲۴ء) ہیں۔

مرزا رفیع سودا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ۱۷۷۳ء میں یعنی آصف الدولہ کی تخت نشینی سے دو سال پہلے فیض آباد آئے اور جب آٹھ سال بعد صوبہ کا مستقر لکھنؤ منتقل ہوا تو یہ بھی یہیں آگئے لیکن قضا بھی ان کے ساتھ ہی پہنچی اور یہ اسی سال پیوند خاک ہوگئے۔ اس طرح ان کے کل چھ سال عہد آصف الدولہ میں گذرے۔ ان کی وفات کے دو سال بعد ان کے مشہور مدمقابل میر محمد تقی میر ۱۷۸۳ء میں لکھنؤ آئے اور ستائیس سال رہ کر یہیں وفات پائی۔ میر کے سات سال بعد ۱۷۹۰ء میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی آئے اور چونتیس سال رہ کر قضا کی مصحفی کے سات سال بعد یعنی ۱۷۹۷ء میں سید محمد میر سوز جو اس سے قبل اودھ سے نامراد مرشد آباد گئے تھے

آصف الدولہ کے فیض کا شہرہ سن کر پھر یہاں آئے اور اس مرتبہ قسمت کی رسائی سے آصف الدولہ
کے استاد ہو گئے لیکن ایک ہی سال بعد وفات پائی۔

ان کے علاوہ اس عہد کے اور بھی کئی شعرا کا پتہ چلتا ہے لیکن نہ تو ان کے مفصل حالات
معلوم ہوتے ہیں نہ ان کا کلام دستیاب ہوتا ہے اس لئے یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ دربار کے
رنگ نے ان کے کلام پر کیا اثر ڈالا۔ اس طرح مرزا فاخر مسکین۔ سرب سنگھ دیوانہ۔ شیخ بقاء اللہ خاں
بقا اور مرزا جعفر علی حسرت وغیرہ کے نام اگرچہ اکثر لئے جاتے ہیں لیکن ان کے حالات اس قدر
تاریکی میں ہیں کہ سنہ وفات تک کا پتہ نہیں چلتا۔

آصف الدولہ کی فیاضیوں نے صرف ان شعرا ہی کو نہیں کھینچ بلوایا بلکہ خود شہزادگان دہلی
ان کی داد و دہش کا شہرہ سن کر لکھنو کا رخ کرنے لگے اور اپنا آبائی وطن چھوڑ کر یہیں سکونت اختیار
کر لی۔ چونکہ یہ شہزادے آگے چل کر دربار اودھ کا ایک جزو بن گئے اور ان کے اطوار کا بڑا اثر لکھنو کی شاعری
پر پڑا اس لئے مختصراً ان کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ ۱۷۸۴ء میں مرزا جوان بخت جو دہلی کے
بادشاہ وقت یعنی شاہ عالم ثانی (۱۷۷۲ء-۱۸۰۶ء) کے ولی عہد تھے۔ اپنے باپ کی پرآشوب
سلطنت کو انہی پر چھوڑ کر نہایت بے سروسامانی کے ساتھ لکھنو پہنچے آصف الدولہ نے کمال اعزاز و
احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ تین لاکھ روپیہ کا نقد و جنس نذر گزرانا اور پچیس ہزار روپیہ ماہوار
مقرر کئے۔ شہزادہ والا تبار اب یہاں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اور مرغ بازی پتنگ بازی
ناچ رنگ اور شعر و سخن کی مجلسوں میں آصف الدولہ کے ہم پیالہ و ہم نوالہ رہنے لگے۔ شومیٔ قسمت
سے درباری ارباب نشاط میں چھگیہ نام ایک طوائف تھی جس پر شہزادہ کا دل آگیا اور انھوں نے
اسے اپنے حرم میں داخل کرنا چاہا۔ اتفاق سے وہ خود آصف الدولہ کی منظور نظر تھی اس لئے
وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ مگر شہزادہ کو اس کی ایسی لو لگی تھی کہ وارن ہسٹنگز گورنر جنرل کے ذریعہ سے
جو اس زمانہ میں لکھنو آئے ہوئے تھے سفارش کرائی اور آصف الدولہ کو مجبوراً ماننا پڑا۔ اس طرح شہزادہ
کو چھگیہ تو مل گئی مگر لکھنو چھوڑنا پڑا کیوں کہ آصف الدولہ ان سے ناراض ہو گئے۔ اور انھیں مجبوراً بنارس

قیام کرنا پڑا۔[1] ۱۷۸۸ء میں ان کے دوسرے بھائی مرزا سلیمان شکوہ وارد لکھنؤ ہوئے۔ آصف الدولہ بڑے بھائی کا رنگ دیکھ چکے تھے اس لئے ان کے استقبال میں پس و پیش کیا اور شہزادہ کو کئی مہینہ لکھنؤ سے باہر ٹھیرنا پڑا۔ آخر لارڈ کارنوالس گورنر جنرل کی سفارش سے نواب نے انہیں قیام لکھنؤ کی اجازت دی اور چھ ہزار درماہہ مقرر کیا۔ یہ عرصہ دراز تک لکھنؤ میں رہے لیکن نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں ان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی قضیہ نامرضیہ پیش آیا جس کے سلسلہ میں یہ لکھنؤ سے چلے گئے اور ۱۸۳۷ء میں بمقام اکبر آباد وفات پائی۔

شہزادہ سلیمان شکوہ لکھنؤ کی تاریخ ادب میں بطور خاص قابل ذکر ہیں اس لئے کہ یہ خود شاعر تھے اور شعرائے دہلی کی بڑی سرپرستی کرتے تھے۔ لکھنؤ آنے کے بعد ان کا دردولت عرصہ دراز تک کئی مشہور شعرا کا مرکز رہا ہے۔ انشاء، مصحفی، رنگین، جرأت، سب ان کے خوان نعمت کے خوشہ چین تھے اور ان ہی کے تقرب اور استادی کے سلسلہ میں وہ نزاع پیدا ہوئی جس نے انشاء و مصحفی کو مدمقابل بنا کر لکھنؤ کی شاعری میں ایک مزید افسوسناک باب کا اضافہ کیا۔ مولوی محمد حسین آزاد ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ "عام اہل دہلی کے علاوہ شعرا کا مجمع دونوں وقت ان کے ہاں رہتا تھا۔ سودا۔ میر ضاحک، میر سوز وغیرہ کا دور تو زمانہ الٹ چکا تھا۔ مصحفی، جرأت، مرزا قتیل وغیرہ شاعروں اور شعر فہموں کے جلسے رہتے تھے۔ جو محفل ایسے گلشن فصاحت کے گلدستوں سے سجائی جائے وہاں کی رنگینیاں کیا کچھ ہوں گی۔ جی چاہتا تھا کہ ان کی باتوں سے گلزار کھلا دوں مگر اکثر پھول ایسے فحش کانٹوں میں الجھے ہوئے ہیں کہ کاغذ کے پرزے ہوئے جاتے ہیں۔ اس لئے صفحہ پر پھیلاتے ہوئے ڈر لگتا ہے"[2] چند سال بعد ان کے چھوٹے بھائی مرزا اسکندر شکوہ بھی لکھنؤ آگئے۔ اور آصف الدولہ نے دو ہزار ماہوار ان کی بھی مقرر کر دی اس طرح دہلی کے تمام منتشر اجزا لکھنؤ میں جمع ہونے لگے اور اس عیش و عشرت، نمایش و تکلف، بے فکری و بیکاری، مفت خوری و بے حیائی، دربارداری و راحت طلبی کی بنیا پڑی جس نے آخرکار شاعری کے ساتھ سلطنت کو بھی ڈبو دیا۔

ایسے دربار کے جو اثرات اس دور کی شاعری پر مترتب ہوئے ان کا اندازہ کرتے وقت ہمیں

[1] تیمر التواریخ جلد اول صفحہ ۱۱۰ و ۱۱۱

[2] آب حیات صفحہ د

چند امور کا بطور خاص لحاظ رکھنا چاہیئے۔

پہلے تو یہ کہ عہد آصف الدولہ میں جو شعرا دہلی سے آئے وہ سن رسیدہ ہو چکے تھے، ان کا ایک خاص رنگ مستحکم ہو گیا تھا، ان کی تخلیقی قوت جواب دے چکی تھی۔ ان کی جوانی کی امنگیں اور شاعری کے ولولے سرد پڑ گئے تھے۔ سودا جب لکھنو آئے تو ان کی عمر ۶۸ سال کی تھی۔ میر کی ۶۰ سال۔ سوز کی ۶۴ سال اور مصحفی کی ۳۴ سال۔ اس طرح بجز آخر الذکر کے اور سب عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے پختہ طبعوں پر کوئی نیا رنگ آسانی سے نہیں چڑھ سکتا۔

دوسرے یہ کہ یہ لوگ اپنے عہد کے ممتاز ترین شعرا اور مسلّم الثبوت اساتذہ مانے جاتے تھے اس لئے وہ اس شاہی تقرب کی خاطر کوئی نیا رنگ اختیار کرنے پر چنداں مجبور نہ تھے۔

تیسرے یہ کہ ان کے کلام کا وہ حصہ جو لکھنو میں مرتب ہوا پوری طرح متعین نہیں کیا جا سکتا اور بجز ان چند نظموں کے جن میں خاص خاص حوالے ہیں باقی کلام کے مواد کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ ایسے حوالے صرف قطعوں یا مثنویوں ہی میں ملتے ہیں، غزلیات میں (جس پر ان کے کلام کا بیشتر حصہ مشتمل ہے) ان کا پتہ نہیں چلتا۔ ان سب باتوں کو پیش نظر رکھنے کے باوجود بھی یہ کہنا بیجا نہیں کہ دربار اودھ کے اس رنگ کا ان شعرا پر کچھ نہ کچھ مضر اثر ضرور پڑا مثلاً میر کے سے نازک کلام اور سرتاج شعرا کو دیکھئے کہ لکھنو میں آکر ان کی فکر سخن کیسے ادنی اور معمولی مضامین پر اتر آتی ہے۔ کبھی تو وہ آصف الدولہ کے ہولی کھیلنے کا ذکر کرتے ہیں تو کبھی ان کے شکار کرنے کا۔ کہیں مرغبازی پر مثنوی لکھتے ہیں تو کہیں تیتر، بلی اور بکری پر۔ ایک قطعہ میں آصف الدولہ کے گھوڑے کی تعریف کرتے ہیں تو دوسرے میں کسی خواجہ سرا کی ہجو۔ پس جب ہم ان کی ایسی پست و رکیک شاعری کا اس بلند رتبہ کلام سے مقابلہ کرتے ہیں جس میں بقول خود میر کے

جہاں سے دیکھئے ایک شعر شور انگیز نکلے ہے　　قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں

تو ہمیں مولانا آزردہ کے اس قول سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ "پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند" اور اس باہمی فرق کو ماحول کے اختلاف پر محمول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

کم وبیش یہی حال سودا کا ہے۔ سودا نے اپنی اہاجی میں جور کا کست داغل کی وہ ناگفتہ بہ ہے پھر یہ ان کے کلام میں کوئی اضافی چیز نہیں بلکہ ان کے کلیات میں ایسا ہی مستقل درجہ رکھتی ہے جیسا کہ ان کی زندگی کا ایک مستقل جزو تھی۔

ان ہجویات کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تمام تر سرزمین اودھ ہی کی پیداوار ہے لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ اگر ان کی مدت قیام کا لحاظ رکھا جائے تو بے شک اودھ کا پلہ بھاری رہے گا کیوں کہ سودا کی وہ گل افشانی جو غلام حسین ضاحک، مرزا فاخر مکین، بقا اللہ خاں بقا، مکند رام فدوی وغیرہ کی شان میں ہوئی زیادہ تر یہیں کی یادگار ہے۔ دربار اودھ کے اثر سے سودا کے طبع رسا کی بجلی ایک اور افق پر بھی چمکی تھی جو اس سے بالکل مختلف ہے اور جس کا مختصر ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ آصف الدولہ کے مورث اعلیٰ میر محمد نصیر مذہب امامیہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کی اولاد میں جتنے فرمانروا گزرے وہ سب اسی مذہب کے پیرو رہے لیکن پہلے تین حکمراں ایسی سخت سیاسی کشمکش میں گرفتار تھے کہ انھیں مذہبی معاملات میں کسی طرح کی دلچسپی لینے کا موقع نہیں ملا آصف الدولہ کے زمانہ میں جب انگریزی مداخلت کی بدولت اودھ کی سیاسی جد وجہد کا خاتمہ ہو گیا تو یہ مذہبی عصبیت بھی رنگ لانے لگی چنانچہ آصف الدولہ کے مشہور وزیر سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں پہلے پہل شیعیت کی شاہی سرپرستی کا باعث ہوئے اور سلطنت میں مجتہد العصر کا عہدہ قائم کرایا جس پر علامہ سید دلدار علی کا تقرر ہوا۔ اس کے بعد ۵ لاکھ روپے اور گراں بہا تحائف شاہ بغداد کو بھیجے گئے تا کہ دریائے فرات سے نجف اشرف تک ایک نہر جاری کی جائے اور دس لاکھ کے صرف سے لکھنؤ میں ایک امام باڑہ تیار کرایا گیا جو دس سال کے عرصہ میں ۱۸۰۵ء میں تکمیل کو پہنچا غرض یہ ہے کہ اسی زمانہ میں وہ مذہبی جانب داری شروع ہوئی جس نے آگے چل کر ایک مستقل تحریک کی صورت اختیار کر لی۔

دربار اودھ کے اس رجحان نے شمالی ہند میں پہلے پہل اس صنف سخن کا اضافہ کیا جو اگرچہ دکن میں سالہا سال سے رائج تھی لیکن شمال کی شاعری میں اب تک اس کا مستقل وجود نہ پایا جاتا تھا یعنی مرثیہ گوئی تھی۔

جس میں سودا کے علاوہ اور بھی کئی شعرا نے طبع آزمائی کی بلکہ کئی ایسی ترمیمیں بھی کیں جو نہایت اہم ثابت ہوئیں اور جنھیں شعرائے مابعد نے مستقل طور پر اختیار کر لیا مثلاً یہ کہ اس وقت تک مرثیئے مربع ہوا کرتے تھے سودا نے اسے مسدس بنایا۔ پہلے مرثیئے محض ایک طرح کا بین ہوتے تھے۔ سودا نے ان میں ادبی شان پیدا کی۔ غرض اس زمانہ میں مرثیہ میں جو کچھ ترقی ہوئی وہ دربار اودھ ہی کے اثر سے ہوئی اور سودا کے اختراعات کا باعث بھی مذہبی رجحان تھا۔

مصحفی اودھ میں سینتیس[۳۷] سال رہے جس میں صرف سات سال آصف الدولہ کے عہد کے تھے باقی تیس سال دیگر فرماں رواؤں کے عہد کے۔ اس کے علاوہ ان کے اصل معرکے سید انشاء کے ساتھ رہے جو سعادت علی خاں کے عہد میں لکھنؤ آئے تھے اور ان ہی کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح مصحفی کا شمار عہد سعادت علی خاں کے شعرا میں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ہم ان ہی کے دور میں ان کا تفصیلی ذکر کریں گے۔

اب رہ گئے میر سوز۔ سوز ان کا لکھنؤ میں کل قیام دو تین سال سے زیادہ نہیں رہا۔ ظاہر ہے کہ اتنی قلیل مدت میں ایک کہنہ مشق شاعر پر کسی طرح کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اس لئے میر سوز کا شمار لکھنوی شعرا میں کرنا صحیح نہیں۔ البتہ ان کے شاگرد نواب آصف الدولہ کا کلام اس زمانہ کی سوسائٹی کا بہترین مرقع اور اس عہد کے دربار کی حقیقی یادگار کہلایا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ نہ صرف ان کا خمیر خاک اودھ سے تھا۔ بلکہ دربار اور دربار کا رنگ عبارت تھا ان ہی کی ذات سے۔ ان کا دیوان اگرچہ طبع نہیں ہوا اور نہ عام طور پر دستیاب ہوتا ہے لیکن خوش قسمتی سے اس کا ایک قلمی نسخہ جو خود ان ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا بیان کیا جاتا ہے کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ جس کی بدولت ہماری نگاہوں کے سامنے اس زمانہ کا مذاق اور دربار کی حالت اس طرح آئینہ ہو جاتی ہے کہ اودھ کی کوئی بڑی سے بڑی تاریخ بھی اوسے اس طرح نمایاں نہیں کر سکتی۔

اس کلیات میں غزلیں، قصائد، مثنویاں، مخمس، رباعیاں، غرض تمام اصناف سخن موجود ہیں۔ حمد و نعت اور منقبت کے بعد ایک مثنوی وزیر علی خاں کی شادی کے بیان میں ہے جو ان کے ولی عہد تھے اور جن کی شادی ۱۷۹۴ء میں بڑے تزک و احتشام سے اشرف علی خاں کی لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس شادی میں تیس لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا اور اس میں ایسے ایسے تکلفات کئے گئے تھے

کہ ہندوستان کی تاریخ میں اس کی نظیر کم ملے گی۔ اس کے تفصیلی واقعات آصف الدولہ نے اس پہلی مثنوی
میں بیان کئے ہیں اس کے بعد دو ایک مثنویاں مختلف موضوع پر ہیں لیکن اوس دربار کی عیش وعشرت
نے شاعری پر جو اثر ڈالا اس کا اصلی اندازہ اون ہجو، قصیدہ، مثنوی او مخمسوں سے ہوتا ہے جو مختلف
لوگوں کے متعلق لکھے گئے ہیں۔

زبان کے اعتبار سے آصف الدولہ کا کلام اپنے ہمعصروں میں بہت صاف وشستہ ہے اور یہہ
معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی تراش خراش سے زباں کی جو ہیئت آگے چل کر قائم ہوئی اس کی بنیاد اسی زمانہ
سے پڑنی شروع ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ طرز ادا میں تعقید اور عربی وفارسی الفاظ کی وہ کثرت جو آخر
زمانہ میں لکھنؤ کے خصوصیات میں داخل ہوگئی تھی ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ البتہ رعایت لفظی اور
مراعاۃ النظیر جس میں لکھنؤ کی شاعری بہت بدنام ہے۔ اس کی جھلک آصف الدولہ کے کلام میں بھی پائی
جاتی ہے۔

(۷) سعادت علی خان کا عہد (۱۷۹۸ء۔ ۱۸۱۴ء)
انشا، مصحفی، جرات اور رنگین کا دور۔

آصف الدولہ کے انتقال پر ان کے ولی عہد مرزا وزیر علی خاں تخت نشیں ہوئے لیکن یہہ
اس قدر نااہل تھے کہ چھ مہینہ بھی سلطنت نہ چلا سکے۔ آخر کار سرکار انگریزی نے مداخلت کرکے انھیں
معزول کردیا اور ان کی جگہ آصف الدولہ کے بھائی سعادت علی خاں کو تخت نشین کیا۔ سعادت علیخان
نہایت لائق تجربہ کار اور صاحب تدبیر فرمانروا تھے اور اوس فضول خرچی سے کوسوں دور تھے
جس نے آصف الدولہ کے عہد میں اودھ کا خزانہ خالی کردیا تھا۔ جس وقت یہ تخت نشین ہوئے
تو اپنا ذاتی جمع کیا ہوا چھ لاکھ روپیہ خزانہ میں داخل کیا اور اس خوبی سے انتظام سلطنت کیا کہ مرتے
وقت سترہ کروڑ روپیہ چھوڑ گئے۔ حالانکہ ان کے زمانہ میں آدھا ملک انگریزوں کو دیدیا گیا تھا
جس کی وجہ یہہ تھی کہ شجاع الدولہ کے عہد میں جو چھاؤنیاں فرخ آباد اور کانپور میں قائم کی گئی تھیں
ان کے سالانہ اخراجات آصف الدولہ کی فضول خرچیوں کے سبب سے نہ ادا ہوسکے اور اتنا بقایا ہوگیا کہ

سعادت علی خاں کو انگریزوں کے روز افزوں مطالبات سے نجات حاصل کرنے کے لئے اودھ کا آدھا علاقہ ان کے حوالہ کرنا پڑا۔ اس طرح صرف آدھا ملک اودھ ان کے قبضہ میں رہ گیا۔ لیکن سعادت علیخاں کے حسن انتظام اور کفایت شعاری نے بڑی حد تک آصف الدولہ کے اسراف کی تلافی کردی اور سلطنت کے مالیہ کو تباہی سے بچالیا۔

اپنی ان سیاسی اور انتظامی مصروفیات کے باعث سعادت علی خاں شعر و شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہ کرسکے اور ان کے دربار میں سید انشا کے سوا (جن کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا) اور کسی شاعر کا گذر نہ ہوا۔ لیکن اس کی تلافی ان شہزادگان دہلی کے ذوق سخن نے کردی جن کا ذکر گذشتہ اوراق میں ہوچکا ہے۔ اب لکھنؤ میں شاعری کا مرکز ان ہی شہزادوں خصوصاً مرزا سلیمان شکوہ کا ورود قرار پایا جہاں ہر وقت شعر و سخن کی مجلسیں گرم رہتیں اور دہلی کا جو شاعر لکھنؤ پہنچتا یہیں آکر دم لیتا۔ اس طرح مصحفی (سنہ ۱۷۵۰ء - سنہ ۱۸۳۴ء) انشا المتوفی (۱۸۱۷ء) رنگین (۱۷۵۶ء-۱۸۳۴ء)، جرات (سنہ ۱۸۱۰ء) سب نے ان ہی کے در کو اپنا ملجا و ماوا بنایا اور انشا کے سوا اور سب آخر وقت تک اسی سرکار کے متوسل رہے۔ ان کا تفصیلی ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ لکھنؤ میں رہ کر ان کی اخلاقی حالت اور بدتر ہوگئی تھی۔ ریاست سے انھیں بیش قرار ماہوار ملتی تھی اور دن بھر سوائے بے فکری اور عیش و عشرت کے کوئی کام نہ تھا شاعری کا شوق یہ دہلی سے ساتھ لائے تھے اور سلیمان تخلص کرتے تھے آصف الدولہ کے عہد میں جب مصحفی لکھنؤ آئے تو ان ہی کے ہاں رہے اور انشا کے آنے تک ان کی اصلاح سخن کی خدمت انجام دیا کئے لیکن جب انشا ؔ نے ادھر کا رخ کیا تو ان کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس لئے کہ ایک تو یہ بوڑھے ہوچکے تھے دوسرے قدرتاً ان کے کلام میں وہ شوخی اور انداز میں وہ بانکپن نہ تھا جس میں انشا اور ان کا کلام ڈوبا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ رنگیں مزاج شہزادوں کو اوس چلبلے جوان کے مقابلہ میں اس خشک بڈھے کا کلام کیا خاک پسند آتا نتیجہ یہ ہوا کہ سلیمان شکوہ کا منصب استادی انشا نے مصحفی سے چھین لیا اور ان کی تنخواہ پچیس سے صرف پانچ رہ گئی۔ یہ بات مصحفی کو بہت ناگوار گزری اور باہم چوٹیں ہونے لگیں۔ شہزادوں نے مشغلہ بیکاری سمجھ کر اس پر اور ہیزم کشی کی پھر تو انشا اور مصحفی کے طرفداروں کی دو

جماعتیں بن گئیں اور سارے شہر میں وہ وہ سوانگ بنے اور شاعری کی ایسی مٹی خراب ہوئی کہ بقول آزاد "شائستگی نے کبھی آنکھیں بند کر لیں اور کبھی کانوں میں انگلیاں دے لیں"، مگر انشا زیادہ عرصے تک مرزا سلیمان شکوہ کے توسل پر قانع نہیں رہے اور ان کی طبع رسا نے سعادت علی خاں کے سے خشک مزاج فرماں روا کے پاس بھی رسائی پیدا کر ہی لی۔ علامہ تفضل حسین خان جو نواب سعادت علی خان کے دست راست تھے اس تعارف کا ذریعہ بنے اور چند ہی روز میں انشا نے نواب کے مزاج میں ایسا درخور پیدا کر لیا کہ خود خان علامہ کو ان کے اس تقرب پر رشک آنے لگا۔ دربار کے اثرات اور ماحول کا رنگ بڑے سے بڑے شاعر کو کس قدر ذلیل اور اس کے فطری جوہر کو کس طرح برباد کر سکتا ہے اس کی بہترین مثال سید انشا کی ذات اور ان کا کلام ہے۔

انشا کے خاندانی حالات کا ذکر کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں کہ "ان کے خاندان کی خوبیوں اور گھر کے چال چلن کو دلی اور لکھنؤ کے شرفا سب مانتے تھے ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ ان کے ہاں عورتوں کی پوشاک گھر میں دھوتے تھے یا جلا دیتے تھے۔ دھوبی کو نہ دیتے تھے کہ نامحرم کے ہاتھ میں عورتوں کا لباس نہ جائے۔"

لیکن ان ہی انشا کے خاندان کی چند سال کے درباری تعلق سے یہ حالت ہو گئی کہ تاریخ اودھ کا مصنف ان کی صاحبزادیوں کے متعلق بعض ناقابل ذکر باتیں لکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔
(صفحہ ، جلد چہارم تاریخ اودھ مصنفہ نجم الغنی رامپوری)

یہی حال انشا کے فضل و کمال کا ہوا۔ اگر آپ اون کی "دریائے لطافت"، پڑھیں اور اس کے بعد ان کا کلام دیکھیں تو حیرت ہو گی کہ ایسی ہمہ گیر قابلیت کا مصنف اور ایسا قادر الکلام استاد آیندہ نسلوں کے لئے شاعری کی جو میراث چھوڑتا ہے اس کا عام رنگ کس قدر پست ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد۔ انشا کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے کیا خوب فرماتے ہیں۔

"لوگ کہتے ہیں کہ سید انشا کا کلام رندانہ ہے اور جو اون کی غزل میں ہزل ہے نہ بقدر نمک ہے بلکہ غذا کی مقدار سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ بات بھی درست ہے مگر اس کا سبب یہ ہے

کہ وقت حاکم جابر ہے اور پسند عام اس کا واضح قانون ہے۔ اوس وقت شاہ و امراسے لے کر
گدا و غربا تک ان ہی باتوں سے خوش ہوتے تھے اور قدردانی یہ کہ ادنیٰ ادنیٰ نظموں پر وہ کچھ دیتے
تھے جو آج کل کے مصنفوں کی کتابوں پر نصیب نہیں ہوتا۔ سید انشا اگر یہ نہ کرتے تو کیا کرتے۔
پیٹ کو کاٹ کر کہاں پھینک دیتے .... یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے ان رستوں
میں قدم کیوں رکھا جو ایسے کیچڑ میں دامن آلودہ ہوئے۔ لیکن شہرستان تجارب کی سیر کرنے والے
جانتے ہیں کہ جب رواج عام کا راجہ ہولی کھیلتا ہے تو بڑے بڑے معقول وضعدار اشخاص اوس کی
چھینٹیں فخر سمجھ کر سر و دستار پر لیتے ہیں۔ یہی وہ اور ان کے معاصر ملک چھوڑ کر کہاں نکل جاتے
نہیں رہنا تھا اور ان ہی لوگوں سے لے کر گذران کرنی تھی۔ ان ہی چاہیئے چاہنے والوں کی فرمائشیں
ہوتی تھیں جو نہ دھری جاتی تھیں نہ اُٹھائی جاتی تھیں اور وہ کچھ وہ چھوٹے لوگ نہ تھے کہ سمجھانے سے
سمجھ جائیں یا ٹالے سے ٹل جائیں۔ کبھی شاہ عالم بادشاہ دہلی تھے۔ کبھی مرزا سلیمان شکوہ تھے
کبھی سعادت علی خاں والی اودھ۔ چنانچہ اکثر غزلیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عالم میں
سعادت علی خاں کی زبان سے ایک مصرع نکل گیا۔ اس کی غزل کا پورا کرنا ان کا کام تھا۔ ایک دفعہ
کسی شخص کی پگڑی بے ڈھنگی بندھی تھی۔ سعادت علی خاں نے کہا۔ ع "پگڑی تو نہیں ہے یہ فرانسیس
کی ٹوپی"۔ تمام غزل دیکھو ان کی غزلوں میں۔ سعادت علی خاں نواڑے میں لیٹے ہوئے۔ میر
انشاء اللہ خاں کی گود میں سر دھرا ہوا۔ سرور کے عالم میں دریا کی سیر کرتے چلے جاتے تھے۔ لب دریا
ایک حویلی پر لکھا دیکھا۔ "حویلی علی نقی خاں بہادر کی" کہا کہ "انشا دیکھو۔ کسی نے تاریخ کہی مگر نظم
نہ کر سکا۔ بھئی تم نے دیکھا۔ بہت خوب مادہ ہے۔ اسے رباعی کر دو۔" اسی وقت عرض کی ـــ

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی	نہ سم کی نہ تال کی نہ سُر کی
یہ تاریخ کہی ہے کسی لُر کی	حویلی علی نقی خاں بہادر کی

تائید اس کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ جب شاہ نصیر دہلوی لکھنؤ میں گئے اور زمین ہائے
سنگلاخ میں گلہ ہائے گلکاری کر مشاعروں کو رونق دی تو سید انشا سے بھی ملے ...... اور کہا کہ وہ بھی

میر انشا اللہ خاں میں فقط تمہارے خیال سے یہاں آیا ہوں ورنہ لکھنؤ میں میرا کون بیٹھا تھا جس کے پاس آتا۔

اوس وقت رات زیادہ گئی تھی۔ میر انشا اللہ خاں نے کہا کہ "شاہ صاحب یہاں کے دربار کا عالم کچھ اور ہے کیا کہوں لوگ جانتے ہیں کہ میں شاعری کرکے نوکری بجالاتا ہوں مگر میں خود نہیں جانتا کہ کیا کر رہا ہوں دیکھو صبح کا گیا گیا شام کو آیا تھا۔ کمر کھول رہا تھا جو چوبدار آیا کہ جناب عالی پھر یاد فرماتے ہیں گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ کوٹھے پر فرش ہے چاندنی رات ہے۔ پہیئے دار چھپر کھٹ میں آپ بیٹھے ہیں پھولوں کا گہنا سامنے دھرا ہے۔ ایک گجرا ہاتھ میں ہے۔ اوسے اچھالتے ہیں اور پاؤں کے اشارے سے چھپر کھٹ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ میں نے سلام کیا۔ حکم ہوا کہ "انشا کوئی شعر تو پڑھو" اب فرمایئے ایسی حالت میں کہ اپنا ہی قافیہ تنگ ہو شعر کیا خاک یاد آئے خیر اس وقت یہی سمجھ میں آیا وہیں کہہ کر پڑھ دیا۔

لگا چھپر کھٹ میں چار پہیئے اچھالا تونے جو لے کے گجرا

تو موج دریائے چاندنی میں وہ ایسا چلتا ہے جیسے بجرا

یہی مطلع سن کر خوش ہو گئے ...... غرض اس معاملہ میں بے تاب کا قول لکھنے کے قابل ہے کہ "سید انشا کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا۔ اور شاعری کو سعادت علی خان کی مصاحبت نے ڈبویا[1]"

اس دور کے باقی شعرا بھی کسی طرح اپنے ان ہمعصروں سے پیچھے نہ رہے اور مذاق عام کا پورا پورا لحاظ رکھا۔ چنانچہ ان کے کلام سے بھی دربار اور ماحول کا رنگ بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

سعادت یار خاں رنگین اگرچہ اصل میں دہلی کے باشندے تھے اور بسلسلہ تجارت لکھنؤ آیا کرتے تھے لیکن وہ اتنے بار لکھنؤ آئے اور ان کی عمر کا اتنا بڑا حصہ یہاں کٹا کہ انھیں لکھنوی شعرا میں شمار کرنا بیجا نہ ہوگا۔ انشا کی ان سے خوب گاڑھی چھنتی تھی اور یہ مرزا سلیمان شکوہ کی بساط سخن کے بڑے زبردست مہروں میں شمار ہوتے تھے اس لحاظ سے ان کا کلام اس زمانہ کے لکھنوی مذاق کا بہترین مرقع کہا جاسکتا ہے۔ ان کا نام اردو زبان کی شاعری میں اس نئی طرز سخن کی بدولت زندہ ہے جو انھوں نے ریختہ کے جواب میں "ریختی" کی ایجاد کی تھی۔ اور جو اس زمانہ میں بہت مقبول ہوئی اس طرز کا مقصد یہ تھا

[1] - آب حیات صفحہ (۲۶۴)

کہ ٹھیٹھ عورتوں کی زبان میں عریاں اور فحش خیالات ادا کئے جائیں جو خواہ صنف نازک کے حسیات لطیف کی صحیح ترجمانی نہ کریں لیکن اس عہد کی ہوس پرستی اور بگڑے مذاق کے لئے سرمایۂ تسلی بن گئیں عورتوں کی زبان سے ان کے جذبات و احساسات ادا کرنے کا خیال فی الواقع نہایت پسندیدہ تھا اور اگر اس میں شائستگی اور حسن مذاق سے کام لیا جاتا تو غزل کی صنف میں ایک بڑے لطیف و دلکش عنصر کا اضافہ ہو جاتا کیوں کہ اردو شاعری اب تک نسائی جذبات کی ان پاکیزہ اور پوشیدہ گہرائیوں سے بالکل نا آشنا ہے جس کی مثالیں ہندی شاعری میں بکثرت پائی جاتی ہیں لیکن رنگین اور ان کے ہم مشرب شاعروں کا ریختی کی ایجاد سے یہ منشا ہی نہ تھا بلکہ ریختی پیدا وار تھی دراصل اس فحاشی اور نسوانیت کی جس میں اوس عہد کا لکھنؤ محسوس طور پر مبتلا ہونا شروع ہو گیا تھا اور جس نے آگے چل کر مذہب اور شاعری کے نام تک وہ مضحکہ خیز اور شرمناک صورتیں اختیار کیں جن کا ذکر اپنے اپنے موقع پر کیا جائے گا۔ مولانا شرر اس زمانہ کی اخلاقی حالت کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ :

"لکھنؤ میں شجاع الدولہ کے زمانہ میں رنڈیوں سے تعلقات پیدا کرنے کی جو بنیاد پڑی تھی روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ امیروں کی وضع میں داخل ہو گیا کہ اپنا شوق پورا کرنے یا اپنی شان دکھلانے کے لئے کسی نہ کسی بازاری حسن فروش سے ضرور تعلق رکھتے تھے۔ حکیم مہدی سا قابل و ہوشیار اور مہذب و شائستہ شخص جو وزیر اعظم کے رتبہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کی ترقی کی بنیاد پیارو نام ایک رنڈی سے پڑی ...... ان بے اعتدالیوں کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ لکھنؤ میں مشہور تھا کہ جب تک انسان کو رنڈیوں کی صحبت نہ نصیب ہو آدمی نہیں بنتا۔

آخر لوگوں کی اخلاقی حالت بگڑ گئی اور ہمارے زمانہ تک لکھنؤ میں بعض ایسی رنڈیاں موجود تھیں جن کے گھر میں علانیہ اور بے باکی سے چلا جانا اور ان کی صحبت میں رہنا معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔" [1]

اس دور کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے ریختی کے متعلق مولوی محمد حسین آزاد فرماتے ہیں کہ :-

"اس دور میں میاں رنگین سب سے نئے گلدستے بنا کر لائے اور اہل جلسہ کے سامنے سجائے یعنی ریختہ میں ریختی نکالی۔ ہم ضرور کہتے کہ ہندوستان کی عاشقانہ شاعری نے اپنی اصل پر رجوع کی۔

[1] مشرقی تمدن کا آخری نمونہ صفحہ (

لیکن چونکہ پہلے کلام کی بنیاد اصل پر تھی اور اس کی بنیاد فقط یاروں کے ہنسنے ہنسانے پر ہے اس لئے سوائے تمسخر کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ اگر لکھنو کے قیصر باغ اور وہاں کے معاملات کی تحریری دیوان رنگین اور دیوان انشا کو کہیں تو کچھ بدگمانی یا تہمت میں داخل نہیں اگرچہ اصل ایجاد میاں رنگین کا ہے مگر سید انشا نے بھی ان سے کچھ زیادہ ہی سگھڑاپا دکھایا ہے۔ ع۱

(۸) غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ء - ۱۸۲۷ء) و نصیر الدین حیدر کا عہد (۱۸۲۷ء - ۱۸۳۷ء)

آتش و ناسخ کا دور

سعادت علی خاں کے عہد تک فرماں روایانِ اودھ نواب وزیر کہلاتے تھے۔ اور برائے نام شاہان دھلی کے نائب سمجھے جاتے تھے۔ جس وقت غازی الدین حیدر اودھ میں تخت نشین ہوئے تو دھلی میں شاہ عالم کے بیٹے اکبر شاہ ثانی حکمران تھے۔ ان کی مارکوئیس آف ولزلی سے جو اس زمانے میں ہندوستان کے وائسرائے تھے۔ کچھ ان بن ہوگئی ایک تو یوں ہی انگریزوں کی یہ پالیسی تھی کہ جہاں تک ہوسکے دربار دھلی کا اعزاز واثر گھٹایا جائے اور اس پر جو یہ ذاتی مخالفت ہوئی تو وائسرائے نے غازی الدین حیدر کو "بادشاہ" کا لقب اختیار کرنے اور اپنی سلطنت کا علیحدہ سکہ چلانے کا مشورہ دیا بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس سے اس کی منظوری بھی منگوا دی۔

غازی الدین حیدر اس تجویز سے بہت خوش ہوئے۔ کئی لاکھ روپے رزیڈنٹ وغیرہ کو اس کے صلے میں دیئے اور دو کروڑ کے صرفہ سے اپنے لئے تخت وتاج اور مرصع چتر تیار کرایا۔ (۱۸۱۹ء) میں بڑے تزک واحتشام سے یہ رسم ادا ہوئی۔ بے دریغ روپیہ صرف ہوا۔ اب فرماں روایان اودھ بجائے نواب وزیر کے بادشاہ کہلانے لگے اور دربار دھلی کی برائے نام نیابت سے آزاد ہوکر خود مختاری کا اعلان کیا۔

یہ خود مختاری اگرچہ سیاسی نقطہ نظر سے کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ کیوں کہ فرماں روایان اودھ بجز ایک نام کے اور کسی طرح شاہان دھلی کے ماتحت نہیں تھے لیکن اس سے اہل لکھنو کی

ع۱ آب حیات صفحہ (۳۱۴)

ذہنیت میں بہت بڑا انقلاب ہوگیا۔ اب تک لکھنؤ گو سیاسی اعتبار سے انگریزوں کے زیر اثر تھا۔ لیکن ذہنی اعتبار سے بالکلیہ دربار دہلی کا حلقہ بگوش تھا۔ دہلی کی عظیم الشان سلطنت اگرچہ اب باقی نہیں رہی تھی لیکن وہاں کی معاشرت۔ وہاں کا تمدن۔ وہاں کی زبان۔ وہاں کے رسم و رواج غرض وہاں کی ہر چیز اہل لکھنؤ کے لئے ایک نمونہ تھی۔ غازی الدین حیدر کے اعلان خود مختاری کی بنا پر پہلے پہل لکھنؤ کو یہ احساس ہوا کہ وہ اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے اور اسے معاملات زندگی میں دوسروں کے اتباع کی کوئی ضرورت نہیں۔

اب فطرتاً یہاں کے لوگوں کی یہ خواہش ہوئی کہ اپنے امتیازی خصوصیات پیدا کئے جائیں اور جس طرح سیاسی اعتبار سے بادشاہ دہلی سے آزادی حاصل کرلی ہے۔ اسی طرح اور حیثیتوں سے بھی آزاد ہو جائیں چنانچہ لکھنؤ کی معاشرت۔ تمدن۔ زبان۔ لباس۔ غرض ہر چیز بدلنی شروع ہوئی۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں تقلید کی جگہ اجتہاد کا زور ہوا۔ دہلی کے ڈھیلے ڈھالے انگرکھے اور نیمے کی جگہ اب چست چپکن اور خوشنما شلوکے نے لے لی۔ قدیم وضع کی پگڑیاں اور چوگوشیا ٹوپیاں، پنچ گوشیا اور مندیل سے بدل گئیں۔ بڑے بڑے کلیوں دار پائچوں کے پائجامہ کے بجائے ایک ڈھیلے عرض کے پائچوں کا پاجامہ ایجاد ہوا۔ سلیم شاہی جوتوں کے بدلے سلمے ستارے کے جوتے نکلے۔ پیچوانوں کی جگہ مداریئے حقے۔ لٹیاریوں کی جگہ پاندان۔ اور آفتابہ کی جگہ لوٹے رائج ہوئے غرض مبتکرانہ تصرف ہر چیز میں کارفرمائی کرنے لگی اور اہل لکھنؤ کو دہلی والوں کے مقابلہ میں اپنی ان ایجادوں پر فخر و ناز ہونے لگا۔ مرزا رجب علی بیگ سرور اپنی مشہور کتاب فسانۂ عجائب میں (جو غازی الدین حیدر کے عہد میں ۱۲۴۰ھ میں لکھی گئی ہے) اس زمانہ کے لکھنؤ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ اس کے ہر لفظ سے تفاخر و تعلّی کی بو آتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دہلی کیا وہ سارے جہاں میں لکھنؤ کی رونق اور رنگ و ڈھنگ کا کہیں جواب نہ پاتے تھے۔ اس میں انھوں نے اپنے عہد کے تمام ارباب ہنر اور ان کے کمالات کا ذکر کیا ہے حتیٰ کہ حلوائیوں، نان بائیوں، عطر فروشوں، قوالوں، نائیوں تک کا حال فخریہ انداز میں بیان کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ ایسے معمولی پیشہ وروں کو اتنی اہمیت دیں وہ بھلا شاعری کو کیونکر

چھوڑ سکتے تھے کیوں کہ اس زمانہ میں شعر کہنا بقول شرر وضعداری بن گیا تھا۔ لیکن اب تک لکھنؤ میں شعر وسخن کا بازار صرف شعرائے دہلی کے دم سے گرم تھا۔ اب اہل لکھنؤ نے چاہا کہ ان کے ملک کے اور باکمالوں کی طرح شاعر بھی خاص وہیں کے ہوں چنانچہ آتش (المتوفی ۱۸۴۶ء) اور ناسخ (المتوفی ۱۸۳۸ء) نے اس کمی کو بھی پورا کر دیا اور شعرائے دہلی کے علی الرغم اپنا ایک علحدہ اسکول قایم کیا۔ لیکن اس سے یہہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہاں شاعری صرف ان ہی کی ذات تک محدود تھی نہیں بلکہ یہہ لکھنؤ کی زندگی کا ایک جزو لاینفک بن گئی۔ اور ہر کس وناکس کے لئے لباس پہننے اور کھانا کھانے کی طرح شعر کہنا بھی ضروری ہو گیا۔

لوگ عام طور پر یہہ سمجھنے لگے کہ شاعر ہونے کے لئے فطری مناسبت اور شاعرانہ مذاق کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ جس طرح ہندوستان میں اور پیشے باپ سے بیٹے اور استاد سے شاگرد پر منتقل ہوتے رہتے ہیں اسی طرح شاعری بھی ایک پیشہ ہے جو صرف فنی نکات کے حاصل کر لینے سے خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ انتہا یہ کہ جن لوگوں کو ان فنی نکات پر عبور حاصل کرنے کی فرصت نہ تھی ان کے لئے بھی شاعر کہلانا اور مشاعروں میں غزلیں پڑھنا ضروری ہو گیا تھا۔ جس کی کیفیت مولوی محمد حسین آزاد مصحفی کے ذکر میں اس طرح بیان کرتے ہیں:-

"سن رسیدہ لوگوں کی زبانی سنا گیا کہ دو تین تختیاں پاس دھری رہتی تھیں جب مشاعرہ قریب ہوتا تو ان پر اور مختلف کاغذوں پر طرح مشاعرہ میں شعر لکھنے شروع کرتے تھے اور برابر لکھے جاتے تھے لکھنؤ شہر تھا۔ عین مشاعرہ کے دن لوگ آتے اور ۸ سے ایک روپیہ تک اور جہاں تک کسی کا شوق مدد کرتا وہ دیتا۔ یہہ اس میں سے ۹ - ۱۱ - ۱۲ شعر کی غزل نکال کر حوالہ کر دیتے اور ان کے نام کا مقطع کر دیتے تھے"۔ [۱]

اس دور کی شاعری کو تباہ کرنے میں ان مشاعروں کی کثرت کو بھی بڑا دخل ہے کیونکہ زیادہ تر غزلیں ان ہی مشاعروں کے لئے لکھی جاتیں جن میں چن چن کر سنگلاخ زمینیں رکھی جاتیں اور شعراء ان ہی میں اپنے اشہب قلم کی جولانیاں دکھانے پر مجبور ہوتے اس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ شاعروں کی فکر سخن تمام تر الفاظ

[۱] آبحیات صفحہ (۲۹۳)

مرتکز ہوگئی اور مطالب جو اصل شاعری ہیں ایک ضمنی اور اضافی شے بن کر رہ گئے۔ مثلاً ایک مشاعرہ کے لئے جو مصرعہ طرح دیا گیا تھا اس کا قافیہ تھا (ہزار) اور ردیف تھی (درخت) ناسخ نے (جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ پہلوان بھی تھے) اس زمین میں جو غزل کہی اس کا ایک شعر یہ ہے۔

تو نے مگدر ہلائے کیوں نہ کریں   باغ عالم میں افتخار درخت

(۱) الغرض اس صورت حال کا اثر یہ ہوا کہ اس دور کی شاعری بالکل سیکانکل ہو کر رہ گئی۔ یعنے جس طرح ایک چمار چمڑا لے کر بیٹھتا ہے اور مقررہ سانچوں پر لگا کر ایک جوتی گانٹھ لیتا ہے یا ایک حلوائی مقررہ مقدار میں دودھ شکر کھویا وغیرہ ملا کر مٹھائی بنا لیتا ہے اوسی طرح اس دور کا شاعر چند مقررہ الفاظ محاورات ترکیبیں تشبیہیں لے کر بیٹھتا ہے اور ان ہی کو الٹ پھیر کر ایک ایسا شعر تیار کر دیتا ہے جو ہر طرح کی شاعرانہ لطافتوں سے معرا ہوتا ہے اس میں نہ تو درد و اثر پایا جاتا ہے نہ بلندی و رفعت نہ شوخی و بانکپن کا پتہ ہوتا ہے نہ جدت و حسن کا مذاق۔

انشا۔ رنگین اور جرات کی شاعری خواہ کیسی ہی فحش و عریاں سہی لیکن اس زندگی کے آثار اور جذبات کے نشانات خواہ وہ گندے ہی کیوں نہ ہوں ملتے ہیں۔ اس کے برخلاف آتش و ناسخ کے عہد کی شاعری اس قدر بے کیف بے مزہ پھیکی اور مردہ ہے کہ میرے خیال میں اوس پر شاعری کا پورا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ مثال کے لئے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ناسخ

دے دوپٹہ تو اپنا ململ کا   ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

شکم صاف کے قریب ہے لم   یہ ہے مخمل پہ خواب مخمل کا

کیا کسی گل کی سواری ہے   نکہت گل دھواں ہے مشعل کا

آتش رخ سے آنکھ سینکتے ہیں   کیا زمستان میں کام منقل کا

لکھوں ناسخ جو وصف چشم سیاہ
ہو سیاہی میں طور کا جل کا

آتش

نہ کہا یا عقدہ کبھی خوانچہ سے قسمت کے | پھنسے جو حلق میں میں وہ نوالہ کیا کرتا

منزل گور اب مجھے اے آسماں درکار ہے | مردم بیمار کو نقل مکاں درکار ہے

رتبہ رکھتے ہیں ترے ابروئے خمدار بلند | طاق کعبہ سے ہیں یہ طاق خوش آثار بلند

اے حور اپنے سیب ذقن کا نہ حال پوچھ | جنت کا میوہ مغز سے ہے پوست تک لذیذ

تمہارے روبرو پھیکا رخ شمس و قمر دیکھا | وہ نان بے نمک پایا یہ شیر بے شکر دیکھا

اس طفل مہ جبین نے جو رکھی کلاہ کج | پیر فلک نے پھینک دی دستار آفتاب

مصحف رخ کی تلاوت ہی نہایت مشکل | اس میں اے قاری زیر و زبر و پیش نہیں

ناسخ

ناک رگڑے ہر گھڑی کیوں کر نہ اس کے سامنے | بدلے نتھنی کے سلیماں کی ہے خاتم ناک میں

رنگ لالہ میں اگر ہے تو نہیں نام کو بو | یاسمن میں ترے بندے سے ہے بو رنگ نہیں

(۲) اس دور کی شاعری کی دوسری خصوصیت اسکی سخافت و ابتذال ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ شاہان بازاری سے تعلقات کی وہ گرم بازاری جس کا ذکر گزشتہ دور میں ہو چکا ہے اس عہد میں اور ترقی کر گئی تھی۔

ایسے ہی ناگفتہ بہ حالات عہد غازی الدین کے بھی ہیں جب بادشاہوں کا یہ حال ہو تو عوام کا کیا پوچھنا۔ غرض "الناس علی دین ملوکھم" کے مصداق سارے شہر میں یہ وبا شدت سے پھیل گئی تھی اور اس کا لازمی اقتضا یہ تھا کہ اس کا پرتو اس دور کی شاعری پر پڑے چنانچہ آتش و ناسخ کے تمام دیوان اس ابتذال اور سوقیت کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔

(۳) تیسری خصوصیت اس دور کی شاعری کی نسوانی متعلقات کا ذکر اور انداز بیان کا زنانہ پن ہے، اور اس کا سبب وہ نسوانیت ہے جو بتدریج اہل لکھنؤ میں سرایت کر رہی تھی اور جو آگے چل کر واجد علی شاہ کی ضرب المثل زنانہ مزاجی اور جان صاحب کی ریختی پر منتج ہوئی جو وہ اس وقت ہمارے

زیر بحث ہے اس کے نسائی میلانات کا اعتراف مولانا عبدالحلیم شرر ایک موقع پر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"اور چونکہ اب سپہ گری و جنگجوی کی بہت ہی کم ضرورت باقی تھی، عیش پرستی اور عورتوں کی صحبت بڑھتی جاتی تھی اس لئے مردوں پر عورتوں کی وضع کا اثر پڑنے لگا جو اعتدال سے باہر ہوگیا اور جس قسم کی زینت اور آرائش عورتوں کے لئے موزوں ہے مردوں نے اپنی وضع اور لباس میں اختیار کرنا شروع کی۔ خصوصاً اس زمانہ سے جبکہ یہاں کے حکمرانوں نے اپنے لئے نواب کا لفظ چھوڑ کے بادشاہ کا لفظ اختیار کیا نیشاپوری اور سالار جنگی خاندان کے لوگ جو معقد بہ وثیقہ اور پنشنیں پاتے تھے بالکل خانہ نشین کر دیئے گئے تو اون کو عورتوں کی صحبت کے سوا کسی کی صحبت ہی نصیب نہ ہوتی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ان کے وضع و لباس ہی میں زنانہ پن نہیں پیدا ہوا بلکہ ان کی زبان بھی عورتوں کی سی ہوگئی اور چونکہ یہی شہر کے رئیس اور وضعدار تصور کئے جاتے لہذا اکثر عوام نے بھی ان ہی کی پیروی شروع کر دی اور بخلاف دیگر مقامات کے رئیسوں کے یہاں لکھنؤ میں یہ عام وضع ہوگئی کہ سر پہ مانگ اس پر ساے کی کا مدار ٹوپی کانوں تک بال جن کی کنگھی کرنے میں ماتھے پر دونوں جانب پٹیاں جمائی جاتیں۔ منہ میں پان ہونٹوں پر لاکھا بٹے میں تین تین کرتوئیوں کا چست انگرکھا اسکے نیچے گلبدن کا پیشی کھینچا ہوا کھٹنا۔ ہاتھوں میں مہندی پاؤں میں ٹاٹ بانی بینے کا مدار بوٹ۔ جاڑوں میں انگرکھے کی جگہ نیلے زرد یا سبز و سرخ اطلس یا گرنٹ کا روئی کا ڈگلہ۔"

پس یہ اسی روزافزوں نسوانیت کا اثر تھا کہ لکھنوی شعرا کے کلام میں نسوانی متعلقات کا ذکر بکثرت آنے لگا یہاں تک کہ یہ اس دور کی ایک نمایاں خصوصیت بن گئی۔ ورنہ متقدمین کے کلام میں محرم انگیا ڈوپٹہ۔ کرتی۔ آرسی مسی وغیرہ کا ذکر شاذ ہی کہیں ہو تو ہو۔ اس کے برخلاف آتش و ناسخ اور ان کے تلامذہ کے ہاں جا بجا ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں نہایت رکیک اور عامیانہ طریقہ پر یہ نسوانی متعلقات بیان کئے گئے ہیں۔

(۴) اس دور کی چوتھی خصوصیت اس کی زبان ہے۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ یہ عہد ایجاد و تصرف کا تھا۔ اور اس کی وجہ اودھ کے دربار میں ایک برائے نام تبدیلی تھی۔ شاعری کے میدان میں تصرف کا

یہ سارا زور زبان پر صرف ہوگیا۔ چنانچہ جس تحریک اصلاح نے انگرکھے کو چپکن، چوگوشیا کو سنڈیل آفتابہ کو لوٹے اور پٹاریوں کو پاندان کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا انھیں اثرات نے "نپٹ" کو "بہت" سے "پرے" کو "الگ" سے "آگو" کو "آگے" سے اور "لاگا" کو "لگا" سے بدل دیا۔

ان تصرفات زبان کی فہرست اتنی طویل ہے کہ یہ بجائے خود ایک مستقل عنوان ہو سکتا ہے لیکن ہمیں یہاں ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں صرف اتنا بتا دینا ہے کہ تصرف زبان کی اس تحریک نے پہلے پہل اردو شاعری کی زبان کو بڑا فائدہ پہنچایا اور بہت سے ثقیل اور مکروہ الفاظ کو سبک اور شیریں سے بدل دیا۔ مثال کے لئے آپ میر و سودا بلکہ انشاء و مصحفی کے کسی شعر کا ناسخ و آتش کے کسی شعر سے مقابلہ کریں تو زبان کی صفائی کا یہ فرق بخوبی ظاہر ہو جائے گا لیکن اہل لکھنؤ کا یہ جذبہ اصلاح و تصرف بڑھتے بڑھتے جنون کی حد تک پہنچ گیا اور نفاست و نزاکت کا خبط ہر شعبۂ زندگی میں وبال جان ثابت ہونے لگا۔ مثلاً دہلی کی چوگوشیا ٹوپی جو فی الواقع بھدی تھی لکھنؤ میں آکر پہلے گول قبہ نما ٹوپی ہوئی کا پھر پنج گوشیا ہوئی پھر سنڈیل ہوئی چہر دو پلڑی ہوئی اور اس کی ساخت اور وضع میں اتنے تکلفات و اہتمامات ہونے لگے اور اس کے بنانے قالب پر چڑھانے کشیدہ کرنے چننے اور سر پر رکھنے کے ایسے بندھے تلے قاعدے مقرر ہوئے کہ وہ ٹوپی نہ ہوئی بلائے جان ہوئی۔ یہی حال شاعری کی زبان کا ہوا۔ تصرف زبان کی یہ تحریک ابتدا میں صرف اس حد تک تھی کہ شعرائے دہلی کے کلام میں ہندی کے جو بڑے اور بھدے، اور نامانوس الفاظ ہوں وہ عربی اور فارسی کے شیریں، عام فہم اور خوش آیند الفاظ سے بدل دیئے جائیں لیکن آخر کار اس مقصد میں اتنا غلو ہوا کہ شاعری صرف الفاظ کا ایک گورکھ دھندا بن کر رہ گئی اور ہندی کے عام و سادہ الفاظ بھی عربی و فارسی کے مغلق الفاظ سے بدلے جانے لگے۔ صرف یہی نہیں بلکہ شاعری عبارت ہوگئی، صنائع بدائع سے۔ الفاظ کی موشگافیوں کا نام نازک خیالی رکھا گیا اور رعایت لفظی شعر کا جزو لاینفک قرار پائی اس رعایت لفظی کا خیال بڑھتے بڑھتے دور ما بعد میں جنون کی حد تک پہنچ گیا جس پر معانی اور مطالب سب قربان کر دیئے گئے اس کی مثالیں ہم آیندہ دور میں پیش کریں گے۔ لیکن یہاں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدا آتش و ناسخ ہی سے ہوئی جس کا

نتیجہ یہہ ہوا کہ ان کا کلام سوز و گداز اور کیف و اثر سے معرا ہوگیا اور اس دور کی شاعری ایسی بے لطف اور جامد ہوگئی جیسے کہ الگزنڈر پوپ کے عہد میں انگلستان کی شاعری ہوگئی تھی ۔

(۹) محمد علی شاہ کا عہد (سنہ ۱۸۳۷ء ۔ سنہ ۱۸۴۲ء)

تلامذہ آتش و ناسخ کا دور ۔

غازی حیدر نے سعادت علی خاں کا جمع کیا ہوا ستر کروڑ روپیہ اگرچہ نہایت بیدردی سے اڑایا پھر بھی اوسے ختم نہ کرسکے اور مرتے وقت چھ کروڑ خزانہ میں چھوڑ گئے جسے ان کے جانشین نصیر الدین حیدر نے ختم کیا اس طرح جب محمد علی شاہ نے زمام حکومت ہاتھ میں لی تو خزانہ شاہی میں جھاڑو پھری ہوئی تھی، ہر طرف عیش پرستی اور بیکاری کا دور دورہ تھا نسوانیت غالب ہورہی تھی ہمت و جرات رخصت ہوچکی تھی اور ریاست کا نظم و نسق اس قدر بگڑ چکا تھا کہ سلطنت چند روز کی مہمان معلوم ہوتی تھی ۔

حقیقت یہہ ہے کہ اسی بدنظمی نے محمد علی شاہ کو تخت دلایا ۔ ورنہ نصیر الدین حیدر کی اولاد موجود تھی اور اوس کے ہوتے محمد علی شاہ کو جو سعادت علی خاں کے بیٹے یعنے نصیر الدین حیدر کے چچا ہوتے تھے تخت سلطنت پر کوئی دعوی نہ پہنچتا تھا لیکن چونکہ نصیر الدین حیدر کے بیٹے مرزا مہدی عرف منا جان نا اہل ہونے کے ساتھ نوجوان بھی تھے اس لئے انگریزوں نے ان کا تخت نشین ہونا پسند نہیں کیا اور سمجھے کہ جس طرح ان کے پیشرو عالم شباب کی وجہ سے لہو و لعب میں پھنس گئے تھے یہہ بھی انھیں کے نقش قدم پر چلیں گے ۔ اس کے برخلاف محمد علی شاہ کہن سال تجربہ کار اور نہایت بیدار مغز تھے اس لئے وہی بادشاہ بنائے گئے اور فی الواقع انھوں نے اپنے آپ کو اس کا اہل بھی ثابت کیا ۔ ان کے باقی ماندہ ایام زندگی سلطنت کی فلاح و بہبود کی فکروں میں کٹے اور انہیں کے حسن انتظام کی بدولت سلطنت دو پشتوں تک قائم رہی ورنہ اسی زمانہ میں ختم ہوجاتی ۔ سب سے پہلے انھوں نے اون فضول خرچیوں اور عیش پرستیوں کا سدباب کیا جس میں ان کے پیشرو مبتلا تھے جو نا اہل اور خود غرض عہدہ دار سلطنت کو نقصان پہنچا رہے تھے سب الگ کئے گئے جن جن کے ذمے سابقہ مطالبات ثابت ہوئے اون سے انار توم کی پابجائی کرائی گئی اس طرح کئی کروڑ روپیہ

جو سابقہ عمال نے ہضم کیا تھا خزانہ میں جمع ہوا ۔ فوجی اور سول ملازمین کی تنخواہیں جو برسوں سے چڑھی ہوئی تھیں ادا کی گئیں ۔ روشن الدولہ جو اس وقت وزیر اعظم تھے اپنی بد دیانتی اور نا اہلی کے سبب برطرف ہوئے اور ان کی جگہ شرف الدولہ عہدہ وزارت پر مامور کئے گئے اس حسن انتخاب نے محمد علی شاہ کے حسن تدبیر کے ساتھ مل کر سونے پر سہاگے کا کام کیا اور ریاست کی سالانہ آمدنی ڈیڑھ کروڑ تک پہنچ گئی جو نہ اوس سے قبل کبھی ہوئی تھی اور نہ اوس کے بعد کبھی ہوئی ۔ تمام ارباب نشاط اور خواصیں جو دربار کا جزو لاینفک بن گئی تھیں یک قلم موقوف ہوئیں اور سینکڑوں غیر ضروری کارخانے تخفیف کر دیئے گئے ۔

غرض ریاست کا نظم و نسق جو بالکل درہم برہم ہو چکا تھا از سر نو درست کیا گیا اور اس ڈوبتی ناؤ کو بچانے کی ممکنہ کوشش کی گئی لیکن بگڑی ہوئی سلطنت کا بنانا اور راسخ عادتوں کا بدلنا کوئی آسان کام نہیں اسی لئے محمد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ کی زندگی کا ہر شعبہ ایک کشمکش میں پھنسا ہوا تھا اور دربار و عوام پر دو متضاد اثرات کارفرما تھے ۔ ایک طرف گذشتہ عیش و عشرت بےفکری و بیکاری تن آسانی و لہو و لعب لوگوں کے خمیر میں داخل ہو چکے تھے تو دوسری طرف برسر اقتدار حکومت ان کو محنت و مشقت کا عادی بنانا اور علوم و فنون کا شوق دلانا چاہتی تھی یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ آج سے ایک صدی قبل جبکہ ہندوستان کے والیان ریاست علوم جدیدہ کے نام سے بھی واقف نہ تھے ۔ محمد علی شاہ نے اوسی لکھنؤ میں جہاں ان کے پیشرو عمر بھر زلف و کمر اور گل و بلبل کے راگ الاپا کئے ایسے مفید و کارآمد علوم و فنون کا سلسلہ قائم کیا تھا جو اگر زمانہ کی دست برد سے بچ جاتا تو آج اس بادشاہ کو علمی دنیا میں بقائے دوام کا خلعت بخشتا ۔ "بزم سحر" کے نام سے ایک کتاب خود میری نظر سے گذری جو ۱۸۴۱ء میں بمقام لکھنؤ چھپی تھی اور جو سائنس کی ایک انگریزی کتاب سے ترجمہ کی گئی تھی جس کا نام تھا ۔

A treatise on The objects, Advantages and pleasure of Science.

اس کتاب کے مترجم میر الحسنی نام کوئی صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ اوس علمی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو محمد علی شاہ کے حکم سے قائم ہوا تھا ۔

غرض محمد علی شاہ کی اس روشن خیالی سے دربار اودھ کے قدیم روایات اور طرز عمل کو جو صدمہ

پہنچا اور سلطنت کے مختلف شعبوں میں جو ردعمل پیدا ہو گئی اوس سے وہاں کے شعر وسخن کا میدان بھی نہ بچ سکا اور ایک ہی زمانہ میں شاعری کے دو ایسے دور قائم ہوئے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ متضاد تھے۔ ایک محمد علی شاہ کے پیشروں کی عیش پسندی وتن آسانی نمائش و تکلف لہو و لعب اور فسق و فجور کا ثمرہ تھا تو دوسرا ان کے اور ان کے جانشین امجد علی شاہ کی سادہ معاشرت، مذہبی تقدس اور علمی قدر دانی کا نتیجہ لکھنو کی شاعری کے اس مبارک دور کے لئے اگرچہ محمد علی شاہ ہی کے عہد میں زمین ہموار کی گئی اور تخم ریزی بھی اسی عہد میں ہوئی لیکن اس کے ثمرات زیادہ تر امجد علی شاہ کے زمانہ میں ظاہر ہوئے اور اوس کے نشو و نما میں بھی ان کا بہت بڑا حصہ رہا اسلئے ہم اس کا تفصیلی ذکر ان ہی کے عہد میں کریں گے۔ یہاں ایک سرسری نظر اوس اول الذکر دور پر ڈالتے ہیں جو تلامیذ آتش و ناسخ کا دور کہلاتا ہے اس دور کو اگرچہ شاہی سرپرستی بالکل حاصل نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود اس میں شاعروں کی ایسی کثرت تھی کہ ان کا حصر و شمار ممکن نہیں کیوں کہ گذشتہ مسند نشینوں کے زہریلے اثرات سے مذاق عام اس قدر بگڑ چکا تھا کہ اون کی بدولت اب یہہ شعرا حکومت کی اعانت سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ ان میں بعض آتش کے شاگرد تھے اور بعض ناسخ کے اور اس لحاظ سے ان دونوں کے دو علحدہ اسکول قائم ہو گئے تھے لیکن اس برائے نام اختلاف کے باوجود ان کی شاعری اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بالکل ایک سی ہے جیسے ان کے اساتذہ کی صدائے بازگشت کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اس میں وہی گزشتہ دور کے سے سوقیانہ خیالات۔ بے کیف مضامین، نسوانی متعلقات کا ذکر اور رنگین ماحول کا اثر صاف نمایاں ہے اور یہ اثر اس عہد کے تمام شعرا میں اس قدر مشترک ہے کہ ان کے انفرادی خصوصیات اگر کچھہ ہیں بھی تو اس عام رنگ میں بالکل دب گئے ہیں۔ البتہ دو خصوصیتیں اس عہد کی مابہ الامتیاز ہیں۔ ایک زبان کی سلاست دوسرے صنائع لفظی کا التزام۔ زبان کی سلاست کو اوس رجحان کا رد عمل کہنا چاہیئے جو آتش و ناسخ کو عربی اور فارسی عنصر کی طرف ہو گیا تھا۔ یہہ زبان اپنی صفائی و سلاست کے لحاظ سے اس عہد کے بڑے کارنامے میں شمار ہونے کے لایق ہے جو اس کے بعد سے آج تک لکھنوی شاعری کا طغرائے امتیاز بنی رہی۔

لیکن ضائع لفظی خصوصاً مراعاۃ النظیر کے التزام نے زبان کی ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیا اور اس کے لطف روانی کو خاک میں ملا دیا۔ اس دور میں رعایت لفظی کا التزام لطف و چاشنی کی حد سے گذر کے خبط و جنون کے درجہ پر پہنچ گیا تھا جس کی قربان گاہ پر مطالب و معانی سب شہید کر دیئے گئے اور شاعری کو ایک مقفیٰ ضلع جگت بنا کر رکھدیا اس رعایت لفظی کی مثالیں اگرچہ آتش و ناسخ کے ہاں بھی ملتی ہیں لیکن اس قدر نہیں جتنی کہ اس دور میں۔ اس دور کے شعرا کے نزدیک تو شاعری گویا عبارت تھی اسی رعایت لفظی سے۔

اگرچہ امانت لکھنوی اس بارے میں بہت بدنام ہے لیکن تحقیق کی جائے تو اس دور کا ہر شاعر کم و بیش اس مرض میں مبتلا نظر آئے گا۔

رند (۱۷۹۷ء - ۱۸۵۷ء) وزیر (المتوفی ۱۸۵۴ء) صبا (۱۷۶۵ء - ۱۸۵۴ء)۔ برق (المتوفی ۱۸۵۷ء) اسیر (۱۸۰۰ء - ۱۸۸۱ء) امانت (۱۸۱۵ء - ۱۸۵۸ء) خلیل (المتوفی ۱۸۶۰ء) بحر (۱۸۰۱ء - ۱۸۸۲ء) سحر (؟) رشک (۱۷۹۹ء - ۱۸۶۷ء) جو اس عہد کے قابل ذکر شعرا ہیں ان سب کا کلام اس صنعت سے اس قدر معمور ہے اور ان کی ساری فکر سخن اسی ایک چیز پر اس طرح مرتکز ہو گئی ہے کہ ان کے کلام کا باہم امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ مثال کے لئے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

رند :- ثابت ہوا جو کشتۂ چشم سیاہ یار　　آہو مرے مزار کے سبزہ کو چر گئے

" روکر کہا جو میں نے کہ مرتا تھا مری جان　　ہنسکر دیا جواب کہ پھر کیوں نہ مر گئے

" کوٹھے پہ جب چمک کے وہ زہرہ جبیں چڑھا　　شمس و قمر نظر سے ہمارے اتر گئے

" میلہ تھا چاند گنج میں سورج گہن کا آج　　تم کس لئے نہ غیرت شمس و قمر گئے

" سورج مکھی کے پھول کا عالم ہے آنکھ کا　　یہ بھی تمہارے ساتھ پھری تم جدھر گئے

خلیل :- کیا دکھاؤں دل پر داغ سیہ چشموں کو　　سہم جائیں گے جو چیتے کو ہرن دیکھیں گے

" اپنی آنکھوں سے خط رخ کی حفاظت کیجئے　　چر ہی جائیں گے جو سبزہ کو ہرن دیکھیں گے

وزیر :- رنگ کندن سا تمہارا ہے عجب کیا ہے اگر　　طوطی سبزہ خط سونے کی چڑیا ہو جائے

وزیر۔ چومتا ہوں لب شیریں وہ خفا ہوتا ہے ۔۔ کیا شکر رنجی جاناں میں مزہ ہوتا ہے

" صورت ماہ نو آتا ہے مہینے پیچھے ۔۔ انہیں باتوں سے تو انگشت نما ہوتا ہے

" نکا مضمون ہاتھ اور اس کان کے بالے کی مچھلی کا ؛ یہ ہم نے چشمۂ خورشید سے مچھلی نکالی ہے

" لڑائی وصل میں اس جنگجو سے ہونے والی ہے ؛ کٹاری گلبدن کے پائجامے نے نکالی ہے

صباؔ۔ ملتا ہے گل رخوں سے دل اس لئے کمینہ ۔۔ ہر پھول میں مٹھاس ہے زنبور کمینے

" ای منہ سا ماں سواری پہ نہ پھولو ۔۔ اڑ جائے گا اک روز ہوا اور تمہارا

" بے تکلف اس سے ہو کر کیوں نہ ہوں محظوظ ہم ۔۔ توڑ کر پرہیز ہوتا ہے بہت بیمار خوش

" عمر بھر دل نہ مرا یار کے گھر سے اٹھا ۔۔ بیٹھا دیوار کے نیچے جو میں در سے اٹھا

بحرؔ۔ اے بحر نہ لے عارض محبوب کا بوسہ ۔۔ شبہہ ہے تجھے کان کی بجلی پہ نگر کا

" خوشبو میں کیا ہیں داغ محبت کے ابھرے ۔۔ سر ہے کہ دوش پر ہے قرابہ گلاب کا

سحرؔ۔ طائر روح کو دانہ پہ لگایا تل نے ۔۔ دل پہ ہم نے تری خندہ وقتی کا چہرہ کھایا

" مسکرا کر وصل میں جب نازنینے پیئے پانی ۔۔ موج خندہ بن گئی زنجیر موتی چور کی

رشکؔ مرغ دل کو توڑے گی بلی اگر دروازے کی ۔۔ رخنۂ تن کو کترے گا چوہا تمہاری ناک کا

---

(۱۰) امجد علی شاہ کا عہد۔ (۱۸۴۲ء۔۱۸۴۷ء)

انیس و دبیر کا دور۔

جس طرح چنگیز و ہلاکو کے نام تاریخ عالم میں ظلم و ستم کے مرادف ہو گئے ہیں۔ اسی طرح امجد علی شاہ کا نام تاریخ اودھ میں تعصب ملی کا مرادف ہو گیا ہے۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ سلاطین اودھ فرقہ امامیہ سے تعلق رکھتے تھے اور برہان الملک سے لیکر واجد علی شاہ تک تمام فرمانروا بلا کسی استثنا رسم اس مسلک کے پابند رہے۔ مگر ابتدا میں یہ مذہبی اثر صرف سلاطین کی ذات تک محدود رہا۔ اور امور مملکت یا عامۃ الناس پر کسی طرح موثر نہیں ہوا لیکن رفتہ رفتہ اس نے ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کرلی

جس سے اودھ کی سیاست، معاشرت، ادب اور شاعری پر گہرے اثرات مترتب ہوئے۔ ہم اوپر کہیں بیان کر چکے ہیں کہ اس کی ابتدا آصف الدولہ کے عہد سے ہوئی تھی جن کے اس مذہبی میلان نے شمال میں مرثیہ نگاری کی بنیاد ڈالی اور اوس عہد کے کئی شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی جن میں سودا، میر ضاحک، میر حسن اور مسکین قابل ذکر ہیں لیکن بجز ایک سودا کے ان میں سے اور کسی نے اس صنف میں خاص شہرت نہیں حاصل کی اور نہ ان کا کلام آج دستیاب ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ شاہان اودھ کے شیعی میلانات کے جہاں یہ معاشرتی ثمرات ظاہر ہوئے۔ وہاں ادبی ثمرات خلیق و ضمیر کے سے مرثیہ گو پیدا ہوئے جنھوں نے اس صنف میں بہت کچھ اصلاح و ترمیم کی اور ان اصول و قواعد کی بنیاد ڈالی جن پر انیس و دبیر نے ایک عظیم الشان عمارت کھڑی کر دی۔ اس بارہ میں ضمیر بطور خاص قابل ذکر ہیں جنھوں نے مرثیہ میں حسب ذیل جدتیں کیں۔

(۱) رزمیہ لکھا۔ (۲) سراپا ایجاد کیا۔ (۳) گھوڑے تلوار اور اسلحہ جنگ کے الگ الگ اوصاف لکھے (۴) واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی اور جزئی واقعات کو بتفصیل بیان کیا۔ (۵) کلام میں زور بندش میں چستی پیدا کی اور جو غلط الفاظ مرثیوں میں مستعمل تھے وہ ترک کر دیئے۔ پہلے مرثیہ سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے ضمیر نے تحت لفظ پڑھنے کی بنا ڈالی۔

نصیر الدین حیدر کے بعد جب محمد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو انھوں نے اگرچہ اپنے پیشروؤں کے بعض رسوم موقوف کر دیے۔ لیکن شیعی میلانات کا ظہور ان کے زمانہ میں بھی ہوتا رہا۔ چنانچہ انھوں نے عزاداری کے لئے وہ مشہور عمارت تعمیر کرائی جو حسین آباد کے نام سے اب تک لکھنؤ میں موجود ہے اس کے علاوہ انھوں نے اپنے عہد کے غزل گو شعرا کے علی الرغم مرثیہ گو شعرا کی سرپرستی کی جس کی بدولت اوس ذوق سخن کی نشو و نما ہوئی۔ جس نے انیس و دبیر کے مقابلہ میں وزیر و اسیر کا رنگ پھیکا کر دیا۔ محمد علی شاہ کی ڈالی ہوئی داغ بیل۔ امجد علی شاہ کے عہد میں اور مستحکم ہو گئی۔

غرض شاہان اودھ کا یہ مذہبی تعصب اقلیم سخن میں ایک ایسی قلمرو کا اضافہ کر گیا۔ جس پر نہ صرف دبستان لکھنؤ بلکہ پوری اردو شاعری جس قدر فخر و ناز کرے بجا ہے۔ اگر کسی کو سلاطین اودھ کی شیعیت کا ایک

مرئی اور غیر فانی مظہر مطلوب ہو تو وہ لکھنوی شاعری ہے کہ اوس سدا بہار گلستان کی سیر کرے جو بظاہر صرف شعرا کی جگر کاویوں کا رہین منت معلوم ہوتا ہے لیکن در اصل شاہان اودھ کے دریائے کرم نے اس کی آبیاری میں اوس سے کم حصہ نہیں لیا تھا کہ انیس و دبیر کے خون جگر نے دیا تھا۔ "الناس علیٰ دین ملوکھم" کے مصداق اس شاہی میلان کی وجہ سے لکھنؤ میں شیعیت کا چرچا روز بروز بڑھتا گیا یہاں تک کہ مرثیے، مجلسیں، تعزیے، اور امام باڑے اہل لکھنؤ کی زندگی کا جزو لاینفک بن گئے۔

ان درباری اور معاشرتی حالات کا لازمی اقتضا یہ تھا کہ صنف مرثیہ گوئی روز افزوں ترقی کرتے کرتے اوج کمال پر پہنچ جائے اور دربار و عوام کا جوش قدردانی۔ انیس (۱۸۰۳ء - ۱۸۷۴ء) و دبیر (۱۸۰۳ء - ۱۸۷۵ء) سے باکمال مرثیہ گو پیدا کرے۔

صنف مرثیہ کی اردو شاعری میں کیا خصوصیت ہے اور مرثیہ نگاروں میں انیس و دبیر کو کیوں اسقدر مقبولیت ہے۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی جا چکی ہیں یہاں تو ہمیں اس دور کی اہمیت واضح کرنے کیلئے صرف اس قدر بتانا ضروری ہے کہ مرثیہ کے فروغ سے پہلے اردو شاعری کا میدان اپنی غیر معمولی وسعت اور گوناگوں صلاحیتوں کے باوجود نہایت تنگ کر لیا گیا تھا۔ غزل جھوٹی عاشقی، پامال مضامین، مقررہ پیرایوں اور رسمی تلمیحوں کے لئے مخصوص ہو چکی تھی اور جو کوئی اس میں طبع آزمائی کرتا وہ اسی محدود دائرہ میں اپنے اشہب قلم کی جولانیاں دکھانے پر مجبور تھا جس کی مثالیں گذشتہ اوراق میں بکثرت ہماری نظر سے گزر چکی ہیں۔

قصائد ایسے کذب و افترا کے لئے وقف ہو چکے تھے جس کے متعلق مولانا حالی فرماتے ہیں کہ:-

جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

ہوا ان کا اگر جھوٹ سارا ☆ ہے بند میں ان سے اور ایک ہالہ

ہالہ سے ہو جس کی چوٹی دوبالا

مثنوی جو بہترین اصناف سخن میں شمار ہونے کے لائق ہے اردو زبان میں ایسے تغافل کا شکار ہوئی کہ معدودے چند کے سوا پہلے تو کسی نے اس کی طرف توجہ ہی نہ کی اور جنھوں نے توجہ کی بھی انھوں نے اوسے وہی حسن و عشق کے فرسودہ قصوں کا آلہ بنا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی اہم صنف جس میں زندگی کے ہر شعبہ سے بحث کی گنجائش تھی

اور وسیع سے وسیع مضامین نہایت خوبی کے ساتھ ادا کئے جا سکتے تھے۔ نہایت مہمل و بے ہودہ پا افسانوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔

اردو زبان کی مشہور ترین مثنویاں جن کی فصاحت زبان اور سلاست بیان پر آج ہم سر دھنتے ہیں ایسے خرافات کا مجموعہ ہیں جن کے مضامین محض خلاف عقل و خلاف فطرت ہونے کے ساتھ ساتھ وہی ایک موضوع پر مشتمل ہیں جسے سنتے سنتے ہمارے کان بہرے ہو گئے اور جو گھن کی طرح ہمارے شجر اخلاق و جوانمردی کو کھائے جاتا ہے۔

ایسی سموم و محدود فضا میں سانس لیتے لیتے اردو شاعری جاں بلب ہو گئی تھی اور کسی ایسے موضوع کی شدید ضرورت تھی جو اپنی گرمی اور رنگینی سے اس تن بے جان میں نئی روح پھونکے۔ یہ رنگینی خیال اور گرمی جذبات اسے شہدائے کربلا کے خون سے حاصل ہوتی جس نے حسن و عشق کے پامال مضامین کے بجائے عزم و ثبات، صبر و رضا، ایثار و شہادت اور صداقت و شجاعت کو مرثیہ کا موضوع بنا کر اردو شاعری کو بقائے دوام کا خلعت بخشا۔ اردو شاعری میں مرثیہ نگاری کو وہی رتبہ حاصل ہے جو دنیا کی اور شائستہ زبانوں میں رزمیہ شاعری (Epic) کو اردو زبان میں رزمیہ شاعری کی علحدہ او مستقل وجود نہیں رکھتی بلکہ مرثیہ نگاری ہی میں رزمیہ شاعری کے تمام لوازم داخل ہو گئے ہیں لیکن اس تعریف میں وہ مرثیے شامل نہیں جو شمال میں اردو شاعری کے آغاز سے تقریباً ایک صدی قبل قطب شاہی فرمانرواؤں کے اثر سے دکن میں لکھے گئے تھے۔ یہ مرثیے در اصل ایک طرح کا بین تھے جن کا مقصد حصول ثواب کے لئے شہدائے کربلا کی یاد تازہ کرنا ہوتا تھا۔ اس کے بعد جب شاہان اودھ کے اثر سے شمال میں مرثیہ کا رواج ہوا تو پہلے سودا اور ان کے بعد ضمیر نے اس میں کئی قابل لحاظ ترمیمیں کیں جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان میں مرثیوں کو رزمیہ شاعری کا درجہ جن محترم ہستیوں کی بدولت حاصل ہوا وہ انیس و دبیر ہیں انیس و دبیر کی انفرادی خصوصیات کا ذکر اور ان کا باہمی تقابل و توازن اگرچہ اردو شاعری کے نہایت اہم اور معرکۃ الآرا مباحث سے ہے لیکن ہمیں یہاں ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ مولانا شبلی نے موازنہ انیس و دبیر میں

انیس کی جو فوقیت دبیر پر جتائی ہے اسے موجودہ اہل الرائے اور اصحاب تنقید پوری طرح تسلیم کرنے لگے ہیں لیکن اس کے باوجود دبیر نے صنف مرثیہ کی ترقی میں جو نمایاں حصہ لیا اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہی وہ بندگسہ ہستیاں ہیں جن کے سر مرثیوں کو درجۂ کمال پر پہونچانے کا سہرا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں جذبات انسانی کی نفسیاتی تحلیل کی، واقعات کی چلتی پھرتی تصویریں نگاہوں کے سامنے پیش کیں مناظر قدرت کے دلفریب نقشے بنا کر کھڑے کئے اخلاقی و روحانی تعلیم دی اور معرکہ کارزار کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں صفحۂ قرطاس پر اتار دیں جن کا جواب اردو شاعری ہی میں کیا دنیا کی کسی اور زبان میں بھی کم ملے گا۔ پروفیسر گراہم بیلی نے اپنی تاریخ ادب اردو میں اردو مرثیہ نگاری پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کو واقعہ کربلا سے مختص کر دینے کے باعث یہ میدان بہت محدود ہو گیا۔ بلاشبہ ان کا یہ اعتراض بڑی حد تک صحیح ہے لیکن اس سلسلہ میں دو امور قابل لحاظ ہیں۔ پہلے تو یہ کہ اردو مرثیوں کا محور یعنی واقعہ کربلا تاریخ عالم کے ان مہتم بالشان واقعات سے ہے جو تاریخی اعتبار سے بالکل صحیح ہی نہیں بلکہ اپنی خاص نوعیت کے لحاظ سے دنیا کے یادگار واقعات میں شمار ہونے کے لائق ہے کیونکہ اس میں اگر ایک طرف انسان اپنی فطرت کی بلند ترین سطح پر نظر آتا ہے تو دوسری طرف پستی کے اس انتہائی قعر تک پہنچ جاتا ہے جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ "کالانعام بل ھم اضل" پس اگر کسی قوم نے اپنی شاعری کی ایک خاص صنف کو ایسے عظیم الشان واقعہ کی تفصیلات و جزئیات کے لئے مختص کر لیا تو میرے خیال میں وہ چنداں قابل اعتراض نہیں کیوں کہ معرکۂ کربلا صرف حسینؑ و یزید کے درمیان کوئی جنگ نہیں بلکہ نیکی و بدی اور حق و باطل کے درمیان ایک جنگ تھی۔ اس لئے جو شاعر اس موضوع کو اپنی فکر سخن کے لئے انتخاب کرتے ہیں وہ دراصل ایک مثال کے ذریعہ ایک عالمگیر حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں اور دو ایسی متضاد شخصیتوں سے ہم کو روشناس کراتے ہیں جنھیں آتش پرستوں کی اصطلاح میں یزدان و اہرمن کہنا بیجا نہ ہوگا۔

دوسری بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ واقعہ کربلا کے نام سے ہر مسلمان شاعر کے مذہبی جذبات کو تحریک ہوتی ہے اور غیر محسوس طور پر اس کے قلم میں وہ زور وہ روانی، درد و اثر، اور جوش و خروش

پیدا ہو جاتا ہے جو رباب ہستی کے صرف نرم تار چھیڑنے سے پیدا ہو سکتا ہے اور جس کے بغیر شاعری بالعموم اور مرثیہ نگاری بالخصوص بے کیف و اثر ہوتی ہے۔ لیکن اگر کسی شاعر کے جذبات رنج و الم کسی اور واقعے سے بھی اسی طرح ہیجان میں آ سکتے ہیں تو اس کے لئے کوئی امر مانع نہیں کہ وہ اسی واقعہ کو اپنے مرثیہ کا موضوع قرار دے۔ انیس و دبیر نے جس فضا میں نشو و نما پائی وہ ماتم حسینؑ کی صداؤں سے معمور تھی جہاں اس واقعہ پر آنسو بہانا نہ صرف داخل ثواب سمجھا جاتا تھا بلکہ دنیا کے اور تمام رنج و الم اس ایک غم کے سامنے ہیچ تھے۔ ایسی فضا میں ظاہر ہے کہ جس طرح یہ موضوع ان کے قلم کو اکسا سکتا تھا کسی اور سے ممکن نہ تھا چنانچہ اسی کی تاثیر تھی کہ انیس، حضور ضاؔ اور دوسرے مرثیہ گو عموماً ان تمام عیوب سے پاک رہے جن میں ان کے ہمعصر غزل گو شعرا آخر زمانے تک مبتلا تھے۔ ان کے کلام میں نہ تو ابتذال ہے نہ فحاشی ہے نہ جمود و بے کیفی ہے اور نہ الفاظ کی بازیگری۔ زبان کی صفائی، بیان کی سلاست، روزمرہ کا استعمال اور مراعاۃ النظیر کا التزام ان کے ہاں بھی پایا جاتا ہے لیکن نہ اس طرح کہ الفاظ کی قربان گاہ پر معانی کو بھینٹ چڑھا دیا جائے بلکہ اس طرح کہ حسن بیان کے ذریعہ حسن خیال کو تقویت پہنچائی جائے۔ مثال کے لئے آپ انیس کے کلام کا اس دور کے کسی غزل گو شاعر کے کلام سے مقابلہ کیجئے تو لطف بیان کا یہ فرق بخوبی ظاہر ہو جائے گا مثلاً رند کہتے ہیں۔

میلہ تھا چاند گنج میں سورج گہن کا آج تم کس لئے نہ غیرت شمس و قمر گئے

چونکہ معشوق کو عموماً چاند اور سورج سے تشبیہ دی جاتی ہے اس لئے شاعر نے پہلے تو ایک ایسے مقام کا انتخاب کیا جو چاند گنج کہلاتا تھا۔ پھر وہاں ایک ایسی تقریب نکالی جس میں سورج کا نام آگیا۔ جب چاند اور سورج دونوں جمع ہو گئے تو مصرعہ ثانی میں معشوق کو غیرت شمس و قمر سے خطاب کر کے مراعاۃ النظیر کا حق ادا کر دیا۔ لیکن اس کا کچھ خیال نہ کیا کہ شعر کا مطلب کیا ہوا اور اس میں کیا شاعرانہ لطافت پیدا ہوئی اس کے برخلاف انیس کا کوئی شعر ایسا لیجئے جس میں انہوں نے رعایت لفظی کا التزام کیا ہے مثلاً ان کا ایک مصرعہ ہے۔ ع

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں یا ع قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں

ان مصرعوں میں رنگ و آب صرف پھول اور قطرہ کی مناسبت سے استعمال ہوئے ہیں ورنہ ان کے بجائے اور لفظ مل سکتے تھے لیکن ملاحظہ فرمائیے کہ ان الفاظ نے لطف معنی کو غارت کرنے کے بجائے اس میں کیسی جان ڈالدی ہے۔

پھر اس حسن زبان کے ساتھ مضمون کے اعتبار سے بھی اس عہد کے مرثیہ گو شعرا غزل گو شعرا سے بدرجہا بہتر ہیں۔ وہ ان کی طرح سے صرف ایک عشق ہی کا راگ نہیں الاپے جاتے بلکہ جرأت و صداقت۔ غیظ و غضب، نفرت و عداوت، ایثار و ہمدردی، ہیبت و خودغرضی، غرض قلب انسانی میں جتنے جذبات موجزن ہو سکتے ہیں ان سب کی تصویریں ایسے موثر انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ہزار پند و نصیحت سے زیادہ دل میں گھر کرتی ہیں۔

مناظر قدرت کے ایسے دلکش نظارے دکھاتے ہیں کہ گویا گھر بیٹھے کوہ و دریا کی سیر کراتے ہیں۔ معرکہ کارزار کی گرمیاں رزمیہ مزاجوں کو مشتعل کر دیں اور اہل بیت کی جوانمردیاں رستم و اسفندیار کو منفعل کر دیں۔ ہجو و مدح، پند و نصیحت، اخلاق و سیرت، رزم و بزم غرض یہ کہ شاعری کے جتنے موضوع ہو سکتے تھے سب کو انیس و دبیر نے ایک مرثیہ میں جمع کر دیا اور اردو شاعری کی "جوئے کم آب" کو بحر بیکراں بنا کر چھوڑا۔

(۱۱) واجد علی شاہ کا عہد (۱۸۴۷ء - ۱۸۵۶ء)
برق و اسیر کا دور

جس طرح امجد علی شاہ کا نام تاریخ اودھ میں تعصب ملی کا مرادف ہے۔ اسی طرح واجد علی شاہ کا نام عیش و عشرت کا۔ اون کی بادشاہت کا زمانہ تو بہت مختصر ہے لیکن یہ پیدا اوسی وقت ہو چکے تھے جبکہ ان کے دادا محمد علی شاہ تخت سلطنت پر متمکن تھے اور اون کے والد امجد علی شاہ خود ولی عہد تھے اس طرح ان کا نہ صرف عہد حکومت بلکہ عہد زندگی لہو و لعب اور عیش و عشرت کی ایک مستقل داستان ہے۔ یہ داستان اتنی طویل اس قدر شرمناک اور ایسی ناگفتہ بہ ہے کہ اس پر جہاں تک پردہ پڑا رہے بہتر ہے۔

صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ شعر و سخن بھی اس بادشاہ کی زندگی کا ایسا ہی جزو لاینفک تھا جیسا کہ تعیش و نفس پرستی۔ ان کا تخلص اختر تھا۔ درحقیقت یہہ ہے کہ سلاست زبان کے اعتبار سے ان کا کلام نہ صرف تمام سلاطین اودھ میں ممتاز ہے بلکہ اردو زبان کے اکثر بلند پایہ شعرا سے ٹکر کھاتا ہے لیکن مضمون کے اعتبار سے یہہ ایک آئینہ ہے جس میں ان کی زندگی کے تمام کارنامے روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتے ہیں۔ پھر یہ آئینہ کوئی چھوٹا سا نہیں کہ جس میں صرف صورت ہی نظر آئے بلکہ یہہ ایک قد آدم آئینہ ہے جس میں پورا سراپا دکھائی دیتا ہے کیوں کہ واجد علی شاہ بڑے پرگو شاعر تھے اور علاوہ چھ دواوین کے کئی مثنویاں اور مرثیے اور مختلف تصانیف نظم و نثر اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سے مرثیوں اور مذہبی تصانیف سے قطع نظر کرلی جائے تو باقی کلام ادن ہی خصوصیات سے لبریز نظر آتا ہے جو ان کے پیشرو غزل گو شعرا کا طغرائے امتیاز رہی تھیں یعنے فحاشی، عریانی۔ ابتذال، صنائع لفظی کا التزام اور رعایت لفظی کا جنون۔ یہی حال ان کے عہد کے اور شعرا کا ہے جن میں قابل ذکر برق و اسیر، قلق و امانت، یاور، شرف، بہار۔ ذکی، درخشاں، اختر وغیرہ ہیں لیکن ان سب کا ایک رنگ ہے، ان سب کے مشترک خصوصیات ہیں مثال کے لئے صرف دو شعر یہاں نقل کر دیتا ہوں۔

بہار:۔ نہ دل ہے مرا اور نہ وہ نازنین ہے — کئی دن سے پہلو میں کوئی نہیں ہے

یاور:۔ بند قبا کو کھینچ کے اتنا نہ باندھیئے — رکھیئے نہ گھونٹ گھونٹ کے حسن و شباب کو

اس عہد کے دو شعرا بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ایک جان صاحب دوسرے امانت:۔

جان صاحب اس لئے کہ وہ نسوانیت جو اس عہد کا طغرائے امتیاز تھی اور جو واجد علی شاہ کے نام کے ساتھ توام ہوگئی ہے۔ جان صاحب کی ریختی کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی جیسے وہ زنانہ لباس پہنکر اور بالکل عورتوں کے انداز میں پڑھا کرتے تھے۔

امانت اس لئے کہ انھوں نے اندر سبھا کے نام سے اردو زبان کا پہلا ڈرامہ لکھا ہے۔ جسے واجد علی شاہ اور ان کی نازنین محلات نے مل کر اسٹیج کیا تھا۔ اس طرح واجد علی شاہ کی عیش پرستی نے اگرچہ سلطنت کھو دی مگر صنف ڈرامہ کا بیج اردو شاعری میں بو دیا جو آج کل خوب ترقی پر ہے اور جسے

عہد حاضر کے نقاد بڑی اہمیت دے رہے ہیں لیکن زمانہ ہی چل کر ثابت کرے گا کہ یہ صنف اردو شاعری کو کیا فیض پہنچاتی ہے جس کی ایجاد کا سہرا واجد علی شاہ کے سر تھا۔

خاتمہ

دربار اودھ کم و بیش ایک سو سال قائم رہا۔ اس مدت میں لکھنو کی شاعری نے جو کچھ ترقی کی وہ زیادہ تر اسی دربار کی زیر سرپرستی کی اس لئے اس میں وہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں جو شخصی حکومت کے اثر سے پیدا ہوسکتی ہیں شاعری کا چرچا جس قدر زیادہ ہوتا گیا اور شعرا کی تعداد جتنی بڑھتی گئی۔ اتنا ہی نوعیت کے لحاظ سے اس میں تنزل ہوتا گیا۔ یہاں کے شعرا نے گو ان تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جو دہلی سے ان کو ورثہ میں ملے تھے بلکہ ان میں ڈرامہ اور مرثیہ کی دو اہم صنفوں کا اضافہ بھی کیا لیکن آخرالذکر کے سوا مضمون کے اعتبار سے کسی صنف میں دبستان دہلی سے بازی نہ لیجا سکے اور جو جدتیں کیں وہ ایسی گندہ تھیں جن سے اردو شاعری کو بجائے فائدہ کے نقصان پہونچا۔ لیکن ایک صنف مرثیہ میں ان کے کمال نے ان کے دامن سے ان کی شاعری کے تمام داغوں کو دھو دیا اور اردو شاعری میں لکھنو کے نام کو زندہ جاوید بنا دیا۔ زبان کے اعتبار سے لکھنو کی شاعری کا جو رنگ آتش و ناسخ کے عہد میں قائم ہوا تھا وہ بتدریج بدلتا گیا۔ عربی اور فارسی کا عنصر رفتہ رفتہ گھٹ گیا۔ اور رعایت لفظی کی بلا گو ان کے تلامذہ کے دور میں بھی مسلط رہی لیکن اس کے بعد اس میں بھی کمی ہونے لگی یہاں تک کہ اس نے اعتدال اور سلامت روی کی چال اختیار کرلی جو اب تک باقی ہے۔ اس طرح آج بھی لکھنو کی زبان ہندوستان کے طول و عرض میں ایک معیاری زبان کا کام دے رہی ہے۔

=== ÷ === ÷ ===

انجمن طیلسانین عثمانیہ کی مطبوعات

۱۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیاں ریاست عادل شاہی دور تولیت کی بسیط اور محققانہ تاریخ مولفہ سید علی محسن صاحب یم اے (عثمانیہ)

قیمت عہ ر

۲۔ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی مفصل محققانہ اور مستند تاریخ۔

مولفہ ظہیر الدین صاحب، ایم، اے (عثمانیہ) قیمت عہ ر

۳۔ امام غزالی کے کلامی خصوصیات۔

مولفہ محمد غوث صاحب (محبوب نگری) ام اے (عثمانیہ) قیمت عہ ر

۴۔ موضع دوپلی کی معاشی تحقیق۔

مولفہ محمد ناصر علی صاحب، ام اے (عثمانیہ) قیمت عہ ر

۵۔ دربار اودھ کا اثر لکھنو کی شاعری پر۔

مولفہ محمد اعظم خاں صاحب، ام اے (عثمانیہ) قیمت عہ ر

اراکین انجمن اور خریداران مجلہ طیلسانین عثمانیہ سے نصف قیمت کتب فروشوں کے ساتھ خاص رعایت بغرض سہولت کتابیں تبادلہ میں بھی دیجاتی ہیں۔

ملنے کے پتے

(۱) دفتر مجلہ طیلسانین و انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن نظام شاہی روڈ

(۲) مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

ماخذہائے قانون

از جناب مولوی فاضل ڈاکٹر میر سیادت علیخان صاحب

آسٹن۔ لکچر ۲۸۔ سامنڈ باب ۶۔ ہالسینڈ باب ۵۔ پالک فرسٹ بک۔ باب ۲۔ کرکوناف کتاب چہارم۔ آلن پوری کتاب۔

ماخذہائے قانون بہت ہی مبہم لفظ ہے۔ اور ذیل کے مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

(۱) **صوری ماخذ کے معنوں میں**۔ صوری ماخذ سے مراد مملکت کی طاقت اور مرضی یا ارادہ ہے جس کی وجہ سے قانون کو اس کی جبری قوت حاصل ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر قانون کا صوری ماخذ مملکت یا اس کی طاقت اور ارادہ ہوتا ہے۔ صوری ماخذ کے برخلاف مادی ماخذ ہوتے ہیں اور ان سے مراد وہ مواد ہے جن سے قانون بنتا ہے۔ یعنے اس میں وہ تمام مواد شامل ہے جس کو استعمال کرکے مملکت قانون وضع کرتی ہے۔

(۲) **مادی ماخذ** مادی ماخذ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ قانونی اور تاریخی۔ قانونی ماخذ سے مراد وہ ماخذ ہیں جن کو مملکت بطور قانون تسلیم کرتی ہے اور تاریخی ماخذ وہ ہیں جو گو ان اصولوں کے جن سے قانون بنتا اور جن پر قانون مشتمل ہوتا ہے۔ فی الواقع مواد ہوتے ہیں لیکن جن کو مملکت اس طرح پر تسلیم نہیں کرتی ہے مثلاً جب عدالت کسی اصول کو اپنے کسی فیصلہ میں قرار دے تو یہ ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے کہ یہ اصول کسی کسی بڑے مصنف مثلاً فرانسیسی مقنن پورٹیے (Portier) کی تصنیف میں پایا جائے، اور پورٹیے نے بھی اس کو ممکن ہے کہ جسٹینین کے مجموعہ ہائے قوانین سے لیا ہو۔ تو پورٹیے یا جسٹینین کے تصانیف اس قانونی اصول کے تاریخی ماخذ ہوئے اور خود نظیر اس کی قانونی ماخذ ہوئی۔ یہ تصانیف محض تاریخی ماخذ اس لئے ہوئے کہ مملکت میں ان تصانیف اور ان کے اصولوں کو بطور قانون تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔ برخلاف

اس کے نظیر قانونی ماخذ اس لئے ہے کہ مملکت نے یہ قرار دیدیا ہے کہ نظائر کی وقعت قانون کی ہے (اور سامنڈ کے نزدیک ماخذ صوری اور ماخذ قانونی میں فرق یہ ہے کہ ماخذ قانونی میں مملکت ایک قاعدہ مقرر کردیتی ہے جس کے مطابق ہونے کے بعد کوئی اصول قانون بن جاتا ہے مثلاً ہر مملکت میں یہ قاعدہ مقرر ہے کہ جو اصول عدالتوں میں فیصلہ پائیں وہ بطور نظائر قانون کی وقعت رکھیں۔ ماخذ صوری کے لئے کسی ایسے قاعدہ کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ماخذ صوری تو مملکت کی قوت! و ارادہ ہی کا دوسرا نام ہے۔

سامنڈ قانونی اور تاریخی ماخذ کے فرق کو بہت اہم اور ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن اس پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ تخصیت مصنوعی اور غیر ضروری ہے۔ اگر ہم سوچیں تو اس کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ بعض ماخذ با قوت مملکت (Authouritative) اور بعض بلا قوت مملکت Unauthouritative ہیں یعنے بعض ماخذ ایسے ہیں جن کے پیچھے مملکت کی قوت ہوتی ہے اور بعض ایسے جن کے پیچھے یہ قوت نہیں ہوتی ہے۔ اور صاف اور غیر مبہم الفاظ میں اس کے معنے صرف یہی ہیں کہ بعض ماخذ۔ ماخذ ہیں۔ اور بعض ماخذ، ماخذ نہیں۔

(۳) آسٹن کے نزدیک مملکت یا مقتدر اعلیٰ ہی قانون کا واحد ماخذ ہے۔ یعنے مقتدر اعلیٰ ہی تمام قوانین کا واحد سرچشمہ ہے اسی سے تمام قوانین نکلتے ہیں اسی طرح پر سوائے قوانین موضوعہ کے رواج۔ نظائر تصنیفات وغیرہ آسٹن کے نزدیک راست نہیں بلکہ قوانین کے کسوبی ماخذ ہوتے ہیں۔ اسی طرح تاریخی اسکول کے اساتذہ کے نزدیک (Volkgeist) ہی تمام قوانین کا واحد ماخذ ہیں۔ (Volkgeist) سے عوام کا وہ خاص ملکہ مراد ہے جس کی وجہ سے عوام قانون بناتے ہیں۔ اس ملکہ کا خاص اظہار رواجی قانون کے ذریعہ ہوتا ہے۔ گو قانون موضوعہ۔ نظائر اور تصنیفات کے ذریعہ سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے۔ ماخذ کے ان دونوں تعریفوں پر اعتراض یہ ہے کہ ان میں یہ لفظ بہت ہی محدود معنوں میں لیا جاتا ہے۔

(۴) ہالینڈ آسٹن کی نقادانہ پیروی کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک بھی قانون کا واحد ماخذ صرف مملکت یا مقتدر اعلیٰ ہی ہے لیکن انھوں نے بھی مثل سامنڈ کے گو سامنڈ کے الفاظ میں نہیں قانون کے بہت سے مادی ماخذ مانے ہیں۔ مثلاً مذہب۔ قانونی تصانیف وغیرہ کو بھی وہ ماخذ کہتے ہیں اور ان کے

نزدیک رواج قانون کا ماخذ بعید ہے۔

بات یہہ ہے کہ صحیح معنے میں ماخذ سے مراد ایک معین ذریعہ ہے جس کی وجہ سے قانون ایک معین عام اور جبری قاعدہ عمل کی صورت اختیار کرلیتا ہے اور ماخذ ہائے قوانین تمام وہ معین ذرائع ہیں جن کی وجہ سے قواعد عمل معین یکساں اور جبری صورت اختیار کرکے قانونی وقعت حاصل کرتے ہیں اور سچ تو یہہ ہے کہ قانون کو یہہ معین یکساں اور جبری صورت ذیل کے ذرائع سے حاصل ہوتی ہے۔

(۱) رواج سے (۲) عدالتی عمل سے یعنے نظائر اور نصفت سے اور (۳) قانون سازی سے۔

اس لئے ہم پہلے رواج سے پھر نظائر اور نصفت سے اور آخر میں قانون سازی سے مختصر بحث کریں گے۔

تعریف۔ رواج سے مراد وہ قواعد عمل ہوتے ہیں جن کو عوام خود اپنے برتاؤ سے اور ان پر عمل کرنے سے بناتے ہیں اور جن کا وجود اور عام مقبولیت بھی عوام کے برتاؤ اور اس پر عمل کرنے سے ثابت کی جاتی ہے۔ اور بلاشبہہ رواج ہی قانون سازی کی قدیم ترین قسم ہے۔

تحلیلی اساتذہ یہہ اساتذہ رواج کی بحث کو تین عنوانوں پر غور کرکے ختم کر دیتے ہیں۔ یعنے (۱) رواج کے طریق نشو و نما پر (۲) اس امر پر کہ رواج کب بطور قانون تسلیم کیا جاتا ہے اور (۳) ان شرائط پر جن پر اترنے کے بعد وہ ثابت قرار دیا جاتا ہے۔

تحلیلی اساتذہ چونکہ صرف قانونی تصورات کے مفہوم کو بذریعہ تحلیل و تجزیہ متعین کرتے ہیں۔ اس لئے وہ مثل دیگر قانونی تصورات کے رواج پر بھی عمرانی اور تاریخی نقطۂ نظر سے غور نہیں کرتے ہیں یعنے مثلاً وہ (۱) ماہیت رواج (۲) رواج کی وسعت (۳) اس کی ابتداء۔ پر تاریخی اور عمرانی نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں اور نہ (۴) رواج کی تعبیر اور اس کے اطلاق پر۔ یعنے تعبیر کنندوں اور فقیہوں کے رواج پر اثر سے متعلق غور کرتے ہیں۔ یہ کام تاریخی اساتذہ انجام دیتے ہیں۔ ہم پہلے تحلیلی اساتذہ کی رائے کا خلاصہ درج کردیں گے۔ اور اس کے بعد رواج سے متعلق تاریخی اساتذہ کے مباحث کا ذکر کریں گے۔

بقول ہالینڈ رواج سے متعلق اہم سوال دو ہیں (۱) طریق نشو و نما (۲) یہہ کہ رواج کب قانون

بن جاتا ہے۔ طریق نشو ونما کے متعلق غالباً یہ خیال صحیح ہے کہ یکساں برتاؤ کے یہ قواعد عمل کچھ تو سہولت کچھ اتفاق
اور کچھ مذہبی اور دوسری قسم کے توہمات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی گاؤں والوں کے کسی ایک
خاص راہ ہی پر غور کیجیے کہ اس کی ابتدا کیونکر ہوئی ہوگی۔ کوئی ایک شخص پہلے اس راستہ پر کبھی سہولت کی
وجہ سے چلا ہوگا اور دو تین مرتبہ اس راستہ پر چلنے کی وجہ ممکن ہے کہ محض اتفاق یا فال کا وہم ہو
اس کے بعد اگر دوسرے اشخاص بھی اس راستہ پر چلیں اور پگڈنڈی پڑ جانے کی وجہ ان کا اس راستہ پر چلنا
قرین قیاس ہو جاتا ہے تو اس راستہ پر چلنے کا رواج پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان کی طفولیت میں ہر عادتی
طرز عمل یا برتاؤ میں مرور زمانہ سے تقدس پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے انحراف کو سخت برا اور ناپسند
کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح پر اگرچہ کوئی مملکت یا مقتدر اعلیٰ ان کو وضع نہیں کرتا ہے۔ بجائے قانون کے یہی
قواعد عمل ہوتے ہیں اور عام طور پر ان کی اطاعت اور تائید کی جاتی ہے اور ان کا نفاذ رائے عامہ ہی
سے ہوتا ہے۔ قیام مملکت کے بعد اس پر ایک اور تہدید یعنی مملکت کی قوت اور جبری اطاعت کی تہدید
کا اضافہ ہوتا ہے۔ نیز قیام مملکت کے بعد بھی عرصہ تک رواج ہی قانون یا اس کا اکثر حصہ رہتا ہے
اور پہلے پہلے ملکی اور موضوعہ قانون رواج ہی کی نقل اور اسی پر مبنی ہوتا ہے اور اب بھی ہر ملک
میں رواج بطور قانون کے پایا جاتا ہے۔ گو اس کی وسعت و اہمیت بہ نسبت قانون موضوعہ اور
نظایر کے کم ہو گئی ہے۔

انگلستان میں رواج کامن لا (قانون عمومی) یا رواج مملکت کے نام سے مشہور رہا اور ہے
ظاہر ہے کہ رواج کے نشو ونما کے دوران میں ججوں یا ان کے پیشروؤں میر پنچوں وغیرہ کا رواج
پر کافی اثر ہوتا ہے۔ سر ہنری سمنر مین نے اپنے مطالعہ میں اس اثر کو اتنا گہرا پایا ہے کہ ان کی رائے
میں جج ہی رواج کو بناتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس رائے میں بہت مبالغہ ہے کیونکہ رواج کی ابتدا
عوام سے ہوتی ہے۔ دوران نشو ونما میں جج ضرور اپنا اثر اور خاصہ اثر اس پر ڈالتے ہیں اور نیز بہت سے
رواجی امور کی ایک طرح پر ابتدا بھی ان ہی سے ہوتی ہے۔ مثلاً یہ رواج کہ غیر منقولہ جائداد بذریعہ دستاویز
منتقل کی جائے اس کی عبارت یہ ہو۔ انتقال کے وقت ان رسومات و ضوابط کی پابندی کی جائے وغیرہ۔

مملکت کے پوری طرح استحکام سے قایم ہو جانے کی بعد کیا ہر رواج یہ ثابت کر دیئے جانے پر کہ اس پر عمل ہوتا آیا ہے مملکت کے لئے قابل تسلیم ہوجاتا ہے ؟ نہیں ۔ مملکت عملدرآمد کے ثبوت کے بعد ہی معقولیت وغیرہ کے مقررہ شرائط کے بعد اس کو تسلیم کرتی ہے لیکن ان شرائط پر پورا اترنے کے بعد مملکت ججوں کے ذریعہ رواج کو عام طور پر بطور قانون تسلیم کرتی ہے ۔ اور نہ صرف تاریخ تسلیم یعنے فیصلہ عدالت کی تاریخ سے بلکہ اس سے قبل سے بھی یعنے فیصلہ سے عدالت یہ تسلیم کرتی ہے کہ تاریخ فیصلہ سے قبل بھی رواج قانون رہا ہے اور اسی اساس پر فریقین کے درمیان احکام صادر اور فصل خصومات کرتی ہے ۔ اس طرح پر آسٹن کا یہ نظریہ صحیح نہیں کہ رواج جب تک کہ عدالتوں میں ثابت اور تسلیم نہیں کیا جائے قانون نہیں کیونکہ کچھ تو رواج کی قدامت کی وجہ سے اور کچھ اس واقعہ کی وجہ سے کہ رواج کے بھروسہ پر افعال کئے جاتے اور ذمہ داریاں وجود میں آتی ہیں اور اس بھروسہ کو پورا کرنا چاہیے مملکت نے ایک اصول بنا دیا ہے کہ تمام رواج جو معقولیت وغیرہ کے متعدد لیکن معین شرائط پر اترے قانون ہے ۔ اسی طرح جس طرح عدالتوں نے (اور اسی وجہہ سے مملکت نے بھی) ہر صورت کے لئے قانون ان کے پاس موجود نہ ہونے کی وجہہ سے یہ اصول بھی قرار دے دیئے ہیں کہ اصول ہائے نصفت پر عمل کیا جائے گا ۔ یا یہ اصول کہ نظایر قابل پابندی ہوں گے عدالتوں یا مملکت کے اس اصول کی وجہ سے رواج قانون ہے اور تاریخ فیصلہ سے قبل بھی قانون ہے ۔ ہالینڈ کہتے ہیں اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی قانون موضوعہ کے کسی دفعہ کی عدالت میں اس دفعہ کے تحت کوئی مقدمہ آنے سے قبل بھی یہ دفعہ قانون ہے لیکن عدالت کے فیصلے کے بعد ہی اس کے معنے معین واضح اور پوری طرح معلوم ہوتے ہیں ۔ اس طرح پر رواج قانون نہ صرف قدامت کی وجہ سے ہے بلکہ عدالتوں یا مملکت کے اس اصول کی وجہہ سے کہ وہ تمام رواج قانون ہیں جو متعدد اور معین شرائط پر اتریں اور اسی وجہہ سے سامنڈ کہتے ہیں کہ رواج قانون کے مادی ماخذ ہیں صوری ماخذ نہیں ۔ صرف مادی ماخذ اس لئے کہ ان کو قانون بننے کے لئے مملکت کی قوت اور ارادے کی مذکورہ بالا اصول کے تحت ضرورت ہوتی ہے ۔

(۳) اب ہمیں ان شرائط کا ذکر کرنا چاہیئے جن پر اترنے کے بعد رواج کو عدالتیں تسلیم کرتی ہیں

ثابت سمجھتی ہیں۔ بقول آمن ان شرائط کا مقصد صرف رواج کے وجود کی شہادت بہم پہنچانا ہوتا ہے۔ اگر رواج ثابت ہو تو عدالتیں اس کو بطور قانون تسلیم کرتی ہیں وہ قانون تاریخ تسلیم سے پہلے بھی ہوتا ہے۔ اور اسکا وجود ثابت ہونے پر وہ قانون صرف تاریخ تسلیم ہی سے نہیں بلکہ اس سے قبل سے بھی قانون مانا جاتا ہے اور وہ قانون محض عدالتوں کے تسلیم کرنے کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے۔ البتہ عدالتیں کسی ایسے رواج کو اسکے ثابت ہو جانے کے بعد بھی قانون تسلیم نہیں کرتی ہیں جو کسی قانون موضوعہ کے خلاف ہو یا جس سے کسی قانون عمومی کے کسی بنیادی اصول کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ ان دو استثناؤں کے ساتھ اگر رواج ثابت ہو تو وہ اپنی ذاتی وقعت کے لحاظ سے قانون ہے۔

(۱) Immemorial autiquity) یاد سے باہر قدامت یہ شرط مقامی رواجات سے متعلق ہے عام رواجات سے نہیں اور نہ تجارتی رواجات سے انگریزی قانون میں رچرڈ اول کے زمانہ کو یعنے ۱۱۸۹ء کو یاد سے باہر زمانہ مانا جاتا ہے۔ یعنے اصولاً رواج کو اس زمانہ سے قبل کا ہونا ضروری ہے۔ گو عملاً بہت کم زمانہ کی شہادت بالعموم کافی سمجھی جاتی ہے۔

(۲) (Continuity) تسلسل یعنے رواج پر برابر عمل ہوتا رہنا ضروری ہے مسلسل عمل ثابت ہونے کے بعد ہی عدالتیں رواج کو ثابت سمجھتی ہیں۔

(۳) (Legality) یعنے قانون موضوعہ اور قانون عمومی (کامن لا) سے مطابقت

مقدمہ پیری بنام بارنٹ (Perry V. Barnet) میں اسٹاک اکسچینج کے رواج کی رو سے بنک کے حصوں کی رجسٹری ضروری نہیں تھی۔ لیکن قانون لیمان (Leeman's Act.) کی رو سے ایسی رجسٹری ضروری تھی۔ عدالت نے رواج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح قانون بیمہ بحری (Marine Insurance Act) کی رو سے بیمہ اسباب۔ کے جواز کے لئے اشیاء میں بیمہ کے قابل کچھ نہ کچھ حصہ ضروری ہے۔ رواجی طور پر (P. P.I. Contracts) بھی کئے جاتے ہیں یعنے " ایسے بیمے بھی کئے جاتے ہیں جن میں سوائے بیمہ کی پالیسی کے اشیاء میں کچھ حصہ بیمہ کروانے والے کا نہیں ہوتا ہے"۔ عدالتوں نے ایسے معاہدوں کو گو وہ رواج پر مبنی ہوں تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔

(۴) اسی طرح رواج پر عمل (nec vi, nec clam, nec precario.) ہونا چاہیئے۔ یعنے "عمل بغیر ظلم اور زبردستی کے علانیہ اور بغیر کسی شخص کی اجازت کے ہونا چاہیئے"۔

(۵) Opinio necessitatis یعنے ضروری ہے کہ رواج پر عمل کرنے والے اس کو لازمی اور واجب العمل سمجھیں کہ اختیاری مثلاً بلاکسٹن نے مثال دی ہے کہ اگر کسی پل کو کسی زمیندار کا خاندان اپنی خوشی سے کبھی بنا دیا کرتا تھا۔ اور کبھی نہیں تو اس سے رواج ثابت نہیں ہوگا۔

(۶) معقولیت (Reasonableness) جب کوئی رواج ثابت ہوجاتا ہے تو اس کو غیر معقول ثابت کرنے کا بار ثبوت اس فریق پر ہوتا ہے جو اس کو غیر معقول کہتا ہے۔ اور رواج کی معقولیت کا معیار یہہ ہے کہ وہ عقل و انصاف کے اس طور پر خلاف نہ ہونا چاہیئے کہ اس کی بطور قانون تعمیل کرانے میں اس سے زیادہ ہرج ہوگا جتنا کہ ان امیدوں اور ان افعال کو الٹ دینے سے جو اس کے جاری رہنے کی امید پر کئے گئے ہوں۔

رواج کو تسلیم کرنیکے وجوہات۔ سامنڈ نے دو بتلائے ہیں (۱) ایک تو یہہ کہ رواج کو قوم صداقت و انصاف اور فائدۂ عام کا حامل سمجھتی ہے اسی وجہہ سے رواجی اصول نہ صرف محفوظ ترین ہوتے ہیں بلکہ ان کے پیچھے طویل عمل کی سند اور اقتدار بھی ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ (۲) کسی رواج کے عرصہ دراز سے موجود ہونے سے لوگوں کو یہہ توقع ہوجاتی ہے کہ وہ آئندہ بھی جاری رہے گا اور اسی کے بھروسہ پر معاملے کئے جاتے ہیں اور ذمہ داریاں وجود میں آتی ہیں اور انصاف کا مقتضا یہ ہے کہ بالعموم اس بھروسہ کو پورا کیا جائے۔

تاریخی اساتذہ ماہئیت رواج۔ بقول آلن معاشرہ کے محض وجود۔ افراد کے محض تعدد سے رواج پیدا ہوتا ہے۔ جس کی پابندی سے مجموعۂ افراد کا کوئی فرد گریز نہیں کرسکتا۔

" The mere existence of a society, the mere plurality of individuals, gives rise to customs from which no single member of the totality can completely divorce himself."

پابندی کی تحدید بعض رواجات میں خوف نفرت یا ملامت ہی میں ہوتی ہے۔ اور بعض آ دوسر

رواجات میں یعنے قانونی رواجات میں یعنے ایسے رواجات میں جن سے قانونی تعلقات کو متاثر کرنا مقصود ہوتا ہے اس سے بڑھ کر تحدید ہوتی ہے ۔ مثلاً اگر آپ اپنے سر کے بال نہ کٹائیں تو آپ کی تکلیف اور ہمعصروں کی ہنسی کے سوائے کوئی اور تحدید نہیں ہوتی لیکن اگر اسٹاک کی منتقلی کے وقت آپ دستخط مہر اور حوالگی کو بے ضروری ضابطہ پسندی تصور کریں تو کوئی انتقال مال واقع ہی نہیں ہوگا اور آپ نقصان اٹھائیں گے ۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ رواج عوام کے عمل سے پیدا ہوتا ہے ۔ یہ بھی ملحوظ رکھیئے کہ اکثر رواجات اپنی ماہیت میں غیر نزاعی ہوتے ہیں یعنے وہ حقوق کے تنازع کی وجہہ سے یا "میں" اور "تو" کے جھگڑے کی وجہہ سے نہیں پیدا ہوتے ہیں بلکہ وہ معاشرہ اور افراد معاشرہ کی سہولت اور معاشری ضرورت کی وجہہ سے پیدا ہوتے ہیں بقول وینوگراڈ آف

"تنازع کی وجہہ سے رواجی قواعد عمل نہیں پیدا ہوتے ہیں بلکہ وہ روزمرہ کے اعمال سے یعنے باہمی میل جول معاشری مصالحت پسندی و رواداری اور معاشری تعاون سے پیدا ہوتے ہیں نہ وراثت نہ جایداد نہ قبضہ نہ معاہدہ یا ان کے متعلق قواعد قانون سازی یا تنازع باہمی کی وجہہ سے پیدا ہوئے ہیں ۔ وراثت یا اس سے متعلق قواعد کی ابتدا منتظم خاندان کی وفات پر خاندان سے متعلق انتظامات کرنے کی ضرورت کی وجہہ سے ہوئی ۔ جایداد کی ابتدا قبضہ سے ہوئی خود قبضہ بطور امر واقعی کسی شئے کو روک رکھنے سے شروع ہوا ۔ او رمعاہدہ کے شروعات مبادلہ کے رواجات ہوے ابتدائی قسم کے معاشروں میں حقوق سے متعلق جو تنازع ہوتے تھے ۔ وہ غیر نزاعی رواجات کے اطلاق ہی کے متعلق ہوتے تھے ۔"

تاریخی علم اصول قانون (H. J.) جلد ا صفحہ ۳۶۸)

"It is not conflicts that initiates rules of legal observance, but the practices of everyday directed by the give-and-take considerations of reosonable intercourse and social co-operation. Neither succession, nor property, ncr contract started from direct legislation or from direct conflict. Succession has

its root in the necessary arrangements of the house-hold on the death of the manager, property began witn occupation, possession is reducbile to defacto detention, the origins of barter go back to the customs of barter, disputes as to rights in primitive society are pre-eminently disputes as to the application of non litiguous customs."

اس طرح پر ظاہر ہے کہ رواج کی ابتدار باہمی سمجھوتہ سے نہ کہ تنازع کی وجہہ سے ہوئی ۔ اسی طرح جس طرح معاشرہ کی ابتدار انسانی فطرت کے مل جل کے رہنے کے اقتضار سے نہ کہ حالت نزاع یا باہمی جھگڑوں کی وجہ سے ہوئی ۔

وسعت رواج ۔ ابتدائی قسم کے معاشروں ہی میں رواج کی یہہ حالت نہیں تھی ۔ اب بھی بہت سے جدید قوانین کی ابتدا سمجھنے رواج کا علم ضروری ہوتا ہے انگریزی "کامن لا" یعنے قانون عمومی میں رواج کا بہت دخل ہے مثلاً قانون مجموعی کا وہ حصہ جو خاندان سے متعلق قانون پر مبنی ہے ۔ ایک ہی بیوی کرنے کا قانون رواج ہی پر مبنی ہے ۔ اسی طرح انگریزوں میں بیوی جو شوہر کے خاندان کا نام اختیار کرلیتی ہے یہہ بھی رواج ہی کی وجہ سے ہے ۔ اسی طرح اختیار پدری یا باپ کا اپنے گھر کا مالک اور اپنے خاندان میں بادشاہ اور حکمران ہونا، حقوق ولایت بچوں کی نگرانی اولاد کی تربیت تعلیم وغیرہ سب رواج ہی پر مبنی ہیں ۔ غیر صحیح النسب بچے پر ماں کا اختیار بھی رواج ہی کی وجہ سے ہے حقیقت تو یہہ ہے کہ باوجود آسٹن کے اس قول کے کہ قانون حکم مملکت ہے انگریزی قانون میں نہایت ہی بنیادی امور میں بہت کم احکام ہیں اور انگریزی قانون میں بہت سے امور تسلیم کرلئے گئے ہیں یعنے رواج میں ان کے موجود ہونے کی وجہہ سے قانون موضوعہ میں ان کی صراحت نہیں کی گئی ہے مثلاً ۔ حملہ ۔ ازالہ حیثیت عرفی حبس بیجا ۔ یا غفلت کی تعریف بقول آلن قانون موضوعہ میں نہیں کی گئی ہے ۔ نہ صرف جج ہی بلکہ پارلیمنٹ بھی اس مفروضہ پر چلتی ہے کہ قانون موجود ہے یعنے رواج میں موجود ہے ۔ چنانچہ قانون میں دوسرا سب سے بڑا جرم یعنے قتل عمد کی تک تعریف قانون موضوعہ

میں نہیں ہے ۔ اسی طرح قانون دستوری کو "قانون اور رواج دستور" کہا جاتا ہے لیکن اس قانون میں
قانون سے زیادہ رواجات ہیں ۔ پارلیمانی نظام کا سنگ بنیاد یعنی کابینہ کے ذریعہ حکومت کا طریقہ رواجات
ہی پر مبنی اور رواجات ہی سے نشو نما پایا ہے اور اب ہمارے آنکھوں کے سامنے اس میں رواجات ہی
کے ذریعہ سے تغیر ہو رہا ہے ۔ صدر کابینہ جو انگریزی مملکت میں سب سے زیادہ اہم اور ذمہ دار شخص ہوتا ہے
قانون موضوعہ میں اس سے متعلق ۱۹۳۷ء کے بعد ہی کوئی کافی صراحت نہیں ہے ۔ قانون دستوری میں اہم
ایک ترمیم بھی بغیر پارلیمنٹ کے عمل کو دریافت کئے نہیں پڑھا سکتے اور پارلیمنٹ کے عمل سے متعلق کوئی صریحی
قوانین وضع نہیں ہیں ۔ اس طرح پر یہ واقعی رواجات یا طریقے پارلیمنٹ کے مطلق العنان اقتدار اعلیٰ
کو کافی حد تک محدود کرتے ہیں ۔ رواجات کا یہ اثر دوسرے نظام ہائے قوانین میں بھی ہے ۔ ہندوستان
ہی کو لیجئے یہ معلوم بات ہے کہ ہندوستان کے رواجی قانون کی واقفیت ہی نے مین (Maine)
کو قانون کے نشو و نما سے متعلق تحقیقات شروع کرائی ۔ اور بقول آلن ہندوستان میں قانون موضوعہ
کا اقتدار ایک جدید چیز ہے ۔ ورنہ یہاں کے قانون کا اکثر حصہ رواجات ہی پر مبنی تھا جس میں کچھ ترمیم
آریائی اور برہمنی اثرات سے ہوئی تھی ۔

اوپر کے سطور میں رواج کی ماہیت اور وسعت بیان کی گئی کہ انسان معاشری ہستی ہونے کی وجہ
سے اپنے ہم جنسوں سے مل کے رہتا ہے ۔ اور محض انسانوں کے مل کے رہنے کی وجہ سے رواج پیدا ہوتا
ہے اور وہ قابل پابندی ہوتا ہے اکثر رواجات غیر نزاعی ہوتے ہیں ۔ افراد معاشرہ کی ضرورت اور
سہولت وغیرہ پر مبنی ہوتے ہیں ۔ ابتدائی معاشروں میں یہی قانون ہوتے تھے ۔ موجودہ جدید معاشروں
میں بھی حال حال تک یہی قانون تھے اور ایک حد تک اب بھی ہیں ۔ مثل دیگر قوانین کے انگریزی قانون میں
بھی رواجات کو کافی دخل تھا اور گو اب قانون سازی اور نظائر کی وجہ سے رواجات کا اثر اور وسعت
نسبتاً کم ہوگئی ہے تاہم اب بھی مثلاً دستوری قانون کے دائرہ میں ان کا کافی اثر ہے ۔

رواج کی ابتداء ۔ علم اصول قانون میں باستثنا رجماعت متحدہ یا سند یافتہ کی شخصیت کے مسئلہ کے
شاید ہی کوئی اور مسئلہ رواج کی ابتداء کے مسئلہ کے مانند معرض بحث رہا ہو ۔ وجہ یہ ہے اس کے

ابتدائی معاشرتی مظاہر سے متعلق ہونے کی وجہ سے شہادت کم ملتی ہے۔ و نیز اس کی محرک قوتیں فرد اور معاشرہ کی نفسیاتی امور سے متعلق ہونے کی وجہ سے بڑی حد تک غیر یقینی ہوتی ہیں۔

قانون روما میں بھی رواج کی ابتداء سے متعلق کوئی متوافق اور جامع نظریہ نہیں ملتا۔ اس قانون میں ابتداء سے مجموعہ قوانین نافذ ہو جانے اور پریٹر وغیرہ فقیہوں کے اثرات کی وجہ سے رواج کو ایک ثانوی درجہ دیا گیا ہے۔ تاہم مجموعہ جسٹینین میں بھی ہر جگہ رواج کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ مثل پریٹر کے بنائے ہوئے قانون نصفت (Jus honorarium) کے رواج مکتوبی یا موضوعہ قانون کا بھی متمم مانا جاتا ہے۔ اور جہاں قانون موضوعہ ساکت ہو تو رواج خود قانون تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اس کے جواز کے لئے کسی اقتدار کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ ایک استثنائی شکل میں تو رواج کو قانون روما میں غیر معمولی اہمیت اور اقتدار دیا گیا ہے۔ یعنے اگر قانون موضوعہ پر عمل نہ ہو تو اس عمل نہ ہونے کی وجہ سے قانون موضوعہ منسوخ متصور ہوتا تھا۔

اس طرح پر قانون روما میں بھی رواج ماخذ قانون تھا اور غالباً کوئی رومن فقیہہ بھی مثل آسٹن کے اس کے قانون تسلیم کئے جانے کے لئے یہہ ضروری نہیں سمجھتا تھا کہ ایک معین مقتدر اعلیٰ اس کو تسلیم کرے۔ تاہم ماخذہائے قوانین میں رواج کو قانون روما میں ایک ثانوی درجہ مجموعہائے قوانین کے نفاذ اور شاہنشاہوں کے اقتدار کی وجہہ سے دیا گیا تھا۔ حال حال ہی میں ماخذہائے قانون میں رواج کی اعلیٰ اہمیت تسلیم کیگئی ہے۔ اور یہہ تاریخی مذہب کے اساتذہ کی وجہہ سے۔

اس اسکول یا مذہب کے نزدیک قانون حالات کی پیداوار ہے ہر قوم میں اس قوم کے قانونی ملکہ کی وجہہ سے پیدا ہوتا ہے۔ رواج ازخود قانون ہے۔ بغیر قومی ضرورت کے وہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور قومی خصوصیات کا وہ مظہر ہوتا ہے۔ ساوینی کے ان خیالات کو پخٹہ (Puchta) نے اور آگے بڑھایا۔ اس کے نزدیک رواج نہ صرف ازخود قانون ہے اور اس کے جواز کے لئے کسی اقتدار کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ تمام صحیح قانون سازی کے لئے شرط مقدم بھی ہے۔ رواج کی اساس قوم کا اجتماعی قانونی شعور اور ایقان ہے۔ اور وہی قانون سازی مفید ہوگی جو اس شعور اور ایقان پر جس حد تک

وہ رواج میں ظاہر ہوا ہو مبنی ہو۔

تاریخی اسکول کی قانون سازی سے خصوصاً جبکہ وہ مجموعہ قانون کی شکل میں ہو بدگمانی اسی نقطۂ نظر کی وجہ سے تھی۔

الحاصل یہہ اسکول ابتدا (Volkgeist) سے کرتا ہے۔ اس لفظ کی کوئی تشریح نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ اس کو فی الواقع بطور ایک قدرتی مظاہر کے تسلیم کرلینا چاہیئے۔ یہہ ایک عمرانی واقعہ ہے اسی کے متعدد مظاہر ہیں قانون بھی ایک مظہر ہے۔ یہہ قوم کا ایک خاصہ ہے جو عملی تعلقات میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس (geist) یا خاصہ ملکہ کا وہ حصہ جو قانونی تعلقات میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کو (Rechtsuberzeugung) یا قانونی ملکہ کہتے ہیں۔ اس خاصہ میں قانونی تعلقات میں خیر و شر کا وقوف بھی داخل ہے۔ تمام قوانین چاہے انہیں جج اطلاق دیں یا مقننہ راملی بنائے اس قانونی ملکہ کے موافق ہونے چاہیں۔ ورنہ یہہ غلط اور برے ہونگے اور لازماً ناکام ہوجائیں گے۔ ہر ترقی یافتہ نظام قانونی کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اس قانون کو اطلاق دے جو قانون رہا ہے۔ جو قانون ہے اور جو قانون ہوگا۔ مصنوعی ایجادات صرف اس وقت جایز ہیں جب معاشرہ میں نئے ضرورتیں پیدا ہوں۔ یہہ صحیح ہے کہ قانون کے اطلاق دینے ججوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ان کا کام صرف قانون کو اطلاق دینا ہے۔ اس میں اضافہ کرنا نہیں ہے رواج ایک قاعدۂ عمل ہے۔ جج اور قانون کی تعبیر کرنے والوں کا کام منطقی فیصلے کرنا ہے۔ نہ کہ قواعد عمل بنانا۔ رواج کی ابتدا اور اس کا جواز ذاتی اس کے اطلاق سے ایک علحدہ امر ہے۔ اور ان دونوں امور کو علحدہ رکھنا چاہیئے اور اس وقت بھی جبکہ جج قانون یا رواج کے معنوں سے متعلق نزاعات میں اپنی رائے دیتے ہیں تو وہ بحیثیت عوام کے نمایندوں کے دیتے ہیں۔ اور جتنی یہ رائے (Volkgeist) کے مطابق ہوتی ہے۔ اتنی ہی یہہ مفید اور منصفانہ ہوتی ہے۔

ساوینی کی تعلیم کا یہہ مختصر اور صحیح خلاصہ ہے۔ اس کا عمرانی رنگ ظاہر ہے۔ اگر ساوینی استاد ارتقا کے پہلے استاد ارتقا تھا تو وہ اہل عمرانیات کے پہلے عمرانی بھی تھا لیکن اس کے نظریہ کے مشکلات

خصوصاً ججوں سے متعلق حصہ کی حد تک بہت سے ہیں۔ اور یہ نظریہ بلا ترمیم کے قبول نہیں کیا جا سکتا۔

(۱) ایک اعتراض یہ ہے کہ بہت سے رواجات ایسے بھی ہیں جو اپنی صداقت یا معقولیت یا سہولت عامہ کے لئے کسی "عام ایقان" پر مبنی نہیں ہیں۔ مثلاً غلامی ہی کو لیجئے۔ جو دنیائے قدیم میں ایک عالمی رسم تھی۔ ارسطو اگر اس کی حمایت کرتا ہے تو صرف انسانوں کی فطری عدم مساوات کی وجہ سے۔ ورنہ عام طور پر وہ اس کا موافق نہیں سمجھا جا سکتا۔ عیسائیت کو بھی اس کے جواز پر شبہ رہا ہے قانون قدرت کی رو سے اس کو صحیح نہیں تصور کیا گیا اور قانون اجانب سے قانون قدرت کا انطباق صرف غلامی کی وجہ نامکمل سمجھا گیا تھا۔ بہرحال غلامی کو قوم یا بنی نوع انسان کے عام ایقان پر مبنی کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے جبکہ قوم یا بنی نوع انسان کا اکثر حصہ دنیائے قدیم میں غلام تھا۔ دراصل غلامی کا رواج ایک اقلیت یعنے حکمران جماعت کی سہولت پر مبنی تھا۔ یہی حال جاگیری رواجات کا تھا۔ ان کو عام طور پر عوام کی مرضی پر مبنی کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کیونکہ عوام کا اکثر حصہ امراء کا ماتحت تھا۔

(۲) یہ بھی ہے کہ خود قومیت کا تصور حال کا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں اقوام کی تقسیم بلحاظ مذہب تھی نہ کہ بلحاظ قومیت اور اس زمانہ میں بہت سے رواجات تاجران جو پیدا ہو گئے وہ کسی ایک قوم کے عام ایقان کے مظاہر نہیں کہے جا سکتے۔ تجارتی اور دوسرے بہت سے ہمہ قومی رواجات کی موجودگی میں قومی عام ایقان (Volkgeist) کے تصور کے معنے بہت کم رہ جاتے ہیں۔ اس تصور میں فتوحات جملہ یا صلح کے ذریعہ سے فتوحات اور ان طریقوں سے رواجات کے پیدا ہو جانے کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے قانون بہت کم بخیب الطرفین ہوتا ہے۔ اور کسی بھی قانونی ادارہ کو قومی کہنا خطرناک ہے۔

(۳) (Volkgeist) یعنے قومی عام ایقان کہنے سے نفسیاتی اور غیر مادی امور کی بحث پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا انسانی معاشروں کی طفولیت میں جبکہ رواج قائم ہوئے غیر مادی اور نفسیاتی امور پر زور دینا بہت کچھ فرض کر لینا نہیں ہے۔ ان دنوں تو زور مادی امور پر زیادہ دیا جاتا تھا اور محسوسات پر کم۔ پہلے پتھر کو خدا سمجھ لیا جاتا تھا۔ رواج عمل ہے ہر ذی روح کے عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک ذہنی اور دوسرا خارجی۔ ذہنی پہلو جذبات اور تمناؤں پر مبنی ہوتا ہے اور خارجی پہلو عمل پر۔ عام ایقان یہ

دینے سے تاریخی اسکول کے اساتذہ ذہنی پہلو پر زور دیتے ہیں اور معاشرہ کی طفولیت میں ذہنی امور پر زور دینا صحیح نہیں ہو سکتا چنانچہ اب ساوینی اور پخنہ ٹ کے شاگرد تک اس کو ترک کر دیتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ قانون سے متعلق عام ایقان اگر کچھ تھا تو وہ ایک شعور کی حالت ذہنی ہی پر مبنی تھا مرضی پر مبنی کوئی عمل نہ تھا۔

ساوینی کے بعد (Gierke) گیرک انسانوں کے ہر مجموعہ کو ایک شخصیہ بنا دیا ہے۔ یعنی ہر انسانی مجموعہ ایک شخص ہوتا ہے اور گیرک (Gierke) زیادہ تر زور عمل کے ذہنی پہلو پر نہیں بلکہ خارجی یا عملی پہلو پر دیتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے دیتے ہیں جو اوپر بیان ہوئی یعنے یہ کہ انسانوں کی طفولیت میں انسانوں کی نظر مادی امور پر رہتی تھی غیر مادی امور پر نہیں۔ مثلاً ملکیت کا مجرد تصور نہیں تھا بلکہ ملکیت کے لئے لٹ یا برچھا۔ یا نزاعی زمین کا ڈھیلا حاصل کرنا ہی ملکیت حاصل کرنا سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے عوام کی اجتماعی زندگی میں ایقان کی تلاش کرتے وقت ہم کو رواج میں عمل (Practice) کے حصہ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ معاشرہ کی طفولیت میں عمل یا مشق یا متواتر عمل کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ اور رواج مادی مثالوں سے نشو نما پاتا ہے۔ رفتہ رفتہ عام تصورات مجرد حیثیت سے سمجھے جانے لگتے ہیں اور عام ایقان اور اس پر عمل دونوں کا اثر ہونے لگتا ہے۔ یعنے کوئی رواج اس وقت تک ظہور پذیر نہیں ہوتا جب تک اس کی کوئی وجہ یا اس میں کوئی سہولت نہ ہو۔

لیکن ہم کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ عمل سے بھی ایقان پیدا ہوتا ہے۔ بہت سے ایسے رواجات ہیں جو کسی شعوری ایقان پر مبنی نہیں ہوتے۔ یہ قوموں کا بھی تجربہ ہو سکتا ہے اور افراد کا بھی مثلاً جب کسی مقام سے یہ نہ معلوم ہو کہ منزل مقصود کا راستہ دو راستوں میں سے کون سا ہے تو آپ کس اصول پر ایک راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یا جب ایک ہی قسم کے اشیاء میں مثلاً گنجفہ کے پتوں اور روپیوں کے نوٹس ایک ہی قسم کے قلموں، سوئیوں میں سے کسی ایک کو لینا ہوتا ہے تو آپ کس بنا پر انتخاب کرتے ہیں۔ یہاں کوئی خاص ترجیح کی وجہ نہیں ہوتی ہے اور آپ ایک راستہ یا ایک پتہ یونہی اختیار کرتے اور لے لیتے ہیں۔ یہی بہت سے رواجات کے نشو نما میں بھی واقع ہوتا ہے مثلاً

سڑک پر ہمیشہ سیدھے ہاتھ سے چلنے یا بائیں ہاتھ سے چلنے کے رواج میں کونسا عام اتفاق کارفرما ہے
ہاں ملک ملک کا علحدہ علحدہ طریقہ ہے۔ انگلستان میں ایک تو فرانس میں ایک۔ اسی طرح یوروپین کیوں
سیدھے جانب سے لکھنے لگے اور مشرقی اقوام بائیں طرف سے۔ کوئی نہ کوئی ایک طریقہ اختیار کر لینا
ضروری ہوجاتا ہے لیکن ملحوظ رکھیئے جب یہ اختیار کر لیا جائے تو پھر یہ مقرر و متعین ہوجاتا ہے۔ امر کے
متعین ہونے میں علاوہ عادت کے نقل کے خاصہ کا بھی دخل ہے۔ اگر ہم بے لوثی سے اپنے روزمرہ
کے افعال پر نظر ڈالیں تو ظاہر ہوگا کہ ہمارے بہت زیادہ افعال نقل پر اور بہت کم افعال عقل پر مبنی
ہیں۔ چاہے ہم اس کو تسلیم کرنا پسند نہ کریں۔ اس میں سہولت بھی ہے اور اگر اصول کا سوال نہ ہو تو
یہ عقلمندی بھی ہے۔ کیونکہ اس کے مطابق عمل کرنے میں نہ عمل کرنے سے کم تکلیف ہے۔

(۴) **رواج کی تعبیر اور اس کا اطلاق**۔ چونکہ بعض رواجات سے قانونی تعلقات بھی
متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ فقیہوں اور عدالتوں کے زیر تنقیح آتے ہیں اس لئے رواجی قانون اور ججوں
یا فقیہوں کے درمیانی تعلق کے متعلق دو نظریہ قابل غور ہیں۔

(۱) پہلا نظریہ تاریخی اسکول کے اساتذہ کا ہے۔ اور اس خصوص میں یہ اساتذہ اس مشکل
میں ہیں کہ وہ یہ خوب جانتے ہیں کہ نظام ہائے قوانین اور اسی لئے رواج کے نشو نما میں ماہرین
کی تعبیر کا اہم حصہ رہا ہے اتنا اہم کہ بادی النظر میں ماہرین واضعین نظر آتے ہیں۔ لیکن ماہرین کو واضعین
سمجھنے سے عوام کے ملکۂ قانون سازی پر کاری ضرب لگتی ہے۔ ساوینی اس کی یہ توضیح کرتے ہیں کہ "گو
ابتدا میں قانون کو تمام قوم سمجھتی تھی اور وہی بناتی تھی۔ لیکن زندگی کے گوناگون تعلقات کی وجہ سے وہ
اپنی تفصیلات میں اس قدر نشو نما پاجاتا ہے کہ عوام اس کو سمجھ نہیں سکتے ہیں اس لئے ماہرین قانون کی
ایک جماعت پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ جماعت عوام ہی کی ایک جزو اور اس دائرہ قانون میں عوام کی
نمایندہ ہوتی ہے"۔ یہ جماعت نہ صرف نظریہ قانون کی تھذیب اور اس کو ترقی دیتی ہے۔ بلکہ اس کو
اطلاق بھی دیتی ہے۔ دونوں کاموں میں اس کا فرض ہے کہ موجودہ قانون کی جو قوم کے رواجات
سے بنا ہے توضیح کرے اس کا یہ فرض نہیں ہے کہ اس میں اپنا کچھ اضافہ کرے۔ قانون کو ترقی تو

قوم ہی دیگی۔ فقیہہ کا کام یہہ ہے کہ اس ترقی کے دائرہ کے اندر ہی رہ کر تعبیر کرے۔"

یہہ نظریہ قابل اعتراض ہے کہ جب کوئی جج مثلاً حکم نامہ احضار شخص جاری کرتا ہے اور یہہ کہہ کر جاری کرتا ہے کہ انگریزی قانون کا یہہ بہت ہی بنیادی اور قدیم اصول ہے کہ حبس بیجا سے ہر شخص آزاد رکھا جائے تو یہہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ایسے اصول کو بیان کر رہا ہے جو تمام برطانویوں کے ایقان میں موجود ہے۔ لیکن جب وہ قانون ارضی کے کسی اصطلاحی اور سخت پیچیدہ امر کا فیصلہ کرتا ہے تو یہہ کہنا کہ یہہ بھی قوم کے ایقان میں داخل ہے صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہہ ہے کہ یہہ امر قوم کی سمجھ سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ اس طرح پر قانونی پیچیدہ مسائل میں یہ کہنا کہ جو جج کے ذہن میں ہوتا ہے وہ عوام کے ذہن میں بھی ہوتا ہے یا زبان فقیہہ زبان خلق ہے صحیح نہیں ہے۔ قانونی تاریخ کے مبتدی پر بھی یہہ امر روشن ہو کہ تعبیر کنندوں یا فقیہوں کا اثر قانون پر کتنا گہرا رہا ہے۔

رومن فقہا ہی کو لیجیئے۔ انھوں نے قانون روما کی شکل میں جریدہ عالم پر ایک لافانی یادگار چھوڑی ہے جو نہ جدید ہے نہ قدیم بلکہ ہر زماں اور مکان میں اس کے اصول اتنے بے مثال ہیں۔ کہ ان سے ثابت ہے کہ ذہن کے لافانی ہونے کے سامنے مادہ کا لافانی ہونا کوئی شیئے نہیں ہے فراموش نہ کیجیئے کہ یہہ رومن فقیہہ نہ حکمران تھے نہ اوتار نہ قانون ساز اور نہ ان کی یاد باقی رکھنے کوئی اہم واقعات عوام کے دلوں میں جاگزین ہو گئے تھے۔ تاہم یہہ واقعہ ہے کہ ان سخت محنت کرنے والے عہدہ داروں اور فقیہوں کا اثر یورپ کے قانونی اداروں سے ان دو ہزار سالوں میں کبھی کلیتہً زائل نہیں ہوا ہے۔ جب تیسری صدی عیسوی میں آخری فقیہہ البینؔ نے اپنا کام ختم کیا تو روما میں زوال آغاز اور جاگزین ہو چکا تھا۔ اور چوتھی اور پانچویں صدی میں سلطنت روما میں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان فقیہوں کی یہہ سب محنت رائیگاں گئی لیکن جسٹنین کے ہاتھوں یہہ پھر زندہ ہوئے۔ اور دنیا کا عظیم ترین (یہہ نہ سہی تو عظیم ترین مجموعوں میں سے ایک) مجموعہ قانون ایسے فقیہوں کے تصانیف سے بنایا گیا جو دو تین چار یا پانچ صدی پہلے مر چکے تھے۔ لیکن یہہ احیا بھی بظاہر دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ پھر پانچ صدیوں تک یورپ پر تاریکی چھا گئی۔ عہد قدیم کے ان فقیہوں کی شمع محض ایک چراغ ہو گئی جس میں نہ روشنی رہی نہ گرمی۔ اس کے بعد پروونس

لمبارڈی۔ راوینا اور بولونہ میں دوسرا احیا ہوا۔ ایسا کہ یورپ کا کوئی ملک حتیٰ کہ انگلستان بھی جہاں اس کا اثر نسبتاً کم رہا ہے۔ اس کے اثر سے بے نیاز نہیں رہا۔ انگریزی ازمنہ وسطی کا قانون بولونہ کا رہین منت ہے۔ نہ صرف براکٹن ہی نے یہاں سے تحصیل علم کیا تھا۔ بلکہ انگریزی جسٹی نین یعنے ایڈورڈ اول نے یہاں سے ایک مشیر قانونی (Fransiscus Son of Accursius) کو لایا تھا اور اس کو عہدۂ جلیلہ پر سرفراز کیا تھا۔ براکٹن نے نہ صرف ازمنہ وسطی کے قانون پر ایک اہم کتاب لکھی ہے بلکہ نظایر کے نظام کی بنیاد بھی اسی نے ڈالی ہے۔ لٹل ٹن نے بھی انگریزی قانون ارضی کی افراتفری میں ایک نظام قایم کیا ہے۔ لٹل ٹن کے متعلق کک نے کہا ہے اور صحیح کہا ہے کہ "انھوں نے اپنی بہترین تصانیف اور کام سے جو وہ دوسروں سے سیکھے تھے عصر ہائے مابعد کے تمام پروفیسروں کو قانون سکھایا ہے" خود کک بھی قانون کی شاہراہ پر ایک رہنما تختی ہے۔ جو بے ڈول ہی سہی لیکن ایسی ہے کہ اس کی رہنمائی سے مفر نہیں۔ انگریزی قانون میں ان کی انتہاک محنت اور دقت نظر کا بہت اثر رہا ہے اور کامن لا اور منصب عدالت کا نصب العین جو انگریزی نظام عدل گستری کی اساس ہے انہیں کا قائم کردہ ہے اٹھارویں صدی میں بلاکسٹن گو اپنے عظیم مشیروؤں کے مانند عظیم شخصیت کے حامل نہیں تھے لیکن شہرۂ شروحا لکھ کے انھوں نے قانونی تعلیم کی خدمت ایسے زمانہ میں کی جبکہ قانونی تعلیم گویا تھی ہی نہیں۔ ان کے شروحات کی سر دلعزیزی قانونی تاریخ میں بے مثال ہے اور آج تک بھی انگریزی قانون میں ان سے اچھی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔

فقیہوں کے اثر اور طاقت کی یہ چند جدید مثالیں ہیں ان کو صرف قانون سازی بھی مٹا نہیں سکی ہے ان کو کس حد تک "عوام کا نمایندہ" کہا جاسکتا ہے۔ یوں تو ہر غیر معمولی شخص اور ہر بیوقوف بھی اپنے زمانہ کی پیداوار ہوتا ہے اور الپین کے لئے قانون روما میں سے غلامی کو خارج کرنا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا کہ لٹلٹن کے لئے قانونی ارضی میں رجسٹری کو لازمی کرنا۔ اسی لئے اگر رومنوں کو قانون کا خاص ملکہ یا خداداد قابلیت (genius) نہیں ہوتی تو عہد قدیم کے رومن فقیہہ قانون روما کو اس کی موجودہ شکل نہیں دے سکتے۔ تاہم یہ تسلیم کرنا انفرادی فقہا کے اثر اور تخلیقی کارناموں کو نظرانداز کرنے کے

مترادف نہیں ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ قانون روما صرف حالات یا صرف رومنوں ہی کا بنایا ہوا ہے۔ ان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔

کیا رواج کو محض فقہا یا جج بناتے ہیں ۔ یہ مقابلہ علم اصول قانون کے بعض علما کی رائے ہے مثلاً مین نے اپنی کتاب (Ancient law) میں یہی قرار دیا ہے۔ اور جی سی گرے نے اپنی کتاب[۱] کے صفحہ (۲۹۷) میں یہ حیرت ناک جملہ لکھ دیا ہے کہ "غالباً قانونی تاریخ کی ہر منزل میں ججوں کے وضع کردہ قواعد سے رواج پیدا ہوا ہے نہ کہ رواج سے ججوں کے قواعد" اور فرانسیسی جورسٹ "میرنے بھی اپنی کتاب[۲] میں ججوں ہی کو رواجی قانون کی قوت محرکہ کہا ہے اور ان کی رائے میں بیرونی عدالتی قواعد عمل کم و بیش سرعت کے ساتھ عدالتی رہنمائی کے مطابق ہوجاتے ہیں۔ پروفیسر اہیرلخ (E. Ehrlich) نے ایک درمیانی راہ اختیار کی ہے انھوں نے اس مسئلہ پر عمرانی نقطۂ نظر سے غور کرکے ججوں کے رواج پر اثر کو ست اہمیت دی ہے وہ یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ روما میں کم از کم شاہنشاہوں کے زمانہ تک رومن رواج سے مطلب ججوں کا وضع کردہ قانون Juristen-recht سمجھتے تھے یہ ہر نظام قانون میں آتا ہے۔ رواج بغیر ججوں کے دخل کے قانون نہیں بنتا۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہو کہ جج ہی رواج بناتے ہیں نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ جج رواج کے نشو و نما پر اثر نہیں ڈالتے ہیں تاریخی اساتذہ کی بنیادی غلطی ان کی رائے میں یہ ہے کہ انھوں نے ان قانونی قواعد عمل میں جو عدالتوں میں اطلاق دیئے جاتے ہیں اور ان قانونی تعلقات میں جو معاشرہ میں موجود ہوتے ہیں۔ فرق نہیں کیا ہے۔ یہ دونوں علٰحدہ علٰحدہ چیزیں ہیں۔ اول الذکر مصنوعی اور عقل و منطق کی پیداوار ہیں موخرالذکر خود رو اور پیدائشی مثلاً خاندان و جائداد سے متعلق قانون یا معاہدہ سے متعلق قانون فقیہہ کے وظائف دو ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ اس کو مطالعہ اور ہمدردی سے یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ قوم میں قانونی ایقان کی کون سی لہریں موجود ہیں یعنے قوم میں کون کون سے قانونی تعلقات یا ان کو منضبط کرنے والے قواعد عمل موجود ہیں۔ اور پھر اس کے بعد معاشرہ میں جو قانونی تعلقات موجود ہوتے ہیں ان کے لئے عام اصول وضع کرنے چاہئیں یعنے ان قانونی تعلقات کو عام اصولوں کے تحت لانا چاہیئے۔ موخرالذکر وظیفہ

[۱] Nature & sources of law ; [۲] La function du Droit civil compare

ایک فنی کام ہے ۔جو عام ایقان اور عام شعور سے علیحدہ چیز ہے ۔ اور ساوینی نے چونکہ یہہ فرق نہیں کیا ہے اسی لئے وہ ججوں کے فنی کام کو قوم کے عام ایقان سے مخلوط کرتے ہیں ۔

قانونی اداروں کے نشو نما میں ان دو گونہ اثرات کی مثال انگریزی قانون عمومی سے بھی دیجاسکتی ہے ۔ بلاکسٹن اور ان سے پہلے اور ان کے بعد بھی بہت سے اساتذہ بنیادی قانونی اصولوں کو عہد قدیم سے قوم کے دل میں جاگزیں اور اس کی خصوصیت بتاتے ہیں ۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ قانون عمومی میں رواج کے اجزا بہت پائے جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی آج کل یہہ بھی قانونی مورخوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ "رواج مملکت" بڑی حد تک "رواج عدالت" نہ کہ "رواج قوم" رہا ہے حتیٰ کہ انگریزی قانون کے اصول شہادات کے متعلق بھی اب تحقیق ہو چکا ہے کہ بارھویں صدی تک یہ عام رواج نہیں تھا ججوں نے اس کو پسند کیا۔ اور انہیں کے اثر سے تیرہویں صدی سے یہہ عام رواج ہوگیا ہے ۔

الحاصل یہ حقیقت ہے کہ رواجی قانون اور ججوں اور فقیہوں کی تعبیر کا ایک دوسرے پر عمل اور ردعمل ہوتا ہے اور رواج کے نشو ونما میں ججوں اور فقیہوں کے وضع قواعد کے کسی ایسے زمانہ کا خیال کرنا بھی ناممکن معلوم ہوتا ہے جس سے پہلے قانونی تعلقات کے وجود کو اور قانونی شعور و ایقان کو تصور نہ کیا جائے یہہ قانونی ایقان یا شعور ممکن ہے کہ غیر متعین مبہم اور غیر اصولی ہو جب تک کہ ماہرانہ علم وفن اس کو تہذیب و ترتیب نہ دے یہ قانونی ایقان و شعور تمام رواجی قانون کی اولین قوت محرکہ (Primum mobile) ہوتی ہے ۔ مین نے علم اصول قانون میں ایک قابل ذکر اضافہ ابتدائی معاشروں میں رواجی قانون کے مکتوب ہو جانے کے اثرات کی وضاحت کر کے کیا ہے ۔ لیکن یقیناً انھوں نے جامعان وشارعان قانون کے تخلیقی اور وضعی فرائض یا وظائف میں مبالغہ سے کام لیا ہے ۔ شارع کے لفظ سے بھی مغالطہ ہو سکتا ہے ۔ شارع قانون اتنا واضع نہیں کرتے تھے جتنا کہ یہ قانون معلوم کرتے تھے ۔ یعنی یہہ کوئی نئے قواعد نہیں بناتے تھے بلکہ خاص مہارت اور دانشمندی سے ان اصولوں کو اطلاق دیتے تھے ۔ جو معاشرتی میل جول یعنی معاشری ضرورت و سہولت ۔ حس انصاف یا محض نقل کی وجہ سے پیدا ہو چکے تھے ۔ ونوگرادوف تاریخی علم اصول قانون صفحہ (۳۶۳) پر کہتے ہیں کہ ۔

"صاف طور پر معاشری رواجات کی ابتدا کسی مجلس یا عدالت سے نہیں ہوئی ہے۔ یہ آہستہ آہستہ گھروں اور خاندانوں کے روزمرہ کے تعلقات سے پیدا ہوتے ہیں، جج بعد میں جبکہ رواج قایم اور ان پر عمل ہوتا تھا۔ پردۂ ظہور میں آئے ہیں۔ اور عام پسندیدگی کی تہدید میں عدالتی اور ماہرانہ توضیح اور توضیع کی تہدید کا اضافہ کرتے ہیں۔"

"Social customs themselves obviously did not take their origin from an assembly or tribunal. They grewupby gradual process in the house-holds and daily relations of the clans, and the magistrates only came in at a later stage, when the custom was already in operation, and added to the sanction of general recognition, the express formulation of Judicial and express authourity."

اس طرح اب بھی ساوینی کے نظریہ میں عصر جدید کے طلبا قانون کے لئے اہم سبق ہے کہ قوم کا بنایا ہوا ایک قانون ہوتا ہے اور اس کی ابتدا عمرانی واقعات کی وجہ سے ہوتی ہے مصنوعی واقعات سے نہیں ہوتی یعنے مثلاً کسی معین مقتدر اعلیٰ کے احکام سے نہیں ہوتی اس بنیادی قانون کے نشو ونما میں فقیہوں اور ججوں کی تعبیر کا ایک اہم اور لازمی حصہ ہوتا ہے۔ اور یہ حصہ زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ جیسے جیسے قانون ترقی کرتا اور اس کے اصول و اشکال معین ہوتے جاتے ہیں۔ اہرنگ کی تاریخی اسکول کی اہم تنقید صحیح معلوم ہوتی ہے یعنے ضروری ہے کہ ان تعلقات میں جو معاشرہ یا قوم میں عمرانی اسباب کی بنا رپر قائم ہو جاتے ہیں اور ان قواعد عمل میں جو جج اور فقیہہ بناتے ہیں فرق کیا جائے۔ تعبیر کے عمل پیہم سے رواج میں بہت تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ بعض وقت اتنی کہ رواج باقی ہی نہیں رہتا۔ "لیکن جج یا فقیہہ کو ہمیشہ ایسے اعمال سے سابقہ ہوتا ہے جو اولاً واقعی معاشری تعلقات سے پیدا ہوتے ہیں۔"

"But always the jurist or the magistrate has to deal with

practices springing in the first instance from actual social relation-ships."

نفاذ کے صحیح معنے یہی ہیں جج یا فقیہہ رواج بناتے یا پیدا نہیں کرتے ہیں۔ اس سے آسٹن کے اس نظریہ کی غلطی ظاہر ہوگی کہ رواج اس وقت تک قانون نہیں ہے جب تک عدالتوں میں اس کو تسلیم نہ کیا جائے۔ حقیقت بالکل ہی اس کی ضد ہے۔ رواج اولین اور اہم ترین قانون ہے۔ لیکن منطق اور تعبیر کے اس پر استعمال کئے جانے سے اس میں تبدیلیاں واقع ہوجاتی ہیں۔ بعض وقت وہ بڑی حد تک بدل جاتا ہے اور بعض وقت وہ قابل عمل نہیں رہتا ہے۔

یہ ہیں رواج سے متعلق تاریخی اساتذہ کے مباحث۔ ان کا خلاصہ یہ ہوگا کہ تاریخی اساتذہ رواج کو اولین اور اہم ترین قانون سمجھتے ہیں۔ موجودہ قانون میں بھی اس کی وسعت کو تسلیم کرتے ہیں۔ رواج کی ماہیت سے متعلق ان کا بیان یہ ہے کہ معاشرہ کے محض وجود۔ افراد کے محض تعدد ہی سے یہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کی ابتدا کو وہ قوم کے قانونی ملکہ سے منسوب کرتے ہیں اس ملکہ کی وجہہ سے قوم اپنی ضرورت، سہولت، اور اتفاق سے قواعد عمل بناتی ہے۔ عادت اور نقل کے فطرت انسان کے خواص کی وجہہ سے ان پر عمل ہونے لگتا ہے اور مرور زمانہ سے ان میں تقدس پیدا ہوجاتا ہے۔ اور ہر عادتی عمل سے انحراف کو برا سمجھا جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر پر تنقید یہ کی گئی ہے کہ گو وہ اپنی حد تک صحیح ہو لیکن کسی ایک قوم کی حد تک اس کو محدود کرنا صحیح نہیں ہے۔ خارجی اثرات تجارتی یا عالمی رواجات کا اس میں پورا لحاظ نہیں ہے۔ بالعموم قانونی ادارے خالص قومی نہیں ہوتے عالمی ہوتے ہیں۔ رواج ایک انسانی ادارہ ہے۔ اسی لئے عالمی ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ گو قواعد عمل یا رواج کی ابتدا معاشرتی تعلقات کی بنا پر قوم میں ہو۔ لیکن فقیہہ اور جج ان کو تہذیب اور اصولی شکل دیتے ہیں۔ اور اس فنی کام سے بھی بہت سے قواعد عمل وضع ہوتے ہیں۔ جو قوم کے قانونی ملکہ کے پیداوار نہیں ہوتے ہیں بلکہ عقل و منطق کے نتیجے ہوتے ہیں۔ فقیہوں کا کام یہ بھی رہا ہے کہ قواعد عمل کو اصولی شکل دیکر ایک نظام میں مدون کریں۔ اور اس نظام کو متوافق متوازن اور عوام کی ضرورتوں کے موافق بنائیں۔

آخر میں رواج سے متعلق مباحث کو ختم کرنے سے پہلے ملحوظ رکھیئے کہ ایک سوال یہ بھی ہوگا کہ

آخر انسانوں میں رواج یا قانون کا اولین تصور پیدا ہی کیسے ہوا۔ اس کا ایک جواب یہہ دیا گیا ہے کہ وہ انسان کے لئے طبعی یا پیدایشی ہے۔ سوال یہہ ہے کہ کیا قانون کے کل مضامین طبعی ہیں؟ انسان کی طفولیت اور قانونی مضامین کی وسعت پر نظر کرتے ہوئے یہہ خیال بداہتہً غلط ہو جاتا ہے۔ یہہ ہو سکتا ہے کہ صرف قانونی قواعد کی ضرورت کا شعور بلا لحاظ ان کے مضامین کے طبعی ہو۔ یہہ خیال اگر صحیح ہے تو پھر شروع ہی سے انسانی شعور میں قانون کا تصور اس کی عام شکل میں مماثل تصورات مثلاً اخلاق مذہب وغیرہ سے صاف طور پر علحدہ پایا جانا چاہیئے۔ لیکن حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے انسانوں کی طفولیت میں قانون کا تصور ایک مادی شکل ہی میں پایا جاتا ہے۔ قانون کا عام تصور جو اس کے تمام مادی اجزا پر حاوی ہو نسبتاً بہت بعد پیدا ہوا ہے۔ ان پڑھ آدمی صرف متعدد علحدہ علحدہ قوانین یا قواعد عمل سے واقف ہوتا ہے۔ اس کا ذہن قانون کے عام تصور سے روشناس نہیں ہوتا۔ اسی طرح قانون اور مذہب یا اخلاقیات میں فرق بہت بعد میں کیا جانے لگا۔ ابتدائے معاشرت میں قانونی اخلاق اور مذہب سب ایک ہی سمجھے جاتے تھے اس لئے اس نقطہ نظر سے قانون کے تصور کو طبعی نہیں کہہ سکتے۔

قانون کا تصور طبعی ہی نہیں، تو پھر یہہ انسانوں میں پیدا کیسے ہوا۔ اس کا جواب یہہ دیا گیا ہے کہ وہ معاشرہ کی طفولیت میں غیر شعوری طور پر انسانوں میں پیدا ہوا ہے۔ تصور قانون کا مواد یا مضمون غیر شعوری طور پر فراہم ہوا ہے۔ قانونی قواعد عمل غیر شعوری طور پر قائم ہوئے ہیں۔ مرضی سے یا ارادی طور پر نہیں قایم ہوئے ہیں۔

ان فقروں کو سمجھنے شعوری عمل کی ابتدا سمجھنا ہوگا۔ نفسیات جدید میں شعوری ارادہ (Consoious wills) کو پیدایشی نہیں مانا جاتا ہے۔ چنانچہ (Bain) نے اپنی کتاب[1] میں ارادہ کے واقعہ کی توجیہہ نفسیات قانون تلازم Law of association سے کی ہے۔ بین کی رائے میں ارادہ انسان کے لئے طبعی نہیں ہے۔ انسان کی طفولیت میں وہ انسانی ذہن کا خاصہ نہیں ہے وہ نفسیاتی ترقی کی ایک پیداوار ہے انسان کی طفولیت میں انسان غیر شعوری طور پر عمل کرتا تھا کیونکہ اس کی عضویت کی خودرو حرکت اس کو عمل پر مجبور کرتی تھی۔ عضویت کی یہ حرکت اس اعصابی

[1] "The Emotions and the wills."

قوت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جو ہمارے جسموں میں زندگی کی وجہ سے پیدا اور جمع ہوتی ہیں جنینوں کی رحم میں حرکت کی یہی وجہ ہے بچے اچھلتے کودتے روتے اور دوڑتے اسی وجہ سے ہیں اور ہم بھی ایک تھکا دینے والی بیکاری کے بعد بلا وجہ اور بے سوچے سمجھے کام اسی لئے کرنے لگتے ہیں لیکن تمام افعال جو ہم غیر شعوری طور پر کرتے ہیں شعور میں دو تصور چھوڑتے ہیں۔ ایک تصور تو عمل کا ہوتا ہے۔ اور دوسرا عمل کے نتایج کا کہ وہ پسندیدہ ہیں یا غیر پسندیدہ۔ تجربہ جتنے زیادہ مرتبہ کیا جاتا ہے اتنا ہی ہمارے ذہن میں ان دو تصورات کی یاد اور خیال یعنے تلازم (Association) پختہ ہوتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جب ہم عمل کو یاد کرتے ہیں تو اس کا ساتھی تصور یعنے پسندیدہ یا غیر پسندیدہ نتایج کا تصور بھی یاد آجاتا ہے۔ اور اس طرح پر ہم عمل کو اچھا یا برا، مطلوب یا قابل اجتناب سمجھنے لگتے ہیں۔ ان دو تصورات کا تلازم جتنا زیادہ قوی ہوگا ہمارے خواہشات بھی اتنے ہی معین و مستقل ہوں گے اور ان کا تلازم جتنا کمزور ہوگا خواہشات بھی اتنے ہی کمزور رہوں گے۔ لیکن عمل یا اس کے نتایج کی یاد سے جب شعوری طور پر خواہش پیدا بھی ہو تو یہ عمل کے لئے کافی نہیں ہے بہت سی خواہشات پورے نہیں ہوتے بہت سے ارمان نہیں نکلتے ہیں ہم ان کے لئے کوشش اور عمل نہیں کرتے۔ عمل کرنے کے لئے اعصاب میں قوت جمع ہونی چاہیئے۔ اعصابی نظام کی حالت کے لحاظ سے کہ وہ کمزور ہے یا قوی خواہشات جامۂ عمل پہنچتی ہیں۔ یا حرف آرزو ہی بن کے رہ جاتے ہیں۔

اسٹن تھل نے زبان کی ابتدا کی توجیہہ بھی اسی طرح کی ہے۔ جذبات سے متاثر ہوکر آدمی غیر ارادی طور پر آوازیں کرتا ہے۔ جن سے اس پر اور اس کے بنی نوع پر ایک اثر ہوتا ہے۔ دوبارہ انھیں حالات میں آہستہ آہستہ اس آواز کے تصور اور اس سے جو اثر پیدا ہوا اس میں تلازم زیادہ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ تلازم کی وجہ سے اس اثر کے تصور سے آواز کا تصور ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور اگر اثر پسندیدہ ہو تو آواز شعوری طور پر نکالی جاتی ہے۔ اس تلازم کی وجہ سے غیر ارادی آوازیں شعوری طور پر بولے ہوئے الفاظ میں بدل جاتی ہیں۔ اس اثر کا تصور آواز سے مل کر لفظ کے معنے بن جاتے ہیں۔

Steinthal(Abrissder sprach wissenschaft).

بقول کرکونا ف قانون کی ابتداء کی بھی اسی طرح توجیہہ کی جاسکتی ہے ۔

معاشرہ کی طفولیت میں حالات یکساں اور تعلقات سیدھے سادھے ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس کے افراد لازماً یکساں طریقہ پر رہتے ہیں اور انسان اپنے بنی نوع اور اپنے آبا واجداد کی طرح عمل کرتا ہے کیونکہ افعال یا اعمال کا شعوری تصور بہت ہی کمزور ہوتا ہے۔ تجربہ سے حاصل شدہ تصورات بہت ہی تھوڑے ہوتے ہیں۔ اور گھڑی گھڑی ان ہی کا اعادہ ہوتا ہے نقل کا رجحان بھی نہایت قوی ہوتا ہے ان وجوہات سے معاشرہ کی طفولیت میں انسان بالکل اپنے بنی نوع اور اپنے آبا واجداد کی طرح عمل کرتا ہے اسی لئے ہر شخص کو یقین ہوجاتا ہے کہ انھیں حالات میں ہر شخص اسی طرح عمل کرے گا۔ وہ عادی تغیر تبادل عمل کی توقع کرنے لگتا ہے۔ اس پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنے معاملات کو بھی اسی توقع کے لحاظ سے ترتیب دیتا ہے اگر کبھی اس کے خلاف توقع کوئی فعل ہوتا ہے ۔ یعنے کوئی شخص اس کے ساتھ اس کے اس توقع کے مطابق عمل نہیں کرتا ہے تو اسے بے اطمینانی ہوتی اور غصہ آتا ہے ۔ وہ اپنے توقعات کو درہم برہم کرنے والے کو برا بھلا کہتا اور اس سے بدلہ لینے کی کوشش کرتا ہے ۔ ایسے تصادم جتنے زیادہ مرتبہ ہوں۔ اتنا ہی رواج کے مقررہ عمل سے انحراف کے تصور اور انحراف سے نقصان اٹھانے والے شخص کے برا بھلا کہنے ، غصہ اور بدلہ لینے کے تصور میں تلازم پیدا ہوجاتا ہے اور اس طرح پر رواجات پر عمل جو پہلے جبلی اور غیر شعوری ہوتا ہے ۔ ایک شعوری تصور میں متبدل اور قائم ہوجاتا ہے اور بالآخر رواج پر عمل صرف عادت اور غیر شعوری میلان ہی کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے بلکہ ان ناپسندیدہ نتائج کے تصور سے بھی جو رواج سے انحراف کرنے سے پیدا ہوتے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رواج کے واجب العمل جبری ہونے کا تصور پیدا ہوجاتا ہے ۔ اور رواج پر عمل باوجود اس سے انحراف میں کوئی مفاد یا فائدہ یا انحراف کا کوئی رجحان ہونے کے اس لئے کیا جاتا ہے کہ انحراف کے ناخوشگوار نتائج سے بچا جائے ضرورت یعنے لزوم یا واجب التعمیل ہونے کے تصور (opinio necssitatis) کے ظہور سے ایک ایک سیدھی سادی عادت جس پر جبلی اور غیر شعوری طور پر عمل ہوتا تھا ۔ قانونی رواج میں بدل جاتی ہے ۔ جس پر شعوری طور پر عمل ہوتا ہے اور جو واجب التعمیل تصور کی جاتی ہے یہی رواج قانونی قواعد عمل کی ابتدائی شکل

primitive from) ہے اور قانون کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ بعضے قواعد عمل پر شعوری طور پر عمل کیا جاتا اور ان کو واجب التعمیل یا جبری تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن یہہ ابتدائی قانونی قواعد عمل یا ان کا مواد یا مضمون شعوری طور پر قائم نہیں ہوتا ہے بلکہ غیر شعوری طور پر قدیم رواجات سے قائم ہوتا ہے۔

قانون کی ابتدا کی اس توجیہہ سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ کیوں انسان کی طفولیت میں قانون کو انسان کی مرضی سے آزاد حکم تصور کیا جاتا تھا۔ اور کیوں اس کے لئے ایک آلہی ماخذ کی تلاش ہوتی تھی۔ انسانی شعور قانون کو غیر شعوری طور پر قائم شدہ رواجات کی وجہہ سے قائم اور مقرر پاتا ہے[1]۔ اور چونکہ انسان ان رواجات کی ابتدا کی قدرتی توجیہہ نہیں کرسکا۔ اس لئے بقول کرکوناف وہ قانون کو ایک آلہی ادارہ سمجھنے لگا۔ اور اس طرح پر قانون انسان کی نظروں میں ایک موضوعی نظام ہے جو انسانی ارادہ سے آزاد انسانی مرضی کا کوئی فعل نہیں ہے اور انسان کے آزادانہ انتخاب کا اس میں دخل نہیں ہے۔

قدیم رواجات کو جبری سمجھتے ہوے انسان ان کے ابتدائی شکل اور مواد یا مضمون میں کوئی فرق نہیں کرتا ہے وہ ان کی شکل اور مواد دونوں پر عمل کو قطعی طور پر واجب التعمیل سمجھتا ہے۔ اسی لئے قانون کی ترقی کے ابتدائی منازل میں حد سے زیادہ اور نہایت سخت ضابطہ پسندی rigid formalism ہوتی ہے۔

اور اگر بلحاظ ان کے مضمون کے قدیم رواجات جبری یعنے واجب التعمیل سمجھے گئے۔ تو اسی سے ابتدائی معاشرہ میں اخلاق، مذہب اور سہولت پر مبنی قواعد عمل میں پورے پورے خلط ملط کی توجیہہ ہوتی ہے۔ رواج کے مباحث میں تاریخی اساتذہ کی دقت نظر اوپر کے ایک سرسری خاکہ سے ظاہر ہوگی۔ مقابلہ کے لئے تحلیلی اساتذہ کے سطحی مباحث مضمون کے ابتدا میں علحدہ لکھے گئے۔ دونوں مذاہب کے مضمون سمجھانے کا فرق ان مباحث سے واضح ہوگا۔ تاریخی اساتذہ تاریخ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور مضمون کی تہہ تک جاتے ہیں تو تحلیلی اساتذہ صرف حدود کے مفہوم متعین کرتے ہیں۔ اور تاریخ سے بے اعتنائی کرتے ہیں۔

[1] Human Consciousness finds law alreay established and set up as the result of customs unconsciously established."

عدالتی عمل۔ (الف) نظیر۔

اس عنوان کے تحت ہم پہلے (۱) نظائر کی تعریف کریں گے پھر (۲) نظائر اور رواج میں مشابہت اور فرق کو ظاہر کریں گے۔ اس کے بعد (۳) استقراری و اصلی نظائر کو بیان کریں گے پھر (۴) نظائر کے تعمیری ہونے اور تنسیخی نہ ہونے کا ذکر آئے گا پھر (۵) وقعت نظائر کا ذکر کیا جائے گا اور آخر میں (۶) نظام نظائر کے حسن و قبح پر ایک نظر ڈالی جائے گی۔

تعریف:۔ نظائر ماخذ قانون ہیں اور اس لئے ہیں کہ ان کے ذریعہ کوئی قاعدہ عمل یکساں معلوم اور جبری قاعدہ عمل کی یعنے قانون کی صورت اختیار کرتا ہے۔

رواج و نظائر کا مقابلہ۔ رواج اور نظائر میں مشابہت تو یہ ہے کہ مثل رواج کے نظائر بھی واقعات پر مبنی اور بالعموم انھیں تک محدود ہوتے ہیں۔ اور مثل رواج کے نظائر سے متعلق عام تصور یہی ہے کہ وہ کسی موجودہ جبری اصول ہی کو اطلاق دیتی ہیں۔ اس کے برخلاف رواج اور نظائر میں فرق یہ ہے کہ نظیر ایک شعوری فعل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف رواج ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک غیر شعوری عادت ہوتی ہے۔ یہ عادت یا عادتی عمل یا برتاؤ قانون یا قانونی قاعدہ عمل اس وقت بن جاتا ہے جبکہ اس کے جبری ہونے کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ رواج کے ایک غیر شعوری عادتی عمل ہونے کی وجہ سے اس کا مواد یا مضمون غیر شعوری طور ہی پر مہیا ہوتا ہے۔ یعنے عادتی عمل سے مہیا ہوتا ہے قانونی شعور جس سے ایک سیدھا سادھا عادتی عمل قانونی عمل رواج یا قانونی قاعدہ عمل بن جاتا ہے اس قاعدہ عمل کا مضمون عادتی عمل یا عادتی اعمال میں موجود پاتا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ برخلاف رواج کے نظائر ایک خاص قانونی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یعنے احکام اور فیصلہ جات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے تحریری ہوتے ہیں۔ رواج بالعموم غیر تحریری ہوتے ہیں شعوری فعل ہونے اور خاص قانونی شکل (Form) کے حامل ہونے میں نظائر۔ قانون سازی (Legislation) سے مشابہ ہوتے ہیں۔

استقراری و اصلی نظائر ۔ بقول ہالینڈ قانون کے اس ماخذ کی ماہیت کے متعلق
دو نظریے ہیں ایک تو یہہ کہ جج نظایر یعنے فیصلوں کے ذریعہ سے نیا قانون نہیں بناتے ہیں بلکہ
وہ صرف موجودہ قانون کی تشریح وضاحت تعین۔ اعلان اور استقرار کرتے ہیں ۔یہہ قدیم انگریزی
نظریہ ہے ۔ بلاکسٹن کی یہہ رائے تھی اور ججوں میں لارڈ ہیل اور لارڈ ایشر سے لیکر حال حال کے
جج مثلاً لارڈ جسٹس اسکرٹن بھی یہی کہتے آئے ہیں۔ اور سامنڈ اس نظریہ کو نظائر کے متعلق استقراری
نظریہ کہتے ہیں۔ اس نظریہ کی بنتھم نے ہنسی اڑائی ہے وہ کہتے ہیں کہ عملاً جج قانون بناتے
ہیں لیکن تو بھی ہیں۔ اور اصولاً انہیں قانون نہیں بنانا چاہیئے ۔ بلکہ موجودہ قوانین کی تعبیر و اطلاق تک
اپنے فرائیض کو محدود رکھنا چاہیئے ۔ آسٹن بھی بنتھم سے اس امر میں متفق ہیں کہ جج بہت کچھہ قانون
سازی کرتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ کو اس اصول پر جائز رکھنا چاہیئے کہ وہ مقتدر اعلی کے نائبوں کی
حیثیت سے قانون سازی کرتے ہیں ۔ اور صحیح بات یہی ہے کہ جج قانون بناتے ہیں کیونکہ ان کے
روبرو ایسے بھی نئے حالات آتے ہیں ۔جن کے تصفیہ کے لئے پہلے سے کوئی قانون نہیں ہوتا ۔
ان امور کا فیصلہ کرنے سے جج نیا قانون بناتے ہیں ۔ اور یہی نہیں بلکہ موجودہ قوانین کو بھی جج ایک
حد تک متغیر الحال معاشری ضرورتوں کے مطابق رکھنے اور نصفتانہ اصول پر عمل کرنے کے لئے
اپنی تعبیر کے ذریعہ سے بدل دیتے ہیں ۔غرض بقول سامنڈ عدالت چانسری میں یا اب اسی عدالت
کے اختیارات جو ججوں کو حاصل ہیں۔ ان کا لحاظ کرتے ہوئے ۔ نظریہ استقرار کی غلطی توبین اور بدیہی
ثابت ہوتی ہے کیونکہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایکوئٹی یا نصفت کے اصول موجودہ قانون یعنے رواج
یا قانون موضوعہ پر مبنی ہوتے ہیں یہہ اصول تو یکے بعد دیگرے جو چانسلر مقرر ہوتے تھے ان کے
عدالتی فیصلوں یعنے نظائر ہی سے وضع ہوتے تھے اس طرح پر ظاہر ہے کہ نظایر یا تو استقراری
(Declaratory) ہوتے ہیں یا اصلی (Original) استقراری نظیر میں کسی موجودہ قانون
کو اطلاق دیا جاتا ہے اور اصلی نظیر میں کوئی نیا قانون وضع ہوتا ہے ۔
لیکن جج جو قانون بناتے ہیں ۔جیسا کہ آلن نے اپنی کتاب کے صفحات ۶۰ تا ۷۷ میں بتایا ہے

ایک ثانوی معنی ہی میں بتاتے ہیں۔ ان کا اہم کام تعبیر قانون ہے۔ وہ تعبیر کرتے ہوئے نیا قانون ان صورتوں کے لئے بناتے ہیں جو قانون کے عام الفاظ کے تحت نہیں آتی ہیں۔ یا جن پر اب تک کوئی قانون نہیں ہوتا ہے مثلاً کسی قانون میں لفظ مویشی (Cattle) استعمال ہوا ہو۔ تو پہلی دفعہ یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کیا گھوڑا بھی اس میں داخل ہے۔ ججوں کی تعبیر سے گھوڑا بھی اس میں داخل ہوسکتا ہے اور اس حد تک فیصلہ کے بعد یہ نیا قانون ہوجاتا ہے۔ یا یہ کہ سنہ ۱۹۲۰ء تک یہ سوال عدالت میں نہیں آیا تھا کہ آیا کوئی شخص اپنی بلی کے ہمسایہ کے کبوتر کھا جانے پر ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے [۵] نہ ۱۹۲۶ء تک یہ سوال کہ آیا آپ کے کمپونڈ کا درخت شاہراہ پر بغیر آپ کی کسی غفلت کے گرے اور ایک راستہ چلنے والے کو ضرر پہونچائے تو کیا آپ ذمہ دار ٹھہرائے جاسکتے ہیں [۶]۔

ایسی صورتوں میں عدالتیں اپنی قرار دادوں سے قانون بناتی ہیں۔ لیکن ملحوظ رکھیے کہ وہ ان امور میں بھی جو تصفیہ کرتی ہیں وہ گو عقل سے کرتی ہیں۔ لیکن بقول لارڈ کک یہ عقل راستہ والے کی عقل نہیں ہوتی۔ بلکہ قانونی ماہروں کی عقل ہوتی ہے جو دوسرے اصول ہائے قانون اور انصاف سے مزین ہوتی ہے۔ جج کی پوری کوشش قانون کی دریافت پر منحصر ہوتی ہے۔ قانون کے بنانے پر نہیں۔ اسی لئے وہ ماضی اور حال کے مواد ہی سے کام کرتا ہے۔ برخلاف اس کے مقننہ بالکل نئے مواد سے کام کرتی ہے۔ کوئی جج بحیثیت جج کے مثلاً متضرر مزدوروں کے معاوضہ کے دلانے سے متعلق قانون نہیں بناسکتا۔ نہ قوم کی صحت کے لئے بیمہ کے قواعد وضع کرسکتا ہے نہ حق رائے دہی دے سکتا یا موسم گرما کا وقت مقرر کرسکتا ہے۔ وغیرہ۔ مقننہ یہ سب کچھ کرسکتی ہے۔ اس طرح پر جج موجودہ مواد سے کام لیتے ہیں۔ فی الجملہ اسی کے اندر رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف مقننہ بالکل ہی نئے مواد سے کام لیتی ہے۔ وہ قانون سازی کرتی ہے اور جج قانون کی تعبیر کرتے ہیں۔

مقننہ اور ججوں کے قانون سازی کے دائروں پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ یہ بالکل علحدہ

[۵] ارٹ بنام ہاکی مان سنہ ۱۹۱۱ء ۳ کنگس بنچ (۵۷۴)

[۶] نوبل بنام ہریمان سنہ ۱۹۲۶ء ۹ کنگس بنچ (۳۳۲)

علیحدہ ہوتے ہیں قانون کے اس حصہ میں جو فرد کے فرد سے تعلقات پر مبنی ہے یعنے قانون خاص کے دائرہ میں مقننہ بہت کم دخل دیتی ہے اور دخل دیتی بھی ہے تو ججوں کے بنائے ہوئے اصولوں کو ملحوظ رکھہ کے۔ مثلاً اس کی توقع کم ہے کہ مقننہ یہہ قانون بنائے کہ معاہدہ کے لئے بدل ضروری نہیں ہوگا یا یہ کہ ملزم کو جب تک کہ وہ مجرم نہ قرار پائے معصوم نہ تصور کیا جائے۔ یا یہہ کہ مداخلت بیجا صرف ارادہ کے ثبوت کے بعد ہی ضرر تصور کیا جائے۔ یا یہہ کہ توہین زبانی بنفسہ قابل نالش ہوگی۔ مقننہ زیادہ تر فرد اور مملکت کے درمیانی معاملات یعنے قانون عام کے دائرہ میں قانون سازی کرتی ہے اور فرد اور فرد کے تعلقات کے دائرہ کو ججوں کے لئے بالعموم چھوڑ دیتی ہے۔

نظائر تعمیری ہوتے ہیں تنسیخی نہیں ۔ ابھی ہم اس نظریہ کی غلطی دیکھہ چکے ہیں۔ کہ تمام نظائر استقراری ہوتے ہیں یعنے موجودہ قانون کا استقرار وضاحت تعین اور اعلان کرتے ہیں اور ہم نے دیکھا ہے کہ نظائر قانون بناتے بھی ہیں۔ نظائر کے ذریعہ سے قانون سازی کے متعلق ملحوظ رکھئے کہ ان کے ذریعہ سے نیا قانون ضرور بنتا ہے لیکن نظائر میں یہہ قوت نہیں ہوتی کہ وہ موجودہ قانون کو بدل کر یا منسوخ کرکے اس کے بجائے کوئی نیا قانون وضع کریں۔ یعنے نظائر ان امور پر قانون بناتے ہیں جن پر کوئی قانون نہ ہو۔ لیکن اگر کسی امر پر قانون موجود ہو تو وہ اس کو منسوخ کرکے نیا قانون اوس کی بجائے نہیں بنا سکتے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ نظائر کے ذریعہ سے قانون سازی یا خود نظائر تعمیری ہوتے ہیں تنسیخی نہیں ہوتے۔ لیکن اس اصول کے متعلق دو امور ملحوظ رکھیئے

(۱) جب کوئی عدالت بالادست کسی ماتحت عدالت کی نظیر پر عمل نہیں کرتی یا اس کو برقرار نہیں رکھتی ہے تو اس کا فعل عملاً منسوخی کے برابر ہے لیکن قانوناً نہیں کیونکہ کسی نظیر کو برقرار نہ رکھنے کے معنے یہہ ہیں کہ قرار یہہ دیا جاتا ہے کہ وہ کبھی قانون تھی ہی نہیں اس لئے برقرار نہ رکھنے والی نظیر کا اثر استقراری ہوتا ہے اور تاریخ فیصلہ سے نہیں بلکہ اس سے پہلے سے نافذ ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے کوئی قانون موضوعہ جب کبھی وہ منسوخ ہوتا ہے۔ تو منسوخ کرنے والے قانون موضوعہ کا اثر تاریخ تنسیخ سے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے نہیں ہوتا کیونکہ سمجھا جاتا ہے کہ منسوخ شدہ قانون موضوعہ تاریخ تنسیخ تک قانون تھا۔ اور

تاریخ تنسیخ کے بعد بھی ان معاملات پر جو تاریخ تنسیخ سے پہلے کئے جائیں قابل اطلاق ہوتا ہے۔

(۲) نیز گو یہہ صحیح ہے کہ جب کوئی قانون موجود ہو تو ججوں کو اسی کو اطلاق دینا چاہیئے اس کو بدلنا نہیں چاہیئے۔ مگر فرض کیجیئے کہ بے خبری، نادانستگی یا عمداً بھی اگر جج کسی موجودہ قانون کو بدل کر نظایر کے ذریعہ سے کوئی نیا قانون وضع کر دے تو بمضمون اصول کہ "وہ جس امر کو نہیں کیا جانا چاہیئے تھا لیکن وہ کیا جائے تو کئے جانے کے بعد وہ صحیح ہو جاتا ہے"[۱] یہہ قانون یا نظیر درست قانون ہوتی ہے مثلاً دارالامراء اگر کوئی غلط قانون بنا دے تو اس کے واجب التعمیل ہونے میں شبہہ کی گنجایش نہیں۔

وقعت نظایر:۔ نظایر کی وقعت کے متعلق بھی دو نظریے ہیں۔ یوروپ میں نظایر گو مفید سمجھی لیکن عدالتوں پر قابل پابندی نہیں ہوتے ہیں۔ وہاں اصول یہہ ہے کہ عدالتوں کا اسی لئے ہر درجہ کی عدالتوں کا فریضہ یہ ہے کہ انصاف کرے۔ اسی لئے ان کو انصاف کرنے کے لئے آزاد رہنا چاہیئے۔ یوروپ کے ممالک کو یہہ نظریہ قانون روما سے ورثتاً ملا ہے۔ جہاں جسٹن کے ایک فرمان کے رو سے بالآخر نظایر واجب التعمیل نہیں رہے۔ پرشیا اور اسٹریا کے مجموعہ ہائے قوانین میں نظایر کے عدالتوں پر واجب التعمیل نہ ہونے کا صریحی حکم موجود ہے۔ فرانس، اطالیہ اور بلجیم کے مجموعہ ہائے قوانین میں گو صریحی حکم موجود نہیں لیکن عمل یہی ہے کہ عدالتوں کے لئے نظایر مفید اور سبق آموز ہیں لیکن قابل پابندی اور واجب التعمیل نہیں۔ اس کے برخلاف انگریزی اور امریکی قانون کا اصول ہے کہ ان ممالک کے نظایر ان ممالک کی عدالتوں پر قابل پابندی اور واجب التعمیل ہیں۔ انگریزی قانون میں اس اصول پر ۱۸۳۳ء یا ۱۸۴۲ء سے عمل ہے۔ اگر کسی امر پر کوئی صاف نظیر موجود ہو تو چاہے وہ جج اس کو پسند کریں یا نہ کریں اس پر عمل کرنا ان کے لئے ضروری ہے اس تاریخ سے قبل انگریزی قانون میں بھی گو نظایر کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا لیکن وہ واجب التعمیل نہیں تھے اور اصول یہہ تھا کہ ججوں کو جو صحیح اصول قانون ہو اسی پر عمل کرنا چاہیئے۔ اس تاریخ کے بعد سے نہ صرف انگریزی نظایر انگریزی عدالتوں پر واجب التعمیل ہیں بلکہ کافی وضاحت کے ساتھ عدالتوں کی تعیم کر دی گئی ہے چنانچہ دارالامراء کے فیصلے انگلستان کی تمام دوسری عدالتوں پر اور خود دارالامراء پر واجب التعمیل ہیں اور گو دارالامراء کا کوئی فیصلہ غلط بھی ہو ...۔

[۱] Quod fieri non debit factum Valet ...

تب بھی اصولاً دارالامراء کو اسکی پابندی لازمی ہے۔ کیونکہ بقول ایک فاضل جج[1] کے قانون کا معین ہونا اس سے کہیں بہتر ہے کہ جج اس کی اصلاح کریں۔" غلط قانون پر عمل کرنا اتنا مضر نہیں جتنا کہ قانون کا غیر معین ہونا۔" اور قانون کی غلطی کی اصلاح پارلیمنٹ کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ عملاً دارالامراء نے بعض صورتوں میں اپنے فیصلوں کی پابندی نہیں کی ہے۔ کیونکہ اصول یہ ہے کہ صرف بنا رفیصلہ قابل پابندی ہے اور کسی ایک مقدمہ کے بنا رفیصلہ کو معین کرنے میں انھوں نے بہت ہوشیاری دکھائی ہے۔ پریوی کونسل کے فیصلہ اصولاً انگریزی عدالتوں پر واجب التعمیل نہیں ہیں لیکن عملاً ان پر اکثر صورتوں میں عمل کیا جاتا ہے۔ عدالت مرافعہ کے فیصلے تمام ماتحت عدالتوں پر واجب التعمیل ہیں۔ اور رجحان یہ ہے کہ خود اس کے فیصلے اس پر واجب التعمیل ہوں۔ عدالت مرافعہ کے اجلاس کاملہ کے فیصلے تو غیر کاملہ اجلاس پر قابل پابندی ہیں۔

انگریزی اور امریکی نظام قانون کے متعلق جہاں نظایر واجب التعمیل ہیں اور اس پر اچھی طرح عمل کرنے کے لئے عدالتوں میں فرق مراتب ہیں۔ حسب ذیل اصول قابل لحاظ ہیں۔

(۱) فیصلہ چاہئے عدالت بالادست کا ہو یا عدالت ماتحت کا اگر متعلق ہو تو احتیاط سے غور کئے جانے کے قابل ہے۔

(۲) عدالت بالادست کا فیصلہ واجب التعمیل ہے۔ لیکن صرف بنا و فیصلہ (ratio decidendi) کی حد تک اور (Obiter dicta) اقوال عدالتی یعنی بنا فیصلہ سے غیر متعلق باتیں جو فیصلہ میں عدالتیں کہتی ہیں۔ واجب التعمیل نہیں ہیں۔ اس اصول کی وجہ سے نظایر کی پابندی سمجھ کر کی جاتی ہے۔ کیونکہ کسی نظیر کا بنا رفیصلہ کیا ہے اس کا تصفیہ خود جج کرتے ہیں اور اگر کوئی نظیر مقدمہ مابعد پر بالکل چسپاں نہ ہو تو عدالتیں بنا فیصلہ کا فرق کر کے اس پر عمل نہیں کرتے ہیں۔ اس طرح یہ بالکل کا یہ کہنا پوری حد تک صحیح نہیں ہے کہ یہ نظام اتنی ہی میکانکی یکسانیت کے ساتھ عمل کرتا ہے۔ جتنی کہ قوانین قدرت میں پائی جاتی ہے۔ خصوصاً قانون ٹارٹ میں نظایر کے بنا فیصلوں کے تعین ہی

[1] لارڈ ایلڈن۔ بمقدمہ گلاسٹر بنام شرٹن۔

بہت سے فرق کئے گئے ہیں مثلاً بارہ تیرہ سال قبل چیف جسٹس ہیورٹ نے ایک مقدمہ میں کہا۔ کہ امدادی غفلت کے نظائر کی بنا فیصلہ یہ رہی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ غلطی کس کی تھی Who was to blame لیکن کورٹ آف اپیل نے اس کو ماننے سے انکار کیا ہے۔

(۳) تمادی کی وجہ سے نظیر کی وقعت کم ہونا ضروری نہیں بلکہ اس میں اضافہ ہوسکتا ہے سوائے اس کے کہ اس کے فیصل ہونے کے بعد سے قانون میں تبدیلی ہوئی ہو۔

(۴) اس کے برخلاف یہ امر مسلمہ ہے کہ قانون معاشری حالات کی تبدیلی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور اسی لئے بہت ہی قدیم نظائر عصر جدید کے حالات میں قابل اطلاق نہیں رہتے۔ اسی لئے ان کا حوالہ کم دیا جاتا ہے۔ نظائر کی تشبیہ مثل جج کے شراب سے دیجاتی ہے۔ یہ امتداد زمانہ سے اچھے ہوتے جاتے ہیں یعنے ایک حد تک جس کے بعد ان میں "وہ بات نہیں رہتی"[a] بیکن نے کہا ہے کہ بہترین نظائر وہ ہیں جو نہ بہت قدیم ہوں نہ جدید۔

(۵) نظائر کی رپورٹس کے متعلق کوئی باضابطہ اصول نہیں ہیں۔ انگریزی عدالتیں ہر قابل اعتبار رپورٹ پر عمل کرتی ہیں۔ اخباروں سے بھی نظائر عدالتوں میں پیش کئے گئے ہیں۔ اگر رپورٹس کی روایت میں شک ہو تو آخری صورت میں عدالت کے سجلات (ریکارڈس) دیکھے جاتے ہیں۔

اس طرح بر ضمن (۱) کے تعلق سے نظائر کی دو اقسام ہوئیں یعنے یا تو وہ واجب التعمیل (authouritative) ہوتے ہیں۔ یا ترغیبی (Presuasive) سامنڈ میں ان کے متعلق تھوڑی مزید تفصیل ہے۔ انگریزی قانون میں ترغیبی نظائر میں بیرونی ممالک کے فیصلے خصوصاً امریکی فیصلے، سلطنت برطانیہ کے دوسرے حصوں مثلاً آیرستان کی اعلیٰ عدالتوں کے فیصلے، پریوی کونسل کے فیصلے اور انگریزی فیصلوں کے اقوال عدالتی شامل سمجھے جاتے ہیں۔ واجب التعمیل نظائر کی پھر دو قسمیں ہیں۔

(۱) جو قطعی طور پر واجب التعمیل ہیں اور (۲) جو مشروط طور پر۔ پہلے میں انگریزی ہر عدالت بالا د

[a] "Precedents may be compared to wine which improves with age; up to a certain point, and then begins to go off."

کے فیصلے ہر انگریزی ماتحت عدالت پر اور دارالامراء کے فیصلے خود ان پر قطعی طور پر واجب التعمیل ہیں اور ہر
عدالت ماتحت کے فیصلے ہر عدالت بالادست میں و نیز ہر عدالت کے فیصلے اسی کو مساوی درجہ کی
عدالت میں مشروط طور پر واجب التعمیل ہیں یعنے بالادست عدالت یا مساوی درجہ کی عدالت ماتحت یا
مساوی درجہ کی عدالت کے فیصلہ پر بالعموم عمل کرے گی۔ لیکن اگر یہ صاف طور پر خلاف قانون یا صاف
طور پر خلاف عقل ہو تو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ یہ یا تو برقرار نہیں رکھا جائے گا یا اس پر عمل کرنے
سے انکار کیا جائے گا۔ دونوں صورتوں میں برقرار نہ رکھنے یا پابندی کرنے سے انکار کرتے ہوئے
ان عدالتوں کو یہ اصول بھی ملحوظ رکھنا لازمی ہے کہ یعنے غلط فیصلہ کافی عرصہ تک شائع ہو چکا ہو تو اس کو
قانون کی وقعت حاصل ہو جاتی ہے[1] کیونکہ قانون کا معین ہونا اس کے صحیح ہونے سے زیادہ اہم ہے۔
ملحوظ رہے کہ آلن اپنی کتاب کے صفحات ۱۵۰ تا ۱۵۹ میں سامنڈ کی متذکرہ صدر تقسیم پر کہ نظائر
یا تو واجب التعمیل ہیں یا ترغیبی تنقید کرتے ہوئے یہ بتلاتے ہیں کہ ان میں فرق دراصل درجہ کا ہے نوع
کا نہیں ہے۔ وہ سر جارج جسل کے الفاظ میں کہتے ہیں کہ نظائر کا اصل فائدہ کسی اصول کا قرار دینا ہے
جس پر کسی بعد کے مقدمہ میں عمل کیا جا سکے۔ و نیز یہ کہ یہ اصول صحیح ہونا یعنے صحیح قانون کا حامل ہونا چاہیے
ایسے اصول کے قرار دینے میں عدالتیں ہر ممکن ذرائع سے مدد لیتی ہیں۔ ملک غیر کے مصنفوں سے بھی۔
اور قانون کے بعض حصوں میں ملک غیر کے فیصلوں سے بھی۔ چنانچہ پوتھیلے کی تصانیف سے دارالامرا
تک نے بھی مدد لی ہے۔ اور اس مصنف کا ذکر بلاک برن جیسے عظیم الشان جج نے تعظیم سے کیا ہے
اور متعدد مقدمات میں سے اگر صرف ہداتی مقدمہ کاگز بنام برنارڈ ہی کو دیکھا جائے تو ڈرائیجسٹ سے
استفادہ کا حال ظاہر ہو جائے گا۔ قانونی اصولوں کی ترقی میں جج اور فقہا کے اثر کو رواج کی بحث میں
کچھ ظاہر کیا گیا ہے۔ نظائر پر غور کرنے سے یہ اثر کم نمایاں نظر آئے گا۔ عصر جدید میں خاص قانون
بین الاقوام سے نظائر زیادہ تر فقہا کی تصانیف ہی سے بنے ہیں۔ اور اس میں دوسرے ممالک کے فقہا
اور عدالتی فیصلوں کا بھی کافی حصہ رہا ہے۔ اسی طرح قانون ارضی (Real Property)

[1] "Communnunis error facit Jus" ۔ سنہ ۱۸۰۳ء لارڈ بریڈ برینڈر یورپس جلد ۲ صفحہ (۳۰۹)

سا بڑا اور اہم حصہ ان فقہا کے عمل پر مبنی) ہے جو فن انتقال جائداد میں مہارت رکھتے تھے اور یہی حال قانون امارت بحریہ (Admiralty Law) کا ہے جس کے متعلق لارڈ ایکن مقدمہ Susque-hanna 1905 P. 199) میں کہتے ہیں کہ اس قانون کا ابھی عملی طور پر بیان باقی ہے جو کسی اچھی کتاب کے لکھے جانے پر پورا ہو گا یہ بات یہ ہوئی کہ انگریزی قانون میں جہاں کوئی مجموعہ قانون نہیں ہے۔ جج خاص سے عام تک جاتے ہیں یعنی واقعات سے اصول قرار دیتے ہیں۔ اس لئے جیسا کہ جیل نے کہا ہے۔ نظائر کا سارا مقصد اصولوں کا قرار دینا ہی ہوتا ہے۔ اور ان اصولوں کے قرار دینے میں وہ تمام ممکن ذرائع سے اگر وہ متعلق ہوں مدد لیتے ہیں۔ ملک غیر کے قوانین کے اصولوں اور مصنفوں سے بھی مدد لی جاتی ہے اور عقل سلیم۔ اخلاقیات اور معاشری افادیت اور مصلحت عامہ کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاتا ہے۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ جو اصول وضع ہو وہ معقول و منطقی۔ قائل کر دینے والا اور قانون کے دوسرے اصولوں سے متوافق اور صحیح قانون کا حامل ہو۔

وجوب نظائر کے وجوہات ۔ نظائر کا عمل اس پر موقوف ہے کہ قانون قیاس کرتا ہے کہ عدالتی فیصلے صحیح ہوتے ہیں۔ اور چونکہ وہ سوچ سمجھ کر اہم موقع پر دیے جاتے ہیں وہ غالباً صحیح بھی ہوتے ہیں۔ لیکن بالفرض اگر وہ صحیح نہ ہوں تب بھی قانون امور فیصل شدہ کی دوبارہ سماعت نہیں کرتا کیونکہ اصول یہ ہے کہ خلایق کا فائدہ اس میں ہے کہ نالشات کی کم ہو۔ ان ہی اصولوں پر عمل کرنے سے قانون نظائر یا فیصلہ جات عدالت میں یکسانیت حاصل ہوتی ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ آیندہ کے لئے ججوں کی خود اختیاری رائیں خارج ہو جاتی ہیں اور یہی سوالات اگر آیندہ پیش آتے ہیں تو ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کا جواب ان ہی فیصلہ جات کے مطابق دیا جائے۔ پس سوالات جو آیندہ پیش آئیں گے یا تو سوالات قانونی ہوں گے یا واقعاتی یعنی یا تو ایسے ہوں گے جن کے متعلق پہلے سے کوئی اصول قانون موجود ہے یا ایسے کہ ان کے متعلق پہلے سے کوئی اصول قانون موجود نہیں ہے۔ پہلی صورت میں قانون کے موجودہ اصول کا اطلاق دیا جائے گا اور جس فیصلہ میں یہ اطلاق دیا جائے گا وہ فیصلہ یا نظیر استقراری ہوگی اور اسکی دوسری صورت میں نئی سوال واقعاتی کی صورت میں عدالتیں نیا قانون وضع کریں گی۔ اور یہ نظیر اصلی ہوگی۔ اور یہ سوال

واقعاتی آیندہ کے لئے سوال قانونی ہوجائے گا مثلاً جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی قانون
موضوعہ میں "مویشی" کا مبہم لفظ استعمال کیا گیا ہو اور پہلی دفعہ یہ سوال پیش ہو کہ آیا اس میں گھوڑے بھی شامل
ہیں یا نہیں تو عدالتیں اس سوال واقعاتی کا جواب ہاں یا نہیں میں دینے میں کسی قانون کے پابند نہیں ہیں۔
فرض کیجئے کہ انھوں نے فہم سلیم اور تعبیری مہارت سے کام لے کر ایک فیصلہ ہاں یا نہیں میں کر دیا
تو آیندہ جب کبھی یہ سوال پیدا ہوگا اس کا جواب اسی طرح دینا ہوگا اور یہ سوال سوال قانونی تصور کیا جائے گا۔
اس طرح پر قانون نظایر کی ترقی سے ججوں کی خود اختیاری رائیں محدود ہوتی جاتی ہیں۔ جج اپنے پاؤں
کے لئے خود آپ زنجیریں وضع کرتے جاتے ہیں۔

ملحوظ رہے کہ عدالتوں میں جو سوال پیش ہوتے ہیں وہ تمام ایسے نہیں ہوتے ہیں کہ ان کا جواب
کسی اصول کی بنا پر دیا جاسکے۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا جواب صرف خاص موقع اسی مقدمہ
تک محدود ہوتا ہے اور بعض ایسے کہ ان کے جواب سے عام اصول قائم ہوسکتا ہے۔ مثلاً کسی مقدمہ
میں سوال ہوسکتا ہے کہ آیا مدعی علیہ نے کوئی حملہ کیا یا نہیں اس کے تصفیہ سے کوئی عام اصول وضع
نہیں ہوسکتا۔ اور وہ لازماً ہمیشہ سوال واقعاتی ہی رہتا ہے۔ برخلاف اس کے عدالت میں یہ بھی
سوال ہوسکتا ہے کہ آیا مدعی علیہ نے جو حملہ کیا وہ قریب یا غفلت کی حد تک پہنچتا ہے۔ اس کے جواب
میں بالکل ممکن ہے کہ کوئی اصول قانون وضع کیا جاسکے۔ اور جو اصول وضع ہوگا وہ اصلی نظیر کے ذریعے
آیندہ کے لئے سوال قانونی سمجھا جائے گا۔ اس طرح پڑھا ہو کہ نظیر سے مراد ایسا عدالتی فیصلہ ہوتا ہے
جو کسی اصول پر مبنی ہو۔ نظیر کے اسی اصول کو بنار فیصلہ کہتے ہیں۔ اور فریقین مقدمہ کے علاوہ سارے
دوسرے اشخاص کے لئے اسی کو قانونی وقعت حاصل ہوتی ہے۔

یہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ تمام سوال واقعاتی کا تصفیہ جیوری اور تمام سوالات قانونی کا فیصلہ
جج کرتا ہے لیکن ہم دیکھ چکے ہیں۔ اصلی نظایر ایسے سوالات واقعاتی کے جواب ہوتے ہیں جن کی
وجہ سے یہ سوالات واقعاتی آیندہ کے لئے سوالات قانونی بنا دیئے جاتے ہیں تو کیا اصلی نظایر کے وضع
کرنے والے جج اور جیوری دونوں ہوتے ہیں۔ لیکن جیوری کوئی نظیر وضع نہیں کرسکتی۔ اس لئے واقعہ

یہہ ہے کہ گو سارے سوالات قانونی کا فیصلہ جج کرتے ہیں لیکن سارے سوالات واقعاتی کا فیصلہ جیوری نہیں کرتی
جج جیوری کو ایسے سوالات اتفاقی کا فیصلہ کرنے نہیں دیتے ان پر یہہ سوالات نہیں چھوڑتے ہیں کے فیصلہ سے وہ کسی اصول کو وضع کر سکتے ہیں۔ اور
اسی لئے جیوری کا صرف ایسے سوالات واقعاتی کا فیصلہ کرتی ہے جن کا جواب خاص موقع یا ایک ہی
مقدمہ تک محدود رہتا ہے اور ان کے جواب سے کوئی عام اصول وضع نہیں ہوتا۔

اب ہمیں نظایر کے مذکورۂ بالا انگریزی نظام کے حسن و قبح کو جانچنا چاہیئے۔ اس پر (۱) ایک
اعتراض تو یہہ ہے کہ یہہ نظام بے ترتیبی سے بغیر کسی سائنٹفک اصول کے ترقی کرتا ہے۔ اس کی
ترقی مقدمہ بازی کے اتفاق پر موقوف ہوتی ہے یہہ اعتراض صحیح ہے۔ خصوصاً آج کل جبکہ بہت سے
امور کے متعلق فیصلے درکار ہیں لیکن یہہ امور عدالتوں تک اخراجات کی وجہ سے نہیں جا سکتے۔

(۲) حجم بہت ہو جاتا ہے۔ اس اعتراض میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ انگریزی قانون کے لئے جو زیادہ تر
نظایر پر مشتمل ہے۔ انگریز اساتذہ کی رائے میں نظایر کی پانچ سو جلدیں کافی ہیں۔

(۳) عدالتوں میں متعلقہ نظایر کے پیش کئے جانے کا یقین نہیں۔ اور بے ضروری نظایر حد سے
زیادہ پیش کئے جاتے ہیں چنانچہ حال کے ایک مقدمہ میں اسکرٹن جسٹس نے جل کر کہا ہے کہ قابل کونسل نے
عدالت کو نظایر کے تحت دفنا دیا ہے۔ اور مقدمہ ۔ ان ری میں کسٹر ۱۹۲۸ء چانسری (۳۸۵)
میں رومر جسٹس نے قرار دیا ہے کہ ایک مقدمہ میں دارالامراء کے سامنے ایک بہت ہی متعلق نظیر پیش نہیں کی گئی۔

(۴) بنتھم کہتے ہیں کہ غلط فیصلے کے شائع ہو جانے پر اس کو قانون کی قوت دینے سے بہت کچھ
غلط قانون پر عمل ہوتا ہے لیکن نظایر کے محض نظایر ہونے کی وجہ سے واجب التعمیل ہونے کے نظریہ
کے باوجود غیر معقول اور سخت قانون کی مقدار بہت کم ہے۔ اس لئے آلن کہتے ہیں کہ اس اعتراض میں مبالغہ ہے۔
یہہ تو نظایر کے معایب ہوئے۔ اب بمصداق "عیب می جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو" ملحوظ رہے
کہ نظایر کے محاسن میں ذیل کی باتیں داخل ہیں۔

(۱) چونکہ انگریزی فیصلے مسلسل بیان کی شکل میں یعنی (Descriptive) ہوتے ہیں۔
قانون وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اس لئے انگریزی قانون میں قانونی اصولوں کو مسلسل ترقی

ہوتی ہے اور ایک اچھا مجموعہ اصولوں کا تیار ہو گیا ہے۔ مثلاً مقدمہ بورن بنام کیمن۔ میں دارالامراء نے ([illegible]) کے سینکڑوں سالہ قانون پر تبصرہ کیا نظائر میں درجہ بدرجہ ترقی اور تبدیلی کو دکھایا اور اس کے اکثر حصہ کو منسوخ کر دیا۔ اسی لئے فیصلے سبق آموز اور بلند معیار کے ہوتے ہیں۔

(۲) اس نظام میں ججوں کو بہت قابل ہونا پڑتا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ انگلستان میں مسلسل بہت قابل جج ہوئے ہیں۔ یہ نظام اچھے ججوں کو پیدا کرتا ہے اور اچھے جج اس نظام کو اور اچھا بناتے ہیں۔ قابلیت کا سکہ جمانے اور شہرت اور نیک نامی حاصل کرنے کے مواقع اس نظام میں بہت ہوتے ہیں۔ مثلاً لارڈ بلاکرن یا لارڈ ماکناٹن کی شہرت اور قابلیت کو دیکھئے۔ برعکس یورپ میں چونکہ فیصلے مسلسل بیان کی شکل میں نہیں ہوتے اور نہ نظائر واجب التعمیل ہوتے ہیں۔ یہ تمام امور ممکن نہیں ہیں۔

(۳) اس نظام میں جج بادشاہ کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا افسر لارڈ چانسلر بادشاہ کے ضمیر کا محافظ ہوتا ہے۔ ان امور سے عوام پر اور خود ججوں پر بہت مفید نفسیاتی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

(۴) نظائر کی جگہ صرف قانون موضوعہ ہی ہو سکتا ہے۔ قانون موضوعہ میں بڑی حد تک زور الفاظ پر دیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف نظائر میں زور الفاظ پر نہیں بلکہ واقعات پر دیا جاتا ہے کیونکہ واقعات ہی کی بنا پر ان کا وجود ہوتا ہے۔ قانون موضوعہ میں قانون چونکہ (عام الفاظ میں ہونے کی وجہ سے تمام واقعات پر حاوی نہیں ہوتا بلکہ بعض واقعات کی حد تک) واقعات کے پیش آنے کے قبل بنایا جاتا ہے۔ اس لئے (بعض وقت) بعض قانون موضوعہ کے نتائج بالکل امید کے خلاف ہوتے ہیں۔ مثلاً پالک کہتے ہیں۔ کہ (St. of Uses) کی پابندی اس حد تک نہیں کی گئی اور قانون انتقال جائداد کا ایک بڑا حصہ اس کے خلاف ورزی کے قواعد پر مشتمل ہے۔ اسی طرح قانون فریب (St. of Frand) سے فریب کا انسداد تو اتنا نہیں ہوا جتنا کہ فریب دہی کے زیادہ مواقع پیدا ہوئے۔ نظائر میں چونکہ واقعات کے لئے قانون بنایا جاتا ہے یہ امر ناممکن ہے قانون کی واقعات اور زمانہ کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ ترقی ممکن ہے۔ غرض انگریزی نظام کے اچھی طرح عمل کرنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اور بریوزڈ

میں بھی رجحان اسی کو اختیار کر لینے کا ہے۔

(ب) نصفت۔

نصفت ماخذ قانون ہے اور اس لئے ہے کہ اس کے ذریعہ قانون میں یکساں معلوم اور جبری قاعدہ عمل کی صورت اختیار کرتا ہے۔ قانون چونکہ لازمی طور پر عام اور کلیوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ اسی لئے چاہے کتنی ہی ہوشیاری سے قانون بنایا جائے بہت سی جزی صورتیں اس عام قاعدہ سے چھوٹ جاتی ہیں اور امور انسانی ایسے گوناگوں ہیں کہ وقتاً فوقتاً یہ جزی صورتیں تصفیہ کے لئے عدالت میں پیش ہوتی ہیں اب اگر قانون کے عام اور کلی قاعدہ پر عمل کیا جاتا ہے تو ان جزی صورتوں میں ناانصافی ہوتا ہے۔ ایسی ہی صورت حال کے لحاظ سے کہا گیا ہے کہ (Summum Jus) سے (Summum injuria) ہوتا ہے یعنے "قانون پر سختی سے عمل کرنے سے سخت ناانصافی ہوتی ہے" اور قانون کا اہم اور اصلی مقصد دادرسی اور عدل گستری فوت ہو جاتا ہے اسی لئے ہر نظام قانون میں عدالتوں کو ایسی صورتوں میں انصاف کرنے کا اختیار تمیزی دیا جاتا ہے اور دیا جانا چاہیئے۔ یونانی نظام قانون میں بھی اس کا لحاظ تھا۔ اور افلاطون کا قول ہے کہ قانون کے عام اصول یا کلیوں پر اگر خاص یا جزی حالات کے لحاظ بغیر عمل کیا جائے تو یہ کلیے مثل ایک "ضدی اور جاہل خود سر" کے ہو جاتے ہیں اور اسی لئے سمجھ کے ساتھ عدل گستری کے لئے نصفت کی ہر نظام قانون میں ضرورت ہے اور اسی لئے یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کہ "اگر قانون خود انصاف ہے جیساکہ اس کو ہونا چاہیئے تو انصاف کرنے کسی مزید درشرح یعنے نصفت کی کیا ضرورت ہے۔ اور قانون کے اقتدار اور اس کے انفرادی اشکال میں تخفیف کے درمیان توافق کیسے ممکن ہے"؟ کیونکہ نصفت کے ذریعہ سے خاص صورتوں میں جو انصاف کی ضرورت ہوتی ہے وہ قانون کی عمومیت کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہ انصاف قانون کی اسپرٹ ہی میں کیا جاتا ہے یعنے اسی طرح جس طرح قانون خود کرتا اگر یہ خاص یا جزی شکل بھی اس کے پیش نظر ہوتی۔ اسی لئے یہ بھی تو کہا جاتا ہے کہ نصفت قانون کے نقش قدم پر چلتی ہے

(Equity Follows the Law)

اس طرح پر نصفت قانون کے اصول کا وہ مجموعہ ہوا جو کسی ملک کی عدالتوں یا ایک خاص

عدالت نے قانون کے عام اصولوں کی جزئی اور استثنائی صورتوں میں انصاف کرنے کی کوشش سے وضع کیا ہے اسی لئے نصفت کے متعلق صحیح طور پر کہا گیا ہے کہ وہ اصل قانون کی تکمیل کرتا ہے (میین ، یا یہ کہ وہ متروح قانون پر ایک "شرح" (gloss) ہوتی ہے۔ (میٹ لانڈ ، ان مقولوں کا مطلب یہ ہے کہ عدالتوں کا فرض ہے کہ قانون پر عمل کریں۔ لیکن اگر اس پر سختی سے عمل کرنے سے ناانصافی ہوتی ہے تو جہاں تک ہوسکے قانون کی پابندی کرتے ہوئے قانون کے اصل مقصد پر عمل کرے یعنے یہ کہ انصاف کرے۔

انگریزی اور رومی نظام ہائے قانون کے نشو ونما میں نصفت کا بہت گہرا اثر ہے۔ چنانچہ قانون روما میں پریٹر نے نصفت کے اصولوں پر عمل کر کے قانون نصفت (Jus honorarium) کا ایک ایسا مجموعہ قانون تیار کر دیا جو اہمیت میں (Jus Civile) قانون ملک سے کم نہیں بلکہ بہت بڑھ کر تھا خصوصاً معاہدہ وصیت ، قبضہ وملکیت اور وراثت کے قانون میں پریٹر کے نصفتاً اصول پر بنائے ہوئے قوانین سے قانون روما میں لچک اور بدلتے ہوئے تمدن کے ضروریات کو پورا کرنے کا سامان مہیا ہوگیا۔ اسی طرح انگریزی قانون میں لارڈ چانسلر کی نصفت یا ایکویٹی سے قانون متعلق اراضی (Real property) قانون متعلق چارہ کار (Remedies) اور معاہدے اور ٹارٹس میں بیش بہا اضافے ہوئے اس طرح نصفت سے نہ صرف قانون ملک کی تنگی دور ہوئی بلکہ ایک حد تک نئے نئے اصول بھی تمدنی ضروریات کے لحاظ سے قانون ملک میں داخل ہوئے۔

انگریزی قانون میں نصفت کے اصولوں کا خلاصہ سر ٹامس مور (More) نے ذیل کی بیت میں کیا ہے۔ جن کو مع ان کی توضیحات کے ذیل میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے :۔

These three give place in Court of Conscience
Fraud accident and things of confidence

یعنے عدالت بالفاظ دیگر عدالت نصفت میں۔ فریب، اتفاق اور اعتمادی امور کا لحاظ کیا جاتا ہے۔

(۱) اعتمادی امور میں سب سے اہم امانتیں ہیں جو اب بھی چانسلری اختیار سماعت کا عظیم ترین جزو ہیں۔ اسی طرح حق انفکاک رہن اور ضامن اور اصل شخص کے درمیان جس کے لئے ضمانت دی جاتی ہے۔

ونیز شرکاء کے درمیان وجبیہ نصفتانہ وجوبات کا نفاذ۔ یا اوصیا اور مہتممان ترکہ پر سختی سے ضمیر کے مطابق عمل کرنے کی ایک جذبہ ذمہ داری کا نفاذ۔ اور اسی طرح اتلاف (Conversion) ملکیت مشترکہ۔ انتقال حقوق نالش (assignment of Chose of actions) اور اختیار تقرر بذریعہ وصیت (power of appointment) کے قانونی اصول سب اعتمادی امور کا لحاظ کرکے عدالت نصفت نے وضع کئے ہیں۔

(۲) فریب۔ اس میں ایسے خلاف ضمیر افعال آتے ہیں جو قانون عمومی کے فریب کے تحت نہیں آتے تھے مثلاً داب ناجائز۔

(۳) اتفاق غلطی کا نظریہ نصفت کے اسی اصول پر مبنی ہے اور اسی کے ضمیمہ بطور تصحیح اور تنسیخ دستاویزات کا نظریہ بھی۔

(۴) "صحیح منشا پر عمل" خصوصاً جبکہ منشا ناقص یا مبہم طریقہ پر ظاہر کیا گیا ہے۔ مثلاً وصیتوں اور تملیک ناموں کی تعبیر میں ان صورتوں میں الفاظ کے پیچھے حقیقی ارادہ اور منشا کو دریافت کیا جاتا اور اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ اسلامی فقہا نے بھی یہی جو اصول قرار دیا ہے کہ "العبرۃ فی العقود للمقاصد والمعانی لا للالفاظ والمبانی۔ یعنے معاملات میں اعتبار منشا کا ہے نہ کہ الفاظ یا تمہیدات کا وہ بھی اسی نصفتانہ اصول پر مبنی ہے۔

(۵) ولایت۔ یعنے ان لوگوں کی جو خاص حالات کی وجہ سے حفاظت کے محتاج ہوتے ہیں مثلاً نابالغ۔ منکوحہ عورتیں ملاح۔ مدیون۔ مجنون۔ غربا۔ یہاں اصول انتہائی انسانیت ہوتا ہے۔ اس کا ایک اور دائرہ علاوہ اوقاف کی حفاظت۔ کے منکوحہ عورتوں کی جائداد کو وہ بوسوں اور لاتوں " ("Kicks & kisses") سے بچاتا ہی رہا ہے۔ اور اسی کو ڈائسی نے انتہائی انسانیت کا اصول کہا ہے۔

(۶) چارہ کار۔ یعنے قانون عمومی کے چارہ کار کے علاوہ چارہ کار۔ ڈگری خاص۔ اعادۂ حالت سابق۔ سابق میں معائنہ دستاویزات۔ حکمنامہ جات امتناعی۔ حکمی اور امتناعی بھی۔ ان چارہ کاروں کے اضافہ سے

قانون عمومی میں ضروری اہم اور منصفانہ چارہ کاروں کا اضافہ ہوا۔

ان تمام شعبوں میں اختیار سماعت اس اصول پر مبنی تھا کہ چانسلر راست خاطی کی ضمیر سے مخاطب ہوتا ہے۔ اس لئے شخص کے ذریعہ سے عمل کرتا ہے۔ (Acts in personam) اور حکمنامۂ حاضری بہ تہدید قید (Sub-poena) کے ذریعہ سے خاطی کو طلب کیا جاتا تھا۔ بالفاظ دیگر اختیار سماعت بلا قید حدود اراضی ہوتا تھا۔

(۳) قانون سازی یا وضع قوانین۔

اس موضوع پر ہم پہلے (۱) قانون سازی کے معنے بیان کریں گے اور نظائر سے اس کا مقابلہ کریں گے۔ پھر اس کے بعد (۲) قانون سازی کے اقسام کی صراحت کریں گے پھر (۳) تعبیر قوانین کے اصول اور آخر میں (۴) مجموعہ قوانین کے متعلق مختصر طور پر بحث کریں گے۔

(۱) یوں تو وسیع تر معنوں میں قانون سازی (Legislation) سے مراد کسی نئے قانون کا کسی بھی طریقہ سے مثلاً بذریعہ نظیر یا منصفی اصول کے بنانے۔ یا مقتدر اعلیٰ کی ہر مرضی کے اظہار سے مثلاً کسی مملکت کے الحاق کے اعلان سے ہوتی ہے لیکن محدود اور صحیح معنی میں قانون سازی سے مراد کسی مقتدر اعلیٰ شخص یا جماعت کا اپنی مرضی اور ارادہ سے کسی نئے قانون کا بنانا ہوتا ہے۔

قانون بنانے کے طریقوں میں قانون سازی سب سے جدید اور سب سے اہم طریقہ ہے۔ آج کل رجحان یہ ہے کہ تمام قوانین قانون سازی ہی کے ذریعہ سے وضع کئے جائیں لیکن مملکت کی مضبوطی سے قیام سے پہلے ایسا نہیں تھا اس وقت مملکت کا کام قانون بنانا نہیں تھا بلکہ اطلاق دینا تھا۔ قانون رواج کے ذریعہ سے بنتے تھے۔ یا قانون کو الٰہی ماخذ سے منسوب کیا جاتا تھا۔ بادشاہوں کے ہاتھ میں قانون سازی کے اختیارات آنا اس امر کی دلیل ہے کہ سیاسی اور قانونی امور میں بہت کچھ ترقی ہوئی اور مملکت مضبوطی سے قائم ہو گئی۔ مغرب کے اساتذہ کی رائے ہے کہ جب تک قانون کو مذہب سے علٰحدہ نہ کیا گیا انسانی ضرورتوں کے مطابق قوانین کو بدلنے اور قانونی اصولوں کو ترقی دینے کی گنجائش کم رہی۔ اس طرح پر آج کل اکثر قوانین قانون سازی ہی کے ذریعہ سے بنائے جاتے ہیں تاہم ہمیں بھولنا نہیں چاہیئے کہ ملتی عمل

کے ذریعہ سے قانون سازی بھی جاری ہے اور اکثر جدید مملکتوں میں قانون سازی کا دائرۂ عمل زیادہ تر قانون عام یعنے فرد اور مملکت کے تعلقات کے دائرۂ عمل سے متعلق رہا ہے اور اصلی قانون یعنے قانون خاص کے اہم ابواب میں مثلاً جرائم افعال ناجائز وغیرہ کے متعلق اصول عدالتوں ہی میں طے ہو رہے ہیں اس واقعہ سے قانون کی ماہیت کی اس حقیقت پر روشنی پڑے گی کہ قانون دراصل کوئی ایک مقننہ رائج نہیں بناتا۔ بلکہ قانون چونکہ ایک نشو ونما اور ارتقاء ہے اس لئے اس کو عوام بناتے ہیں اور فقیہانہ اور عدالتی تعبیر کے ذریعہ سے اس کے اصول مستنبط اور منضبط اور مہذب ہوتے ہیں۔

قانون سازی اور قانون نظائر کا مقابلہ سبق آموز ہوگا۔ اور اس مقابلہ سے ظاہر ہوگا کہ قانون سازی کو قانون نظائر پر چند فوقیتیں حاصل ہیں۔ اور اس نقطۂ نظر سے قانون سازی کی پہلی خوبی اس کی تنسیخی قوت ہے۔ قانون سازی کے ذریعہ سے جس طرح نئے قوانین بنائے جاتے ہیں اسی طرح منسوخ بھی کئے جا سکتے ہیں۔ اس طرح بیکار اور انسانی ضرورتوں کے غیر موافق قوانین کو منسوخ کر کے قانونی اصولوں کو ترقی اور قانون میں اصلاح کی جا سکتی ہے ورنہ قوانین پتھر کی لکیر ہی رہتے۔ اور ان میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے نظائر کے متعلق تم دیکھ چکے ہیں کہ وہ تعمیری ہوتے ہیں تنسیخی نہیں ہوتے یعنے ان کے ذریعہ سے نیا قانون وضع ہو سکتا ہے لیکن موجودہ قانون منسوخ نہیں ہو سکتا کیونکہ جب کوئی قانون موجود ہوتا ہے عدالتوں کا فرض ہوجاتا ہے کہ اسی کو اطلاق دیں۔ (۲) قانون سازی کی دوسری خوبی یہ ہے اس میں تقسیم عمل کے مفید اصول پر عمل ہوتا ہے اگر مقننہ صرف قانون وضع کرے اور عدلیہ صرف اس کو اطلاق دے تو یہ امر فی الجملہ وضع قوانین اور اطلاق قوانین دونوں کے لئے مفید ہوتا ہے (۳) قانون موضوعہ کی تیسری خوبی یہ ہے کہ اطلاق سے پہلے قانون کا اعلان ہوجاتا جو عین انصاف ہے برخلاف اس کے قانون نظائر میں اطلاق سے پہلے قانون وضع نہیں ہوتا ہے بلکہ اطلاق دیتے وقت ہی قانون وضع ہوتا ہے وہ بعد از وقوعہ قانون سازی ہوتی ہے۔ جس کی بنتھم نے بڑی ہنسی اڑائی ہے۔ (۴) قانون موضوعہ میں وضع قوانین مقدموں کے پیش آنے کے اتفاق پر موقوف نہیں رہتی۔ اسی لئے قانونی اصولوں کی ترقی منتظم اور معین طریقہ پر ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے نظائر کے ذریعہ سے قانون سازی اس وقت تک نہیں ہو سکتی۔ جب تک مقدمہ پیش نہیں آتے۔ اسی لئے قانون سازی غیر منتظم اور غیر یقینی طریقہ پر ہوتی ہے۔ قانون موضوعہ کی آخری (۵) خوبی

یہہ کہ اس میں قانونی اصول اچھی شکل میں پیش کئے جاسکتے ہیں انہیں مجرد اصولوں میں بیان کیا جاسکتا ہے برخلاف اس کے نظائر میں قانونی اصول و واقعات کے انبار میں محفوظ ہوتے ہیں قانون موضوعہ اسی لئے مختصر صاف ہوتا ہے اور اس تک آسانی سے دسترس ہوجاتی ہے نظائر کے جب تک صفحوں کے صفحے نہ الٹیں قانونی اصول دستیاب نہیں ہوتے ۔ اسی لئے قانون موضوعہ کی مثال اگر زر نقد یا اشرفی کی ہے تو نظائر کی اس سونے کی جو کان میں ہوتا ہے اور اس کے چند ماشے سیروں مٹی میں ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن اس ظاہری خوبی سے قانون موضوعہ میں ایک بڑی معنے کی خرابی بھی ہے یعنے قانون موضوعہ میں زور الفاظ پر ہو جاتا ہے۔ ان کے معنے کا لحاظ نہیں رہتا ہے برخلاف اس کے نظائر میں سارا زور معنے پر ہوتا ہے الفاظ پر نہیں اسی وجہ سے برخلاف قانون موضوعہ کی تنگی اور سختی کے قانون نظائر لچک دار اور واقعات کے مطابق ہوتا ہے۔

(۲) قانون سازی یا وضع قوانین کی دو قسمیں ہیں ۔

(الف) **اعلیٰ قانون سازی یا وضع قوانین** ۔ جو مملکت کے مقتدر اعلیٰ شخص یا جماعت کا کام ہوتا ہے اور اسی وجہ سے مملکت کی کوئی دوسری قانون ساز جماعت اس کو منسوخ یا تبدیل نہیں کرسکتی مثلاً انگریزی شہنشاہی پارلیمان کی قانون سازی اعلیٰ قانون سازی ہے ۔

(ب) **ماتحت قانون سازی یا وضع قوانین** ۔ مملکت کے مقتدر اعلیٰ شخص یا جماعت کے سوا دوسری جماعتوں کا کام ہوتا ہے ۔ یہہ قانون سازی اپنے وجود صحت اور جواز کیلئے مقتدر اعلیٰ کی اجازت اور منظوری پر موقوف ہوتی ہے ۔ اور ان جماعتوں میں مملکت کی خود جماعت عاملہ و عدلیہ اور بلدیہ اور شخصیہ مثلاً جامعات اور ریلوے کمپنیاں داخل ہیں نیز انگلستان کی نو آبادیاں مثلاً کینیڈا یا اسٹریلیا کی مقننہ جات کی قانون سازی بھی ماتحت قانون سازی حال حال تک تھی ۔

ماتحت قانون سازی کا حصہ آجکل کی مملکتوں میں روز افزوں زیادہ ہوتا جارہا ہے ۔ جرمن اور فرانسیسی اساتذہ کے اس کے متعلق نظریوں کی وجہ سے آجکل اس موضوع پر بہت سی بحثیں پیدا ہوگئی ہیں خصوصاً (Leon Dugiut) کا نظریہ (Federal Syndicalism) قابل غور ہے ۔ اس نظریہ کی رو سے مملکت کے قانون سازی کے اجارہ پر اعتراض کیا جاتا ہے لیکن بہت سی بحث کے بعد آن نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے کیونکہ ایک مرکزی منضبط کرنیوالی قوت کا ہونا ضروری ہے لیکن ساتھ ہی فرد اور مملکت کے تعلقات میں نظر ثانی فرد کو زیادہ حقوق دیجیئے ماتحت قانون سازی کے دایرہ کو وسیع کیجئے کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ چونکہ قوانین موضوعہ میں زور الفاظ پر دیا جاتا ہے اسلئے برخلاف رواجی قانون نظائر کے قانون موضوعہ میں تعبیر کے یعنے منشاء مقننہ کے دریافت کرنیکی ضرورت ہوتی ہے۔

(۳) تعبیر قوانین کا پہلا اصول یہ ہے کہ قانون موضوعہ کے الفاظ کی تعبیر نحوی اور لفظی ہونی چاہیئے یعنے الفاظ کے نحوی معنے لینے چاہیئے اور الفاظ کے معنے لیتے وقت متن کا جن میں یہ الفاظ واقع ہوں لحاظ رکھنا چاہیئے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ اگر الفاظ کے معنے صاف ہیں تو پھر عدالتوں کو اس امر میں دخل دینے کی قطعاً ضرورت نہیں کہ مقننہ کا منشاء یہ ہو سکتا تھا۔ ظاہر نہیں لیا گیا نہ انہیں کسی ایک ایکٹ کی پارلیمانی یا شرعی تاریخ یا اسکے وضع ہوتے وقت کے ان حالات کا جن کا ذکر ایکٹ میں نہ ہو لحاظ کرنا چاہیئے لیکن اور تیسرا اصول ہے کہ عدالتوں کو کسی ایکٹ کی عام پالیسی کا لحاظ بھی کرنا چاہیئے اور اس کے لئے (ہیڈن) کے مقدمہ میں قرار دیا گیا ہے کہ انہیں دیکھنا چاہیئے کہ ایکٹ کے نفاذ کے وقت کامن لا کیا تھا۔ کامن لا میں کیا ترمیم کی گئی اس ترمیم کی نوعیت کیا تھی اور ترمیم کرنے کی وجہ کیا تھی تعبیر قوانین کا چوتھا اصول یہ ہے کہ جبکہ ایکٹ کے الفاظ سے مطلب صاف طور پر نہیں نکلتا ہو تو ایکٹ کے الفاظ کو قطعی تصور کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ مقننہ کے منشاء کو دوسری شہادتوں سے دریافت کیا جا سکتا ہے مثلاً الف جب ایکٹ کے الفاظ کے معنے ایسے خلاف عقل ہوں کہ بداہتہً مقننہ کا منشاء وہ نہیں ہو سکتا تھا جو اس کے ان الفاظ سے نکلتا ہو مثلاً کتابت کی کوئی صریحی غلطی یا کوئی غلط اشارہ (ب) جبکہ ایکٹ کے الفاظ کی غلطی منطقی طور پر ظاہر ہو یعنے جبکہ ان سے کوئی ٹھیک مسلسل کامل معنے ظاہر نہ ہوں مثلاً ابہام کی صورت میں یعنے جب کہ ایکٹ کے الفاظ سے دو یا دو سے زیادہ مطلب نکلتے ہوں یا ۲۔ تناقض کی شکل میں یعنے جبکہ ایکٹ کے مختلف حصے ایک دوسرے کے نقیض ہونے کی وجہ سے باہمی اہمیت کو گھٹاتے ہوں۔

(۴) مجموعہ قوانین (Codes) سے مراد تمام قانون کو جہاں تک ہو سکے قانون موضوعہ کی شکل میں بدلنا ہے۔ وضاحت اور سہولت مجموعہ قوانین کی بڑی خوبیاں ہیں اسی لئے آج کل اس طریقہ کو اہم سمجھنے کا عام رجحان ہے لیکن مختتم ہونا (Finality) اسکی خوبی نہیں اسلئے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس کے بعد نظائر کی ضرورت نہیں رہے گی مجموعہ قانون نپولین میں نئی ابن عدیم کے تنانوے اصولوں کے نوٹس پر ایک سطر ہے[1] لیکن نظائر کی متعدد موٹی موٹی جلدیں اس کی شرح پر تیار ہو گئی ہیں۔ فرانس، پرشیا، ہالینڈ وغیرہ ممالک کے تجربہ سے جہاں مجموعہ بنائے گئے تھے ظاہر ہے کہ ان کے بعد بھی تعبیر مجموں، وکلاء اور خود ترمیم کی ضرورت ہوتی گئی جسٹنین نے اپنے کوڈ کو آخری سمجھا تھا لیکن درحقیقت وہ پہلا نکلا کیونکہ پرشیا کا مجموعہ قانون بنایا گیا اور اب جرمنی میں ایک کمیشن کا تقرر ہوا ہے۔ جس نے ۱۳ جلدیں رپورٹ کی تیار کر لی ہیں غرض قانون نظائر اس وقت بھی نشو و نما پاتا رہیگا جبکہ تمام قوانین مجموعوں کی شکل میں آ جائیں گے کیونکہ بہترین مجموعوں میں بھی نازک نازک ابہام جلی یا خفی تناقض اقسام کے سہو پائے جائیں گے جن کو نظائر یعنے عدالتی عمل کے ذریعہ سلجھایا جائے گا۔

[1] انصرس [illegible] ال۔ (ضرر کے لئے چارہ کار ہوگا۔)

انسان کا انسان سے شکوہ

از جناب محمد امیر صاحب، بی، اے، بی، ٹی

دانائیاں ہی بن گئیں نادانیاں تری
اے کافرِ خرد! تری حکمت کو کیا ہوا

کیوں گر گیا ہے آج مقامِ بلند سے؟
اے نائبِ خدا! تری سطوت کو کیا ہوا

کیوں نشترِ ہوس کو رگِ جاں سے چھیڑ ہے؟
اے آدمِ شقی! تیری غیرت کو کیا ہوا

کیوں بجھ رہی ہے پھونک سے تیری یہ کائنات؟
ناداں! ترے فرضِ خلافت کو کیا ہوا

ذرّوں میں تیرے کچھ نہ رہا نورِ بندگی
اے خاک! تیرے عہدِ محبت کو کیا ہوا

آئینہ

از جناب صمد رضوی صاحب (ساز)

مرحبا مردہ زمین کے اے جوانِ ہمت غلام　　تجھ سے قایم ہے کہن سالی کا فرسودہ نظام

موت جیسی نیند کے آرام میں سویا ہوا　　کاروانِ زندگی کی گرد میں کھویا ہوا

بک چکی تیری نظر اور لٹ چکا تیرا خیال　　تجھ میں اپنا کچھ نہیں ہے اے شہیدِ مستِ حال

غور سے سن اقتضائے وقت کی آواز کو

دیکھ آنکھیں کھول کر انجام کو آغاز کو

ختم دورِ جبر و استبداد ہونا چاہیئے　　مفلسوں فاقہ زدوں کو شاد ہونا چاہیئے

جنتِ شداد کو برباد ہونا چاہیئے　　نعمتوں کو عام اور آزاد ہونا چاہیئے

ایک برتر زیست کی تعمیر کا ساماں کر

اس جہنم زار کی تخریب کا پیماں کر

توڑ دے اس عہد کا ہر ایک قصرِ زرنگار
عقل جس کا دیوتا اور مملکت پروردگار

جس کی ہر آواز حیوانی خباثت کی پکار
جس کی آزادی ہوسرانی کا زندہ شاہکار

جس کی فکر و کشمکش روٹی کے ٹکڑوں تک نثار
جس کی پیشانی سیاسی مکر و فن سے داغدار

جس نے سمجھا ہے شکم سیری کو معراجِ حیات
ساغر و مینا میں جس نے غرق کر دی کائنات

پست حیوانوں کی فطرت بخش دی انسان کو
دے کے قدرے خیر ارزاں کر دیا عصیان کو

عہدِ حاضر کے جوان، پروردۂ صد اضطراب
صرف نعروں سے نہیں ہوتا ہے کوئی انقلاب

سطح بیں نظریں، شرابِ حسن میں الجھی ہوئی
ذہنیت ذوقِ غلامی سے اُدھر سلجھی ہوئی

دیکھ!! تیری موت کا ساماں کرتی ہے تلاش
اے سگِ دنیا وہ اٹھی اب تری قدروں کی لاش

عہدِ حاضر جاں بلب ہے آپ اپنے جوش میں!!
ایک طوفاں پل رہا ہے وقت کی آغوش میں!!

تاریخی کاغذات کے ذخیرے

(۳)

نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ ثانی کے عنایت نامے

از محمد غوث ام اے، ال ال بی

کتب خانہ سعیدیہ کے ذخیرۂ کاغذات میں تین مکاتیب ایسے محفوظ ہیں جو نواب غازی الدین خاں، فیروز جنگ ثانی نے نواب محمد علیخاں والاجاہ، نواب کرناٹک کے نام ارسال فرمائے تھے۔ یہ تینوں مکاتیب شایع کئے جاتے ہیں۔

امیر الامرا غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ حضرت آصف جاہ مرحوم مغفور کے بڑے فرزند تھے۔ ان کا اصلی نام میر محمد پناہ تھا۔ کم سنی ہی سے محمد شاہ کے دربار میں تقرب حاصل تھا۔ دربار کے ماحول میں ہی نشو و نما پائی ابتداء میں بخشی گری احدیاں کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ ۱۱۵۳ھ میں جبکہ حضرت آصف جاہ میر بخشی (امیر الامرائی) کے عہدہ پر سرفراز ہو کر دکن آئے تو اس عہدہ کی نیابت غازی الدین خاں کو حاصل ہوئی۔ حضرت آصف جاہ کے انتقال کے تین سال بعد میر بخشی کے عہدہ پر خود غازی الدین خاں کا تقرر عمل میں آیا۔

حضرت ناصر جنگ کی شہادت کے بعد غازی الدین خاں کو حکومت دکن کی خواہش ہوئی۔ اعیان حکومت ابتداء میں اس پر رضامند نہیں ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ شاہ درانی کی دہلی میں آمد آمد کا شہرہ تھا اور ان کے ایلچی قلندر خاں دہلی میں وارد ہوئے تھے۔ بادشاہ کے اشارے سے صفدر جنگ جو اس وقت صوبہ اودھ اور الہ آباد میں احمد خاں بنگش کے مقابلہ میں ملہار راؤ ہولکر کے ساتھ کام میں ہوئے تھے۔ ملہار راؤ ہولکر کو زر کثیر کے وعدہ سے اپنے ہمراہ لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن ان کے آنے سے قبل ہی بادشاہ نے شاہ درانی کے مطالبات تسلیم کر لئے۔ اور قلندر خاں

رخصت ہوئے۔ صفدر جنگ بادشاہ کی خدمت میں پہونچ کر حیران ہوئے کہ اب ہولکر کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔

اس دوران میں دکن سے راجہ رگھوناتھ داس کے مارے جانے کی خبر آئی اور یہ اطلاعیں بھی پہنچیں کہ دکن کی فوج میں ہرج و مرج پیدا ہو گیا ہے۔ نیز یہ کہ فرنگیوں (فرانسیسیوں) نے غلبہ حاصل کر لیا ہے تو ان امور کو معلوم کر کے احمد شاہ نے ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کے اتفاق رائے سے اور خود غازی الدین خاں کی رضامندی سے ان کو ۳ رجب سنہ ۱۱۶۵ھ کو صوبہ داری دکن کی خلعت عطا فرمائی۔ اس موقع پر نواب غازی الدین خاں نے ملہار راؤ ہولکر سے اتحاد پیدا کیا۔ اور اس سے یہ وعدہ کیا کہ صوبہ خاندیس اس کو تنخواہ میں عطا کیا جائیگا۔ ہولکر نے یہ شرط قائم کی کہ صوبہ خاندیس میں جن عہدہ داروں کو جاگیر حاصل ہے اس پر ان کو آئندہ حق حاصل نہ رہے گا اور زمانۂ عالمگیری میں اور دوسرے بادشاہوں کے زمانہ میں صوبہ خاندیس سے جن لوگوں کو روزینہ مقرر ہوا تھا خواہ وہ آل تمغا کیوں نہ ہو موقوف کر دیا جائیگا۔ نواب غازی الدینخاں نے ہولکر کی یہ شرط منظور کر لی۔ اور اپنی دستخط سے صوبہ خاندیس کی سند عطا کر دی۔ غرض نواب غازی الدین خاں ہولکر کی اعانت کے بھروسہ پر برسات کے موسم میں مالوا کے راستہ سے دکن کی جانب روانہ ہوئے۔

اکبرآباد پر پہونچ کر نواب محمد علی خاں و [illegible] کے نام [illegible] صادر فرمایا جو حسب ذیل ہے

(۴)

خان شہامت و بسالت دستگاہ!

سابق کہ عزیمت دکن بعمل آمدہ بود بسبب این کہ بعضے ارکان حضور بر خود از متوجہ شدن نواب صاحب وزیر الممالک بہادر بہ سمت افاغنہ بنگشی و برآمدن این جانب بعزم دکن عرصہ را خالی دیدہ ہنگامہ آرا شدند و خیالات فاسد بخاطر راہ دادند۔ جناب اقدس و اعلیٰ بدریافت این معنی باصرار تمام برائے اطفائے این نائرہ فساد طلب حضور نمودند و خلعت میر بخشی گری عنایت فرمودند نظر بحق نمک رسیدن بحضور انور ومنید بودن این جا ضرور دانستہ۔ درین ولا کہ افاغنہ بنگشی مطیع و منقاد شدند و ابدالی کہ بہ لاہور رسیدہ بود اطاعت حکم والا نمودہ معاودت بوطن خود کرد۔ نواب وزیر الممالک بہادر بسطوت و صولت تمام بحضور انور

لہ نواب صفدر جنگ۔

رسیدند و با ایں جانب و نواب موصوف ربط محبت و دوستی ہا بہ کمال صدق و صفا موکد بعہود و مواثیق استحکام یافت و عوالی و معالی پناہاں راؤ ملہارجی و راؤ جیاو پاجی راؤ بدل متحد و متفق شدند و بجمیع وجوہ از کارہائے حضور دل جمعی حاصل گردید تبارِیخ سیوم رجب خلعت استقلال و رخصت دکن از پیش گاہ فضل کرم مرحمت شد۔ فردائے آن بحول و قوۃ داخل خیمہ شدیم۔ و منزل بمنزل عازم سمت مقصود ایم و عوالی پناہاں راؤ ملہار راؤ و جیاجی راؤ لوازم کمال دوستی و سعی در حصول رخصت بتقدیم رسانیدہ با جمعیت کثیر ہمراہ اند و امارت و ایالت مرتبت راؤ پنڈت پردہاں با قتضائے فرط محبت و یگانگت و یکجہتی و صفا در جمیع امور رفیق اند با ایں طرف اکبر آباد بعنایت ایزدی رسیدہ شد انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب بآں ملک رسیدہ می شود جمعیت افزائے دوستان صادق و احبائے موافق بعمل می آید۔ مراتب وثوق اتحاد آں شہامت و بسالت دستگاہ و توجہات خاص کہ حضرت علیہ الرحمۃ بر آں موالات دستگاہ داشتند بوجہ احسن مرتسم خاطر است و بر محبت و دوستی ہائے آں شہامت پناہ کمال اعتماد و یقین۔ می باید کہ بخاطر جمع و استقلال بودہ باستمالت و دل جوئی سرداران و رفقائے قدیم و تربیت یافتہ ہائے حضرت علیہ الرحمۃ پردازند کہ ایں جانب محض بنابر پاس خاطر و جمعیت افزائی دوستان متوجہ شدہ ایم۔ حالا بالفضل الٰہی وقت جلوہ افروزی شاہد مدعائے احباء و ترقیات ہمہ مقاصد است خاطر مشتاق مشتاق دانستہ بہ ملاقات ہا زود مسرور باید ساخت و تا حصول ایں معمول بہ تحریر مکاتیب نشاط افزا باید بود۔" (بیض خاص)

اس مکتوب کے لفافہ پر امیر الامراء بہادر نظام الملک ۱۱۶۴ھ کی مہر ثبت ہے اور دفتر والا جاہی میں یہ شرح لکھی گئی ہے کہ "در بست و چہارم شہر ذی قعدہ ۱۱۶۵ھ در منزل رندہ امی ورود نمود۔"

اس مکتوب کا مطلب یہ ہے کہ میں نے پہلے بھی دکن آنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اس زمانہ میں وزیر الممالک (صفدر جنگ) افاغنہ بنگشی کی جانب گئے ہوئے تھے اور میرے دکن جانے کے عزم کا اظہار ہوا تو بعض لوگوں نے فساد مچایا۔ بادشاہ نے فساد کے رفع کرنے کے لئے مجھے طلب فرمایا اور میر بخشی کے عہدہ پر مامور فرمایا حق نمک کے خیال سے چند دن بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہنا ضروری متصور ہوا۔ اس اثناء میں افاغنہ بنگشی مطیع ہوگئے۔ احمد شاہ ابدالی لاہور سے واپس ہوگئے۔ وزیر الممالک

بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ نواب موصوف اور مجھ میں محبت و دوستی کا ربط قائم ہو گیا۔ مہاراؤ (ہولکر)، اور جی اپا (سندھیا)، سے بھی اتحاد قائم ہوا ہے۔ جب کہ مجھے بادشاہ نے دکن کی صوبہ داری پر مامور کیا اور دکن جانے کی اجازت دی، میں روانہ ہو چکا ہوں۔ مہاراؤ اور جی آپا اپنی فوج کے ساتھ ہمراہ ہیں۔ پنڈت پردھان سے یگانگت پیدا ہو چکی ہے۔ اس وقت ہم اکبر آباد تک پہونچ چکے ہیں۔ مکتوب الیہ (جو بھی تھا والا جاہ) کی محبت و دوستی پر اعتماد حاصل ہے۔ جلد ملاقات کریں اور [illegible] جاری رکھیں۔

غرض نواب غازی الدین خاں دریائے نربدا پر پہونچے تو پھر ایک مختصر عنایت نامہ صادر فرمایا جو حسب ذیل ہے۔

(۵)

ہو

شہامت و بسالت پناہا اخلاص و موالات دستگاہا۔

مراتب محبت و دولت خواہی و بہادری ہائے آں شہامت و بسالت پناہ کہ بعرض رسیدہ باعث مزید خوشوقتی ما گردیدہ۔ الحال کہ بفضل الٰہی کنار نربدا رسیدہ شد ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب بجمیعہ بنیاد می رسیم آں اخلاص و موالات دستگاہ بجمیع وجوہ مطمئن بودہ باستقلال بکارہائے متعلقہ مستعد سرگرم باشند و بتقدیم لوازم دولت خواہی پردازند کہ متمر ثمرات و نتیجہ ترقیات خواہد بود۔" (بنقش خاص)

اس مکتوب کے لفافہ پر "امیر الامراء بہادر نظام الملک ۱۱۶۴" کی مہر ثبت ہے۔ اور دفتر والا جاہی میں یہ شرح لکھی گئی ہے کہ "دو بست و چہارم ذی قعدہ ۱۱۶۵ھ در منزل وندواسی در رود نمود"۔

اس مکتوب کا مطلب یہ ہے کہ نربدا پر ہم پہونچ چکے ہیں اور جلد اورنگ آباد پہونچ جائیں گے۔

نواب غازی الدین خاں کی آمد آمد کی خبر پھیلی تو نواب صلابت جنگ کے لشکر میں انتشار سا پیدا ہوا۔ ہر عہدہ دار اپنی فکر کرنے لگا۔ اس زمانہ میں نواب صلابت جنگ [illegible] سے برسر پیکار تھی لیکن اب صلح ہو گئی۔ اب قرار یہ پایا کہ کرنول کا قلعہ [illegible] ان کو اپنا رفیق بنا کے نواب غازی الدین خاں سے مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ منور خاں کے نام سند قلعہ کرنول عطا ہوئی۔ اس سے قبل قلعہ کرنول مظفر خاں گارڈی کے قبضہ میں تھا۔ اب گویا ان کو بے دخل کر دیا گیا۔ مظفر خاں [illegible] سے

اس لئے غرض جیسے جیسے نواب غازی الدین خان دکن سے قریب ہوتے گئے نواب صلابت جنگ کی فوج میں سراسیمگی بڑھنے لگی لیکن مقابلہ بھی ٹھان لیا گیا۔ بُسّے نے ۱۲ ہزار گارڈیوں ، ۲ ہزار فرنگیوں اور ۲ ہزار سواروں کے ساتھ یہ ارادہ کیا کہ دریائے نربدا پر پہونچکر جنگ کرے۔

غرض نواب غازی الدین خاں دکن میں آئے تو پہلے برہان پور میں قیام کیا اور وہاں اپنا کافی اثر قائم کرلیا۔ اس زمانہ میں مندرجۂ ذیل عنایت نامہ صادر فرمایا۔

(۶)

خان شہامت وبسالت پناہا اخلاص وموالات دستگاہا

وثوق اتحاد ونیک اندیشی ودولت خواہی وصداقت ویکجہتی آن شہامت وبسالت دستگاہ بوجہ احسن منقش خاطر است وترددات وبہادری ہائے کہ درین ولا از آن شہامت وبسالت دستگاہ در تنبیہ وتادیب چندے شقی بظہور رسید مفصل ومشروحا بپیرایہ ایضاح یافتہ باعث کمال خوش وقتی وانبساط شد۔ این کار از تو آید و مردان چنین کنند۔ خاطر را بہمہ جہات جمع داشتہ بر تعلقات وخدمات متعلقہ مستقل بودہ بتقدیم لوازم یکجہتی باید پرداخت الحال کہ بحول وقوۃ الٰہی عبور زبدہ کردہ شدہ وعنقریب بہ خجستہ بنیاد رسیدہ می شود وقت آن است کہ مزید اقتدار جمعیت جمیع دوستان صادق ودولت خواہاں بالتخصوص آن شہامت ومعالی پناہ کہ محبت صمیم باما دارند جلوہ نمائے عرصۂ ظہور شود۔ شنیدہ شد کہ جمعیتے شایستہ از فرنگیان انگریز ہمراہ آن شہامت وبسالت دستگاہ است حالا کہ بفضل ایزدی آن شہامت وبسالت دستگاہ را دل جمعی از کار ہائے انجا دست دادہ وچندا کہ مصدر ہنگامہ وفساد بود بسزا رسید لہذا تعلیمی می گردد کہ فرنگیان مذکور را مستمال وامیدوار ساختہ نزد ما باید فرستاد۔ بعد فراغ از کار ہائے این جا اگر آن شہامت وبسالت دستگاہ درخواست خواہند نمود فرستادہ خواہد شد از انجا کہ راستی ودرستی ویکجہتی آن شہامت وبسالت دستگاہ بدرجہ اتم مرتسم خاطر گشتہ است لہذا از راہ کمال اعتماد این معنے بقلم آمدہ خاطر را مشتاق وخواہان ملاقات خود تصور نمودہ بہ ترقیم احوال حرمال نشاط افزا ومسرت پیرا باید بود۔" شرح دستخط خاص :-

سلہ ۔ نواب حسین دوست خان چندا صاحب ۔ سلہ ۔ اورنگ آباد

نواب غازی الدین خان کا مکتوب نواب والا جاہ کے نام

"......... این خدمات و وفائے بہ چنین اوقات ثمرات عظیم دارد و بفضل الٰہی وقت ظہور آن قریب رسیدہ" (بعین خاص)

اس مکتوب کا یہ مطلب ہے کہ مکتوب الیہ کے اتحاد اور نیک اندیشی پر پورا بھروسہ ہے۔ چنداصاحب کی تنبیہ میں جو کوشش عمل میں لائی گئی اس سے خوش وقتی حاصل ہوئی۔ "وہ این کار راز تو آید و مردان چنین کنند" اب ہم نربدا عبور کر چکے اور بہت جلد اورنگ آباد پہونچ جائیں گے۔ اب ضرورت ہے کہ سب دوستان صادق پوری کوشش عمل میں لائیں۔ سننے میں آیا ہے کہ آپ کے پاس انگریزوں کی کوئی بہتر فوج ہے۔ اب جبکہ چنداصاحب اپنی سزا کو پہنچ چکے اور آپ کو دل جمعی حاصل ہو چکی انگریزوں کی فوج کو ہمارے پاس بھیجدیں۔ کام ختم ہو جائے تو آپ کی درخواست پر پھر ان کو واپس بھیجدیا جائے گا۔ خدمات اور وفاداری سے آپ کو بڑے ثمرات حاصل ہوں گے۔

بہرحال نواب غازی الدین خان اورنگ آباد پہونچ گئے۔

محمد علی الحسینی نے اپنی کتاب تاریخ راحت افزا میں لکھا ہے کہ غازی الدین خاں کی جانب سے نواب صلابت جنگ کو یہ پیغام بھیجا گیا کہ ہم دونوں بھائی ہیں۔ جنگ کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ میں صرف ملک کے بندوبست کے لئے آیا ہوں۔ اگر چاہو تو میری نیابت میں تم دکن میں رہو میں انتظام قائم کرکے پھر ہندوستان چلا جاؤں گا۔

محمد علی الحسینی نے اپنی دوسری کتاب مرات الصفا میں تصریح کی ہے کہ نواب غازی الدین خاں جب تک زندہ رہے برابر اس فکر و تدبیر میں رہے کہ صلابت جنگ ملاقات کے لئے آجائیں تاکہ بندوبست زیادہ بہتر طریقہ سے ہو سکے۔

غرض نواب غازی الدین خاں اورنگ آباد میں صرف ۱۱ روز رہ کے مرگ مفاجات سے عالم جاودانی کی جانب رہسپار ہوئے۔ ماثر الامراء نے تاریخ مظفری کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ اصل میں زہر دے دیا گیا۔ تاریخ راحت افزا میں لکھا ہے کہ "و بعضے گویند کہ نواب فیروز جنگ را بعضے از خدمہ محل نواب صلابت جنگ مسموم نمودند۔"

غرض نواب صلابت جنگ کے دہلی سے روانہ ہونے اور مرگ مفاجات تک جو جو امور پیش آئے اور جن کی تفصیل تاریخ احمد شاہی اور مراۃ الصفا میں قلم بند کی گئی ہے یکسر عبرت آموز سبق ہیں۔ عہدہ داروں کی کشمکش، باہمی ناچاقی، بیگمات اور سازشیں اور مکر و فریب غرض ہماری کمزوریوں سے اختیار شاہی کے مختار بنے تھے۔

اوپر ابوالمنصور خاں کا نام آیا ہے ان کا مختصر تذکرہ بے محل نہیں۔

ابوالمنصور خاں کا خطاب صفدر جنگ تھا، میرزا مقیم نام تھا۔ سیادت خاں کے بیٹے تھے محمد شاہ کے عہد میں صوبہ اودھ کا نظم و نسق ان کے سپرد ہوا۔ بعد میں صوبہ الہ آباد بھی ان کے تفویض کیا گیا۔ احمد شاہ کے دور میں حضرت آصف جاہ کے انتقال پر صفدر جنگ کو وزارت پر مامور کیا گیا۔ احمد خاں بنگش سے اختلاف پیدا ہوا تو باہمی جنگ و جدل کی نوبت آئی اور احمد خاں نے صفدر جنگ کو شکست دی۔ احمد خاں نے بعد میں صوبہ اودھ اور صوبہ الہ آباد میں غارت گری شروع کی۔ اس کے سدباب کے لئے صفدر جنگ نے جے اپا سندھیا کے تعاون سے افاغنہ پر یورش کی اور اس مرتبہ انھوں نے افاغنہ کو شکست دی۔

احمد خاں بنگش جن کا ابھی اوپر تذکرہ ہوا افغان تھے اور محمد خاں قائم جنگ صوبہ دار مالوا کے بیٹے تھے۔
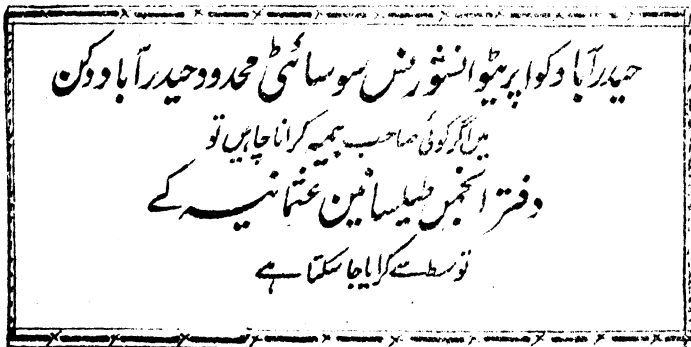
معاصروں کے صفحے

ہندوستان کے سماجی حالات میں انقلاب، چاہے خوشگوار ہو یا ناخوشگوار پیدا ہو رہا ہے۔
ب طرف حیدر آبادی عمائدین اپنے خاموش عمل سے اس انقلاب کی رہنمائی کر رہے ہیں اور دوسری
ن حیدر آبادی قائدین اپنے بلند آہنگ اقوال سے اس انقلاب کو روکنا چاہتے ہیں۔ اس کا ایک
بت ہی دلچسپ مرقع لاہور کے نسوانی ہفتہ وار اخبار تہذیب النسواں کی ۱۳۔ مارچ سنہ ۱۹۴۳ء کی
شاعت میں نذر سجاد حیدر صاحبہ نے کھینچا ہے اور خوب کھینچا ہے۔ اس قسم کے حالات اور واقعات
اس اسلوب بیان میں خبر رساں اداروں کے بیانات میں کیوں آنے چلے۔ یہ امور تو وہی محسوس کرے
جو خود انقلابی ہو۔ حیدر آبادی عمائدین اور قائدوں کے متعلق وہ کہتی ہے "تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا" کے مصداق
ناظرین مجلہ بھی اس سادہ لیکن اثر پیدا کرنے والے بیان کی باریکیوں پر غور کریں۔ نذر سجاد حیدر صاحبہ
لکھتی ہیں:۔

"۱۳۔ فروری کو اسٹریچی ہال مسلم یونیورسٹی میں تقسیم اسناد کا جلسہ تھا۔ میں اپنی بھاوج بیگم
ابراہیم خاں اور بھانجی قمر جبین، عزیزہ سعیدہ قادر حسین کو ہمراہ لیتی وہاں پہنچی۔
اسٹریچی ہال میں قدم رکھ کر خدا کی شان نظر آتی ہے اور اب سے بیس سال قبل کا زمانہ یاد آجاتا
ہے۔ اللہ اللہ! یہ وہی مقام ہے اور ویسا ہی اجلاس۔ بلکہ اس وقت اس اجلاس کی صدر ایک جلیل القدر
خاتون ہوا کرتی تھیں اور آج سب مرد ہی مرد ہیں۔ مگر یونیورسٹی کے حاکم کے حکم بلکہ تنگ نظری سے
ہم کو ہال میں برقع پہن کر بھی قدم رکھنے کی اجازت نہ ملتی تھی یہاں تک کہ اوپر نشستی گیلریوں میں پردے
اور چلمنیں لگوا کر بھی ہمیں وہاں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی اور آج وہی یونیورسٹی کا حاکم ہے کہ رفتار زمانہ سے مجبور
اور بے بس ہے۔ اس وقت اس قدر ہمت نہیں ہے کہ ہم لوگوں کو بے نقاب ہال میں آنے سے روک سکے۔
جس وقت ہم لوگ وہاں پہنچے اسٹریچی ہال سیکڑوں مردوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک پروفیسر ہمارے

آگے آگے راستہ بتاتے ہوئے ہمیں اندر لے گئے۔ اور سب سے پہلی قطار میں اسی حاکم دارالعلوم کے بالکل سامنے بٹھا دیا۔ میں دل میں سوچ رہی تھی کہ اس رنگ برنگی چمکیلی ساڑیوں کو اپنے مقابل میں بے نقاب دیکھ کر اُس قدامت پسند و تنگ نظر بزرگ کے دل پر کیا گذر رہی ہوگی۔

میں نے بیس سال قبل بھی جبکہ میرے شوہر مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے اور مرحومہ بیگم صاحبہ بھوپال چانسلر تھیں بڑی کوشش سے اور مخالفانہ کارروائیوں کے علی الرغم پس پردہ سنگین چلوں میں سے بہت سی خواتین کے ساتھ یہ مجمع دیکھ ہی لیا تھا۔ اور اب تو آزادی ہے۔ خدا جنت نصیب کرے سر شاہ سلیمان مرحوم کو جن کے عہد حکومت میں اس بے کس و بے بس مظلوم فرقہ کو یہ حق حاصل ہوگیا کہ وہ بھی اپنے قومی جلسوں میں شریک ہو سکے۔ میرے برابر والی کرسی پر عزیزہ ممتاز جہاں بیگم پرنسپل مسلم گرلز کالج علی گڈھ رونق افروز تھیں۔ اور پہلی قطار میں مسلم کالج کی گریجویٹ طالبات۔

جب ام اے کی ڈگری دی جانے لگی تو عزیزہ ممتاز جہاں اٹھیں اور ان کے پیچھے دوسری لڑکیاں! کتنا دلکش اور قابل قدر نظارہ تھا! پھر اسی طرح بی اے اور بی ٹی کی ڈگریاں لینے والیاں اپنے پرنسپل کے پیچھے گئیں۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے دو سال سے اس موقع پر میں علی گڈھ جا رہی تھی۔ اس مجمع میں علاوہ خواتین علی گڈھ کے چند باہر کی بیگمات بھی نظر آئیں۔ جو خاص اس جلسے کے لئے دور دور سے تشریف لائی تھیں۔

پھر تین بجے ہم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے اجلاس میں اسٹریچی ہال آگئیں۔ اس کانفرنس میں میری اس آزادی کے ساتھ پہلی شرکت تھی۔ ۲۰ تا ۲۵ سال قبل اس کانفرنس کے ساتھ ہماری زنانہ نمائش بھی ہوا کرتی تھی۔ اور تعلیم نسواں سکشن کا اجلاس بھی۔ نمائش دیکھنے کے لئے میں کئی بار گئی تھی لیکن کانفرنس اور اپنے سکشن کے جلسوں میں ہمارا گزر ناممکن تھا۔ پردہ کے شدید انتظامات کے ساتھ خواتین کو صرف زنانہ دستکاری کی نمائش دکھا دی جاتی تھی۔ مگر اس سال مردانہ کانفرنس اور تعلیم نسواں کے سکشن کی کارروائیاں مخلوط تھیں۔ اور اسی چیز کی کشش نے مجھے لکھنؤ سے کھینچ لیا تھا۔ چھ بجے شام تک کانفرنس کا پہلا اجلاس ختم ہوا اور سب خواتین ایٹ ہوم میں گئیں۔

اوہ! میں ایک ضروری بات لکھنا بھول ہی گئی۔ نواب ظہیر یار جنگ صدر کانفرنس مع اپنی بیگم صاحبہ کے

ہال میں تشریف لائے اور کرسی صدارت کے برابر ہی بیگم ظہیر یار جنگ بھی رونق افروز ہوگئیں ۔ گو اسکی کوئی ضرورت نہیں تھی ۔ اور اگر حاکم یونیورسٹی اور محترم سکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا بس چلتا تو وہ ایسی بدعت ہرگز نہ ہونے دیتے جس وقت ان کی مکمل حکمرانی وخود مختاری کا زمانہ تھا اس وقت ہم تڑپ تڑپ کر رہ جاتی تھیں ۔ اور اس اجلاس میں بھی با نقاب جانے کی اجازت نہ ملتی تھی جس کی صدر سرکار عالیہ بھوپال ہوا کرتی تھیں ۔ آج بیسیوں خواتین اسلام اس بڑے مجمع میں بے نقاب شریک تھیں اور ایک نوجوان صدر کانفرنس کی نو عمر بیگم صاحبہ بھی بازو رونق افروز ہیں ۔

دوسرے روز دس بجے تعلیم نسواں سیکشن کا اجلاس تھا ۔ پردہ نشین خواتین کے لئے اسٹیج ہی ہال ہی کی چقوں اور کپڑوں سے پردہ گاہ بنائی گئی تھی ۔ ہال کے باقی حصوں میں مردوں کا مجمع تھا کرسی صدارت بھی باہر مردانہ میں ہی رکھی گئی تھی ۔ یہ دیکھ کر ہم کو بے انتہا حیرت ہوئی ۔ پردہ کانفرنس ! صدر ایک محترم خاتون ! اور تمام کارروائی پردہ سے باہر ! زنانہ جلسہ اور مردوں کو اس میں تقریر کرنیکی اجازت ! کارکن کمیٹی کے ممبر بیویاں پردہ کے اندر ! اور صدر جلسہ اور قمر جہاں بیگم پردہ سے باہر ! یہ طریق کار ہماری سمجھ میں تو نہ آیا ۔ زنانہ کمیٹی کی منتظمہ سے حکم ملا کہ پردہ میں بیٹھنا سب کو لازمی ہے ۔ میں نے کہا صدارت کی کرسی پردہ کے اندر منگوائے ۔ جب پردہ کانفرنس ہے تو صدر کا بھی اندر ہونا لازمی ہے ۔ معلوم ہوا کہ کانفرنس کے بانی مردوں نے اس کی اجازت نہیں دی کہ بیچاری پردہ نشین خواتین اپنی صدر بیگم ظہیر یار جنگ کو آنکھوں سے دیکھ سکیں ۔ اور کارروائی ان کے آگے ہو ۔ ہم سے تو ایسا نہ ہوسکا کہ سب کام پردہ کے باہر ہو رہا ہے اور ہم آنکھیں بند کئے اندر بیٹھی رہیں ۔ چنانچہ میں مع چند خواتین کے چلمنوں سے باہر کی کرسیوں پر آبیٹھی ۔ مجھے یہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ میری روشن خیال بہن سیدہ رضویہ خاتون سیاہ برقع میں نقاب ڈالے میرے قریب آبیٹھی ۔ یہ عجیب کانفرنس تھی ! جس پردہ بھی اور بے پردہ بھی ۔ صدر جلسہ بیگم ظہیر یار جنگ باہر چند اور خواتین بھی باہر اور کچھ بیبیاں اندر ! بہت مناسب کیا بہن رضویہ نے کہ باہر بھی آگئیں اور پردہ بھی نہ اٹھایا یہ ہے زمانہ کا زبردست اثر کہ حامیاں پردہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور ان کا کچھ بس نہ چلتا تھا ۔

چاہیے تو یہ تھا کہ محترم سکریٹری صاحب ایجوکیشنل کانفرنس حتی الامکان دوراندیشی سے کام لے کر اپنی صدارت پردہ کے اندر رکھوا دیتے۔ پھر کوئی بی بی پردہ سے باہر آنے کی ہمت نہ کرسکتی۔ مگر زمانہ بدل چکا ہے۔ اور ایک کام اندر ہوا اور ایک باہر۔ جب کسی اندرونی خاتون کو تقریر کرنی ہوتی تو میکروفون چق کے باہر کی طرف لگا دیا جاتا تھا۔ غالباً وہ بی بی اپنا منہ بلکہ ہونٹ چلمن کی تیلیوں پر میکروفون کے برابر رکھ دیتی ہونگی اور پھر کوئی مرد مقرر کو اٹھتے تو میکروفون وہاں لاکر رکھ دیا جاتا تھا۔ نرالے انداز کی کارروائی دیکھی۔ اس وقت حیدرآباد کے ایک نواب بہادر یار جنگ نے ایک فاضلانہ اور ہمدردانہ تقریر کی جس میں ابتدائے اسلام سے دورِ جدید تک کی خواتین اسلام کی خوب خوب تعریفیں کیں اور ان کے کارنامے بیان کیے۔ جن کو سن کر ہم سب خوش ہو رہی تھیں۔ مگر آخر میں اکبر مرحوم کا شعر۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

پڑھ کر کہا کہ میری ماؤں بہنو اور بیٹیو! شمع انجمن نہ بنو، چراغ خانہ ہی بنی رہو۔ یہ ہدایت فرما کر انھوں نے اپنی تقریر ختم کردی۔

اس وقت شمع انجمن کے لفظ پر اندر اور باہر کی خواتین کے چند بار مشتعل ہو گئے اور مخالف تقریریں ہونے لگیں۔ سب سے پہلے ہمارے ہم نوائے نسواں محترم بزرگ شیخ عبد اللہ صاحب بانی مسلم گرلز کالج علی گڈھ نے تقریر کی۔ پھر بیگم [illegible] نے بہت معقول جواب دیا۔ حیرت ہے کہ اس حالت میں جب حیدرآباد کی ایک عالی رتبہ خاتون اس مجمع عام میں زنانہ جلسہ کی صدارت کر رہی ہو۔ نواب بہادر یار جنگ آج کل کی خواتین کو شمع انجمن کہیں۔ غرض کہ بہت دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔"

ضروری اطلاع

معزز ارکان انجمن و خریدار صاحبان مجلہ کی توجہ منعطف کرائی جاتی ہے کہ نقل مقام یا تبادلہ کی صورت میں براہ کرم دفتر انجمن کو اپنے صحیح پتہ سے اطلاع فرمائیں

تنقید و تبصرہ

(۱) مضامین محمد علی (حصۂ دوم)

یہ کتاب مولانا محمد علی کے اون مضامین کا مجموعہ ہے جو ہمدرد میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ بہ لحاظ زمانہ ان مضامین کا تعلق سنہ ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۲۹ء سے ہے یہی وہ زمانہ ہے جبکہ سنہ ۱۹۲۱ء کے نان کوآپریشن اور تحریک خلافت کا ردعمل ہندوستانیوں پر ہو رہا تھا۔ ہندو مسلمانوں کے اتحاد کو نظر لگ چکی تھی اور مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری حکیم اجمل خاں صاحب جیسے اتحاد کے حامی اور جو کانگریس کے صدر بھی رہ چکے تھے کانگریس سے بیزار ہو چکے تھے اس کی کیا وجہ تھی اگر تلاش کرنا ہو تو اس کتاب کی ورق گردانی سے بہت کچھ مدد ملے گی مسلم لیگ کی آج کل جو روش ہے اوس کی داغ بیل اوسی زمانہ میں پڑ رہی تھی۔ اس میں کانگریس کا ہندو مہاسبھا کا اور لیگ کا کس قدر قصور ہے اس پر اظہار کئے بغیر ہم کہہ سکتے ہیں کہ واقعات کے ایک پہلو کی تصویر ان مضامین سے ضرور واضح ہو جاتی ہے اور یہ مضامین ایسے شخص کے نہیں ہیں جو پہلے سے کانگریس کا مخالف رہا ہو بلکہ یہ کانگریس کے سابق صدر کے خیالات ہیں اس لئے زیادہ قابل توجہ ہیں اور مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کے لئے قابل توجہ ہیں۔ اور ان مضامین کے مطالعہ سے انھیں یہ نتیجہ نکالنے میں آسانی ہوگی کہ آج مسلم لیگ کانگریس سے کیوں برسر جنگ ہے۔ کتاب کا وہ حصہ توجہ کو زیادہ جذب کرتا ہے جہاں مسٹر جناح کا ذکر آتا ہے اور مسٹر جناح کے اس وقت کے خیالات کا علم ہوتا ہے لیکن کتاب کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں ڈاکٹر اقبال مرحوم سے متعلق مضامین درج ہیں۔ مضامین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی کو علامہ اقبال سے بے حد عقیدت تھی اور وہ خود لکھتے ہیں کہ اونھوں نے اسلام مولویوں سے نہیں بلکہ علامۂ اقبال سے سیکھا تھا لیکن نان کوآپریشن کے سلسلے میں مولانا محمد علی علیگڈھ کالج کو بند کر دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اسلامیہ کالج پشاور کو بند کرانے میں کامیاب نہیں ہوتے جس کے سکرٹری علامۂ اقبال تھے۔ اس کے بعد مولانا محمد علی علامہ اقبال کو کونسل میں بیٹھا ہوا دیکھتے ہیں جبکہ خود مولانا پکے نوچینجر تھے اور سوراج پارٹی کے مسلک کے بالکل خلاف تھے جو سی، آر، داس اور پنڈت موتی لال نہرو

کے ہاتھوں میں تھی۔ علامہ اقبال کے اس طرز عمل سے مولانا کو بہت تکلیف ہوتی ہے اور انھیں تعج
ہوتا ہے کہ ہندی ترانہ ، نیا شوالہ ، اور شمع و شاعر کا مصنف آزادی کی تحریک سے کیوں بے تعلقی
اظہار کر رہا ہے ۔ وہ شاعر اقبال سے خود اوسی کے اشعار کے حوالہ سے اون کا واسطہ دے د
دریافت کرتے ہیں کہ آخر یہ کیا ہے اور کیوں ہے ۔ لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ اگر مولانا محمد علی آج زند
تو اون کے خیالات کیا ہوتے اور ڈاکٹر اقبال سے متعلق ان مضامین کے متعلق وہ کیا رائے رکھتے۔ بہرحال کتا
دلچسپ ہے ۔ تقریباً (۴۰۰) صفحات کی مجلد کتاب ہے ۔ کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ ہے اور مکتبہ جامعہ د
طبع ہوئی ہے ۔ اس گرانی کے زمانہ میں قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ بہت کم ہے ۔ ہم مطالعہ کی سفارش کر
ک ۔ ا

(۲) تاریخ عطیات آصفی

تالیف مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی

عطیات آصفی پر نہایت مفید اور مختصر کتاب ہے اور بقول مولوی عبدالباسط خانصاحب سابق ا
عطیات "ہاشمی صاحب کی ملازمت کا آغاز دفتر دیوانی و مال سے ہوا اور بجز تین سال کے ان کی پوری ملاز
کا زمانہ دفتر دیوانی و مال ہی میں بسر ہوا ہے ۔ اسی لحاظ سے اون کو دفتر موصوف کے داخلوں اور
پر پورا عبور ہے ۔ اون کی زیر نظر کتاب سررشتہ عطیات اور دفتر دیوانی و مال کے کاروبار اور داخلو
متعلق قیمتی معلومات اور صحیح رہبری کا کام دے سکتی ہے اونھوں نے نہایت محنت اور تحقیق
نہ صرف پراگندہ اور منتشر معلومات کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے ۔ بلکہ جدید معلومات اور مختلف ابواب مطلوبہ
مصالحہ فراہم کر دیا ہے ۔ جو معاشداران اور وکلاء کے لئے واقعی کار آمد ہوگا" ہماری رائے میں کتاب
اور وکلاء کے علاوہ حیدرآباد کی عطایا سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بھی اچھی مطالعہ کی چیز ہے
تقریباً سوا سو صفحہ کی کتاب اور کتابت وطباعت اچھی ہے ۔ قیمت دو روپیہ ہے ۔ ک ۔ ا

(۳) قرآنی دعائیں

مولفہ محمد فاروق بی ، اے (عثمانیہ) ، ایچ ، سی ، ایس (۶۴) صفحے چھوٹی تقطیع نفیس لکھائی چھپائی
[illegible]

اس مختصر رسالہ میں مولف نے ان تمام دعاؤں کو یکجا کر دیا ہے جو قرآن مجید میں مختلف سوروں اور آیتوں میں ہیں۔ ان کی تعداد (۰۰ ۷) ہوئی ہے۔ اولاً اعراب لگا ہوا عربی متن پھر ترجمہ اور آخر میں مختصر توضیح ہے۔

کتاب میں ترتیب تو وہی ہے جو خود قرآن مجید میں ان دعاؤں کی ہے لیکن علمی ضرورت سے دو فہرستیں دیکر تلاش آسان کر دی گئی ہے۔ پہلی فہرست میں ہر دعا کا موضوع یا عنوان بلحاظ ترتیب طباعت دیا گیا ہے اور دوسری فہرست جو اشاریہ ہے، ان موضوعوں کو حروف تہجی پر مرتب کرنے پر مشتمل ہے۔ مثلاً علم، اولاد، رزق دشمن سے نجات وغیرہ۔

یہ کتاب سفر و حضر کی بڑی اچھی مونس و رفیق ہے۔ م ۔ ح ۔ ل

(۴) آسان حدیث

مولفہ محمد شعیب حنفی رکن مجلس علماء بھوپال۔ غالباً مولف سے ملے گی۔ فی حصہ (۱ ۴/) آنہ

مولف نے چھوٹی چھوٹی، اخلاقی اور کارآمد حدیثوں کا ترجمہ خاص کر بچوں کے لئے شایع کرنا شروع کیا ہے۔ ہر حصے میں کم و بیش تیس چالیس حدیثیں ہوتی ہیں جو چھوٹی تقطیع کے ایک جز پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اب تک ہمیں چار حصے وصول ہوئے ہیں۔ زیادہ تعداد میں خرید کر تقسیم کرنا اور خاص کر بچوں کو انعام میں دینا مفید ہوگا۔

احادیث کے ترجمہ کے بعد عام فہم مطلب بھی چند الفاظ میں شامل کر دینے سے اس کا افادہ بڑھ گیا ہے۔ اگر محترم مولف ہر حدیث کے بعد اس کا حوالہ بھی دیدیں کہ کس کتاب سے لی گئی ہے تو مناسب ہوگا۔ ماخذ اگرچہ کنز العمال ہے، لیکن کنز العمال میں بھی ہر حدیث کا حوالہ ہوتا ہے کہ کس کتاب سے لی گئی ہے۔

مذہبی لٹریچر کی اخلاق سازی کے لئے اتنی کثیر ضرورت ہے کہ اس طرح کے کاموں میں مزید اضافے بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر ہر حصے میں صرف ایک ایک موضوع ہی کی حدیثیں کسی ترتیب سے جمع کی جائیں اور جلی خط میں چھاپی جائیں تو نوعمر بھی پڑھ سکتے ہیں اور یہ انھیں کے لئے لکھی جا رہی ہیں۔ م ۔ ح ۔ ل

(۵) شیطان کا انتقام

از جلال الدین صاحب اشک۔ قیمت ۸ر

یہ مختصر سی کتاب بقول مصنف "دور حاضر کے علمی، اخلاقی اور سیاسی رجحانات پر ایک تیز اور تند اور تلخ تبصرہ ہے"

عہد حاضر میں جو تخریبی قوتیں سارے عالم میں کارفرما ہیں ان سے ہر سوچنے والا دل ودماغ ضرور کچھ نہ کچھ متاثر ہو رہا ہے۔ زیر نظر کتاب میں اسی عالمگیر ہیجان کو ایک تمثیلی افسانے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح شر کی قوتیں خیر پر غالب آ رہی ہیں اور کس طرح شیطان اپنے ازلی دشمن آدم کی اولاد سے اپنی رسوائی کا انتقام لے رہا ہے اس قصہ میں شیطان خود انسان کے ہاتھوں انسان کی تباہی کے سامان بہم پہنچاتا ہے اور مختلف علوم وفنون مثلاً سائنس، طب، ادب، فلسفہ، تاریخ، وغیرہ کا غلط استعمال کرا کے نسل آدم کے دماغوں کو زہر آلود کرتا ہے تا کہ انسانی آبادی کی ذہنیت ہمیشہ کے لئے مسموم ہو جائے اور قتل وغارت کے موجودہ ہنگاموں سے جو لوگ بچیں وہ آیندہ نسلوں میں ایسا بیج بوئیں جس کے اثرات سے نسل آدم کبھی پنپ نہ سکے۔ اپنا یہ مقصد شیطان اپنے ذریات کے ذریعہ اس طرح پورا کراتا ہے کہ انسان نام نہاد ترقی کے دھوکہ میں پڑ کر تباہی کے غار میں گرتا چلا جائے۔ بقول اکبر الہ آبادی ؎

شیطان نے ترکیب تنزل یہ نکالی ٭ کہ تم انھیں شوق ترقی کا دلادو

افسانہ دلچسپ اور پر اثر ہے اور اس کی زبان صاف وسلیس کتابت وطباعت عمدہ ہے اور کاغذ اس گرانی کے باوجود اعلیٰ قسم کا استعمال کیا گیا ہے۔ ا۔ ن۔

(۶) میسور میں اردو

چھوٹی سائز حجم (۹۶) صفحات مولف مولوی محمد سعید عبدالخالق صاحب (عثمانیہ)

ناشر درس گاہ اردو معظم بلڈنگ متصل معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن قیمت (۹/)

نصیر الدین صاحب ہاشمی کی تالیف "دکن میں اردو" ایک کتاب آفرین کتاب ثابت ہوئی۔ اس کے شائع ہونے کے بعد "پنجاب میں اردو" اردو کے قدیم مخطوطات "یوپی میں اردو" وغیرہ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ زیر بحث کتاب میسور سے متعلق ہے۔ اس کے مولف جامعہ عثمانیہ کے ایک متعلم عبدالخالق صاحب ہیں۔

ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب "مدراس میں اردو" میں جو دکن میں اردو کے دوسرے حصے کے طور پر شائع ہوئی ہے۔ میسور کی اردو کا مختصر تذکرہ کیا ہے لیکن میسور اور بنگلور میں اردو زبان کی جو خدمت ہوئی اور

ہو رہی ہے اس کے لحاظ سے ضرورت تھی کہ تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جاتا۔ عبدالخالق صاحب نے اس کو بڑی محنت سے مکمل کیا ہے۔

"میسور میں اردو" پانچ ابواب پر مشتمل ہے جن کی صراحت حسب ذیل ہے۔ پہلے باب میں دولت خداداد (حیدر علی اور ٹیپو سلطان) کے ماقبل کا تذکرہ ہے اس میں دو کتابوں کا ذکر ہے۔ دوسرا باب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے عہد سے متعلق ہے اس باب میں انیس شعرا اور نثاروں کا تذکرہ ہے اور نمونہ کلام دیا گیا ہے۔ تیسرا باب میسور کے موجودہ راج کے متعلق ہے۔ اس میں تیس شعرا اور نثر نگاروں کا تعارف کرایا گیا ہے، چوتھا باب عصر حاضر کے خواتین سے متعلق ہے اس میں پندرہ خواتین کا تعارف کرایا گیا ہے۔ جو اردو کی خدمت میں مشغول ہیں اسی باب میں ایسی انجمنوں کا تذکرہ بھی ہے۔ جو اردو کی خدمت انجام دیتی ہیں پانچوں باب اخبارات اور رسائل سے متعلق ہے اس میں قدیم اور جدید (۴۳) اخبارات اور رسائل کا نام گنایا گیا ہے۔

مؤلف صاحب نے یہ کتاب اپنے میسور اور بنگلور کے سفر کے بعد لکھی ہے اور وہاں کے علم دوست اصحاب سے استفادہ بھی کیا ہے۔

اس کتاب سے واضح ہوتا ہے کہ میسور اور بنگلور نے اردو کی کس طرح خدمت انجام دی ہے۔ اور کس طرح اردو زبان ہندوستان کی عالمگیر زبان ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔

چونکہ عبدالخالق صاحب کی طالب علمی کی کوشش ہے اس لئے اس میں بہت کچھ اضافے کی گنجائش ہے توقع ہے کہ خود آگے چل کر مؤلف صاحب اس کو مفصل طور پر مرتب کر دیں گے۔ بریں ہم اب بھی یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔

جامعاتی معلومات

مندرجۂ ذیل معلومات اور اطلاعیں ہر جامعہ کی تازہ رپورٹ سے ماخوذ ہیں۔ ہندوستان کی اکثر جامعات نے براہ کرم یہ انتظام کیا ہے کہ ان کی رپورٹ اور دوسری رودادیں وغیرہ بالالتزام مجلہ کو ارسال ہوا کریں۔

کلکتہ کی جامعہ سے حال میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والوں میں عطاء الحکیم صاحب ایم، اے بھی ہیں۔ ان کے مقالہ کا موضوع "اہل عرب اور ریاضیات" تھا۔

ٹراونکور کی جامعہ کے تحت جن موضوعات پر جامعہ کے مختلف شعبوں میں تحقیقاتی کام ہو رہا ہے ان کے منجملہ چند حسب ذیل ہیں۔

۱۔ نمک بنانے کے تجربے نیز ساتھ ہی اس امر کی تحقیق کہ نمک کے حصول کے بعد جو قلمزا مائع حاصل ہوتا ہے اس سے میگنیشیم، پوٹاسیم کے نمک ہیگنیشیم کلورائڈ، برومین وغیرہ تیار کئے جائیں۔ (۲) احتراقی تیل اور دوسری ذیلی روغنیات تیار کرنا۔ (۳) مونازائیٹ سے میسوتھوریم اور تھوریم کے مرکبات کا حصول (۴) ناریل کے خول سے چارکول کی تیاری۔ (۵) لیمن گراس آئیل اور وغیرہ کے سلسلہ میں تحقیق (۶) دیسی ادویہ پر کیمیائی اصولوں کو منطبق کرنا۔ (۷) کتابوں پر کیڑوں کے حملہ کا سدباب۔ (۸) سمندری گھاس سے ایوڈین کی تیاری۔ (۹) دھان اور نے شکر پر تجربے۔ (۱۰) پانی کے نلوں میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا انسداد۔ (۱۱) مختلف اضلاع کی مٹی کا تجزیہ تاکہ جو ضروری اجزا کم مقدار میں پائے جائیں ان کے مضر اثرات کا سدباب۔ (۱۲) ٹراونکور میں پیدا ہونے والے چاول کی مختلف انواع کی غذائی اہمیت کی تحقیق (۱۳) ٹراونکور کی زمینوں میں حل پذیر کھاد کے

انجذاب کے متعلق ابتدائی تحقیقات۔ (۱۴) ناریل کے پتوں میں پیدا شدہ کیڑوں کا انسداد۔ (۱۵) الائچی پر تحقیقات۔ (۱۶) چاول کو خراب کرنے والے کیڑوں پر تحقیقات۔ (۱۷) ٹائیفائڈ کے ٹیکے کا بطور حفظ ما تقدم استعمال۔ (۱۸) مانع ہیضہ ٹیکہ۔ (۱۹) غذائیت پر تحقیق۔ (۲۰) چوہوں کے پسوؤں کا معائنہ۔ (۲۱) جراثیم سے پانی کے جرثوموں کو الگ کرنے پر جراثیم کا مضر اثر۔ (۲۲) رسوبی تعاملات میں الکاؤ کا اثر۔ (۲۳) تازہ مچھلی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا۔ اور اس کا ذخیرہ کرنا۔ (۲۴) شارک مچھلی کا تیل۔

ڈھاکہ کی جامعہ کے اہتمام سے بنگال کی ایک مفصل تاریخ تین جلدوں میں زیر طباعت ہے۔

اناملی کی جامعہ ٹامل زبان میں مختلف فنون کی کتابیں شائع کر رہی ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۴۰ء میں علم حیات جلد دوم، کیمیا جلد دوم، اور حسابیات شائع ہوئیں۔ اس جامعہ نے ارادہ کیا ہے کہ ٹامل گیتوں کا مجموعہ ۱۲ جلدوں میں شائع کرے۔ چنانچہ پہلی چار جلدیں زیر طبع ہیں۔ یہ جامعہ اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالوں کی طباعت کا بھی اہتمام کرتی ہے۔ تجاور کے ناٹکوں پر ایک کتاب شائع ہوئی ہے اور چینجی کی تاریخ پر ایک کتاب زیر طبع ہے۔

کلکتہ کی جامعہ نے اپنے سائنس کالج کو ایک تحقیقاتی ادارہ کے طور پر مزید ترقی دینے کی تجاویز پیش کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔

کلکتہ کی جامعہ کے زیر غور یہ امر ہے کہ جامعہ کے ساتھ فن تعمیر کی ایک درسگاہ قائم کی جائے۔

سنہ ۴۱-۱۹۴۰ء کے دوران میں آگرہ کی جامعہ میں مندرجہ ذیل امور کا انتظام عمل میں آیا۔

ا۔ شعبۂ طب کا قیام اور آگرہ کے میڈیکل کالج کا الحاق جامعہ سے۔ حکومت نے باوجود مالی مشکلات کے عمارت اور ساز و سامان کے لئے بڑی اعانت کی۔ جامعہ کے زیر اہتمام ام، بی، بی ایس کا پہلا فوقانی امتحان بھی ہوا۔

۳۔ ٹریننگ کالج کا بمقام اجمیر افتتاح ہوا اور اس کا الحاق جامعہ سے عمل میں آیا۔ راجپوتانہ سنٹرل انڈیا اور گوالیار کے بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کی جانب سے یہ کالج کھولا گیا ہے۔ اور جنگ کی مشکلات کے باوجود بورڈ نے بڑی کشادہ دلی سے اس کالج کے انتظامات میں رقم صرف کی۔ جامعہ نے اپنے ہاں بی ٹی ڈگری کا انتظام منظور کیا۔

ڈھاکہ کی جامعہ نے فن حرب کو بی، اے۔ بی، ایس، سی اور بی کام کے امتحانوں میں مضمون اختیاری کے طور پر جاری کیا۔ الہ آباد کی جامعہ میں بھی فن حرب کی تعلیم کا انتظام ہے چنانچہ ۵۰ طلبہ اس فن کی تحصیل میں مصروف ہیں۔

بنارس ہندو یونیورسٹی میں سنسکرت کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد سر ایس رادھا کرشنن وائس چانسلر نے رکھا۔ اس عمارت کی تعمیر کے لئے سیٹھ جی، ڈی برلا نے ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ دیا۔ برلا خاندان کے افراد نے اس جامعہ کو اس کے قیام سے اب تک دس لاکھ روپیہ کا عطیہ دیا ہے۔

اناملی کی جامعہ نے حسب ذیل عطیات حاصل کئے۔

۱۔ مہاراجہ ٹراونکور۔ ایک لاکھ روپیہ۔ مہاراجہ کو کانوکیشن اڈریس پڑھنے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔

۲۔ کاسی مٹ کے سوامی ۱۳ ہزار روپیہ۔ بعض سالانہ انعامات کے لئے۔ ۳۔ حکومت مدراس سے اس کی سالانہ امداد ایک لاکھ نو ہزار روپیہ ہیں۔ مزید ۲۱ ہزار روپیہ سالانہ کا اضافہ تاکہ وائس چانسلر کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔ ۴۔ راجہ اناملی ۹ ہزار روپیہ۔ مہاراجہ ٹراونکور کی آمد کی خوشی میں۔

آنریبل مسٹر ونسنٹ ماسی (کناڈا) نے ہندوستان سے اپنی ہمدردی کے اظہار میں سالانہ ۲ ہزار اسٹرلنگ کا ایک وظیفہ ایک ایسے ہندوستانی طالب علم کے لئے مقرر کیا جو ٹورنٹو کی جامعہ میں مابعد طلبیانی تعلیم حاصل کرے۔

الہ آباد کی جامعہ میں طلباء کی تعداد ۲۳-۱۹۲۲ء میں صرف ۷۴۰ تھی۔ اس کے بعد ہر سال اضافہ ہوتا گیا

تاآنکہ سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں طلبہ کی تعداد ۱۴۸۲۴ ہوگئی۔ خواتین کی تعداد ۸۴۸ تھی۔ تحقیقاتی کام کرنے والے طلبہ کی تعداد ۶۴ تھی۔ ۶ طلبہ نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

بمبئی کی جامعہ سے ملحقہ کلیات میں طلبہ کی تعداد مارچ سنہ ۱۹۴۲ء کے اختتام پر ۲۰۸۱۴ تھی۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں طلبہ کی تعداد ۱۱ ہزار ۵ سو ۷۵ تھی۔ گویا اس پانچ سال کے دوران میں ۹۲۳۹ طلبہ کا اضافہ ہوا۔

آگرہ کی جامعہ سے ملحقہ کلیات میں ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء کو ۵۱۱۴ طالب علم زیر تعلیم تھے۔

سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں ڈھاکہ کی جامعہ میں طلبہ کی تعداد ۲۰۴۸ تھی۔ اناملی کی جامعہ میں سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں ۵۲۴ طلبہ کا داخلہ عمل میں آیا۔ زیر تعلیم طلبہ کی تعداد ۴۰۰ تھی۔ ٹراونکور کی جامعہ میں طلبہ کی تعداد سنہ ۴۱-۱۹۴۰ء میں ۱۱۶۳ تھی۔ اس سے پہلے یہ تعداد ۱۰۴۳ تھی۔

بمبئی کی جامعہ کے امتحانات بابتہ سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں طلبہ کی کل تعداد ۲۸ ہزار ۱۰۶ تھی۔ مقالہ کے ذریعہ جو امتحانات لیے جاتے ہیں ان کے طلبہ کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔ میٹرک کے امتحان میں ۹ ہزار طلبہ شریک ہوئے اور ۵ ہزار ۳ سو ۳۱ امیدوار یا فی صد ۲۵.۶ امیدوار کامیاب ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ (فنون) کے امتحان میں ۹۱۰۴ طلبہ شریک ہوئے جن میں سے ۱۸۴۲ فی صدی ۲۳.۶۰ طلبہ کامیاب ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ (سائنس) کے امتحان میں ۶۲۵۳ طلبہ شریک ہوئے اور ۷۹۶۱ یا فی صدی ۶۱.۰ طلبہ کامیاب ہوئے۔ بی۔اے میں ۲۱۰۲ طلبہ شریک امتحان ہوئے۔ ان میں سے ۸۹۵۱ یا فی صدی ۴۲.۷۹ طلبہ کامیاب ہوئے۔ بی۔ایس۔سی کے امتحان میں ۷۵۸ طلبہ شریک اور ۳۴۲۶ یا فی صدی ۴۱.۹ ۴۷ کامیاب ہوئے۔ ام۔اے میں ۶۳۳ طلبہ شریک اور ۲۱۰ کامیاب۔ ام۔ایس۔سی بذریعہ مقالہ میں ۴۸ طلبہ شریک اور ۲۷ کامیاب ہوئے۔ ام۔ایس۔سی۔ بذریعہ پرچہ جات میں ۱۸ طالب علم شریک ہوئے ۱۰ کامیاب ہوئے۔

ڈی ایس سی کے امتحان میں ایک طالب علم شریک اور کامیاب ہوا۔ پی ایچ ڈی کے امتحان میں ۴۳ طالب علم شریک اور ۳۰ کامیاب ہوئے۔ ال ال بی ابتدائی میں ۸۹۸ شریک اور ۷۸۲ کامیاب ہوئے (فی صدی ۶۸ء ۸۷) ال ال بی آخری میں ۶۵۳ شریک اور ۲۰۶ کامیاب ہوئے۔ (فی صدی ۳۱ء۵۴)۔ ال ال ایم میں ۱۱ شریک اور ۶ کامیاب ہوئے۔

۴۲-۱۹۴۱ء میں آگرہ کی جامعہ کے امتحانات میں مجموعی طور سے ۴۰۸۷ طلبہ شریک ہوئے۔ امتحانات کے نتائج حسب ذیل ہیں۔

امتحان	شریک	کامیاب	فی صد
بی۔ اے	۱۲۱۱	۷۵۵	۶۳ء ۳
ام۔ اے ابتدائی	۲۵۰	۲۰۷	۸۲ء۸۰
ام۔ اے آخری	۱۸۶	۱۱۵	۶۱ء۸۲
بی ایس سی	۲۹۳	۱۹۳	۶۵ء۸
ام ایس سی ابتدائی	۵۳	۴۴	۸۳ء۰۱
ام ایس سی آخری	۳۷	۳۶	۹۷ء۲۹
ال ال بی ابتدائی	۴۴۱	۲۴۹	۵۶ء ۴
ال ال بی آخری	۳۶۲	۲۷۴	۷۵ء ۶

ڈھاکہ کی جامعہ کے نتائج بابتہ ۴۲-۱۹۴۱ء کی صراحت حسب ذیل ہے۔

یم اے پہلا حصہ	۷۴ء ۲	یم ایس سی پہلا حصہ	۶۶ء ۲
یم اے دوسرا حصہ الف	۸۴ء ۷	یم اے دوسرا حصہ ب	صد فی صد
یم ایس سی دوسرا حصہ	۹۱ء ۵	بی ایس سی زراعت	۸۶ء ۴

بی، اے آنرز آخری	۷۶٫۶	بی، اے	۴۹٫۹۴
بی، ایس، سی آنرز آخری	۶۰٫۰	بی، ایس، سی	۸۴ فی صد
بی، ال، ابتدائی	۷۰ فی صد	بی، ال آخری	صد فی صد

ٹراونکور کی جامعہ کے امتحانات بابتہ مارچ ۱۹۴۲ء میں کلیات جامعہ سے جو طلبہ شریک ہوئے ان کے نتائج کا حال حسب ذیل ہے۔

امتحان	شریک	کامیاب	فی صد
انٹرمیڈیٹ	۲۸۸	۱۴۳	۴۹٫۶۵
بی، اے	۵۸	۲۹	۵۰
بی، ایس، سی	۱۳۳	۷۰	۵۲٫۶۳
بی، ایس، سی آنرز	۸	۸	۱۰۰
بی، اے آنرز	۱۵	۱۵	۱۰۰
ام، اے	۲	۲	۱۰۰
ال، ٹی	۸۰	۶۵	۸۱٫۲۵
بی، ال	۴۶	۳۵	۷۶٫۰۸

اناملی کی جامعہ کے جو امتحانات مارچ ۱۹۴۲ء میں ہوئے تھے۔ ان کے نتائج سے واضح ہے کہ انٹرمیڈیٹ کا نتیجہ ۶۲٫۳۵ تھا۔ بی، اے اور بی، ایس، سی کے امتحان کے کسی مضمون میں نتیجہ ۶۵ فی صد سے کم نہیں ہے۔ بی، اے آنرز کے ہر مضمون میں نتیجہ صد فی صد رہا۔

الہ آباد کی جامعہ کے کتب خانہ میں ایک لاکھ ۶ ہزار ایک سو ۹۵ کتابیں مخزون ہیں۔ ٹراونکور کی جامعہ

ملحقہ کتب خانوں میں کتابوں کی تعداد ۲۹ ہزار ایک سو ۲۵ ہے۔ اور انامِلی کی جامعہ کے کتب خانہ میں ۶۲ ہزار ۷ سو ۲۱۔

بمبئی کی جامعہ کے دارالمطالعہ میں ۳۰۲ مجلّے اور رسالے آتے ہیں۔ الہ آباد کی جامعہ میں ۳۷۷۔ انامِلی کی جامعہ ۲۲۵ مجلّے اور رسالے خریدتی ہے۔ اس کے مجلّے کے تبادلہ میں اور عطیہ کے طور پر مزید ۳۸ مجلّے وصول ہوتے ہیں۔

الہ آباد کی جامعہ کا متوالی خرچ ۱۹۴۱-۴۲ء میں ۱۱ لاکھ ۵۸ ہزار روپے تھا۔ بمبئی کی جامعہ کے اخراجات ۱۵ لاکھ ۹۳ ہزار ۹ سو ۵۵ روپے۔ انامِلی کی جامعہ پر ۱۹۴۲ء میں ۵ لاکھ ۷۰ ہزار ۴ سو روپے خرچ ہوئے۔

آگرہ کی جامعہ نے اپنے ہاں امتحان کے پرچوں کے تبصرہ کے طریقہ کو منسوخ کر دیا ہے۔

ٹراونکور کی جامعہ میں دیسی ورزش کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

ڈھاکہ کی جامعہ میں صدر و میر شعبہ قانون کی جگہ خالی ہونے پر ہنگامی طور پر ایک بڑے عرصہ کے لئے مسٹر پی سی گھوش (وکیل سرکار) کو اس خدمت پر مامور کیا۔ موصوف نے ان خدمات کا کوئی معاوضہ حاصل نہیں کیا۔

انجمن طیلسانیین عثمانیہ اور اسکی ملحقہ جماعتوں کی اطلاعات

اطلاعات انجمن

اس دوران میں انجمن نے عام سرکاری تعطیلات پر غور کیا۔ اس خصوص میں کابینہ کے پیش نظر جو یادداشت تھی وہ حسب ہدایت کابینہ مجلہ میں شائع کی جاتی ہے جو حسب ذیل ہے۔

مملکت آصفیہ اور عام تعطیلات

۲۴ ربیع الثانی ۱۲۸۲ھ سے پہلے جمعہ کے دن کے علاوہ ۱۹ یوم کی تعطیل ہوا کرتی تھی۔ ان ۱۹ یوم کی تفصیل ذیل ہے ان کے من جملہ صرف محرم میں تین روز ۵، ۹ اور ۱۰ تاریخ کو اور ۲۷ رجب کو بلالحاظ قوم و مذہب عام تعطیل ہوا کرتی تھی گویا جمعہ کے علاوہ صرف ۴ یوم کی تعطیل سال بھر میں ہوا کرتی تھی۔ باقی تعطیلات یا تو مسلمانوں سے متعلق تھے یا ہندوؤں سے مسلمانوں کے لئے تعطیل کے دن حسب ذیل تھے۔

۱۴ شعبان، ایک یوم اور ۲ و ۳ شوال، تین یوم ۱۲ ربیع الاول، ایک یوم ۱۰، ۱۱ و ۱۲ ذیحجہ تین یوم۔

ہندوؤں کے لئے تعطیل کے دن یہ تھے۔

شیوراتری ایک یوم، ہولی۔ دو یوم، اوگادی، ایک یوم، راکھی پونم۔ ایک یوم جنم اشٹمی ایک یوم۔ دسہرہ، ۲ یوم۔ دیوالی، ایک یوم۔

بعدازاں آہستہ آہستہ تعطیلات میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کی تفصیلات طویل ہیں۔ البتہ جمعہ کا معاوضہ ملنے کا جو طریقہ جاری ہوا اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ جب ۱۲۸۸ھ میں کوہ مولا کا عرس جمعہ کے دن واقع ہو گیا اس کا معاوضہ دوسرے دن دیا گیا۔ بعد ازاں خاص خاص تعطیلات میں مدارالمہام کے حکم سے معاوضہ ملتا تھا مقامی تعطیلات میں پہلی تعطیل عرس گلبرگہ کی ملنے لگی اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ ۲۹ ۱۲۹۳ھ میں سلطے سے جاری ہوئی۔ نواب مکرم الدولہ صدرالمہام مالگزاری کی تحریک سے ۵ یوم کی تعطیل اضلاع صوبہ گلبرگہ، میدک، بیدر کی حد تک منظور ہوئی۔

تعطیلات کا یہی نظام جاری رہا۔ یعنے چند عام تعطیلات۔ چند تعطیلات مخصوص بہ اہل اسلام اور چند تعطیلات مخصوص بہ ہنود۔ ایک مقامی تعطیل۔

۱۹۰۹؁ / ۱۳۲۷ف میں مولوی مشتاق حسین وقار الملک نے نواب سر آسمانجاہ صدر المہام عدالت کی صواب دید سے مدار المہام کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ

صیغہ عدالت کی تعطیلات کا جو طریقہ اس وقت جاری ہے۔ وہ اصلاح طلب ہے کیونکہ اس کی تعمیل ناممکن کے قریب قریب ہے اس وجہ سے اکثر مواقع پر اس کی تعمیل نہیں ہوتی اور بعض خاص مواقع پر دقتیں پیش آتی ہیں۔ اس لئے اصلاحات ذیل ضروری ہیں۔

ا۔ تعطیلات کے ساتھ قید اہل اسلام اور ہنود جو لگی ہوئی ہے اوٹھ جانی چاہیئے اور عام تعطیلات سب فرقوں کے لئے عام کردی جائیں کیونکہ اکثر ایسا ہوا کرتا ہے کہ ناظم مسلمان ہے تو بعض عملہ ہنود ہے۔ اگر مدعی ہنود سے ہے تو مدعی علیہ مسلمان ہے بعض وکلاء اگر مسلمان ہیں تو بعض ہنود بھی ہیں۔ گواہوں کی تعداد ہر فرقہ سے ہوا کرتی ہے۔

نواب وقار الملک مرحوم نے اپنی یادداشت کے ذریعہ بعض تعطیلات کے اضافہ کی تحریک کی مسلمانوں کی بھی اور ہندوؤں کی بھی۔

مسلمانوں کے حسب ذیل تعطیلات کی سفارش کی۔

تعطیلات عید الفطر تین یوم کے بجائے پانچ یوم۔ شب برات دو یوم کے بجائے تین یوم شب قدر کیلئے ایک یوم

ہندوؤں کے حسب ذیل تعطیلات کی سفارش کی۔

گنیش چوتھ ایک یوم۔ اننت چتورودشی ایک یوم۔ بسنت ایک یوم۔

نیز یہ تحریک بھی کی کہ تعطیل عیدین کے درمیان جمعہ واقع ہوجائے تو اس کا معاوضہ ملنا چاہیئے۔ نیز یہ بھی کہ سورج گہن اور چاند گہن کی تعطیل بھی ہونی چاہیئے۔

دوسرے صدر المہاموں کی رائے لے کر نواب مختار الملک نے جمعہ کے معاوضہ کے سوا مولوی مشتاق حسین کی سب باقی تجویزیں منظور کریں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسی وقت تعطیلات کی کثرت کا احساس ہوا چنانچہ ۱۳۲۰ھ میں نواب اعظم السلطنت

مدار المہام کے حکم سے شب برات عید الفطر اور عید الضحیٰ سے ایک ایک روز گھٹا دیا گیا لیکن مزید تعطیلات کا سلسلہ کچھ نہ کچھ جاری رہا تعطیلات مختص بہ مقام میں اورنگ آباد کے صوبہ کے لئے حضرت زرزری بخش کے عرس کیلئے تین روز کی تعطیل منظور ہوئی۔ سالگرہ قیصر ہند کی تعطیل بھی مقرر ہوئی اور تعطیلات مختص بہ عیسائیاں کا قاعدہ بھی جاری ہوا۔

بہرحال ۱۳۰۷ف ۱۲۹۹ھ میں جو تعطیلات جاری تھے وہ حسب ذیل ہیں۔

عشرہ محرم - ۸ یوم - ۵ - سے ۱۲ تک - آخری چہار شنبہ ۱ یوم - روز ولادت پیغمبر اسلام - ۱ یوم ۱۲ ربیع الاول سالگرہ اعلیٰحضرت ۱ یوم - ۶ ربیع الثانی - روز وفات شیخ عبد القادرؒ - ۱ یوم ۱۱ ربیع الثانی - شب برات ۲ یوم ۱۳ و ۱۴ شعبان - لیلۃ القدر - ۱ یوم - ۲۷ رمضان - عید الفطر - ۴ یوم یکم تا ۴ - شوال - عید الضحیٰ ۴ یوم ۹ - ذی الحجہ سے ۱۲ تک - اوگادی ۱ یوم - راکھی پونم - ۱ یوم - جنم اشٹمی ۱ یوم - گنیش چوتھ ۱ یوم - اننت چتودشی ۱ یوم - دسہرہ - ۲ یوم - دیوالی - ۱ یوم - بسنت ۱ یوم - شیوراتری - ۱ یوم - ہولی - ۲ یوم - سالگرہ قیصرہ ہند - ۱ یوم

میزان (۳۹ یوم)

اس زمانہ میں یہ قاعدہ قائم ہوگیا کہ جو کسی عام تعطیل کے درمیان واقع ہو جائے تو اس کا معاوضہ ختم تعطیل کے دوسرے روز ملیگا۔ ان کے علاوہ سورج گہن اور چاند گہن کی تعطیل بھی مقرر تھی۔

اعراس کے لئے تعطیلات مختص بہ مقام صرف حسب ذیل مقرر تھے۔

عرس حضرت زرزری بخش ۳ یوم - صوبہ غربی۔

" " جمال بہار " ۲ یوم بلدہ و بھونگیر

" " خواجہ معین الدینؒ ۱ یوم بلدہ

" کوہ مولیٰ ۲ یوم بلدہ بھونگیر وغیرہ

" خواجہ بندہ نوازؒ " ۴ یوم گلبرگہ وغیرہ

تعطیلات مختص بہ اقوام کی تفصیل حسب ذیل تھی

عیسائیوں کے لئے

کرسمس ۵ یوم - ایسٹ وڈنس ڈے ایک یوم - گڈ فرائی ڈے یک یوم۔

پارسیوں کے لئے ۔ عید نوروز ۔ ایک یوم

مولوی صفی الدین نے اپنی تالیف "پنجاہ سالہ جنتری" میں (جس سے یہ مواد ماخوذ ہے) لکھا ہے کہ "اس وقت دفتر پولیٹیکل میں تقلیل تعطیلات کا مسئلہ زیر غور ہے ۔ بعض عہدہ دار اس سے موافق ہیں اور بعض مخالف"

معلوم ہوتا ہے کہ اس غور وخوض کا کچھ مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا ۔ کیونکہ بیس، اکیس برس کے بعد ۱۳۲۲ف میں جو تعطیلات مقرر تھے ان میں اور ۱۲۹۹ف کی تعطیلات میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے ۔ اضافہ ہی ہوا ہے کمی بہت کم ۔ جو فرق ہے وہ یہ ہے ۔

آخری چہار شنبہ کی تعطیل حذف ہوگی ۔ دیوالی میں ایک یوم کا اضافہ ہوا عید الضحیٰ میں ایک یوم کا اضافہ ہو ۔ شب قدر میں تین دن کا اضافہ ہوا ۔

اس طرح سابقہ تعطیلات میں ایک دن کم کرکے ۵ یوم کا اضافہ ہوا اس طرح ۱۳۲۲ف میں جمعہ کے علاوہ تعطیلات کی تعداد ۳۴ یوم قرار پائی ۔ تعطیلات مختص بہ مقام میں بھی اضافہ ہوا ۔ البتہ تعطیلات مختص بہ اقوام میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ۔

۱۳۲۰ف سے تعطیلات میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا چنانچہ اس وقت جمعہ کے علاوہ جو عام تعطیلات ۱۳۵۲ف کے لئے مقرر ہیں ان کی تعداد ۴۰ یوم ہے ان میں ۲ یوم جمعہ کے دن واقع ہوئے ہیں

اس دوران میں تعطیلات مقامی میں بھی بکثرت اضافہ عمل میں آیا ہے ۔ ۱۳۲۲ف میں صرف ۵ مقامات پر تعطیل مختص بہ مقام ہوتی تھی تو اب (۲۱) مقامات پر تعطیل ہوتی ہے ۔ یہ تعطیل آدھے دن سے لے کر تین دن تک ہوتی ہے ۔

تعطیلات مختص بہ اقوام میں بھی اضافہ ہوا ہے ۔ پہلے یہ تعطیلات صرف عیسائیوں اور پارسیوں کی حد تک ہوا کرتے تھے ۔ اب دوسروں کے لئے بھی ایک ایک دو دو یوم کی تعطیل مقرر ہوگئی ہے ۔

فی الوقت سال بھر میں آٹھ دن ایسے ہیں کہ دفتر صدر محاسبی صبح کا ہوتا ہے ۔ دوسرے دفاتر اپنے معمولی وقت پر کھلتے اور بند ہوتے ہیں ۔ اس عمل درآمد سے مشکلات پیدا ہوا کرتے ہیں ۔

بہرحال ملازم سرکار کے لئے ۸۰ دن عام تعطیل کے مقرر ہیں اسکے علاوہ۔

۵۲ دن سال بھر کے یوم جمعہ کے ہیں۔

۱۵ دن رخصت اتفاقی کے۔

۳۰ دن رخصت خاص کے۔

اس طرح ایک ملازم سرکاری ۱۷۷ یا دوسرے الفاظ میں ۵ ماہ ۲۷ یوم چھٹی منایا کرتا ہے۔ اگر ان ۱۷۷ دن میں سے ۲۲ ایوم وہ نکال دیئے جائیں جو دوسری تعطیلوں میں ضم ہوگئے ہیں تو جب بھی (۱۵۵) دن یا ۵ ماہ ۵ ایوم تعطیل کے ہیں۔

سال گزشتہ کے جلسہ تقسیم انعامات میں عثمانیہ ٹریننگ کالج کے صدر نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی کہا کہ "ہماری بے موقع تعلیم کش تعطیلات کے درحقیقت یہ معنی ہیں کہ کم وبیش ۱۵۰ ایام کار میں سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ زمانہ کے حالات اس تیزی سے کروٹ بدل رہے ہیں کہ ہمارے ہاں کی تعطیلات کا مسئلہ دن بدن اہم ہوتا جاتا ہے"

اس کے جواب میں صدر اعظم بہادر نے ارشاد فرمایا کہ

"میں خود اسے محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے ہاں تعطیلات سب جگہ سے زیادہ ہوتی ہیں۔ یہ مسئلہ نہ صرف حکومت سرکار عالی کے زیر غور ہے بلکہ یہاں کی پبلک کی بھی توجہ کا محتاج ہے کہ وہ اس اقتصادی تقابل کے زمانہ میں اپنے ملک کے سال میں کتنے روز کام کرنے کے لئے رکھنا چاہتے ہیں"

اطلاعات مجلس نمایش

(۱) نمایش مصنوعات مملکت آصفیہ کی تنظیم میں مزید خوش اسلوبی پیدا کرنے کی غرض سے اس کے شرائط شرکت میں چند ترمیمات جلسہ عام نے منظور کئے تھے۔ اب دفتر رجسٹرار کمپنی ہائے سرمایہ مشترکہ سے ان کی توثیق ہوچکی ہے۔ آیندہ سے مجلس نمایش کا جملہ کاروبار یکم شہریور سے شروع ہوگا۔ اور آخر امرداد پر ختم ہوگا۔ اس سے قبل یکم آذر سے سال کا آغاز ہوتا تھا اور یکم ذی الحجہ تک نمایش کے انتظامات کے لئے بہت ہی کم وقت ملتا تھا۔ مجلس نمایش کا موازنہ چار یا پانچ ہزار سے تجاوز کرکے چالیس پچاس ہزار روپئے تک پہونچ گیا ہے اس لئے

آیندہ سے موازنہ کی منظوری جلسہ عام سے ہوا کرے گی نمایش کا طریقہ کار اور بجٹ بھی جلسہ عام منظور کرے گا۔

اس کے علاوہ مجلس عاملہ کے ارکان کی تعداد میں پندرہ کی حد تک اضافہ کر دیا گیا ہے جس میں سے ایک رکن ایسا ہوگا جو صنعتی یا تجارتی مفادات کا نمایندہ ہو۔ ایک رکن محکمہ صنعت و حرفت سرکار عالی نامزد کرے گا تین ارکان کو مجلس عاملہ معاشی کمیٹی نامزد کرے گی۔ اس سے قبل مجلس نمایش کے ارکان کی تعداد ایک سو تھی جو مکمل ہو چکی تھی۔ ترمیم شرائط شرکت کے لحاظ سے ارکان کی تعداد ایک سو پچاس مقرر کر دی گئی ہے۔

(۲) مجلس نمایش کی مالیاتی کمیٹی کے تصفیہ کے بموجب روشنی کے پنڈال کی آمدنی اور ٹکٹ سے حاصل شدہ رقم رسدی جنگی فنڈ میں ایک ہزار دو سو بیالیس روپیہ بارہ آنہ ایک پائی کی امداد دی گئی۔ سال حال شعبہ تفریحات کا کام سال ہائے گذشتہ کے مقابلہ میں بہتر رہا۔ آمدنی بھی اس سال زیادہ ہوئی اور اس شعبہ کو خود مکتفی بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس اصول کے پیش نظر تفریحات کمیٹی نے سررشتہ ریلوے سے اشتراک عمل کر کے معاہدہ کے ذریعہ تفریحات کے مختلف سامان فراہم کئے اور اپنی آمدنی کا حصہ رسدی جنگی فنڈ میں دیدیا۔

(۳) نلگنڈہ کی نمایش منعقدہ [illegible] میں مجلس نمایش کے توسط سے حیدرآباد کے چند صناعوں نے حصہ لیا۔ خواجہ حمید احمد صاحب معتمد معاشی کمیٹی اور شرف الدین صاحب معتمد مجلس نمایش نے اس نمایش میں شرکت کی جو انعامات کمیٹی کے ارکان مقرر کئے گئے تھے۔

(۴) مجلس نمایش کے سالانہ انتخابات کے نتائج حسب ذیل رہے۔

صدر:۔ احمد محی الدین صاحب بی۔ اے (کنٹب) ناظم سررشتہ تجارت و حرفت

نائب صدر:۔ رائے گرو داس صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (عثمانیہ) بیرسٹر

معتمد:۔ شرف الدین صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) مددگار کیمیا انجینیر اے۔ آر۔ پی

نائب معتمد:۔ محمد عبد العلی صاحب۔ بی۔ ایس۔ سی، ایل، ایل، بی (عثمانیہ) وکیل ہائیکورٹ

خازن:۔ میر محمود علی صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) لکچرار جامعہ عثمانیہ

اراکین:۔ (۱) میر اکبر علی خاں صاحب۔ بیرسٹر

(۲) خان صاحب عارف صاحب۔ کمشنر انجینیر سررشتہ برقی

(۳) محمد غوث صاحب ایم، اے، ال ال بی (عثمانیہ)

(۴) رائے شنکرجی صاحب بی، اے، ال، ال بی (عثمانیہ) مددگار امیر محکمۂ بلدیہ

(۵) برہان الدین حسین صاحب بی، اے، جی۔ مہتمم مزرعہ حمایت ساگر

نمایندگان معاشی کمیٹی

(۱) ظہیر الدین احمد صاحب ایچ سی ایس شریک معتمد فینانس

(۲) ایل، این گپتا صاحب ایچ، سی، ایس، ملٹری اڈوائزر

(۳) خواجہ حمید احمد صاحب بی، اے (عثمانیہ) مددگار ناظم اعداد و شمار

نمایندہ سررشتہ تجارت و حرفت

بی، کے کنگوان صاحب انڈسٹریل انجینیر سررشتہ تجارت و حرفت

صدر سال ماسبق

ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی

عثمانیہ بلدی جماعت

اس دوران میں جماعت ہذا کے مجلس عاملہ کے تین جلسے منعقد ہوئے۔ جن میں بلدی امور کے متعلق غور کیا گیا اور حلقہ داری تنظیم کے متعلق عملی اقدام شروع کیا گیا ہے۔ مولوی غلام مصطفی صاحب کا تقرر اور مولوی حبیب اللہ صاحب فاروقی کا منصفی پر تبادلہ ہوا نیز دو ایک ارکان کی عدم مصروفیت کی وجہ سے اختتام سال تک کے لئے حسب ذیل جدید اصحاب کا انتخاب کیا گیا۔

(۱) مولوی محمد غوث صاحب ایم، اے، ال ال، بی (عثمانیہ) (۲) مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی، اے (عثمانیہ)

(۳) مولوی شرف الدین صاحب بی، اے (عثمانیہ) (۴) مولوی عبدالعلی صاحب بی ایس سی ال ال، بی (عثمانیہ) معتمد

اب جبکہ نواب ڈاکٹر ناظر یار جنگ بہادر صدر جماعت اپنے طویل دورہ سے واپس آچکے ہیں۔ توقع ہے کہ جماعت بلدی امور میں شہریوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرے گی۔

چھٹی نمائش مصنوعات مملکت آصفیہ

بابتہ سنہ ۱۳۵۳ف

بمقام باغ عام بلدہ حیدرآباد

یکم ذیحجہ سنہ ۱۳۶۲ھ تا ۲۹ ذیحجہ سنہ ۱۳۶۲ھ

مطابق

۲۵ - دے سنہ ۱۳۵۳ف تا ۲۴ بہمن سنہ ۱۳۵۳ف

مطابق

۳۰ نومبر سنہ ۱۹۴۳ء تا ۲۸ دسمبر سنہ ۱۹۴۳ء

زیر اہتمام

مجلس نمائش معاشی کمیٹی حیدرآباد (انجمن طیلسانین عثمانیہ)

تفصیلات اعزازی معتمد مجلس نمائش - معظم بلڈنگ سے

حاصل کئے جاسکتے ہیں!

ٹیلیفون نمبر (۲۵۵۳)

مجلّۂ طیلسانیین

حصّہ

معاشیات

دوسری جلد۔ امرداد ۱۳۵۲ف۔ جولائی ۱۹۴۳ء جمادی الثانی ۱۳۶۲ھ تیسرا شمارہ

مدیر مجلّۂ طیلسانیین: محمد غوث ام اے۔ ال ال بی (عثمانیہ)

فہرست مضامین

صفحہ

حرفِ آغاز

مجلس نمائش نے اپنی رضا کارانہ جدو جہد سے ملک کے طول و عرض میں جو نام نیک حاصل کیا ہے وہ سب خدمت گزاروں کے لئے باعثِ ہمت ہے۔ کام کرنے اور آگے بڑھنے کے لئے جو میدان ہے اسکی وسعت کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا۔ بہرحال کسی نہ کسی وقت کچھ نہ کچھ کام نیا ہو ہی جاتا ہے۔

مجلس نمائش کی سرپرستی میں چند سرگرم نوجوانوں کی جماعت نے امرداد ۱۳۵۲ف کے پہلے ہفتہ میں پہلی مرتبہ آموں کی نمائش کے انعقاد کا بیڑا اٹھایا۔ پہلی کوشش میں جو کامیابی حاصل ہوئی وہ مستحق مبارک باد ہے۔

آموں کی نمائش کیوں ہونی چاہیئے؟ اس کا جواب مولوی مسعود علی صاحب محوی کی اس تقریر سے مل جاتا ہے جو صاحب موصوف نے نشر گاہ حیدرآباد سے نشر فرمائی اور اخبار مملکت کی اشاعت مورخہ ۲۷ر امرداد ۱۳۵۲ف میں شائع ہوئی۔

ہمارے ملک نے اپنی صنعت، اپنی تجارت اور اپنی زراعت کے قدیم شاندار کارنامے بھلا بیٹھے ہیں۔ فلاحت میں بھی ہمارا ملک ایک زمانہ میں ترقی یافتہ تھا۔ دولت آباد، اورنگ آباد اور بیدر اپنے میووں کیلئے بھی مشہور تھے۔ انگور، انجیر اور امرود مشہور تھے۔ مولوی بشیر الدین مرحوم نے لکھا ہے کہ اورنگ آباد میں جو انجیر ہوتا تھا اتنا بڑا اور شاداب انجیر شاید کہیں اور ہوتا ہو۔ لیکن اب حیدرآباد کے بازاروں میں باہر کا میوہ غالب ہے اور سالانہ پچاس لاکھ روپے کا میوہ باہر سے آتا ہے۔ خود آم جس کے لئے ہمارے ملک کی سرزمین اور آب و ہوا بالکل موافق ہے زیادہ تر باہر سے آرہا ہے۔ مندرجہ ذیل کیفیت سے جو نمائش میں پیش کی گئی تھی حقیقت حال روشن ہوگی۔

"مقطعہ کوٹپال تعلقہ سدی پیٹ بلدۂ حیدرآباد سے ۳۰ میل پر واقع ہے۔ اس مقطعہ کی امرائی تقریباً ایک صدی سے موجود ہے۔ یہاں پر ۲۰، ۲۵ اقسام کے قلمی درخت موجود ہیں۔ ان میں سے بعض درختوں کی عمر اس وقت ۸۰ سال سے بھی زاید ہے۔ چالیس سال قبل یہاں کی امرائی حیدرآباد کی مشہور امرائیوں میں شامل تھی۔ ملغوبہ آم ایک سیر سے زیادہ وزنی ہوتا تھا۔ دوسرے آموں کا بھی یہی حال تھا۔ اس وقت بھی بلدہ حیدرآباد د

اطراف بلدہ میں تجارتی نقطۂ نظر سے مقطعۂ کوٹیال کے مماثل گنتی کے چند ہی باغ ہیں جہاں فصل اچھی ہونے کی صورت میں ساٹھ ستر بنڈی آم ایک ہی باغ سے حاصل ہوتا ہو۔

اضلاع راج مندری اور بجواڑہ سے ریل اور موٹر لاریوں کے ذریعہ جب سے کہ یہاں آموں کی برآمد ہونے لگی ہے تجارتی نقطۂ نظر سے حیدرآباد کے شہری پیوندی آم کی قدر گھٹنے لگی۔ چنانچہ ۲۰ سال قبل مقطعۂ کوٹیال سے آئی ہوئی ایک بنڈی آم کی قیمت ما فی ۱۵ سے ۲۰ تک وصول ہوتی تھی لیکن اب اوسطاً فی ۵ سے زیادہ رقم وصول نہیں ہوتی۔ ملغوبہ آم فی روپیہ دو سیر کے نرخ سے فروخت ہوتا تھا لیکن بیرونی آم کی برآمد کی وجہ سے پیوندی آم اب تخمی آموں کی قیمت پر فروخت ہوتا ہے۔

پٹرول راشننگ اور واگنوں کی قلت کے باعث اس سال بیرونی آم کی برآمد دس فی صدی سے زاید نہیں ہوئی اس کے طفیل میں ملکی آم اچھی قیمت سے فروخت ہوا"

اس حالت کو جاری رہنے دیا جائے تو اس سے بہت نقصان ہوگا۔ اس کے سد باب کیلئے نمایش کے ذریعہ تشویق و ترغیب کا سامان مناسب و برمحل ثابت ہوا۔

مملکت آصفیہ میں جو صنعتی کارخانے اور دوسرے معاشی ادارے موجود ہیں ان کے حالات سے عام طور پر بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ان کے حالات معلوم ہوں تو دوسروں کو ہمت اور ترغیب ہوگی۔ حیدرآباد میں بیٹھ کر اس عظیم الشان حرکت و برکت کا کوئی حقیقی اندازہ نہیں ہوسکتا جو سرپور کے کارخانۂ کاغذسازی، تانڈور کے کوئلہ کے معدن اور اعظم جاہی ملز وغیرہ میں نمایاں اور روشن ہے۔

مجلّہ کی ادارت نے ارادہ کیا ہے کہ مملکت آصفیہ کے معاشی اداروں کے معائنہ کا انتظام کیا جائے اور ضروری حالات مجلّہ کے صفحات پر پیش کئے جائیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ قبل کارخانۂ کاغذسازی، کوئلہ کی معدن اور اعظم جاہی ملز، ادارۂ قالین باقی، اور ورنگل کے مصنوعات محبس کا معائنہ مجلہ کے کارکنوں اور معاشی کمیٹی کے دو ایک ارکان نے کیا۔

ان کارخانوں اور معدن کو دیکھنے سے ملک کے وسایل ثروت و دولت کا تھوڑا بہت حقیقی اندازہ ہوا۔ یہ بات ثابت ہوئی کہ کسی کام میں انسان کامیابی حاصل کرنے کا ارادہ کرلے تو پھر ہر مشکل

خود کامیابی کا پیش خیمہ ہو جاتی ہے۔ حیدرآباد کنسٹرکشن کمپنی نے حیدرآباد کی صنعتی دنیا میں جو انقلاب پیدا کر دیا ہے وہ ہر طرح خوش آئند اور ہمت افزا ہے۔ ہر محب وطن کی یہ دلی اور مخلصانہ خواہش ہے کہ اس کمپنی کے ذریعہ حیدرآباد میں اور ایسے بیسیوں کارخانے قایم ہوں اور ہر طرف جوش و سرگرمی کا ویسا ہی مظاہرہ ہو جس کا ایک سرور انگیز نمونہ کارخانۂ کاغذسازی اور اسکی نوآبادی میں نظر افروز ہوتا ہے۔
مجلّہ کی آیندہ اشاعت سے ان کارخانوں اور اداروں کے حالات کا سلسلہ شروع کیا جائیگا۔

"موضع دوپلّی کی معاشی تحقیق" کے موضوع پر محمد ناصر علی صاحب ام۔اے لکچرار جامعۂ عثمانیہ کا جو مقالہ ایک عرصہ سے قسط وار شائع ہو رہا تھا وہ اس اشاعت میں بہ تمام وکمال شائع کر دیا گیا ہے جو ناظرین اس کا مکمل متن حاصل کرنا چاہیں وہ رعایتی قیمت سے حاصل کر سکینگے۔
واضح ہو کہ اس مقالہ کے ساتھ بعض ضمیمے بھی شامل ہیں جن میں موضع کے مختلف افراد کے بیانات درج ہیں یا دوسری ایسی تفصیلات ہیں جو عام ناظرین کے لئے زیادہ دلچسپی کا باعث نہیں ہو سکتیں۔ کاغذ کی گرانی کے باعث یہ ضمیمے ترک کر دیئے گئے ہیں۔ جو اصحاب ان امور سے واقف ہونا چاہیں وہ اصل مقالہ سے جو انجمن کے کتب خانہ میں محفوظ کیا گیا ہے استفادہ کر سکتے ہیں۔

معاشی کتب خانہ

معاشی کمیٹی کی جانب سے ایک معاشی کتب خانہ قائم کیا گیا ہے۔ یہ کتب خانہ حیدرآباد میں اپنی نوعیت کا اکیلا ادارہ ہے۔ عامۃ الناس بھی اس کتب خانہ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔
ہمدرد اصحاب کتب خانہ میں اضافہ کتب وغیرہ پر توجہ فرمائیں تو
باعث تشکر ہوگا

مسائل معاشیات حیدرآباد

از جناب مولوی حافظ محمد مظہر صاحب اعزازی معتمد حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

(سلسلہ شمارہ ۱ جلد ۷)

ریلوے بورڈ

ریلوے سے متعلق امور میں ایک مسئلہ ریلوے بورڈ کا بھی ہے۔ اسکی تشکیل کے متعلق چند گذشتہ حقایق کا اظہار ضروری ہے۔ برطانوی ہند کی سرکاری ریلوے اور نیز دوسرے علاقوں کی ریلوے پر نگرانی رکھنے اور رہبری کرنے کی غرض سے حکومت ہند میں ریلوے کاروبار کا اصول یہ ہے کہ ویسرائے کی کونسل میں ایک رکن کو سررشتہ حمل ونقل کا قلمدان حاصل رہتا ہے۔ اسکے تحت ایک ریلوے بورڈ ہوتا ہے جسکے تین چار ارکان ہوتے ہیں۔ اس بورڈ کا ایک صدر ہوتا ہے۔ یہ ریلوے بورڈ گویا معتمدی اور صدر نظامت کے فرائض انجام دیتا ہے۔ رکن سررشتہ حمل ونقل اس بورڈ کی صدارت نہیں کرتا۔ وہ نہ دوسری ریلوے کمپنیوں میں آفیشل ڈائرکٹر کی حیثیت سے شریک ہوتا ہے۔ ریلوے بورڈ کا جو کچھ فیصلہ ہوتا ہے وہ رکن سررشتہ حمل ونقل کے پاس پیش ہوتا اور اسکے اختیاری امور اسکے حکم سے اور اسکے اختیارات سے متجاوز امور ویسرائے یا کونسل کے سامنے لائے جاتے ہیں۔ اہم تر امور خود وزیر ہند کے تصفیہ کے لئے پیش ہوتے ہیں۔ جس زمانہ میں انگلش کمپنیاں ہندوستان میں ریلوے کاروبار چلاتی تھیں اس وقت انگلستان میں ایک خاص عہدہ دار آفیشل ڈائرکٹر کے طور پر ان کمپنیوں میں کام کرنے کے لئے رہتا تھا اور وہ وقتاً فوقتاً وزیر ہند اور حکومت ہند سے احکام حاصل کرتا تھا۔

ہماری ریلوے کمپنی جب انگلستان میں قائم ہوئی تھی تو اولاً یہہ ہوا تھا کہ ایک انگریز سرکار عالی کے آفیشل ریلوے ڈائرکٹر کمپنی کے بورڈ کے لئے نامزد کئے گئے اولاً نواب فتح نواز جنگ مرحوم پھر

شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی ...... ریلوے اور معدنیات کے سررشتوں کے بھی معتمد تھے اور ڈائرکٹر ملکپنی بھی صاحب موصوف ملازمت سرکاری سے سبکدوش ہوئے تو سررشتہ ہائے ریلوے و معدنیات سرجارج کیسن واکر کے سپرد ہوئے، سرجارج اولاً معتمد فینانس تھے بعد میں معین المہام فینانس ہوئے بعد میں ....

سر اکبر حیدری کو سرجارج کی ماتحتی میں معتمد فینانس مقرر کیا گیا۔ لیکن ریلوے کا صیغہ ان سے متعلق نہیں کیا گیا۔ کاغذات بلاواسطت معتمد فینانس ایک یورشین مددگار کے ذریعہ راست سرجارج کے پاس پیش ہوتے رہے۔ بظاہر یہ خیال قایم ہوتا ہے کہ سرجارج واکر یہ نہیں چاہتے تھے کہ ریلوے کے متعلقہ مسائل سے کسی ویسی اعلیٰ عہدہ دار کو سابقہ رہے سرجارج نے اپنی آفیشل ڈائرکٹری کی حیثیت بھی قائم رکھی مگر جب وظیفہ لیکر انگلستان چلے گئے تو سر ڈیوڈ بار وظیفہ یاب رزیڈنٹ نے اس عہدہ کی خواہش کی مگر سرجارج واکر نے یہ عہدہ اپنے لئے حاصل کرلیا بعد اس کے بعد ....

سر جنالڈ گلانسی معین المہام فینانس اور ریلوے ہوئے لیکن انہوں نے بھی نواب فخریار جنگ بہادر وغیرہ معتمدین فینانس سے ریلوے کا کام نہیں لیا۔ وہ بھی بلاواسطت معتمد، ریلوے کا کام خود کرلیا کرتے تھے۔

سر اکبر حیدری صدر المہام فینانس قرار پائے تو انھوں نے بھی نواب فخریار جنگ بہادر کا تعلق عرصہ تک معتمدی ریلوے کے کام سے نہ رکھا۔ سرجارج واکر کا انتقال ہوگیا تو سر چارلس بیلی جو حیدرآباد کے رزیڈنٹ اور بہار کے لفٹنٹ گورنری سے سبکدوش ہوگئے تھے۔ سرکار عالی کے ریلوے آفیشل ڈائرکٹری کی خواہش کی۔ دوسروں نے بھی اسکی خواہش کی لیکن سر اکبر حیدری کے مصالح اس بات کے متقاضی تھے کہ یہ حیثیت وہ خود اپنے لئے حاصل کرلیں اور باوجود اس امر کے کہ ہندوستان میں رہکر ڈائرکٹری کا کام انگلستان میں کرنا دشوار سمجھا گیا۔ سر اکبر حیدری ریلوے آفیشل ڈائرکٹر بھی ہوگئے اس دوران میں ریلوے کا انفکاک ہوگیا اور اگر حکومت ہند کے طریقہ پر کام چلایا جاتا تو نہ کوئی اعتراض ہوسکتا تھا نہ کوئی دشواری عاید ہوتی۔ صدر المہام ریلوے کو صدر المہام ہی رہنا چاہیئے تھا۔ بیرلائڈ جونس کو

چند روز کے لئے ریلوے بورڈ کا صدر بنایا جا سکتا تھا۔ ارکان میں نواب فخر یار جنگ بہادر کو شامل کیا جا سکتا تھا۔ اور حکومت ہند کے سررشتۂ ریلوے کے کسی بڑے عہدہ دار کو چند سال کے لیے مستعار لیکر دوسرا رکن بنایا جا سکتا تھا۔ اُس زمانہ میں محمد عبدالعزیز صاحب زندہ تھے جو میسور ریلوے کے ایجنٹ تھے اور حکومت ہند کے سررشتۂ ریلوے میں مستقل عہدہ کے حامل تھے۔ وہ لئے جا سکتے تھے۔ اس انتظام سے کام عمدگی سے چل سکتا تھا۔ انگلستان میں کسی ذمہ دار وظیفہ یاب سول سرونٹ کو خریدی سامان وغیرہ کے لئے ایجنٹ مقرر کیا جا سکتا تھا۔ اسکے بجائے سر اکبر حیدری نے حیدرآباد میں رہکر انگلستان میں کام کرنے والے ریلوے بورڈ کی صدارت بھی اپنے ذمہ بحیثیت صدرالمہام فینانس و ریلوے منظور کرالی اور یہ تصفیہ کرایا کہ سرکار عالی کے ریلوے بورڈ کے ارکان مقیم انگلستان ہر سال کچھ مدت کیلئے سرکاری صرفہ سے حیدرآباد آکر کام کریں۔ دراصل ریلوے بورڈ کے حقیقی کار فرما مسٹر لائڈ جونس ہی تھے نواب فخر یار جنگ بہادر کو اب بطور کسی صلہ کے ریلوے کی معتمدی بھی عطا کی گئی اور دوسو پچاس روپے الونس بقایا کے ساتھ دلایا گیا۔

رونڈ ٹیبل کانفرنس کے سلسلہ میں جب سر اکبر حیدری انگلستان گئے تو صدرالمہامی فینانس پر کسی کو منصرم نہ کرنے کی یہ توجیہ ہوئی تھی کہ سرکار عالی کے ریلوے بورڈ کے ضابطہ کی رو سے صدرالمہام فینانس ریلوے بورڈ کے صدر تھے اور انگلستان کے قیام کے زمانہ میں وہ ریلوے بورڈ کا کچھ کام کرینگے۔ سر اکبر حیدری صدراعظم ہوئے تو ریلوے اور معدنیات کی صدرالمہامی کے فرائض اپنے ذمہ ہی رکھے۔ اور معتمد فینانس بلاواسطہ صدرالمہام فینانس ریلوے اور معدنیات کے کاغذات صدراعظم کے ملاحظہ میں پیش کرتے رہے۔ سر اکبر حیدری نے بعض دوسرے سررشتے بھی براہ راست اپنی نگرانی میں ہی رکھے تاکہ حقیقی اقتدار ان کے ہاتھ میں ہی رہے۔ لیکن یہ زمانہ ان کے قویٰ کے انحطاط کا تھا اور اب یہ کوئی راز نہیں ہے کہ ریلوے کے سررشتہ میں سارے مالہٗ وما علیہ میں مسٹر لائڈ جونس اور دوسرے مقامی اعلیٰ عہدہ دار ہی حقیقی طور پر حاوی رہے۔ سر اکبر حیدری کا ذاتی اثر کبھی کبھی کسی تقرر وغیرہ کے سلسلہ میں ظاہر ہوا کرتا تھا

سر اکبر حیدری نے اپنی صدر المہامی فینانس و ریلوے کے زمانہ میں ریلوے جو رسٹرکشن سرکار عالی کو حاصل تھے، حدود سرکار عالی میں جی آئی پی ریلوے کی جو لائن ہے اسکی خریدی نیز سرکار عالی کے دیگر حقوق کے متعلق یادداشتیں مرتب کرائیں لیکن عملی کارروائی اور معاملات کو روبراہ کرنے کے بارے میں سست رفتار بن گئے۔

سر اکبر حیدری کے آخری زمانۂ صدارت عظمیٰ میں حضرت بندگان عالی کی تدبیر صائب اور حکمت عملی کی بدولت ریلوے بورڈ کا مستقر حیدرآباد میں ہی قرار پانے کی نسبت تصفیہ ہوگیا اور اب جدید بورڈ تشکیل پاچکا ہے۔ اسکی تشکیل اور اختیارات میں حکومت برطانی ہند کے سررشتۂ ریلوے اور ریلوے بورڈ کی مماثلت پیش نظر رہتی تو نظم و نسق کا اعلیٰ معیار قائم ہوجاتا۔

ریلوے کی توسیع

ریلوے پر سرکاری ملکیت حاصل ہوجانے اور اپنا ریلوے بورڈ قائم ہوجانے کے بعد اہم مسئلہ ریلوے کی توسیع کا تھا۔ تجاویز تو بہت پیش ہوئے اور پیمایش بھی بہت سے راستوں کی ہوئی مگر گزشتہ ۱۱ سال میں جدید ریلوے لائن کی تعمیر صرف (۱۰۶) میل کی ہوئی۔ مدکھیڑ عادل آباد کی لائن پر کام ایسے وقت میں شروع ہوا کہ جنگ شروع ہوگئی اور کام ملتوی کردیا گیا اور صرفہ بڑی حد تک ضائع ہوگیا۔

جس طرح فی الحال دنیا کو ہوائی جہاز سمندری جہازوں سے مستغنی نہیں کرسکتے ہیں۔ اسی طرح موٹر لاریاں ریل سے بے نیاز نہیں کرسکتے۔ ہمارے ملک کے ۸۲ ہزار مربع میل کے رقبہ میں صرف ۱۳۰۰ میل کی ریلوے کسی طرح کافی نہیں ہے۔ ہر ضلع ہر ڈویژن بلکہ ہر تحصیل کے مستقر اور ہر ۱۰ ہزار آبادی والے قصبہ کو ریل سے متمتع کرنا حکومت کے نظم و نسق اور تمام ملک کے کاروباری مصالح کے لئے ضروری ہے۔ ریلوے کی تعمیر جس طرح مفید ثابت ہوئی اور کسی حقیقی نقصان سے سرکاری ریلوں کو سابقہ نہیں رہا ہے اسکی توضیح اس مضمون کی گزشتہ قسط میں ہوچکی ہے۔ بہرحال ریلوے کی توسیع کی مخالفت کچھ وزنی نہیں ہے۔ ریل سے جو فوائد حاصل ہیں اسکو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے اعداد و شمار بہترین ذریعہ ہوسکتے ہیں۔ ذیل میں بعض اعداد پیش کئے جاتے ہیں۔

سنہ ۱۳۳۰ف میں ریلوے لائن کا طول ۱۲۲۸ میل تھا۔ جملہ مصارف سرمایہ ۱۴ کروڑ ۹۰ لاکھ ہوئے جملہ آمدنی ۲ کروڑ ۸ لاکھ روپے ہوی۔ مصارف کی مقدار ایک کروڑ ایک لاکھ روپے تھی خالص منافع ایک کروڑ ۳۶ لاکھ روپے ہوا۔ ملازمین ریلوے کی تعداد ۱۵۹۷۲ تھی۔ مسافرین ایک کروڑ ۱۹ لاکھ سے زیادہ اور مال کی مقدار ۱۶ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن تھی۔

حالیہ اعداد یہ ہیں۔ ریلوے لائن ۱۳۴۴ میل۔ سرمایۂ سرکار بر ریلوے ۱۶ کروڑ روپے۔ جملہ آمدنی ۳ کروڑ دس لاکھ روپے۔ اخراجات ایک کروڑ ۶۰ لاکھ روپے خالص منافع ایک کروڑ ۵۰ لاکھ روپے۔ مستقل ملازموں کی تعداد ۱۷ ہزار۔ مسافروں کی تعداد ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ۔ مال کی مقدار ۳۰ لاکھ ٹن یہ اعداد عالیجناب صدر اعظم بہادر نے جدید ریلوے بورڈ کے افتتاح کے موقع پر بیان فرمائے۔ کیا اسکے بعد بھی کوئی صاحب ریلوے کی توسیع سے اختلاف کر سکتے ہیں؟

کمپنی کے کاروبار کو سرکار عالی نے حاصل کر لیا تو ۱۲ سو میل کی لائن سپرد کی۔ ہمیں اس قسم کا ایک پروگرام بنانے میں کوئی ناقابل حل مشکل درپیش نہیں تھی کہ ہر سال ایک سو میل جدید ریلوے لائن کی توسیع ۲۰ سال تک ہوتی رہے تا آنکہ مجموعتً ۳ ہزار میل ریلوے لائن ممالکت آصفیہ میں قائم ہو جائے۔ ریلوے کی تعمیر پر اوسطاً حقیقی خرچہ، کفایت سے کام لیا جائے، تو فی میل ۷۰ ہزار سے زیادہ نہیں ہوتا۔

یہ فرض کیا جاتا ہے کہ اس طرح پروگرام مرتب کرنے کے بعد سے سنہ ۴۲ء تک ۱۲ سو میل کی تکمیل ہو جاتی اور چونکہ ہم ریلوے پٹریاں اور آہنی سامان پہلے ہی خرید چکے ہوتے اس لئے ہمارے پاس دو سو میل تک، زاید اسٹاک سنہ ۴۲ء تک کام کے لئے مہیا رہتا اور اسکی وجہ سے سنہ ۴۲ء تک جملہ ڈھائی ہزار میل، کی تکمیل ہم کر چکے ہوتے پھر جنگ کی وجہ سے کام روک دیا جاتا۔

اس بارہ سال کی مدت میں سالانہ ۷۰ لاکھ روپے اس طرح مہیا کئے جاتے کہ ۳۵ لاکھ روپے سالانہ سرمایہ سرکار کی سلک اور ریلوے کے منافع سے بچایا جاتا اور ہندوستان کی حکومت کے پرامیسری نوٹوں کی خریدی کے بجائے اسکو ریل کی تعمیر پر صرف کیا جاتا۔ باقی ۳۵ لاکھ روپے رعایا ملک سے قرضہ لیکر مہیا کیا جاتا۔

اس طرح جو سرمایہ ریلوے کی تعمیر پر لگایا جاتا اس پر اقل درجہ خود پرامیسری نوٹوں کا منافع فی صدی تین روپے آٹھ آنے ضرور حاصل ہو جاتا۔ جو حکومت ۱۵ کروڑ روپے کلدار ریلوے پر لگا چکی ہے اسکے لئے مزید ½ ۸ کروڑ روپے کی فراہمی ۱۲ سال میں دشوار نہیں تھی۔

ہو سکتا تھا کہ یہ لائنیں اس طرح قایم کی جاتیں کہ ان سے جی آئی پی اور ام ایس ام ریلوے سے نرخ کے معاہدہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا اور ملک کے زرخیز اور شاداب علاقے ریل سے متمتع ہو جاتے۔ ہو سکتا تھا کہ یہ ریلوے لائنیں حسب ذیل ہوتیں۔

۱۔ مدکھیڑ سے عادل آباد تک۔ ۲۔ پداپلی سے کاماریڈی یا نظام آباد تک براہ کریم نگر۔ ۳۔ اکنا پیٹ یا مرزاپلی سے براہ میدک وسداسیو پیٹ شنکر پلی تک۔ ۴۔ پرلی سے براہ بیڑ اورنگ آباد تک۔ ۵۔ بھونگیر یا حیدر آباد سے نلگنڈہ تک۔ ۶۔ گدوال سے کپل تک ۷۔ بودھن سے نظام ساگر اور ناندیڑ کے اندرونی حصوں تک۔

اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟۔ ۱۔ سرمایہ کا بڑا حصہ ملک میں ہی صرف ہوتا جس کی وجہ سے کاروبار میں وسعت پیدا ہوتی اور دوسرے فوائد حاصل ہوتے۔ ۲۔ مزید ۱۵ ہزار افراد کو ریلوے کی ملازمت ملنے سے ملک میں خوش حالی پیدا ہوتی ۳۔ لائن پر ہزاروں مزدور اور بیسیوں گتہ داروں کو کام مہیا ہوتا ۴۔ پتھر، لکڑی اور چونہ فراہم کرنے میں مزید ہزاروں افراد مصروف رہتے۔ ۵۔ عام تجارتی کاروبار کو فروغ ہوتا ۶۔ انتظامی ضروریات کی تکمیل ہوتی۔ ۷۔ سررشتۂ کروڑگیری اور سررشتۂ ٹپہ کے کام میں وسعت حاصل ہوتی ۸۔ ریلوے کی تاربرقی اور ٹیلیفون کا سلسلہ وسعت پا جاتا اور وہ خود آمدنی اور کاروبار کی وسعت کا ذریعہ ثابت ہوتا۔ (۹) جس قدر رقم عامتہ الناس سے لیکر ریلوے کو وسعت دینے میں لگائی جاتی اس کا منافع انکو ملتا اور اس طرح بیرون ملک سرمایہ کا تحفظ کرنے کے بجائے خود ملک میں ہی سرمایہ محفوظ ہو جاتا۔

سررشتۂ ریلوے کے لئے یہ ممکن تھا کہ اس ۱۲ سالہ توسیع ریلوے کو کامیاب بنانے کے لئے اس غرض کو ظاہر کرکے کہ اسکو رولنگ اسٹاک کی ضرورت ہوگی مزید دو ڈھائی کروڑ کے سرمایہ سے ریلوے ورکشاپ کو اس پیمانہ پر وسعت دی جاتی کہ نہ صرف ریل کی مسافر گاڑیاں مال کے ڈبے بلکہ موٹر بسیں موٹر لاریاں اور

موٹر کاریں بھی ضرورت کے مطابق مہیا ہو جاتیں۔ اسکے نتائج کس قدر زرین ہوتے! ملک کے ذرائع معشیت کس قدر وسعت پا جاتے! کس قدر بے روزگار افراد کام پر لگ جاتے! مگر افسوس ہم نے پورے ۲۱ سال ضائع کر دیئے۔ باتیں اور تقریریں کرتے رہے کہ یہ کر سکتے ہیں اور یہ کرنا چاہیئے۔

اس موقع پر پھر اس بحث کا جواب نامناسب نہیں کہ جو بعض افراد پیدا کرتے ہیں کہ ہماری معاشی ترقی میں اعلیٰ شہنشاہی پالسی مزاحم ہو جاتی ہے۔

کوئی شبہ نہیں کہ انگلستان کے بعض باشندے ذاتی طور پر ہندوستان کی صنعتی ترقی کو فطرتاً پسند نہیں کرینگے۔ ان کا نقطۂ خیال یہ ہوگا کہ ہندوستان اشیائے خام بہم پہونچانے والا ملک رہے اور انگلستان صنعتی ملک رہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ برطانوی ہند کے بعض اعلیٰ حکام یہ امر پسند کریں کہ دیسی ریاستوں کے نظم و نسق اور ہر قسم کے کاروبار کا معیار برطانوی ہند سے گھٹا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود اقتضائے زمانہ کے مدنظر ترقی اور کاروبار میں وسعت دینے کی خواہش عزم راسخ اور صحیح استدلال کے ساتھ ظاہر کی جائے تو حکومت ہند کی مفاہمت، بالآخر حاصل کر لینا کوئی دشوار امر نہیں ہے۔

حکومت ہند کی ابتدا سے یہ پالسی رہی ہے کہ سارے ہندوستان میں ریلوے لائینوں کی ممکنہ توسیع میں تامل نہ کیا جائے چنانچہ ۹۰ سال کے عرصہ میں ہندوستان بھر میں ۴۵ ہزار میل ریلوے کو پھیلایا گیا۔ آخر خود ممالک محروسہ سرکار عالی میں ۱۲اسو میل لائن تعمیر ہوئی۔ اگر اس زمانہ کے صدرالمہام فینانس اور ریلوے جو حکومت ہند سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ اصرار کرتے اور صحیح استدلال پیش کرتے کہ سرکار عالی اپنے ملک میں ریلوے کو رعایا کی کاروباری اور معاشی ضرورتوں کیلئے وسعت دینا چاہتی ہے تو انکار کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

یہ امر ممکن تھا کہ ضروریات ریلوے میں انگلستان کے مال کو ترجیح دیجاتی۔ فنی کاموں اور نظم و نسق کے لیئے انگلستانی افراد کے خدمات حاصل کئے جاتے۔ ہمسایہ برطانوی ریلوں سے غیر ضروری اور خلاف مصلحت مقابلہ نہ کیا جاتا۔ ان حالات میں حکومت ہند خواہ مخواہ کیوں مزاحم ہوتی۔

اس سلسلہ میں یہ خیال آرائی کی جا سکتی ہے کہ جب دوسرے مقامات پر موٹر سازی کے کارخانہ کیلئے

اجازت نہیں ہے تو حیدرآباد کو کیوں کر کامیابی ہو سکتی تھی۔ اس کے بارے میں یہ واضح کیا جا سکتا ہے کہ ریل کی مسافر گاڑیوں، مال کے ڈبوں اور موٹر سازی کے کارخانہ کے قیام کی اجازت ہمیں حاصل ہو جاتی اگر تعاون کی اسپرٹ میں سرکار عالی کی جانب سے صدرالمہام فینانس حکمت عملی سے یہ امر ظاہر کرتے کہ یہ حکومت سرکار عالی کی قطعی پالسی ہے کہ ایسا کاروبار سررشتہ ریلوے سرکار عالی کے ورکشاپ کے جزو کے طور پر ریلوے کی ضرورت رفع کرنے قائم کیا جائے اور اس میں کسی منافع کی گیارنٹی یا تامین تجارت کا سوال پیدا نہ کیا جائے گا۔ حکومت ہند نے واضح کر دیا ہے کہ میسور کے کارخانہ موٹر سازی میں نفس کارخانہ سے اختلاف نہ تھا صرف منافعہ پر معین گیارنٹی کے اصول اختلاف کیا گیا تھا۔ نیز جب حکومت ہند ٹاٹا کو آہنی اشیاء کا کارخانہ جمشید نگر میں اور وال چند کو احاق پٹن میں جہاز سازی کے کارخانے کے قیام کی اجازت ممکنہ مراعات اور سہولتوں کے ساتھ دیتی ہے، کو چین کی حکومت کو ایک عظیم الشان جہازی گودی کی تعمیر کرنے میں اعانت و مشورت دیتی ہے۔ حکومت میسور کو بھی آہنی سامان کے کارخانہ کے قیام میں سہولت بہم پہونچاتی ہے تو سر اکبر حیدری بھی ناکامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ جب گزشتہ جنگ کے موقع پر ممالک آصفیہ میں کرنسی نوٹوں کی اجرائی اور سرکار عالی کے مالیہ کی عظیم ترین اسکیم تدبر کے ساتھ کامیابی سے رائج ہوگئی اور بڑے بڑے خدمات پر اہل ملک کو مامور ہونے کا موقع مل گیا تو ہمت اور تدبر سے ریل کی توسیع اور موٹر کاروں و ریل کے گاڑیوں کے ایک بڑے کارخانہ کا قیام بالکل ممکن تھا لیکن ہمت کہاں تھی۔ تدبر کہاں تھا۔ ہم لوگ محض اپنے سایہ سے ڈرتے رہے۔ ملک کے اعلیٰ حکام کا وقت محض جزئیات میں صرف ہوتا تھا۔ اپنے متوسلین کو ملازمت دلانا، تنخواہوں میں اضافہ اجرائی ماہوار، گریڈ اور بقایا کی منظوری، مکان کی خریدی، مکان کرایہ پر لینا۔ یہی امور پیش نظر رہتے تھے۔ ریل کا جال تمام ملک میں پھیلانے اور ریل کی ضروریات ملک ہی باہم فراہم کرنے کی بارہ سالہ بڑی فرصت ضائع کر دی گئی۔

معدنیات

اس خطبۂ صدارت میں بعض معدنی مسائل کا بھی تذکرہ ہے۔ قبل اس کے کہ اس بارے میں

کوئی تنقید کی جائے یہ ظاہر کرنا برمحل ہوگا کہ معدنیات ملک سے کام لینے کی ضرورت کا احساس نواب مختار الملک مرحوم نے بروقت کر لیا تھا اور مرزا مہدی خاں کوکب کو معدنیات کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان روانہ کیا تھا۔ موصوف نواب مختار الملک کے آخری زمانہ میں واپس آئے اور نواب صاحب مرزا صاحب سے کام نہ لے سکے۔ بعد میں بجائے اسکے کہ سررشتۂ معدنیات قائم کرکے اس پر مرزا مہدی خاں کا تقرر کیا جاتا، ان سے اولاً مردم شماری اور پھر گزیٹر کی ترتیب کا کام لیا گیا اور کام ختم ہونے کے بعد گھر بیٹھے ماہانہ ۳۵ا روپیہ ماہوار حاصل کرتے رہے۔ ملک کو ان کے اصلی معلومات فن سے مستفید کرنے کے لئے کوئی توجہ نہیں کی گئی۔

غرض اس خطبۂ صدارت میں یہ کہا گیا ہے کہ

"حیدرآباد میں سوائے کوئلہ اور سونے کی کانوں کے کوئی بڑی کانیں نہیں ہیں"

لیکن آگے چل کر یہ بھی کہا گیا ہے کہ

"یہ صحیح ہے کہ مملکت حیدرآباد میں ہر قسم کی معدنی اشیا اور دیگر اشیائے خام پائی جاتی ہیں"۔

بیان کے اس تضاد کے باوجود اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ملک میں صرف کوئلہ اور سونے کی کانیں ہیں تو یہ خود ملک کے لئے بڑی دولت ہے۔ ہندوستان کے بہت سے حصے اس دولت سے محروم ہیں۔ بمبئی کے علاقہ میں نہ سونا ہے نہ کوئلہ ہے۔ اسی طرح مدراس کی حالت ہے۔ میسور میں بھی کوئلہ نہیں ہے دنیا میں برقابی کے بغیر بھی علی العموم کوئلہ سے کام لیا جاتا ہے۔ میسور میں آبشار سے برقابی قوت ارزاں طور سے حاصل ہوگئی ہے مگر وہاں بجز اسکے کہ لوہے کے کارخانے اور سونے کی کان میں کام لیا جائے یا روشنی کے اغراض میں مدد لی جائے یا معمولی کارخانے چلائے جائیں کوئی اور صورت نہیں ہے نہ تو ملک کا رقبہ وسیع ہے اور نہ زرعی پیداوار اس قدر ہے کہ اس سے کام لیا جائے۔

مملکت آصفیہ میں لوہا گھٹیا ہونے اور زیادہ مقدار میں نہ ہونے کا اظہار پہلی مرتبہ اسی خطبۂ صدارت سے ہوا ہے ورنہ اب تک جس قدر رپورٹیں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر شائع ہوئی ہیں سب میں متعدد

اضلاع میں کافی مقدار میں بہتر قسم کے لوہے کی موجودگی کا حال درج ہے۔ اس سلسلہ میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔ ۱۔ آیا مکمل تحقیقات ہو چکی ہے ۲۔ آیا لوہے کے استفادہ کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے۔ ۳۔ ایا بعض قطعات ابھی تحقیقات کے لئے کھلے ہوئے ہیں؟ ان سوالات پر اس نوٹ سے روشنی پڑ سکیگی جو سررشتۂ صنعت و حرفت کی جانب سے دفتر معلومات عامہ نے چند ماہ قبل شائع کیا تھا۔

اس سے قطع نظر سررشتۂ معدنیات کا کام اب تک یہ رہا ہے کہ خود تحقیقاتی کام انجام نہ دے اور دوسروں کی درخواست کا منتظر رہے۔ یہ طریقہ کار ممکن ہے کہ برطانیہ جیسے ممالک میں سودمند ہو جہاں وافر قومی سرمایہ ہر وقت کام کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس لئے حکومت کو خود توجہ کی ضرورت پیش نہیں آتی یہ پالیسی برطانوی ہند میں بھی اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ وہاں بھی بڑے بڑے انگریز سرمایہ دار سرمایہ لگانے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ اور اب گجراتی اور مارواڑی وغیرہ اس کے لئے آمادہ ہوگئے ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ پالیسی قطعاً مفید نہیں ہوسکتی۔ ہمارے ملک کے سرمایہ دار باہمت اور باخبر نہیں ہیں۔ وہ امید امید میں اپنا روپیہ اور محنت صرف نہیں کرتے۔ سررشتۂ معدنیات کے طریقۂ عمل سے انگریز اور بیرونی سرمایہ دار فائدہ پیدا کرسکے۔ معدنیات کے اجارے بیرونی سرمایہ داروں کو دینا کسی طرح مفید نہیں ہے۔ اسکے یہ معنی ہیں کہ معدنی دولت کو لٹا دیا جائے۔ سرفضل بھائی کو بھی معدنیات کے چند اجارے دیئے گئے تھے مگر انہوں نے جس طرح دوسری کمپنیوں کو یا خود سرکار کو معاوضہ لے کر دست برداری اختیار کرلی وہ نہایت ہی افسوسناک ہے۔ اس فرم کی وجہ سے ملک کے معاشی کاروبار میں نقصان پیدا ہوا۔ اس فرم نے ملک کی دولت تلف کرنے میں اور سرمایہ لگانے والوں میں بے اعتمادی پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ غرض سررشتۂ معدنیات کے طریقہ کار میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

سررشتۂ معدنیات کو چاہیے کہ مملکت آصفیہ کے معدنیات سے استفادہ کے لئے ابتدائی تحقیقات خود کرائے۔ سررشتہ کو فنی نقطۂ نظر سے یہ کام اپنے ہاتھ میں لینے میں کوئی مشکل اس وجہ سے بھی نہیں ہوسکتی کہ اب سررشتہ کی نظامت پر ایک ماہر فن مامور ہیں اور ان کی ماتحتی میں متعدد اہلِ فن

موجود ہیں اگر ضرورت ہو تو مزید ماہران فن کی ماموری میں کوئی دقت نہیں ہے۔ بہرحال جب معدنی تحقیقات مکمل ہو جائے تو سررشتۂ معدنیات کو چاہیئے کہ استفادۂ معدنیات کی ذمہ داری اہل ملک کے سپرد کرنے کی کوشش عمل میں لائے۔ تحقیقات سے معدن کا وجود ثابت ہو جائے تو پھر خود بخود ملک کے سرمایہ داروں کو سرمایہ لگانے کی ترغیب ہو گی۔

انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ سے امداد ہو سکتی ہے۔ گزشتہ ۲۱، ۲۲ سال قبل ہی سر اکبر حیدری کی رہنمائی میں سررشتۂ معدنیات اس خصوص میں کوشش عمل میں لاتا تو نتائج درخشاں رہتے۔ اب بھی موقع ہے کہ طریقۂ کار میں تبدیلی عمل میں لائی جائے۔

ابھی حال میں ایک غیر ملکی فرم کو سونے کی تلاش کے لئے کام سپرد کیا گیا۔ اس کام کے لئے سرمایہ سرکار عالی نے فراہم کیا۔ لاکھوں روپے سرکار عالی نے خرچ کئے لیکن اسکے باوجود قرار پایا تھا کہ فائدہ ہو تو اس میں غیر ملکی فرم بھی شریک رہے گی اگر نقصان ہو تو اس کو سرکار عالی برداشت کریگی جہاں تک معلوم ہے اس تلاش میں کامیابی نہیں ہوئی اور کام بند کر دیا گیا۔ سرکار کے کئی لاکھ روپے صرف ہو گئے۔

اس امر کی کوشش بھی عمل میں نہیں آئی کہ طبقات الارض اور معدنیات کی تعلیم اور عملی تربیت کے لئے ملک میں ایک درسگاہ قائم کی جائے تاکہ معدنوں میں کام کرنے کے لئے اہل ملک دستیاب ہو سکیں ہمارے ملک کے لئے ایک معدنی تعلیم گاہ ہر طرح ضروری اور مناسب ہے۔

پارچہ بافی

جناب مولوی لیاقت اللہ خان صاحب نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے اور بجا ارشاد فرمایا ہے کہ

"محض خام اشیا کی موجودگی کسی کارخانۂ صنعت کے قیام کے لئے کافی نہیں ہے اولاً خام اشیا کا اتنی مقدار میں ہونا ضروری ہے کہ ایک کارخانہ کے تجارتی اصول پر چلانے کے لئے جس اقل مقدار کی ضرورت ہے وہ موجود ہو۔ دوم یہ کہ تیار شدہ

اشیا کی لاگت اس قیمت سے نہ بڑھے جس قیمت پر بیرون ملک کی تیار شدہ اشیا
یہاں آکر فروخت ہوتی ہوں۔ اگر ان دو شرطوں میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری نہ ہو
تو سمجھنا چاہیئے کہ ایسی صنعت نفع آور طریقہ پر ملک میں قائم نہیں ہوسکتی"۔

ان دونوں اصولوں کو ذہن میں رکھکر بیان کیا جا سکتا ہے کہ مملکت آصفیہ میں روئی جوب روغن دار، چمڑا، صابون، ادویات اور رنگ سازی کے لئے خام اشیا اسی مقدار میں مہیا ہوسکتی ہیں جس مقدار میں کہ ضروری ہو۔ یہ اشیا ملک میں اسقدر وافر مقدار میں موجود ہیں کہ بیرون ملک کے کارخانوں کے لئے ان کو خریدا جاتا ہے۔ جب مانچسٹر، جاپان اور بمبئی کے لئے یہ ممکن ہے کہ روئی ہمارے ملک میں خریدے اور باہر لے جاکر پارچہ اور سوت بنا کر خود ہمارے ملک میں فروخت کے لئے بھجوائے تو ایسی صورت میں خود ہمارے ملک میں سوت اور پارچہ کیوں تیار نہیں ہوسکتا۔

۵۵ سال قبل مملکت آصفیہ میں پارچہ بافی کی تین گرنیاں کھل چکی تھیں۔ اسکے بعد ۲۵ سال تک بجز اسکے کہ نہایت کثرت سے روئی صاف کرنے اور گھٹے باندھنے کے کارخانے کھولے گئے اور خام روئی باہر لے جانے کے لئے ہر قسم کی آسانی پیدا کی گئی، کوئی کوشش، چھوٹے پیمانہ پر ہی سہی، پارچہ بافی کے کارخانوں کے قیام کے لئے نہیں کی گئی۔ اسکے بعد بھی صرف ۳ گرنیاں پارچہ بافی کی کھولی گئیں۔ ہمارے ملک کے ایک بہت بڑے مہاجن کا کاروبار شولاپور میں پارچہ بافی کا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ وہ خود اپنے ملک میں اس قسم کے کاروبار نہیں چلاتے۔ اسکے اسباب کا پتہ لگانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

صورت حال یہ ہے کہ لنکا شائر، بمبئی اور احمد آباد، ہر ایک کو روئی کی ضرورت ہے۔ جاپان کو بھی ضرورت ہوتی تھی۔ ان سب کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بمبئی کے تاجران کپاس نے مملکت آصفیہ میں روئی کی خریداری کا بڑا انتظام کر رکھا ہے۔ اور اب ہمارے ملک کے تاجر جس طرح ہوسکے روئی فروخت کرنے میں اپنی ساری توانائی صرف کر دیتے ہیں۔

پارچہ بافی کے گرنیوں کے قائم کرنے میں ہمتیں جو متوجہ نہیں ہوتی ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے کام کے لئے کافی سرمایہ کے علاوہ، کاروباری مہارت بھی ضروری ہے اور اسی کا اہل ملک میں

نقصان ہے۔ بمبئی کے کارخانہ داروں کا عموماً طریقہ عمل یہ ہے کہ جس قدر رقم کی ضرورت ہوتی ہے اس سے کم رقم بطور حصص (شیرز) مہیا کی جاتی ہے۔ اسکے بعد بطور ڈبنچر کم منافع پر کچھ رقم بطور قرض حاصل کی جاتی ہے اور جلد ادا کروی جاتی ہے تا کہ اصل حصہ داروں کو زیادہ منافع ملے۔ اس کے ساتھ یہ بھی عمل ہے کہ میانیجنگ ایجنٹ کو منافع کا بہت بڑا حصہ لازماً ملا کرتا ہے۔ میانیجنگ ایجنٹوں کا یہ بھی عمل ہے کہ عمارت کی تیاری، اور مشتری کی بہم رسانی، روئی کی خریدی اور پارچہ کی فروخت میں اپنے عزیز اور دوست کاروباری اصحاب کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اصل حصہ داروں اور مزدوروں کے افادہ کا خیال کم رکھتے ہیں۔ مصارف میں بھی کفایت کا خیال نہیں رکھتے۔ ان سب امور سے قطع نظر میانیجنگ ڈائرکٹروں کے امیرانہ مصارف ہوتے ہیں۔ بعض کو گھوڑ دوڑ اور سٹہ کا شوق ہوتا ہے اور دوسرے تجارتی کاروبار میں نقصان ہوتا ہے تو اسکی سلامتی کے لئے اپنے کارخانوں کو ناجائز استفادہ کا ذریعہ بناتے ہیں۔

حیدرآباد میں پارچہ بافی کی جو کمپنیاں قائم ہوئیں اسکے ڈائرکٹروں نے کارخانوں کی ضرورتوں کے مطابق سرمایہ جمع نہیں کیا اور کام کی تکمیل کے لئے جو رقم بطور قرض لی گئی اس کا کافی سود اصل آمدنی پر عاید ہونا شروع ہوا۔ نیز میانیجنگ ایجنٹ کے معاوضہ کی شرح گراں تر تھی۔ ان اسباب کی بناپر ابتدائی حصہ داروں کو کوئی منافع ہی نہیں ملتا تھا۔ اس صورت حال نے مزید کارخانوں کے قائم کرنے کے ولولہ کو سرد کردیا۔ جنہوں نے حصص خریدے انہوں نے کم قیمت پر فروخت کر دیئے۔

مسٹر ڈنلاپ اور مسٹر ویکفیلڈ کے زمانہ میں سررشتۂ مال کے تحت نہ صرف کروڑگیری کا سررشتہ ہی تھا بلکہ تجارت و حرفت کی کامل ذمہ داری بھی۔ اس زمانہ میں تمام تر توجہ اسی جانب مبذول کی گئی کہ روئی کو حیدرآباد سے باہر بھیجنے کے لئے ہی سہولتیں بہم پہونچائی جائیں۔ اس زمانہ میں ہی روئی صاف کرنے اور گٹھے باندھنے کے کارخانے قائم کئے گئے۔ ہر قسم کی سہولتیں ان کے لئے فراہم کی گئیں حقیقت میں جس قدر ضرورت تھی اس سے بہت زیادہ ایسے کارخانے قائم کرائے گئے۔

اس وقت کسی نے خیال نہیں کیا کہ اس قدر کارخانے زاید از ضرورت ہیں۔ اور آگے چلکر صرف شدہ

سرمایہ پر کافی منافع نہ مل سکیگا۔ اولاً کارخانوں نے شرح اجرت میں ایک دوسرے سے مقابلہ کیا تو
اس طرح کیا کہ سب گھاٹے میں رہے۔ آخر سب نے اتفاق کیا کہ ہر سال باری باری سے چند کارخانے
روئی کے موسم میں کام کریں اور باقی بند رہیں۔ اور جو کچھ منافع ملے سب ملکر تقسیم کرلیں۔ چنانچہ سیلو میں
اس قسم کے ۱۳ کارخانے ہیں، لیکن ہر سال صرف تین کارخانے کام کرتے اور باقی بند رہتے ہیں۔
جیسا کہ ابھی ظاہر کیا جاچکا ہے حیدرآباد گلبرگہ اورنگ آباد میں پارچہ بافی کے کارخانے
تقریباً ۶۰ سال قبل قائم ہو چکے تھے۔ اگر اس وقت ذمہ داران نظم و نسق اور دوسرے کاروباری لوگ
اور سرمایہ دار اصحاب یہ تخیل قائم کرتے کہ جب تین کارخانے قائم ہو چکے ہیں اور برٹش انڈیا میں ہر سال
کارخانے کھلتے جاتے ہیں تو یہ ناممکن نہیں کہ اس قسم کے کارخانے ملک کے دوسرے حصوں میں بھی قائم
کئے جائیں۔ صحیح کاروباری طریقہ، ایمانداری اور جملہ امور کی پیش بینی کے بعد اچھے کاردان اور
ماہران فن منتظموں کو فراہم کیا جاتا اور اس زمانہ کے حکام سررشتۂ مال چاہتے تو جو سرمایہ روئی صاف
کرنے اور گٹھے باندھنے کے کارخانوں میں لگایا گیا اس سے پارچہ بافی کے کارخانے قائم کراسکتے تھے
اور ہمارے ملک میں مثل احمد آباد اور بمبئی کے دولت کے دریا بہا سکتے تھے۔ بالآخر سر علی امام کو خیال آیا کہ
کچھ تو حالت بدلے۔ مگر بدقسمتی سے انہوں نے سر فضل بھائی کریم بھائی پر اعتماد کیا جو نیم دیوالیہ ہو چکے
تھے۔ ان کے مقدمات سے ملک کی صنعتی ترقی کی امیدیں سراب ثابت ہوگئیں۔ تاہم اب ملک میں
۶ پارچہ کے کارخانے کافی وسعت کے ساتھ موجود ہیں۔

حبوب روغن دار

کپاس کی جو حالت ہے وہی حالت حبوب روغن دار کی ہے۔ یہ حبوب سالانہ پانچ چھے
کروڑ کی مالیت میں ملک سے باہر جاتے ہیں اور خام روغن جو بمبئی میں صاف ہونے کے لئے جاتا ہے
اسکی مالیت تیس چالیس لاکھ سالانہ کی ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں ان حبوب کے روغنوں کی درآمد
کافی مقدار میں ہوتی ہے۔ سالانہ تیس چالیس لاکھ سے کم اسکی مالیت نہ ہوتی ہوگی۔ مملکت آصفیہ کی
ارنڈی، مونگ پھلی، السی اور رتولہ وغیرہ کی جو شہرت ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ لیکن بعض جگہ

روغن کشی کی معمولی گرنیاں قائم ہیں مگر اس روغن کو مقطر اور صاف کرنے کا خیال کبھی نہیں کیا گیا۔ جس طرح روئی کو بنولہ نکال کر اور گھٹے باندھ کر بمبئی وغیرہ کو روانہ کردیا جاتا ہے کہ مصارف میں کمی ہو اسی طرح حبوب کو مصارف کی کمی کے لحاظ سے روغن کی صورت میں بمبئی وغیرہ کو روانہ کردیا جاتا ہے تاکہ صاف ہو کر یا تو پھر خود ہمارے ملک میں آئے یا دوسرے ملکوں میں فروخت کیا جائے۔

یادگیر میں روغن کشی کا کارخانہ قائم کیا گیا مگر اسکو فروغ نہ ہوسکا۔ رائے گیر میں بھی معمولی کارخانہ قائم ہوا اور وہ کچھ کامیاب حالت میں نہیں ہے۔

پارچہ بافی کے سلسلہ میں جو امور واضح کئے گئے وہی امور حبوب روغن دار کے سلسلہ میں بھی بیان کئے جاسکتے ہیں۔ حیدرآباد کے علاقہ میں بمبئی اور مدراس کے تاجروں کے ایجنٹ پھیلے ہوئے ہیں اور اپنے کاروبار کے فروغ کے خاطر یہاں روغن تیار کرنے کی حرفت جاری کرنا پسند نہیں کرتے۔ ملک کے کاروباری اور سرمایہ دار اصحاب ہمت نہیں کرتے کہ سب ملکر اپنی حرفت جاری کردیں۔

چمڑا

حیدرآباد سے سالانہ ۴۰،۴۵ لاکھ روپے کی مالیت کا چمڑا باہر جاتا اور ۱۴، ۱۵ لاکھ روپے کی مالیت کی چرمی چیزیں باہر سے آتی ہیں۔ تاجران مدراس کے کارندے ممالک محروسہ کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں تاکہ چمڑا اور چمڑا صاف کرنے اور رنگنے کے اشیا خرید کر بیرون ملک روانہ کردیں۔ اگرچہ ملک میں معمولی طور پر دباغت چرم اور چرمی اشیا تیار کرنے کی کوشش ہوتی ہے اور وہ حوصلہ افزا ہے مگر کسی کو اب تک ہمت نہیں ہوئی کہ اس قسم کے کاروبار کو بڑے پیمانہ پر شروع کرے۔

صابون وغیرہ

ممالک محروسہ میں سالانہ دس لاکھ روپیہ کا صابون اور مغربی عطریات وغیرہ درآمد ہوتے ہیں۔ میسور میں صابن سازی کامیاب ہوچکی ہے۔ نیز ٹاٹا کمپنی نے "حمام سوپ" وغیرہ بنانے میں شہرت حاصل کی ہے۔ ہندوستان میں دوسرے کارخانے بھی قائم ہیں، سن لائٹ صابن کا کارخا

ہندوستان میں منتقل کردیا گیا ہے مگر ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ صابن سازی کا سرکاری کاروبار دو مرتبہ بھی چلکر بند ہوگیا۔ پہلی مرتبہ دو ایسے اصحاب کی خدمات حاصل کی گئیں جن کو صابون سازی میں مہارت تھی۔ ایک صاحب تو چند دن کی ملازمت کے بعد غالباً مستعفی ہو کر میسور چلے گئے۔ دوسرے صاحب عرصہ کی ملازمت کے بعد جب کہ ان کو ذمہ وار عہدہ دار سررشتۂ صنعت و حرفت کی حیثیت میں کام کرنے کا بڑا موقع ملا، حال میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ناکام شدہ کاروبار کی مشنری کو خرید کر ذاتی کاروبار کی صورت میں اسکو چلانا چاہیے ہیں اور اب حال میں اسکو ایک کاروبار سرمایہ مشترکہ کی صورت دی ہے۔

ادویات

مملکت آصفیہ میں سالانہ ۱۵ لاکھ روپے کے ادویہ طب مغرب برآمد ہوتے ہیں

بنگال میں چند ہی سال کی مدت میں سرپی سی رائے نے ایک عظیم الشان کارخانہ قائم کردیا۔ بڑودہ میں بھی اس قسم کا کارخانہ کامیابی سے چل رہا ہے۔

حیدرآباد میں پچاس سال قبل سرکار عالی کے میڈیکل اسٹور میں بعض طبی مرکبات کو تیار کیا جاتا تھا مگر کچھ عرصہ کے بعد اسکو مسدود کردیا گیا۔ نواب تلاوت جنگ بہادر معین المہام طبابت نے اس بارے میں توجہ کی تھی۔ بعد میں ڈاکٹر لنکاسٹر ناظم طبابت نے کچھ خیال کیا مگر پھر وہ بھی خاموش ہوگئے۔

راقم الحروف نے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس میں ایک تحریک اس نوعیت کی پیش کی کہ ملک میں ایسا کاروبار سرکار عالی کو قائم فرمانا چاہیے۔ اور وہ منظور ہوئی۔ بعد میں جب یہ تحریک معتمدی متعلقہ میں کارروائی کے لئے آئی تو گو بعض یوروپین جامعات کی ڈگری رکھنے والے مددگاروں نے اختلاف کیا کہ ہمارے ملک میں صحیح اوزان اور برٹش فارماکوپیا کے صحیح اصول پر ادویہ سازی نہ ہوسکیگی۔ لیکن اسوقت کے معتمد سررشتۂ طبابت نواب نذیر جنگ مرحوم نے اس تحریک کے مالہ وماعلیہ معلوم کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی کہ اگر ہم اپنے ملک کی ترقی کے لئے موانعات دور کرنے کا عزم نہ کریں تو پھر ترقی کس طرح ہوسکیگی۔ انھوں نے ناظم طبابت کو لکھا کہ اس بارے میں ایک مکمل اسکیم پیش کریں

اس وقت کرنل بابا جیون سنگھ ناظم طبابت تھے۔ کرنل جیون سنگھ سرکار عالی کے اُن چند بہترین عہدہ داروں میں تھے جنکے خدمات اس ملک میں مستعار لئے گئے۔ کرنل جیون سنگھ فوراً کلکتہ کو گئے اور وہاں بنگال کیمیکل ورکس کے معائنہ اور سر پی سی رائے کی مشورت سے ایک عملی اسکیم پیش کردی۔ یہ اسکیم حسب قاعدہ سررشتۂ فینانس میں بھیجی گئی وہاں معتمد اور صدر المہام دونوں نے مددگاران معتمد فوج کی رائے سے اتفاق کیا۔ لیکن نواب نذیر جنگ مرحوم نے اپنی تحریک کو قوت سے آگے بڑھایا اور بالآخر سرکار عالی نے اسکیم منظور فرمالی۔ اس اثنا میں معتمدی فوج اور نظامت طبابت پر نئے اصحاب مامور ہوئے۔ کرنل نارمن واکر کو اس اسکیم میں کوئی دلچسپی نظر نہ آئی۔ چونکہ سررشتۂ فینانس پہلے ہی سے اختلاف ظاہر کرچکا تھا اس لئے اس اسکیم کو محافظ خانہ کی الماریوں میں محفوظ کردینے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

اگر یہ کام نو دس سال قبل شروع ہوجاتا تو اب تک بہترین نتائج پیدا ہوچکے ہوتے۔ اور اب جو محتاجی ادویات کے نہ ملنے سے ملک کو ہو رہی ہے وہ نہ ہوتی۔ حال حال میں سید عبدالرزاق کمپنی نے یہ کاروبار شروع کیا ہے۔ گو حالات جنگ کے اعتبار سے کامیابی سردست شاید مشکل نظر آئے تاہم حالات امید افزا ہیں۔

متذکرۂ بالا اشیا کی طرح ممالک محروسہ میں دیگر خام اشیا اتنی مقدار میں موجود ہیں کہ متعدد کارخانے تجارتی اصول پر چل سکتے ہیں اور جو چیزیں تیار ہونگی انکی لاگت بیرون ملک سے آنے والی چیزوں کے مقابلہ میں بڑھ نہ سکیگی۔

فرض کیا جاسکتا ہے کہ ان ۶۰ سال کے عرصہ میں کم از کم ۳۶ کروڑ کے مشترکہ سرمایہ سے پارچہ بافی روغن سازی و دیگر صنعتی کاروبار کو فروغ دینا ناممکن نہیں تھا۔ یہ امر درست ہے کہ ۳۶ کروڑ کی مجموعی رقم بہت زیادہ ہے اور یہ کہ اس ملک کی مجموعی سرمایہ داری اور کاروباری مالیت خود فی الوقت اسقدر نہیں ہے لیکن یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ جیسے جیسے کاروبار بڑھتا جاتا ہے تمول اور معاشی توانائی بڑھتی جاتی ہے ۶۰ سال میں بتدریج ایسے کارخانے کھلنا اور اسقدر سرمایہ مہیا ہوجانا بالکل ممکن تھا۔

زراعت | اس خطبۂ صدارت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ

"حکومت سرکار عالی نے حال ہی میں سررشتۂ زراعت کی تقسیم شعبۂ تحقیق اور شعبۂ اشاعت میں کردی ہے تاکہ ہمارے ہاں کی زرعی پیداواروں کی اقسام کو ترقی دینے اور مختلف قسم کی کھاد کے طریقوں اور اچھے بیج کے فراہم کرنے سے متعلق تجربات کئے جائیں اور انکی تشہیر گاؤں گاؤں کی جائے"

واضح ہو کہ ہمارے ملک کی زراعتی پیداوار کو امریکہ اور یورپ وغیرہ کی طرح بلند معیار پر لانے، تجربے کرنے اور ان سے زراعت پیشہ افراد کو واقف کرنے کی ضرورت کا احساس نواب مختار الملک مرحوم نے ۶۰ سال قبل کرلیا تھا۔ انہوں نے نواب عماد الملک کے چھوٹے بھائی سید محمدؐ بلگرامی مرحوم کو یورپ میں زراعت کی تعلیم سرکاری مصارف سے دلائی۔ ان کے واپس آنے کے بعد بالکل ممکن تھا اسی وقت سررشتۂ زراعت قائم کردیا جاتا مگر اس وقت کے کارفرمایوں کو سررشتۂ زراعت کا قیام پسند نہ آیا بحالیکہ برٹش انڈیا میں اس وقت یہ سررشتہ قائم ہوچکا تھا۔ سید محمدؐ صاحب مرحوم سررشتۂ انعام میں ڈپٹی کمشنر بنائے گئے۔ بعد ازآں سررشتۂ مال میں ان کو عمل داری اور اول تعلقداری کے خدمات پر مامور کیا گیا۔ ان کا کوئی تعلق زراعتی مسائل سے کبھی نہیں رکھا گیا۔

نواب آسمان جاہ مرحوم کی مدار المہامی میں سررشتۂ زراعت وتجارت وحرفت قائم ہوا اور اسکی نظامت کیلئے سید محمدؐ حسین مرحوم برٹش انڈیا سے طلب کئے گئے نگران کی ماتحتی میں سید محمدؐ بلگرامی مرحوم اور مرزا مہدی خاں کوکب کو دے کر کام لینے کا کبھی خیال نہیں کیا گیا۔ اس زمانہ میں پارٹی فیلنگ کا جو زور شور تھا اس میں ایسے مفید ملک اور بہر کسی کو غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ دو تین سال کے بعد ایسی حالت میں جب کہ فی الجملہ کام چلنے لگا تھا، ناظم سررشتہ کا انتقال ہوجاتا اور سر آسماں جاہ کی وزارت بھی ختم ہوجاتی ہے۔ اس سررشتہ کو تخفیف کرکے اس کے فرائض مجلس مالگزاری کے سپرد کردیئے جاتے ہیں۔ حالات کی مدد سے قیاس قائم کیا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ اس وقت کے ذمہ داران فینانس نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی مرحوم وغیرہ کا مطمح نظر یہ تھا کہ کوئی بلند نظری کا کام نہ ہو۔

ذمہ دار مال مسٹر ڈنلاپ آنجہانی کا تخیل بظاہر یہ تھا کہ مملکت آصفیہ کو برٹش انڈیا کے مقابلہ میں

پست رکھا جائے اور اشیائے خام فراہم کرنے والا ملک ہمارا ملک رہے اسکے بعد بھی اگرچہ کہ برٹش انڈیا میں سررشتۂ زراعت نے کافی ترقی کرلی تھی مگر حیدرآباد میں ایسے کسی سررشتہ کے قیام میں مسٹر ڈنلاپ اور سر جارج کیس واکر نے تجاہل عارفانہ کیا اور نواب حامد یار جنگ مرحوم اور خواجہ عبدالرشید مرحوم جیسے افراد سے بھی جو انگلستان سے اعلیٰ زراعتی تعلیم حاصل کرکے آئے تھے کوئی کام نہیں لیا گیا۔
آخر کار دور عثمانی میں ہی یہ سررشتہ قائم ہوا اسکی نظامت پر مسٹر جان کینی مامور ہوئے۔ یہ صاحب کس حد تک فن زراعت سے واقف تھے اور برٹش انڈیا کے کسی صوبہ میں اس کام کا تجربہ حاصل کیا تھا یا نہیں اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ اسکے بعد بالآخر نظامت زراعت پر مولوی مظہر حسین صاحب مامور ہوئے جو فن زراعت کی اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کرچکے تھے۔ ابتدا میں گو ان کو کام کرنے کا موقع نہیں دیا گیا بریں ہم انہوں نے مشکلات کو رفع کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ خودداری اور عزت نفس کے ساتھ کام آغاز کرتے ہیں کہ اس اثنا میں مسٹر کالنس صدر ناظم و معتمد تجارت و حرفت و زراعت ہوتے ہیں انہوں نے مظہر حسین صاحب کے ساتھ کام کرنا پسند نہیں کیا۔ مسٹر کالنس کی استدعا منظور ہوگئی اور اس امر پر کوئی غور نہیں کیا گیا کہ ایک ناظم سررشتہ کیوں اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے۔ نظامت زراعت پر برٹش انڈیا کے ایک نان گزیٹیڈ ملازم کو جو مستعار لیا گیا تھا ترقی دے دی گئی حالانکہ خود سرکار عالی کے علاقہ میں کسی نان گزیٹیڈ ملازم کو گزیٹیڈ اور اعلیٰ خدمت ملنا دشوار تر ہوگیا ہے اور عمال کو عہدوں پر ترقی دینے کے محترم صدرالمہامان زراعت سر رچرڈ ٹرینچ اور سر تھیوڈر ٹاسکر بڑی حد تک مخالف تھے۔
غرض سررشتہ زراعت کی دو شعبوں میں تقسیم کسی اصول پر مبنی نہیں ہے۔ برٹش انڈیا میں کسی صوبہ میں سررشتۂ زراعت یوں دو حصوں میں تقسیم نہیں کردیا گیا ہے بمبئی میں تجربہ کیا گیا لیکن ناکام ثابت ہوا اور دو شعبے جو الگ قائم کئے گئے تھے ملا دیئے گئے۔
سررشتۂ زراعت کے قیام کے بعد سے اس سررشتہ نے لانبے ریشے کی کپاس کو ترقی دینے میں ہی اپنی توانائی بڑی حد تک صرف کی۔ ارنڈی کی فصل کو کیڑوں سے بچانے، چاول کی اچھی قسموں کو ترقی دینے اور پنجابی عمدہ چاول اور بیرونی نہبوں سے حیدرآباد کو بے نیاز کرنے اور میووں کی پیداوار ممالک محروسہ میں

بافراط ہونے کے لئے بظاہر کوئی اہم و نمایاں کام انجام نہیں دیا گیا۔ بحالیکہ باہر سے ملک میں سالانہ پچاس لاکھ روپے کا میوہ آتا ہے۔ اور چاول و گیہوں کی بھی بڑی حد تک ضرورت ہوتی ہے۔

آبپاشی

نواب علی نواز جنگ بہادر کے ایک بلند پایہ مہندس ہونے کی نسبت سخت سے سخت مخالف کو بھی کلام نہیں ہوسکتا۔ ان کی علمی قابلیت اور سررشتۂ تعمیرات میں ان کا کارنامہ دنیا نہیں تو کم از کم ہندوستان کی نگاہوں میں موجود ہے ان کے تعمیری کاموں سے عام طور پر نظم و نسق اور معاشی کاروبار کو کس قدر سہولت اور کس قدر ترقی میسر ہوئی وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ عام طور سے سب لوگ واقف ہیں کہ نواب صاحب موصوف نے آبپاشی، سڑکوں، پلوں، برقی قوت، اور ٹیلیفون کے لئے بہت سی اسکیمیں بنادی تھیں۔ گو یہ اسکیمیں صرفۂ کثیر کی طالب تھیں لیکن آمدنی اور منافع کا بھی یقین دلاتی تھیں۔

سب اہل ملک اس بات سے آگاہ ہیں کہ کسی سال بارش میں کمی ہوجائے تو کیا کیا زحمتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جس رقبہ میں تنگبھدرا اور کرشنا کی ندیاں بہتی ہیں خود وہاں پر بھی رعایا پانی کے ایک ایک قطرہ کے لئے تڑپ تڑپ کر رہ جاتی ہے۔ لیکن سررشتۂ تعمیرات کی ہر کوشش میں سررشتۂ فینانس مانع اور مزاحم ہوگیا۔ نواب علی نواز جنگ بہادر کی آبپاشی کی اسکیمیں فنی نقطۂ نظر سے چند ان اہم اعتراضوں کی مورد نہیں ہیں بلکہ رعایا کی سیرابی اور خوش حالی کے لئے ہر طرح ممد و معاون ہیں۔ یہ ملک کی بدقسمتی تھی کہ ۱۵، ۲۰ سال قبل سررشتۂ تعمیرات اور سررشتۂ فینانس میں اختلافات پیدا ہوئے اور بالآخر مخالفت کی نوبت آگئی۔ سررشتۂ فینانس نے سررشتۂ تعمیرات پر عملاً یہ ظاہر کردیا کہ اسکو زیادہ رقم نہیں دی جاسکتی، اسکی اسکیموں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ جو رقم دی بھی جائے گی اس میں جامعۂ عثمانیہ اور دیگر عمارات پر اولاً سررشتۂ فینانس یا دوسرے الفاظ میں سر اکبر حیدری کے منشاء کے مطابق رقم صرف کی جانی لازم ہے۔

سررشتۂ فینانس عرصہ دراز سے یہ تسلیم کرتا آیا ہے کہ آبپاشی وغیرہ کے بڑے بڑے کاموں میں قرضہ لیکر کارہائے سرمایہ کے طور پر رقم صرف ہوسکتی ہے۔ مگر اس کے باوجود اس نے آمادگی ظاہر نہیں کی کہ

قرضہ کے ذریعہ آبپاشی برقابی کی اسکیمیں چلائی جائیں۔ یوں سررشتۂ فینانس کی مرضی ہو تو وہ بڑے بڑے قرضے لیتا ہے اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ لیا ہوا قرضہ حقیقتاً کس کام میں صرف ہوا۔ قحط فنڈ کے لئے ہمارا سررشتۂ فینانس ہر سال ایک کافی رقم آمدنی سے علحدہ کرتا ہے اور اس مد کی اب بھی ایک بہت بڑی رقم برٹش پرامیسری نوٹوں کی صورت میں محفوظ ہے اسکی یا عام سرمایہ جات سرکار عالی کی کفالت پر اس فنڈ سے آبپاشی کے بڑے کاموں کے لئے رقم بآسانی مہیا کی جاسکتی تھی۔

ذمہ داران فینانس کے لئے یہ امر بالکل آسان تھا کہ ۱۳۳۰ف سے جبکہ نظام ساگر کا کام تقریباً مکمل ہو رہا تھا سالانہ ایک کروڑ روپے سررشتۂ آبپاشی، ٹیلیفون اور برقیات کو ۱۲ سال تک یعنی ۱۳۴۹ف تک دیا جاتا اور شرط یہ لگائی جاتی کہ ہر ہر پراجکٹ کی تکمیل کے بعد چار روپے فی صدی منافع اور سنکنگ فنڈ کے لئے مناسب رقم سررشتہ متعلقہ ادا کرے۔ اس ۱۲ کروڑ کے صرفہ سے کس قدر زرین نتائج پیدا ہوسکتے تھے! اس ۱۵ سال کی مدت میں آبپاشی، برقابی اور ٹیلیفون کے کام اس قدر کامیاب ہو جاتے کہ منافع ادا کرنے کے قابل ہو جاتے۔ نظام ساگر سے ملک کی سیرابی، مزارعین کی خوش حالی اور عام کاروبار کی ترقی جو کچھ ہوئی اس کا تصور وہ افراد کرسکتے ہیں جنہوں نے ضلع نظام آباد اور نظام ساگر کی خوش حالی کو دیکھا ہے۔ اس مقالہ میں مختلف مقامات پر یہ قیاس آرائی کی گئی ہے کہ ۱۲ کروڑ روپے ریلوے پر ۱۲ کروڑ روپے آبپاشی برقابی ٹیلیفون وغیرہ کی اسکیموں پر اور ۳۶ کروڑ روپے کارخانوں وغیرہ کے قیام میں لگانا ممکن تھا۔ درحقیقت اس قدر سرمایہ کی فراہمی ناممکنات سے نہیں تھی۔ جب ہماری حکومت کا مالیہ ۲۰ سال میں دگنا بلکہ ڈھائی گنا بڑھ گیا ہے۔ ریلوے کا ۱۶ کروڑ روپے کا سرمایہ اب ڈیڑھ کروڑ روپے سالانہ کے خالص منافع کا ذریعہ ہوگیا ہے تو ۲۰ سال کی مدت میں مزید اوسطاً سالانہ ایک کروڑ روپے لگانا رعایا اور سرکار کے مشترکہ تعاون اور تشارک کی صورت میں بالکل ممکن تھا۔

سرمایہ

اسی خطبہ میں آگے چلکر کہا گیا ہے کہ

"محض حکومت کی کوششیں کافی نہیں ہیں تاوقتیکہ مختلف طبقات ملک بھی اپنے اپنے

دائرۂ عمل کو حالات وقت کے مطابق نہ کرلیں۔ سرمایہ دار طبقہ کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ ملک میں صنعتی کارخانے محدود ذمہ داریوں کی کمپنیوں کی شکل میں فوراً قایم کریں۔ حالیہ تلخ تجربہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے سرمایہ دار ایک جمود کے عالم میں ہیں۔ نظام شوگر فیکٹری اور کارخانۂ کاغذ سازی میں اس طبقہ نے کوئی قابل لحاظ حصہ نہیں لیا اگر حکومت کیجانب سے حصص نہ خریدے جاتے تو یہ کارخانے عالم وجود میں نہ آتے۔ معاشی کمیٹی کے پروگرام میں اگر ملکی سرمایہ داروں کے ذریعہ چھوٹے بڑے کارخانوں کے قیام کی جد و جہد بھی شامل کی جائے تو مناسب ہوگا۔"

ہمارے ملک کے سرمایہ داروں کے جمود کے عالم میں رہنے کا جو تلخ تجربہ ہوا ہے اسکی بنیادی وجہ کیا ہے؟۔ دنیا کے اور ممالک کی طرح مملکت آصفیہ کے نہ صرف سرمایہ دار بلکہ ملازمین سرکار اور خوش باش لوگ بھی کسی نفع آور کام میں اپنا سرمایہ اور بچت لگانے کے لئے بالکلیہ آمادہ ہیں۔ حیدرآباد کے اکثر افراد یہاں کوئی ذریعہ نہ ہونے سے برٹش انڈیا میں سرمایہ لگاتے ہیں۔ برٹش انڈیا کے پوسٹ آفسوں میں روپیہ رکھاتے ہیں۔ برٹش پرامیسری نوٹس خریدتے ہیں۔ برٹش بنکوں میں اپنی رقم محفوظ رکھتے ہیں۔ جب سرکار عالی کے ٹپہ خانوں میں سیونگس بنک قائم ہوئے تو لوگوں نے اس ذریعہ سے کامل استفادہ کیا۔ چنانچہ اب رقم امانتی کی مقدار ایک کروڑ روپے سے متجاوز ہوچکی ہے۔ سرکار عالی نے پرامیسری نوٹس جاری فرمائے تو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ اپنا سرمایہ لگا دیا۔

دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ کسی کاروبار میں سرمایہ اسی وقت لگایا جاسکتا ہے جب کہ اطمینان ہوتا ہے کہ کاروبار معتبر اور محفوظ ہیں۔ چنانچہ خود برطانیہ میں جہاں کروڑوں پونڈ کا سرمایہ نفع آور کاروبار کی تلاش میں رہتا ہے کبھی تو فوراً مہیا ہوجاتا ہے اور کبھی کوششوں کے بعد بھی ناکامی ہوتی ہے۔

حیدرآباد کی رعایا بھی نفع آور کاروبار میں سرمایہ لگانے کے لئے کافی اطمینان اور معتبری کی خواہاں ہے۔ اس نے سرکار عالی کو ابتدا میں قیام ریلوے کے لئے لاکھوں روپے دیئے۔ جب ریلوے کو انگلستان میں کمپنی کے سپرد کرنے کی گفت و شنید آغاز ہوئی تو امراء اور ساہوکار اس بات کے لئے

ٹکڑے ہوگئے تھے کہ کمپنی قائم نہ کی جائے اور ان سے روپیہ بقدر ضرورت مل سکتا ہے۔ خاندان ہائے راجہ نرسنگ گیر، راجہ شیولال موتی لال، راجہ چیتر بھوج داس، راجہ بھگوان داس، راجہ صاحبان ونپرتی، گدوال اور چٹپل نواب سیف نواز جنگ بہادر کے رقوم لاکھوں کی مقدار میں برٹش انڈیا میں لگے ہوئے ہیں۔ خاندان چینائی کا بھی بڑا سرمایہ باہر لگا ہوا ہے۔ نواب داؤد جنگ بہادر بھی کاروبار میں رقم لگاتے ہیں۔ سردار ولیر الملک مرحوم، کمال خاں مرحوم اور غالب الملک مرحوم کی بھی لاکھوں کی جائداد بمبئی وغیرہ میں تھی۔ اسی طرح اوروں کے بھی نام لئے جاسکتے ہیں۔ جناب نواب سالار جنگ بہادر بھی کافی سرمایہ کاروبار میں لگاتے ہیں۔ اس تفصیل سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ صحیح طریقہ پر سرمایہ لگانے میں حیدرآباد کے سرمایہ داروں نے کبھی انکار نہیں کیا۔

بدقسمتی سے مشکل یہ آن پڑی ہے کہ حیدرآباد میں صنعتی کاروبار میں روپیہ لگانے کا تجربہ اکثر تلخ ثابت ہوا۔ اول اول حیدرآباد میں گلبرگہ اور اورنگ آباد میں پارچہ بافی کی مشترکہ سرمایہ اور محدود ذمہ داری کی ۳ کمپنیاں قائم ہوئیں۔ اور ابتدائی اصل سرمایہ لگانے والوں کو مانیجنگ ایجنٹوں کے عمل کی وجہ سے سال ہا سال تک کوئی منافع حاصل نہیں ہوا۔ دکن مائننگ کمپنی کے متعلق سردار ولیر الملک کے طرز عمل نے لندن تک ایک خلفشار پیدا کیا۔ سید عبدالرزاق کمپنی کا کارخانہ شکرسازی جو نواب سروقارالامرا کی وزارت کے زمانہ میں قائم ہوا تھا سررشتہ مال کی عدم ہمدردی اور بیرون ملک کے سخت مقابلہ کی وجہ سے ناکام رہا۔ شاہ آباد سمنٹ کمپنی کو کئی سال تک منافع نہیں ملا اور جیسے ہی منافع کا زمانہ قریب آیا واقف حال افراد نے کم قیمت یا اصل مقدار پر حصص اصلی حصہ داروں کو ناواقف رکھکر خرید لئے۔ یادگیر کے کارخانہ تیل اور عثمان شاہی ملز کے حالات طشت از بام ہیں۔ ان حالات میں حیدرآباد کے سرمایہ دار اصحاب سرمایہ لگانے میں احتیاط کرتے ہیں۔ یوں خود شاہ آباد سمنٹ کمپنی اور عثمان شاہی ملز میں سرمایہ لگانے میں ملک میں ہر طرف جوش اور سرگرمی کا اظہار ہوا تھا۔ بہرحال واقعات زمانۂ گزشتہ میں خواہ کچھ بھی رہے ہوں ملک کا سرمایہ دار طبقہ کا یہ فرض ضرور ہے کہ صنعتی کارخانے محدود ذمہ داری کے کمپنیوں کی صورت میں فوراً قائم کرلے۔

مگر سرمایہ دار اصحاب کس طرح یہ فرض ادا کریں؟ یہی مشکل ہے جو اولاً حل ہونا چاہئیے۔ یورپ اور امریکہ میں جہاں سرمایہ وافر اور کاروباری مہارت و بلند حوصلگی کی کمی نہیں ہے حکومت اپنے کو کاروبار سے علحدہ رکھتی اور کام کو سرمایہ داروں اور کاروباری لوگوں پر منحصر کر دیتی ہے۔ مگر اب سرمایہ داری کے رد عمل کے طور پر روس میں صنعتی کاروبار حکومت کے فرائض میں شامل کرلئیے جاتے ہیں روس و جرمنی میں سرکاری سرپرستی اور ذمہ داری کو معاشی کاروبار کی حد تک بھی وسعت دیگئی۔ جاپان میں سرمایہ داروں کے ساتھ سرکاری رہنمائی اور تعاون کا عمل اختیار کیا گیا۔ ہندوستان میں حکومت برطانیہ کے اصول پر معاشی کاروبار کو کاروباری لوگوں پر چھوڑ دیا گیا۔ اس اصول پر سرکار عالی بھی عرصہ تک کاربند رہی مگر پھر یہ طریقۂ عمل اختیار کیا گیا کہ سرکاری سلک کا کچھ حصہ نفع آور کاروبار میں بھی لگایا جائے۔ اسی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے برٹش انڈیا کی بعض کمپنیوں میں حصص یا ڈبنچرز لئے گئے۔ نیز خود مملکت کی ریلوے اور معدنیات اور دوسری کاروباری کمپنیوں میں رقم لگائی گئی۔ اور بالآخر انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ قائم کیا گیا۔ اس فنڈ نے عثمان شاہی ملز کی مینجنگ ایجنسی قبول کی ہے۔ اور سمنٹ، شکر، کاغذ وغیرہ کے کاروبار میں شرکت کی گئی۔ جب یہاں تک قدم بڑھایا گیا ہے تو قدم کیا اور آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں؟۔

حسب ذیل چند امور پر توجہ کی جائے تو ملک میں سرمایہ حاصل ہونے میں جو موانعات ہیں وہ دور ہو جائینگے۔

۱۔ مشترکہ سرمایہ کی کاروباری کمپنیوں میں یہ طریقہ رائج ہو گیا ہے کہ مینجنگ ایجنسی کو منافع میں بہت بڑا حصہ دیا جائے اور مینجنگ ایجنٹ حاکم مطلق قرار پا جاتا ہے۔ ہر قسم کی رقومات پر اسکو لامتناہی اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ تعمیر، خرید آلات، اور اشیائے خام کی فراہمی میں وہ سرپرستی کرتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس اقتدار مطلق میں مناسب حد بندی عمل میں لائی جائے اور اس نوعیت کاروبار کے متعلق جو ضوابط اور قواعد ہیں ان میں قانوناً مناسب نظر ثانی عمل میں لائی جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو عثمان شاہی ملز میں گھاٹا نہ آتا۔

۲۔ یہ انتظام کیا جائے کہ عموماً حصص چھوٹی مقدار مثلاً سو روپے کے رکھے جائیں اور چونکہ اعلان قیام کمپنی، طلب سرمایہ اور افتتاح کاروبار میں کافی زمانہ گزرتا ہے اس لئے حصص کی رقم

ڈیڑھ دو سال کی مدت میں دس دس کے حساب سے ماہانہ یا دو دو ماہ پر وصول کرنے کا قاعدہ قرار دیا جائے اسکی وجہ سے عام طور پر ملازم پیشہ اور کم معاش لوگوں کو خریدی حصص کی ترغیب ہو جائیگی۔ اور نہ صرف سرمایہ دار بلکہ دوسرے عام لوگوں میں قومی مشترکہ سرمایہ فراہم کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائیگا یہی جذبہ پیدا ہوا تھا جب کہ شاہ آباد سمنٹ کمپنی اور عثمان شاہی ملز کے حصص فروخت ہوئے تھے۔

۳۔ منیجنگ ایجنٹ کے معاوضہ کی شرح میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بطور مثال کہا جا سکتا ہے کہ اسوسی ایٹیڈ سمنٹ کمپنی کے منیجنگ ایجنٹ کے معاوضہ کی سالانہ مقدار سات آٹھ لاکھ روپیہ کلدار ہے حالانکہ گورنر جنرل کی سالانہ تنخواہ ڈھائی لاکھ روپیہ ہے اور یہ تنخواہ ساری سلطنت برطانیہ میں سب سے بڑی تنخواہ ہے اسی طرح مملکت آصفیہ میں شکر، کاغذ اور تعمیری کاروبار کی جو کمپنی ہے اسکے منیجنگ ایجنٹ کا معاوضہ تینوں کاروبار میں کم و بیش ایک لاکھ روپے سالانہ ہوگا حالانکہ مملکت کے صدر اعظم کا سالانہ مشاہرہ ۶۰ ہزار روپے کلدار ہے اور صدر المہاموں کو ۴۸ ہزار روپے سالانہ سے زیادہ تنخواہ نہیں دی جاتی یہی حال ممالک محروسہ سرکار عالی کے پارچہ بافی کی گرنیوں کے انتظام کا ہے۔ اسکے علاوہ اسٹاف کی تعداد اور ماہوار وغیرہ میں بھی اسراف نہ ہونے کی نگرانی رکھنی چاہئیے۔

۴۔ فی الحال انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کو ہی مفید اور نفع آور کاروبار آغاز کرنا ہر طرح کامیاب ہونے کا یقین دلاتا ہے۔ یہ امر مناسب ہوگا کہ انڈسٹریل ٹرسٹ کسی بلند پایہ تجربہ کار ماہر کاروبار کے خدمات بطور مشیر اور ڈائرکٹر ان چیف حاصل کرے جسکے سپرد کاروبار کے تفصیلات کئے جا سکتے ہیں۔

۵۔ انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کے ٹرسٹیوں اور ذمہ داروں کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ وہ ملک کے امراء، تجار، مہاجن، سرمایہ داروں، کاروباری لوگوں اور ماہران سائنس، ماہران معاشیات اور معاشی اداروں سے تعلقات رکھیں اور جیسے ہی کسی کاروبار کے آغاز کا تہیہ ہو ان سے مشورت لینا او سرمایہ لگانے پر آمادہ کرنا ضروری ہے۔

۶۔ بالعموم ایسے کاروبار اختیار کئے جائیں جو برٹش انڈیا میں کامیاب ثابت ہو چکے ہوں او جن کو اس ملک میں خام اشیا کی بکثرت اور وافر موجودگی کی وجہ سے بآسانی جاری کیا جا سکتا ہے۔

مستقبل

معاشی کاروبار کی ترقی کے امکانات کے ساتھ ہی یہ خیال افسردگی پیدا کردیتا ہے کہ جنگ کی وجہ سے جب مشنری مل نہیں سکتی اور ساری توانائیاں کامیاب انصرام جنگ پر لگی ہوئی ہیں تو ہم بے بس افراد کیا کرسکتے ہیں۔

اخبارات کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ جہاں فریقین جنگ کے دفاتر اور سررشتے جنگی اہتمام میں پوری شدت اور انہماک کے ساتھ مصروف ہیں وہاں ہر فریق کے ملک میں چند باخبر اور تجربہ کار افراد مابعد جنگ کے معاشی پروگرام کی ترتیب میں مصروف ہیں۔ ہم بھی اس فرصت میں سے چند باخبر افراد کو بعد از جنگ معاشی پروگرام مرتب کرنے میں مشغول کردے سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ اہل بصیرت کیے غور کیجئے یہ واقعہ اپنے حال پر قائم ہے کہ کسی جگہ بھی مشنری کا وجود بیک وقت طلسمات کی طرح قائم نہ ہوا۔ بتدریج ان کی ایجاد ہوتی گئی۔ مثلاً پارچہ بافی کے دستی چرخے اور کرگھے چل رہے تھے۔ ان کے بجائے برق و بخار کی مدد سے کاروبار بڑے پیمانہ پر چلانے کا طریقہ بتدریج ترقی پاتا گیا۔ اور بتدریج ان کے آلات و اوزار بنائے گئے۔ یہی حال دوسری ہر صنعت کا ہے۔

ہم یہ تصور کرسکتے ہیں کہ مشین کے ذریعہ برق و بخار کی طاقت سے پارچہ بافی کی دریافت ہم نے آج ہی کی ہے یا یہ کہ موٹر کار کی پہلی مشین ہم نے آج ہی تیار کی ہے اور پھر ہم اسکے سلسلہ میں وہی کوشش اسی طریقے سے آغاز کریں جو پارچہ بافی کی پہلی مشین کے موجد اور پہلی موٹر کار کی اختراع کے بعد اسی کی مشینوں کو بنانے کے لئے یورپ اور امریکہ میں عمل میں آئی تھی۔ آج نہیں تو دیر میں سہی ہماری کوشش کامیاب ہوسکتی ہے۔

مشکلات کو حل کرنے کے سلسلہ میں ایک مثال درج کی جاتی ہے۔ یہ داستان پہلے بیان ہوچکی ہے کہ کس طرح ملک میں روئی صاف کرنے اور گٹھے باندھنے کے کارخانے بلاضرورت ہوئے اور یہ کہ اکثر کارخانے سال بھر بند پڑے رہتے ہیں۔ سیلو میں ایک ایسے بند کارخانہ کے متعلق ایک صاحب ہمت کو خیال آیا کہ اسکی مشنری سے برقی روشنی اور برقی طاقت مہیا کرنے کا کام نکالا جائے۔

چند ضروری ترمیمات اور چند ضروری آلات کی فراہمی کے بعد اب اس کارخانے سے سیلو کے چھوٹے سے قصبہ میں برقی قوت بآسانی پیدا کی جارہی ہے اور ساری بستی میں تقسیم ہورہی ہے۔ اس طرح ایک بے کار کارخانہ کارآمد ہوگیا۔ چند ماہران فن اس امر کی رپورٹ پیش کرنے کے لئے مامور ہوسکتے ہیں کہ ان بیکار کارخانوں کو کس حد تک فی الحال صنعتی کاروبار کے لئے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ اور اگر مزید مشنری کی ضرورت ہو تو اسکے فراہم ہونے کی کیا سبیل ہے۔ آخر کاغذ کے کارخانے کی مشنری جنگ کے زمانہ میں ہی آئی سویڈن سے روس ہوکر اور وہاں سے عراق اور خلیج فارس کے راستہ کچھ مشنری آخر آہی گئی۔ صرف ہمت اور کسی کام کو انجام پر پہونچانے کا ولولہ ضروری ہے۔

اوین میٹل ورکس کا خام مال جمشید پور سے آتا ہے اور زمانہ جنگ میں ہی کارخانہ کھل گیا۔ (باقی آیندہ)

صنعتی ممالک کے چند معاشی مسایل

از جناب حامد محی الدین صاحب معتمد بزم معاشیات جامعۂ عثمانیہ

موجودہ دور تاریخ انسانی میں اس حیثیت سے بھی بے نظیر ہے کہ دُنیا نے جدال و قتال کا ایسا ہنگامہ آج تک نہیں دیکھا جیسا کہ آج کل کُل عالم میں برپا ہے۔ جنگ کے ہیبتناک شعلوں کی لپیٹ نے ساری دُنیا کو ہم آغوش کرلیا ہے بلاشبہ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا جب اس وسیع عالمی محاذ کے کسی نہ کسی حصہ پر ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کی بھینٹ جنگی دیوتا کو نہ چڑھائی جاتی ہو۔ یہ جنگ دراصل اس انتشار کا خارجی مظہر ہے جو اس وقت متمدن دنیا میں جاری ہے۔ انسانی تمدن کا ہر شعبہ چاہے وہ معاشی ہو یا سیاسی، قومی ہو یا بین الاقوامی، اس میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہے۔ ان ساری دہشت ناکیوں کا حقیقی سبب وہ چند معاشی مسائل ہیں جو ترقی یافتہ ممالک میں خطرناک حد تک اہمیت حاصل کرچکے ہیں۔

ان معاشی مسائل کو ہم افلاس، بیروزگاری، سرمایہ اور محنت کی جنگ، معاشی بحران سامراجی جلب منفعت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ان مسائل کی ماہیت کو سمجھنے کیلئے سب سے پہلے اس معاشی ڈھانچہ کو سمجھ لینا ضروری ہے جو کسی صنعتی ملک میں اسوقت موجود ہے۔ ان صنعتی ممالک میں سرمایہ دارانہ طریق پیدائش وصرف رائج ہے۔ اس نظام میں ذرائع پیدائش پر صرف ایک طبقہ کا قبضہ ہوتا ہے۔ ساری معاشی مشنری خواہ وہ پیدائش ہو کہ صرف یا تقسیم خانگی افراد کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ اور دوسرا طبقہ جو کثیر تعداد میں موجود ہوتا ہے اپنی محنت کو "جنس" کی طرح بیچکر روزگار کماتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی تعریف انگلستان کے مشہور و معروف، ماہر معاشیات کول کے الفاظ میں یوں کی جاسکتی ہے "سرمایہ داری وہ ترقی یافتہ نظام پیدائش دولت ہے جو منافع اندوزی کیلئے ذرائع پیدائش کی خانگی ملکیت پر مبنی ہوتا ہے" چونکہ مٹھی بھر سرمایہ داروں کی

تعداد ملک کے تمام ذرائع پیدائش کی مالک ہوتی ہے اور ملک کی زیادہ سے زیادہ آبادی مزدور کی حیثیت سے اپنا گذارہ کرتی ہے تاکہ برا بھلا انکا اور انکے اہل وعیال کا گذارا ہوسکے۔ اس لئے ملک کی مادی خوشحالی میں ناہمواری اور ضروریات زندگی کی تکمیل میں عدم توازن کا پایا جانا ضروری ہے۔ سرمایہ دار طبقہ محنت نہ کرتے ہوئے بھی عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اور مزدور طبقہ جو مظلوم طبقہ ہوتا ہے سرمایہ دار طبقہ کے لئے زیادہ سے زیادہ سامان تعیش پیدا کرتے ہوئے بھی اپنی ضروریات زندگی کیلئے محتاج ہوتا ہے اور اپنی آمدنی میں اضافہ کی خاطر اپنے کم سن بچوں اور عورتوں کو محنت کرانے پر مجبور ہوتا ہے اس مجبوری کی وجہ سے ملک کی آبادی کے بڑے حصہ میں معاشرتی اور خاندانی زندگی میں کئی نقائص پیدا ہو چکے ہیں یہ تقابلی مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ دولت کی تقسیم میں عدم توازن شدت سے جاری ہے اس عدم توازن نے ایک چھوٹی سی تعداد کو خوشحال اور بڑی تعداد کو مصیبت زدہ اور دکھی بنا دیا ہے۔ اب یہ بہانہ تو نہیں تراشا جاسکتا کہ دولت زیادہ نہیں پیدا کی جاسکتی اور کثیر آبادی کی ضروریات کو پورا بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس قسم کا سبب اور نقص جاگیرداری نظام میں موجود تھا۔ دولت کے پیدائش کے طریقے اور آلات پہلے اتنے ترقی یافتہ نہیں تھے جسقدر کہ آج ہیں۔ چھوٹے پیمانہ کی صنعتیں رائج تھیں۔ صنعتی انقلاب نے دنیا کی ہر جہتی زندگی میں تبدیلی پیدا کردی۔ "چھوٹے پیمانہ کی پیدائش کی جگہ "بڑے پیمانہ کی پیدائش" نے لے لی ہے۔

مشینوں کی ایجادات نے پیدائش دولت کی تحدیدات کو یکسر مٹا دیا ہے۔ اگر دولت کی پیدائش کے ساتھ تقسیم دولت کو معاشی نظم کے ماتحت لایا جائے تو اس قسم کے نقائص کا نام ونشان باقی نہ رہے گا اور افلاس کا مسئلہ جو آج سوائے ایک ملک کے ساری دنیا میں پریشان کن ثابت ہورہا ہے اس کا بھی خاتمہ ہوجائیگا۔

اس زمانہ میں تو افلاس کا تعلق دولت کی قلت سے نہیں بلکہ اسکی افراط سے وابستہ ہے چنانچہ ہزاروں ٹن گیہوں اس لئے برباد کیا جاتا یا تہہ آب کردیا جاتا تھا کہ زائد پیداوار کے سبب تجارتی نفع اندازی متاثر نہ ہو اور بازاری قیمتیں گرنے نہ پائیں آج دنیا کی دوسو کروڑ سے زیادہ آبادی

نکبت کی حالت میں اپنے زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ اسکے برخلاف بعض ممالک میں دولت کے چشمے اُبل رہے ہیں ہر چھ آدمیوں میں ایک موٹر نظر آتی ہے اسکے برخلاف بعض ممالک میں روزانہ آمدنی کا فی کس اوسط ۲/ آنے سے زیادہ نہیں ہے۔ بعض دفعہ" زاید پیداوار کی کھپت کے سلسلہ میں جنگ بھی ضروری ہو جاتی ہے" سرمایہ دارانہ طریق پیدائش کا مقصد صرف نہیں ہوتا بلکہ نفع اندوزی ہوتا ہے۔ حالانکہ پیدائش کا مقصد ہی صرف ہے۔ معاشی نظم کے نہ ہونے کی وجہ سے ضروریات زندگی سے زیادہ سامان تعیش کی طرف توجہ دی جاتی ہے کیونکہ سامان تعیش کے پیدا کرنے میں نفع اندوزی کے مقصد میں کامیابی ہوتی ہے۔

ہر صنعتی ملک میں آبادی دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک سرمایہ دار دوسرا مزدور اور معاشی زندگی میں سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ جاری ہے ایک کا معیار رہائش بلند ترین اور دوسرے کا اسی نسبت سے پست ترین ہوتا ہے کیونکہ سرمایہ داری نظام کا انحصار منافع پر ہوتا ہے اور منافع اجرتی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی استواری کاروبار کی آزادی سے قائم ہے۔ جسکی وجہ سے دولت کی پیدائش کسی نظم کے بغیر ہوئی ہے۔ جسکی وجہ سے زاید پیداوار کی زیادتی ہوتی ہے یہ دولت اپنے ملک میں نہیں کھپ سکتی۔ کیونکہ ملک کی آبادی کی ایک کثیر تعداد کا معیار رہائش پست ہوتا ہے۔ ان کی قوت خرید کم ہوتی ہے۔ اس لئے سرمایہ دار ممالک کے لئے ضروری ہے کہ مال کی نکاسی کیلئے کہیں باہر بازار پیدا کریں تمام کرۂ ارض کے سرمایہ داروں کو اپنی پیداوار کیلئے ایک برابر بڑھتے رہنے والے بازار کی ضرورت ہوتی ہے قدیم اور مروج صنعتیں برباد کی جا چکی ہیں اور جو باقی ہیں وہ برباد کی جا رہی ہیں۔ ان کی جگہ جدید صنعتیں رائج کی جا رہی ہیں یہ صنعتیں نہ صرف اپنے ملک کی خام پیداوار کام میں لاتی ہیں بلکہ دور دراز ممالک کی خام پیداوار بھی چاہتی ہیں۔ اور پیدا آوری کی کثرت کے سبب اشیا کی کھپت ان کے ہی علاقہ میں نہیں بلکہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اسی نوبت پر صنعتی ممالک لوٹ کھسوٹ شروع کر دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نو آبادیات بنائی جاتی ہیں آزاد ممالک کو غلام بنایا جاتا ہے۔ اور کئی آزاد

تو تیں برباد کردی جاتی ہیں تاکہ اپنے مال کی زیادہ سے زیادہ کھپت ہوسکے۔ اسطرح پر ملک کے سرمایہ دار اسی کوشش میں رہتے ہیں۔ ان میں مقابلہ کا شروع ہونا ناگزیر ہوجاتا ہے اب اندرون ملک مقابلہ بڑی حد تک کم ہوگیا ہے اور اجارہ داری نے جنم لیا ہے لیکن اب بین الاقوامی مقابلہ شروع ہوگیا ہے۔ بیرونی ممالک مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے کئی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ایک عام طور سے زیادہ عمل میں آنے والا طریقہ (DUMPING) کا ہے۔ اس تدبیر سے کسی صنعتی ملک کا مال اندرون ملک تو مہنگے داموں فروخت ہوتا ہے لیکن بیرونی بازاروں میں مقابلہ میں کامیابی کے حصول کی خاطر ارزاں داموں پر فروخت ہوتا ہے۔ بیرونی بازاروں میں سامان تجارت کی ارزانی ہی وہ ذریعہ ہے جسکے زور سے سرکش قوتوں کو بھی اطاعت پر مجبور کیا جاتا ہے۔ بیرونی بازاروں کے حصول کے باوجود ملک کی معاشی ابتری ویسی ہی رہتی ہے۔ کیونکہ بیرونی ممالک سے فائدہ حاصل کرنے والا سرمایہ دار طبقہ مٹھی بھر ہوتا ہے اور ملک کے مزدوروں کے مسائل لاینحل ہی رہتے ہیں ان سرمایہ دارانہ ممالک کو اب دو قسم کی مخالفانہ جد وجہد سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو نوآبادیوں اور مقبوضہ ممالک کی جنگ آزادی اور دوسرے خود آزاد ممالک کے مزدوروں کی جد وجہد مزدوروں نے اجتماعی قوت کا احساس کرلیا ہے۔ چنانچہ وہ اب منافع کے دعویدار ہو رہے ہیں۔ کم سے کم "کام کے گھنٹوں" کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مختلف قسم کے آسائشوں کی مانگ کی جاتی ہے۔ سرمایہ اور محنت کا یہ تصادم اسوقت تک جاری رہیگا جب تک کہ مزدوروں کو ان کا پورا پورا حق نہ مل جائے اور سرمایہ داری کا خاتمہ نہ ہوجائے۔ مزدوروں کی جد وجہد ہڑتالوں کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور بے چینی پیدا ہوتی ہے لیکن اس بے چینی میں اس وقت اور بھی اضافہ ہوتا ہے جبکہ چند چند سال کے وقفہ سے معاشی کساد بازاری آتی ہے سرمایہ دار معاشی کساد بازاری کے مقابلہ کیلئے مزدوروں کی اجرت گھٹا دیتے ہیں کارخانے بند کردیتے ہیں یہ دونوں چیزیں طبقاتی منافرت میں اور بھی شدت پیدا کردیتے ہیں اور دوسری طرف بیرونی بازاروں کے حصول کیلئے صنعتی ممالک میں جو مقابلہ پیدا ہوتا ہے وہ اکثر دفعہ جنگ کی صورت اختیار کرلیتا ہے اور ہر چند سالوں کے بعد نوع انسانی کو جنگ کی ہولناکیوں میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔

سرمایہ داری جب ترقی کرکے سامراجی منزل پر پہنچ جاتی ہے تو دو قسم کے معاشی تضاد پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو اندرون ملک اور دوسرے بیرون ملک۔ اندرون ملک اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ مزدور اپنے حقوق حاصل کرنے کیلئے مزدور سبھاؤں اور ٹریڈ یونین کے ذریعہ سیاسی قوت حاصل کرنا چاہتے ہیں چنانچہ اب دیکھا جاتا ہے کہ ہر ملک کی سیاسی جماعتوں میں ایک مزدور جماعت بھی ہوتی ہے روس میں ان کی کوشش بارآور ہو چکی ہیں۔

اکثر ممالک بیرونی مقابلہ سے بچنے کیلئے آپس میں نفع حاصل کرنے کے معاہدے کر لیتے ہیں اندرون ملک کے تنازعوں کو جو آجر اور مزدور کے باہمی جھگڑوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں کم کرنے کیلئے سرمایہ دار مزدوروں کی اُجرت میں برائے نام اضافہ کرتے ہیں۔ اوقات کار میں خفیف سی کمی کرتے ہیں ہزاروں مزدوروں میں سے صرف چند سو کیلئے مکانات بنائے جاتے ہیں۔ اور حکومتیں قوانین وضع کرکے اشک شوئی کرنے کی سعی کرتی ہیں لیکن ان جزوی تبدیلیوں سے بڑی کمزوریاں کسطرح کم ہو سکتی ہیں! کیونکہ مذکورہ بالا تبدیلیوں کے باوجود محنت کا استحصال باقی رہتا ہے۔

بیرون ملک کے مقابلہ سے جو تباہ کاریاں جنگ کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ انکو کم کرنے کیلئے اور امن کے قیام کیلئے مجلس اقوام کی بنیاد ڈالی گئی لیکن اسکی کوششیں کارگر نہیں ہوئیں۔

غرض یہ تدابیر بنیادی نقائص کو دور نہ کرسکے ان امور سے تو اندرون ملک کے معاشی حالات پر تو پردہ ڈالا جا سکتا ہے لیکن یہ نابود ہونے نہیں پاتے۔

جب تک سرمایہ دارانہ نظام کے یہ تضاد باقی ہیں دنیا آزادی، مساوات اور حقوق کے سنہرے الفاظ کو شرمندہ معنیٰ نہیں دیکھ سکتی۔

غرض اکثر جماعتیں فی الحال سرمایہ دار طبقہ سے برسر جنگ ہیں لیکن ان میں مزدوری پیشہ جماعت ہی حقیقی انقلابی جماعت ہے۔

رہا ادنیٰ اور متوسط طبقہ جس میں چھوٹے چھوٹے دست کار اور سرمایہ دار شریک ہیں یہ اس لئے اس جد و جہد میں شریک ہے کہ وہ متوسط طبقے کے رکن ہونیکی وجہ سے اپنی حیثیت برقرار

رکھ سکیں یہ جماعتیں قدامت پسند ہوا کرتی ہیں۔

ویسے بھی سرمایہ دارانہ نظام معیشت اپنی کمزوریوں کی وجہ سے زندگی کے آخری مراحل طے کر رہا ہے۔ جن ممالک میں اسکو پارلیمانی جمہوریت میں پناہ نہ مل سکی وہاں اس نے فسطائیت اور قومی اشتراکیت کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اس میں معاشی نظام بالکلیہ سرمایہ دارانہ طریق پر استوار نہیں کیا جاتا اس میں خانگی ملکیت کو تو برقرار رکھا جاتا ہے لیکن معاشی قانون اور نظم حکومت کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ اشیاء پر نگرانی اور قیمتوں پر قابو حاصل کرلیا جاتا ہے۔ یہاں مزدور اپنی تنظیم نہیں کرسکتے۔

موجودہ جنگ ان ہی نقائص کا مظاہرہ ہے اگر فسطائیت کو فتح ہوئی تو پھر سرمایہ دارانہ نظام اپنی پوری تباہتوں کے ساتھ دنیا میں موجود رہیگا۔ اور اگر اتحادین کو فتح ہوئی تو اس نظام کا زوال لازمی ہے کیونکہ اتحادین میں روس اور چین جیسے ترقی پسند ممالک اور امریکہ و برطانیہ کے ترقی پسند عوام مقبوضہ ممالک کے عوام کے ہمدردیوں کے ساتھ شریک ہیں۔

روس نے معاشی سود و بہبود کا ایک اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ جہاں سرمایہ دارانہ نظام کے سارے نقائص مفقود ہیں۔ یہاں دولت کی پیدائش کا مقصد صرف ہے یہاں نہ تو آجر و مزدور کے تنازع ہیں نہ تقسیم دولت کی عدم مساوات نہ تو مقابلہ کی برائیاں ہیں اور نہ سامراجی لوٹ کھسوٹ کی حرص۔ یہاں وہ سارے مسائل ناپید ہیں جن سے انسانیت میں افلاس، بیروزگاری اور معاشی بحران اور سامراجی لوٹ کھسوٹ کی مصیبتیں پیدا ہوتی ہیں۔

بعض ممالک میں جن میں روس بھی شریک ہے "معاشی خود کفالت" کی حکمت عملی باوجود مخالفتوں کے مسلمہ ہوچکی ہے۔ چنانچہ جرمنی نے اپنے "چار سالہ لائحہ عمل" کے ذریعہ اور روس نے "پنج سالہ لائحہ عمل" کے ذریعہ کوشش کی کہ قومی ضرورتوں کے حد تک اپنے ملک کو کسی دوسرے ملک کا محتاج نہ رہنے دیا جائے۔ معاشی نظم کو بے ترتیبی سے چلانے کے بجائے منظم کردیا جائے اور تجارت و صنعت کی حد تک آزاد مسابقت کی جگہ تاہیں اور حفاظت کا اصول رائج کیا جائے۔ اس حکمت عملی سے بعض دفعہ جنگ کا خطرہ لاحق ہوتا ہے

غرض تمدن انسانی میں انتشار پیدا ہے۔ لیکن روس کی مثال نے دنیا کو دوراہے پر پہنچا دیا ہے۔ ایک تو تباہی اور بربادی کا دوسرا آزادی اور خوشحالی کا۔ اب انسانیت کو کسی ایک راستہ پر چلنا ہوگا۔

بلاشبہ مزدور کا میلان تو آزادی اور خوشحالی کے راستہ کی طرف ہوگا لیکن ان کے برخلاف مٹھی بھر سرمایہ داروں کا میلان جلب منفعت کی طرف رہنمائی کریگا۔ لیکن جسطرح اقتداری نظام نے جاگیردارانہ نظام کو اور جاگیردارانہ نظام نے سرمایہ دارانہ نظام کو ابھارا اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام کو ایک ایسے نظام کیلئے جگہ خالی کرنی ہوگی جنمیں سرمایہ داری کی ساری قباحتیں نابود ہوں۔

غرض انسانیت کو ساری معاشی قباحتوں سے بچانے کیلئے زندگی اور تمدن کے شعبہ میں ایک جدید تنظیم کی ضرورت ہے جس میں قومی حدود کے اندر اپنے مسائل کو نہ سلجھایا جائے بلکہ ایک بین الاقوامی خیال اور انسانیت کی خاطر سوچ بچار کیا جائے۔

کاشتکار اور مچھلیاں

از جناب محمد رحیم اللہ صاحب ام ایس سی مہتمم شریشتہ سمکیات

اس مختصر مضمون میں اس بات کو بتانے کی کوشش کیگئی ہے کہ کسطرح کسان مچھلیوں کی صحیح اصول پر پرورش کرکے خود مستفید ہوسکتے اور ملک کو ایک عمدہ غذا کی فراہمی میں مدد دیسکتے ہیں۔

کاشتکاروں کا تعلق مچھلیوں سے بالکل قریبی ہے اسلئے کہ وہ کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ آسانی سے اُنہیں پال سکتے ہیں خصوصاً ایسے اضلاع میں جہاں پانی کی افراط ہے۔ نظام آباد اور میدک میں نظام ساگر اور پوچارم کی نہروں کی وجہ سے پانی آسانی کے ساتھ ملتا ہے۔ چاول کی کاشت اکثر دوسرے اضلاع میں بھی ہوتی ہے۔ کھیتوں میں پانی کئی مہینوں تک جمع رہتا ہے اور اُسکے بعد خارج کردیا جاتا ہے ذراسی محنت اور توجہ سے کھیتوں کے ایسے حصوں میں جو سب سے نیچے ہوں چند گڑھے بنادیئے جاسکتے ہیں جہاں بیکار پانی جمع ہوتا رہے۔ اس پانی میں مرل کے بچے چھوڑ دیئے جائیں اور اس بات کا خیال رہے کہ پانی کے پودے اور چند بیلیں بھی پانی میں موجود رہیں تو سال کے ختم تک کافی مقدار میں مچھلی دستیاب ہوسکیگی۔ یہ مچھلی کسان اپنی غذا کے طور پر استعمال کرسکتے ہیں اسکی شدید ضرورت ہے کہ کسانوں کو مچھلی یا اسی قسم کی کوئی غذا وقتاً فوقتاً ملتی رہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان غریبوں کی غذا جوار۔ پیاز اور معمولی چٹنی ہوتی ہے جسمیں چند غذائی اجزاء زیادہ تر موجود نہیں ہوتے۔ اگر کوئی حیوانی غذا بھی اُنکو کبھی کبھی ملتی رہے تو تندرستی کے لئے زیادہ بہتر ہوگا۔

مرل یا دوسری مچھلیوں کو پکاتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اُنکے جگر کو نکال کر باہر نہ پھینکدیں بلکہ پتہ کو جو گہرے نیلے رنگ کا ہوتا ہے علیحدہ کرکے جگر کو مچھلی کے ساتھ ہی پکائیں۔ جگر میں تیل ہوتا ہے جسکے اندر حیاتین **الف** کی کافی مقدار رہتی ہے اور خود مچھلی کے جسم میں حیاتین **ج** موجود ہے اسطرح دو اہم غذائی اجزاء تھوڑی سی مچھلی کھانے سے حاصل ہوسکتے ہیں۔

مرل مچھلی ہمارے ملک میں ہر جگہ پائی جاتی ہے اور اگر اسے ملک کی دولت کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ آسانی کے ساتھ پالی جاسکتی ہے اور اسکی افزائش بھی اسلیئے مشکل نہیں کہ یہ ہر کنٹہ یا گڑھے میں انڈے دیتی ہے۔ اسکے بچے اپریل اور ستمبر یا اکتوبر سال کے دو موسموں میں نکلتے ہیں اور آسانی کے ساتھ خریدے جاسکتے ہیں یا اگر کسان تھوڑی سی جستجو کریں تو خود بھی کنٹوں اور تالابوں سے جمع کر سکتے ہیں اسلئے کہ مرل ہمیشہ کم پانی میں کنٹوں کے کنارے گھانس کو جمع کر کے گھر بناتی اور اسمیں انڈے دیتی ہے۔ بارو ری کے بعد ان میں سے بچے نکلتے اور گھر میں اسوقت تک رہتے ہیں جبتک کہ وہ اپنی غذا آسانی کے ساتھ فراہم کرنے کے قابل نہ ہوں۔ تھوڑی مدت تک مادہ بچوں کی حفاظت کرتی اور بچوں کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ گاؤں میں مچھلی پکڑنے والے اور دوسرے لوگ اس بات سے بخوبی واقف ہیں اور اس سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ پھول مرل کے بچے سرخ رنگ کے اور کالی مرل کے سرخی مایل سیاہ ہوتے ہیں۔ ڈھوک کے بچے سیاہ ہوتے ہیں۔

علاوہ مرل کے دوسری مچھلیاں بھی آسانی کے ساتھ پالی جاسکتی ہیں۔ مثلاً سنگھی اور معروف ان مچھلیوں کے گوشت میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ چربی کم ہونے کی وجہ سے یہ آسانی کے ساتھ ہضم ہو جاتا ہے اور ایک خاص قسم کا غذائی جزو موجود ہوتا ہے جسکو لائیسن کہتے ہیں اسکی وجہ سے کمزور اور مریض بہت جلد طاقت حاصل کرتے ہیں۔

جن کھیتوں میں نہر سے پانی آتا ہے اُن میں پانی کے ساتھ ساتھ مچھلی کے بچے بھی آتے ہیں۔ اگر گڑھے بنا کر زاید پانی کو محفوظ کر لیا جائے تو یہ بچے بڑے ہو کر آمدنی کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ رُوہو کے بچے نہر کے پانی میں بکثرت ملتے ہیں۔ ایک دوسری مچھلی ہے جسکو کتلا کہتے ہیں یہ گاؤں میں بوچی کے نام سے مشہور ہے۔ مانجرا ندی میں بکثرت ملتی ہے اگر اس مچھلی کے بچے جمع کر کے ایسے کنٹوں میں ڈال دیئے جائیں تو سال بھر میں تقریباً ایک فٹ تک بڑھ جائینگے۔

یہ امر اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب پانی کھیتوں میں داخل ہوتا ہے تو جگہ جگہ ٹوکری نما پھندے لگا دیئے جاتے ہیں جنہیں بکثرت مچھلی کے بچے پھنس جاتے ہیں اور اس طرح وہ لاکھوں کی تعداد میں

برباد ہوتے ہیں۔ اگر ان کو بڑھنے دیا جائے تو یہ تھوڑے عرصہ میں بڑے ہو کر زیادہ فائدہ مند ہونگے۔ ایسی ایک مچھلی ایک چھوٹے خاندان کیلئے کافی ہوگی۔ کسانوں کی لاعلمی یا ان کے افلاس کی وجہ ہے کہ وہ ہر اُس چیز کو غنیمت سمجھتے ہیں جو انہیں فوراً ملجائے۔ اس بات کو واضح کردینا ضروری ہے کہ بچوں کو پکڑ کر برباد کرنا نقصان رساں ہے اور تھوڑے عرصہ تک صبر کرنے سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

صرف ایک مثال کے ذریعہ یہ بات صاف ہو جائیگی۔ اگر مرل کے بچے ایک ہزار کی تعداد میں چھوڑے جائیں تو خریدی میں صرف پانچ روپے صرف ہونگے۔ سال بھر کے بعد ان کو پکڑ کر فروخت کریں تو کم از کم ڈھائی سو روپیہ حاصل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح کتلا اور رُوہو مچھلی سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اس وقت یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کسانوں کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ مچھلی کے بچے جمع کریں۔ اسکے لئے حکومت کی معمولی توجہ سے انتظام ہو سکتا ہے اور وہ اسطرح کہ جس جگہ یہ بچے بکثرت دستیاب ہوتے ہیں وہاں سے پکڑ کر کاشتکاروں کو سستے داموں دئیے جائیں یا اگر کچھ سرکاری امداد مل سکے تو شروع میں مفت بھی دئیے جائیں۔ موزوں مقامات پر "فش فارم" یا ایسے کنٹے بنائے جائیں جہاں مختلف قسم کی مچھلیوں کے بچے جمع کئے جا سکیں اور ہر وقت ضرورتمند اشخاص کو فراہم کئے جا سکیں۔

اس کام کو اگر بڑے پیمانہ پر کیا جائے تو زاید از ضرورت مچھلیاں فروخت بھی کیجا سکتی ہیں کوشش کیجا رہی ہے کہ ہر ضلع کے تعلقوں میں مچھلی والوں کی انجمنیں بنائی جائیں جو مقامی مارکٹ کو مچھلیوں کی حد تک اپنے ہاتھ میں رکھیں اور زاید مقدار کو باہر بھیجنے کی کوشش کریں۔ حیدرآباد شہر میں ایسی ایک انجمن بن چکی ہے جو زاید مچھلیوں کو خرید کر فروخت کا انتظام کریگی اور اسطرح کسانوں کی آمدنی میں بغیر کسی زیادہ محنت کے اضافہ ہو سکیگا۔

اب یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ جب پانی جگہ جگہ بھرا رہیگا تو لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مچھر زیادہ تعداد میں

پیدا ہونے لگیں گے۔ قدرت نے ایسی مچھلیاں پیدا کی ہیں جو مچھر کے بچوں کو کھا کر پانی کو صاف کر دیتی ہیں۔ یہ پرکلیاں ہیں۔ ان کے علاوہ گیمبوسیہ ایک چھوٹی مچھلی ہے جسکو اگر کافی تعداد میں پانی میں چھوڑ دیا جائے تو ملیریا کا انسداد ایک حد تک کر سکتی ہیں۔ پانی جب خشک ہوگا تو یہ گڑھوں میں جمع ہو جائینگی اور جب پانی آئیگا تو پھیل کر پھر اپنا مفید کام شروع کر دینگی۔ اسطرح بغیر کسی زائد خرچ کے یہ مشکل بھی آسان ہو سکتی ہے۔

باؤلیوں کیلئے ایسی دوسری قسم کی مچھلیاں فراہم کیجا سکتی ہیں جو آسانی کے ساتھ اپنی افزائش کر سکیں۔ یہ اسی وقت زیادہ تعداد میں مہیا ہو سکینگی جبکہ اضلاع میں "فش فارم" تیار ہوں اور کافی تعداد میں انکی افزائش کرکے بچے تقسیم کرنے کیلئے جمع ہو سکیں۔ مرل عام طور پر باؤلیوں میں افزائش نہیں کرتی اور اس کا زیادہ دن تک زندہ رکھنا بھی مشکل ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ مرل جب باؤلیوں میں چھوڑی جاتی ہے تو تھوڑے عرصہ کے بعد اس کا سر بڑا اور جسم پتلا ہونے لگتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو غذا کافی نہیں ملتی۔ رفتہ رفتہ یہ مرجاتی اور باؤلیاں خالی ہو جاتی ہیں۔ اسکی غذا مینڈک، مینڈک کے بچے اور چھوٹی مچھلیوں پر مشتمل ہے جنکی فراہمی ہر وقت ممکن نہیں۔ باؤلیوں کے لئے ایسی مچھلیوں کا انتخاب ہونا چاہیئے جنکی غذا آسانی کے ساتھ فراہم ہو سکے اور یہ اپنی افزائش بھی کر سکیں ایسی ایک مچھلی ایٹروپلس ہے جسکو بیتیل کس بھی کہتے ہیں یہ نباتات خوار ہے اور تیل کی کھلی پر بھی پالی جا سکتی ہے۔ اسمیں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ نمکین پانی میں بھی رہ سکتی ہے جہاں دوسری مچھلیاں آسانی کے ساتھ نہیں رکھی جا سکتیں مچھلیوں کی کھاد بھی بنائی جا سکتی ہے لیکن یہ اسوقت ہی ممکن ہے جبکہ کافی مقدار میں چھوٹی مچھلیاں مل سکیں۔ یہ کھاد پھل کے درختوں کیلئے نہایت کارآمد ہے۔ زائد مچھلی کو آسانی کے ساتھ سکھا کر بعد میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

غرض مچھلیوں کی پرورش کسان کے لئے نہ صرف اچھی غذا ہی فراہم کر سکتی ہے بلکہ آمدنی کا ذریعہ بن سکتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایسی بیماریاں مثلاً ملیریا اور نارو کا بھی انسداد کر سکتی ہے جو گاؤں والوں اور حکومت کے لئے ایک اہم مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔

تنقید و تبصرہ

ہماری ریلیں اور سڑکیں

مصنفہ ڈاکٹر جعفر حسن صاحب۔ ریڈر شعبۂ عمرانیات جامعۂ عثمانیہ۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۴۱ء۔ حجم ۱۲۸ صفحات۔ قیمت عہ۔ لکھائی چھپائی بہترین۔

اٹھارویں صدی عیسوی انجنیری اور سائنٹفک ذہانت کے لحاظ سے امتیازی شان رکھتی ہے۔ اس دور میں ہمیں اکثر موجد ایسے ملتے ہیں جن کی ابتدا معمولی کاریگر سے ہوئی لیکن آگے چل کر مختلف کلوں کی ایجاد کا باعث بنے۔ بھاپ کی قوت کے اثرات انقلابی ثابت ہوئے۔ آب و ہوا، موسمی تبدیلیاں اور دوسرے جغرافیائی حالات سے متاثر ہوئے بغیر اس کے ذریعہ مختلف کام لینے کا امکان پیدا ہوگیا۔ کارخانوں کو چلانے اور تجارتی اشیاء کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچانے کے لئے اس کا استعمال ضروری ہوگیا۔ اس کے ذریعہ نقل و حمل میں بھی ترقی حاصل ہوئی۔ نوآبادیات سے خام پیداوار فراہم کرنے میں سہولت ہوگئی اور یوروپی مصنوعات کی کھپت ان نوآبادیات میں خوب ہونے لگی بہرحال سیاست اور معشیت پر بھاپ کی قوت کی حکمرانی انیسویں صدی عیسوی کے ختم تک ظاہر ہوگئی تھی۔

ان حالات کے تحت ہندوستان میں بھی ریل جاری کرنے کا خیال سب سے پہلے منچسٹر کے انگریز تاجروں کو ہوا چنانچہ انہوں نے بعض انجنیروں اور کاروباری واقفیت رکھنے والوں کو اس غرض سے ہندوستان روانہ کیا کہ وہ اندرون ملک ریلوں کی تعمیر اس کی افادیت اور کاروباری نقطۂ نظر سے اپنی رائے پیش کریں۔ چند سال بعد ہندوستان میں ریلوں اور اس کے ساتھ جدید سڑکوں کی تعمیر سے عمرانی اور معاشی تغیرات رونما ہونے لگے۔ چنانچہ زیر تبصرہ کتاب میں ان ہی تغیرات و حالات سے بحث کی گئی ہے۔

حیدرآباد میں تعلیم یافتہ اشخاص کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوگیا ہے لیکن ابھی تک ہمارے مصنف اور انشاپرداز ادب لطیف افسانوں یا شعر شاعری پر قلم اٹھاتے ہیں اور زندگی کے اہم اور روزمرہ کے مسائل پر

بہت کم روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ڈاکٹر جعفر حسن صاحب نے ہندوستان کے ذرائع نقل پذیری پر تبصرہ کر کے بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا اور راستہ بتایا ہے اس سے معاشیات اور عمرانیات میں ایک نیا اور ترقی پذیر ارادہ پیدا ہوسکیگا۔

اس کتاب میں سب سے پہلے باب میں سڑکوں کی تاریخی سرگزشت اور تدریجی ترقی بیان کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں وہ پیدل آتا جاتا اور سامان اپنے سر پر اٹھا کر لاتا لیجاتا تھا۔ اسکے بعد باربرداری کیلئے جانوروں کو استعمال کرنا شروع کیا پھر ٹھیلے بنے اور ٹھیلوں کے بعد چھکڑے۔ جیسے جیسے چھکڑوں کا رواج بڑھتا گیا راستے کشادہ ہوئے۔ تہذیب و تمدن میں انسان نے ترقی کی۔ بڑی بڑی ریاستیں وجود میں آئیں اور ان ریاستوں نے یا تو اپنے نظم و نسق کی سہولت کیلئے یا خدمت خلق کے جذبہ کے تحت سڑکیں بنائیں۔ اس کتاب میں مہاراجہ اشوک کے زمانہ سے سڑکوں کی تعمیر کی تاریخی سرگذشت اجمالی طور سے بیان کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ابن بطوطہ اور البیرونی وغیرہ سیاحوں نے ہندوستان کی سڑکوں اور راستوں کے جو حالات قلمبند کئے ہیں اسکی کچھ تفصیل بیان کی جاتی تو کتاب کی خوبی میں مزید اضافہ ہو جاتا نیز تلاش سے تاریخ کی فارسی کتابوں سے بھی بہت کچھ مواد ملتا۔ اول تو تاریخ کا قدیم سلسلہ بیان کرنا ہی نہیں تھا لیکن جب اس پر قلم اٹھایا گیا تو انصاف کا حق ادا کرنا تھا۔

دوسرے باب میں ہندوستان کی "آب راہیں" پر بحث کیگئی ہے۔ علمی کتابوں میں جذبات کا اظہار نامناسب ہے معاشیات کی کتابوں میں حالات، واقعات اور اعداد و شمار اس ترتیب و اسلوب سے بیان کر دینا کافی ہے کہ جس سے پڑھنے والا خود بخود گذشتہ زمانہ کی یاد تازہ کرلے، عبرت حاصل کرے یا جوش عمل پیدا کرے۔ حالات اور واقعات اور اعداد و شمار سے بڑھکر صرف الفاظ سے جوش عمل پیدا کرنا ہو تو مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ ہندوستان میں صنعت جہاز سازی جس ترقی پذیر حالت میں تھی اس کے حالات مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" سے بھی معلوم ہوسکتے ہیں اور دوسرے ماخذ بھی ہیں۔ سیٹھ دال چند ہیراچند کی توجہ سے قدیم جہازرانی اور جہاز سازی کا جو مواد مہیا ہوگیا ہے اس سے استفادہ کرنا ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو اس موضوع پر قلم اٹھائے۔ قابل مصنف نے ان امور کو یہ کہکر بالکل ہی نظر انداز فرمادیا ہے کہ عام کتابوں میں ہماری قدیم جہازرانی اور جہاز سازی کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔ سیٹھ دال چند نے اپنی تقریر میں جو وائزیگ پٹم میں جہاز سازی کے کارخانہ کے افتتاح کے موقع پر کی تھی۔ یہ کہا تھا کہ انگلستانی بحریہ تک کیلئے جہاز ہندوستان میں

ہندوستانی کاریگر تیار کرتے تھے پھر یہ زوال کا زمانہ تھا۔ عروج کے وقت کیا حالت ہو گی۔ ڈاکٹر صاحب تلاش اور جستجو فرماتے تو کیا یہ باب اور پہلا باب یوں تشنہ اور جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہو کر نہ رہ جاتے نیز بالخصوص دوسرے باب میں بلا حوالہ دیئے جو قیاسات قائم کرلئے ہیں وہ بہت کچھ تحقیق کے محتاج ہیں۔ اسی باب میں ہندوستان میں پانی کے راستوں کی موجودہ حالت بیان کی گئی ہے اور اُمیدیں وابستہ کی گئی ہیں کہ ہندوستان میں صنعت جہازرانی کو ترقی ہو گی۔ دردمندوں میں قوت عمل پیدا ہو گی اور ہندوستان کی جدید اصلاح و تجدید میں اس صنعت کو اس کی اہمیت کے شایان شان جگہ دینے کی کوشش عمل میں آئے گی۔

کتاب کے ابتدائی ابواب میں مولانا حالی اور شاعر اسمٰعیل کے اشعار سے بھی اس کتاب کو زینت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب موصوف ہمیشہ نصیحت کیا کرتے ہیں کہ معاشیات یا عمرانیات سائنٹفک علوم ہیں ان میں شعر و شاعری نہ ہونا چاہیئے اور علمی شان تو یہی ہے کہ مبالغہ آمیز باتوں سے گریز کیا جائے اور حقیقت حال بلا کم و کاست لکھ دی جائے۔

زیر نظر کتاب کے تیسرے باب میں ریل کی ایجاد رواج اور ترقی پر بحث کی گئی ہے اور اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یورپ اور امریکہ میں ریلوں کے جاری کرنے میں کن کن دقتوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔

چوتھے باب میں ہندوستان میں ریلوں کی سرگذشت اور موجودہ حالت و کیفیت ۱۹۳۸-۳۹ء تک تحریر کیگئی ہے لیکن ساری بحث سرسری ہے اور ایک بات سے دوسری بات اسطرح پیدا کیگئی ہے کہ بیان میں تسلسل قائم نہیں رکھا جا سکا ہے۔

پانچویں باب میں ہمارے ہوائی راستوں پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن یہ باب بہت ہی مختصر اور زیادہ تر ہوائی جہاز کی ایجاد کی تاریخ اور دوسرے ملکوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس باب کے آخر میں حسرت کے ساتھ یہ صحیح کہا گیا ہے کہ "جس طرح چھکڑے اور بہلیاں ہماری ہیں اس طرح نہ تو طیارے ہمارے ہیں نہ ریلیں ہماری ہیں ملک اور نام ہمارا ہے کام اور فائدہ غیروں کا ہے"!!

چھٹے باب میں جدید ذرائع حمل و نقل کی اہمیت کے ساتھ ساتھ سیاسی استحکام و سیاسی تنظیم قومیت، بین قومیت اور بین صوبہ واریت پر عمرانیاتی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔

ساتویں باب میں جدید ذرائع نقل پذیری پر معاشی نقطۂ نظر سے غور کیا گیا ہے اور امور ذیل پر

روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۱) قومی اور بین الاقوامی تجارت کا فروغ (۲) خود اکتفائی کا خاتمہ (۳) صنعتی ملکوں کا فرق (۴) گھریلو صنعتوں کی تباہی (۵) کاشت اور دولت پیدا کرنے کے مقصد میں تغیر (۶) مسئلہ آبادی کی نوعیت میں تغیر (۷) قحط کی نوعیت میں تغیر۔ یہی اہم اور اساسی معاشی امور ہیں ان پر تبصرہ گو مختصر ہے مگر مفید ہے۔

آخری باب میں ریلوں کا تاریک پہلو دکھلایا گیا ہے کہ ہندوستان کیلئے ریلیں سراپا نعمت نہیں ہیں ان سے نقصانات بھی ہوئے ہیں مثلاً صنعتوں کی تباہی، قحطوں کی وسعت، گرانی اور دوامی نیم فاقہ کشی وغیرہ۔ بہرحال ریلیں ہندوستان کے لئے فائدوں اور مصیبتوں کا سرچشمہ ثابت ہوئیں۔

کتاب کے آخر میں شماریات نقل پذیری یعنی آمدورفت اور نقل وحمل کے بارے میں بعض دلچسپ اور سبق آموز اعداد وشمار دیئے گئے ہیں۔ ضمیمے میں سن وار جدید ذرائع نقل پذیری کی تاریخی سرگذشت (۱۸۰۷ء سے ۱۹۴۲ء) دلچسپ ہے۔

"ہماری ریلیں اور سڑکیں" ایک بڑا موضوع ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب معاشیات سے دلچسپی رکھنے والے اردو داں طبقہ کو مطمئن کرنے کے بجائے اور تشنہ بیں کر دیتی ہے۔ کتاب میں مملکت آصفیہ کی ریلوں اور سڑکوں کے متعلق صرف چند اشارے کئے گئے ہیں۔ حالانکہ اس کی شدید ضرورت ہے کہ ہمارے مفکر اور ادیب اپنے ملک کی معاشیات پر قلم اٹھائیں۔ پھر جب کہ کتاب کی نکاسی ابھی مملکت آصفیہ میں سرکاری سررشتوں کی سرپرستی سے ہوگی اور نیز جبکہ جامعہ عثمانیہ کے بجٹ سے سالانہ پچاس ہزار روپے سے انجمن ترقی اردو کی امداد ہوتی ہے۔۔ زیر نظر کتاب میں حیدرآباد سے متعلق صرف حسب ذیل حوالے ہیں۔

(۱) گوداوری اور کرشنا جنوب کی ندیاں جہازرانی کیلئے بالکل ناموزوں ہیں۔

(۲) نظام اسٹیٹ ریلوے کا انتظام ریاست حیدرآباد کے تحت ہے۔

(۳) ۱۹۳۵ء میں بمبئی سے حیدرآباد، حیدرآباد سے مدراس آنے جانے کیلئے ہوائی جہاز کا باقاعدہ انتظام ہوگیا۔

(۴) ریاست حیدرآباد کے علاقہ مرہٹواڑی میں روئی کی کاشت بھی بہت بڑھے گی۔

(۵) ہندوستان میں بالعموم اور حیدرآباد میں بالخصوص ترکی ٹوپی کا استعمال مسلمان بڑے شوق سے

کرتے ہیں۔ اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ ٹوپیاں ترکی میں بنتی ہیں اور ترکی ٹوپی خریدنے سے وہ بالواسطہ ترکی کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

(۶) ریاست حیدرآباد ۸۲۶۹۸ مربع میل ہے جس میں ۱۳۶۰ میل کی ریلیں اور آٹھ ہزار میل کی سڑکیں ہیں۔

(۷) حیدرآباد میں پچاس میل کی جدید وضع کی بے گردی سڑکیں موجود ہیں۔

توقع ہے کہ دوسرے اڈیشن میں ممالک آصفیہ کی ریلوں اور سڑکوں کے باب کا ضرور اضافہ کردیا جائیگا قابل مصنف نے اپنے مطالب کو واضح کرنے میں بہت کوشش کی ہے اور علمی اصطلاحات سے گریز کرکے مطالب عام فہم دلچسپ اور سبق آموز بنانے کی بھی کوشش کی ہے اگرچہ کہ بعض جگہ الفاظ غیر مانوس آگئے ہیں مثلاً منجھلی سڑک، آب راہیں، ہندیاناد وغیرہ یا بعض الفاظ دوسرے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں مثلاً پیروکار۔ اپنے سیاق کے لحاظ سے صرف 'پیرو' کافی تھا۔ بعض جگہ اردو کے بجائے انگریزی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں مثلاً دریائے سندھ کے بجائے انڈس اور صوبہ متحدہ کے بجائے یو۔ پی جو تھوڑی محنت سے دور کئے جاسکتے تھے۔

مجموعی لحاظ سے کتاب کا مطالعہ نہ صرف مفید بلکہ اردو دان طبقہ کے لئے بہت ضروری ہے اس سے انہیں اس کا بھی اندازہ ہوجائے گا کہ علمی مطالب کے اظہار کی اردو زبان میں کسقدر گنجائش موجود ہے۔

چند اور امور کی وضاحت بھی نامناسب نہیں۔

(۱) الفاظ اور اشیاء کے نام ایسے استعمال ہونے چاہئیں جو کل ہندوستان میں بولے اور سمجھے جاتے ہوں یا اگر کسی خاص صوبہ کے الفاظ استعمال ہوں تو اس کے ساتھ دوسرے صوبہ میں استعمال ہونے والے الفاظ بھی لکھ دیئے جائیں مثلاً جہاں ٹھیلے بہلیاں اور چھکڑے کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہاں ٹانگہ، جھٹکہ، شکرام، لکھاچر وغیرہ الفاظ کا استعمال بھی ضروری تھا۔

(۲) متن کتاب میں حوالے اسقدر کم ہیں کہ اس سے اس شخص کی رہبری نہیں ہوسکتی جو کسی خاص پہلو پر مزید مطالعہ کرنا چاہے

(۳) کتاب کے آخر میں حوالے کے لئے جن کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اس پر صرف "ریلوے اور ب" کا اطلاق ہوتا ہے خود سڑکوں کے متعلق بھی سوا ایک آدھ کتاب کے کسی اور کتاب کا حوالہ نہیں ہے نیز آب راہوں، جہاز سازی، ہوائی راستوں، تار برقی اور لاسلکی پر بھی کسی کتاب کا حوالہ نہیں ہے۔ متن کتاب میں حاشیہ پر دو ایک کتابوں کا جو حوالہ ہے اس کو آخر میں بھی دہرا دیا جاتا تو مناسب ہوتا۔ فقط

ش ،

تجویزیں اور مشورے

زرعی انجمن کے قیام کی تجاویز

"معاشی کمیٹی انجمن طیلسانیین عثمانیہ کی ایک ذیلی کمیٹی کا قیام اس غرض سے عمل میں لایا گیا ہے کہ معاشی کمیٹی کے تحت ایک ایسی زرعی انجمن کے قیام کے امکانات معلوم کئے جائیں جو ملک کے تعلیم یافتہ حضرات کی عملی زرعی جد و جہد کا مرکز بن سکے۔ اس سلسلہ میں ملک کے بعض ارباب فکر کی جو آراء حاصل ہوئی ہیں ان میں بعض آراء کی اشاعت اس غرض سے کی جارہی ہے کہ دوسرے اہل ملک سے مزید تجاویز حاصل ہوں چنانچہ مولوی سید یوسف علی صاحب معتمد محکمۂ تجارت و حرفت اور مولوی عبدالعزیز صاحب مہتمم عبدالرزاق کمپنی کے مکتوب شائع کئے جاتے ہیں"

۱۔ مولوی سید یوسف علی صاحب کا مکتوب :-

"یہ کہنے میں کسی کو کچھ بھی تامل نہیں ہوسکتا کہ پڑھے لکھے لوگوں کی ایک ایسی انجمن کے قیام کی ضرورت ناگزیر ہے جو زراعت کی طرف عملی توجہ کے ذریعہ ملک کے نوجوانوں کے سامنے ایک اچھا نمونہ پیش کرسکے۔ اور میں ایسی انجمن میں شریک ہونے ہر وقت تیار ہوں۔

اس سے مجھے پورا اتفاق ہے کہ ابتداء چھوٹے پیمانہ پر اور حیدرآباد کے آس پاس کے رقبہ میں ہونی چاہیئے۔ اور دوسرا قدم اس وقت اٹھانا چاہیئے جب کہ پہلے تجربہ میں خاصی کامیابی کا یقین حاصل ہوجائے۔ اس کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ انجمن چند نوجوانوں کے لئے حمایت ساگر کے زرعی فارم پر یا کسی اور جگہ عملی تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچائے۔ حمایت ساگر کے زرعی فارم پر غالباً ہر سال کاشتکاروں کے لڑکوں کو زراعت کے ترقی یافتہ طریقوں سے اور نئی ایجادات کے استعمال سے واقف کرایا جاتا ہے۔ سرکاری طور پر انجمن اپنے لوگوں کے لئے بھی شاید بغیر کسی دشواری کے انتظام کرسکیگی۔

کسی اور جگہ سے میرا منشاء۔ مثال کے طور پر۔ نظام آباد اور اورنگ آباد جیسے مقامات ہیں

نظام آباد میں نیشکر کی کاشت کے سوائے دوسرے اجناس کی کاشت بھی ایک جماعت کر رہی ہے۔ جس کے کاروبار کی نگرانی نواب نور اللہ صاحب والا جاہی فرمارہے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ انجمن اپنے کچھ منتخب نوجوانوں کو ان کے پاس چند دن کام کرنے کے لئے بھیج سکے۔ اورنگ آباد اور دوسرے مرہٹواڑی کے علاقوں میں اچھے میوؤں اور ترکاریوں کی کاشت بعض جگہ بڑے پیمانوں پر ہو رہی ہے۔ پچھلے محرم کی چھٹیوں میں مجھے خلد آباد سے کوئی تین میل پر "قلندر آباد" موضع میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں ایک شریف خاندان کے دو نوجوانوں نے سنترے اور موسمبی کے باغ لگائے ہیں اور چند ہی سال میں اتنی ترقی کی ہے کہ اسکو مثال کے طور پر ہر تعلیم یافتہ نوجوان کے سامنے جو ملازمت کی مصیبت کی تلاش میں سرگردان رہتا ہو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس باغ سے اس سال کوئی سولہ ہزار کے منافع کی اُمید کی جارہی ہے۔ ان نوجوانوں نے نہ صرف ذاتی محنت اور توجہ سے خاصا فائدہ کمانے کے امکانات کی ایک قابل رشک مثال ملک کے سامنے پیش کی ہے۔ بلکہ انہوں نے اپنے موضع کو مرکز قرار دیکر آس پاس کے مواضع میں دیہات سدھار اور بالغوں کی تعلیم کی بھی اچھی کوشش کی ہے۔ میں نے ان سے اس مسئلہ پر گفتگو کی کہ آیا وہ اور بھی لوگوں کو اگر وہ ان کے پاس بھیجے جائیں تو اپنے کام کی عملی تفصیلات سے واقف کراسکیں گے یا کیا۔ انہوں نے بڑی خوشی سے اس پر آمادگی ظاہر کی۔ مگر ان کا خیال یہ تھا کہ ہر موسم کے کاروبار کی جزئیات سے واقف ہونے کی غرض سے یہ بہت مناسب ہوگا کہ تعلیم ایکسال کی رکھی جائے۔ دوسری تفصیلات کے عرض کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ جو کچھ میں واضح کرنا چاہتا ہوں وہ صرف اس قدر ہے کہ انجمن کے تمام کام کرنے والے پڑھے لکھے ملک کے نوجوان ہوں اور ان کے لئے عملی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع بہم پہونچائے جائیں۔

اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہوئے یہ ظاہر کردینا بھی ضروری ہے کہ "زمینات" دور دراز یا متعدد مقامات پر حاصل کرنے سے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ایک ہی جگہ ایک بڑا رقبہ پہلے حاصل کیا جائے اس سے صرفہ کی کفایت اور نگرانی میں سہولت ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر "زمینات" دور ہوں یا وہ منتشر مقامات پر ہوں یا چھوٹے چھوٹے رقبہ کی ہوں تو دلچسپی کے سوا کامیابی کے امکانات بھی بہت کم ہوجائینگے۔ باقی باتوں پر اگر کوئی کمیٹی طلب کی جائے تو بات چیت ہوسکتی ہے۔ لیکن شاید یہاں اس بات کی طرف اشارہ کردینا مناسب

نہ ہوگا۔ کہ اگر انجمن " زینات " حاصل کرنے کی غرض سے ہمارے ملک کے روشن خیال بڑے جاگیرداصاحبوں کی طرف رجوع کرے تو اسکو یقیناً مناسب مراعاتیں مل سکیں گی۔ مثال کے طور پر اگر پائیگاھوں اور سمستانوں کے علاقوں سے۔ نواب سالار جنگ بہادر سے یا نواب کمال یار جنگ بہادر۔ نواب دوست محمد خاں بہادر یا راجہ ترمبک راج صاحب جیسے حضرات سے معاملہ کو رجوع کیا جائے تو اس ضمن میں پوری ہمدردی اور امکانی مراعتوں کے حصول کی امید کی جاسکتی ہے۔

میں اس جواب میں تھوڑی سی تفصیل سے اسوجہ سے کام لے رہا ہوں کہ خدمات عامہ کے تعلق سے حیدرآباد کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بیروزگاری کے مسئلہ پر غور کرنے کا مجھے تھوڑا بہت موقع ملا ہے۔ اور اسی سلسلہ میں میں نے اس لٹریچر کا بھی مطالعہ کیا ہے جو اسبارے میں برطانوی ہند کے صوبوں سے مجھے مل سکا صوبۂ متحدہ میں سپرو کمیٹی نے تعلیم یافتہ بیروزگاری کے مسائل اور ان کے حل کرنے کے طریقوں پر کافی روشنی ڈالی ہے مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس صوبہ میں یا برطانوی ہند کے کسی اور صوبہ میں مسئلہ کے مختلف اور پیچیدہ پہلوؤں کا کوئی ایسا عملی حل پیش نہیں کیا گیا ہے جو پوری طرح مستقبل سے متعلق اطمینان دلا سکے۔ حیدرآباد اسبارے میں زیادہ تر نفسیاتی وجوہات مثلاً چھوٹی خدمات پسندی غلط روایتوں اور گمراہ کن تصور حیات کی وجہ مستقبل کے اندیشوں سے خالی نظر نہیں آتا۔

آبادی بڑھ رہی ہے۔ خدمات عامہ میں بھرتی کے امکانات کم ہو رہے ہیں اور جنگ کی وجہ سے جو معاشی مسائل پیدا ہو رہے ہیں یا جنگ کے بعد جنکا سامنا ہوگا وہ اتنے مہیب ہیں کہ ان پر فوری توجہ وقت کی سب سے زیادہ شدید ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جنگ نے ایک حد تک روزگار کے فراہم کرنے میں مدد دی ہے۔ لیکن اس کے ختم ہونے پر ردعمل بہت برا ہوگا۔ اسکے سوا بعض صنعتوں میں یا پیداوار کے کارخانوں میں ملک کے نوجوانوں کی جو کھپت اس وقت ہو سکتی ہے۔ اسکی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ایک مستقل صورت اختیار کرے گی۔ اسکی ایک بڑی وجہ جو ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ آئندہ حکومتوں کی صنعتی معاشی یا (FISCAL) پالیسی کیا ہوگی اور اس کا اثر ہندوستان پر اور ہندوستان کا ایک حصہ ہونے کی وجہ سے حیدرآباد پر کیا پڑیگا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ رہی تجارتی کمپنیاں یا بڑے پیمانہ پر بیوپار کی انفرادی کوششیں

ان کے بارے میں بھی موجودہ حالات میں کامیابی کی کوئی صحیح پیش قیاسی کرنا آسان نہیں ہے۔ اس وجہ سے کہ جنگ کے بعد کی دنیا کیسی ہوگی۔ کرنسی۔ تبادلہ۔ حمل و نقل کے ذرائع کی کیا صورتیں ہوں گی۔ اور دنیا کے مختلف حصوں کے درمیان سیاسی تعلقات جن پر ایک حد تک تجارت کا دار و مدار ہوتا ہے، کیسے ہوں گے۔ یہ کہنا بھی دشوار ہے۔ ان حالات میں جو چیز لے دے کر بھروسہ کے قابل ہو سکتی ہے وہ زراعت اور صرف زراعت ہے جو ممالک جنگ میں شریک ہیں یا بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سے متاثر ہیں وہ سب یہ رجحان رکھتے ہیں کہ آنیوالی دنیا میں ہر سیاسی اکائی کو کھانے پینے کی ضرورتوں کی حد تک خود مکتفی ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ بعض صورتوں میں ایسی کوشش پیداوار کے فطری ذرائع کو ملحوظ رکھتے ہوئے شاید ہر جگہ آسان نہ ہوگی۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی جائے تو تب بھی حیدرآباد کو زرعی ترقی کی کوششوں میں پست ہمت ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی اور خصوصاً جبکہ آپکی کمیٹی معاشی نقطۂ نظر سے ملک کی ایک ایسی پیمایش کرسکے جو مختلف اجناس۔ ملک کی ضرورتوں اور ان اجناس کی پیدایش کے رقبوں اور انکے امکانات پر مشتمل ہو۔ اور اس ضمن میں ممالک محروسہ کے ان رقبوں کی دریافت کی جائے جو (CULTIVABLE WAST LANDS) کہلائی جاسکتی ہیں۔

"زمینات" کے حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انجمن کو یہ چاہیئے کہ وہ دوسرے متعلقہ کاروبار کیلئے بھی مختلف شاخیں قائم کرے۔ مثال کے طور پر ایک ایسی انجمن جو کھاد۔ زراعتی آلات۔ تخم اور مویشی وغیرہ کی بڑے پیمانہ اور سستی قیمتوں پر سپلائی کرسکے۔ دوسری ایک ایسی انجمن جو اتحادی اصول پر پیداوار کو خریدتی اور فائدہ کے ساتھ اسکی نکاسی یا فروخت کا انتظام کرسکے۔ تیسری ایک ایسی انجمن جو خالص بنک کاری کے فرائض انجام دے۔

یہ چند باتیں ہیں مختصر طور پر اس وجہ سے لکھ رہا ہوں کہ آپ کی انجمن ان پر ابھی سے غور و فکر کرنا شروع کردے۔ معاشی کمیٹی کو اور طیلسانیین کی انجمن کو ملکی مصنوعات کی نمایش میں جو کامیابی ہوئی ہے اس سے یہ امید ضرور ہوسکتی ہے کہ اس کام کو بھی جسکے پیچھے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ہمتیں کام کرنے کیلئے آمادہ معلوم ہوتی ہیں کامیابی کے ساتھ چلایا جاسکے گا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ نمایش سے کہیں زیادہ یہ کام مشکل ہے اور اس کے فوائد بھی نسبتاً دور رس ہیں۔ مجھے اس کا یقین ہے کہ حکومت کے محکموں نے جس طرح نمایش کے

کاروبار میں تعاون فرمایا ہے۔ اسی طرح وہ اس انجمن کے کاروبار میں ضرور ہاتھ بٹائینگے۔ میری ساری اچھی تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

۲۔ مولوی عبدالعزیز صاحب کا مکتوب۔

حیدرآباد کے قرب وجوار میں امداد باہمی کے اصول پر کاشتکاری کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن بجائے جنس غلہ کے کمپنی ہذا کی رائے میں اولاً ترکاریوں کی کاشت اور مقامی موجودہ باغات کی طرف توجہ ہونی چاہیئے کہ حیدرآباد وسکندرآباد کی وسیع آبادی کے لحاظ سے یہ اسکیم اس قسم کی کاشت کے لئے زیادہ موزوں اور امید افزا ہے۔ فوائد اور تاثرات کے لحاظ سے میوہ جات کے بعد ترکاریوں کا دوسرا درجہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اور ترکاریوں کا استعمال بقاء صحت کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے اعلیٰ نظام اور نئے طریقوں سے کاشت کی ہوئی ترکاریاں اگر کافی مقدار میں ملنے لگیں تو اچھے قسم کی ترکاریاں بھی سستے دام سے بہم دست ہوسکینگی۔ علاوہ ازیں یہ اسکیم صحت عامہ اور مالیہ کے لحاظ سے بھی سودمند متصور ہوسکتا ہے۔

ف۔ اگر میوہ جات کے درخت لگائے جائیں تو اس کے نتائج بہت عرصہ کے بعد برآمد ہوتے ہیں۔ بلدۂ حیدرآباد اور اس کے نواح میں بکثرت باغات موجود ہیں جو بے توجہی کی وجہ برباد ہو رہے ہیں۔ ان باغات میں ایسے درخت اب بھی موجود ہیں جنکی پرورش بڑی محنت اور مصارف سے ہوئی ہے۔ انہی درختوں کی جدید اصول پر دیکھ بھال کی جائے اور ساتھ ہی میوؤں کے تئے درختوں کے بوسے جانے کا انتظام کیا جائے تو بہت تھوڑے دنوں میں بہترین ملکی میوہ جات مل سکینگے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ان باغات کو کسی نہ کسی طریقہ پر حاصل کرلیا جائے۔

ف۔ ترکاریوں کی کاشت اچھے اور نفع بخش طریقہ سے ہونی چاہیئے جو ترکاریاں اس وقت بازار میں ملتی ہیں ان میں خصوصاً پھلوں۔ گڈوں اور پھلیوں کے قسم کی ترکاریوں کی شکل جسامت رنگ اور خوشنمائی میں یکسانیت نہیں ہوتی ہے۔ اگر جدید اصول کے بموجب اعلیٰ پیمانہ اور خوش نظمی کے ساتھ اسکی کاشت کا انتظام کیا جائے تو اس سے وہ سب مقاصد حاصل ہوسکتے ہیں۔ جن کی اس اسکیم سے توقع کی جاسکتی ہے۔

اس اسکیم کی کامیابی موسمی موافقت۔ کم از کم مصارف اور زیادہ سے زیادہ کاشت اور خوش انتظامی پر منحصر ہے لیکن باوجود اسکے عملی قدم ضرور اٹھانا چاہیئے۔ کام مستقل اور نفع بخش ہو اور اس سے ملک کے کاشتکاروں کی رہنمائی ہوسکے۔

تنظیم دیہی کے مسائل پر تحقیقات اور سروے کی ایک اسکیم

معاشی کمیٹی کی مجلس عاملہ نے تنظیم دیہی کے مسائل پر تحقیقات اور سروے کی ایک اسکیم مرتب کرکے سرکار عالی کی خدمت میں پیش کی ہے یہ اسکیم مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی اے (عثمانیہ) معتمد معاشی کمیٹی کے ایما پر ذیل میں شائع کی جاتی ہے:۔

ممالک محروسہ سرکار عالی میں ایک بڑے پیمانہ پر تنظیم دیہی کے کام کی انجام دہی کے لئے سرکار عالی خاص شغف سے سعی فرما رہی ہے۔ اس غرض کے لئے ایک جداگانہ معتمدی کے ساتھ ایک مجلس تنظیم دیہی کا قیام عمل میں آیا ہے جو گذشتہ دو تین سال سے بہت مفید کام انجام دے رہی ہے۔ سال حال کے موازنہ میں مبلغ تین لاکھ روپیہ کی ایک رقم تنظیم دیہی کے سرمایہ کے آغاز کے لئے رکھی گئی ہے جو توقع ہے کہ اس کام کے لئے بنیاد کا کام دے گی اور آیندہ اس مسئلہ کی جانب سرکار عالی اور پبلک دونوں کی روز افزوں توجہ کا باعث ہوگی۔ معاشی کمیٹی حیدرآباد نے اس اقدام کا خیر مقدم کیا۔ اور قومی تعمیر کے اس کام میں تعاون کے لئے اپنی آرزو کا اظہار کیا ہے۔ ایک علمی جماعت ہونے کی حیثیت سے معاشی کمیٹی چند مثالی مواضع کے معاشی حالات کا جائزہ (معاشی سروے) اس موضوع پر موجودہ تمام مواد کی فراہمی نیز دیگر تحقیقاتی کاموں کا (جو تنظیم دیہی کی مختلف تدابیر کے عملی طور پر اختیار کرنے میں مفید ہوں) انتظام کرکے دیہی تنظیم کے لئے ایک واضح اور نہایت منظم و مرتب اسکیم کی ترتیب میں حکومت کی مدد کر سکتی ہے۔ اس غرض کے لئے ذیل میں بالاختصار ایک اسکیم کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ معاشی سروے: کمیٹی چند مثالی مواضع مثلاً چھ مواضع کے (جن میں سے دو تلنگانہ کے دو مرہٹواڑی کے ایک کرناٹک کا اور ایک جاگیری یا سمستان کے علاقہ کا ہو) معاشی حالات کے جائزہ (معاشی سروے) کا انتظام کرے گی۔ ارادہ یہ ہے کہ معاشیات کے ایسے مابعد طیلسانی متعلین کو جو خدمت خلق کا جذبہ رکھتے ہوں اور ان مواضع میں قیام کی طرف راغب ہوں ان مواضع میں کم از کم چھ ماہ کی مدت کے لئے ٹھہرایا جائے اور یہ اصحاب تمام مقامی مسائل مثلاً مواضع کے مختلف طبقہ جات یعنی زمیندار کاشتکار شکمیدار زرعی مزدور ساہوکار

وغیرہ کی معاشی حیثیت فی کس آمدنی اور قرض کی مقدار اخراجات زراعت اور پیداوار آلات کشاورزی کھاد اور مویشی کے متعلق صورت حال اگر کوئی ضمنی صنعتیں موجود ہوں تو ان سے متعلق مسائل صفائی صحت عامہ اور مارکٹنگ کی سہولتوں ذرائع آب اور حمل و نقل کے مقامی مسائل کا مطالعہ کریں۔ یہ متعلمین ایک مرکزی کمیٹی کے زیر ہدایت کام کرینگے جو چھ ماہرین پر مشتمل ہو گی جس کی تفصیلات آئندہ فقرہ میں درج ہیں۔ ان متعلمین کو مبلغ ۷۵ روپیہ یا ایک سو روپیہ ماہانہ کا وظیفہ دینا ہوگا محکمۂ مالگذاری سے استدعا کی جائیگی کہ متعلقہ مواضع کے پٹیل پٹواریوں کے نام احکام جاری کیئے جائیں کہ وہ ضروری مواد کی فراہمی اور مقامی موسمی مسائل کے مطالعہ میں ان متعلمین کی اعانت کریں۔

۲۔ تنظیم دیہی کا کام تقریباً تمام ہندوستان میں سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع سے انجام پا رہا ہے لیکن یہ سب منتشر اور ایک دوسرے سے بے تعلق ہیں۔ یہ چیز بہت کار آمد ہو گی کہ مختلف مراکز میں مختلف ذرائع سے جو کام انجام پایا ہے اس کا مطالعہ کیا جائے اور اسے ایک جگہ جمع کیا جائے۔ یہ معلومات باقاعدہ پلاننگ کے لئے بہت مفید مواد کا کام دینگی اس غرض کے لئے تجویز یہ ہے کہ تین کارکنوں کو جو معاشیات کے متعلم بھی ہوں گے منتخب صوبہ جات مثلاً ایک کو پنجاب اور بنگال اور دوسرے کو مدراس اور میسور روانہ کیا جائے کہ وہ وہاں ترقی دیہات کے اس کام کا مطالعہ کریں جو سرکاری ذرائع سے انجام پایا ہے تیسرے متعلم کو اس کام کے مطالعہ کے لئے روانہ کیا جائے جو غیر سرکاری اداروں مثلاً سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی آل انڈیا ویلیج انڈسٹریز اسوسی ایشن اور ینگ مین کرسچین ایسوسی ایشن وغیرہ نے انجام دیا ہے متعلمین کو خاص ان مراکز پر جہاں کام ہو رہا ہے جا کر تمام معلومات براہ راست جمع کرنا ہوگا۔ ہر متعلم کو تین ماہ کی مدت کے لئے مبلغ (۷۵) روپیہ ایک سو تک کا وظیفہ اور انٹر یا دوسرے درجہ کا جس میں سہولت ہو سفر خرچ دینا ہوگا۔ جن اشخاص کا انتخاب کیا جائے ان میں خدمت خلق کا جذبہ ہونا چاہیئے۔

۳۔ دیہاتی آبادی کے لئے ضمنی صنعتوں کی جو اہمیت ہے اس پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے تاہم گو اس موضوع پر نظری طور پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن بعض منتخب دیہی صنعتوں سے متعلق عملی مواد یعنی اخراجات پیداوار آلات خام اشیاء اور مارکٹنگ کے متعلق مواد جمع کرنے کے لئے اب تک بہت کم کام ہوا ہے۔ آل انڈیا

ویلیج ایسوسی ایشن نے اس سلسلہ میں کچھ کام کیا ہے لیکن یہ بہت محدود نوعیت کا ہے یہ مناسب ہوگا کہ ایسی دو تین صنعتوں کو جو بالقوہ ہمارے مقامی حالات کے اعتبار سے مفید ہوں منتخب کرلیا جائے مثلاً ہاتھ سے سوت کاتنا۔ بافندگی۔ مرغیوں وغیرہ کی پرورش۔ ٹوکری سازی اور بوریا بافی اور ان صنعتوں کے لئے تمام ضروری مواد جمع کیا جائے یہ کام بہت اختصاصی نوعیت کا ہوگا اور تین سے چار تک متعلمین میں سے ایک ایک صنعت ایک ایک کے سپرد کرکے ان سے خواہش کی جاسکتی ہے کہ ان کے متعلقہ معاشی اور فنی مسائل کا مطالعہ کریں۔ اگر وہ اس صنعت کے لئے جو ان کے سپرد کی گئی تھی کوئی مبسوط اسکیم تیار کرسکیں تو پھر سرکار عالی اسے ترقی دینے اور اپنے سررشتہ جات انتظامی کے توسط سے دیہاتی آبادی میں اس کی اشاعت کے لئے سعی فرماسکتے ہیں۔ اس کام کے لئے جن متعلمین کا انتخاب عمل میں آئے انہیں تین چار ماہ تک تقریباً ایک سو روپیہ ماہانہ کا وظیفہ اور ضروری تجربات کی غرض سے خام اشیاء اور آلات وغیرہ پر خرچ کے لئے ضروری رقم دینی ہوگی۔

۴۔ مجوزہ صدر نہج پر کام کی رہنمائی کے لئے ایک مرکزی کمیٹی رکھنا ضروری ہوگا یہ کمیٹی معاشی کمیٹی میں سے تین چار اراکین اور چند ماہرین مثلاً معاشیات کے دو تین پروفیسر اور سررشتہ ہائے سرکار عالی مثلاً زراعت مارکٹنگ، امداد باہمی اور صنعت و حرفت وغیرہ کے دو تین عہدہ داروں پر مشتمل ہوگی یہ ضروری ہوگا کہ دو ہمہ وقتی متعلمین کی خدمات حاصل کی جائیں جو مختلف مراکز سے وصول شدہ رپورٹوں کا مطالعہ کرکے اس کا تجزیہ اور نوعیت واری تقسیم کریں اور اُسے ربط دے کر ترتیب کا کام انجام دیں تاکہ مرکزی کمیٹی پیشگاہ سرکار میں پیش کرنے کی غرض سے ایک مبسوط رپورٹ مرتب کرسکے۔ کمیٹی کو ایک ہمہ وقتی ٹائپسٹ اہلکار ایک چپراسی اور صادر متفرق کے لئے ایک قلیل رقم کی ضرورت ہوگی۔

۵۔ معاشی کمیٹی کے سامنے انجمن امداد باہمی تنظیم دیہی کے آغاز کرنے کی بھی ایک اسکیم ہے جس کا ایک خاکہ منسلک ہے۔ یہ انجمن ایک نوع کا تجربہ بہم پہنچانے میں معاون ثابت ہوگی جس سے مرکزی کمیٹی مفید معلومات جمع کرنے کے قابل ہوسکے گی۔ کام کے آغاز کرنے کے لئے انجمن کو مبلغ (ا ضافہ ۱۵) روپیہ سے (ا۰۰۰،۲) روپیہ تک کی ایک چھوٹی سی رقم کا عطیہ دیا جانا ہوگا۔ مدعا یہ ہے کہ آخر کار انجمن کو بالکل خود مکتفی بنا دیا جائے۔

۶۔ معاشی کمیٹی کو مسائل تنظیم دیہی سے متعلق تمام ممکن الحصول کتابیں جمع کرنا اور اس موضوع پر جہاں تک

ممکن ہو مکمل ترین کتب خانہ رکھنا پڑیگا تاکہ جو متعلم متذکرہ صدر مسائل پر کام کررہے ہیں وہ بلا معاوضہ اس سے استفادہ کرسکیں۔

مجوزہ اسکیم کے اخراجات کے تخمینہ کا ایک تختہ منسلک ہے۔

تخمینہ اخراجات

۱۔ سروے

چھ وظائف بحساب مبلغ (۷۵) روپیہ ماہانہ کے لئے جملہ ۲۷

صادر متفرق اور سفر خرچ بحساب (۲۰۰) سو فی متعلم جملہ ۱۲۰۰

میزان [illegible]

۲۔ تین وظائف بحساب مبلغ ایک سو روپیہ چار ماہ کے لئے جملہ ۱۲۰۰

سفر خرچ بحساب مبلغ دوسو فی کس جملہ ۶۰۰

صادر متفرق جملہ ۲۰۰

میزان ۲۰۰۰

دیہی صنعتیں

۳۔ تین وظائف بحساب مبلغ ایک سو روپیہ فی کس چار ماہ کیلئے جملہ ۱۲۰۰

خام اشیاء آلات وغیرہ جملہ ۱۸۰۰

میزان [siyaq amount]

۴۔ امداد برائے انجمن امداد باہمی تنظیم دیہی جملہ ۲۰۰۰

۵۔ دو متعلم بحساب مبلغ (۱۰۰) ماہانہ چھ ماہ کیلئے جملہ ۱۲۰۰

ٹائپسٹ اہلکار بحساب پچاس ماہانہ چھ ماہ کیلئے جملہ ۳۰۰

صادر متفرق جملہ ۶۰۰

میزان ۲۱۰۰

۶۔ کتب جملہ ۲۰۰۰

جملہ میزان ۱۵۰۰۰

تجاویز برائے قیام انجمن تنظیم دیہی

مجوزہ معاشی کمیٹی انجمن طیلسانیین عثمانیہ

معاشی کمیٹی انجمن طیلسانیین نے ایک سب کمیٹی قائم کی تھی کہ وہ بلدہ حیدرآباد سے اندرون پانچ میل کسی موضع میں ایک مرکز تنظیم دیہی کے قیام کیلئے تجاویز پیش کرے اس قسم کی انجمن کے قیام سے انجمن طیلسانیین کا منشاء دیہات کی تنظیم و تعمیر جدید ہے جس میں دیہی صنعتوں کا احیاء حوصلہ افزائی اور ترقی دیہی آبادی کی جسمانی و اخلاقی ترقی شامل ہے۔ یہ کام امداد باہمی کے طور پر کیا جائے۔

سب کمیٹی کے فرائض۔

۱۔ مواضع میں کام کے لئے ایک خاکہ تیار کرنا۔ ۲۔ ترقی دیہات کے لئے ایک پنجسالہ تعمیری اسکیم پیش کرنا۔

۳۔ ایک موضع کا انتخاب کرنا جو حسب ذیل شرایط پر پورا اترتا ہو۔

الف۔ موضع کی آبادی معمولاً ایک ہزار سے زاید نہ ہو ورنہ اس کا سنبھالنا ممکن نہ ہوگا۔ اور اس پر پورا تعلیمی اثر اور قابو نہ رہے گا۔ ب۔ اس میں ایک سرکاری مدرسہ ہونا چاہیئے۔ ج۔ موضع میں خواندہ اشخاص کی ایک کافی تعداد ہونی چاہیئے۔ د۔ موضع سڑک سے پانچ سے دس میل تک فاصلہ پر ہونا چاہیئے

ہ۔ موضع میں ایک انجمن امداد باہمی موجود ہونا چاہیئے۔

۴۔ معاشی کمیٹی کی تجویز ہے کہ ایک انجمن تنظیم دیہی کے قیام سے کام کا آغاز کیا جائے۔ اس انجمن میں موضع کے تمام ارکان کو شامل ہونا چاہیئے ہر رکن سالانہ چندہ دینا ہوگا جس کی مقدار ایک آنہ سے ایک روپیہ تک ہوگی البتہ مزدور چندہ سے مستثنیٰ ہونگے اور انہیں سال میں ایک یا دو روز مفت کام کرنا ہوگا۔

۵۔ موضع کے تمام خاندانوں کی ہمت افزائی کی جانی چاہیئے کہ وہ اصلاح کے کام میں حصہ لیں جو امداد باہمی کے اصول پر کیا جائے گا۔

۶۔ عہدہ داران دیہی، اور معتبرین جو بحیثیت عہدہ دار انجمن کے ارکان ہونگے بہت خوشگوار تعلیمی اثر ڈال سکینگے

۷۔ انجمن فوراً مصرحۂ ذیل کام انجام دینا شروع کریگی، یہ موضع کی شدید ضرورتوں پر توجہ مرکوز کریگی۔

الف۔ صنعتیں۔ ب۔ زراعت۔ ج۔ صفائی۔ د۔ غذا۔

الف۔ صنعتیں۔ ۱۔ موضع کے صنعتی حالات کا جائزہ (سروے) ۲۔ جو خام اشیاء مقامی طور پر دستیاب ہوسکتی ہوں ان کا جائزہ (سروے) ۳۔ دیہاتیوں کی غذا اور اشیاء استعمال سے متعلقہ صنعتوں کا قیام مثلاً دھان صاف کرنا گیہوں اور اناج پیسنا تیل نکالنا، گڑ بنانا۔ ۴۔ بعض گھریلو صنعتیں مثلاً چرخا کاتنا۔ پافندگی چاندی اور سونے کے نقش کا کام قالین اور کمل بافی جوتہ سازی وغیرہ۔

ب۔ زراعت۔ ۱۔ بیج اور کھاد کی فراہمی۔ ۲۔ سادہ مشین کی قسم کے آلات ہل وغیرہ حاصل کرنا جو زراعت کیلئے کارآمد ہوں۔ ۳۔ سررشتۂ زراعت کے عہدہ داروں کو مدعو کرنا کہ دیہاتیوں کو مشورہ دیں۔ ۴۔ پیداوار کی فروخت کیلئے مارکٹنگ کی سہولتوں کا انتظام کرنا۔ ۵۔ زرعی مظاہرہ کی پارٹیوں کی تنظیم کرنا۔ ۶۔ دیہاتیوں کے اوقات فرصت کی مقبولیت اور ان کی قابلیت پیداوار میں اضافہ کی غرض سے ضمنی زرعی صنعتوں جیسے شیر خانوں مرغی خانوں وغیرہ کی ترقی۔

ج۔ صفائی۔ ۱۔ بیت الخلا (پاپخانوں کی ترویج) ۲۔ خاکروبی۔ ۳۔ الف۔ سڑکوں مکانات اور نالیوں کی ترقی اور مرمت۔ ب۔ گڑھے بھرنا باؤلیوں اور تالابوں کی صفائی ج۔ آب نوشید نی کی بہم رسانی۔ ج۔ لاشوں کو معاشی طریقہ پر ٹھکانے لگانا۔

د۔ غذا (۱) کھانے کی چیزوں کی غذائی قیمتوں کے متعلق معلومات بہم پہونچانا جیسے ماہرین سے حاصل کرکے دیہاتیوں میں شائع کیا جائے۔ (۲) دیہاتیوں کی استطاعت کے مطابق ان کی ذاتی اصلاح کے لئے تجاویز پیش کرنا۔

۸۔ انجمن تنظیم دیہی۔ لکچروں۔ کتابچوں خاکوں اور پوسٹروں کے ذریعہ امداد باہمی اصلاح معشیت صفائی اور دیہی حفظان صحت کے متعلق پروپگنڈے کا کام انجام دے گی۔ کچھ عرصہ بعد جب وقت ساز گار ہو تو ایک ریڈیو پوسٹ لگانے کی بھی تجویز ہے۔

۹۔ انجمن تنظیم دیہی ایک انجمن کفایت شعاری و پس اندازی بھی قایم کریگی۔

۱۰۔ یہ ایک (آیورویدیا یونانی) دواخانہ بھی قائم کریگی اور عورتوں کی امداد کے لئے دائیوں کی

ٹریننگ بھی کریگی۔

۱۱۔ معاشی کمیٹی کی تجویز یہ ہے کہ اندرون پنج سال حسب ذیل ادارہ جات قائم کرکے اپنے دائرۂ عمل کو وسعت دے۔

الف۔ ایک متعدد المقاصد انجمن اتحاد باہمی۔ ب۔ کو اپریٹیو مارکٹنگ سوسائٹی۔ ج۔ ذخیرہ ہائے اناج بر اصول اتحاد باہمی۔ د۔ اتحاد باہمی کے مزرعے پٹہ کی بنیادوں پر۔ ھ۔ مرکز افزائش نسل۔ و۔ لڑکوں کو دیہی صنعتوں کی ٹریننگ دینے اور دیہی صنعتوں کی ترقی کے لئے ایک انسٹی ٹیوٹ۔ ز۔ مدارس شبینہ تعلیم بالغان اور تحریک خواندگی۔ ح۔ اصلاح معشیت و اصلاح مزرعہ جات۔

۱۲۔ کمیٹی کی تجویز ہے کہ بلدہ کے نواح کے دیگر مواضع تک بھی اپنے دائرۂ عمل کو وسعت دے۔

۱۳۔ متذکرۂ صدر اسکیم اور اس میں جو مالی بار عاید ہوگا خاص طور پر زیر تحقیقات ہے (اگر تمام کام انجام دیئے جائیں تو متوقعہ اخراجات مبلغ (صہ ۵۰۰۰ کے) سے (اسمہ ۶۰۰۰ کے) سالانہ تک ہونگے۔

۱۴۔ رقم کی سربراہی کی حسب ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں۔

الف۔ اراکین کا چندہ۔ ب۔ آمدنی لوکل فنڈ۔ ج۔ سرکاری امداد۔ د۔ پہلے پانچ سال جو منافعہ غیر تقسیم شدہ رہے۔ ھ۔ سرمایہ مشغولہ اور انجمن کفایت شعاری کے خریدی مشتری کی اماتی رقوم دیہی سرمایہ اور انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کے غیر سودی قرضے۔

۱۵۔ سرکار عالی سے استدعا کی جائیگی کہ جملہ سررشتہ ہائے سرکاری کو احکام جاری فرمائیں کہ وہ اس اسکیم کی کامیاب پیش رفت میں ہمدردانہ طور پر ہاتھ بٹائیں۔

موجودہ غذائی صورت حال کے متعلق معاشی کمیٹی کی یادداشت

(قراردادہائے منظورہ در جلسۂ عاملہ منعقدہ ۱۹ ارخورداد سنہ ۱۳۵۲ ف)

موجودہ پریشان کن غذائی صورت حال کی اصلاح کے سلسلہ میں معاشی کمیٹی نے حسب ذیل قرارداد منظور کی ہیں۔

۱۔ کافی مقدار میں فراہمی اغذیہ کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ اجناس خوردنی کی زیادہ سے زیادہ کاشت کیجائے۔ فی الوقت ممالک محروسہ سرکار عالی میں اجناس کے رقبہ کی جس رفتار سے ترقی ہورہی ہے وہ اطمینان بخش نہیں معلوم ہوتی۔ خصوصاً چاول اور گیہوں کا رقبہ مقامی ضروریات کے لحاظ سے بہت ناکافی ہے۔ چنانچہ حکومت کی جانب سے مخصوص رقبہ جات کا تعین کرکے ان اجناس کی کاشت میں فوری طور پر اضافہ کیا جانا مناسب ہوگا۔

۲۔ زیادہ اجناس کیلئے اور بالخصوص چاول کی کاشت کے واسطے زیادہ ذرائع آبپاشی کی ضرورت ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں فی الوقت تری کا جو رقبہ ہے اوس کا تناسب بہت کم ہے۔ بڑے تالابوں اور ساگروں کی تعمیر سے اگرچیکہ ایسے رقبہ جات میں اضافہ ہورہا ہے لیکن اب جدید تالابوں کی تعمیر میں کافی عرصہ درکار ہوگا۔ لہٰذا فوری طور پر موجودہ ضروریات کی تکمیل کے لئے مختلف رقبوں میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں باؤلیات وکنویں وغیرہ کھدوایا جانا اور شکستہ تالابوں کی مرمت کے لئے فوری امداد بہت کارآمد ہوگی۔ اس کام کیلئے جتنی بھی رقم صرف کی جائیگی اس سے ملک کی زرعی پیداوار کی صورت میں کافی معاوضہ حاصل ہوگا۔ اور قلت اغذیہ کی شکایت بڑی حد تک رفع ہوجائیگی اور چونکہ موجودہ قیمتوں کے اضافہ کا بھی ان کاموں پر اثر نہیں پڑتا اس لئے دوران جنگ میں بھی اس کی فوری انجام دہی کی جانب کوشش کیجاسکتی ہے۔

۳۔ مستقل طور پر اغذیہ کی پیداوار اور اس کی فراہمی اور تقسیم کے مسائل حل کئے جانے کے لئے ایک مشاورتی مجلس (فوڈ کونسل FOOD COUNCIL) کے قیام کی ضرورت ملک میں محسوس کی جارہی ہے جو سرکاری اور غیر سرکاری اداروں پر مشتمل ہو۔ ایسی مجلس کے قیام کی صورت میں معاشی کمیٹی اس امر کا اظہار ضروری سمجھی ہے کہ وہ اپنے نمایندوں کے ذریعہ مجلس مذکور کے کاموں میں کماحقہ تعاون کرنے کیلئے آمادہ ہے۔

۴۔ اجناس خوردنی کی فروخت دکانوں پر نگرانی کے لئے معاشی کمیٹی کی جانب سے بعض ارکین رضاکارانہ طور پر کام کرنے تیار ہیں۔ اگر سررشتۂ متعلقہ معاشی کمیٹی کی اس پیش کش سے استفادہ کرنا چاہے تو ایسے رضاکار ارکین کے نام روانہ کئے جائینگے۔

۵۔ موجودہ حالات کے تحت اور بلدہ حیدرآباد کے جغرافی خصوصیات کے لحاظ سے تمام اجناس خوردنی کیلئے راتب بندی کا عمل قرین مصلحت نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا قوی احتمال ہے کہ بلاک مارکٹ (BLACK MARKET) اس کے نفاذ کے بعد خوب زور پکڑیگی۔ البتہ ان اجناس کی حد تک جن کا رسد کا دار و مدار زیادہ تر بیرون ملک کی درآمد پر ہے اور جو اجناس فی الوقت بہت کم مقدار میں دستیاب ہو رہے ہیں۔ ان کی تقسیم کے لئے راتب بندی ضروری ہے لیکن مناسب طور پر ایسی تقسیم عمل میں لانے کیلئے بہتر صورت یہ ہوگی کہ راتب بندی کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ جس میں مختلف اداروں اور طبقات کی جانب سے نمایندگی ہو۔ اس کے لئے معاشی کمیٹی بھی ممکنہ تعاون کرنے کے لئے تیار ہے۔

۶۔ موجودہ گرانی کے اثرات ایسے تنخواہ یاب یا اُجرت یاب طبقوں پر بہت زیادہ پڑ رہے ہیں جن کی آمدنی کے ذرایع محدود ہیں اور انکی آمدنی پر اس شرح سے اضافہ نہیں ہو رہا ہے جس شرح سے اشیا کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ چنانچہ اس کا تدارک مناسب شرح کے ساتھ تنخواہوں اور اجرتوں میں اضافہ سے کیا جا سکتا ہے جہاں ادنیٰ درجہ کے سرکاری ملازمین کو گرانی الونس دیا جا رہا ہے۔ اوس میں مزید اضافہ کی ضرورت ہے اور متوسط طبقہ کے سرکاری ملازمین بھی چونکہ گرانی سے بہت متاثر ہو رہے ہیں ان کو بھی گرانی الونس دیا جانا مناسب ہوگا۔ علاوہ ازیں غیر سرکاری ملازمین اور خصوصاً کارخانوں کے مزدور، زرعی مزدور، اور خانگی ملازمین وغیرہ کی اجرتوں میں بھی فوری اضافہ کے لئے کارخانہ داروں اور دیگر کاروباری طبقوں کو ہر طرح پابند کرنیکی ضرورت ہے۔

۷۔ تنخواہوں اور اجرتوں کے اضافہ کے ساتھ افراط زر یا محصول آمدنی کا سوال درپیش ہوتا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں آمدنی کے ذرایع بڑھانے کی ضرورت ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں محاصل کا بار زیادہ آمدنی رکھنے والے طبقوں پر ابتک بہت ہی کم ہے اور خصوصاً فی الوقت کارخانہ دار، گتہ دار، تجار و ساہوکار طبقے جس کثرت سے نفع اندوزی کر رہے ہیں۔ اس کے تدارک کے لئے انکم ٹیکس کا

فوری رائج کرنا معاشی کمیٹی کی رائے میں ازیں ضروری ہے۔ انکم ٹیکس کے علاوہ دیگر ایسے ٹیکسوں کے عاید کرنے کی بھی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جن سے ملک کا معاشی توازن برقرار رہ سکے۔

۸۔ معاشی کمیٹی کی رائے میں اندرون ممالک محروسۂ سرکارعالی اشیائے خوردنی کے نقل و حمل میں کم سے کم موانعات ہونے چاہئیں تاکہ ملک کے تمام حصوں کی رعایا یکساں طور پر اجناس خوردنی حاصل کر سکے۔ اس کے لئے ریلوے کے جانب سے نقل و حمل کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہونچائی جانی چاہئیں۔ اور کافی مقدار میں ریلوے واگنوں کے مہیا کئے جانے کی ضرورت ہے۔

علاوہ ازیں ملک کی مقامی سواریوں مثلاً بنڈی۔ بیل۔ گاڑیوں کی بروقت فراہمی کیلئے ملک میں ایک تنظیم قایم کرنے کی ضرورت ہے جن سے ملک کے ایسے حصوں میں جہاں ریلوے لائین نہیں ہے بہ آسانی نقل و حمل کی جا سکے۔

اس سلسلہ میں مقامی عہدہ داروں سے بھی یہ توقع بے جا ہو گی کہ وہ مقامی ضروریات کے بعد جو غلہ بچ رہے اسکو دیگر اضلاع کی رعایا کیلئے روانہ کرنے میں ممکنہ امداد سے دریغ نہ کرینگے۔

۹۔ ناجائز طور پر اجناس کے جو ذخیرے جمع کئے جا رہے ہیں۔ ان سے ملک کی غذائی صورت حال بہت نازک ہو رہی ہے۔ جہاں ایسے ذخیرے جمع کرنے کے مرتکب تجار اور بیوپاری ہو رہے ہیں وہاں انفرادی طور پر بعض افراد بھی اپنی ضروریات سے بہت زیادہ غلہ فراہم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ذخائر کی نشان دہی کیلئے حکومت کی جانب سے جو احکام صادر ہوئے ہیں ان میں خود بہت رعایت برتی گئی ہے۔ تاہم ان احکام کی بڑی سختی کے ساتھ پابندی کرائی جانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں ارکین معاشی کمیٹی بھی اس امر کی رضاکارانہ کوشش کرنے مستعد ہیں کہ ایسے ناجائز ذخائر کا پتہ معلوم کر کے ان کی اطلاع متعلقہ ارباب حکومت کو دیں۔ آخر میں معاشی کمیٹی اہل ملک سے یہ توقع کرتی ہے کہ وہ بھی فرداً فرداً ایسے ناجائز ذخائر کی موجودگی کا صحیح صحیح پتہ دینگے معاشی کمیٹی کی رائے میں آیندہ ضرورت ہو تو فاضل اجناس کے ذخائر کو حکومت حاصل کرے اور ان کی مناسب قیمتوں پر منصفانہ تقسیم کا انتظام کرے۔ فقط

آموں کی نمایش: رپورٹ

زیر سرپرستی مجلس نمایش معاشی کمیٹی انجمن طیلسانیین عثمانیہ آموں کی ایک نمایش بمقام پروگریس پویلین باغ عامہ بلدۂ حیدرآباد بتواریخ ۳ تا ۵ امرداد ۱۳۵۲ف منعقد ہوئی۔ اس نمایش کا مقصد یہ تھا کہ مملکت آصفیہ میں آموں کے پھل اور درخت کی داخت و پرداخت کا شوق پیدا کیا جائے۔ اور آموں سے مختلف کار آمد مرکبات تیار کرنے کی ترغیب دی جائے۔ اس غرض سے ایک مجلس عاملہ بصدارت جناب پروفیسر محمد سعید الدین صاحب صدر شعبۂ نباتیات جامعۂ عثمانیہ ترتیب دی گئی۔ اس کے معتمد نجم الدین بی۔ اے عثمانیہ اور اراکین جناب شنکر پلے صاحب بی۔ اے ماہر فواکہات سرکار عالی۔ مولوی محمد غوث صاحب یم۔ اے یل یل بی (عثمانیہ) رائے شنکر جی صاحب بی۔ اے یل یل بی (عثمانیہ) مولوی شرف الدین صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) مہندراج صاحب یم۔ یس۔ سی (عثمانیہ) مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) مولوی عبد الوحید صاحب یم۔ یس۔ سی عثمانیہ۔ محمد عبد السلام صاحب یم یس سی عثمانیہ۔ محمد عبد العلی صاحب بی۔ یس۔ سی۔ یل یل۔ بی۔ عثمانیہ تھے۔ ایک مجلس مشاورت بھی ترتیب دی گئی تھی۔ جس کے اراکین حسب ذیل تھے۔

۱۔ عالیجناب نواب میر اکبر علیخاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔ ۲۔ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ۳۔ نواب میر احمد علی خاں صاحب۔ ۴۔ یل۔ ین گپتا صاحب یچ سی۔ ایس۔ ۵۔ نواب دوست محمد خاں صاحب جاگیردار ۶۔ مولوی مظہر حسین صاحب ناظم اعداد شمار سرکار عالی۔ ۷۔ رائے صاحب کالیداس سہانی صاحب ناظم زراعت تحقیقات۔ ۸۔ رائے مہندر بہادر صاحب ناظم زرعی اشاعت سرکار عالی۔ ۹۔ ڈاکٹر ہاشم امیر علیخاں صاحب چیف مارکٹنگ آفیسر ۱۰۔ محمد علی صاحب۔ ۱۱۔ محمد حسن خاں صاحب نمایندگان تجار فواکہات۔

بتاریخ ۳ امرداد ۱۳۵۲ف بوقت ساڑھے چار ساعت شام نواب خسرو جنگ بہادر معزز رکن باب حکومت سرکار عالی نے نمایش کا افتتاح فرمایا۔ افتتاح کی درخواست کرنے سے پہلے پروفیسر محمد سعید الدین صاحب نے ایک پر از معلومات تقریر فرمائی۔ جس میں نہ صرف حیدرآباد میں آم کی کاشت کے ماضی و مستقبل پر گہری نظر

ڈالی بلکہ آم کے درخت پر علم نباتات کی روشنی میں بحث کی اس کی تاریخ اسکی کاشت افزائش کے طریقے آم کے اقسام وغیرہ پر تفصیلی روشنی ڈالی نواب صاحب موصوف نے اس کے بعد مختصر مگر جامع تقریر کی۔

”میری آنکھوں میں آموں کی رنگینیاں گھوم رہی ہیں۔ اور میری زبان کو دعوت لطافت دے رہی ہیں۔ جس قدر جلد ہوسکے میں آم کے سر بہ مہر گلاس کو پینا چاہتا ہوں۔ آموں سے متعلق میں غالب کے عقیدہ کا بالکل ہم نوا ہوں۔ اور بڑی مسرت کیساتھ اس نمائش کی افتتاح کرتا ہوں“

جب نواب صاحب ممدوح افتتاح کی رسم ادا کرتے ہوئے ریشمی فیتہ کو قطع فرما رہے تھے تو کیولری بیانڈ سلامی ادا کر رہا تھا۔ اعلیٰ عہدہ داران سرکاری و معززین شہر و طیلسانیین عثمانیہ تقریباً پانسو کی تعداد میں مدعو تھے۔ ان کے علاوہ تین دن تک تقریباً ایک ہزار شائقین نے نمائش کا معائنہ کیا۔ عام خیال یہ تھا کہ یہ پہلی نمائش جس قلیل سرمایہ کے ساتھ جس طرح کامیاب ہوئی وہ بہت ہمت افزا ہے۔ اموں کی جتنی قسمیں نمائش میں دیکھنے میں آئیں۔ اس کا بازاروں میں بہت کم وجود رہتا ہے۔

کل بتیس (۳۲) مشہور قسموں مثلاً الفن۔ گوا۔ ملغوبہ۔ بے نشان۔ وغیرہ وغیرہ کے علاوہ چھ۔ بارہ۔ وچوبیس قسم کے پیوندی آموں کے مجموعےً چھ قسم کے تخمی آموں کے مجموعہ و نیز نمائش میں بہترین قسم کے تخمی آم۔ اچار۔ چٹنی۔ مربے۔ جلّی۔ شربت وکھاد وغیرہ کے مقابلے کا اعلان ہوا تھا۔ ان ہی اشیاء کے فروخت کے لئے اسٹال قائم کرنے کی بھی اجازت تھی۔ نمائش کے افتتاح سے قبل مولوی مظہر حسین صاحب ناظم اعداد وشمار پروفیسر محمد سعید الدین صاحب صدر شعبۂ نباتیات جامعہ عثمانیہ۔ شنکر پلے صاحب ماہر فواکہات سرکار عالی اور مجاہد علی صاحب عاقل مہتمم باغ عامہ نے انعامات کا تصفیہ کیا۔ انعامات پانے والے اشیاء پر درجہ واری انعامات کا لیبل چسپاں کر دیا گیا۔ اکتالیس مقابلہ کنندوں نے نمائش میں حصہ لیا۔ آموں اور مرکبات کے فروخت کے بھی دو اسٹال قائم ہوئے۔ شعبہ فواکہات سررشتۂ زراعت تحقیقات سرکار عالی نے آم کی سروے کے سلسلہ میں مختلف باغات سے جو آم جمع کئے اور ان کے رنگین نقوش تیار کئے ہیں ان کا مظاہرہ کیا۔ سررشتۂ اعداد وشمار کی جانب سے ریاست حیدرآباد کا ایک نقشہ پیش کیا گیا تھا۔ جس میں مختلف اضلاع میں تخمی و پیوندی آموں کی کس قدر رقبہ پر کاشت کی جاتی ہے اس کو نمایاں کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ آموں کی پیداوار

درآمد وغیرہ کے اعداد بھی پیش کئے گئے تھے تصاویر کے ذریعہ مارکٹنگ کے طریقوں وغیرہ سے متعلق معلومات بہم پہنچائی گئیں۔ نہ صرف بلدہ و اطراف بلدہ کے باغات سے آم نمایش میں لائے گئے تھے بلکہ اورنگ آباد رائچور۔ میدک ۔ ورنگل ۔ کریمنگر۔ نلگنڈہ سے بھی نمائندگی ہوئی۔

اعلان کردہ (۳۲) مشہور قسموں کے علاوہ دیگر (۵۵) قسم کے نمونے پیش کئے گئے تھے۔ ان میں قابلِ ذکر باغات خسروی کے خاص آموں کے نادر نمونے تھے جو خاص طور پر خاصہ مبارک کیلئے مخصوص سمجھے جاتے ہیں مثلاً شربت گھڑی پاشاہ پسند حضور پسند۔ گلقند۔ مصری ملائی۔ دردانہ بہشت۔ لال موتیا۔ تخمی۔ واحو تخمی ماشاء اللہ۔ سبحان اللہ۔ بتاشہ وغیرہ وغیرہ۔ ان ہی میں سے سب سے وزنی آم دودیہ ملغوبہ تھا۔ جس کو پکنے اور بڑنے کیلئے ابھی مہینہ ڈیڑھ مہینہ درکار تھا۔ مگر اس کا وزن ابھی سے تقریباً دو ڈھائی سیر سے زیادہ تھا۔ ان آموں کی شیرنی و خوشبو وغیرہ کا کیا ذکر ہوسکتا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر اشخاص کے پاس سے جو نمونے حاصل ہوئے ان میں قابل ذکر ثمر بہشت۔ خسرو پسند۔ سیب ہملیٹ ۔ ٹیزر۔ کالاپہاڑ۔ مرشد آبادہیں۔ ثمر بہشت نہایت شیریں پھل تھا۔ جو منیجر صاحب عنبر پیٹھ کالونی نے روانہ کیا تھا۔ نواب سالار جنگ بہادر کے علاقہ کا ایک آم موسوم بہ سیب بالکل اسم بامسمیٰ شکل و رنگ میں بالکل سیب کے مشابہ تھا۔ جسامت کے لحاظ سے قابلِ ذکر ہملیٹ و ٹیزر تھے۔ جن کا وزن ڈھائی سیر کے قریب تھا۔ راجہ دھرم کرن بہادر کے پاس کا ایک آم کالاپہاڑ اگرچہ بہ ظاہر سوک گیا اور سوکڑ گیا تھا مگر مزا میں کچھ خرابی پیدا نہ ہوئی تھی۔ مرشد آباد اپنی سُرخ رنگت کیلئے بہت پسند کیا گیا۔

درجہ اول کے کل (۳۲) انعام۔ درجہ دوم کے کل (۲۷) انعام۔ درجۂ خاص کے (۵) انعامات دیئے گئے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ باغات علاقہ صرفخاص مبارک (۱۲) انعام ۲۔ باغات علاقہ نواب سالار جنگ بہادر (۲) انعام ۳۔ باغات علاقہ راجہ دھرم کرن بہادر (۹) انعام۔ ۴۔ قادر باغ نزد فتح نگر داخلہ کنندہ مولوی محمد یوسف الدین صاحب یم۔ اے (عثمانیہ) (۸) انعام۔ ۵۔ باغات علاقہ مقطعہ کوٹیال و حلیم نگر واقع سدی پیٹھ ضلع میدک۔ داخل کنندہ مولوی عزالدین محمد صاحب (۷) انعامات۔ ۶۔ مولوی برہان الدین صاحب (۶) انعامات۔ ۷۔ مولوی عبدالعزیز صاحب

فرزند عبدالجلیل صاحب مددگار معتمد فوج (۲) انعامات۔ ۸۔ باغات علاقہ واجد نگر داخل کنندہ نواب میر احمد علی خاں صاحب جاگیردار (۱) انعام۔ ۹۔ مولوی اکبر بیگ صاحب انجنیر وظیفہ یاب (۲) انعامات ۱۰۔ پنگل وینکٹ راما ریڈی صاحب (۲) انعامات۔ ۱۱۔ یل سی آنند صاحب (۲) انعامات ۱۲۔ مینجر صاحب عنبر پیٹھ کالونی (۲) انعامات۔ ۱۳۔ کریم اللہ صاحب (۱) انعام۔ ۱۴۔ شیورام صاحب پشاوری (۱) انعام ۱۵۔ الگیر ریڈی صاحب سری نواس ریڈی صاحب (۱) انعام۔ ۱۶۔ خالدہ بیگم (۱) انعام۔ ۱۷۔ شعبۂ فواکہات سررشتۂ زراعت تحقیقات سرکار عالی (۱) انعام۔ ۱۸۔ باغ گلزار اولیا ورنگل (۱) انعام۔ ۱۹۔ سید محمد یونس صاحب انجنیر (۱) انعام۔ ۲۰۔ شرف الدین صاحب (۱) انعام۔

حسب ذیل اصحاب نے انعامات بشکل رقومات کپ و تحفہ عطا فرمائے روانہ فرمائے جنکو شکریہ کیساتھ قبول کیا گیا۔

۱۔ نواب سر صدر اعظم بہادر باب حکومت سرکار عالی۔ ۲۔ نواب غازی یار جنگ بہادر رکن عدالت العالیہ وظیفہ یاب۔ ۳۔ پروفیسر محمد سعید الدین صاحب۔ ۴۔ محمد غوث صاحب یم۔ اے یل یل بی۔ ۵۔ مولوی عبدالوحید صاحب یم یس سی۔ ۶۔ نواب اکبر یار جنگ بہادر رکن عدالت العالیہ وظیفہ یاب۔ ۷۔ مولوی شرف الدین صاحب بی اے (عثمانیہ) ۸۔ مولوی محمد عبدالعلی صاحب بی یس سی یل یل بی۔ و نیز حسب ذیل اصحاب نے انعامات روانہ فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ۱۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر معتمد کمرشیل کارپوریشن۔ ۲۔ راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی صاحب او۔ بی ای کوتوال بلدۂ وظیفہ یاب ۳۔ نواب یمین جنگ بہادر معتمد اسٹیٹ نواب کمال یار جنگ بہادر

آخر میں ہم ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے مختلف قسم سے نمایش کو کامیاب بنانے میں حصہ لیا۔ سرکاری سررشتوں میں سررشتۂ اعداد و شمار و شعبۂ فواکہات سررشتۂ زراعت تحقیقات۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ انہوں نے نمایش میں علمی حصہ لیا۔ سررشتۂ آرایش بلدہ و محکمۂ سیاسیات و فراش خانہ سرکار عالی نے بلدیہ باغ عامہ و محکمۂ فوج نے عمارت اور فرنیچر استعمال کیلئے عطا کیا اور صفائی و آرایش میں مدد دی۔ اور خود مجلس نمایش معاشی کمیٹی نے مالی امداد کرکے نمایش کو کامیاب بنانے میں ہاتھ بٹایا۔ آخر میں نواب خسرو جنگ بہادر معزز رکن باب حکومت مولوی مظہر حسین صاحب پروفیسر سعید الدین صاحب شنکر پلے صاحب محبوب علی صاحب عاقل محمد علی صاحب موسوی کے علاوہ تمام اراکین مجلس عاملہ و مشاورت نمایش آئندہ قابل تشکر ہیں فقط نجم الدین اعزازی معتمد نمایش آئندہ

۸	سندھ	۱۳
۹	تعلقہ بورسیڈ (واقع گجرات)[۱]	۲۱،۵
۱۰	موضع اٹیگام (واقع گجرات)[۲]	۲۷،۵
۱۱	موضع پنیٹہ (واقع حیدرآباد دکن)[۳]	۳۲،۶
۱۲	موضع پن گنٹہ (واقع حیدرآباد دکن)[۴]	۴۲،۲
۱۳	موضع پھل ماڑی (واقع حیدرآباد دکن)	۱۴،۵
۱۴	موضع دوپلی (موضع زیر بحث)	۱۵

مندرجہ بالا اعداد کے دیکھنے سے واضح ہے کہ زیر بحث موضع میں بھی برما، آسام اور پنجاب وغیرہ کی طرح غیر مقروض خاندانوں کا اوسط نسبتاً بہت کم ہے۔ ذیل میں فی کس اوسط قرض کے تقابلی اعداد دیئے گئے ہیں۔

نام مقام	اوسط قرضہ فی کس		نام مقام	اوسط قرضہ فی کس	
	حالی	کلدار		حالی	کلدار
پنجاب	۶۶،۱۲	۵۷	مارواڑ	۵۱،۰۴	۴۴
صوبجات متحدہ	۲۹	۲۵	تعلقہ بورسیڈ	۱۲۵،۲۸	۱۰۸
بہار و اڑیسہ	۴۷،۵۶	۴۱	موضع اٹیگام	۴۹،۸۸	۴۳
صوبجات متوسط	۲۶،۶۸	۲۳	موضع پنیٹہ	۲۳	۱۹،۸۲
برما	۴۲،۹۲	۳۷	موضع پن گنٹہ	۴۲	۳۶،۲
آسام	۲۷،۸۴	۲۴	موضع پھل ماڑی	۵۱	۴۳،۹۶
شمال مشرقی سرحدی صوبہ	۵۱،۰۴	۴۴	موضع دوپلی	۳۵	۳۰،۱۷

[۱] یہ اعداد مسٹر اے۔ ڈی ٹیل کی کتاب ہندوستانی زرعی قرض کے صفحہ ۲۴۳ سے لئے گئے ہیں۔ [۲] لائف اینڈ لیبر از جی سی مکتیار صفحہ (۲۴۸) دیئے ہوئے اعداد کی مدد سے ہمنے فیصد نکالا ہے۔ [۳] "موضع پنیٹہ" کی معاشی تحقیق" از محمد ناصر علی صاحب صفحہ ۲۵ [۴] "موضع پن گنٹہ کی معاشی تحقیق" از شیخ علی مجلہ عثمانیہ جلد ۱۱ صفحہ ۵۸ [۵] موضع پھل ماڑی کی معاشی تحقیق از احمد خاں (مضمون غیر مطبوعہ) نوٹ - ۱۱۶ حالی مساوی ہے ۱۰۰ کلدار روپیوں کے۔

مندرجہ بالا اعداد سے واضح ہے کہ صوبہ جات متحدہ صوبہ جات متوسط اور آسام کی طرح موضع دوپلی میں بھی قرض کا اوسط کم ہے۔ مسٹر بھروچہ زائد معتمد مال نے ۱۳۴۵ف (م اکتوبر ۳۶-۱۹۳۵ء) میں حیدرآباد کے ۳۱۲ مواضعات میں زرعی قرضہ جات کی تحقیق کی (واضح رہے کہ صاحب موصوف کی تحقیق صرف زمیندار جماعتوں تک محدود تھی۔) اور اپنی رپورٹ ۱۳۴۶ف (م اکتوبر ۳۷-۱۹۳۶ء) میں شائع کی۔ اس رپورٹ میں فی کس قرض کا بار ۳۰ روپیہ حالی بتلایا گیا ہے جو کہ ۲۵٫۸۶ روپیے کلدار کے مساوی ہے۔ موضع زیربحث میں فی کس قرض کا بار مسٹر بھروچہ کے اعداد سے ۱۶٫۶۶ فیصد بڑھا ہوا ہے۔ لیکن اسکے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ موضع ہذا میں قرض کا بار کچھ زیادہ نہیں۔

۳۔ قرض کی ماہیت قرض کی تقسیم اور بار قرض کی تشریح کے بعد اب ہم اپنی توجہ ایک دوسرے دلچسپ عنوان یعنی ماہیت قرض کی طرف مبذول کرتے ہیں۔ اس عنوان کے تحت ہم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ مجموعی قرض میں سے (۱) سودی قرض کسقدر ہے اور غیر سودی کسقدر (۲) اسی طرح کفالتی قرضہ کتنا ہے اور غیر کفالتی کتنا (۳) نقدی قرضہ کسقدر ہے اور غیر نقدی کتنا (۴) ...... آبادی ...... قرضوں کی کیا مقدار ہے۔ ذیل میں ان امور کی سلسلہ وار تشریح کیجاتی ہے۔

(۱) **سودی اور غیر سودی قرض** ——— واضح رہے کہ غیر سودی قرض سے ہماری مراد قرض حسنہ ہے۔ اس قسم کے قرض کی مقدار بہت ہی قلیل ہے۔ ۴۰۸۲۵ روپیوں میں سے غیر سودی قرض کی مقدار صرف ۵۲۵ ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے غیر سودی قرض ۱۱٫۳ فیصد ہے۔ باقی ۴۰۳۰۰ روپیے یا ۹۸٫۷ فیصد قرض سودی ہے۔

غیر سودی قرض عموماً عزیز و اقارب ایک دوسرے سے حاصل کرتے ہیں۔ ان قرضوں کی مقدار بالعموم ۵-۱۰-۱۵-۲۰ اور ۲۵ روپیوں سے زاید نہیں ہوتی۔ بعض مرتبہ ساہوکار بھی معتبر آسامیوں کو (جن سے ان کے دوستانہ تعلقات ہیں) ایک قلیل عرصہ کیلئے غیر سودی قرض دیتے ہیں۔

(۲) **کفالتی اور غیر کفالتی قرض** ——— جسطرح غیر سودی قرض کی مقدار بہت محدود ہے اسی طرح کفالتی قرض بھی بہت ہی قلیل ہے۔ ۴۰۸۲۵ روپیوں میں سے ۳۹۲۲۵ روپیہ غیر کفالتی قرضہ ہے

اور ۱۵۹۰ روپیہ کفالتی قرض ہے۔

۱۵۹۰ روپیوں میں سے ۱۳۵۲ روپیے جائداد غیر منقولہ مثلاً زمین اور مکانات کی کفالت پر حاصل کئے گئے ہیں۔ باقی ۲۳۸ روپیہ قرض اشیاء منقولہ (مثلاً سونے، چاندی کی چیزیں) کی کفالت پر لیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے کفالتی قرضہ ۹ء۱ فیصد ہے اور غیر کفالتی قرض ۹۸ء۱ فیصد ہے۔ کسانوں کیلئے یہ چیز بہت ہی باعث سہولت ہے کہ انہیں غیر کفالتی قرضہ بآسانی ملجاتا ہے شہروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی رقومات بھی عموماً بغیر کفالت کے قرض نہیں دیجاتیں خصوصاً بنیئے تو بغیر کفالت قرض ہی نہیں دیتے۔ اگر دیہاتوں میں بھی یہی کیفیت ہوتی تو زراعتی کاروبار کا چلنا محال تھا۔

دیہاتی چونکہ عموماً دیانت دار ہوتے ہیں لہذا انہیں غیر کفالتی قرضہ بآسانی ملجاتا ہے۔ چنانچہ ایک ساہوکار نے ہم پر اس کا اظہار بھی کیا ہے کہ اوسکو دیہاتوں کی جائداد سے کہیں زیادہ انکی زبان کا لحاظ ہوتا ہے۔ ساہوکار چونکہ ہر دیہاتی سے شخصی طور پر بخوبی واقف ہوتے ہیں اس لئے غیر کفالتی قرض کے دینے میں پس وپیش نہیں کیا جاتا۔ ساہوکاروں کو اس امر کا یقین ہوتا ہے کہ اونکا قرضہ ڈوبیگا نہیں۔ آج نہیں تو کل۔ باپ سے نہیں تو بیٹے سے ضرور وصول ہوجائیگا۔

(۳) جنسی ورقمی قرض ——— رقمی قرض سے ہماری مراد وہ قرض ہے جو بشکل زر دیا جائے جنسی قرض وہ ہے جو جنس کی شکل میں دیا جائے۔ موضع زیر بحث میں ہر دو قسم کے قرض مروج ہیں۔

جنسی قرضے عام طور پر خوراک اور تخم ریزی کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں مگر یہ بالعموم قلیل المقدار ہوتے ہیں۔ ۲۰۸۲۵ روپیوں میں سے رقمی قرضہ ۲۰۱۷۳ روپیہ ہے۔ جنسی قرض کی مقدار (تقریباً ۹ کھنڈی[۵۲]) ۶۵۲ روپیے کے ہمقدار ہے۔ مجموعی قرض کے تناسب سے جنسی قرضہ ۱ء۶ فیصد ہے اور غیر جنسی یعنی رقمی قرض ۹۸ء۴ فیصد ہے۔

(۴) ذاتی آبائی اور مخلوط قرضے ——— ذاتی قرضوں میں ان قرضوں کو شامل کیا گیا ہے جسکو

۵۱۔ دوسرے ضمیمے میں صفحہ ۱۸۳ اسکے متعلق ایک بیان موجود ہے۔

۵۲۔ ایک کھنڈی ۲۰ من کی ہوتی ہے۔ اور ایک من ۱۶ پایلی کا۔ ایک پایلی ۴ سیر کے مساوی ہوتی ہے۔

کسی شخص موجودنے بذاتہ حاصل کیا ہو۔ آبائی قرضوں سے وہ قرضے مراد ہیں جو کسی شخص موجود کو ورثے میں
ملے ہوں۔ بعض افراد کے قرضے اس نوعیت کے ہیں کہ ان کو نہ تو کلیتاً آبائی قرض کہا جاسکتا ہے۔ اور نہ ذاتی۔
لہذا اس قسم کے قرضوں کو مخلوط قرضوں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ ذیل کے جدول میں ذاتی۔ آبائی اور مخلوط
قرضوں کی تفصیل دی گئی ہے۔

نوعیت قرضہ جات	قرضہ جات		فی صد بلحاظ	
	تعداد	رقم	مجموعی تعداد	مجموعی رقم
ذاتی قرضے	۶۰۶	۳۰۹۱۸	۸۱	۷۶
آبائی قرضے	۱۲۰	۶۹۹۲	۱۶	۱۷
مخلوط قرضے	۲۲	۲۹۱۵	۳	۷
جملہ	۷۴۸	۴۰۸۲۵	۱۰۰	۱۰۰

مندرجہ بالا اعداد سے واضح ہے کہ جملہ قرضوں کی تعداد (جنکو ہر آسامی نے مختلف ساہوکاروں سے
حاصل کیا ہے) ۷۴۸ ہے۔ ۷۴۸ قرضوں میں سے ۶۰۶ یا ۸۱ فی صد قرضے ذاتی ہیں۔ ۱۲۰ یا ۱۶ فیصد آبائی
۲۲ یا تقریباً ۳ فیصد مخلوط ہیں۔ اسی طرح رقم کا لحاظ کرتے ہوئے ۴۰۸۲۵ روپیوں میں سے ۳۰۹۱۸ یا
۷۶ فیصد روپیہ ذاتی قرض سے متعلق ہے۔ ۶۹۹۲ یا ۱۷ فیصد قرض آبائی ہے۔ ۲۹۱۵ یا ۷ فیصد مخلوط ہے۔
اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ مخلوط قرض (۲۹۱۵) میں بھی ۱۶ فیصد قرضہ آبائی ہے تو اس مفروضے کی
بنا پر ۴۰۸۲۵ روپیوں میں سے ذاتی قرض کی مقدار ۳۱۳۸۴ رہتی ہے اور آبائی قرض ۹۴۴۱ روپیہ رہتا ہے۔
اس طرح مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے ذاتی قرض کی مقدار ۷۷ فیصد اور آبائی قرض کی ۲۳ فیصد ہے
بالفاظ دیگر ذاتی اور آبائی قرض کا باہمی تناسب تقریباً ۷ اور ۲ رہتا ہے۔ اس نتیجہ کو دوسرے الفاظ میں
یوں کہا جاسکتا ہے کہ اگر مجموعی قرض ۹ روپیہ ہے تو اس میں ذاتی قرضہ ۷ روپیہ اور آبائی ۲ روپیہ ہے۔ مانا کہ
ذاتی قرض کے مقابل آبائی قرض کی مقدار بہت کم ہے لیکن یہی قلیل مقدار کسان کی مصیبتوں میں اور زیادتی کردیتی ہے

واضح رہے کہ ۲۱۱ مقروض خاندانوں میں سے ۱۴۸ یا تقریباً ۷۱ فیصد خاندان ایسے ہیں جن کے مجموعی قرض میں آبائی قرض کا کچھ نہ کچھ جزو شامل ہے۔ صرف ۶۳ یا ۲۹ فیصد خاندان ایسے ہیں جن کے مجموعی قرض میں آبائی قرض کا کوئی جزو شریک نہیں۔ جب کہ ۷۱ فیصد خاندانوں کو قرض کا کچھ نہ کچھ جزو بطور ورثے کے ملا ہے تو ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ موضع زیر بحث کے کسانوں کی اکثریت بھی مقروض پیدا ہوتی مقروض زندگی بسر کرتی اور مقروض فوت ہوتی ہے

۴۔ قرض کی خصوصیات موضع ہذا میں قرضہ جات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عموماً ایک سے زاید ساہوکاروں سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ بہت کم قرضے ایسے ہیں جو صرف ایک ساہوکار سے حاصل کئے گئے ہیں۔ ذیل کے اعداد سے ہمارے اس بیان کی وضاحت ہوتی ہے۔

قرضے	تعداد	فیصد
وہ قرضے جو صرف ایک ساہوکار سے حاصل کئے گئے ہیں۔	۴۹	۲۳
وہ قرضے جو دو ساہوکاروں سے حاصل کئے گئے ہیں	۳۲	
〃 ۳ 〃 〃	۵۱	
〃 ۴ 〃 〃	۲۲	
〃 ۵ 〃 〃	۱۷	
〃 ۶ 〃 〃	۱۳	۷۷
〃 ۷ 〃 〃	۸	
〃 ۸ 〃 〃	۶	
〃 ۹ 〃 〃	۶	
〃 ۱۰ 〃 〃	۴	
〃 ۱۱ 〃 〃	۳	
جملہ	۲۱۱	۱۰۰

سابقہ صفحہ کے اعداد سے ظاہر ہے کہ جملہ ۲۱۱ قرضوں میں سے صرف ۴۹ یا ۲۳ فیصد قرضے ایک ساہوکار سے حاصل کئے گئے ہیں۔ باقی ۱۶۲ یا ۷۷ فیصد قرضے دو تا بارہ مختلف ساہوکاروں سے حاصل کئے گئے ہیں۔

واضح رہے کہ کسان کی مقروضیت کا آغاز ایک ساہوکار سے ہوتا ہے۔ ابتداً منہ مانگی رقم قرض ملتی رہتی ہے اور سود و اصل کا مطالبہ بھی شدت کے ساتھ کیا جاتا ہے لیکن کچھ مدت بعد جب کہ قرض کی مقدار بڑھ جاتی ہے تو ساہوکار کا طرزِ عمل بالکل بدل جاتا ہے۔ اور اب وہ جدید قرض دینے کی بجائے واجب الوصول اصل و سود کا سختی سے مطالبہ کرتا ہے لہٰذا کسان دوسرے ساہوکار سے تھوڑی بہت رقم حاصل کر کے قدیم ساہوکار کے قرض کا ایک حصہ بے باق کرتا ہے۔ لیکن اسی اثناء میں کسان کو بیل کی خریدی یا کسی دوسرے اہم کام کے لئے مزید قرضے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے نتیجہ یہ کہ وہ تیسرے ساہوکار کے ہاں جاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے چنانچہ ہماری تحقیق کے مطابق ۳ خاندان گیارہ مختلف ساہوکاروں کے مقروض ہیں۔

قرضہ جات[1] کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ زیادہ تر قلیل المقدار (مثلاً ۵۔۱۰۔۱۵۔۲۰ اور ۲۵) ہوتے ہیں۔ چونکہ اکثر کسانوں کا مجموعی قرض متعدد اجزا پر مشتمل ہوتا ہے لہٰذا ۲۱۱ مقروض خاندانوں کے مجموعی قرضہ جات (۲۱۱) میں ۴۸۷ چھوٹے چھوٹے قرضے شامل ہیں جو کہ ۱ تا ۱۲ مختلف ساہوکاروں سے حاصل کئے گئے ہیں۔ ذیل کے اعداد میں بتلایا گیا ہے کہ بلحاظ مقدار ان قرضوں کی کیا نوعیت ہے۔

نوعیت قرضہ جات	تعداد	فیصد
وہ قرضے جن کی مقدار ۱۰ روپیہ سے کم ہے۔	۱۴۹	
وہ قرضے جن کی مقدار ۱۰ اور ۱۵ روپیہ کے درمیان ہے	۲۵۱	۶۰
″ ″ ۱۵ ″ ۲۵ ″	۵۱	
″ ″ ۲۵ ″ ۵۰ ″	۹۹	

---

[1] پچھلے صفحہ پر قرض سے مراد کسی شخص کا مجموعی قرض ہے۔ اس صفحہ پر قرض سے ہماری مراد کسی شخص کا مجموعی قرض ہے۔

وہ قرضے جن کی مقدار ۵۰ اور ۱۰۰ روپیہ کے درمیان ہے۔	۱۰۳	۲۷
〃 〃 ۱۰۰ 〃 ۲۰۰ 〃	۷۰	
〃 〃 ۲۰۰ 〃 ۳۰۰ 〃	۱۲	۱۳
〃 〃 ۳۰۰ 〃 ۴۰۰ 〃	۸	
〃 〃 ۴۰۰ 〃 ۵۰۰ 〃	۵	
جملہ	۷۴۸	۱۰۰

مندرجہ بالا اعداد سے واضح ہے کہ ۷۴۸ قرضوں میں سے ۶۰ فیصد قرضوں کی مقدار ۲۵ روپیوں سے کم ہے۔ ۲۵ اور ۱۰۰ روپیوں کے درمیانی قرضے ۲۷ فیصد ہیں۔ صرف ۱۳ فیصد قرضے ۱۰۰ اور ۵۰۰ روپیہ کے درمیانی ہیں۔

جب کبھی کسان کو بڑی رقم (مثلاً ۱۰۰ تا ۵۰۰) کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اس رقم کو مختلف ساہوکاروں سے حاصل کرتا ہے۔ ساہوکار بڑی رقمیں بہت کم قرض دیتے ہیں البتہ چھوٹی چھوٹی رقموں میں اصل و سود جمع کرکے بڑی رقموں کے مساوی کر دیتے ہیں۔

قرضہ جات کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ حاصل کئے جائیں تو پھر ان کے لین دین کا سلسلہ مدتوں چلتا رہتا ہے۔ چنانچہ ۷۴۸ کھاتوں کا مدت وار تجزیہ حسب ذیل ہے۔

کھاتے	تعداد	فیصد
وہ کھاتے جنہیں قایم ہو کر ابھی ایک سال مکمل نہیں ہوا۔	۸۰	۱۱
وہ کھاتے جو ایک اور ۵ سال کے درمیان قائم کئے گئے ہیں۔	۲۳۰	۳۱
〃 ۵ 〃 ۱۰ 〃 〃	۱۸۹	۲۵
〃 ۱۰ 〃 ۱۵ 〃 〃	۱۱۵	۱۵
〃 ۱۵ 〃 ۲۰ 〃 〃	۸۳	۱۱
〃 ۲۰ 〃 ۲۵ 〃 〃	۴۱	۶
〃 ۲۵ 〃 ۵۰ 〃 〃	۱۰	۱
جملہ	۷۴۸	۱۰۰

تقریباً ہر کسان کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ جس قدر قرض لیتا ہے اُوس کا تین چار گنا سود (ایک طویل مدت میں) ادا کرتا ہے۔ دوران تحقیق میں ہمیں متعدد مثالیں ایسے کسانوں کی ملتی ہیں جنہوں نے آٹھ ایک سال قبل صرف ایک مرتبہ قرض لیا تھا اور اب تک (جسقدر ممکن ہوسکے) صرف سود ہی ادا کرتے چلے آرہے ہیں۔ خصوصاً متفرق چھوٹے چھوٹے قرضوں (مثلاً ۵-۱۰-۱۵-۲۰ اور ۲۵) میں یہ چیز بہت عام ہے۔ مثال کے طور پر ہم مسمی نانیا کو پیش کرسکتے ہیں۔ اس نے آج سے ۸ سال قبل ایک ساہوکار سے (۳۰ تولے اشیا ر چاندی کی کفالت پر) دس روپے قرض حاصل کئے۔ اور وعدہ کیا کہ ہر ماہ دس روپیوں پر چار آنے سود ادا کریگا۔ مسمی مذکور کا بیان ہے کہ وہ حسب وعدہ ۸ سال سے مقررہ سود برابر ادا کررہا ہے۔ جسکے متعلق ساہوکار کو بھی اعتراف ہے۔ گذشتہ ۸ سال میں اسامی نے سالانہ تین روپے (جس کی فیصد شرح ۳۰ رہتی ہے) کے حساب سے ۲۴ روپیہ بطور سود ادا کئے جو کہ حاصل کردہ اصل (۱۰ روپے) سے ۱۴۰ فیصد زیادہ ہے۔ سود کے ضمن میں اسمیں شک نہیں کہ اسقدر زاید رقم ادا کیجا چکی ہے لیکن ابھی تک ادائے اصل کی نوبت نہیں آئی۔ مزید برآں اشیائے کفالت بھی ساہوکار کے ہاں موجود ہیں۔ اچھوت خاندانوں میں اس قسم کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

نویں فصل - زرعی مقروضیت

(بہ سلسلہ سابق)

قرض کی تقسیم - بار قرض - ماہیت قرض - اور خصوصیات قرض کے حالات معلوم کرنے کے بعد اب ہم یہ دریافت کرینگے کہ موضع زیر بحث میں قرض حاصل کرنے کے کیا ذرائع ہیں - قرض کی وجوہات کیا ہیں - اور کن شرحوں پر قرض حاصل کیا جاتا ہے -

۱ - قرض حاصل کرنے کے ذرائع مزارعین کے بیان کے مطابق ذرائع قرض کو ۲ طرح پر تقسیم کیا جاسکتا ہے (الف) سرکاری ذرائع قرض اور (ب) خانگی ذرائع قرض - ذیل میں ہم ان ہر دو ذرائع کی جدا جدا تشریح کرتے ہوئے آخر میں یہ بتلائینگے کہ قرض کا سب سے اہم ذریعہ کیا ہے -

(الف) سرکاری ذرائع قرض ــــ واضح رہے کہ حکومت دو طرح پر قرض دیتی ہے - (۱) براہ راست اور (۲) بالواسطہ براہ راست تقاوی کے ذریعہ اور بالواسطہ انجمن امداد باہمی کے توسط سے قرض دیا جاتا ہے -

(۱) تقاوی ــــ موضع ہذا میں رقم تقاوی کی تقسیم سب سے پہلے سنہ ۱۳۴۰ ف (م اکٹوبر ۳۱-۱۹۳۰ء) میں ہوئی - جملہ رقم ۲۵۵ روپے تھی جو کہ ۱۲ اشخاص کو دیگئی - سنہ ۱۳۴۳ ف (م اکٹوبر ۳۴-۱۹۳۳ء) میں صرف ۷۵ روپیہ ایک شخص کو دئیے گئے - تین سال بعد یعنی سنہ ۱۳۴۶ ف (م اکٹوبر ۳۷-۱۹۳۶ء) میں ۳۷۰ روپیہ ۱۱ مختلف اسامیوں کو دئیے گئے - سنہ ۱۳۴۷ ف (م اکٹوبر ۳۸-۱۹۳۷ء) میں بھی رقم بہ ضمن تقاوی آسامیوں سے واجب الوصول تھی - مجموعی قرض (۸۲۵؍۴۰) کا لحاظ کرتے ہوئے تقاوی کا قرضہ تقریباً ۹ فیصد ہے -

(۲) انجمن امداد باہمی ــــ سرکاری ذرائع قرض کا دوسرا ذریعہ انجمن امداد باہمی ہے - اس موضع میں انجمن کا قیام سنہ ۱۳۳۴ ف (م اکٹوبر ۲۵-۱۹۲۴ء) میں ہوا - جملہ ۱۹ دیہاتوں نے اس کی

شرکت قبول کی۔ ۱۰۹۰ روپے صدر بنک سے حاصل کئے گئے اور ان کی تقسیم اراکین کے مابین ہوئی۔ ذاتی سرمایہ کی مقدار بتدریج بڑھتی گئی چنانچہ اب انجمن کلیتہً "ذاتی سرمایہ سے" کام کر رہی ہے۔ اس وقت اراکین کی تعداد ۲۵ ہے گویا قیام انجمن کے بعد سے اراکین کی تعداد میں ۴۲ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ سال حال اراکین کے ذمے ۱۱۲۶ روپے واجب الوصول ہیں اسطرح اوسط قرضہ فی رکن ۴۵,۰۴ روپے ہے۔ مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے انجمن کا قرض ۲,۸ فیصد ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ سرکاری ذرائع قرض سے ۱۴۹۶ روپے حاصل کئے گئے ہیں جو کہ جملہ قرض (۴۰۸۲۵) کا ۳,۷ فیصد ہے۔

(ب) خانگی ذرائع قرض ——— خانگی یا غیر سرکاری ذرائع قرض سے ہماری مراد ساہوکار ہیں موضع زیر بحث میں جملہ ۲۲ ساہوکار ہیں[۵] جن میں سے ۳ مسلمان اور ۱۹ ہندو ہیں۔ بالفاظ دیگر ۱۴ فیصد مسلمان اور ۸۶ فیصد ہندو ساہوکار ہیں۔ ساہوکاروں کی ایک دوسری تقسیم ۲ طرح پر کیجا سکتی ہے۔ مقامی اور غیر مقامی جملہ ۲۲ ساہوکاروں میں سے صرف ۷ یا تقریباً ۳۲ فیصد مقامی ساہوکار ہیں۔ باقی ۱۵ یا ۶۸ فیصد غیر مقامی ہیں۔

غیر مقامی ساہوکار اس میں شک نہیں کہ مقامی ساہوکاروں کے مقابل دوگنے سے زاید ہیں لیکن اسکے باوجود انکا دیا ہوا قرض (۹۵۰۶) مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے صرف ۲۳ فیصد ہے۔ مقامی ساہوکار گو تعداد میں کم ہیں لیکن ۷۲ فیصد قرض (۲۹۲۹۸) انہیں سے متعلق ہے۔ اس فرق کی اہم وجہ مقامی اور غیر مقامی ساہوکاروں کی شخصی واقفیت ہے۔ مقامی ساہوکار چونکہ ہر دیہاتی کو اچھی طرح جانتے ہیں لہذا حالات کے مدنظر ہر شخص کو اس کی حیثیت کے موافق قرض دیا جاتا ہے۔ برعکس اسکے غیر مقامی ساہوکار صرف انہیں آسامیوں کو قرض دیتے ہیں جن سے وہ بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ وصولات کی دقتیں بھی غیر مقامی ساہوکاروں کو زیادہ قرض دینے سے روکتی ہیں۔

یہ ایک ضمنی بحث تھی کہ کونسے ساہوکار (مقامی یا غیر مقامی) زیادہ قرض دیتے ہیں۔ ساہوکار

---

[۵] مقالہ کے ساتھ جو دوسرا ضمیمہ شامل ہے اسمیں جملہ ساہوکاروں کی فہرست دی گئی ہے۔

خواہ وہ مقامی ہوں یا غیر مقامی زرعی مالیات میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس اہمیت کا اندازہ حسب ذیل اعداد سے ہوسکتا ہے۔

ذرائع قرض		مقدار رقم		فی صد	
الف۔ وہ قرض جو سرکاری ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے۔					
(۱) تقاوی	۳۷۰	۱۴۹۶	۰٫۹	۳٫۷
(۲) انجمن امداد باہمی	۱۱۲۶		۲٫۸	
ب۔ وہ قرض جو خانگی ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے۔					
(۱) جو مقامی ساہوکاروں سے لیا گیا ہے۔	۲۹۲۹۸	۳۹۳۲۹	۷۲	۹۶٫۳
(۲) جو غیر مقامی ساہوکاروں سے لیا گیا ہے۔	۹۵۰۶		۲۳	
(۳) جو عزیز و اقارب سے لیا گیا ہے۔	۵۲۵		۱٫۳	
جملہ		۴۰۸۲۵		۱۰۰

مندرجۂ بالا اعداد سے واضح ہے کہ مجموعی قرض (۴۰۸۲۵) کا لحاظ کرتے ہوئے ۳٫۷ فیصد قرض سرکاری ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے۔ ۹۶٫۳ فیصد قرض خانگی ذرائع سے۔ خانگی ذرائع قرض میں صرف ۱٫۳ فیصد قرض عزیز و اقارب سے بطور قرض حسنہ لیا گیا ہے۔ اور باقی ۹۵ فیصد قرض مقامی و غیر مقامی ساہوکاروں سے متعلق ہے۔ ان حالات کے تحت ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ساہوکاری زرعی مالیات کی روح رواں ہیں۔

۲۔ قرض کے وجوہ ذرائع قرض کی تشریح کے بعد اب ہم یہ دریافت کرینگے کہ موضع زیر بحث میں کن مختلف وجوہات کیلئے قرض لیا جاتا ہے۔ ہمارے جمع کردہ اعداد کے مطابق وجوہ قرض کو اختلف مدات کے تحت تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ۱۔ شادی بیاہ ۲۔ تعمیر مکانات ۳۔ سابقہ قرضوں کی ادائی ۴۔ قرضہ بوجوہات نامعلوم ۵۔ خریدی بیل وغیرہ ۶۔ لاگوڑ (اخراجات کاشت کو مقامی زبان میں لاگوڑ کہا جاتا ہے) ۷۔ تجارت وغیرہ ۸۔ مالگزاری کی ادائی ۹۔ موت مٹی ۱۰۔ خوراک ولباس ۱۱۔ عقاید کی بجاآوری۔ ذیل کے

اعداد میں اس امر کی صراحت کیگئی ہے کہ ۴۰۸۲۵ روپیوں میں کسقدر قرض مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر لیا گیا ہے۔

نشان	قرضہ بوجہ	مقدار قرض	فی صد
۱	شادی بیاہ	۹۰۲۳	۲۲
۲	تعمیر مکانات	۶۶۶۰	۱۶
۳	سابقہ قرض کی ادائی	۴۶۹۰	۱۱
۴	نامعلوم	۴۱۶۱	تقریباً ۱۱
۵	خریدی بیل وغیرہ	۴۰۵۲	۱۰
۶	لاگوڑ (اخراجات کاشت)	۳۵۲۷	۹
۷	تجارت وغیرہ	۳۳۴۰	۸
۸	مالگذاری	۲۷۱۱	۷
۹	موت مٹی	۱۳۱۰	۳
۱۰	خوراک ولباس	۹۲۶	۲
۱۱	عقاید کی بجائی	۴۲۵	۱
جملہ	....	۴۰۸۲۵	۱۰۰

(۱) شادی بیاہ۔ موضع زیر بحث میں شادیاں نہ صرف قبل از وقت کیجاتی ہیں بلکہ قرض لے کر کیجاتی ہیں۔ سالگذشتہ کوئی ۱۳ شادیاں کی گئیں[۵۱] جنمیں سے ایک شادی بلا حصول قرض کیگئی ورنہ باقی تمام شادیوں میں کچھ نہ کچھ قرض ضرور لیا گیا۔ فی نفسہ شادی کے اخراجات بہت زیادہ نہیں ہوتے۔ لیکن جس شرح پہ قرضے لئے جاتے ہیں وہ بہت تباہ کن (آئندہ عنوان میں ہم شرح قرض کا مفصل حال بیان کرینگے) ہوتی ہے۔ زاید شرح سود اور قرض کی رقم بتدریج جمع ہو کر ایک کی بجائے چار ہو جاتی ہے اور غریبوں کیلئے وبال جان ثابت ہوتی ہے۔ شادی بیاہ کے موجودہ قرض (۹۰۲۳) میں نہ معلوم جمع شدہ سود کا کسقدر جزو شامل ہے!

[۵۱] ضمیمہ میں ان افراد کی فہرست دیگئی ہے جنہوں نے سالگذشتہ شادیاں کیں

(۲) تعمیر مکانات ۔ شادی بیاہ سے قبل تقریباً ہر دیہاتی کی یہ فکر ہوتی ہے کہ حتی الامکان اپنے مکان کی حالت ٹھیک کرے ۔ جو افراد کہ جھونپڑیوں میں رہتے ہیں انکی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایک کمرے والا سفال پوش مکان بنایا جائے اسیطرح وہ افراد جو ایک کمرے والے مکانات میں رہتے ہیں اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ مکان کو نسبتاً وسیع کیا جائے ۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ ہے کہ گذشتہ ۱۰ سال کے عرصے میں اکثر جھونپڑیاں ایک کمرے والے مکانات میں تبدیل ہوگئی ہیں اور بعض ایک کمرے والے مکانات وسیع تر کردئیے گئے ہیں ۔ حالات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیہاتیوں کو تعمیر مکان کا بہت شوق ہے ۔ اس شوق کی تکمیل بذریعہ قرض کی جاتی ہے ۔ اور قرض کا سلسلہ مدتوں چلتا رہتا ہے ۔ ہم اس بات پر معترض نہیں کہ مکانات کیوں تعمیر کئے جاتے ہیں ۔ ہمارا اعتراض اس امر پر ہے کہ ان مکانات کی تعمیر اعلیٰ شرح سود پر قرض حاصل کرکے کیجاتی ہے ۔ اس اعلیٰ شرح کی وجہ سے دیہاتیوں کو مدتوں پریشانی اٹھانی پڑتی ہے ۔

(۳) سابقہ قرضوں کی ادائی ۔ پیچھے یہ بتایا جاچکا ہے کہ ۲۱۱ مقروض خاندانوں میں سے ۷۷ فی صد افراد دو تا بارہ مختلف ساہوکاروں کے مقروض ہیں ۔ ان کی آمدنیاں چونکہ محدود ہوتی ہیں لہذا ہر ساہوکار کے مطالبات کو ذاتی آمدنی سے پورا نہیں کیا جاسکتا ترکیب یہ کی جاتی ہے کہ ایک ساہوکار سے قرض لیکر دوسرے کو اور بعض مرتبہ تیسرے سے قرض لیکر چوتھے کو ادا کیا جاتا ہے ۔ اس ترکیب کی وجہ سے اس میں شک نہیں کہ ساہوکاروں کی ادائگی ہوتی رہتی ہے ۔ لیکن قرضوں کا حقیقی بار گھٹتا نہیں بلکہ بتدریج بڑھتا جاتا ہے ۔ فرق صرف اسقدر ہوتا ہے کہ قرض کی رقم ایک کھاتے سے دوسرے کھاتے میں منتقل ہوجاتی ہے ۔

(۴) قرضہ بوجوہات نامعلوم ۔ اکثر قرضے اس نوعیت کے تھے کہ جنکے متعلق یہ نہیں معلوم کیا جاسکا کہ وہ کن اغراض کے تحت حاصل کئے گئے تھے ۔ لہذا ایسے تمام قرضوں کو "قرضجات بوجوہ نامعلوم" میں شامل کیا گیا ہے ۔

(۵) خریدی بیل و بھینسے ۔ کسانوں کو خریدی بیل و بھینسے وغیرہ کیلئے آئے دن قرض کی ضرورت لاحق ہوتی ہے ۔ چنانچہ مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے ۱۰ فیصد قرض اسی احتیاج سے متعلق ہے ۔ بیل یا بھینسے کے فوت ہونے پر کسان اسبات پر مجبور ہوتا ہے کہ دوسرا جانور خریدے ورنہ زراعتی کاروبار نہیں چل سکتے ۔

(۶) لاگوڑ (اخراجات کاشت) ۔ اخراجات کاشت مثلاً مینڈھ بندی باڑ لگائی ، کلپائی ، وغیرہ کیلئے

قلیل المقدار قرضے (مثلاً ۵ - ۱۰ - ۱۵) حاصل کئے جاتے ہیں۔ کٹائی فصل کے لئے بھی قرض حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ قرضے عام طور پر چھوٹے چھوٹے ساہوکاروں سے لئے جاتے ہیں۔

(۷) تجارت وغیرہ۔ تجارتی قرضے بیشتر جلاہوں۔ دھنگروں۔ گولیوں اور دھوبیوں سے متعلق ہیں بعض جلاہے نہ صرف کپڑا بنتے ہیں بلکہ گرنی کے بنے ہوئے کپڑوں کی تجارت بھی کرتے ہیں جس کے لئے قرض لیا جاتا ہے۔ دھنگر بکروں کی تجارت کیلئے قرض لیتے ہیں۔ گولیوں کو پھلوں کی تجارت اور مختلف قسم کے گنّوں کے لئے قرض درکار ہوتا ہے۔ دھوبی دھان کا بیوپار کرتے ہیں۔ مزید برآں گدھے خرید کر حمل ونقل کا کام انجام دیتے ہیں۔ تجارتی قرضے جوکہ مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے ۸ فیصد ہیں کلیتہً پیداوار قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

(۸) مالگذاری۔ جب کہ فصلیں خراب ہوجاتی ہیں تو قیمت پیداوار سے اخراجات کاشت اور مالگذاری بھی نہیں وصول ہوسکتی۔ لہذا مالگذاری کی ادائی بذریعہ قرض کیجاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر جب کہ فصلیں خراب ہوجاتی ہیں حکومت کی جانب سے ایک مناسب رقم معاف بھی کیجاتی ہے تاکہ رعایا پریشان نہونے پائے۔

(۹) موت مٹی۔ ہمارے دیہاتیوں کی بے سروسامانی کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ انہیں پیدائش سے لیکر موت تک تقریباً تمام کاروبار کے لئے قرض لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ موت مٹی اور اس سے متعلقہ امور کی تکمیل سے متعلق قرض ۱۳۱۰ روپیہ یا تقریباً ۳ فیصد ہے۔

(۱۰) خوراک ولباس۔ اکثر کسان خوراک ولباس کی خاطر بھی قرض لیتے ہیں۔ دھان ساہوکاروں سے قرض لئے جاتے ہیں اور کپڑا جولاہوں سے۔ مجموعی قرض کے تناسب سے صرف ۲ فیصد قرض خوراک و لباس سے متعلق ہے۔

(۱۱) عقاید کی پابجائی۔ دیہاتیوں کے عقاید بھی ایک حد تک ان کی مقروضیت کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ جب کبھی کوئی شخص بخار وغیرہ میں مبتلا ہو تو "فال" کے ذریعہ بیماری کا سبب معلوم کیا جاتا ہے۔ کسی شخص کے مکان میں اگر کوئی فوت ہوجائے اور اس کے بعد دوسرا شخص بیمار ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ اس شخص پر فوت شدہ شخص نے اثر کرلیا ہے۔ اس اثر کو دور کرنے کیلئے فوت شدہ شخص کے نام پر بکرا ذبح کیا جاتا ہے[۱]۔ اگر کسی شخص کی بیماری دوا سے کم نہو تو نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ مریض پر شیطان کا اثر ہوگیا ہے[۲]۔ اس اثر سے نجات

۱،۲ - ضمیمہ میں اسکے متعلق بیانات شامل کئے گئے ہیں۔

پانے کے لئے شیطان کے نام پر بکرے کی قربانی ویجاتی ہے۔ موضع ہذا کے دیہاتیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ شیطانی اثرات نہ صرف انسانوں بلکہ جانوروں پر بھی ہوتے ہیں۔ اگر بیل یا بھینسے یکایک بیمار ہوجائیں تو خیال کیا جاتا ہے کہ جانور پر شیطان کا اثر ہے۔ لہذا شیطان کو منانے کے لئے اُسکے نام پر بکرے کا ذبح کیا جانا لازمی قرار دیا جاتا ہے۔ مزید برآں ان کا یہ بھی اعتقاد ہے کہ فصل کی کٹائی سے قبل یا کٹائی کے بعد نیائی سے پہلے میٹمی (دیوی کا نام) کے نام پر بکرا ذبح کرنے سے غلے کی مقدار میں زیادتی ہوجاتی ہے۔ واضح رہے کہ بکروں کی قربانی عموماً بذریعہ قرض کی جاتی ہے۔ چنانچہ ۵۲۵ روپیہ یا ایک فیصد قرض انہی قربانیوں وغیرہ سے متعلق ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق سالگذشتہ ایک سال کے عرصے میں ۲۴۶ مکانات میں سے ۴۳ یا تقریباً ۱۹ فیصد مکانات میں شیطانوں وغیرہ کے نام پر بکرے ذبح کئے گئے۔[۵۱] نہ صرف انپڑھ بلکہ پڑھے لکھے افراد بھی انہی عقاید کے تابع (خواہ کسی وجہ سے کیوں نہو) نظر آتے ہیں۔

۳۔ قرض کی شرحیں وجوہ قرض کی تشریح کے بعد اب ہم اپنی توجہ شروح قرض کی طرف مبذول کرینگے۔ موضع زیر بحث میں ۳ قسم کی شرحیں (الف۔ خالص رقمی شرح (ب) خالص جنسی شرح (ج) مخلوط شرح مروج ہیں۔

قبل ازیں ہم بتا چکے ہیں کہ ۴۰۸۲۵ روپیوں میں سے (جو کہ موضع کا جملہ قرض ہے) ۵۲۵ یا ۱۳ فیصد قرض غیر سودی ہے۔ سودی قرضہ ۴۰۳۰۰ یا ۹۸٫۷ فی صد ہے۔ ذیل کے اعداد میں اس امر کی وضاحت کیگئی ہے کہ ۴۰۳۰۰ روپے سودی قرض میں سے کسی قدر رقم مذکورہ بالا ۳ شرحوں سے متعلق ہے۔ بلحاظ مجموعی قرض ان رقومات کا فیصد بھی دیا گیا ہے۔

	رقم جو قرض دی گئی	فیصد
(الف) خالص رقمی شرح پر	۱۳۷۰۰	۳۳٫۶
(ب) خالص جنسی شرح پر	۴۰۹۰	۱۰
(ج) مخلوط شرح پر	۲۲۵۱۰	۵۵٫۱
جملہ	۴۰۳۰۰	۹۸٫۷

[۵۱] ضمیمہ دوم میں یہ بیانات شامل ہیں اور ان تمام افراد کی فہرست دیگئی ہے۔ جنہوں نے سالگذشتہ شیطانوں وغیرہ کے نام پر بکرے ذبح کئے۔

مندرجہ صدر اعداد سے واضح ہو رہا ہے کہ ۴۰.۳۰ یا ۷،۹۸ فیصد قرض میں سے ۳۷.۰۰ یا ۳۴،۲۶ فیصد قرض خالص رقمی شرح پر حاصل کیا گیا ہے۔ ۴۰.۹۰ یا ۱۰ فیصد قرضہ خالص جنسی شرح سے متعلق ہے ۔ باقی ۲۲.۵۱۰ یا ۱۱.۵۵ فیصد قرضہ مخلوط شرح پر حاصل کیا گیا ہے۔ شروحات کے اس تجزیہ کے بعد اب ہم یہ دریافت کرینگے کہ متذکرہ ہر سہ شروحات کے تحت کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ کسقدر سود وصول کیا جاتا ہے۔

(الف) خالص[1] رقمی شرح اور مقدار سود ــــ خالص رقمی شرح کے تحت کم سے کم ۶ اور زیادہ سے زیادہ ۳۶ فیصد سالانہ سود وصول کیا جاتا ہے۔ صرف تقاوی کے قرضے ۶ فیصد سالانہ کے حساب سے دیے جاتے ہیں انجمن امداد باہمی سے ۹ روپیہ ۶ آنے فیصد کی شرح سے قرض ملتا ہے۔ ساہوکار کم سے کم بارہ اور زیادہ سے زیادہ ۳۶ فیصد سالانہ کی شرح سے سود وصول کرتے ہیں[2]۔

(ب) خالص جنسی شرح اور مقدار سود ــــ جنسی شرح سود وصول کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔

جنسی شرح سود وصول کرنے کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ اگر ابتدائے فصل پر ایک روپیہ قرض دیا جائے تو طرفین کی قرارداد کے مطابق فصل کے اختتام پر آتا ۲ پائیلی دھان بطور سود وصول کئے جاسکتے ہیں[3]۔ ایک پائیلی دھان کی قیمت ۳ آنے ۶ پائی سے لیکر ۳ آنے ۹ پائی تک رہا کرتی ہے۔ لہذا ۲ پائیلی کی قیمت ۷ آنے سے لیکر ۷ آنے ۶ پائی ہوگی۔ جبکہ ایک روپیے پر ایک فصل (اوسطاً ۶ ماہ) میں ۳ آنے ۶ پائی سے لیکر ۷ آنے ۶ پائی سود (بشکل زر) لیا جائے تو فیصد سالانہ شرح ۴۵، ۴۳ سے لیکر ۵،۷، ۹۳ فیصد سالانہ ہوگی۔ مقامی زبان میں قرض دہی کے اس طریق کو "پیچل" کہا جاتا ہے۔

جنسی شرح سود وصول کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر ابتدائے فصل پر ایک من دھان دیے جائیں تو اختتام فصل پر سوا من سے لیکر ڈیڑھ من تک وصول کئے جاتے ہیں۔ گویا ایک من پر ایک فصل کیلئے پاؤ من سے لیکر

---

[1] خالص رقمی شرح سے مراد وہ شرح ہے جو کلیتہً بشکل زر وصول کیجائے۔ [2] ضمیمہ دوم میں یہ بیانات شامل ہیں۔ ساہوکاروں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ کم سے کم خالص رقمی شرح ۱۲ فیصد اور زیادہ سے زیادہ ۳۶ فیصد وصول کرتے ہیں۔

[3] دوسرے ضمیمہ میں یہ بیانات شامل ہیں۔ ساہوکاروں کو اعتراف ہے کہ وہ فی روپیہ ہر فصل پر آتا ۲ پائیلی دھان وصول کرتے ہیں۔ . . . . آسامیوں نے بیان کیا ہے کہ وہ اس شرح پر قرض لیتے ہیں۔

آدہ من تک سود وصول کیا جاتا ہے۔ جسکی فیصد شرح مختلف نرخوں کا لحاظ کرتے ہوئے (بشکل زر) ۵۰ فیصد سے لیکر ۱۰۰ فیصد تک رہا کرتی ہے۔

جنسی شرح سود وصول کرنے کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ابتدائے فصل پر اگر ۲ روپیہ قرض دئیے جائیں تو آسامی سے وعدہ لیا جاتا ہے کہ وہ اختتام فصل (اوسطاً ۶ ماہ) پر ایک من دھان دے[۱] ۔ ایک من دھان کا نرخ ۳ روپیہ ۸ آنے سے لیکر ۳ روپے ۱۲ آنے تک رہا کرتا ہے۔ جبکہ ساہوکار اوسطاً ۶ ماہ قبل ۲ روپے قرض دے کر ۳ روپیہ ۸ آنے تا ۳ روپیہ بارہ آنے کا مال وصول کرے تو اسکے یہ معنی ہوئے کہ وہ ۲ روپیوں پر ۶ ماہ میں ایک روپیہ آٹھ آنے تا ایک روپیہ ۱۲ آنے سود (بشکل زر) وصول کر رہا ہے۔ جسکی فیصد سالانہ شرح ۱۵۰ روپیوں سے لیکر ۱۷۵ روپیہ تک رہا کرتی ہے۔ مقامی زبان میں قرض دہی کے اس طریق کو " لاونی " کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

جنسی شرح سود وصول کرنے کا چوتھا طریقہ (جسکو ہم لاونی و پکّل کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں) یہ ہے کہ ساہوکار آسامی کو کچھ روپیہ قرض دینے کے بعد اس سے وعدہ لیتا ہے کہ قرض دئیے ہوئے روپیوں میں سے نصف روپیوں کا مال ایک مقررہ نرخ (جو کہ بازار سے عموماً ۴۵ تا ۵۰ فیصد کم ہوتا ہے) سے فروخت کرے نصف روپیوں پر فی روپیہ فی فصل ایک پائیلی (واضح رہے کہ ایک پائیلی ۴ سیر کے مساوی ہوتی ہے) دھان ادا کرے۔

اس طریق کی عملی مثال میں مسمی ڈیو پوجی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس نے ایک ساہوکار سے ۱۴ روپیہ قرض حاصل کئے۔ ساہوکار سے وعدہ کیا کہ ۱۴ روپیوں میں سے نصف روپیوں، یعنی سات روپے کے دھان ۲ روپیہ فی من کے حساب سے فروخت کریگا (جبکہ بازار میں دھان کا نرخ ۳ روپیہ آٹھ آنے سے لیکر ۳ روپیہ ۱۲ آنے تک رہا کرتا ہے) اور باقی ۷ روپیوں پر فی فصل ایک پائیلی دھان ادا کریگا[۲] ۔

اس قرارداد کے مطابق آسامی کا فریضہ ہے کہ وہ ۷ روپیوں میں ساڑھے تین من دھان فروخت کرے جنکی بازاری قیمت حسب حالات ۱۲ روپیہ ۴ آنے سے لیکر ۱۳ روپیہ ۸ آنے ہوتی ہے اور فی روپیہ ایک پائیلی کے حساب سے ۷ روپیوں پر ۷ پائیلی دھان دے۔ ۷ پائیلی دھان کی قیمت حسب حالات ایک روپیہ آٹھ آنے چھ پائی سے

---

۱ ۔۔۔۔۔۔ ساہوکاروں نے بیان کیا ہے کہ وہ قرض دیگر کن معاملات کے تحت مال خریدتے ہیں۔۔۔۔۔۔

۲ ۔۔۔۔۔۔ آسامی کے بیان کی تصدیق ہمنے ساہوکار سے بھی کی ہے۔۔۔۔۔۔

لے کر ایکروپیہ ۰ آنے ۳ پائی تک رہا کرتی ہے۔ اسطرح ساہوکار کو ۱۴ روپیوں پر ایک فصل (اوسطاً ۶ ماہ) میں ۶ روپیہ ۱۲ آنے ۶ پائی سے لیکر ۸ روپیہ ۲ آنے ۳ پائی تک سود (بشکل زر) ملتا ہے جسکی فیصد سالانہ شرح سود ۹۶ء۸ سے لیکر ۱۱۶ء۳ رہا کرتی ہے۔

ان حالات کے تحت جنسی شرح سود کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ (بشکل زر) کم سے کم ۴۵ و ۴۳ اور زیادہ سے زیادہ ۱۷۵ فیصد سالانہ رہا کرتی ہے۔

(ج) مخلوط شرح اور مقدار سود۔ خالص رقمی اور خالص جنسی شرحوں کی تشریح کے بعد اب ہم مخلوط شرح کے حالات دریافت کرینگے۔ مخلوط شرح سے ہماری مراد وہ شرح ہے جسکا ایک حصہ بشکل زر حاصل کیا جائے اور دوسرا بشکل جنس اس طریق کے تحت اگر ایک ساہوکار کسی آسامی کو ۱۰۰ روپیے قرض دے تو وہ اس سے وعدہ لیتا ہے کہ قرض دی ہوئی رقم کی نصف مقدار پر بشرح مقررہ رقمی سود ادا کرے۔ باقی نصف رقم کا مال بہ نرخ مقررہ فروخت کرے رقمی شرح سود کم سے کم ایک فیصد اور زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ فیصد ماہانہ وصول کیجاتی ہے۔ مال کم سے کم ۲۰ اور زیادہ سے زیادہ ۵۰ فیصد تخفیف کے ساتھ خریدا جاتا ہے۔ ہم نے حساب لگایا ہے کہ موضع زیر بحث میں مخلوط شرح (کلیتہً بشکل زر) کم سے کم ۳۱ فیصد اور زیادہ سے زیادہ ۱۱۰ فیصد سالانہ رہا کرتی ہے۔

بحیثیت مجموعی (مذکورہ ہر سہ قسم کی شرحوں کا لحاظ کرتے ہوئے) شرح ہائے قرض کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ کم سے کم شرح سود ۶ فیصد اور زیادہ سے زیادہ ۱۷۵ فیصد سالانہ ہے۔

مسئلۂ قرض داری کے بغور مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ بار قرض سے کہیں زیادہ اہم اور توجہ طلب مسئلہ شرحہائے قرض کا ہے۔ جنکی غیر معمولی زیادتی کی وجہ سے اگر ایک طرف آسامی مفلس و نادار ہوتے جاتے ہیں تو دوسری طرف ساہوکاروں کا تموّل بڑھتا جاتا ہے۔ اعلی شرح سود کی وجہ سے مزارعین کی آمدنی قابل لحاظ طور پر گھٹ جاتی ہے۔ تخفیف آمدنی کا براہ راست اثر انکے معیار زندگی پر پڑتا ہے۔

لہ۔ دوسرے ضمیمہ میں یہ بیان درج ہے جسمیں ساہوکار نے بیان دیا ہے کہ ابتداءً اسنے تقریباً ایک ہزار روپیے کے سرمایہ سے لین دین و تجارت کا کاروبار شروع کیا لیکن اب اسکی جائداد ۲۰۔۲۵ ہزار ہے۔

نوٹ:۔ تقریباً تمام ساہوکاروں کی ترقی کا یہی حال ہے۔

دسویں فصل اصلاحی تدابیر

دوسری فصل میں بتلایا گیا ہے کہ موضع زیر بحث کے باشندوں کا معیار زندگی بحیثیت مجموعی ادنیٰ اور معمولی ہے۔ اسی فصل کے آخری پارے میں ادنیٰ معیار زندگی کی سب سے اہم اور بنیادی وجہ ادنیٰ آمدنی قرار دی گئی ہے مزید برآں ادنیٰ آمدنی کے تین اہم وجوہ بتلائے گئے ہیں۔

(۱) اضافہ آبادی اور ذرائع معاش کی غیر متناسب رفتار ترقی۔ (۲) پیشوں کا فقدان اور زراعت پر زاید از ضرورت بار۔ (۳) نظام زراعت کے گوناگوں نقائص۔ مثلاً زرعی عوامل پیدایش کی غیر متناسب حالت طریقہ ہائے کاشت۔ طریقہ ہائے فروخت۔ اور طریقہ ہائے لین دین کے گوناگوں نقائص۔

زرعی عوامل پیدائش کے عدم تناسب اور غیر اصولی طریقہ ہائے کاشت کی وجہ سے اگر ایک طرف مصارف پیدایش نسبتاً زیادہ ہو جاتے ہیں تو دوسری طرف پیداوار فی ایکر بھی ادنیٰ اور معمولی ہوتی ہے مصارف پیدایش کی نسبتاً زیادتی اور پیداوار کے معمولی ہونیکی وجہ سے آمدنی میں بھی نسبتاً تخفیف ہو جاتی ہے ناقص طریقہ ہائے فروخت کی بناء پر آمدنی میں مزید تخفیف ہوئی ہے۔ ناقص طریقہ ہائے لین دین اور اعلیٰ شرح سود کی بدولت آمدنی میں اور بھی تخفیف ہو جاتی ہے۔ ادنیٰ اور معمولی آمدنی کا براہ راست اثر باشندوں کے معیار زندگی پر پڑتا ہے نتیجہ یہ کہ ادنیٰ آمدنی کی وجہ سے معیار زندگی بھی ادنیٰ اور معمولی ہو جاتا ہے۔

ان تمام حالات کی تشریح کے بعد ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باشندگان موضع ہذا کے موجودہ معیار زندگی کو کیوں کر بلند کیا جا سکتا ہے۔

معیار زندگی کو بلند کرنیکی سب سے اہم تدبیر (علاوہ دیگر امور کے) یہ ہے کہ آمدنیوں میں اضافہ کیا جائے

آمدنی میں اضافہ کے لئے حسب ذیل (الف) بالواسطہ اور (ب) بلاواسطہ تدابیر اختیار کئے جانے چاہئیں۔

(الف) بالواسطہ تدابیر ——

(۱) تخفیف آبادی —— آبادی کے قدیم اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موضع زیر بحث سنہ ۱۳۲۳ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء) ہی میں کثیر الآباد ہوگیا تھا۔ جب کہ اسکی آبادی ۱۰۳۲ تھی۔ کیونکہ سنہ ۱۳۲۳ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء) میں جب آبادی اس نقطہ پر پہنچ گئی تو کثرت آبادی اور ذرائع خوراک کی قلت کی وجہ سے مابعد سالوں میں، مالتھس کے ذکر کردہ مثبت موانعات (مثلاً ہیضہ۔ چیچک۔ طاعون اور قحط وغیرہ) کی بدولت مسلسل تخفیف شروع ہوئی چنانچہ سنہ ۱۳۲۳ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء) تا سنہ ۱۳۲۹ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء) کے سات سالوں میں بحیثیت مجموعی ۱۲۵ نفوس فوت ہوئے۔ جبکہ انہی سات سالوں میں صرف ۵۴ نفوس پیدا ہوئے۔ مزید برآں سنہ ۱۳۲۷ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۷-۱۸ء) اور سنہ ۱۳۲۸ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء) کی قحط سالیوں میں اکثر خاندان تلاش معاش کی خاطر دیگر مقامات کو منتقل ہوئے ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۳۲۹ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء) کے اختتام پر جملہ آبادی صرف ۸۸۷ رہ گئی۔ گویا سات سال کے عرصہ میں بحیثیت مجموعی ۱۴۵ نفوس کی تخفیف ہوگئی۔ لیکن سنہ ۱۳۳۰ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء) کے بعد پھر بتدریج اضافہ شروع ہوا چنانچہ سنہ ۱۳۳۵ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۲۵-۲۶ء) میں آبادی ۹۲۲ ہوگئی۔ جسکی اہم وجہ یہ تھی کہ قحط سالی کے اثرات زائل ہوجانے کی بدولت وہ افراد جو تلاش معاش کی خاطر دیگر مقامات کو منتقل ہوئے تھے دوبارہ واپس ہونا شروع ہوئے۔ سنہ ۱۳۳۵ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۲۵-۲۶ء) کے بعد بھی آبادی میں زیادتی شروع ہوئی حتیٰ کہ سنہ ۱۳۴۴ف میں آبادی ۱۱۵۴ تک پہنچ گئی۔ موجودہ آبادی سنہ ۱۳۲۳ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء) کی آبادی کے مقابل ۱۱ر۸۲ فی صد زیادہ ہے۔ آبادی میں مناسب تخفیف یا ذرائع معاش میں مناسب اضافہ نہ کیا جائے تو پھر اس بات کا امکان ہے کہ مالتھس کے ذکر کردہ مثبت موانعات (مثلاً ہیضہ۔ چیچک۔ طاعون اور قحط وغیرہ) کے ذریعہ آبادی میں تخفیف ہوگی۔ موضع ہذا میں کثرت آبادی کا اندازہ اس امر سے بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں فی مربع میل ۳۶۱ نفوس پرورش پارہے ہیں حالانکہ ماہرین نے تخمینہ[۵۱] کیا ہے کہ اگر زراعت سے بہتر سے بہتر استفادہ کیا جائے تو

۵۱۔ م معاشیات ہند مصنفہ جتھار اینڈ بیری ایڈیشن سنہ ۱۹۳۳ء صفحہ (۴۰)

اس کے ذریعہ فی مربع میل ۲۵۰ نفوس ایک معقول معیار آرام پر زندگی بسر کرسکتے ہیں۔

ان حالات کے تحت بہتر اور مناسب یہی ہے کہ موضع زیر بحث کے باشندوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے اور آئندہ کیلئے مثبت موانعات کے عمل درآمد کو روکنے کے لئے آبادی میں تخفیف کی جائے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ آبادی میں تخفیف کی جائے تو اس کے ساتھ ہی دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ آبادی میں کسقدر تخفیف کی جانی چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ یہ تخفیف کیونکر کی جاسکتی ہے۔

پہلے سوال کا جواب بہت ہی وقت طلب ہے۔ کسی مقام کی متوازن آبادی کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں قائم کی جاسکتی۔ بالفاظ دیگر قطعی طور پر یہ نہیں بتلایا جاسکتا کہ اگر کسی مقام کی آبادی اسقدر ہے تو وسایل معاش اسقدر ہونے چاہئیں۔ تاہم تخمینہ کے ذریعہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ موضع زیر بحث کی متوازن آبادی ۸۰۷ ہونی چاہیئے (اس تخمینہ کا قطعیت کے ساتھ صحیح ہونا ضروری نہیں) کیونکہ ۱۳۲۳ف (م اکتوبر ۱۹۱۳ء) کے بعد گوناگوں مثبت موانعات کی بدولت آبادی گھٹتے گھٹتے ۸۰۷ ہوگئی۔ اگر آبادی میں تخفیف کی مزید گنجائش ہوتی تو مثبت موانعات آبادی کو ۸۰۷ سے بھی زیادہ گھٹا دیتے لیکن۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ آبادی میں بتدریج اضافہ ہوتا ہے۔ جب کہ آبادی کی تعداد ۸۰۷ سے بڑھنے لگتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ موضع زیر بحث کے ذرائع معاش میں ۸۰۷ نفوس سے زاید افراد کو ایک معقول معیار آرام پر پرورش کرنے کی گنجائش ہے بلکہ اس زیادتی کی بنیادی وجہ ذرائع خوراک کی تحدید اور اضافہ آبادی کے مضر اثرات سے لاعلمی کا نتیجہ ہے[ف]۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ موضع زیر بحث کے موجودہ وسائل سے ۲۵۰ نفوس فی مربع میل ایک معقول معیار آرام پر زندگی بسر کرسکتے ہیں تو موضع کی جملہ زراعت پیشہ آبادی ۸۱۳ ہونی چاہیئے۔ جیسا کہ ہم اس سے قبل کہہ چکے ہیں کہ متوازن آبادی کو قطعی طور پر نہیں بتلایا جاسکتا۔ محض تخمینے اگر ایک طرف صحت سے کسقدر قریب ہوتے ہیں تو دوسری طرف اسکا بھی امکان ہوتا ہے کہ وہ صحت سے بہت دور ہوں۔ اس مجبوری کے تحت ہم موضع زیر بحث کی کوئی متوازن آبادی قطعیت کے ساتھ نہیں بتلاسکتے تاہم حالات حاضرہ کا لحاظ کرتے ہوئے اتنا ضرور کہینگے کہ موجودہ آبادی میں

ف۔ اس قانون کی لاعلمی یا علم ہونے کے باوجود اس کی جانب سے لاپرواہی کی بنا پر ذرائع معاش کی تحدید کے باوجود آبادی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ ایک حد معینہ کے بعد مثبت موانعات اثر پذیر ہوکر آبادی کو قابل لحاظ طور پر گھٹا دیتے ہیں۔

ایک مناسب اور موزوں تخفیف ہونی چاہیئے۔

جب ہم یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ موجودہ آبادی میں ایک موزوں و مناسب تخفیف کیجانی چاہیئے تو پھر ہم دوسرے سوال سے دوچار ہوتے ہیں یعنی یہ کہ یہ تخفیف کیونکر کیجا سکتی ہے۔ اس تخفیف کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں یا تو یہ کہ موجودہ نفوس میں سے ایک قابل لحاظ نفوس کی تعداد کو ہلاک کر دیا جائے (اگر ہم نہ کریں تو قحط اور وبائیں اس کام کو پورا کرتی ہیں) یا یہ کہ انہیں ایک ایسے مقام پر منتقل کیا جائے جہاں کافی ذرائع معاش موجود ہیں۔ جہاں تک کہ پہلی تدبیر کا تعلق ہے موجودہ حالات کے تحت وہ قطعاً ناممکن ہے البتہ دوسری تدبیر پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ ریاست کے ایسے مقامات میں جو غیر آباد ہیں موضع ہذا کے قابل لحاظ افراد کو (مختلف تحریصات اور سہولتیں بہم پہنچا کر) وہاں منتقل کرنا چاہیئے۔ جہاں تک کہ آئندہ پیدائشوں کا تعلق ہے اُن پر سختی سے تحدید کیجانی چاہیئے۔ بچپن کی شادیاں قطعی طور پر ممنوع قرار دیجائیں جب تک کہ اس قسم کی سختی نہ کیجائے اعلیٰ شرح پیدائش کی تحدید دقت طلب امر ہے۔ مانا کہ اس ممانعت کی وجہ سے لازمی طور پر عام بے چینی (خصوصاً دیہاتیوں میں) پیدا ہوگی لیکن موزوں و مناسب تدابیر کے ذریعہ ایک مدت معینہ میں اس کو کلیتہً رفع کیا جا سکتا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کیلئے نہ صرف اس امر کی ضرورت ہے کہ بچپن کی شادی کے طریق کو روکا جائے بلکہ موثر پروپگنڈے کے ذریعہ افراد کو سمجھایا جائے کہ وہ اس وقت تک شادیاں نہ کریں جبتک کہ وہ اپنے اہل و عیال کو ایک معقول معیار آرام پر پرورش کرنے کے قابل نہ ہوں۔ ہماری اس آخری تجویز پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ لوگ شادیاں تو دیر سے کر سکتے ہیں لیکن جنسی جذبات پر بہت عرصہ تک قابو نہیں رکھ سکتے لہذا بد اخلاقی کے عام ہونے کا اندیشہ ہے جسکی بدولت دیر سے شادیاں کرنے کا مقصد فوت ہو جائیگا۔ اعتراض ایک حد تک درست ہے۔ اگر جذبات پر قابو نہیں رکھا جا سکے تو ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ شادیوں کے بعد ضبط تولید کے ذرائع اختیار کئے جائیں۔ نہ صرف موضع زیر بحث بلکہ تمام ہندوستان کیلئے ہماری قطعی رائے ہے کہ اگر ہم موجودہ معیار زندگی کو بلند کرنا چاہیں تو ہمارے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ موجودہ ذرائع سے بہتر سے بہتر استفادہ کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کیجائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آبادی کے بڑھتے ہوئے رجحان کو نہایت سختی کے ساتھ اُسوقت تک روکا جائے جبتک کہ ہم یہ محسوس نہ کرلیں کہ آبادی کی تحدید کی وجہ سے ہمیں کوئی حقیقی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

(۲) صنعتی ترقی ـــــــ آمدنیوں میں اضافہ کرنے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کیلئے تحدید آبادی کے ساتھ ساتھ ضرورت اس امر کی ہے کہ مختلف پیشوں کے مابین توازن قایم کیا جائے۔ قیام توازن کے لئے صنعتی ترقی (خواہ وہ کسی قسم کی ہو) ضروری ہے محض موضع زیر بحث کو لیکر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں صنعت پیشہ آبادی اسقدر ہونی چاہیئے اور زراعت پیشہ اسقدر۔ صنعتی ترقی کا مسئلہ کل ریاست سے متعلق ہے۔ ریاست کے ایک حصہ میں صنعتی ترقی کا اثر دوسرے حصہ پر پڑیگا۔ دوسرے حصہ میں ترقی کا اثر تیسرے حصہ پر پڑیگا اور بحیثیت مجموعی تمام ملک کے پیشوں کا لحاظ کرتے ہوئے ایک قسم کا توازن قائم ہوسکے گا۔ فی الوقت اگر موضع دوپلّی پر بحث کیجارہی ہے تو اسکے یہ معنی نہیں کہ ہم موضع دوپلّی کو ایک خود کفیل معاشی اکائی فرض کر رہے ہیں۔

(۳) تعلیمی ترقی ـــــــ دیہاتیوں کی لاعلمی انکے لئے گوناگوں مصیبتوں کا باعث بنی ہوئی ہے آئے دن اونہیں اپنی لاعلمی کی وجہ سے مختلف قسم کے مالی نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ مثلاً دیہاتی چونکہ لاعلم ہوتے ہیں لہذا اونہیں جب کبھی دفتر وغیرہ سے متعلق کوئی کام پڑتا ہے (خواہ وہ کام کسقدر معمولی کیوں نہو) تو اسکی اجرائی کے لئے کچھ نہ کچھ صرف کرنا پڑتا ہے۔ فروخت پیداوار کی حد تک دلال اونکی لاعلمی وجہالت سے فائدہ اوٹھاتے ہیں۔ اسی طرح ساہوکار بھی اونکی لاعلمی وجہالت کی بدولت جا وبیجا طور پر اونکا استحصال کرتے ہیں اپنی لاعلمی کی وجہ سے وہ یہ نہیں معلوم کرسکتے کہ وہ کس شرح فیصد پر سود ادا کر رہے ہیں۔ انہیں یہ بھی نہیں معلوم ہوسکتا کہ ساہوکار نے کھاتے میں کس قسم کا اندراج کرلیا ہے۔ کیا یہ چیز اونکی لاعلمی کیوجہ سے نہیں کہ وہ بغیر سوچے سمجھے سادھے کاغذ پر ابہام کردیتے ہیں۔ جسکی بدولت انہیں نقصان عظیم اٹھانا پڑتا ہے۔ چونکہ یہ لوگ قانون سے ناواقف ہوتے ہیں لہذا جا وبیجا طور پر آبائی قرضوں کی ادائی کرتے رہتے ہیں جسکی وجہ سے ان کی آمدنی کا کافی حصہ مستقل طور پر منہا ہوتا رہتا ہے۔ اپنی لاعلمی ہی کی بدولت وہ نہ تو اخراجات کاشت کا حساب رکھ سکتے ہیں اور نہ یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ کس جنس کی کاشت میں انہیں نسبتاً زیادہ منافع مل سکتا ہے۔ دیگر مجبوریوں کے علاوہ اپنی لاعلمی وجہالت کی بدولت گوبر کا بری طرح استعمال کرتے ہیں۔ قلت کھاد کا اثر پیداوار پر پڑتا ہے۔ اونی پیداوار کی وجہ سے آمدنی میں تخفیف ہوتی ہے۔ مزارعین کی حالت کو سدھارنے اور انہیں متذکرہ مختلف مالی نقصانات سے بچانے کیلئے تعلیم کا دیا جانا ضروری ہے تعلیم کا بالواسطہ اثر مزارعین کی بیداری پر پڑتا ہے۔ بیداری کی وجہ سے

متذکرۂ نقصانات سے بڑی حد تک سبکدوشی حاصل کیجا سکتی ہے۔ اگر دیہاتی تعلیم یافتہ اور ہوشیار ہوں تو دیہی تنظیم سے متعلق ہر قسم کی تحریک بآسانی کامیاب ہوسکتی ہے۔

جب ہم تعلیم کی اہمیت و ضرورت کو محسوس کرتے ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس قسم کی تعلیم دیجانی چاہیئے۔ موجودہ حالات کا لحاظ کرتے ہوئے نہ صرف مناسب و موزوں فنی تعلیم کا انتظام کیا جائے بلکہ حرفتی تعلیم بھی نہایت اہم و ضروری ہے خصوصاً زراعت کی تعلیم ازبس ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے کسان محنتی و جفاکش ہوتے ہیں لیکن زراعت سے متعلق انکے جسقدر معلومات ہیں وہ نہایت ہی قدیم ہیں۔ موجودہ زمانہ اسکا مقتضی نہیں کہ انہی معلومات پر اکتفا کیا جائے۔ فی زمانہ حالات بالکل بدل گئے ہیں۔ زمینات کی گھٹتی ہوئی زرخیزی کا مسئلہ بہت ہی اہم ہوگیا ہے۔ کسانوں کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ کس زمین کی کیا خاصیت ہوتی ہے (مانا کہ بعض تجربہ کار کسانوں کو اسکا علم ہوتا ہے لیکن سب کسان زمین کی خاصیت کو نہیں جان سکتے) کس قسم کی جنس کے لئے کس نوعیت کی کھاد کس مقدار میں دیجانی چاہیئے۔ مزید برآں اونہیں جانوروں اور فصلوں کی بعض معمولی بیماریوں کی خاصیت اور اونکا علاج بھی معلوم ہونا چاہیئے لیکن کسانوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقی علاج و واشت سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ فصلوں اور جانوروں کی مختلف بیماریوں کا نام تو بتلا سکتے ہیں لیکن انکا حقیقی علاج نہیں جانتے۔ زراعتی تعلیم میں کسانوں کو مذکورہ تمام باتوں کے علاوہ دیگر ضروری اور مفید معلومات سے بھی آگاہ کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک کہ باغبانی کا تعلق ہے ہمارے کسان بالکل بے بہرہ نظر آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ باغبانی کیلئے مالی مشکلات سدراہ ہوتے ہیں لیکن اگر انہیں حل بھی کیا جائے تو موجودہ حالات کے تحت ہمارے کسان کامیاب باغبانی کرنے کے قابل نہیں جبتک کہ انہیں باضابطہ تعلیم نہ دیجائے۔ باغبانی کے ذریعہ ایک قابل لحاظ تعداد معقول آمدنی کے ساتھ اپنی پرورش کرسکتی ہے۔ اگر "ڈیری فارمنگ" کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور عوام کو اس کی ترغیب دیجائے تو اس صنعت میں بھی قابل لحاظ افراد کی کھپت ہوسکتی ہے۔ بہرطور زراعتی تعلیم اس نوعیت کی ہونی چاہیئے جو تمام اجزائے زراعت پر حاوی ہو۔

جہاں تک کہ عام تعلیم کا تعلق ہے وہ کم از کم اس معیار کی ہونی چاہیئے کہ جسکی بدولت دیہاتی باضابطہ طور پر پڑھ لکھ سکیں۔ اور معمولی قسم کی سرکاری مراسلت بھی کرسکیں۔ علاوہ ازیں انہیں اتنی قابلیت بھی

ہونی چاہیئے کہ وہ مختلف اخبارات ورسائل کو پڑھ کر اپنے پیشہ سے متعلق ضروری اور مفید معلومات حاصل کرسکیں
ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ جبتک لاعلم دیہاتیوں کی تعلیم کا باضابطہ اور موثر انتظام نہ کیا جائے دیہی اصلاح سے
متعلق خاطرخواہ نتائج نہیں برآمد ہوسکتے۔ تقریباً ہر دیہات میں ایک مدرسے کا قیام ضروری ہے۔ مدرسین کی
تعداد کا مدار دیہات کی وسعت پر ہوگا۔ اسمیں شک نہیں کہ ہر دیہات میں ایک مدرسہ قائم کرنے کی وجہ سے
تعلیمی اخراجات بہت بڑھ جائینگے لیکن ان اخراجات کے بار کو بار نہ تصور کیا جائے۔ علاوہ ازیں معمر اشخاص اور
ایسے لڑکوں کی تعلیم کیلئے جنہیں دن میں فرصت نہیں ملتی تعلیم شبینہ کا انتظام کیا جائے۔ جبتک ایسا نہ ہو
عمومیت تعلیم کا مدعا سرعت کے ساتھ پورا نہیں ہوسکتا۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا بالواسطہ تدابیر کے علاوہ مزارعین کی آمدنیوں کو بڑھانے بالفاظ دیگر انکے
معیار زندگی کو بلند کرنے کیلئے حسب ذیل بلاواسطہ تدابیر کا بھی اختیار کیا جانا ضروری ہے۔

(ب) بلاواسطہ تدابیر ——

(۱) تقسیم وانتشار اراضی کی اصلاح —— زراعت کو نفع بخش بنانے کے لئے زمینات کی تقسیم اور
انتشار کو دور کرنے کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔ زرعی اراضیات کے اس نقص کی وجہ سے نہ صرف موضع زیر بحث بلکہ
تمام ہندوستان کے کسانوں کو قابل لحاظ نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ ہماری رائے میں تقسیم وانتشار اراضی کے مسئلہ کو
حل کرنے کی کارگر تدبیر یہ ہے کہ ملک کے طول وعرض میں حسب حالات مناسب وموزوں صنعتوں کو ترقی دیجائے
(ان صنعتوں کی نوعیت گھریلو ہی کیوں نہو۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ہر قسم کی صنعت کارخانہ ہی سے متعلق ہونی
چاہیئے) پیشوں کی زیادتی کا اثر بالواسطہ طور پر زراعت پر پڑیگا۔ اور لوگ زراعت اختیار کرنے کے لئے
ایسے مجبور نہ ہونگے جیسے کہ اب ہیں۔ گویا صنعتی ترقی کی وجہ سے زراعت کا موجودہ بار کم ہوگا اور تقسیم اراضی کی
سابقہ شدت برقرار نہ رہے گی۔ تحدید آبادی کا بالواسطہ اثر بھی تقسیم اراضیات کی شدت کو کم کریگا۔ کیونکہ
پیشوں کے فقدان کے ساتھ ساتھ جس سرعت سے آبادی میں اضافہ ہوگا (اشتراک خاندان کے زوال کی بدولت
اسی سرعت کے ساتھ اراضیات کی تقسیم در تقسیم عمل میں آئیگی اور تقسیم اراضیات کے ساتھ انتشار کی کیفیت بھی
بڑھتی جائیگی۔ لہذا تقسیم وانتشار اراضیات کی شدت کو روکنے کیلئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ ملک کے

طول وعرض میں مناسب حال اور موزوں صنعتوں کو ترقی دیجائے بلکہ اسکے لئے آبادی کی تحدید بھی ضروری[1] ہے۔ مزید برآں موثر پروپگنڈے کے ذریعہ مزارعین کو تقسیم و انتشار اراضیات کے حقیقی نقصانات سے واقف کرایا جائے اور انہیں اس امر کی ترغیب دیجائے کہ بزرگ خاندان کی وفات پر ہر ہر قطعۂ اراضی میں سے جداجدا حصص کرنے کی بجائے جہانتک ہوسکے اراضی کی اس طور پر تقسیم کریں کہ اسکی بدولت کم سے کم قطعات ہونے پائیں موجودہ انتشار کو کم کرنے کے لئے کسانوں کو الحاق یا اتصال اراضیات کی ترغیب دیجائے۔ چنانچہ یہ تحریک پنجاب اور صوبجات متوسط میں قابل لحاظ طور پر کامیاب ثابت ہوچکی ہے۔ پنجاب میں اس تحریک کی کامیابی کا ایک اہم سبب یہ بتلایا جاتا ہے کہ بلحاظ زرخیزی وہاں کی زمینات تقریباً یکساں ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ الحاق یا اتصال اراضیات میں اختلاف زرخیزی کی وجہ سے بہت رکاوٹ پیدا ہوتی ہے لیکن اس دقت کو بھی رفع کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ رفع کرنے کی کوشش کیجائے۔ فرض کیجئے دو کسان اپنی اراضی کے ایک قطعہ کا تبادلہ کرنا چاہتے ہیں لیکن دقت یہ ہے کہ ایک کسان کا قطعہ ۲ ایکر ہے اور دوسرے کا ڈیڑھ ایکر علاوہ ازیں اول الذکر قطعہ نسبتاً کم زرخیز ہے اور آخرالذکر نسبتاً زیادہ زرخیز۔ اگر فریقین حالات کو اچھی طرح سمجھ لیں تو ۲ ایکر اراضی (جو نسبتاً کم زرخیز ہے) کا ڈیڑھ ایکر اراضی سے (جو نسبتاً زیادہ زرخیز ہے) تبادلہ کرنا طرفین کے حق میں باعث نقصان نہ ہوگا۔ اگر طرفین یہ محسوس کریں کہ اس قسم کے مبادلہ میں ان کا نقصان ہے تو اس نقصان کی تلافی بشکل زر کیجاسکتی ہے۔ بعض کسان ایسے بھی ملینگے جو بہر حال (خواہ مبادلہ میں انکا فائدہ ہو یا نقصان) اراضی کا مبادلہ نہیں کرنا چاہتے اس قسم کے کسانوں کو قانوناً مجبور کیا جانا چاہیئے۔ جو افراد اتصال اراضی کیخاطر قطعات اراضی کا مبادلہ کریں تو ان سے رجسٹری کا معاوضہ لیا جائے بلکہ ملکیت کا اندراج طرفین کے نام پر بلا فیس کیا جائے۔ اگر فیس رجسٹری لیجائے تو یہ چیز طرفین کے حق میں بار ثابت ہوگی۔ نہ صرف یہ بلکہ اتصال اراضیات میں رکاوٹ کا باعث بنے گی۔ اتصال اراضی کا کام اگر موثر طریق پر جاری رکھا جائے تو فی الوقت قابل لحاظ اراضیات یکجا ہوسکتی ہیں جبکہ

---

[1] مختلف نقاط نظر سے ہندوستان کی موجودہ آبادی میں تحدید کی سخت ضرورت ہے۔ اگر کمزور اور نہایت ادنیٰ کارگذار آبادی میں دن بدن اضافہ ہوتا جائے تو حالات بد سے بدتر ہوتے جائینگے۔ ہمارے لئے اضافہ آبادی کا مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا برعکس اسکے افراد کی کارکردگی کو بہتر بنانے کا مسئلہ بہت اہم ہے۔

ہم نے تقسیم و انتشار اراضیات کے گوناگوں نقائص کو چند باسمجھ اور تجربہ کار کسانوں کے سامنے بیان کیا اور اتصال اراضیات کی تحریک پیش کی تو تقریباً تمام کسانوں نے اس سے اتفاق کیا بشرطیکہ اس کی وجہ سے طرفین کا کوئی حقیقی نقصان نہ ہو۔ کسانوں کو تقسیم و انتشار اراضی کے نقصانات سے بچانے کے لئے ایک طرف تو سرگرم طریق پر اتصال اراضیات کی ترغیب دیجانی چاہیئے اور دوسری طرف "مشترک کاشت" کی ترغیب بھی نہایت ضروری ہے۔ حالات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اشتراک خاندان کا طریق ہندوستان کے مختلف حصص میں دن بدن کم زور ہوتا جارہا ہے۔ موضع زیر بحث میں بھی بہت کم خاندان اس طریق پر عمل پیرا ہیں۔ سالہائے ماسبق میں ہندوستانی خاندان (بالخصوص ہندو) بالعموم مشترک طور پر دولت پیدا کرتے اور مشترک طور پر صرف کرتے تھے لیکن اب واقعات بالکل برعکس نظر آرہے ہیں۔ گوناگوں وجوہات کی بنا پر بزرگ خاندان کی وفات پر تقریباً ہر وارث یہ چاہتا ہے کہ اپنا گھر بار علیحدہ کرے۔ اس رجحان کی وجہ سے بھی تقسیم و انتشار اراضیات کا مسئلہ اہم تر ہوتا جارہا ہے۔ فی زمانہ اگر اشتراک خاندان کا طریق غیر مفید ثابت ہورہا ہے تو تقسیم و انتشار اراضیات کو حل کرنے کے لئے کم ازکم مشترک کاشت کی ترغیب دیجانی چاہیئے۔ مشترک کاشت کا طریق موضع زیر بحث کیلئے کوئی نیا طریق نہیں۔ کیونکہ بعض خاندان، اس میں شک نہیں کہ علیحدہ علیحدہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن کاشت کی حد تک مشترک نظر آتے ہیں خصوصاً گنّے کی کاشت (جسمیں زیادہ اخراجات لاحق ہوتے ہیں) بالعموم مشترکہ طور پر کیجاتی ہے کہ کولھو عام طور پر مشترکہ طور پر خریدا جاتا ہے اور مشترکہ طور پر اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ان حالات کے تحت اگر ہمارے دیہات میں کسانوں کو مشترک کاشت کے گوناگوں فوائد سے آگاہ کیا جائے اور موثر طور پر انہیں اسس، کی ترغیب دیجائے تو کوئی وجہ نہیں جو یہ تحریک کامیاب ہوتی نظر نہ آئے۔ مختصر یہ کہ صنعتی ترقی تحدید آبادی۔ اتصال اراضیات اور مشترک کاشت کی ترغیب کے ذریعہ تقسیم و انتشار اراضی کی موجودہ نوعیت کو قابلِ لحاظ طور پر کم کیا جاسکتا ہے۔ جسکی بدولت مزارعین کے مصارف کاشت میں تخفیف ہوگی بالفاظ دیگر انکی آمدنیوں میں اضافہ ہوسکے گا۔

(۲) زرعی اصل کی اصلاح ـــــ واضح رہے کہ زرعی اصل میں مویشی۔ آلات زراعت مصنوعی ذرائع آبپاشی۔ کھاد اور تخم کو شامل کیا گیا ہے۔ مزارعین کی آمدنیاں نہ صرف اراضیات کی تقسیم و

انتشار کی وجہ سے کم ہوتی ہیں بلکہ زرعی اصل کے گوناگوں نقائص کا بھی کمی آمدنی پر نمایاں اثر پڑتا ہے۔

مویشی ـــــ مویشیوں کی حد تک سب سے اہم مسئلہ انکی کارکردگی کا ہے۔ مویشیوں کی ادنیٰ کارکردگی کی وجہ سے غیر محسوس طریقہ پر مصارف کاشت بڑھ جاتے ہیں۔ مصارف کاشت کی زیادتی کا اثر آمدنیوں پر پڑتا ہے۔ لہذا آمدنیوں میں اضافہ کی خاطر نہ صرف تقسیم و انتشار اراضی کی اصلاح ضروری ہے بلکہ مویشیوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کا مسئلہ بھی اسقدر اہم ہے۔ مویشیوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کیلئے حسب ذیل تدابیر اختیار کئے جانے چاہئیں۔

الف۔ مویشیوں کی تعداد میں تخفیف۔

ب۔ مویشیوں کے رکھ رکھاؤ اور چارہ کا بہتر انتظام۔

ج۔ نسل کشی کا انتظام

د۔ علاج حیوانات کا معقول و بروقت انتظام۔

الف۔ موضع زیر بحث میں انسانی آبادی اور جانوروں کی آبادی ہر دو کے مسائل یکساں نظر آتے ہیں اگر ہم ہر دو مسائل کا تقابلی مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ہر دو صورتوں میں اگر ایک طرف ذرائع معاش محدود ہیں تو دوسری طرف آبادی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ظاہر ہے کہ تحدید خوراک اور اضافہ آبادی (خواہ وہ انسانوں کی ہو یا جانوروں کی) کا اثر قلت خوراک کی صورت میں نمودار ہوگا اور قلت خوراک کی وجہ سے کارکردگی متاثر ہوگی۔ ۱۳۳۸ف (م اکتوبر ۲۹ سنہ ۱۹۲۸ء) میں موضع زیر بحث کے جملہ زرعی وغیر زرعی جانوروں کی تعداد ۱۲۳۱ تھی لیکن اب ۱۶۹۲ ہوگئی ہے۔ اس اضافہ کے ساتھ ساتھ چاہیئے تھا کہ فی سو جانور رقبہ گاران میں بھی زیادتی ہوتی لیکن ہمیں تخفیف نظر آتی ہے۔ ۱۳۳۸ف (م اکتوبر ۲۹ سنہ ۱۹۲۸ء) میں فی سو جانور اوسط رقبہ گاران ۳۱٫۷ یکر تھا لیکن اب ۲۳٫۵ یکر ہوگیا ہے۔ موضع زیر بحث میں جانوروں کی کثرت کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں پر فی سو یکر کاشت شدہ اراضی کیلئے بحیثیت مجموعی ۱۴۹ زرعی و غیر زرعی جانور ہیں۔ حالانکہ شاہی زرعی کمیشن نے بتلایا ہے کہ برٹش انڈیا میں فی سو کاشت شدہ رقبہ کیلئے بحیثیت مجموعی (۶۷ + ۲۷) ۹۴ جانور ہیں۔ کمیشن کی رائے میں یہ تعداد زیادہ ہے۔ لیکن موضع زیر بحث میں

فی سو ایکڑ کاشت شدہ رقبہ کیلئے جانوروں کی تعداد ۱۲/۹ سے بھی بہت زیادہ یعنی تقریباً ۱۴۹ ہے۔ ان حالات کے تحت موضع ہذا کے جانوروں کی آبادی کے متعلق ہم یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ وہ کثیر الاباد ہے جانوروں کیلئے قلت خوراک کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ خوراک کی مسلسل کمی اور کثرت کار کی بدولت خصوصاً زراعتی جانوروں (جو زراعت میں براہ راست مدد دیتے ہیں) کی حالت ناگفتہ بہ نظر آتی ہے۔ لہذا ان کی کارکردگی کو بہتر بنانے کیلئے ضرورت اس امر کی ہے کہ انکی تعداد میں تخفیف کیجائے۔ پانچویں فصل میں ہم بتا چکے ہیں کہ جملہ زرعی جانوروں کا لحاظ کرتے ہوئے ۸ و ۴ فیصد جانور زیادتی عمر وغیرہ کی وجہ سے بالکل از کار رفتہ ہو گئے ہیں ان جانوروں کو قصابوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جانا چاہیئے۔ مزید برآں اسی فصل میں یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ جملہ زرعی جانوروں کا لحاظ کرتے ہوئے ۶۰،۳ فی صد جانور کارگذار ہیں۔ ۶۰،۳ فی صد کارگزار جانوروں میں سے صرف ۸،۲ فیصد معیاری ہیں اور باقی ۵۲ فی صد غیر معیاری جانور ہیں۔ ۵۲ فیصد جانوروں میں سے ۲۴،۳ فیصد جانوروں کی کارکردگی مقابلتاً خراب اور ۲۷،۷ فیصد کی بہت ہی خراب ہے۔ ہر کسان کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ جہانتک ہوسکے ۴ خراب جانوروں کی بجائے دو اچھے جانور رکھے۔ کیونکہ ۲ اچھے جانور اسی قدر کام کر سکینگے جسقدر کہ ۴ خراب جانور انجام دیسکتے ہیں۔ چنانچہ پانچویں فصل میں ہم نے بتلایا ہے کہ معیاری بیلوں کی ایک جوڑ روزانہ ۳۰ گنٹہ تری یا ۲۰ گنٹہ خشکی کی ہل چلائی کرسکتی ہے۔ حالانکہ ادنی قسم کے بیلوں کی ایک جوڑ روزانہ صرف ۱۵ گنٹہ تری یا ۱۰ گنٹہ خشکی کی ہل چلائی کرسکتی ہے۔ ان حالات کے تحت اگر کسان معیاری بیلوں کے رکھنے کی کوشش کریں تو موجودہ ادنی قسم کے بیلوں کی تعداد میں (جو کہ مجموعی زرعی جانوروں کی تعداد کا لحاظ کرتے ہوئے ۱۲،۹ فیصد ہیں) ۵۰ فیصد تخفیف کی گنجائش ہے۔ ٹھیک اسی طور پر معیاری قسم کے بھینسے رکھنے کی وجہ سے ادنی قسم کے بھینسوں کی تعداد میں ۵۰ فیصد تخفیف ہو سکتی ہے۔ اگر درجہ دوم کے بیلوں اور بھینسوں کی حالت کو ٹھیک کیا جائے تو جانوروں کی تعداد میں تخفیف کی مزید گنجائش نکل آتی ہے۔

جہانتک کہ موضع زیر بحث کی گائیوں اور بھینسوں کا تعلق ہے ان کی حالت بہت ہی ناگفتہ بہ ہے چنانچہ ہم نے پانچویں فصل میں درجہ اوّل و دوم اور سوم قسم کی گائیوں اور بھینسوں کی کارکردگی کا حال تفصیل کے ساتھ بتلایا ہے۔ جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قوت تولید اور خصوصاً دودھ دینے کی صلاحیت کا

لحاظ کرتے ہوئے موضع ہذا کی گائیوں اور بھینسوں کی حالت بہت ہی خراب ہے۔ یہ بات کسقدر قابل افسوس ہے کہ یہاں کی بہتر سے بہتر گائے روزانہ سوا سیر اور بہتر سے بہتر بھینس روزانہ ڈھائی سیر سے زاید دودھ نہیں دے سکتی واضح رہے کہ اس قسم کے گائیوں اور بھینسوں کی تعداد بہت ہی محدود ہے۔ دوم اور سوم قسم کی گائیں اور بھینسیں تعداد میں بہت زیادہ ہیں دوم قسم کی گائے روزانہ ڈھائی پاؤ اور سوم قسم کی گائے روزانہ پاؤ سیر سے زاید دودھ نہیں دے سکتی۔ اسیطرح دوم قسم کی بھینس روزانہ پونے دو سیر اور سوم قسم کی بھینس روزانہ سوا سیر سے زاید دودھ نہیں دے سکتی۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی ادنیٰ کارکردگی والی گائیوں اور بھینسوں کو ایک کثیر تعداد میں جمع رکھنے سے بجائے فائدے کے نقصان ہوگا۔ کیونکہ ادنیٰ قسم کی گائیوں اور بھینسوں کی یہ تعداد و چارہ کے ذرائع پر ایک قسم کا بار ثابت ہوگی۔ انکی تعداد کی زیادتی کی وجہ سے زراعت میں براہ راست مدد دینے والے جانور یعنی بھینسے اور بیلوں کیلئے قلت چارہ کا مسئلہ بہت ہی اہم ہوجائیگا نتیجہ یہ کہ کمی خوراک کی بدولت (جسکو ہمارے کسان حقیقی طور پر محسوس نہیں کرتے) اگر ایک طرف بیلوں اور بھینسوں کی حالت خراب ہوتی جائیگی تو دوسری طرف گائیوں اور بھینسوں کی حالت بد سے بدتر ہوگی۔ لہذا بہتر و مناسب یہی ہے کہ ادنیٰ قسم کی گائیوں اور بھینسوں کی تعداد میں بھی تخفیف کیجائے۔ ۲ خراب گائیوں اور ۲ خراب بھینسوں کی بجائے ایک اچھی گائے اور ایک اچھی بھینس رکھی جائے تو انکی تعداد میں بھی ۵۰ فیصد تخفیف کیجا سکتی ہے۔ اگر ادنیٰ قسم کے بھینسے، بیلوں گائیوں اور بھینسوں کی تعداد میں ممکنہ تخفیف کیجائے تو چارہ کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہوجائے گا۔ اچھے جانوروں کو اچھی غذا مل سکے گی اور وہ عمدگی کے ساتھ اپنا کام انجام دے سکینگے۔

(ب) رکھ رکھاؤ اور چارہ کا بہتر انتظام — مویشیوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے ایک طرف تو ان کی تعداد میں نمایاں تخفیف کی جانی چاہیئے اور دوسری طرف چارہ کے موجودہ ذرائع سے بہتر سے بہتر استفادہ کیا جائے۔ چنانچہ شاہی زرعی کمیشن نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے اور ہمیں کمیشن کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے کیونکہ ان دو صورتوں کے علاوہ تیسری مفید شکل نظر نہیں آتی۔

چارہ کے موجودہ ذرائع سے بہتر استفادہ کرنے کا ایک طریق یہ ہے کہ موسم بارش میں جبکہ چارہ کی کثرت ہوتی ہے اسکا ذخیرہ کیا جائے۔ ذخیرہ کے لئے سیلاج کا طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ بشکل سیلاج چارہ کا

ذخیرہ کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ زمین میں ۱۰ فیٹ لانبا۔ ۸ فیٹ چوڑا اور ۸ فیٹ گہرا گڑھا کھود دیا جائے اس گڑھے کو چارہ سے بھر کر مٹی سے ڈھانک دیا جائے۔ سیلاج کا جمع کیا ہوا چارہ خصوصاً دودھ دینے والے جانوروں کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔

دھان اور جوار کی فصلوں سے جو چارہ حاصل ہوتا ہے اسکو احتیاط کے ساتھ زیر سایہ رکھا جائے لیکن موضع ہذا میں قلت جگہ کی وجہ سے چارہ کو زیر سماگری کی شکل میں رکھا جاتا ہے۔ موسم گرما میں ان گریوں کو بعض مرتبہ آگ لگ جاتی ہے جسکی بدولت کسانوں کو بہت ہی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ مزید برآں بارش کے موسم میں چارہ کی گری بھیگ بھیگ کر چارہ سڑ جاتا ہے۔ بارش کی وجہ سے ہر سال چارہ کی قابل لحاظ مقدار خراب ہوتی رہتی ہے آگ اور پانی سے چارہ کی حفاظت کیجائے تو اسکی کافی مقدار بچ سکتی ہے۔

ہمنے یہ بھی دیکھا ہے کہ جب جانوروں کے آگے چارہ ڈالا جاتا ہے تو وہ اسکی قابل لحاظ مقدار کو کھندل کر خراب کر دیتے ہیں۔ چارہ ڈالنے کا انتظام اس طور پر کیا جائے کہ مویشی چارہ کو خراب نہ کر سکیں۔ جہانتک کہ کڑبی کا تعلق ہے وہ عام طور پر یوں ہی ڈالدی جاتی ہے جسکی وجہ سے اگر ایک طرف مویشیوں کو کڑبی چبانے میں دقت ہوتی ہے تو دوسری طرف وہ اسکو پوری طرح نہیں کھا سکتے۔ لہذا کڑبی (جسکی موضع ہذا میں بہت قلت ہے) کا کافی حصہ رائگاں جاتا ہے۔ اگر کڑبی کو کتر کر ڈالا جائے تو نہ صرف مویشیوں کو کھانے میں سہولت ہوگی بلکہ غیر ضروری طور پر کڑبی خراب بھی نہونے پائیگی۔

چارہ کی کفایت کیلئے موجودہ رقبہ گاران کا مناسب انتظام بھی ضروری ہے۔ فی الوقت رقبہ گاران کی کوئی تنظیم نہیں۔ جسکے جانور جدھر چاہیں چر سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ بہت سی گھاس محض روندنے میں خراب ہوجاتی ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ گاران کے باضابطہ قطعات کئے جائیں اور باری باری چند یوم کے عرصے سے دیہات کے جملہ جانور ایک ایک قطعہ پر چرائے جائیں۔ اس ترکیب کی وجہ سے چارہ غیر ضروری طور پر خراب نہونے پائیگا۔ حصول چارہ کی ایک اور صورت یہ ہے کہ مزارعین کو چارہ کی ارزان فصلیں اگانے کی ترغیب دیجائے مگر اس بارے میں سب سے اہم مالی دقت پیش آتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جن اراضیات پر چارہ کی فصل اگائی جائے ان پر محصول آبپاشی معاف کیا جائے۔ موضع زیر بحث میں اگر یہ سہولت بہم پہونچائی جائے تو ہمیں توقع ہے کہ کسانوں کی

ایک قابلِ لحاظ تعداد چارہ کی فصلیں اگانے پر راضی ہوگی۔

(ب) جانوروں کے رکھ رکھاؤ کا باضابطہ انتظام ــــ مویشیوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کیلئے نہ صرف چارہ کا بہتر انتظام کیا جانا چاہیئے بلکہ مویشیوں کے رکھ رکھاؤ کا باضابطہ انتظام بھی ضروری ہے۔ جانوروں کے کوٹھے (وہ مقام جہاں کہ جانوروں کو باندھا جاتا ہے) نہ صرف بند ہوتے ہیں بلکہ غلیظ بھی۔ خصوصاً موسم باراں میں نکاسی آب کا باضابطہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے انکی حالت خراب رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ غلاظت کی وجہ سے کوٹھے بھی متعلق ہونگے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کوٹھوں کو ہمیشہ خشک اور صاف رکھا جائے اور ہوا کے داخل ہونے کے لئے باضابطہ روشندان رکھے جائیں۔ جانوروں کو عام طور پر بری طرح کوٹھے میں بھر دیا جاتا ہے۔ خصوصاً گائیوں کے ساتھ یہ طرز عمل بہت عام ہے۔ قلت جگہ اور جانوروں کی کثرت کیوجہ سے غیر محسوس طریق پر جانوروں کی صحت متاثر ہوتی ہے خصوصاً اُس زمانہ میں جبکہ کوئی متعدی بیماری پھیلی ہوئی ہو۔ جانور بہت جلد متاثر ہوجاتے ہیں۔ اکثر کوٹھے محض برائے نام ہوتے ہیں۔ انمیں نہ صرف بارش کا پانی نیچے اترتا ہے بلکہ سردی کے زمانے میں جانور اوس سے بھی بچ نہیں سکتے۔ لہذا جانوروں کی صحت اور کارکردگی کو برقرار رکھنے یا بڑھانے کیلئے نہ صرف اچھی غذا دیجانی چاہیئے بلکہ اونکی رہائش کا انتظام بھی اچھا ہونا چاہیئے۔

(ج) نسل کشی کا باضابطہ انتظام ــــ مویشیوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کیلئے نہ صرف مویشیوں کی تعداد میں تخفیف کیجانی چاہیئے اور چارہ کے ذرائع سے بہتر سے بہتر استفادہ کیا جائے بلکہ اسکے لئے نسل کشی کا باضابطہ انتظام بھی ضروری ہے۔ فی الوقت ہمارے کسان اس کام کی جانب سے بالکل بے بہرہ نظر آتے ہیں۔ اُنکے ہاں نسل کشی کا کوئی تخیل ہی نہیں گائے ران میں اچھے اور برے جانور یکساں طور پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ لہذا اچھی گائیوں اور خراب بیل۔ خراب گائیوں اور اچھے بیلوں کے اختلاط کی وجہ سے اچھی نسل پیدا ہونے نہیں پاتی۔ اکثر مرتبہ خراب گائیوں اور خراب بیلوں کا اختلاط بھی ہوا کرتا ہے۔ اس اختلاط کی وجہ سے جس نوعیت کی نسل پیدا ہوگی وہ پوشیدہ نہیں۔ بیلوں اور گائیوں کو گائے ران میں یکساتھ چھوڑ دینے کی وجہ سے اکثر مرتبہ غیر پختہ گائیوں (ان گائیوں سے ایسی گائیں مراد ہیں جنمیں بچہ دینے کی قابلیت بطور اتم پیدا نہیں ہوئی) کا اختلاط ہوجاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ بچہ کمزور پیدا ہوتا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ گائیوں اور بیلوں کے

چرنے کا علیحدہ علیحدہ انتظام کیا جائے۔ اس انتظام کی وجہ سے اسمیں شک نہیں کہ تھوڑی بہت دقت اٹھانی پڑیگی لیکن اسکا بہت ہی مفید اثر مترتب ہوگا۔ سرکاری مزرعہ جات پر عمدہ قسم کے بیل زیادہ تعداد میں رکھے جائیں اور موثر پروپگنڈے کے ذریعہ مزارعین کو ایک طرف تو عمدہ قسم کی گائیں رکھنے کی ترغیب دیجائے اور دوسری طرف انہیں عمدہ اختلاط کے حقیقی فوائد سے آگاہ کیا جائے۔ بہرطور مویشیوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کیلئے عمدہ غذا کے علاوہ نسل کشی کا معقول انتظام نہایت ضروری ہے۔

(۲) علاج حیوانات ـــــ جس طرح کسان آئے دن متعدد بیماریوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں اسیطرح انکے مویشی بھی مختلف امراض[51] میں مبتلا رہتے ہیں۔ جنمیں سے بہت کم بیماریوں کا علاج کسانوں کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے۔ بعض متعدی بیماریوں کے وقت کسان بالکل بے دست و پا ہو جاتے ہیں اور سمجھنے لگتے ہیں کہ چونکہ دوا کی وجہ سے بیماری ٹھیک نہیں ہو رہی ہے لہذا جانور پر شیطان کا اثر ہو گیا ہے۔ اس اثر کو دور کرنے کیلئے شیطان کے نام پر بکرا ذبح کیا جاتا ہے۔ جسوقت محرر مقالہ موضع میں مقیم تھا دیہات کے تقریباً تمام جانور گالی کی بیماری میں مبتلا تھے۔ اس بیماری کو دور کرنے کیلئے کسانوں میں اس تحریک کا آغاز ہو چکا تھا کہ بحیثیت مجموعی تمام دیہات سے چندہ کرکے کچھ بکرے ذبح کئے جائیں تاکہ گالی کی بیماری دیہات سے چلی جائے۔ ممکن ہے کہ ابتک اس تحریک کو عملی جامہ پہنا دیا ہو گا۔ مزارعین کو بیجا مصارف سے بچانے کے لئے موثر پروپگنڈے کے ذریعہ انکی توہم پرستی کو دور کیا جائے مزید برآں علاج حیوانات کا معقول انتظام کیا جائے۔ فی الوقت نظام آباد (جو موضع زیر بحث سے تقریباً ۹ میل ہے) میں جانوروں کا ایک دواخانہ موجود ہے لیکن کسان اس سے خاطر خواہ طور پر مستفید ہوتے نظر نہیں آتے۔ امراض مویشیان کا معقول اور بروقت علاج نہ صرف اسلئے ضروری ہے کہ اس کی بدولت جانوروں کی کارکردگی ٹھیک ہو سکتی ہے بلکہ اموات مویشیان میں تخفیف کی وجہ سے کسانوں کا قرض بھی بہت کچھ ہلکا ہو سکتا ہے کیونکہ کسانوں کو جانور بالعموم اسوقت خریدنا پڑتا ہے جبکہ وہ فوت ہو جاتے ہیں۔

آلات زراعت ـــــ جدید اور مناسب حال آلات کے استعمال کا مسئلہ بھی ایسا ہی اہم ہے جیسا کہ مویشیوں کی کارکردگی کا مسئلہ۔ مزارعین کی موجودہ پست معاشی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے عام طور پر قدیم آلات کے

۵۱۔ مویشیوں کے مختلف امراض اس کا تذکرہ ہو چکا ہے۔

استعمال ہی کو مناسب خیال کیا جاتا ہے۔ مالی وقت کا سوال اسمیں شک نہیں کہ بہت اہم ہے لیکن اگر ہم اپنی زراعت کو بہتر بنانا چاہیں اور فی ایکر پیداوار کے اوسط کو بڑھانا چاہیں تو ماہرین کی رائے کے مطابق اس نوعیت کے آلات استعمال کیئے جائیں کہ جنکی بدولت ہل چلائی اور تخم ریزی وغیرہ کا کام بہتر سے بہتر طریق پر ہو سکے۔ ہمارا یہ خیال نہیں کہ قدیم آلات چونکہ قدیم ہیں لہذا وہ برے ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ قدیم آلات ہی میں اس قسم کی تبدیلی کرنی چاہیئے کہ جسکی بدولت اگر وہ ایک طرف نسبتاً کم قیمت میں دستیاب ہوسکیں تو دوسری طرف اپنے مفوضہ کام کو بہتر سے بہتر طریق پر انجام دیں اس قسم کے آلات کی فراہمی اور اس سے متعلقہ تحقیق محکمۂ زراعت کا کام ہونا چاہیئے۔ مانا کہ ہمارے ہاں کے تجرباتی مزرعہ جات پر تحقیق اور تجربوں کا کام نہایت عمدہ طریق پر ہو رہا ہے لیکن جہانتک کہ پروپگنڈے کا تعلق ہے یہ مزرعے بہت ہی قابل تنقید ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مزرعہ نظام آباد اور مزرعہ رودرور پر ہر سال نمائش ہوتی ہے لیکن اس نمائش کا کام بالکل نمائشی ہوتا ہے جس سے کسان حقیقی طور پر استفادہ نہیں کر سکتے۔ موزوں اور مناسب حال آلات کی ترویج کیلئے موثر پروپگنڈے کو کام میں لایا جائے۔ اور مختلف سہولتیں محکمۂ زراعت کی جانب سے بہم پہنچائی جائیں کسانوں کو اس بات کی ترغیب دیجانی چاہیئے کہ وہ جدید آلات کو مشترکہ طور پر خریدیں جسطرح کہ کولہو عام طور پر مشترک حیثیت سے خریدا جاتا ہے خواہ جدید آلات ہوں یا ترقی یافتہ آلات ہر دو کا اصولی استعمال عمدہ پیداوار حاصل کرنے میں بہت ہی موثر ثابت ہوگا۔

مصنوعی ذرائع آب پاشی ——— ذرائع آب پاشی کی حد تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ موضع زیر بحث میں بطور اتم موجود ہیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان ذرائع سے خاطر خواہ طور پر استفادہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ مزارعین کا خیال ہے کہ چونکہ خشک اراضیات کے مقابل تر اراضیات کی مالگذاری بہت زیادہ ہوتی ہے لہذا انہیں خشک اراضیات کے مقابل تر اراضیات کی کاشت میں بہت کم منافع ملتا ہے لیکن ہم نے بتلایا ہے کہ خشک اراضیات کے مقابل تر اراضیات کی کاشت میں قلیل منافع کے وجوہ کچھ اور ہی ہیں........ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر تر اراضیات کی کاشت مناسب اصول پر کیجائے تو اسمیں خشک اراضیات کی کاشت سے کہیں زیادہ منافع کی گنجائش ہے چونکہ کسان تر زمینات سے عموماً بدظن نظر آتے ہیں لہذا موضع کی تر اراضیات کا ایک قابل لحاظ حصہ خارج از کاشت پڑا ہوا ہے۔ جسکی بنا پر حکومت کو متوقعہ رقم مالگزاری (۱۹۳۷ء) سے ۳۵۰،۰۱ روپے کم مالگذاری وصول ہوئی ہے اگر زراعتی تعلیم کا باضابطہ انتظام ہو جائے اور کسان مناسب اصول پر تر اراضیات کی کاشت کرنے لگیں تو

اونہیں قابل لحاظ منافع ملنے لگے گا۔ موجودہ خارج از کاشت اراضیات زیر کاشت آجائیگی۔ اوسط رقبہ فی کاشت کار بڑھے گا اور حکومت کو بھی معقول آمدنی ہوگی جس سے فلاح عامہ کے بہت سے تعمیری کام کئے جاسکینگے۔

کھاد ـــــ اس سے قبل ہم نے کھاد کی طلب و رسد پر روشنی ڈالتے ہوئے بتلایا ہے کہ ۱۳۴۷ف (م اکتوبر ۲۸ ۱۹۳۷ء) کے جملہ کاشت شدہ رقبے سے عمدہ پیداوار حاصل کرنے کیلئے جسقدر کھاد درکار تھی اس سے ۵۱٫۴۴ فیصد کم کھاد دستیاب ہوئی اگر وہ اراضیات جو فی الوقت خارج از کاشت ہیں زیر کاشت آجائیں تو کھاد کی قلت میں مزید اضافہ ہوجائیگا نہ صرف موضع زیر بحث بلکہ تمام ہندوستان کیلئے قلت کھاد کا مسئلہ دن بدن اہم سے اہم تر ہوتا جا رہا ہے

اس مسئلہ کو حل کرنیکی سب سے بہتر اور کارگر تدبیر یہ ہے کہ ایک طرف تو کھاد کے قدرتی ذرائع سے پورا پورا استفادہ کیا جائے اور دوسری طرف ارزاں قسم کی مصنوعی کھادوں کی ترویج عمل میں لائی جائے۔

کھاد کے موجودہ ذرائع سے کلی طور پر استفادہ کرنے کیلئے ضرورت اس امر کی ہے کہ گوبر کی جملہ پیداوار کو نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ کرلیا جائے ہم نے اندازہ لگایا ہے کہ مکانات کے لیپنے چھڑکنے اور بطور ایندھن استعمال کرنے میں سالانہ ۲٫۵ ۱۸۱ بنڈی گوبر صرف کیا جاتا ہے۔ اگر اس گوبر کو محفوظ کرلیا جائے اور اسکی کھاد تیار کیجائے تو ۵۱٫۴۴ فی صد کمی میں سے ۲۶٫۹۴ فی صد کمی کی تلافی کیجاسکتی ہے بالفاظ دیگر اگر گوبر کو مکانات کے لیپنے۔ چھڑکنے اور بطور ایندھن جلانے میں صرف نہ کیا جائے اور اس کی کھاد تیار کرکے کاشت کیلئے استعمال کی جائے تو کھاد کی قلت ۵۱٫۴۴ فی صد کی بجائے ۲۴٫۵ فیصد رہے گی۔

مزارعین کیلئے یہ امر بہت وقت طلب ہے کہ وہ گوبر کے استعمال کو یک لخت ترک کردیں۔ البتہ موثر پروپگنڈے کے ذریعہ یہ عادت بتدریج رفع ہوسکتی ہے۔ موضع ہذا کے قرب وجوار میں اکثر و بیشتر جنگل ہیں خصوصاً موسرہ کا جنگل بہت وسیع ہے یہاں سے لکڑی باسانی فراہم کیجاسکتی ہے ہمنے اندازہ لگایا ہے کہ اگر ایک خاندان گوبر جلانے کی بجائے لکڑی استعمال کرے تو سالانہ ۱۲ روپیہ کی کفایت کرسکتا ہے۔

گوبر سے پورے پورے طور پر استفادہ کرنے کے بعد کھاد کی جو قلت (۲۴٫۵) فیصد ہوتی ہے اسکو پورا کرنے کیلئے جانوروں کا پیشاب جمع کیا جائے جو کہ نائٹروجن حاصل کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ اگر مویشیوں کے

سـ۱ ۔موضع بیٹہ کی معاشی تحقیق از محمد ناصر علی صاحب صفحہ ۱۹۔

پیشاب کرنے کی جگہ پر گڑھے کر دیئے جائیں تو پیشاب بآسانی جمع ہوسکتا ہے۔ یا یہ کہ پیشاب کو خراب گھاس میں بھی جذب کرلیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوسکے تو پیشاب کی مٹی ایک مناسب موقعہ سے بدل دی جائے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ دیہات میں مویشیوں کا پیشاب کلیتاً رائیگاں جاتا ہے اگر اسکو محفوظ کرلیا جائے تو اس سے نائٹروجن کی کافی مقدار حاصل کیجاسکتی ہے۔ ماہرین کی تحقیق کی بناء پر ہندوستانی زمینات میں عام طور پر نائٹروجن کم مقدار میں پائی جاتی ہے[ف۱]۔

کھاد کی مزید کمی کو پورا کرنے کیلئے اونہیں ہڈی کی کھاد تیار کرنے کو نسبتاً آسان طریقے بتلائے جائیں کیونکہ ایک تو مردہ جانوروں کی ہڈی اطراف واکناف میں مفت ملجاتی ہے دوسرے یہ کہ ہڈی کی کھاد چانولوں کی کاشت کیلئے (جوکہ موضع کی سب سے اہم پیداوار ہے) بہت مفید ہے۔ علاوہ ازیں اونہیں بتلایا جائے کہ چاولوں کے چھلکوں سے (جوکہ مقدار کثیر مفت میں ملتے ہیں) کیونکر کھاد تیار کیجاسکتی ہے۔ یہ کھاد گیہوں اور جوار کی کاشت کیلئے کافی زرخیز ثابت ہوئی ہے مزارعین کو اسکی بھی ہدایت دیجائے کہ گنے کے چھلکے (جو بکثرت ملتے ہیں) جلانے کی بجائے بطور کھاد استعمال کئے جائیں۔ ان چھلکوں میں کاربن کی کافی مقدار موجود ہوتی ہے جوکہ پودوں کی خاص غذا ہے۔ مزید برآں انسانی فضلے کو (جو بالکل رائیگاں جاتا ہے) گڑھوں میں جمع کرکے سوکھنے کے بعد بطور کھاد استعمال کیا جائے۔ ان طریقوں پر عمل کرنے کے بعد کھاد کی کمی بڑی حد تک پوری ہوجائیگی اگر نہ بھی ہو تو اسکو بیسیوں دیگر ذرائع سے رفع کیا جاسکتا ہے کیونکہ مسٹر پاکسن کے قول کے مطابق "روئے زمین پر کوئی ملک ایسا نہیں جس میں کھاد اس کثرت سے اور اتنے مختلف اقسام کی موجود ہو جیسے کہ ہندوستان میں موجود ہے..... مگر کاشتکار اسکی قدر نہیں کرتے جسکا باعث محض لاعلمی ہے"[ف۲]۔

تخم ——— عمدہ پیداوار حاصل کرنے کیلئے عمدہ تخم کا انتخاب نہایت ضروری ہے ہمارے دیہات کی سب سے اہم پیداوار چاول ہے لیکن چاولوں کی کاشت کیلئے جس قسم کے تخم استعمال کئے جاتے ہیں وہ بہت ہی ادنی اور معمولی ہوتے ہیں۔ سالہا سال سے صرف ایک ہی قسم کے تخم کی کاشت کیجارہی ہے۔ ادنی قسم کے دھانوں کی بجائے اگر عمدہ قسم کے دھان کاشت کئے جائیں تو کسانوں کو عمدہ قیمت وصول ہوسکتی ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دیہاتیوں کو

ف۱۔ موضع زیر بحث کی زمینات میں بھی بحیثیت مجموعی نائٹروجن کی مقدار کم ہے۔ ...... ڈاکٹر کرشنا اگریکلچرل کیمسٹ صدر مزرعہ حمایت ساگر کی ہدایات کے موافق موضع دوپلی سے مٹی کے نمونے لائے گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اپنی مہربانی سے ان نمونوں کا طبعی اور کیمیائی تجزیہ کیا۔ بعض وجوہ کی بناء پر تجزیہ کے نتائج بہت دیر بعد وصول ہوئے۔ اسلئے اس سے تحقیقی استفادہ نہیں کیا جاسکا تاہم معلومات کی خاطر اس تجزیہ کے اعداد ضمیمہ دوم میں دیئے گئے۔ ف۲۔ رہنمائے ہند مصنفہ مسٹر پاکسن صفحہ (۲۰-۲۱) ترجمہ

اسکا کوئی خیال ہی نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ماحول کا لحاظ کرتے ہوئے محکمہ زراعت کی جانب سے عمدہ قسم کے تخم کی تشہیر کا کام موثر طریقہ پر جاری رکھا جائے۔ بعض کسانوں کو عمدہ قسم کے تخم مفت دیئے جائیں اور بعض مستطیع کسانوں سے رعایتی قیمت وصول کیجائے۔ ابتداً مختلف سہولتوں کے ذریعہ کسانوں کی توجہ عمدہ تخم کے استعمال کی طرف مبذول کرائی جائے۔ جب وہ انکے فوائد سے آگاہ ہوجائینگے تو اس وقت عمدہ تخم کا استعمال عام ہوجائیگا۔

فصلوں اور انکی بیماریوں کا سدباب ـــــ انسانوں اور جانوروں کی طرح فصلوں کو بھی آئے دن مختلف قسم کی بیماریاں ہوتی رہتی ہیں۔ مزارعین کا بیان ہے کہ نہر نظام ساگر کی اجرائی کے بعد سے "کا ما روگم" "بردی روگم" اور "انکیا روگم" بہت عام ہوگئے ہیں۔ کاما روگم کی وجہ سے وہاں کے پودے میں ایک قسم کا چھوٹا پودا اُگ آتا ہے یہ پودا فصل کو کمزور کردیتا ہے۔ بردی روگم کی وجہ سے دھان سفید ہوکر خراب ہوجاتا ہے۔ انکیا روگم کی بدولت وہاں کے خوشے لال ہوکر جھڑ جاتے ہیں۔ ان بیماریوں کی وجہ سے کسانوں کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔ کسانوں کا بیان ہے کہ نہیں ان بیماریوں کا کوئی علاج معلوم نہیں۔ حکومت کے جانب سے بھی ان بیماریوں کے علاج کی طرف کوئی توجہ نہیں کیگئی۔ محکمۂ زراعت کو چاہیئے کہ بہت جلد اپنی توجہ اس طرف مبذول کرے اور مزارعین کو نقصان سے بچایئے۔ اجرائی نہر کی وجہ سے ایک جدید مسئلہ زمینات کی رطوبت سے متعلق پیدا ہوگیا ہے۔ پانی کی زیادتی کی وجہ سے زمینات ہر وقت مرطوب رہنے لگی ہیں نتیجہ یہ کہ بعض زمینات میں اسقدر کھار پیدا ہوگیا ہے کہ کلیتاً خارج از کاشت ہوگئی ہیں۔ مختلف بیماریوں کی وجہ سے پیداوار کا قابل لحاظ حصہ مارا جاتا ہے اور مزارعین کی آمدنیاں گھٹ جاتی ہیں۔ لہٰذا آمدنیوں کو بڑھانے کی خاطر فصل کی بیماریوں کا سدباب اور زمینات کے کھار کا مسئلہ نہایت ہی اہم ہے۔

فروخت پیداوار ـــــ کسان اپنی لاعلمی اور دیگر مجبوریوں کی بدولت جہاں اور امور میں نقصان اٹھاتے ہیں وہاں فروخت پیداوار کے تحت بھی اونہیں کافی خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔ ساہوکار انکی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاکر غلہ کی خرید میں غیر معمولی نفع کماتے ہیں۔ مزارعین کی آمدنیاں اگر ایک طرف ادنی پیداوار (جسکے مختلف وجوہ بیان کیئے گئے ہیں) کی وجہ سے کم ہوجاتی ہیں تو دوسری طرف ناقص طریقہ ہائے فروخت کی بدولت بھی انکی آمدنیوں کا قابل لحاظ حصہ مارا جاتا ہے۔ موضع زیر بحث کی پیداوار کا بہت بڑا حصہ "لاؤنی" کے تحت فروخت ہوتا ہے۔ چنانچہ ساتویں فصل میں ہم بتا چکے ہیں کہ اس طریق کے تحت پیداوار فروخت کرنیکی وجہ سے کسانوں کو کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ

کسقدر نقصان اوٹھانا پڑتا ہے۔

مزارعین کو نقصان سے بچانے بالفاظ دیگر انکی آمدنیوں میں اضافہ کرنے کی خاطر ضرورت اس امر کی ہے کہ پیداوار کی فروخت کا مناسب انتظام کیا جائے۔ لاؤنی کے تحت مال خریدنے کے طریق کو قطعاً ممنوع قرار دیا جائے۔ ساہوکاروں کو اس امر کا پابند کیا جائے کہ وہ قرض دیگر مقررہ رقمی سود (جسکا آگے ذکر کیا جائے گا) وصول کریں۔ اگر قرضہ بشکل جنس دیا گیا ہے تو اسپر مقررہ رقمی شرح کا لحاظ کرتے ہوئے سود وصول کیا جائے۔ مقامی انجمن امداد باہمی کے تحت فروخت غلہ کا ایک گوادم قایم کیا جائے اس گودام سے ارکین کو دو قسم کے فوائد حاصل ہونگے۔ پہلا یہ کہ انہیں رفع احتیاجات (مثلاً ادائی مالگذاری وغیرہ) کیلئے بروقت رقم مل سکے گی دوسرے یہ کہ کچھ عرصے تک غلے کا ذخیرہ کرنے کے بعد اسکو فروخت کیا جائیگا تو قیمت بھی اچھی وصول ہوگی سرکاری پیمانوں کے علاوہ دیگر قسم کے بڑے پیمانوں کے استعمال پر سختی کے ساتھ نگرانی رکھی جائے۔

ناندیڑ۔ سیلو۔ عمری۔ جالنہ اور لاتور وغیرہ کی طرح نظام آباد کی مارکٹ میں بھی "مارکٹ کمیٹی" کا قیام عمل میں لایا جائے۔ کمیٹی کے قیام کی بدولت اوزان پیمانہ جات۔ اڑتی اور بعض غیر ضروری مدات کی وصولی پر کافی نگرانی رکھی جاسکے گی۔

قرضہ جات —— ناقص طریقہ ہائے فروخت کے علاوہ ناقص طریقہ ہائے لین دین کی بدولت بھی کسانوں کی آمدنی مستقل طور پر کم ہوتی رہتی ہے۔ طریقہ ہائے لین دین کو بہتر بنانے کے یہ معنی ہیں کہ کسانوں کی آمدنیوں میں اضافہ کیا جارہا ہے۔ آمدنیوں میں اضافے کی وجہ سے معیار زندگی بھی نسبتاً بلند ہوسکے گا۔

قرضہ جات سے متعلق سب سے اہم مسئلہ شرح سود کا ہے۔ نویں فصل میں ہم یہ معلوم کرائے ہیں کہ موضع ہذا میں زیادہ سے زیادہ ۷۵ فیصد سالانہ شرح سود وصول کیجاتی ہے۔ دستور العمل قرض دہندگان کی رو سے اس میں شک نہیں کہ کفالتی قرض پر زیادہ سے زیادہ ۹ فیصد سالانہ سود سادہ اور غیر کفالتی قرض پر زیادہ سے زیادہ ۱۲ فیصد سالانہ سود سادہ مقرر کیا گیا ہے لیکن اسپر عمل ہوتا نظر نہیں آتا۔ اسی قانون کی رو سے ساہوکاروں کیلئے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ لائسنس خریدیں لیکن موضع زیر بحث میں ایک بھی ساہوکار ایسا نہیں جسکے ہاں سرکاری لیسنس ہو۔ اس دستور العمل کا لحاظ کرتے ہوئے ساہوکار اسکے بھی پابند قرار دئیے گئے ہیں کہ وہ اپنے آسامیوں کو مرتبہ نمونوں کے موافق حساب کتاب دیں قانون اسمیں شک نہیں کہ بہت مفید ہے۔ لیکن سوال اسکے عمل اور عدم عمل کا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ ساہوکاروں کو اسکا پابند بنایا جائے ساہوکار اسوقت تک پابند نہ ہونگے جب تک ان پر نگرانی نہ رکھی جائے۔

نویں فصل میں ہم معلوم کرائے ہیں کہ مزارعین کے قرضہ جات کے دو اہم مدات شادی بیاہ اور تعمیر مکان ہیں کیونکہ مجموعی قرض کا لحاظ کرتے ہوئے ۲۲ فیصدی قرض شادی بیاہ سے متعلق ہے اور ۱۶ فیصد تعمیر مکانات سے مزارعین کو سمجھایا جائے کہ بچپن کی شادی کی وجہ سے انہیں قبل از وقت زیر بار ہونا پڑتا ہے چونکہ شادی کا قرضہ کلیتہً غیر پیداوار ہوتا ہے اور چونکہ اسکی شرح بھی بہت زیادہ ہوتی ہے لہذا اسکی ادائی کا سلسلہ مدتوں چلتا رہتا ہے اور آمدنیوں میں مستقل کمی ہوتی رہتی ہے اگر شادیاں بروقت کی جائیں تو قرض کے بیجا بار میں بہت کچھ تخفیف ہوسکتی ہے۔ بہتر ہوگا کہ انجمن امداد باہمی سے شادی بیاہ اور تعمیر مکان کیلئے طویل المدت کفالتی قرضے دیئے جائیں۔ قرض دہی کرتے وقت اس امر کا تعین کردیا جائے کہ یہ قرضہ اسقدر مدت میں وصول ہونا چاہیئے اس مدت کا سود اقساط کی ادائی کا لحاظ کرتے ہوئے اصل میں جمع کردیا جائے۔ اصل و سود کی جملہ رقم کو ایک جا کرکے اسکی قسط بندی کردینی چاہیئے۔ تعمیر مکانات کیلئے بھی اسی قسم کے طویل المدت قرضوں کا انتظام کیا جائے اس طریق کی بدولت اراکین کو نہ صرف ادنیٰ شرح پر قرض مل سکے گا بلکہ اسکی ادائی بھی آسانی سے ہوسکے گی۔

نویں فصل میں ہم یہ بھی معلوم کرائے ہیں کہ ایک فیصد قرض مزارعین کی توہم پرستی کی وجہ سے ہے۔ توہم پرستی کا سدباب اگر ایک طرف موثر پروپگنڈے کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے تو دوسری طرف اسکے لئے عام بیداری کی ضرورت ہے جو بذریعہ تعلیم حاصل ہوسکتی ہے۔ مزید برآں دیہاتیوں کو اسراف سے بچنے کی ترغیب دی جائے انہیں سمجھایا جائے کہ موجودہ سودی لین دین کا لحاظ کرتے ہوئے قرض ایک بری بلا ہے۔ اور اس سے حتی المکان بچنے کی کوشش کیجائے۔

مزارعین کے موجودہ بار قرض کو کم کرنے کیلئے قدیم قرضہ جات کے تصفیے کئے جائیں۔ ان قرضوں کی تحقیق اور تصفیوں کیلئے ایک کمیٹی کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس کمیٹی میں محکمۂ تنظیم دیہی (جسکی ہم آئندہ سفارش کرینگے) کا ایک عہدہ دار ہوگا اس عہدہ دار کے علاوہ دیہات کے دو دیانت دار افراد بھی شریک ہونگے۔ کمیٹی کا فریضہ ہوگا کہ افراد کے قدیم قرضہ جات کی تحقیق کرے اور انکے مابین ایک مناسب تصفیہ کرے۔ ہمارے خیال میں قدیم قرضہ جات کے تصفیوں کا کام بہت ہی کامیاب ثابت ہوگا۔ کیونکہ اس قسم کے تصفیوں کیلئے نہ صرف قرضدار بلکہ ساہوکار بھی راضی نظر آتے ہیں۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان تصفیوں کی وجہ سے طرفین[۵۱] کا فائدہ ہوگا۔ چنانچہ ہم نے فریقین کے

---

[۵۱] ضمیمۂ دوم میں یہ بیانات نمبر ۱۷- ۱۸- ۱۹- ۲۰- ۲۱- ۲۲- ۲۳- ۲۴- اور ۲۵ درج کئے گئے ہیں۔

رہبر نمائش مصنوعات ملکی بابتہ ۱۳۵۱ف

تالیف

مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی، اے (عثمانیہ)

سر ایم وشویشرایا کے، سی، آئی، ای، کی رائے کا اقتباس حسب ذیل ہے

"میں نے رہبر نمائش بابتہ ۴۲-۱۹۳۱ء کا خاص دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا اس میں اعلیحضرت حضور نظام کی قلمرو کی چوتھی صنعتی نمائش کی بعض موثر خصوصیات درج ہیں۔

"رہبر مذکور میں نمائش کے مقاصد اس وسیع سلطنت کی معاشی صلاحیتیں نمائش میں سرکار عالی کے مختلف محکموں نے جو دلچسپی لی ہے اور انجمن طیلسانیین عثمانیہ کی کاوشیں اجمالی طور پر واضح کی گئی ہیں اس ضمن میں انجمن طیلسانیین عثمانیہ نے جو ایک باعزم ادارہ ہے اپنی مساعی سے اس تحریک کی جو رہبری کی وہ عامۃ الناس سے خراج تحسین حاصل کرنے کی مستحق ہے"

رعایتی قیمت دو روپیہ سکہ عثمانیہ ملنے کا پتہ دفتر مجلس نمائش معاشی کمیٹی معظم بلڈنگ حیدرآباد

حیدرآباد دکن کا ہفتہ وار اخبار

"مملکت"

ملک کی علمی، ادبی، معاشی، اور سیاسی خدمت کے لئے ترقی پذیر رجحانات کا حامل

شرح چندہ سالانہ ے؍ ششماہی ے؍ سہ ماہی عہ

قیمت فی پرچہ ۲؍

پتہ :- دفتر اخبار مملکت سیانچہ توپ ا حیدرآباد دکن

مجلّہ طیلسانین کے مقاصد و قواعد

(۱) "مجلّۂ طیلسانین" انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا ترجمان ہے۔

(۲) اغراض انجمن کے لحاظ سے مجلّہ میں مضامین مقالے اور نظمیں شائع ہونگی۔

(الف) جامعہ عثمانیہ کے منظورہ مابعد طیلسان مقالے شائع کئے جائینگے۔

(ب) اُردو مطبوعات پر تنقید و تبصرہ کیا جائیگا۔

(ج) انجمن طیلسانین عثمانیہ اور اسکے ملحقہ اداروں کی سرگرمیوں اور کاروبار کے تفصیلات کی اشاعت عمل میں آئیگی۔

(د) علمی اور ہر جہتی ترقی کے معلومات و اطلاعات شائع کیجائینگی۔

(ھ) سیاسیات حاضرہ اور اختلافی مذہبی امور کے متعلق مضامین وغیرہ کسی صورت میں شائع نہ کئے جائینگے۔

(۳) حسب ضرورت مجلّہ کے مختلف حصّے خاص خاص علم و فن سے مختص ہونگے فی الوقت مجلّہ کے دو حصّے ہونگے۔ ایک عام حصّہ دوسرا موسوم بہ "معاشیات"

(۴) مجلّہ بہمن۔ اردی بہشت۔ امرداد۔ آبان مطابق جنوری۔ اپریل۔ جولائی۔ اکتوبر میں شائع ہوگا۔

(۵) مجلّہ کے ہر حصّہ کی ضخامت کم از کم ۶ جزو ہوگی۔

(۶) مضمون یا مقالہ نگار ونکو انکے مضمون یا مقالہ کے ۲۵ نسخے بلا قیمت ارسال ہونگے اور ایم۔اے کے مقالہ کے ۱۰ نسخے بلا قیمت ارسال ہونگے بشرطیکہ پہلے مطلع کر دیا جائے اگر ان نسخوں سے زاید نسخے درکار ہوں تو کاغذ کی قیمت قبل از قبل ادا کرنے پر انتظام عمل میں آئیگا۔

(۷) اگر مضمون یا مقالہ نگار پہلے سے مجلّہ کے خریدار نہوں تو مجلّہ کا وہ شمارہ جسمیں مضمون شائع ہو بلا قیمت ارسال کیا جائیگا۔

(۸) سال بھر میں کسی صاحب کے ۲ مضمون یا مقالے شائع ہونے کی صورت میں سال مابعد کیلئے اگر قواعد انجمن طیلسانین عثمانیہ مانع نہ ہوں، مجلّہ بلا قیمت جاری کیا جائیگا۔

(۹) اگر کوئی مضمون، یا مقالہ یا نظم قابل اشاعت قرار نہ پائے تو اسکو واپس کر دیا جائیگا۔

(۱۰) اگر کسی مضمون یا مقالہ کیلئے مجلّہ اپنے خرچ سے تصاویر کے بلاکس تیار کرے تو ان کو مناسب قیمت پر جسکا تصفیہ مہتمم مجلّہ کریگا فروخت کیا جاسکیگا۔

(۱۱) اگر مجلّہ کا کوئی شمارہ اشاعت کے مقررہ مہینہ میں وصول نہو تو اسکی اطلاع مہتمم کو دوسرے مہینہ میں کر دینی چاہیئے۔

(انتظامی پریس)

حیدرآباد دکن

مطبوعہ انتظامی پریس حیدرآباد دکن

مجلّہ طیلسانیین کا چندہ و اشتہارات کا نرخ

مجلّہ کے چندے کے متعلق حسب ذیل اُمور پر عمل ہوگا

(۱) (الف) مجلّہ چندہ دہندہ ارکان انجمن طیلسانیین عثمانیہ کو مقررہ قواعد کے بموجب بلا قیمت ارسال کیا جائیگا۔

(ب) مجلّہ کا حصہ موسوم بہ "معاشیات" معاشی کمیٹی انجمن طیلسانیین کے ارکان کے پاس بلا قیمت ارسال کیا جائیگا۔

اگر ان کو مجلّہ کے دونوں حصّے مطلوب ہوں تو اسکے لئے انکو (عہ) ایکروپیہ سالانہ اپنے چندہ رکنیت کے علاوہ ادا کرنا ہوگا۔

(ج) مجلّہ کے دونوں حصوں کی قیمت محصول ڈاک کے علاوہ خریداران مملکت آصفیہ سے پانچ روپیہ سکہ عثمانیہ سالانہ ہوگی اور بیرون مملکت آصفیہ سے پانچ روپیہ سکہ حکومت ہند۔

(د) مجلّہ کے عام حصہ کی قیمت محصول ڈاک کے علاوہ خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ تین روپے سکہ عثمانیہ ہوگی اور بیرون مملکت آصفیہ سے تین روپے سکہ حکومت ہند۔

(ہ) مجلّہ کے حصہ "معاشیات" کی قیمت معہ محصول ڈاک خریداران مملکت آصفیہ سے سالانہ تین روپے سکہ عثمانیہ ہوگی اور بیرون مملکت آصفیہ سے تین روپے سکہ حکومت ہند۔

(۲) مجلّہ کے ہر حصہ کی قیمت فی نسخہ ایک روپیہ ہوگی۔ دونوں حصوں کی قیمت فی نسخہ ایکروپیہ آٹھ آنے ہوگی۔

(۳) اشتہارات کا نرخ حسب ذیل ہوگا۔

مقدار	نرخ سالانہ	نرخ فی اشاعت
پورا صفحہ پہلا ورق	۱۵	[illegible]
" اندرونی	۱۰	۳
نصف صفحہ پہلا ورق	[illegible]	۲
" اندرونی	[illegible]	۱ ۸

البتہ تبادلہ کے طور پر اشتہارات کی اشاعت مطلوب ہو تو مراسلت کے ذریعہ تصفیہ ہوسکے گا۔

(۴) مجلّہ کے سلسلہ میں ہر قسم کی مراسلت معتمد انجمن طیلسانیین عثمانیہ کمرہ نمبر ۲۰ دیگا ۵ سٹرک نظام شاہی حیدرآباد دکن کے توسط سے کیجانی چاہئے۔

(۵) خریداران اپنے پتہ کی تبدیلی سے مہتمم مجلّہ کو بروقت مطلع فرمائیں۔

انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی ترجمان

مجلہ طیلسانین

ساتویں جلد ۔ آبان ۱۳۵۲ف ۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء ۔ شوال ۱۳۶۲ھ ۔ چوتھا شمارہ

مدیر: محمد غوث ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی (عثمانیہ)   مہتمم: محمد عبدالعلی بی ایس سی ایل ایل بی (عثمانیہ)

فہرست مضامین

عرض حال

گزشتہ شمارے میں اس امر کا اظہار کیا گیا تھا کہ عثمانیہ برادری اپنے ایک سینیر برادر مولوی محمد یوسف الدین مرحوم کے انتقال پر ماتم گسار ہے۔ کسے خبر تھی کہ مجلے کے اس شمارے کا صفحۂ ابتدائی بھی ماتم و اشک باری کے لیے وقف کرنا پڑے گا۔

شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ کے سب سے پہلے طیلسانی مولوی عبد القادر صاحب صدیقی بھی عین جوانی میں چل بسے۔ ان سے ملنے جلنے والے بظاہر ان پر کسی بیماری کا کوئی اثر نہیں دیکھتے تھے، لیکن معلوم ہوا کہ ان کے جگر کا فساد عرصے سے چلا آرہا تھا۔ اولاً پڑھنے لکھنے میں علاج معالجے پر توجہ نہیں کی، پھر درس و تدریس کے دل فریب مشغلے میں اس قدر منہمک ہوئے کہ گویا خود فراموشی پیدا کرلی۔ اسی خود فراموشی میں آخر کار جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بیماری کے سخت اور نازک ہونے کا ان کو اس وقت علم ہوا جب کہ دواخانے میں نسخہ تجویز کرانے کے لیے گئے۔ بیماری اس قدر نازک ہوچکی تھی کہ اطبانے ان کو دواخانے میں ہی روک لیا۔

مرحوم شعبۂ دینیات کے پہلے ام۔ اے بھی تھے جس زمانے میں امتحان ام۔ اے میں کامیاب ہوئے اس وقت جامعہ کے مختلف شعبوں میں خود طلبائے جامعہ کے ذمے درس و تدریس کے فرائض سپرد ہونے لگے تھے، اس لحاظ سے ان کے ام۔ اے کامیاب ہونے کے بعد یہ بجا توقع تھی کہ وہ بھی شعبۂ دینیات میں مامور ہوں گے۔ چنانچہ پندرہ برس وہ اپنے مادرِ علمی کی خدمت میں ذوق و شوق سے منہمک رہے۔ اور علالت سے جب تک مجبور اور فریش نہیں ہوگئے اپنے فرائض کی بجا آوری میں سر مو تجاوز نہیں کیا۔

ان کی خلیق اور ملنسار طبیعت، ان کی خاموش خدمت گزاری اور ان کے ذوقِ علم کو ان کے دوست اور شاگرد مدت العمر یاد کرتے رہیں گے۔

ہم ابھی یوسف الدین اور عبد القادر کے لیے ہی ماتم کناں تھے کہ اپنی برادری کا ایک اور روشن ستارہ بھی غروب ہوگیا۔ احمد عبد المجید صاحب رضوی بی۔ اے نے جامعہ کے کھیل کے میدانوں میں بڑی نام آوری پیدا کی تھی۔ ہر کھیل میں ان کی طبیعت پوری جولانی دکھاتی تھی۔ ساتھ ہی ذہن و دماغ کی قوتوں سے بھی بہرۂ وافر حاصل کیا تھا۔ اخلاق و محبت کے زیور سے بھی قدرت نے ان کو آراستہ کیا تھا۔ طیلسان حاصل کرکے سررشتۂ مال میں تحصیلداری کے انتخاب میں بازی لے گئے تھے۔ اب حال میں اے۔ آر۔ پی کے سررشتے میں منتقل ہوئے۔ اس جدید سررشتے کی ذمہ داریاں بہت اور نازک تھیں۔ بریں ہم مرحوم اپنی خداداد طبیعت کے جوہر ابھی دکھانے بھی نہیں پائے تھے کہ پیامِ اجل آگیا۔

اس طرح عثمانیہ برادری کے ارکانِ گرامی اپنے وقتِ مقررہ پر چل چلاؤ کی صدا پر لبیک کہہ کر ابدی سکون و اطمینان حاصل کرتے جارہے ہیں۔ اس قافلے کا سلسلہ یوں ہی باقی رہے گا۔ لیکن زندگی کا تقاضا یہ ہے کہ اس قسم کی آزمائشوں اور ابتلامیں سب اپنے لیے اس دُنیا میں بھی سکون و اطمینان اور راضی بہ رضا رہنے کی ہی دعا مانگا کریں۔

مجلے کی اس اشاعت پر نئی ادارت اور نئے انتظام پر گویا ایک سال گزر گیا۔ اس دوران میں نہ صرف چھٹی جلد کے دو شمارے مجموعۃً بلکہ ساتویں جلد کے چاروں شمارے علٰحدہ علٰحدہ شایع ہوگئے۔ مجلہ آہستہ آہستہ اپنی مشکلوں کا حل تلاش کرتا جارہا ہے۔ موجودہ نہایت ہی غیر معمولی حالات میں ایک خالص علمی مجلے کا تسلسل کے ساتھ جاری رہنا ہی بہت غنیمت ہے۔ مجلے کو اور زیادہ معیاری بنانا ناظرین اور معاونین کی اعانت پر منحصر ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ آیندہ سال مجلہ ظاہری اور معنوی، دونوں اعتبار سے اور زیادہ ترقی حاصل کرے۔

ترتیبِ مجلہ

۔ مجلے کی گزشتہ اشاعت میں اس امر کا اظہار کیا گیا تھا کہ "مجلے کی آیندہ اشاعت کو

گزشتہ کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ کے مقالات و خطبات اور دیگر تفصیلات کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔ ادارت کی جانب سے پوری کوشش کی گئی کہ سب مقالے اور ضروری رودادیں وقت پر مہیا ہو جائیں۔ لیکن پوری پوری کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ جو مقالے فراہم ہو سکے وہ اس اشاعت میں شریک کر دیے گئے ہیں۔ خطبات، اخبارات میں شایع ہو چکے تھے، ان کو پھر مجلے میں شایع کرنا، کاغذ کی اس نایابی کے زمانے میں کچھ زیادہ مناسب متصور نہ ہوا۔ ضروری رودادوں کے وصول ہونے کے لیے بھی بہت انتظار کیا گیا، وہ بھی آخر تک وصول نہ ہوئیں۔ اب ان رودادوں کے شایع کرنے کا وقت گزر گیا ہے۔ البتہ تقریریں قلم بند کر کے اور دوسرے مقالے بعد نظرِ ثانی بھیجے جائیں تو ان کی اشاعت کے لیے کوشش کی جائے گی۔

۲۔ کانفرنس کے موقع پر عثمانیین کی تالیفوں وغیرہ کی نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ اس موقع پر مولفوں کی جو ابجد واری فہرست ان کی تالیفوں کی صراحت کے ساتھ مرتب کی گئی وہ مجلے کی اس اشاعت میں شایع کی جا رہی ہے۔ اس فہرست کی تکمیل میں امید ہے کہ سب اصحاب اپنی اعانت سے دریغ نہ فرمائیں گے۔

فکر و نظر

حیدرآباد کا حلقۂ ملازمت اپنے دام میں ملک کے بیسیوں قابل ترین دماغوں کو اسیر کیے ہوئے ہے، اور یہ آرزو رہتی ہے کہ جو شخص اس دام سے نکل آئے وہ اگر ابھی توانا ہے تو خدمتِ قوم میں بھی کچھ وقت گزارے۔ ہمارے ملک میں وظیفہ یابی کے بعد عموماً پھر بازماموری کے لیے ہی دوڑ دھوپ شروع ہو جاتی ہے۔ ہمارے ملک سے قطع نظر دوسرے ممالک میں وظیفہ یابی کے بعد حوصلہ مند لوگ جس قسم کے مشاغل اختیار کرتے ہیں ان کو مسٹر سی راج گوپال چاری نے اپنی ایک تالیف میں یوں بیان کیا ہے:-

"میں اپنے لیے باعث فخر سمجھتا ہوں کہ میں نے کرنل میڈک کی شام زندگی کا منظر دیکھا۔ وہ علمی تحقیقات کے کام اس مستعدی سے کر رہے ہیں جیسے کوئی بیس برس کا نوجوان۔ اس کے علاوہ بھی انھیں بہت سی چیزوں سے دلچسپی ہے، اور ان میں منہمک رہتے ہیں۔ وہ باغبانی کے فن میں مہارت رکھتے ہیں، اور ان کا ایک خوبصورت باغ ہے جس میں طرح طرح کے پھلوں اور پھولوں کے درخت ہیں، اور وہ ان پر مختلف قسم کے تجربے کیا کرتے ہیں۔ انھیں دودھ دہی تیار کرنے کا بھی شوق ہے اور اس تحقیقات کے ضمن میں کہ گائے کو دق ہونے کے کیا اسباب ہیں، انھوں نے گھانس کی قسموں پر، جو گائے کھاتی ہے، عجیب و غریب تجربے کئے ہیں۔ انھوں نے ان جراثیم کے متعلق بہت دن تک مسلسل تجربہ کیا جس سے بہترین مکھن پیدا ہو سکتا ہے اور اس میں انھیں کامیابی ہوئی مگر یہ معلوم ہوا کہ اس میں خرچ زیادہ ہوتا ہے۔ اپنے گھر بار کے لیے خود پٹرول سے گیس تیار کر رہے ہیں، اور ہر وقت کام میں محو رہتے ہیں۔

کرنل میڈک زیادہ مُسن نہیں بلکہ اور کم سن معلوم ہوتے تھے، کیونکہ اب وہ نوکری کے جھمیلے سے آزاد ہیں اور جن کاموں کا شوق ہے انھیں انجام دے سکتے ہیں۔"

واضح ہو کہ کرنل میڈک پونا کے وہ سرجن تھے جنھوں نے گاندھی جی پر ایک بہت ہی کامیاب عمل جراحی کیا تھا۔ مسٹر سی راج گوپال چاری نے جو حالات بیان کئے ہیں وہ راونڈ ٹیبل کانفرنس کے زمانے کے ہیں۔

اس ملک میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو وظیفہ لینے کے بعد کرنل میڈک کی طرح اس قدر مفید مشاغل میں اپنا وقت صرف کرتے ہوں۔ اگرچند قابل اور توانا وظیفہ یاب وظیفہ پانے کے بعد قومی خدمت کے میدان میں قدم رکھیں تو کام کے لیے جو میدان ہے اس کی وسعت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔

قانون تجاذب اور سیرت سازی

از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

بدی کنی و نیکی طمع می داری ۔۔۔ ہم بد باشد سزائے بدکرداری

با آن کہ خداوند کریم است و رحیم ۔۔۔ گندم ندہد بار چو جو می کاری (رومی)

قانون تجاذب (Law of Attraction) ذہنی یا روحانی زندگی کا ایک ضروری کلی اور عالم گیر قانون ہے نہ اس کی ضد قابل تصور ہے اور نہ اس کا کوئی استثنا ہے! کون شبہہ کر سکتا ہے کہ جن طبائع میں مماثلت پائی جاتی ہے وہ ایک انجذابی قوت کے زیر اثر ایک دوسرے پر غیر شعوری طور پر مائل ہوتی ہیں اسی لئے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کی سیرت کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو دیکھو اس کی صحبت کیسی ہے قانون کی صداقت کا تو ہر کوئی قائل ہے لیکن ہمیں یہاں اس کے بعض تضمنات کو ذرا کھول کر بیان کرنا ہے

"ہشدار کہ راہ خود بخود گم نہ کنی"!

فکر کی دنیا میں اس قانون کی سرگرمی پر غور کرو! ایجابی اور نیک خیالات مماثل خیالات کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں اور ان کے درمیان ارتباط یا وابستگی ہوتی ہے، اسی طرح بد، سلبی اور شر انگیز افکار باہم وابستہ ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو پیدا کرتے ہیں، اپنی طرف کھینچتے ہیں، قوت پہنچاتے ہیں۔ تمہارے ذہن میں ایک خیال آتا ہے، اب اس کو تھوڑی دیر روکے رکھو، اس پر تخیل کی تعمیری قوتوں کو مرکوز کرو، مماثل خیالات کا خطور شروع ہو جائیگا، رفتہ رفتہ ان میں زیادتی ہوتی جائے گی اور بالآخر ان کا ہجوم ہونے لگے گا اور تمہارے ذہن کی فضا ان سے مملو ہو جائے گی! جن لوگوں نے اپنے ذہن کی تربیت میں کوشش کی ہے اور اپنے افکار و خیالات پر قابو پیدا کر لیا ہے وہ اس قانون کو تعمیری طریقے سے استعمال کرتے ہیں اور دنیا ان کی قوت فکری کا لوہا مانتی ہے۔ دیکھو مصنف کسی خاص موضوع پر قلم اٹھانا چاہتا ہے! ایک مرکزی خیال اس کے قلب پر چھایا ہوا ہے وہ رات دن اسی میں مستغرق ہوتا ہے، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اس کا ذہن اسی میں مصروف ہوتا ہے، ناگہاں

افکار و تصورات کا تسلسل شروع ہو جاتا ہے۔ اور نامعلوم و ناقابلِ علم منبع سے خیالات کا چشمہ ابلنے لگتا ہے اور جب تک یہ حالت نہ ہو مصنف لکھنے کی کوشش نہیں کرتا!

اسی طرح مقرر اپنی تقریر کی تیاری کے لئے اپنے موضوع پر ذہن کی سرچ لائٹ ڈالتا ہے، انہماک کے ساتھ اس پر غور کرتا ہے۔ قانون تجاذب کا غیر مرئی عمل مماثل تصورات کا ذخیرہ بہت جلد فراہم کر دیتا ہے ان میں ترتیب بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور نظام بھی یہ سب مبدءِ نامعلوم سے پیدا ہوتے ہیں اور مقرر کا ذہن ان کا قیام گاہ ہوتا ہے! یاد رکھو کہ مفکر تصورات کا خالق نہیں حامل ہوتا ہے وہ تصورات کو پیدا نہیں کرتا وہ محض قانون کی پیروی کرتا ہے اور نتیجہ کے طور پر اس کو خیالات، و افکار کا تحفہ عطا کیا جاتا ہے! یہ عطا ہر شخص کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے۔

قانون کے تضمن و تعبیر سے واقف ہونے کے بعد حصول مسرت اور تزکیۂ نفس یا سیرت سازی کی خاطر اس کا استعمال کرو۔ اس کی توضیح میں ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں لیکن ہم دو ایک مثالوں پر یہاں اکتفا کریں گے۔ فرض کرو کہ بیماری کا وہم تمہارے دل میں پیدا ہوا۔ اب بجائے اس کے کہ تم اس کو قبول کر لو اور اس کے متعلق فکر کرنے لگو اور ذہن کو مماثل وسوسوں اور وہموں کا آماج گاہ بنا لو تمہیں چاہیئے کہ اس وہم کی نفی کرو اور وہ اس طرح کہ سب درِ علم کی طرف فوراً متوجہ ہو جاؤ یعنے حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور آہستگی سے لیکن پورے اعتماد و اذعان کے ساتھ کہو:۔

حصنت نفسی بالحی القیوم الذی لا یموت ابداً و دفعت عنہا السوء بالف الف لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ ؎

یا یوں کہو "میں حق تعالیٰ کی حفاظت میں ہوں اور تمام بیماریوں اور آفتوں سے محفوظ ہوں"۔ ان الفاظ کو لیکار کر کہنے کی ضرورت نہیں محض ذہنی طور پر یہ کہے جا سکتے ہیں جو شخص اس طرح سلبی خیالات کو ذہن میں اترنے اور اپنی جگہ بنانے سے روکتا ہے، اور قانون تجاذب کو اجازت نہیں دیتا کہ اپنے عمل سے ان سلبی فاسد اور تباہ کن تصورات کی تعداد میں اضافہ کرے اور قلب کو خوف و ہراس سے بھر دے بلکہ اس کے برخلاف اپنی حقیقت کی

؎ "میں نے اپنے نفس کو محفوظ کیا اس ذات پاک کی مدد سے جو حی اور قیوم ہے اور جو کبھی نہیں مرتی اور اپنے نفس سے برائی کو دور کیا لاکھوں لاحول و قوۃ سے" یہ حدیث کے الفاظ ہیں ضروری نہیں کہ ان ہی کا استعمال کیا جائے۔ ان کے بجائے کوئی اور موزوں الفاظ استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

جانب متوجہ ہوجاتا ہے اور وہاں سے ایجابی اور قوت بخش تصورات کو اخذ کرتا ہے جو قانون تجاذب کے عمل سے ہر آن زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ ہر دم نئی طاقت حاصل کرتے جاتے ہیں، قلب کو قوی کرتے ہیں، سیرت کی تعمیر کرتے ہیں اور وفور قوت کی وجہ سے عمل میں نمایاں ہوتے ہیں، صحت کو درست کرتے ہیں، ماحول کو خوشگوار طریقے سے بدل دیتے ہیں، موافق مرام نتائج پیدا کرتے ہیں اور اس طرح قسمت ہی کو بدل دیتے ہیں! یاد رکھو بیماری کی اصل علت ذہنی ہوتی ہے کیوں کہ اگر ہم جراثیم کے نظریے کو بھی مان لیں تو بھی یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جراثیم کا اثر اس قلب پر نہیں ہوتا جو ایجابی (Positive) ہوتا ہے یعنے جو خود کو سلبی خیالات کا بازیگاہ نہیں بناتا جو ہر دم وساوس اور ہواجس کی نفی کرتا ہے اور ان کی بجائے ایجابی اور حیات بخش اور نیک خیالات کا اثبات کرتا رہتا ہے اور ان کے مبدء یعنے اپنی حقیقت کو کسی آن فراموش نہیں کرتا۔ ایسا قلب قوت کا مرکز ہوتا ہے توانائی کا مبدء ہوتا ہے، ایسا قلب بیماری کا آسانی کے ساتھ شکار کیسے ہوسکتا ہے! بیماری طبیعت کی کمزوری سے پیدا ہوتی ہے طبیعت اگر قوی ہو تو سرے سے بیماری کا وجود ہی ناممکن ہے، یہ کوئی ایجابی چیز نہیں بلکہ سلبی صفت ہے، قدرت کا نہ ہونا ہی عجز ہے، قوت کا نہ ہونا ہی بیماری ہے، سلبی خیالات، منفی افکار قوت کو سلب کرتے ہیں، قلب کو کمزور کرتے ہیں، اعضاء کو مضمحل کرتے ہیں، اعصاب میں تناؤ پیدا کرتے ہیں اور اسی لئے ان کو ایجابی وثبوتی تصورات سے بدل دیا جانا چاہیئے ایجابی افکار کا مبدء ارحق تعالے ہیں، جوں ہی ہم نے ان کی طرف اپنا رخ کیا، گویا ہم ظلمت سے نکل کر روشنی میں آگئے۔ اب روشنی کی کرنیں آہستہ آہستہ ہمارے جسم میں داخل ہوتی ہیں، ان سے مردہ اعصاب جاگ اٹھتے ہیں، مضمحل اعضا میں توانائی آتی ہے۔ قلب وجگر تازہ دم ہوجاتے ہیں، کھوئی ہوئی صحت پوری قوت کے ساتھ عود کر آتی ہے! صحت کے حصول کے لئے اور اس کے قیام و بقا کے واسطے اس قطعی وحتمی نسخے کو یاد رکھو اور ہمیشہ اس کو استعمال کرتے رہو!

قانون تجاذب کے استعمال کی ایک اور مثال پر غور کرو۔ تم پر کسی نے زیادتی کی ہے تمہارے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ کیا گیا ہے تمھیں غصہ آتا ہے، رنج ہوتا ہے، اضطراب ہوتا ہے اور تم اس نقصان پر ذہن کی ساری قوتوں مرکوز کر دیتے ہو نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ سب سے پہلے "مماثل" خیالات کا ہجوم قلب پر

ہونے لگتا ہے، یہ تاریک اندوہ خیز، زہریلے خیالات جو قانون تجاذب کے عمل سے پیدا ہو رہے ہیں اپنے منحوس سایہ سے تمہاری ذہنیت کو مسموم کر دیتے ہیں تمہاری مسرت فنا ہو جاتی ہے ۔ تمہاری صحت ٹوٹنے لگتی ہے اور ممکن ہے کہ بالآخر تمہارا دماغ بھی متاثر ہو جائے اور اس میں فتور آنے لگے ۔ آتشِ انتقام کا سوختہ فاتر دماغ اگر انتقام پر اتر آئے تو اس کے نتائج اور اثرات عموماً مسرت و طمانیت قلب کے لئے مفید نہیں ثابت ہوتے ۔

مرغ پرنارستہ چوں پرآں شود
لقمۂ ہر گربۂ دراں شود (معنوی)

اب اگر تم "دَعْ اَذٰهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ" (پ ۲۲ ع ۴) پر عمل کرتے ہوئے اس کو معاف کئے دیتے ہو اور اپنے خیالات کی رَو کو بدل دیتے ہو سلبی خیالات کی بجائے ایجابی افکار کے قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہو تو تمہیں ان تمام شر انگیز و فتنہ خیز نتائج سے نجات مل جاتی ہے اور اب تجاذب کا قانون تمام اچھی چیزوں کے رخ کو تمہاری طرف پھیر دیتا ہے ۔ اب تم کو حقیقی معنی میں حریت نصیب ہوتی ہے طمانیت حاصل ہوتی ہے مسرت میسر ہوتی ہے ۔ کیونکہ تم نے سینہ کو کینہ سے پاک کیا، غضب سے پاک کیا ان منفی جذبات کے دور ہو جانے سے تمہارے قلب سے ظلمت دور ہوئی، نور کا دخول ہوا اور تمہاری ہستی کا ہر ذرہ اس نور سے جگمگا اٹھا ۔ اسی لئے تو کسی عارف نے کہا ہے :-

عالم تمام یک گل بے خارمی شود
دل را از کینہ گر صفا کند کسے

ہر فعل کا اثر، ہر حرکت کا رد عمل، ہر علت کا معلول قطعی ہوتا ہے، یہ قانون کلی اور ضروری ہے، اب کینہ و غضب کے جذبات کا لازمی و جبری نتیجہ غم و حزن کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ۔ اسی طرح عفو و احسان، ہمت و کرم، صبر و شکر کا قطعی و ضروری نتیجہ مسرت و طمانیت، توافق و الفت، فلاح وغیرہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ علیت کے اس کلی اور عالمگیر، دوامی و لزومی قانون پر یقین ہو جائے تو اِحْسَنْ اِلٰى مَنْ اَسَآءَ، والے حکم پر عمل کرتے ہوئے ہمیں کوئی تکلف نہیں ہوتا اور ہم اپنے اس عقیدہ کا اظہار کسی شاعر تمام المعرفت کے سر لیے الفاظ میں یوں کرتے ہیں ۔

[1] چھوڑ دے ان کو تنہا اور بھروسہ کر اللہ پر ۔ [2] جس نے تمہارے ساتھ برائی کی ہے اس کے ساتھ [illegible]

ہر کسے در راہ من خارے نہد من گل نہم!

او سزائے خار یابد من جزائے گل برم!

یہ سن کر اور مان کر بھی تم ذرا جھلا کر کہتے ہو کہ یہ میرے بس کی بات ہے ، میں بہر حال بشر ہوں اور فطرۃً قائل بشر ہوں ، فطرۃً "ظلوم" ہوں ، "جہول" ہوں ظلمت و جہل میری ماہیت میں داخل ہیں ۔ ان صفات مذمومہ کو مجھ سے دور کیسے کیا جا سکتا ہے ۔ ان کی وجہ سے آفت و مصیبت میں مبتلا ہوتا رہتا ہوں لیکن سچ پوچھو تو حال یہ ہے :۔

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں

پھر وہی زندگی ہماری ہے! (غالب)

تم ایک حد تک ٹھیک کہتے ہو آؤ ہم تمہیں ایک نفسیاتی طریقہ بتلائیں جس کے استعمال سے تمہیں غایت کے حصول میں آسانی ہو گی ۔

جس شخص سے تمہیں نقصان پہونچا ہے اور جس کے خیال سے تمہارے بدن میں شورش ہوتی ہے اور جس کو معاف کرنا تم ممکن نہیں سمجھتے اس کو معاف کرنے کے لئے تمہیں چاہیئے کہ کچھ دن اس صداقت پر غور کرو۔

وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم اور تم کو جو کچھ مصیبت پہونچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے ویعفو عن کثیر۔ (پ ۲۵ ع ۵) کئے ہوئے کاموں سے ہے اور بہت سے تو اللہ درگزر ہی کر دیتا ہے

نیز انما ھی اعمالکم ترد علیکم (الحدیث) یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جاتے ہیں ۔

ذرا سوچو اصل میں تمہارا کوئی دشمن نہیں سوائے تمہارے نفس کے یہ سب کچھ اسی کا کمایا ہوا ہے اور اسی کے میں کا تقاضا "یداک کسبتا و فوک نفخ"[1] دوسرے کو اپنے افعال کا ذمہ دار قرار دینا تمہارے عقل کی کجی اور جذبات کی خامی کی دلیل ہے ! جوں جوں تم اس صداقت پر غور کرتے جاؤ گے تم پر واقعات کھلتے جائیں گے اور ہر آفت ، ہر مصیبت کی علت تم اپنی کسی حماقت کو پاؤ گے ! اگر سلسلۂ تفکر کو چند روز جاری رکھو گے تو حقیقت اس قدر مبرہن ہو جائے گی کہ بے اختیار چیخ اٹھو گے کہ غلطی میری تھی کسی دوسرے کی نہیں اور حق تعالیٰ کے طرف ظلم کی نسبت تو کسی طرح نہیں کی جا سکتی ہے ۔ ان اللہ لیس بظلام للعبید[2] :۔

[1] ۔ تیرے ہاتھوں نے کمایا ہے اور تیرے ہی منہ نے پھونکا ہے ۔ [2] ۔ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے!!

ہر چہ ہست از قامت ناسازیٔ اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

اس اصول کی صداقت کے وجدان میں کھل جانے کے بعد تم اپنے دشمن کو بھی معاف کرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔

اگر تم جذباتی انسان ہو عقل سے کافی حصہ تمہیں نہیں ملا ہے اور مذکورۂ بالا اصول تمہاری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا تو تمہیں دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

جس شخص کو تمہیں معاف کرنا ہے اس کی شبیہہ اپنے تخیل کی مدد سے اپنی نظروں کے سامنے لے آؤ اور اب اس کو مخاطب کرکے کہو:۔

"میں تمہیں (نام شخص) حسبۃً للہ پوری طرح معاف کرتا ہوں، دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ تمہیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کریں اور تمہیں نورانی کردیں، آمین"

اگر تم یہ عمل چند روز مسلسل خلوص دل کے ساتھ کرتے رہو تو کچھ دن بعد تمہیں یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ تمہارے لئے اُس شخص کو معاف کر دینا زیادہ مشکل تو نہیں۔ اپنے اس مجاہدہ سے اگر تم نے حسن خلق حاصل کر لیا کہ خلق کی طرف سے جفا کے باوجود ان سے وفا کی۔ رحمت و شفقت کو اپنا شعار بنایا اور ان کے لئے بخشش و عفو کی دعا کی۔ تو اب حقیقی مسرت، طمانیت، سکون، بردباری، محبت وہ انعامات ہیں جو حق تعالیٰ کی جانب سے تم کو عطا کئے جائیں گے اور وہ تمہیں بطریق اجتبا اپنی جانب کھینچ لیں گے۔

راہ بسیار راست مردم را بسوئے حق ولے
راہ نزدیکش دل مردم بدست آوردن است (صائب)

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ . لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ[1]۔

(پ ۲۳ ع ۲)

---

[1] بیشک یہی ہے بڑی مراد ملنی، ایسی چیزوں کے واسطے چاہیئے محنت کریں محنت کرنے والے۔

حسن کا ادبی پہلو

از جناب محمد عبدالقیوم خان صاحب باقی ۔ ایم۔ اے (عثمانیہ) لکچرار ادبیات اردو جامعۂ عثمانیہ

حقیقت کے تین رخ

حقیقت کا جلوہ انسان نے تین زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ایک صداقت، دوسرے خیر اور تیسرے حسن۔ یہہ تین روپ گویا فطرت اور زندگی کی تمورتی ہے، صداقت کا تعلق منطق، خیر کا تعلق اخلاقیات اور حسن کا تعلق جمالیات سے ہے۔ ہمیں آج کی صحبت میں یہہ معلوم کرنا ہے کہ حسن کی فطرت اور ماہیت کیا ہے؟ اور ادب میں اس کی تخلیق کس طرح ہوتی ہے؟

لیکن اس سے پہلے ایک امر کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے، وہ یہہ کہ لفظ حسن کے ساتھ جو ہماری دلچسپیاں وابستہ رہتی ہیں، اسکی وجہ یہہ ہوتی ہے کہ ہم اس کے ساتھ اپنے حسن جذبات کو بھی شامل کر دیتے ہیں جیسے کہ جوش کی شاعری میں ہے لیکن اصولی تحقیق میں حسین متعلقات کی حیثیت آفل شمار کی جاتی ہے۔ بعض منکرین مثل (رسکن اور ہوگارت) نے محض جمالیاتی نقطۂ نظر سے حسن انسانی کو سراہا ہے لیکن یہہ بحث طلب مسئلہ ہے۔

حسن ایک غزال وحشی ہے

حسن کی حیثیت عجیب ہے۔ جب سے انسانی شعور پیدا ہوا ہے اس وقت سے حسن انسان کے ساتھ ہے اس کے اندر ہے، باہر ہے، اوپر ہے گرد و پیش ہے۔ اس کے اعمال کے ساتھ ترقی کرتا ہے اور اس کے ساتھ عروج و زوال کی منزلیں طے کرتا ہے لیکن ایسی قریبی شئے کے متعلق ہم ابھی تک یہہ نہیں جانتے کہ یہہ ہے کیا؟ ہمارے اعمال کی دنیا اس سے معمور ہے لیکن علم کی دنیا اس سے خالی نظر آتی ہے۔

چنانچہ ایک شاعر نے حسن ہی کے تصور پر خوب کہا تھا۔

یہ دہ داری یہ کہ ہر شئے میں ہے جلوہ آشکار ۔۔۔ بے حجابی یہ کہ صورت آج تک دیکھی نہیں

حسن ہمیشہ سے انسان کے ساتھ رہا، لیکن جب کبھی اسے شمشیرِ خیال میں اسیر کرنے کی کوشش کی گئی، یہہ اس سے گریز کرتا رہا۔ مصر، بابل، نینوا، شام کی تہذیب و تمدن میں حسن اپنی نمایاں حیثیت رکھتا ہے لیکن ان اقوام میں سے کسی نے یہ دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ حسن کیا ہے؟ اس کا آغاز ان یونانی مفکرین نے کیا جنھیں دنیا آج تک افلاطون اور ارسطو کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس وقت سے آج تک یعنے تقریباً دو ہزار سال سے انسان اس حسن گریزاں کو اسیر کرنے میں کوشاں ہے۔ جن علوم نے اس کا پیچھا اٹھایا ہے۔ وہ چار ہیں، ایک فلسفہ دوسرے نفسیات، تیسرے علم تشریح (physiology) اور چوتھے (سائنس) لیکن حسن کا تعاقب کرنے میں انسان کی حیثیت تین قسم کی ہے۔ (۱) ناظرِ حسن (۲) ناقدِ حسن (۳) خالقِ حسن، ہماری آج کی صحبت زیادہ تر انسان کی تیسری حیثیت خالقِ حسن یعنے حسن کار سے ہوگی لیکن اس سے پہلے نقاد بن کر حسن کے فلسفے کے متعلق چند مسائل سمجھنے ضروری ہیں۔

حسن داخلی ہے یا خارجی؟

حسن کے متعلق ہمیں سب سے پہلے اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہیے کہ آیا حسن کائنات کے جملہ مظاہر اور اعیان میں ایک صفت بن کر پہلے سے موجود ہے (جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے) یا اس کا پہچاننا اور اس سے لطف اٹھانا انسان کے داخلی احساسات پر مبنی ہے۔ لیکن اس مشکل سوال کا جواب اس وقت تک نہیں دیا جاسکتا جب تک ہم دنیا کے بعض اہم مفکرین سے خود نہ پوچھ لیں کہ وہ حسن کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں یہ چاہتا ہوں کہ معلمین اوّل یعنے افلاطون اور ارسطو اور فلاطینوس کے بنیادی نظریوں کا ذکر کروں، اور پھر دو جرمن مفکرین، کانٹ اور ہارٹن کے خیالات کی شرح کروں۔

افلاطون کا نظریۂ حسن

یہہ کہنا ایک حد تک درست ہے کہ انسان فطرتاً افلاطونی ہوتا ہے یا ارسطوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان یا تو تصوری ہوتا ہے یا حقیقت پرست۔ افلاطون کا حسن کے متعلق نظریہ یہہ ہے کہ حسن تصوری ہے اور پہلے سے موجود ہے۔ وجود کائنات سے اور احسن ایک تمثال (Idea) ہے وہ ایک نورِ مطلق کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب وہ موجودات میں داخل ہوتا ہے تو اس کا نور تاریک تر

ہوتا جاتا ہے، اس لئے وہ کائنات کو حسن ازل کا پرتو اور سایہ قرار دیتا ہے۔ جب حسن کار فطرت کی تقلید کرتا اور اپنے آرٹ کی بنیاد فطرت پر مبنی پر رکھتا ہے تو اس کا آرٹ سایہ کا سایہ عکس کا عکس بن جاتا ہے (فیڈ ریس) میں اس نے بڑی خوبی سے کہا ہے کہ حسن مطلق ماورائے احساس کا ایک جوہر ہے جب دل اس کا سامنا کرتا ہے تو اس میں ایک ترنگ سی آجاتی ہے حسن کا یہ ذہنی نظارہ اسے اتنا خالص اور لطیف بنا دیتا ہے کہ نظارہ حسن بن جاتا ہے غیر حسی حیثیت سے حسن کا شعور وجدانی ہے یعنے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے وجود سے ماقبل کی زندگی میں حسن کو دیکھا ہے اور اس وقت اس کا جلوہ ہمارے احساس کے شیشوں سے چھن کر ایسا آرہا ہے جیسے آفتاب کی شعاع، تاریک شیشوں میں سے گذرتی ہے یہ بصارت اور نمو کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے (پروفیسر ناٹ) نے مکالمات افلاطون میں حسن کے متعدد اور عمیق خیالات سے ایک جامع تصور حسب ذیل پیدا کیا ہے ۔ اور بکھرے ہوئے موتیوں کو سمیٹ کر اس طرح کی مالا تیار کی ہے ۔ "پروفیسر ناٹ"

"ہر شئے میں دو امور کا اتصال ہے ۔ ایک حقیقی منظر اور دوسرا خیال جو اس کے اندر ہوتا ہے اور اس سانچے میں متعین بنتا ہے ۔ قالب انفرادی اور ٹھوس ہوتا ہے ۔ خیال ( ) عام اور غیر مادی ۔ قالب مرئی ہوتا ہے اور جلد گذر جاتا ہے ۔ خیال غیر مرئی ہوتا ہے ۔ ا ا مکمل ہو ۔ پست تر کا یہ کام ہے کہ بالاتر کی طرف ۔۔۔ جائے ۔

جس طرح فلسفے کا اہم منصب یہ ہے کہ وہ مظاہر سے اعیان کی طرف لے جائے اسی طرح اس خاص معاملے میں فلسفہ ہمیں ایک خاص عالمگیر اور کامل اصل یعنے حسن کی طرف لے جاتا ہے ۔ یہ حسن نہ جلی ہو سکتا ہے نہ خفی بلکہ جو ہمیشہ ہے اور ہمیشہ تھا اور ہمیشہ رہے گا ۔ وہ ہر شئے کے قلب میں، کائنات کے ہر شئے میں موجود ہے ۔"

حسن اور ارسطو

افلاطون کے برعکس ارسطو کا فلسفہ تعمیہ پر نہیں بلکہ تجربہ پر ہے ۔ وہ حقیقت سے تصور کی طرف

جاتا ہے۔ اس لئے اس نے موجودات اور حقائق کا تجزیہ کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے میں عمر گذار دی۔ اس نے افلاطون کی طرح حسن کو ایک حسن مطلق فرض نہیں کیا۔ اس کے نزدیک حسن کا تصور اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوتا جب تک کہ موجودات کے ساتھ اس کے اضافی تعلق پر غور نہ کیا جائے۔ لیکن جب حسن اضافی ہے، تو اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ کارآمد مفید یا اخلاقی بھی ہے۔ حسن کو ایک عالم سکون اور خاموش زندگی میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ حسن کا جذبہ خواہش کا جذبہ نہیں ہے۔ بلکہ غور و فکر کا جذبہ ہے۔ اس نے ان خارجی اشیاء کی صفات جو حسن رکھتی ہیں تنظیم (Order) اور توازن (Symmetry) قرار دی آخر میں اس نے اپنا ایک مشہور نظریہ پیش کیا کہ حسن بہ ہر حیثیت "Means between the extremes" ہے یہ جامع الفاظ بعد کو شیلر کی دو بنیادوں اور کانٹ کے اتحاد عقل و ارادہ کی بنیاد بن گئے۔ "خیر الامور اوسطہا" میں اخلاقی تصور ہے لیکن ارسطو کے نزدیک حسن کے تصور کی بنیاد بھی یہی ہے

فلاطینوس (شہر اسکندریہ کا مفکر ہے۔ ۲۵۰ - ۲۷۰ء)

"حسن مادی اشیاء میں موجود نہیں ہے، بلکہ ان ازلی خیالات میں پایا جاتا ہے جو مادی اشکال میں نامکمل حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ یہ حسن ظاہری آنکھوں سے نہیں۔ بلکہ "چشم باطن" سے دیکھا جاتا ہے۔ کائنات میں لامحدود یا ازل۔ حواس یا عقلیت کے ذریعہ نہیں پہچانا جاتا، بلکہ وجدان کے ذریعہ وہ ہمارے اندر اپنا وجود محسوس کراتا اور ہمارے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔" ( )

وہ صاف کہتا ہے:۔ "حسن وہ ہے جو تناسب و تنظیم میں نہیں، بلکہ ہماری فطرت کے ہم آہنگ ہو جائے۔ بدصورت وہ ہے جو اس کی ضد بن کر ہماری فطرت سے دور ہو جائے۔ حسین اشیاء ہماری روح کے ساتھ جو موانست ہے وہ اس کا مبداء ( ) ہے۔ جو دونوں کو پیدا کرتا ہے جس میں وہ قالب (Formed) بن جاتا ہے۔ بدصورت وہ ہے جو غیر قالبی (Unformed) ہو۔ حسن ایک ازلی خیال ہے جو مادہ میں چمکتا رہتا ہے۔ مادہ اس وقت

حسین بن جاتا ہے جب وہ خیال سے منور ہو جائے۔ حسن نہ صرف مرئی اور سماعی اشیاء ہی میں نہیں بلکہ ہمارے اعمال، مناصب، عادتوں، ارادوں، قدروں اور علوم میں بھی نظر آتا ہے۔ [1]

حسن کے متعلق ان تین متکلمین اول کے نظریے اس لئے پیش کئے گئے کہ آئندہ حسن کے متعلق جو فلسفیانہ تحقیقات ہوئیں وہ انھیں بنیادوں پر ہوئیں۔ سائنس یعنے طبیعیات، کیمیا، نفسیات، علم الانسان نے اس میں نئے باب کھولے۔ ہمارے ان متکلمین اول نے حسن کے غزال رعنا کو کمند خیال میں گرفتار کیا ہے تو ہمیں اس کی تین حیثیتیں نظر آتی ہیں۔

خلاصہ

(۱) حسن ایک خیال مطلق ہے جو ماورائے وجود ہے اور کائنات میں منعکس ہے۔

(۲) حسن ایک حقیقت ہے اور کائنات کے ساتھ اضافی تعلق میں محسوس کیا جاتا ہے، جس کی دو صفتیں تنظیم و تناسب ہیں۔

Beauty is thus the eternal word or reason of the Universe dimly shadowed forth by symbols in matter. Objects are ugly when they are devoid of the word. They are beautiful when they are filled with it; And the soul of the artist if susceptible to beauty drinks it in and becomes filled with the word of the Universe"

The eye could never have beheld the sun had it not become sunlike. The mind could never have perceived the beautiful had it not first become beautiful itself"

(۳) حسن ایک عقلیت ایک لفظ ہے جو کائنات میں مثال بن کر اور صرف وجدان کے
ذریعے سمجھا جاتا ہے

ایک طویل مذہبی وقفہ کے بعد اٹھارویں صدی میں حسن پر داخلی حیثیت سے فکر کی گئی۔ اس کا آغاز جرمن مفکر بام گارٹن (۱۷۶۲-۱۷۱۴ء) سے ہوا۔ لیکن ہم اپنے مقصد کی حد تک اٹھارویں صدی سے بیسویں صدی کے مفکرین کے نظریوں میں سے صرف دو پر بحث کریں گے۔ ایک امانوئیل کانٹ جس کے متعلق ہیگل نے کہا تھا کہ حسن کے متعلق سب سے پہلا معقول لفظ اسی کا ہے۔ دوسرے ہارٹن۔

امانیول کانٹ

کانٹ کا فلسفہ حسن بہت نازک اور پیچیدہ ہے۔ تاہم اسے واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کانٹ نے پہلے یہ بتایا کہ انسانی دماغ کی تین صلاحتیں ہوتی ہیں۔ (۱) ملکۂ علم (۲) ملکۂ غم و مسرت (۳) ملکۂ ارادہ اس نے اپنی تین مشہور کتابوں میں ان تینوں کی علٰحدہ علٰحدہ وضاحت کی۔ وہ کہتا ہے کہ ملکۂ علم کو اپنے عقلیتِ محض کی تنقید میں سمجھایا۔ ملکۂ ارادہ کو عملی عقلیت کی تنقید میں واضح کیا لیکن غم و مسرت کے لئے اسے بہت الجھن رہی۔ بالآخر اس کی تکمیل (تنقید تصدیق) کے ذریعہ ہوئی۔ جو اس کی تیسری اہم کتاب ہے۔ حسن کے متعلق اس آخری کتاب میں نہ صرف تکملہ ملتا ہے۔ بلکہ اس کی دو پہلی کتابوں کے نظام فکر کا اتحاد بھی پایا جاتا ہے۔

کانٹ کا استدلال یہ ہے کہ حسن کا احساس درحقیقت ایک درمیانی احساس ہے جو عقلیت اور ارادے کے اتحاد عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ صاف الفاظ میں کانٹ کے تصور حسن کی بنیادی نظریہ یہ ہے

"We can feel what we can niether know nor will"

اس اصول و ساطت و صداقت است اس لیے

حسن کے غزال رعنا کا شکار کیا۔ جب ہم عقلیت کے ذریعے مظاہر اور اعیان کی دنیا سے ماورا کی دنیا میں نفوذ نہیں کر سکتے اور جب ارادے کی توانائی صرف ہمارے اندر گھٹ کے رہ جاتی اور داخل رہتی ہے، تو ہمیں ایسی اشیاء کا احساس ہوتا ہے جو ہم سے دور ہیں اور جو ہمارے اندر ایک قسم کی ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں

یہ درمیانی خلا اور احساس ہم آہنگی حسن کا احساس ہے۔ یہ بروہ سمجھتا ہے کہ ہم حسن کا شعور چار طریقوں سے کرتے ہیں۔

(۱) کسی شئے کو حسین کہہ کر ہم اپنی ایک مسرت سے واقف ہوتے اور اس کا شعور پیدا کرتے ہیں لیکن یہ مسرت "بے غرض" ہوتی ہے۔

(۲) پھر ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس احساس کو دوسروں تک پہنچانا چاہیئے۔ ہم اس شئے کے متعلق اپنے احساسات کو عالمگیر بنانا چاہتے ہیں اور اس لئے بنانا چاہتے ہیں کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سارے انسان ہماری طرح ایک ہی فطرت رکھتے اور ہمارے ہم خیال ہو سکتے ہیں۔

(۳) جب ہم کسی شئے کو حسین کہتے ہیں تو گویا ہم اسی شیے کے ساتھ اپنے ذاتی تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ مگر اس تعلق کی کوئی وجہ قرار نہیں دے سکتے۔

(۴) حسین اشیاء ہمیں اس لئے حسین نظر نہیں آتیں کہ ان میں کمال ہے، یا وہ ہمیں اکساتی ہیں، بلکہ وہ ہماری صلاحیتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر کام کرتی ہیں۔

پھر اس سوال کا جواب دینا بھی ضروری ہے کہ ہم حسن کے متعلق اپنے خیالات کو عالمگیر کیوں بناتے ہیں وہ کہتا ہے کہ انسان اپنی طرح ساری فطرت میں ایک عقلیت محسوس کرتا ہے، وہ اس عقلیت سے فائدہ اٹھا کر دوسروں کو اپنے احساسات حسن سے لطف اندوز کرتا ہے۔

کروچے نے کانٹ کے ۴ (..............) تعریفات کی وضاحت خوب کی ہے جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) وہ حسین ہے جو ہمیں بغیر کسی غرض کے خوش کرے۔

(۲) وہ حسین ہے جو ہمیں بغیر کسی تصور کے خوش کرے۔

دونوں (Sensationilsts) "جذبات پرستوں" کے خلاف پیش کی گئیں۔ اب دو (Intellectualists) "عقل پرستوں" کے متعلق ہیں۔

(۳) وہ حسن ہے جو آخریت اور مقصد کا قالب اختیار تو کرے لیکن کسی انجام کی نمائندگی

نہ کرے۔ یعنے حسن میں کمال ہوتا ہے۔ لیکن کمال منتہیٰ کو نہیں پہنچا۔

(۴) وہ حسین ہے جو عالمگیر مسرت کی شئے ہے۔

ہارمن

ہارمن نے حسن کے تصور کو بڑی ذہانت اور ایمائیت کے ساتھ سمجھایا۔ یہ گویا ایک قسم کا مغربی اشراقیت ہے۔ اس نے ہیگل کے "مطلق اور شوپنہار کی مشیت" کو ملا کر اپنا نظریہ پیش کیا۔ جیسے (.........) "نظریۂ بیخودی" کہتے ہیں۔ اس نے سب سے پہلے حسن کے متعلق غور کرنے والوں کے مختلف اصولوں اور نظریات کی تنقید کی۔ اس نے (.........) عقل پرستوں (Intellectualists) وجدان پرستوں (.........) جذبات پرستوں (.........) اشکال پرستوں (.........) وغیرہ پر نظر ثانی کی اور یہ سمجھایا کہ ان سب میں تھوڑی تھوڑی صحت موجود ہے۔ اور ضرورت ہے کہ ان نیم صداقتوں سے حسن کے متعلق ایک اجتماعی تصور پیدا کیا جائے۔

وہ کہتا ہے جب تک حسن کسی مادی شئے میں (.........) حلول نہیں کرتا اور تجسیم نہیں پاتا۔ اس وقت تک حسن کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس نتائج میں اصول یہ ہے کہ :۔ (......) خیالی کو نیم شعوری طریقے سے (......حقیقی) بنایا جاتا ہے اور (......) (غیر مادی) کو (......) مادی) میں مقید کیا جاتا ہے۔ جب تک ایسا نہ ہو حسن کا ادراک ناممکن ہے۔ حسن کا انکشاف اور حسن کی تخلیق دونوں غیر شعوری طریقوں سے ہوتی ہے۔ عمیق النظری اور واضح نگاہی سے غیر شعوریت کو نقصان پہنچتا ہے اور حسن غائب ہو جاتا ہے۔

پھر وہ حسن پر دو طریقوں سے غور کرتا ہے۔ ایک حسن کا تصور اور اس کا انسان اور فطرت کے تین مقام۔ دوسرے فطرت، تاریخ اور آرٹ میں اس حسن کا انکشاف۔ وہ آرٹ کے متعلق اس انتہا پسندی کو مٹا دینا چاہتا ہے کہ آرٹ مکمل داخلی ہے یا مکمل خارجی۔ وہ کہتا ہے کہ آرٹ کا یہ عمل خارجی طور پر حقیقت ہوتا ہے۔ لیکن اس کا داخلی اثر حسن کہلاتا ہے۔

حسن ایک چمک ہے۔ (Schine)

آخری اور اہم بحث یہہ ہے کہ حسن ایک قسم کا "شائین" یعنی چمک ہے۔ یہ چمک نہ ذہن میں موجود ہے اور نہ خارجی اشیاء میں۔ خارجی اشیاء تو محض اس چمک کو دعوت دیتے ہیں اور آرٹ کے ذریعے یہ چمک عام انسانوں کے مشاہدہ میں اس وقت آتی ہے جبکہ وہ حسن کارانہ اعمال کے ذریعے پیش کی جاتی ہے۔ وہ مختلف قسم کی چمک" کا ذکر کرتا ہے آنکھ کی چمک، کان کی چمک، تخئیل کی چمک آواز کی چمک، لے کی چمک، تصور کی چمک، اور کہتا ہے کہ اسی چمک میں حسن رہتا ہے۔ یہ چمک حقیقی ہے نہ تخیلی۔ نہ وہ منظر ہے نہ تصور۔ اگر کسی تصویر کو دیکھیں تو ساری تصویر ایک شئے ہوگی۔ اور "چمک" اس کا نفس اور ذہنی پہلو۔ یہ تصویر کا سانچہ نہیں بلکہ اس کی روح ہے۔

اس مختصر پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے۔ ہم اپنے پہلے سوال کی طرف لوٹتے ہیں کہ حسن آیا کسی شئے کی حقیقت ہے۔ جو اس میں پہلے سے موجود رہتی ہے، وہ صرف ہمارے احساس، مشاہدے اور ذوق پر منحصر ہے۔ جدید فلسفے نے اس کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا ہے لیکن بحیثیت مجموعی اتفاق رائے اس امر پر ہے، اور مفکرین کی تحقیقات اسی تصور پر مبنی معلوم ہوتی ہیں کہ حسن خارجی نہیں اور نہ کسی خاص شئے کی صفت ہے بلکہ وہ ہے، جیسے ہیوم نے صاف طور پر سمجھا دیا۔

ہیوم

"Beauty is no quality in things themselves it exists merely in the mind which contemplates them."

"حسن اشیائے محض کی خاص صفت نہیں۔ وہ اس دماغ میں موجود رہتا ہے جو ان پر غور و فکر کرتا ہے۔"

ہیوم نے حسن اور فطرت انسانی کے اس ربط کے متعلق جو نظریہ قایم کیا ہے، وہ جدید مفکرین کے لئے نشان راہ کا کام دیتا ہے۔ جدید مفکرین مثلاً، اسپنسر، گروز، بالڈوین، کروچے، راجر فرائی، ہربرٹ ریڈ، سالمن سیموں نے اسی نظریے کی بنیاد پر حسن کی نفسیاتی تشریح کی ہے۔ اس کا اچھا ثبوت ہمیں ادب میں مل سکتا ہے۔ چونکہ ادب کا تعلق داخلی احساسات سے ہے اور حسن بھی داخلی نوعیت رکھتا ہے، اس لئے مناسب ہوگا کہ ہم حسن کے ادبی پہلو پر بجائے فلسفے کے نفسیات کے نقطۂ نظر

ے غور کریں کیونکہ نفسیات ہی کے ذریعے حسن کی بنیاد انسانی دل و دماغ کا عمل اور تجربہ ہے ۔ ہم یہ معلوم کرسکتے ہیں
ادب میں حسن کسے کہتے ہیں، یہ کس طرح پیدا ہوتا ہے اور اس کا اثر اور ماہیت کیا ہے ؟
مفکرین نے نفسیاتی نقطۂ نظر سے حسن کے متعلق مختلف نظریے قائم کئے ہیں ۔ ان میں اہم اور بڑی
حد تک مکمل اور معقول مسئلہ حسن ( ) پیقر ( ) کے الفاظ میں یہ ہے ۔

ادب اور حسن

"ادب حسن کی ماہیت یہ ہے ۔ وہ کسی انجام تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور واسطہ ۔ واسطہ یہ ہے ۔ حرکتی، بصری، سماعی اور دیگر تخیلی میدانوں میں ہیجان اور تحریک کا امکان ۔ انجام کیا ہے ؟ انجام ایک ساعت تکمیل ہے ۔ ایک ایسا تجربہ حاصل کرنا ہے جو اپنی فطرت میں مکمل ہو ۔ ایک ایسی موافق تحریک جو سکون کے ساتھ کی جائے ۔ حسن جس طرح فلاطینس نے کہا کاملیت نہیں ، کسی شئے کا حسن یہ ہے کہ وہ ساعت تکمیل پیدا کرسکے ۔ اس ساعت کا تجربہ یعنے تحریک اور سکون کا اتحاد ، جمالیاتی تجربے کا جزو ترکیبی ہے ۔"

ادب میں حسن کی دو خصوصیات

اصطلاحوں سے ہٹ کر اس تعریف سے حسن کی جو خصوصیات معلوم ہوتی ہیں وہ دو ہیں ۔

(۱) حسن انسان کے اندر ایک تحریک اور ہیجان پیدا کرتا اور اس کا ردعمل یعنے نتیجہ سکون اور تفکر ہوتا ہے ۔

(۲) حسن ایک اندرونی تجربہ کا نام جس میں ہم یہ محسوس کریں کہ وہ اپنی حد تک مکمل اور اطمینان بخش ہے ۔

گویا تحریک، سکون اور کمال یہ حسن کے تین نفسیاتی رخ ہیں ۔

آیئے اب انھیں بنیادوں پر ادب میں حسن کی ماہیت پر غور کریں ۔

سب سے پہلے ہمیں اپنے پہلے بیان کی ہوئی بات میں سے ایک کا تعین کرلینا ضروری ہے ۔

وہ یہ ہو کہ حسن سے وابستہ ہونیکی انسانی حیثیتیں تین ہوتی ہیں ۔ (۱) ناظر حسن (۲) ناقد حسن (۳) خالق حسن
ادب میں حسن کار زیادہ تر خالق حسن ہوتا ہے اور اس نظریئے کی تشریح کرتا ہے کہ "حسن کار نہ صرف
حسن فطرت کی تقلید کرتا ہے، بلکہ حسن پر اضافہ بھی کرتا ہے"۔ جس طرح اقبال نے کہا ہے ۔

عشق ما اندر جہاں ہنگامہ ہا تعمیر کرد ۔۔۔ ورنہ این شہر خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

اس کے ساتھ یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ادب ایک (Temporal art) ہے
یعنے یہہ نظری نہیں بلکہ جذباتی ہے اور اس حسن کی چند صفات حسب ذیل ہیں ۔

ادب میں حسن کی عام صفات

(۱) ادب کا حسن عورت کے حسن کی طرح بدیہی اور نظری نہیں بلکہ داخلی اور حسی ہے ۔

(۲) اس میں جس طرح کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے "جنت نگاہ" اور "فردوس گوش" کی تفریحی اقدار
ہی نہیں ہوتیں، بلکہ اس میں معلومات آفرین مقصد بھی ہوتا ہے ۔

(۳) ادب برائے ادب کے معنے صرف یہہ ہیں کہ ادب اپنے مقصد سے آگاہ ہو لیکن ادب
کا حسن عام آزاد اور ہمہ گیر ہوتا ہے ۔

(۴) ادب کے حسن میں گفتگو کی صفت بہت زیادہ ہے کیونکہ اس میں الفاظ کا استعمال
ہے جو نہ صرف جذبات انسانی کے ترجمان ہوتے ہیں بلکہ اس کے خیالات، شعور اور معنی آفرینی کی مکمل تصویر بھی۔

(۵) ادب کے حسن میں مصوری، موسیقی، بت تراشی، رقص اور تعمیر کے عناصر شامل رہتے ہیں ۔

اس تمہید کے بعد ہمیں یہہ معلوم کرنا ہے کہ ادب میں حسن کی ایک واضح تشریح و تعریف کیا ہوسکتی
ہے۔ حسن کا کام یہہ ہے کہ وہ احساسات کے ذریعے انسان میں ایک طلسمی اثر پیدا کرے اور ایک ساعت
تکمیل کا جلوہ دکھائے ۔ اس لیے ایک مفکر ادب میں حسن کی تعریف اس طرح کرتا ہے ۔

"Literature has "all thoughts all passions all delights"— the the treasury of life — to play with" to weave a spell for the whole man. Beauty in literature is the power to enchant man through the mind and heart, across the dialect of life into a moment of perfection."

ادب میں "جملہ تخئیلات، جملہ جذبات اور جملہ مسرتیں ہوتی ہیں جو زندگی کا خزانہ ہیں۔ انہیں ادب تصرف میں لاتا۔ اور سارے انسانوں کے لئے ایک طلسمی دنیا تیار کرتا ہے۔ ادب میں حسن اس قوت کو کہتے ہیں جو انسان کو محاورۂ حیات کے ذریعے ایک ساعت تکمیل ہوئے آتی اور اسے مسرو کرتی ہے"۔

حسن خارجی ہو یا نہ ہو انسان کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے تصور کو مجسم بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ جملہ احساسات کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی وحدت عمل سے اپنے سامنے ایک تصویر کھڑی کریں جس کو انسان اکثر نسوانیت کے روپ میں دیکھتا ہے اور شاعر بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ حسن ایک صفت الٰہی ہے جس طرح **رسکن** نے صاف کہدیا "تو کینڈ اور جسکو سلاوا کیا میں فطرت اور اللہ میاں کو (The Great Feminine the Great She کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایسی ہی تصویر ایک شاعر کی پیش کردہ ہے۔ سنیئے۔ وہ "غمزۂ حسن" کے عنوان سے یہ بتایا ہے کہ حسن فطرت اور زندگی کس طرح عمل کرتا ہے۔

غمزۂ حسن

دکھا کے پھر غمزہ میرے دل کو، بڑھا کیا اضطراب تو نے

چلا کے پھر صرصر تمنا، الٹ دیا فرش خواب تو نے

کبھی جو پھولوں کی انجمن میں الٹ دیا ہے نقاب تو نے

تو جام شبنم کو بھر دیا ہے، انڈیل کر آفتاب تو نے

اسی ہے فطرت کے دل میں کیا کیا تیرے سبب سے بہار انگیں

چمن کی افسردہ پتیوں کو سنگھائی بوئے شباب تو نے

فدا ہوں میں تیری شوخیوں پر، نہ کیوں کرائے حسن غمزہ پرور

کہ میری ظلمت کے آشیاں پر گرائی برق عتاب تو نے

وہ گل جو تھے حسن کے چمن میں، اڑا ہے جو بن کے رنگ انکا

دیا ہے کھول اسے نسیم غربت، یہ کس کے منہ کا نقاب تو نے

ازل کے دن دستِ نازنین سے، جو تو نے چھیڑا یہ سازِ ہستی
کیا ہے چاک اپنی انگلیوں سے، خموشیوں کا حجاب تو نے
کرن حقیقت کی تلملائی کہ پھونک دے پردۂ نظر کو
غبارِ حسنِ مجاز کا جب اٹھا چمک کا نقاب تو نے

(افکارِ سلیم)

الفاظ اور زبان حسن کے ترجمان ہیں۔

ادب میں حسن پیدا کرنے کا واسطہ عام طور پر الفاظ کو سمجھا جاتا ہے۔ الفاظ دراصل ایک حرکت ایک عمل ایک علامت، اور ایک واسطہ ہے انسانی خیال اور جذبات کی طرف اشارہ کرنے کے لفظ میں معنی ہوتے ہیں، لیکن لفظ عین معنی نہیں ہوتا۔ عقل ادراک، شعور، سوچنے سمجھنے سے دیکھنے سننے کی صلاحیت انسان میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ زبان کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کی اس فطری صلاحیت کو اکسانے کیلئے اسے مدد دے اور اس میں اگر کمی ہو تو اس کو پورا کرے۔ زبان اور لفظ کا سرچشمہ خیال ہے۔ اسی لئے ادب کا حسن ان خیالات میں پایا جاتا ہے، جو کسی واسطے کے ذریعے الفاظ کے قالب میں قید کئے جاتے اور ہمارے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ Thought in words is the matter of literature.

بعض الفاظ جو (onamatopoetic) ہوتے ہیں اور اپنے اندر صوتی حسن، یعنی ترنم، اور قوت اظہار رکھتے ہیں، وہ ادب کے ذریعے انسان میں ایک ہمدردانہ استغراقی کیف پیدا کرتے ہیں اور یہی حسن ہے۔

مثلاً انیس کی یہ نظم پڑھنے والوں کے دل میں استغراقی ہمدردی پیدا کرتی ہے۔ یہ الفاظ کے ذریعے صبح کے حسن کی آبشنہ پردار ہے۔

صبح کا سماں

طے کر چکا جو منزل شب کاروان صبح — ہونے لگا افق سے ہویدا نشان صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اختران صبح — ہر سو ہوئی بلند صدائے اذان صبح

پنہاں نظر سے روئے شب تار ہو گیا
عالم تمام مطلع انوار ہو گیا

یوں گلشن فلک پہ ستارے ہوئے نہاں — چن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گل مہتاب پر خزاں — مرجھا کے رہ گئے ثمر و شاخ کہکشاں

دکھلائے طور، باد سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

وہ سرخی شفق کی اِدھر چرخ پر بہار — وہ بار ور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آبدار — پھولوں سے سب بھرا ہوا دامان کوہسار

نافے کھلے ہوئے، وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

اس نظم میں صرف صبح کا تصور ہے بلکہ اسے پیش کرنے کی ایک صوتی اور لفظی خوبی بھی ہے۔

ایک لفظ سے جان پڑ جاتی ہے۔

ادب میں حسن صرف الفاظ کے مجموعے سے پیدا نہیں ہوتا بعض وقت مجرد الفاظ فرداً فرداً جان پیدا کی جاتی ہے، سر والٹر رلے نے اپنے عالمانہ مضمون میں (Essay on style) میں لفظ کی اہمیت اس طرح جتائی ہے:

"الفاظ میں تھوڑی سی اصطلاحیت اور عام زبان ہونے کی حیثیت سے تھوڑی سی قدامت کا رنگ ہوتا ہے، ادیب بعض وقت لفظ کے جسم پر یہ پیرہن اتار دیتا ہے تو اس میں حسن آجاتا ہے"۔

اسلوب

الفاظ کے مجموعی استعمال سے جو خوبی پیدا ہوتی ہے اسے اسلوب (style) کہتے ہیں۔ پیٹر نے اسلوب کے متعلق خوب کہا ہے۔

"اچھی تحریر کے جملہ ضوابط ایک قسم کی وحدت اور اتحاد دل و دماغ کے عمل کو پیش کرنے ہیں اس عمل میں لفظ کو اس وحدت کا روح رواں بنایا جاتا ہے"۔

بہ قبول اسپنسر ( ) "اسلوب" توجہ کی "معاشیات" یا کفایت ہے۔

یہاں ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حسن جب ادب میں داخل ہوتا ہے تو اس کی جھلک وحدت عمل، اور دل و دماغ کی زبان کے ساتھ کامل ہم آہنگی اور اتحاد میں نظر آتی ہے۔ اعلیٰ ادب کو جانچنے کا یہ عمدہ اصول ہے۔

یہاں تک زبان اور لفظ پر بحث کی گئی۔ اور یہ واضح کرنے کے لئے کی گئی کہ زبان اور لفظ دونوں مل کر کس طرح "dialect of life" "محاورۂ حیات" بن جاتے ہیں۔ اسی محاورۂ حیات میں احساس حیات بھی ہے۔ ادب کے ذریعے ایک دل دوسرے سے ملتا ہے اور ایک دل کے واقعات دوسرے تک منتقل ہوتے ہیں۔

جب احساس حیات ہوتا ہے تو اسی کے ذریعے ہم احساس حسن کی سنہری ساعتوں میں داخل ہوتے ہیں۔ "احساس حیات" ایک جامع اصطلاح ہے یہ کہہ دینا آسان ہے کہ احساس حیات" سے ہم حسن کی سرحدمیں داخل ہوتے ہیں۔ یا حسن احساس حیات میں پایا جاتا ہے۔ ہم مختصراً یہ بتائیں گے کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے احساس حیات کے معنے کیا متعین ہو سکتے ہیں؟

احساس حیات کے نفسیاتی مفہوم

دیکھیے حیات کے جملہ تجربے، جذبات، خیالات، رجحانات اور ہیجانات علم و عمل کا ایک طوفان ہوا کرتے ہیں۔ ہم میں حقیقت کا احساس اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک ہم اس میں مداخلت نہ کریں، ان میں عملی کوئی حصہ نہ لیں۔ بعض اوقات زندگی کی واردات اتنی استمراری ہوتی ہیں۔ کہ ہم ان کے متعلق اپنے ردعمل کو بھول جاتے ہیں، اور اسی کا نام ہے :۔

تقدیر جو دکھائے سو ناچار دیکھنا

نہ ہم انھیں بدل سکتے ہیں، نہ ان میں مداخلت کر سکتے ہیں، اس لئے وہ ہمارے لئے حقیقی نہیں ہوتے ادب میں اس قسم کی عدم مداخلت ہوتی ہے۔ اور انسان ہر تجربۂ حیات میں صرف ایک (خیال) دیکھتا ہے جس طرح ہیگل نے کہا تھا۔ جملہ آرٹ میں ایک (خیال) کارفرما ہونا چاہیے۔ ادب ہمیں اسی (خیال) کی رنگینی دکھاتا ہے۔ اس خیال میں تاثیر اور جذبے کی آمیزش ضرور ہی ہوتی ہے، مگر ایسی نہیں جیسے ہماری مداخلت اور عمل سے پیدا ہو۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہیں کہ ادب کا احساس حیات ایک "فریب حیات"

ایک خیال، ایک تمثال، ایک تصور ہے۔ ادب میں حسن یہی ہے کہ اس فریب حیات کو پیدا کرنے میں وہ کامیاب ہو جائے۔ دیکھو آزاد نے اپنی پاکیزہ نثر میں تمثیلی طریقے پر کس طرح احساس حیات پیدا کیا ہے۔ واقعہ انشا کا ہے لیکن اس میں انسان شاعرانہ زندگی کی عظمت محسوس کرتا ہے۔

"میں لکھنؤ گیا شام ہوئی تو معلوم ہوا کہ قریب ہی مشاعرہ ہوتا ہے۔ کھانا کھا کر میں بھی جلسے میں پہنچا، ابھی دو تین سو آدمی آئے تھے۔ لوگ بیٹھے باتیں کرتے تھے۔ حقہ پی رہے تھے۔ میں بھی بیٹھا ہوں، دیکھتا ہوں کہ ایک شخص میلی کچیلی روئی دار مرزئی پہنے۔ سر پر ایک میلا سا پھٹیا، گٹھا پاؤں میں، گلے میں پیکیوں حقہ پلانے والے کا توبڑا ڈالے ایک گڑگڑا کا حقہ ہاتھ میں لئے آیا۔ اور سلام علیکم کہہ کے بیٹھ گیا۔ کسی کسی نے اس سے مزاج پرسی بھی کی۔ اس نے اپنے توبڑے میں ہاتھ ڈال کے تمبا کو نکالا اور اپنی چلم پر سلفا جما کر کہا کہ بھئی ذرا سی آگ ہو تو اس پر رکھ دینا۔ اسی وقت آوازیں بلند ہوئیں، اور گڑگڑی، شٹک، پیچوان سے لوگ تواضع کرنے لگے۔ وہ بد دماغ ہو کر بولا، کہ صاحب ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو نہیں تو ہم جاتے ہیں۔ سب نے اس کی بات تسلیم اور تعمیل کی۔ دم بھر کے بعد پھر بولا کیوں صاحب ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا۔ لوگوں نے کہا جناب لوگ جمع ہوتے جاتے ہیں۔ سب آجائیں تو شروع ہو وہ بولا کہ صاحب ہم تو اپنی غزل پڑھ دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر توبڑے میں سے ایک کاغذ نکالا اور غزل پڑھنی شروع کر دی۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں ۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی ۔ تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر ۔ غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسان نقش پائے، رہروان کوئے تمنا میں ۔ نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کہیں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے، افتادگی سے اکثر پہروں میں ۔ نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے ۔ یہاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو ۔ جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ ۔ غنیمت ہے کہ ہم صحبت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

وہ تو غزل پڑھ کاغذ پھینک سلام علیک کہہ کر چلے گئے۔ مگر زمین و آسمان میں سناٹا ہو گیا اور دیر تک دلوں پر ایک عالم رہا۔

اسی قسم کا ایک واقعہ طباطبائی مرحوم نے اپنے مضمون "مٹیا راج کے سبزہ سیار" میں لکھا تھا کہ مشاعرے کے وقت پردے کے پیچھے سے ایک چیخ کی آواز سنائی دی تھی۔ اسی طرح میر کی آواز سنئے

دمِ صبح بزمِ خوشِ جہاں، شبِ غم سے کم نہ تھی مہرباں
کہ چراغ تھا سو تو دود تھا، جو پتنگ تھا سو غبار تھا

دلِ خستہ جو لہو ہو گیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھی سوزِ سینہ سے داغ تھا کبھی دردِ غم سے فگار تھا

دلِ مضطرب سے گذر گئی شبِ وصل اپنی ہی فکر میں
نہ دماغ تھا، نہ فراغ تھا، نہ شکیب تھا، نہ قرار تھا

یہ تمہاری اِن دنوں دوستاں، مژہ جس کے غم میں ہے خونچکاں
وہی آفتِ دلِ عاشقاں کسو وقت ہم سے بھی یار تھا

نہیں تازہ دل کی شکستگی یہی درد تھا یہی خستگی!
اسے جب سے ذوقِ شکار تھا اسے زخم سے سروکار تھا

کبھو جائے گی جو اُدھر صبا، تو یہ کہیو اس سے کہ بے وفا
مگر ایک میرؔ شکستہ پا، ترے باغِ تازہ میں خار تھا

ادب میں اس قسم کی حسن آفرینی کی تصویر ایک مفکر نے خوب کھینچی ہے۔

No syllable in the slow unfolding of exquisite cadences but is supremely placed from the first page to the last, as note calls to note thought calls to thought and feeling to feeling and the last word is an answer to the first of the inevitable procession.

"وہ کوئی حرف ایسا نہیں جو ترنم کے دلکش بہاؤ کو بتدریج پیدا کرنے کے لئے صفحہ اول سے آخر تک اعلیٰ ترین مقام پر نہ رکھا گیا ہو، جیسے ایک سُر سے دوسرا اثر پیدا ہوتا ہے، ایک خیال سے دوسرے خیال کی رہنمائی ہوتی ہے، تاثر سے تاثیر کا پتہ ملتا ہے۔ اسی طرح اس جلوس خیالی کا آخری لفظ پہلے لفظ کے ربط و اتحاد کا علمبردار ہوتا ہے۔"

وحدت اور سکون

قالب اور سانچے کی وحدت کافی نہیں ہے۔ اس کے لئے احساس حیات کی ہم آہنگی اور وحدت ضروری ہے جسے "Repose of centrality" کہتے ہیں، یہی حسن ہے اور اس میں حیات کامل کے معنی اور احساس پوشیدہ ہیں۔ احساس حیات میں اگر صرف ایک قسم کی توانائی ہو کافی نہیں۔ اس کے ساتھ تعمیم حیات بھی ہونی چاہیئے۔ "Stevenson" نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہتا ہے:۔

"واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی کتاب کسی خاص اثر کے تحت لکھی جاتی ہے، یا ایسے دل کی پیداوار ہوتی ہے جو سر آشفتہ نشہ رکھتا ہو۔ اس وقت ہماری ہستی کے جملہ اسباب گویا ایک آہنی گرفت میں آجاتے ہیں، اور اس طرح آتے ہیں کہ بالغرض اگر کتاب کا مواد معمولی اور کمزور بھی ہو تو اس سے کوئی نہ کوئی صداقت اور حسن کا استقرار ضرور کیا جا سکتا ہے۔"

خلاصہ

ہم نے ابتدا سے حسن کے ادبی پہلو پر جو روشنی ڈالی، اس میں یہ بتایا کہ ادب میں حسن کی تین صفتیں ہوتی ہیں۔

(۱) ہیجان اور سکون کی ہم آہنگی۔

(۲) تفکر میں احساس تکمیل۔

(۳) ان دونوں کا مجموعی اثر وحدت۔

یہ بتا دیا گیا کہ ہیجان اور سکون کی ہم آہنگی احساس حیات میں اس طرح ہوتی ہے کہ ہم جملہ واردات حیات میں ایک تخیلی حیثیت سے مداخلت کرتے ہیں، اور تخیل اور تصور، زندگی کو ایک مرکزیت کی طرف لاتا ہے، اور اس میں سکون پیدا کرتا ہے۔ یہی حسن ہے۔

احساس تکمیل کی چند صفتیں۔

اب ہمیں زندگی کے احساس تکمیل کے متعلق کچھ کہہ کے مضمون ختم کرنا ہے۔ مفکرین نے اس احساس تکمیل کی چند صفتیں جو بتائی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

(۱) ہم اپنی ہستی کی سرحدوں کو چھو آتے ہیں۔

(۲) دنیا پر من حیث الکل غور کرتے ہیں۔

(۳) ایک ساعت تکمیل سے گذر کر نشانے حیات میں خیر، حسن اور حق پاتے ہیں۔

(۴) ہم خیال حیات کو پکڑ لیتے اپنے اندر جگہ دیتے اور اسے اپنی عمیق ترین احساسات اور خواہشات کے موافق پاتے ہیں۔

(۵) ہم اس دنیا سے دنیائے تجربات میں پہنچ جاتے ہیں۔

(۶) ہمارے خیالات اور اعمال حسنہ کی شرائط ہمیں متاثر کرتی ہیں۔

ان سب کا گویا ایک حلقہ ہوتا ہے جو زندگی کو گھیر لیتا ہے، اور اس حلقے میں ہم سکون اور تفکر پاتے ہیں جس ادب میں اتنی وسعت اور مرکزیت ہو وہ گویا احساس تکمیل کا محرک ہے، بجائے خود کامل ہے، اور حسن اسکی کاملیت اور تخلیق احساس میں نظر آتا ہے۔

فطرت اور زندگی۔

ادب اور زندگی کا یہ احساس تکمیل چند اور حیثیتیں بھی رکھتا ہے مثلاً زندگی اور فطرت کے ساتھ یکساں تعلق۔ پہلے زندگی کا ایک تصور "مستقبل" کے عنوان سے شاعر کی زبانی سنیے جس میں فطرت اور زندگی کو ہم آہنگ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

زمانہ آنے والا دور سے آنکھیں دکھاتا ہے	دل ہمت نشیمن دیکھتا ہے مسکراتا ہے
نظر آتے ہیں خون آشام جب آثار منزل کے	جری انگڑائیاں لیتا ہے بزدل تھرتھراتا ہے
کوئی آسان ہے زنجیر چھونا باب مقصد کی	مسافر رستہ بھر موت سے زور آزماتا ہے
زمانہ ٹوکتا رہتا ہے بڑھ جاتے ہیں دل والے	صبا منہ زوریاں کرتی ہے غنچہ کھلکھلاتا ہے

سمجھتا ہے اسے اپنا مقدر صاحب ہمت	تبیں آسماں پر جو ستارہ جگمگاتا ہے

مجاہد خود الٹتا ہے ورق تاریخ عالم کا
لگا کر مہر اپنے خون کی، خود مسکراتا ہے
(انجم)

یا جگر نے ـــــــ زندگی اور فطرت میں انسان باوجود بے کیفیوں کے ایک مصالحت محسوس کرتا ہے۔

بے کیف دل ہے اور جیئے جا رہا ہوں میں	خالی ہے شیشہ اور پیئے جا رہا ہوں میں

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز	کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

فطرت کا احساس اور حسن۔

زندگی کی اس مصالحانہ روش کی طرف توجہ دلانا حسن ہے لیکن جس طرح پہلے کہا گیا ہم انشا، میر اور جگر کی زندگی کو بہر حال اپنی زندگی نہیں سمجھ سکتے، اس میں ایک خیال دیکھتے ہیں جس کے ساتھ ہمیں ہمدردی ہوتی ہے اس سے تلخیاں دور ہو جاتی ہیں اور احساس حسن بن جاتا ہے۔ زندگی کے ساتھ ساتھ حسن کا رفطرت پر نظر ڈالتا ہے اس لئے نظر ڈالتا ہے کہ اس میں زندگی کا احساس ہے، کائنات، اسی آگ میں جلتا تھا کہ فطرت میں اسے عقلیت اور ارادے کا ایک قوی عمل نظر آتا تھا۔ اس نے اس عمل کو انسان کے ساتھ ملانے کی کوشش کی، اور تصدیق ہینے احساس حسن کے ذریعے وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوا جوش کے ابتدائی دور کی نظمیں فطرت اور زندگی کے احساس کا بہت ہی عمدہ نمونہ تھیں، مثلاً وہ کھتے ہیں۔

کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر چٹکتی کلیو ذرا ٹھہرو
ہوائے گلشن کی نرم رو میں، یہ کس کی آواز آ رہی ہے

ٹیگور نے Whispering footsteps کے نام سے اسی خیال کی ایک پاکیزہ نظم لکھی ہے۔ فطرت میں کسی کی آواز سننا گویا اس میں احساس حیات پیدا کرنا ہے۔

حسن فطرت (Responsive) اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ ہم اس میں زندگی کا احساس پیدا کریں اور اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں۔ جوش کی اس ہم آہنگی کا ایک رنگ دیکھئے:

خامشی وحشت پہ جس وقت کہ چھا جاتی ہے	عمر بھر جو سنی ہو وہ صدا آتی ہے

جھاڑیوں کو جو ہلاتے ہیں ہوا کے جھونکے دل شبنم کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
مجھ سے کرتے ہیں گھنے باغ کے سناٹے باتیں ایسی باتیں کہ مری جان پہ بن جاتی ہے

اردو غزل پر یہ الزام ہے کہ اس میں ریزہ خیالی کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ ہر چیز شکستہ ہے لیکن بعض اساتذہ کی غزلیں جو ایک ہی کیفیت کی پیداوار ہوتی ہیں، وہ اپنی رنگ شکستگی میں بھی، ہیجان و سکون، تنوع اور وحدت، تجزیہ اور تنظیم کا حسن رکھتی ہیں، مثلاً غالب کی ایک غزل ہے جو بظاہر ایک رنگ کی آئینہ دار نہیں لیکن غور و فکر سے اس میں یکرنگی محسوس کی جاتی ہے۔ اس کا پہلے ایک مرقع سن لیجیے۔

بزم ناز ہے، ایک طرف ریشمی پردوں، خوبصورت ساز و سامان سے سجی ہوئی خلوت دوسری طرف صحن چمن، اس میں بہار کے جلوے۔ آئینہ کے سامنے معشوق بیٹھا سرمہ لگا رہا ہے۔ ایک طرف ساز رکھے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف جام و سبو کی محفل سجی ہے۔ کونے میں عاشق زرد رنگ، چہرا اداس بیٹھا ہوا ہے معشوق اس کی طرف نہیں دیکھتا۔ کبھی کبھی لوگ اس خلوت کی طرف سے گذر جاتے ہیں۔ عاشق انھیں اپنے خزاں زدہ چہرے کی رنگ شکستگی دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ دل ساز چھیڑنے کی فرمایش کرتا ہے آواز آتی ہے کہ سننے والے کے لیے پھول، کلی، پردے، مینا، ہر چیز میں صدائے نغمہ موجود ہے۔ پھر بزم مئے میں جوش آتا ہے۔ آخر میں معشوق اٹھ کر چلا جاتا ہے، اور عاشق پر ہجر کی گھڑیاں نازل ہو جاتی ہے۔ اب غالب کی زبان سے سنئے

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا
تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبط آہ میں، میرا وگرنہ میں طعمہ ہوں ایک ہی نفس جاں گداز کا
یاں بس کہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا
تاراج کاوش غم ہجراں ہوا اسدؔ سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

ادب اور حسن کے متعلق ایک نقاد کی رائے جو جامع حیثیت رکھتی ہے ۔ غور کے قابل ہے ۔

"نظم و نثر اور ناول سب میں اپنی اپنی خاص خوبیاں ہوتی ہیں ۔ یہ خاص موقع اور محل سے پیدا ہوتی ہیں جن سے انھیں دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ لیکن یہ سب مل کر بحیثیت ادب ایک خاص قوت کے چند عناصر پیدا کرتے ہیں ۔ یہ خاص قوت کیا ہے ۔ یہ حیات کا ایک کامل تجربہ پوری کاملیت اور وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے اور حیات کے مفہوم حقیقی کے ساتھ وابستہ ہوکر وحدت اور خود تکمیلی ، ایسے قالب میں پیدا کرتا ہے جو ہمارے ذہنی اعمال کو ہیجان اور سکون کی ایک ساعت تکمیل عطا کر سکے "

اقبال کی نظم ارتقا میں ادب اور حسن کی یہ ساعت مکمل نظر آتی ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز	چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز	سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی
سکوت شام سے تا نغمۂ سحر گاہی	ہزار مرحلہ ہائے فغان نیم شبی
کشاکش زم و گرما تپش تراش و خراش	ز خاک تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی
مقام بست و شکست و فشار و سوز و کشید	میان قطرۂ نیسان و آتش عنبی
اسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام	یہی ہے راز و تب و تاب ملت عربی

مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند ، آفتاب می سازند

شکسپیر نے سچ کہا تھا کہ "شاعر کی آنکھ ایک دیوانہ وار گردش میں زمین سے آسمان ، اور آسمان سے زمین پر نظر ڈالتی ہے"۔ اسی قسم کے خیال کو حضرت اقبال نے ظاہر کیا ، جو ادب میں حسن کے جوہر دکھاتا ہے ۔۔

می شود پردۂ چشمم پر کاہے گاہے	دیدہ ام ہر دو جہان را بہ نگاہے گاہے

متنبی کا درس حیات

از جناب ڈاکٹر محمد عبدالمعید خاں صاحب یم اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ

علی العموم ہر افسانہ کا ہیرو اپنے ماحول کا ساز گار ہوا کرتا ہے مگر چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں قدرت نے کوفہ کے اسٹیج پر ایک ایسے ہیرو کو پیش کیا ہے جس کی ساری عمر اپنے ماحول کی بندشوں کے توڑنے ہی میں صرف ہوتی رہی۔ یہ ہیرو عربی ادب کا مشہور و معروف شاعر ابوطیب متنبی ہے۔ قدرت نے ہمیشہ یہ چاہا کہ اس کو شاعر بنائے اور متنبی نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ وہ اپنے تدبر اور حکمرانی کے جوہر دکھائے۔ اس کی زندگی حقیقت میں ایک سبق آموز مطالعہ قدرت ہے۔ اس کے دیوان کو ذرا گہری نظر سے پڑھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ گویا شاعر اپنی زندگی کے ہر مرحلہ پر قدرت اور انسانی طاقتوں کے مابین ایک ایک کش مکش کا دلفریب منظر پیش کر رہا ہے۔ اس مختصر مضمون میں یہ تو ممکن نہیں ہے کہ متنبی کی زندگی کے ہر پہلو پر بحث کی جائے۔ ہم یہاں اس فطری شاعر کے صرف اس درس حیات یا تجربات زندگی کا ذکر کریں گے جو اس کے بنانے یا بگاڑنے میں کار فرما تھے۔

تیسری صدی اور اوائل چوتھی صدی ہجری تاریخ اسلامی کا ایک عجیب انقلابی ہنگامہ خیز زمانہ تھا۔ اسی زمانہ میں بابک خرمی کی شورشیں برپا ہوئیں جس نے مامون اور معتصم کے عہد میں تخت خلافت کی جڑیں کھوکلی کردی تھیں۔ ابھی یہ شورشیں ختم بھی نہیں ہوئی تھیں کہ زنگیوں کی فتنہ انگیزیاں شروع ہوئیں ان سے چھٹکارا نہ ہوا تھا کہ عراق میں قرامطہ کی ہنگامہ آرائیاں ہونے لگیں۔ ان شورشوں کا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف علم اور مختلف فلسفیانہ خیالات کی اشاعت ہو رہی تھی تو دوسری طرف ایک خاص طبقہ میں مال کثرت سے جمع ہو گیا تھا۔ بالفاظ دیگر دولت مندوں اور تنگدستوں میں ایک قسم کا تنازع پیدا ہو گیا تھا۔ کبھی یہ شورشیں مذہب کے خلاف نمایاں ہوتیں اور مذہبی حیلہ قیود سے آزاد ہونا چاہتیں اور کبھی مجوسی یا رومی فلسفہ کے تاثرات کا نتیجہ ہوتیں اور غریبوں اور مفلسوں کے لئے بدل

بوجہ قلت وقت اس مضمون کو صرف اس نقطہ نظر سے لکھا گیا ہے کہ متنبی کے متعلق جو جدید تحقیقات عربی زبان میں ہوئی ہیں ان سے اردو داں کو روشناس کیا جائے۔

انصاف کی طلبگار بن جاتی تھیں۔ ادھر یہ فسادات اجتماعی زندگی میں انتشار پیدا کر رہے تھے اور ادھر طوائف الملوکی کی وبا پھیل کر خلافت کو روز بروز کمزور بنا رہی تھی۔ اس طوفانی زمانے میں ابوطیب احمد حسین بن عبدالصمد معروف بہ متنبی (۳۰۳ ہجری) میں پیدا ہوتا ہے اس کے نسب میں مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ کوئی اس کو سقہ کا بچہ بتاتا ہے کوئی اس کو علوی خاندان سے منسوب کرتا ہے۔ بہر حال خود متنبی کو اپنی فطری صلاحیتوں کا یہ احساس ہے کہ وہ اپنی ہستی کو اپنے خاندان بلکہ قوم کے لئے مایۂ ناز سمجھتا ہے۔ متنبی کہتا ہے۔

لا بقومی شرفت بل شرفوا بی　　　　وبنفسی فخرت لا بجدودی

ترجمہ:۔ "میں نے اپنی قوم کے سبب شرف حاصل نہیں کیا۔ بلکہ میری قوم میرے سبب بزرگ و برتر ہوگئی۔ میں فخر کرتا ہوں تو اپنی ذات پر نہ کہ اپنے بزرگوں پر۔"

اس میں شک نہیں کہ متنبی فطرتاً ذہین، حساس، بلند حوصلہ اور عالی ہمت تھا۔ اور اس کی خودداری خود پرستی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ کوفہ کی علمی فضا نے علوم وفنون سے بھی اس کو آشنا کر دیا تھا۔ کم سنی ہی سے شام کے بدویوں کے ساتھ بھی اس کو رہنا پڑا تھا۔ غالباً یہیں اس نے جرأت اور ہمت اور جنگ وجدل کی خوبیوں کے درس حاصل کئے تھے اس کو بچپن ہی سے شعر سے لگاؤ تھا۔ کمسنی کے زمانہ سے اس کی شعروشاعری کے چرچے ہونے لگے تھے۔ ابھی اس نونہال کی عمر نو برس کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ قرامطہ کوفہ پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اور لوٹ کھسوٹ مچا دیتے ہیں۔ جب یہ بارہ برس کا ہوتا ہے تو قرامطہ دوبارہ کوفہ میں داخل ہو جاتے ہیں اور پھر وہی فساد برپا نظر آتا ہے۔

۳۱۷ ہجری میں قرامطہ مکہ پر بھی غارت گری کر دیتے ہیں اور عرب کی مقدس زمین میں بھی اپنی ناپاک بدعنوانیوں سے باز نہیں رہتے۔ ایسے حالات میں ناگزیر ہے کہ متنبی جیسا حساس انسان قرامطہ کی برسر اقتدار حکام کے خلاف عدل وانصاف کی چیخ وپکار سے متاثر نہ ہوتا۔ بہت ممکن ہے کہ حکام اور امراء کا طبقہ قرامطی سمجھ کر کوفہ میں اس کا رہنا دشوار کر دیا ہو۔ لیکن ایک جدید محقق کا خیال ہے کہ یہ علوی نسب کا تھا۔ مگر علوی سربرآوردہ لوگ اس ہونہار نوجوان سے جھینپتے تھے اور اس کے علوی ہونے کے ادعا کو پسند نہ کرتے تھے۔ بہر حال کوفہ میں اس انقلابی شاعر کے حاسدوں اور مخالفین کا

ایک گروہ ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ اس کے قبیلے کو اور اس کو نقصان پہنچانے پر تلا ہوا تھا جب اس کی خوداری کو ٹھیس لگنے لگی تو یہ یتیم لیسر اپنے عزیز وطن اور محبوب وادی کو چھوڑ کر شام روانہ ہوا۔ کوفہ سے بغداد، موصل نصیبین، راس العین، دمشق، حلب، لاذقیہ اور انطاکیہ سے ہوتا ہوا حمص پہنچا۔ جہاں علویوں کی خفیہ سازشیں سرگرم عمل تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ متنبی اسی صحرانوردی میں اپنے علوی النسب ہونے کا پرچار کر رہا تھا۔ اور اکثر یہ کہتے ہیں کہ اسی زمانہ میں اس نے اپنے نبوت کا اعلان کیا جس کی پاداش میں اس کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ ایک اور نظریہ یہ بھی ہے کہ اس نے نبوت کا دعوی نہیں کیا بلکہ علم بغاوت بلند کرنے کی سزا میں امیر ابن طغج کے عامل نے اس کو قید کر دیا تھا۔ خواہ اس نے خود نبی ہونے کا دعوی کیا ہو یا اس کے دشمنوں نے حکام اور امراء کو اس کے خلاف بھڑکانے کے لئے اس کو نبی کے جیسا بنا دیا ہو۔ بہر حال یہی وہ زمانہ ہے جس میں ابوطیب کو اپنی شخصیت اپنی خداداد قوتوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے ساری دنیا کی وسعتوں کو وہ اپنی ذات کے آئینہ میں دیکھنے لگتا ہے۔ اس زمانہ کی شاعری میں اس کے احساس خودی کی تکوین نظر آتی ہے۔ عہد طفلی میں متنبی کے دماغ نے جو سب سے گہرے نقوش لئے وہ امیروں کی امارت کے مقابلہ میں غریبوں کی تنگدستی کے مناظر تھے۔ اولاد اشراف کے ساتھ وہ کوفہ کے مدرسہ میں پڑھتا تو تھا مگر یہ غیور لڑکا اپنی اور ساتھیوں کی زندگی میں ایک ذلت آمیز فرق دیکھتا ہوگا۔ جب ہی تو وہ کہتا ہے۔

أری اناساً ومحصولی علی غنم　　　وذکر جود ومحصولی علی الکلم

"میں دخوشحال، لوگوں کو دیکھتا ہوں تو میری آمدنی کا دار و مدار بھیڑوں اور بکریوں پر نظر آتا ہے اور جود و سخا کے قصے سنتا ہوں تو میری زندگی چند اشعار کی کمائی پر منحصر معلوم ہوتی ہے۔"

یہ غریب اور امیر کا فرق صرف شاعری وجدان تک محدود نہیں رہتا بلکہ متنبی کے دماغ میں ایک عقیدہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس کو امراء اور حکام کے خلاف نبرد آزمائی کے لئے اس حد تک تیار کر دیتا ہے کہ وہ کہتا ہے :۔

الی ای حین انت فی زی محرم　　　وحتی متی فی شقوۃ والی کم

والا تمت تحت السیوف مکرما تمت وتقاسوا الذل غیر مکرم

فثب واثقا باللہ وثبة ماجد یری الموت فی الھیجا جنی النحل فی فم

"تو کب تک آخر احرام باندھنے والوں یعنی مفلسوں کے لباس میں رہے گا اور کب تک یہ مصیبت اور بدبختی کی زندگی بسر کرے گا اور اگر تیغوں کے سایہ میں عزت کے ساتھ لڑتا ہوا مرنا نہیں چاہتا تو ذلت اور بے حرمتی کی زندگی میں مبتلا رہ (اور اک نہ اک دن) مرنا تو ہے ہی۔ بہتر تو یہ ہے کہ اللہ پر بھروسہ کر اور اس مرد میدان کی طرح کارزار زندگی میں اتر آ جو مرنے کو ایسا سمجھے جیسے منہ میں شہد۔"

ان عقائد کے ساتھ ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ ابوطیب نے اپنی صلاحیتوں کا بھی اندازہ کر لیا تھا وہ کہتا ہے:۔

این فضلی اذا قنعت من الدھر بعیش معجل التنکید

"میرا جوہر ذاتی کہاں رہے گا۔ اگر میں ایسی زندگی پر قناعت کر لوں۔ جو بہت جلد غم و آلام کا شکار ہونے والی ہے۔"

ایک اور جگہ کہتا ہے۔

لیس التعلل بالآمال من أدبی ولا القناعة بالاقلال من شیمی

ولا اظن بنات الدھر تترکنی حتی تسد علیھا طرقھا ھممی

"امیدوں کے دم دلاسوں میں آنا میرا کام نہیں اور نہ تنگدستی پر قانع ہو جانا میری خصلت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حوادث روزگار میرا پیچھا نہ چھوڑیں گی جب تک میری بلند ہمتیں ان کے (حملے) کی راہیں نہ بند کر دیں"

اور پھر اپنی شجاعت کی جوشیلی تصویر کھینچتے ہوئے کہتا ہے۔

ذرنی وایاہ وطرفی وذابلی نکن واحدا یلقی الوری وانظرن فعلی

"مجھ کو میری تلوار کو میرے گھوڑے اور چمکتے ہوئے نیزے کو (میدان میں) چھوڑ کر میری بہادری کے جوہر دیکھ کہ ہم سب مل کر کس طرح ایک ہو جاتے ہیں۔ اور ساری دنیا کا مقابلہ کرتے ہیں۔"

ہمارے شاعر کی اس سے بھی تشفی نہیں ہوتی وہ اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتا ہے۔

ولو برز الزمان الیّ شخصا لخضّب شعر مفرقہ حسامی

"اور اگر زمانہ مجسم شخص بن کر میرے سامنے آجائے تو دیکھ لے گے میری شمشیر اس کے سر کے بال کو خون سے رنگ دے گی"

اس سے ظاہر ہے کہ اس نوجوان کے یہ جذبات اور یہ نوخیز امنگیں نہ صرف امراء اور حکام کو بلکہ متوسط طبقے کے حاسد مزاجوں کو بھی اس کا دشمن بنا دیا ہوگا۔ ان حاسدوں کی شرارتیں متنبی کی نظر سے نہ چوک سکتی تھیں۔ اور نہ چوکیں۔ چنانچہ کہتا ہے۔ کہ :-

ما مقامی بارض نخلۃ الا کمقام المسیح بین الیھود

میری اقامت سرزمین نخلہ میں ایسی ہے جیسی حضرت عیسیٰ کی اقامت یہود میں۔

مطلب یہ ہے کہ جیسے یہودی حضرت مسیح کے دشمن تھے ایسے ہی قریہ مذکور کے باشندے میرے دشمن ہیں۔ اسی طرح ایک اور جگہ کہتا ہے۔

انا فی امۃ تدارکھا اللہ غریب کصالح فی ثمود

"میں اپنی قوم میں (خدا اس کی اصلاح کرے) ایسا ہی اجنبی یا بے یار و مددگار ہوں جیسے حضرت صالح قوم ثمود میں تھے"۔

یہاں متنبی نے اپنے آپ کو مشہور انبیاء حضرت صالح اور حضرت عیسیٰ کے مماثل قرار دیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہی اشعار اس کے متنبی کہلائے جانے کے باعث ہوئے اور اس بلبل شیریں مقال کی انہیں بلند پروازیوں نے اس کو جال میں پھنسایا اور قفس میں قید رکھا۔ مگر متنبی جو حوادث روزگار کو ٹھکراتا اور دنیا کو مجسم شخص بنا کر خاک اور خون میں نہلا سکتا تھا وہ بھلا حمص کے قید خانے کو کیا خاطر میں لاتا۔ قید خانے سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

کن ایھا السجن کیف شئت فقد وطنت للموت نفس معترف

لو کان سکنای فیک منقصۃ لم یکن الدر ساکن الصدف

"اے قید خانہ تو تکلیف و شدت میں ایسا ہی رہ جیسا تو چاہتا ہے۔ دینے میں مجھ سے تخفیف تکالیف

کی درخواست نہیں کرتا۔ کیونکہ میں نے آپ کو خوگر موت بنا لیا ہے۔ اے قید خانے اگر میرا قیام تجھ میں میرے نقصان و عیب کا سبب ہوتا تو موتی با این ہمہ قدر سیپ جیسی بے قدر چیز میں نہ رہتا۔

یہہ سب اس کی بہادری استقلال اور اولعزمی کے مظاہر تھے۔ مگر متنبی انسانی شکل میں ازسرتاپا ایک قوت متحرکہ تھا۔ اوس کے دماغ کی جولانیاں، بخارات کی طرح بند نہیں کی جاسکتی ہیں اس کو کسی نہ کسی طرح قید خانے سے چھٹکارا حاصل کرنا ہی پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے نصیبوں کے بُرے ستارے ہمیشہ حصول مقصد میں آڑے آتے رہے مگر ان مصائب اور دشت نوردی نے اس کو اپنی دنیا اور دنیا والوں سے قریب تر کر دیا اب اس کی نظر دنیوی معاملات میں ایک دور سے بیٹھے ہوے دیکھنے والے فلسفی کی نظر نہ تھی بلکہ ایک گرگ باران دیدہ کی بصیرت حاصل تھی۔ کوفہ میں اخلاق حسنہ کا قحط، کمینوں میں دولت مندی، شریفوں میں تباہی، حکام کا ظلم و ستم، بغداد میں خلیفہ کا عجمیوں کے ہاتھوں کٹ پتلی بنا رہنا۔ باب خلافت پر موالی ترکی دیلمیوں کا شور و شغب، شام میں علویوں اور فاطمیوں کے خلیفہ وقت کے خلاف سازشیں۔ غرض عرب کی بربادی اور عجمیوں کا اقتدار یہہ وہ کریہہ منظر اس کی آنکھوں نے دیکھے تھے کہ متنبی جیسے غیور حساس اور آزاد طبیعت میں ناممکن تھا کہ وہ عجمیوں کے خلاف انتقامی جذبہ نہ پیدا کرتے اسی حالت کا نقشہ متنبی اپنی زبان میں یوں کھینچتا ہے۔

حولی بکل مکان منهم خلق　　　　تخطئ اذا جئت فی استفهامها بمن

میرے گرد ایسے گروہ ہیں کہ اگر تو یہ کون انسان ہیں پوچھے تو تو غلطی کرتا ہے۔ کیونکہ یہہ بہائم ہیں۔

وانما الناس بالملوك وما　　　　تفلح عرب ملوكها عجم

کسی قوم کی رفعت ان کے بادشاہوں سے ہوتی ہے (مگر) ان عربوں کو کیا فلاح نصیب ہو سکتی ہے جن کے بادشاہ عجمی ہیں۔

بکل ارض وطئتها امم　　　　ترعی بعبد کانها غنم

ہر اس زمین میں جہاں میں نے قدم رکھا ہے ایسی اقوام کو دیکھا ہے جن کو ایک غلام بکریوں کی طرح چراتا ہے۔ اور پھر کہتا ہے۔

ودھر نا سہ ناس صغار وان کانت لھم جثث ضخام

میرا زمانہ ایسا ہے کہ اس کے آدمی کم ہمت اور حقیر القدر ہیں اگرچہ ان کے بدن بڑے موٹے تازے ہیں۔

ارانب غیر انھم ملوک مفتحة عیونھم نیام

"بجز اس کے کہ وہ بادشاہ ہیں وہ بالکل خرگوشوں کے مانند ہیں مثل خرگوش کے ان کی آنکھیں بظاہر کھلی ہوئی ہیں اور حقیقت میں وہ سو رہے ہیں"۔

یہ دور متنبی کی زندگی کا وہ زمانہ ہے جس میں اس کو اپنی ذات سے بڑھ کر اپنی قوم کا خیال پیدا ہو گیا ہے۔ اب گویا اس کا احساس خودی فرد سے گذر کر ایک اجتماع افراد پر حاوی ہو گیا ہے۔ اس کے تخیلات۔ عالم عربی کی ایک تصویر بنا رہے تھے اس کی آنکھیں عدل گستری اور عربی اقتدار کے عروج کی شدت سے منتظر تھیں۔ اب وہ روزی کا اس قدر متلاشی نہ تھا جس قدر اس کی اپنی خاص زبان میں "مجد" یعنی بزرگی عظمت بلند مرتبہ یا اقتدار و حکومت کا جویا تھا۔ چنانچہ ابوالعشائر علی بن الحسین بن حمدان کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

فسرت الیک فی طلب المعالی وسار سوای فی طلب المعاش

میں تیرے پاس بلند امور حاصل کرنے آیا ہوں اور میرے سوا دوسرے روزی کی طلب میں تیرے پاس پہنچے ہیں

ایک اور موقع پر کہتا ہے :۔

فمالی وللدنیا طلابی نجومھا ومسعای منھا فی شدوق الاراقم

مجھ کو دنیا سے کیا واسطہ میرا مطلوب تو اس کے ستارے یعنی اس کی بلندیاں ہیں۔ اور میری جستجو اس کے حصول کے لئے ایسی ہے جیسے اژدھا کے منہ سے بچ کر نکلنا۔

معلوم ہوتا ہے کہ متنبی کو اپنے مطلوب کی اہمیت اور اس کے حصول میں پیش آنے والی دشواریوں کا بھی کافی احساس تھا۔ اس شعور کی تصویر وہ یوں کھینچتا ہے۔

ومن یبغی ما ابغی من المجد والعلی تساوی المحایی عنده والمقاتل

اور جو شخص اس شرف و بلند نامی کا طالب ہو جو میں چاہتا ہوں تو اس کے نزدیک زندگی اور مرگ دونوں برابر ہیں

اس سے ظاہر ہے کہ متنبی کے مقصد کا حصول اس کے نزدیک موت وحیات کا مسئلہ تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ آخر عربی ممالک میں عجمی کیوں اس قدر قوت و اقتدار کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ اس کی نظروں میں صرف ایک چیز آتی تھی وہ یہ کہ مرکز خلافت کمزور ہو چکا ہے سارے مرکزی عہدوں پر عجمی قبضہ جما چکے ہیں اس سے نجات حاصل کرنے کا اس کے تجربات زندگی نے اس کو طریقہ بھی سکھا دیا تھا۔ اور وہ طریقہ اس کی فلسفیانہ نظروں میں یوں تھا۔

الا لَسْتُ الحاجات الا نفوسکم ولیس لنا الا السیوف وسائل

خبردار رہو کہ ہمارے مقاصد سوائے تمہارے نفوس کو نشانہ بنانے کے اور کچھ نہیں اور اس غرض کے لئے سوائے ہماری شمشیروں کے اور وسیلے نہیں۔ اس مسلک کی مدافعت وہ یوں کرتا ہے۔

من الحلم ان تستعمل الجہل دونہ اذا اتسعت فی الحلم طرق المظالم

جس وقت حلم کے سبب ظلم کی راہیں کشادہ ہوجائیں اس وقت یہ بھی حلم میں داخل ہے کہ اس سے مقابلہ کے لئے تو بھی جہالت برتے۔

ومن عرف الایام معرفتی بہا وبالناس روی رمحہا غیر راحم

اور جو شخص زمانہ کو ایسا جانے جیسا میں اس کو اور لوگوں کو جانتا ہوں تو بیرحمانہ اپنے نیزہ کو ان کے خون میں سیراب کر دیگا۔ اس شاعر کا یہ خیال محض نظریہ نہیں تھا بلکہ اس کے حصول کی اس نے بڑی بڑی کوششیں کیں۔ بغداد، شام، مصر، شیراز، غرض دنیا کی خاک چھان ڈالی۔ عرب حکام اور امراء کو عجمیوں کے مقابلہ میں اس نے طرح طرح سے سراہا۔ ان کی شجاعت اور جنگ و جدل کی صلاحیتوں کو ابھارنے میں مختلف پیرایے اختیار کئے۔ علی بن احمد بن عامر انطاکی کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ذر النفس تاخذ وسعہا قبل بینہا فمفترق جاران دارہما العمر

ولا تحسبن المجد زقا وقینۃ فما المجد الا السیف والفتکۃ البکر

وتضریب اعناق الملوک وان تری لک الہبوات السود والعسکر المجر

وترکک فی الدنیا دویا کانما تداول سمع المرء انملہ العشر

تو اپنی طبیعت کو اس کے حال پر چھوڑ دے تاکہ موت سے پہلے بقدر استطاعت وہ اپنی ممکنہ وسعت حاصل کرلے کیوں کہ نفس (روح) وجسم دو ایسے ہمسایے ہیں جن کا گھر عمر ہے اور وہ ایک دوسرے سے جدا ہونے والے ہیں مطلب یہ ہے کہ جو چیز حاصل ہوسکے جلد حاصل کرلے۔ اور یہ سمجھے کہ میخواری اور گانے والی کا راگ سن لینا ہی بڑی بلندی اور عظمت ہے۔ بلکہ بلندی وعظمت نام ہے تلوار سے نئی نئی فتوحات حاصل کرنے کا اور شاہان خودسر کی، گردن زدنی کا اور یہ کہ تیرے لشکر عظیم کا غبار سیاہ آسمانوں پر اڑتا ہے۔ اور تیری بلند نامی کا آوازہ ایسا گونجے کہ انسان کانوں میں انگلیاں رکھ لے۔

یہ تھا متنبی کا نصب العین۔ اس کے حصول میں اس پر مصیبتوں کی گھٹائیں چھائیں۔ حکام امراء اور ان کے درباریوں نے اس پر حسد وبغض ورقابت کی بجلیاں گرائیں۔ مگر اس حقیقت شناس شاعر نے دنیا کے غم واندوہ پر ہنسا کیا۔ انسان تھا مصیبتوں پر مایوس بھی ہوا مگر اس کا عزم متزلزل ہوا نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی۔ اس نے حوادث روزگار کا جس خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے کہتا ہے۔

فالموت اعذر لی والصبر اجمل بی والبر اوسع والدنیا لمن غلبا

مطلب یہ ہے اگر میں طلب رفعت وعظمت میں قتل کیا جاؤں تو موت میری عذرخواہی کو کھڑی ہو جائے گی اور صبر مجھ جیسے بہادر ہی کو زیبا ہے (گھبرانا بزدلوں کا کام ہے) اور جنگل ومیدان میرے لئے میرے گھر سے زیادہ وسیع ہیں اور دنیا اور اس کی دولت اس کے لئے ہے جو لڑے اور غالب آوے نہ اوس کے لئے جو گھر میں سوتا پڑا رہے۔ اس معنے ومطلب کے اشعار اس کے دیوان میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ متنبی ان جذبات اور ان تدابیر کو دل ودماغ میں بٹھائے ہوئے سیف الدولہ حمدانی کے دربار میں داخل ہوتا ہے۔ اس کو اس عربی امیر سے بڑی بڑی امیدیں لگی ہوئی تھیں جس طرح متنبی عجمی اقتدار کو گھڑی بھر نہیں دیکھ سکتا سیف الدولہ بھی عربوں کو عجمی پنجے سے نجات دلانے کے لئے بیچین رہتا ہے۔ متنبی کی طرح سیف الدولہ بھی علوی اور فاطمی سادات کا سخت مخالف اور عرب کے طرفدار عباسی یا علوی خلفاء کا حامی نظر آتا ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ

اس بدوی شاعر کی عزیز ترین چیز یعنے شجاعت اور علم و عساکر رکھنے کا شوق و طاقت یہہ بھی سیف الدولہ میں بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ ان مشترکہ خصائص نے متنبی کو سیف الدولہ کا اور سیف الدولہ کو متنبی کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ ایک پیغمبر شعر و سخن تو دوسرا بادشاہ ملک و ملت دونوں کے امتزاج نے متنبی کے بحر جذبات میں جو تلاطم پیدا کر دیا ہوگا وہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے۔

"لقد سل سیف اللہ وله المجد معلما — ولا المجد مخفیه ولا الضرب ثالمه
له عسکرا خیل و طیر اذا رمی — بها عسکرا لم یبق الا جماجمه
اجلتها من کل باغ ثیابه — وموطئها من کل باغ ملاغمه"

کہتا ہے خود مجد و شرف نے حکومت کی تلوار (یعنے سیف الدولہ) کو نمایاں طور پر صاف میان سے باہر کھینچ لیا ہے۔ اب نہ مجد و خود اس کو میان کے اندر چھپا سکتا ہے۔ (یعنے قتل اعداء سے روک سکتا ہے) اور نہ تلوار اس کو کوئی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ممدوح کے دو لشکر ہیں ایک تو سواروں کا اور دوسرا پرندوں کا (جو مقتول دشمنوں کا گوشت کہانے کے لئے اس کے ساتھ ہمیشہ رہتا ہے) جب ان لشکروں کو کسی لشکر پر پھینک مارتا ہے تو صرف ان کی کھوپریاں باقی رہ جاتی ہیں اور کچھ نہیں بچتا۔ ممدوح کے گھوڑوں کی جھولیں ہر سرکش کے کپڑے ہیں اور ان گھوڑوں کی روندنے کی جگہ ہر باغی کے چہرے۔

اور جب سیف الدولہ نے انطاکیہ سے کوچ کا ارادہ کر لیا تو اس کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے۔

این ازمعت ایهذا الهمام — نحن نبت الربی وانت الغمام
فی سبیل العلا قتالک والسلم — وهذا المقام والاجذام
لیت انا اذا ارتحلت لک الخیل — وانا اذا نزلت الخیام

اے اولوالعزم بادشاہ ہمارے پاس سے کہاں جانے کا قصد رکھتا ہے کیونکہ ہم مانند گہانس کے ہیں اور تو بمنزلہ ابر کے ہے۔ یعنے ہماری بقا کا دارو مدار تجھ پر ہے۔ اور تیری جنگ و صلح اور تیرا قیام اور تیز روی سب کچھ بلند نامی کے لئے ہے۔ کاش جب تو کوچ کرتا تو ہم تیرے گھوڑے ہوتے اور جب تو فروکش ہوتا تو ہم تیرے خیمے بن جاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کے عربی اشعار میں جو جذبات پنہاں ہیں ان کا اظہار کسی اور زبان میں

ناقابل ترجمہ ہے مگر ابوطیب کا دل سیف الدولہ کی جس قدر محبت سے مملو تھا وہ ان اشعار مذکورہ سے صاف عیاں ہوجاتا ہے۔ ازیں جن اسباب کی بنا پر یہہ سیاسی شاعر اس امیر عرب سے خلوص رکھتا تھا۔ اس کی شہادت حسب ذیل شعر سے ملتی ہے۔ وہ استفہامیہ لہجے میں دریافت کرتا ہے۔

اما للخلافة من مشفق　　　علی سیف دولتها الفاصل

کیا حمایت خلافت کے لئے اس کی دولت کی شمشیر (یعنے سیف الدولہ) کا کوئی ہمدرد یا ساتھی نہیں کہ اس کو تنہا کثرت جدال و قتال سے روکے کیونکہ اگر اس کو کوئی صدمہ پہنچ جائے گا تو خلافت بے شمشیر ضعیف ہوجائے گی۔ مگر متنبی کو سوائے سیف الدولہ کے عربی اقتدار و خلافت عربیہ کی مدافعت کرنے والی ہستی نظر بھی نہیں آتی تھی۔ اس کو اس امیر عرب سے یہہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ رومیوں کے قلع قمع کرنے میں اتنا نہ لگ جائے کہ عجمیوں کو نظر انداز کردے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

انت طول الحياة للروم غاز　　　فمتی الوعد ان یکون القفول
وسوی الروم خلف ظهرک روم　　　فعلی ای جانبیک تمیل

تو عمر بھر رومیوں سے لڑتا رہے گا تو آخر واپسی کا کب خیال ہے۔ علاوہ رومیوں کے تیرے پشت رومیوں کے جیسے اور بھی تو دشمن ہیں۔ آخر ان کی طرف کب رخ کرے گا؟

پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں ایک لفظ (الوعد) واقع ہوا ہے۔ اس سے ایک محقق نے یہہ نتیجہ نکالا ہے کہ سیف الدولہ نے متنبی سے یہہ وعدہ کیا تھا کہ وہ شام سے رومیوں کو نکال باہر کرنے کے بعد عربی حکومت کو عجمی پنجہ سے نجات دلائے گا۔ اور یہی سبب تھا کہ جس کی بنا پر متنبی نے سیف الدولہ کے پاس ایک رسوخ اور تقرب حاصل کرلیا تھا۔ مگر اس تقرب کو درباری کینہ در کہاں دیکھ سکتے تھے انھوں نے آتش حسد کو ہر طرف بھڑکانا شروع کیا۔ اس آگ لگانے میں خود سیف الدولہ کے عزیز و اقارب بھی شریک ہوگئے۔ ابو فراس جیسا امیر شاعر اور ابن خالویہ جیسا جید عالم لغت نے بھی متنبی کو سیف الدولہ کی نظروں سے گرانا شروع کیا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ متنبی سیف الدولہ کی مدح میں قصیدہ پڑھتے ہوئے جب ان ابیات پر پہنچا۔

انا الذی نظر الاعمیٰ الیٰ ادبی — واسمعت کلماتی من بہ صمم
الخیل واللیل والبیداء تعرفنی — والسیف والرمح والقرطاس والقلم

"میں وہ شخص ہوں کہ اندھے نے بھی میرے ادب ولیاقت کو دیکھ لیا اور بہرے نے بھی میرے اشعار سن لئے۔ اندھیری راتیں خشک جنگل اور گھوڑے مجھ کو بخوبی جانتے ہیں اور تلوار اور نیزے کے ضرب اور کاغذ وقلم میری قدر خوب پہچانتے ہیں۔"

بھلا ابو فراس جیسے موقع شناس سے کہاں رہا جاتا فوراً کہہ دیا کہ شجاعت فصاحت حکومت و سخاوت سب کچھ فخر تجھ ہی میں ہیں تو پھر امیر کے لئے کیا باقی رکھا ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ سیف الدولہ کی موجودگی میں متنبی اور ابن خالویہ میں کسی لغوی مسئلے پر جھگڑا ہو گیا متنبی نے حقارت آمیز لہجے میں کہہ دیا۔ خاموش ہو۔ تو آخر عجمی ہی تو ہے تجھکو بھلا عربی زبان سے کیا واسطہ اس پہ ابن خالویہ نے اپنی جیب سے کنجیوں کا جھیلا نکالا اور اپنے مخاطب کے منہ پہ دے مارا۔ لیکن اس موقع پہ سیف الدولہ نے متنبی کی کوئی امداد نہ کی۔ اب کیا تھا ابوطیب کی خود دار طبیعت ایک عجمی کے ہاتھوں اس ذلت کو کیسے برداشت کرسکتی۔ بالآخر حاسدوں کی ان سازشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ متنبی کو سیف الدولہ کا دربار چھوڑنا پڑا۔ لیکن اس امیر کا ساتھ چھٹنے کا غم متنبی کو عمر بھر رہا۔ کیوں کہ وہ سیف الدولہ کو صرف عربوں کا امیر ہی نہیں بلکہ ان کا سیاسی قائد، سالار اعظم، عربی خلافت کا یکتا و تنہا محافظ سمجھتا تھا۔ یہ ساری خصوصیات ایک واحد امیر میں کہاں جمع ہو سکتی تھیں۔ ایسی ناگزیر صورت میں متنبی کی نظریں اب اس امیر عرب سے اٹھ کر خود اس کی ذات میں مرتکز ہو گئیں۔ اب وہ خود کو ان ساری صفتوں کا حامل سمجھتا تھا جو سیف الدولہ کی ذات میں تھیں صرف اس قدر کمی تھی کہ متنبی کے پاس دولت وحکومت نہ تھی۔ اب وہ دولت حکومت کا خواہاں ہو مگر اپنی ذاتی اغراض کے لئے نہیں۔ چنانچہ کہتا ہے۔

وما حاجتی فی عسجد استفیدہ — ولکنہا فی مفخر استجدہ

"میری خواہش زر ذاتی منفعت کے لئے نہیں ہے بلکہ اس عظمت رفعت کے حاصل کرنے کے لئے ہے جس کی میں تجدید کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے حاصل کرنے اس باکمال شاعر نے یہ تدبیر سوچی تھی کہ وہ خود کسی اقلیم عربی کا خود مختار حاکم بنا دیا جائے۔ اسی جستجو میں وہ کافور اخشیدی والی مصر کے دربار میں پہنچا۔ اس کی مدح میں بڑے بڑے قصیدے لکھے۔ اس کی سخاوت، بہادری اور عقلمندی کی تعریفیں کیں۔ اس کی کنیت ابو المسک کو مدح و ثنا کی خوشبو سے تعبیر کیا۔ اس کے سیاہ اور چمکیلے رنگ کو بھی رشک شمس و قمر ٹھیرایا۔ مختصر یہ کہ اس کو اپنی آخری امیدوں کا سہارا سمجھا۔ چنانچہ کہتا ہے۔

یا رجاء العیون فی کل ارض ۔۔۔ لم یکن غیر ان اراک رجائی

فارم بی حیث شئت منی خالی ۔۔۔ أسد القلب آدمی الرواء

و فؤادی من الملوک وان کا ۔۔۔ ن لسانی یری من الشعراء

"اے زمین والوں کے آنکھوں کی امید مجھکو سوائے تیرے دیکھنے کے کوئی امید نہیں رہی ہے۔ مجھ کو مشکل سے مشکل کام میں آزما کر دیکھ کہ میں آدمی کی صورت میں شیر دل واقع ہوا ہوں۔ اور میرا دل شاہانہ ہے اگرچہ میری زبان شاعرانہ۔"

بعض کا خیال ہے کہ کافور نے متنبی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کو کسی اقلیم کا حاکم بنائے گا۔ مگر ایک مدت تک جب یہ وعدہ پورا نہ کیا گیا تو اس نے اسی کی طرف ذیل کے شعر سے توجہ دلائی۔

اذا لم تنط بی ضیعة او ولایة ۔۔۔ فجودک یکسونی و شغلک یسلب

"جب تک تو مجھ کو کسی قریہ یا ملک کی حکومت کو میرے حوالہ نہ کرے گا تیری بخشش میرا تن تو ڈھانک دیگی مگر تیری خدمت گزاری تیرا دیا لیا سب کچھ چھین لے گی۔"

غالباً متنبی کو اس کا بھی علم ہوا تھا کہ کافور اس شاعر کی انتقامی قابلیت پر بھروسہ نہیں رکھتا تھا اسی شک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے۔

فلن فی اصطناعی محسنا کمجرب ۔۔۔ یبن لک تقریب الجواد و شده

اذا کنت فی شک من السیف فابله ۔۔۔ فاما تنفیه واما تعده

مجھ پر احسان کرنے میں ایک آزمائشی محسن بن کر دیکھ تاکہ تجھ پر ایک عمدہ گھوڑے کی چال اور اس کے

وهان فما ابالي بالرزايا　　　　لاني ما انتفعت بأن أبالي

مصیبتوں کے تیر لگنے مجھ کو آسان ہو گئے ہیں۔ اب مصیبتوں کی پروا نہیں کرتا کیوں کہ ان کی فکر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اور پھر کہتا ہے۔

فلهون الصبر عندي كل نازلة　　　　ولين العزم حد المركب الخشن

میرے صبر نے میری ہر مصیبت آسان کر دی۔　　　　اور میری ہمت نے سفر میں سخت سے سخت سواری کو نرم کر دیا ہے۔

لیکن مصر سے واپسی پر اس کی کوئی امید بر آنے کی صورت نظر نہ آتی تھی اس کو بڑا خیال تھا کہ اس کی شعر و سخن پر قدرت اس کا زور قلم دنیائے عرب میں ایک انقلاب پیدا کر دیگا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اس کی ساری تدبیریں بے سود ہو گئیں۔ بالآخر اس کو یہ کہنا پڑا ۔

حتى رجعت - واقلامي قوائل لي　　　　المجد للسيف ليس المجد للقلم

میں ناکام اپنے وطن کو واپس آیا اور میں کہنے لگا کہ شرف و مجد بذریعہ شمشیر حاصل ہوتی ہے نہ بواسطے قلم کے۔

معلوم ہوتا ہے کہ متنبی اپنے عمر کے اس آخری زمانہ میں بہت زیادہ قنوطیت پسند ہو گیا تھا اس کی مسلسل ناکامیاں سیف الدولہ جیسے امیر عرب سے فراق ۔ دولت و حکومت کے حصول میں ناکامی۔ سیاسی نصب العین میں تدبیروں کا شرمندہ تقدیر نہ ہونا غرض ان سب مایوسیوں نے اس کے دل میں زمانے کے خلاف انتقامی جذبات پیدا کر دیئے۔ ممکن ہے کہ آپ اور خود میں بھی متنبی نے درس حیات سے جو نتائج اخذ کئے ہیں اس سے متفق نہ ہوں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس شاعر نے ادب عربی میں عربیت قوت، جوش، بہادری، اور اولوالعزمی کے ایسے لازوال شہ پارے چھوڑے ہیں جو مٹائے نہیں مٹائے جا سکتے حقیقت یہ ہے کہ متنبی کے احساسات یا اس کا درس حیات اس کا ایک ایک شعر ہے اور ہر ایک شعر اس کے زمانے کی حقیقی تصویر میں اپنے نوجوان احباب سے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ آپ متنبی کی طرح جنگجو سپاہی بنیں مگر شاید یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ کو اولوالعزمی، بہادری اور صبر و استقلال کے سبق بھی پڑھنے ہوں تو اس بلند ہمت فصیح و بلیغ شاعر کا کلام اسکی زبان میں ضرور پڑھیے جس کی عملی زندگی اس کے اس شعر کی صحیح تعبیر تھی۔ کہتا ہے ۔

اذا غامرت في شرف مروم　　　　فلا تقنع بما دون النجوم

جب تو نے بلند داعلیٰ مقصد کے حصول کا ارادہ کر لیا تو پھر ستاروں سے ورے قناعت نہ کر۔

بھمنی دربار

از جناب عبدالمجید صاحب صدیقی استاذ تاریخ (جامعہ عثمانیہ)

بہمنی سلطنت کی تاسیس جو چودھویں صدی کے وسط میں عمل میں آئی تاریخ دکن کا ایک بہت دلکش باب ہے۔ اس سلطنت کے بست وکشاد میں زندگی کی بڑی جنبشیں پنہاں تھیں۔ اس سلطنت نے اپنی ڈیڑھ سو سالہ دور میں دکن کی حیات قومی کی بڑی بڑی گتھیاں سلجھائیں۔ سیاست وتمدن کے بڑے تجربے کئے اور دکھنی قومیت کی صحیح معنوں میں تعمیر کی۔ اس سلطنت کے حامل "امیران صدہ" تھے جو شمال سے دکن میں وارد ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ شمالی تمدن کا بڑا سرمایہ آیا تھا۔ جو سلطنت بہمنی کی تعمیر میں لگایا گیا جس وقت ان واردوں کے قافلے بندھیاچل اور نربدا کی گھاٹیوں کو عبور کر کے بالاگھاٹ کی شاداب وادیوں میں اترنے لگے تو ان کو ہر قدم پر نئی فضائیں ملنے لگیں۔ ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے سکون قلب کے ساتھ زندگی کی نئی لہر دوڑانے لگے پہاڑیوں کی گودی میں جو ندیاں بہتی ہیں ان کا شفاف پانی کبھی سرسبز چوٹیوں سے جھرتا اور کبھی شاداب درختوں کی جھرمٹ سے گذرتا ہوا انسانی تخیل کی اس قدر گدگداتا ہے کہ دیکھنے والے بے چین ہو جاتے ہیں اور فطرت شناس قلوب رقص و وجد کے ساتھ جھومنے لگتے ہیں۔ دکن میں کئی ہستیاں ایسی بھی گذری ہیں جو اس دیوتائے فطرت کے سامنے اپنا چڑھاوا چڑھانے کے لئے دریاؤں کے کنارے بیٹھ گئیں اور اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ انھیں وادیوں میں دکھنی تمدن کے پرانے خزانے ملتے ہیں اور ان قومی رہنماؤں کی بھولی ہوئی صدائیں سنائی دیتی ہیں جو کبھی تعمیر ملت کے لئے بلند ہوئی تھیں۔ غرض دکن کا خطہ تمام ہندوستان میں اپنی جغرافی اور تمدنی دلفریبیوں کا بہت بڑا مخزن ہے۔ اسی ماحول میں شمال کے نو واردوں کو غور وفکر کا بہت بڑا سامان ملا۔ جب ان واردوں نے دکن کی دریاؤں کے کنارے اپنی گٹھڑیاں کھولیں اور اپنا متاع تمدن بکھیرا تو قدیم وجدید تمدن کا بڑا دلکش امتزاج ہونے لگا۔ چند ہی روز کے اندر ان تمدنوں کا ایک خوشگوار

مرکب تیار ہو گیا جس سے بالآخر سلطنت بہمنی کی تعمیر عمل میں آئی۔

سلطنت بہمنی قرون وسطیٰ کی سلطنت تھی جس میں بادشاہ کی ذات اور اس کے دربار کو بہت اہمیت حاصل تھی کیونکہ اس زمانے کا بادشاہ اور اس کا دربار تمام افراد مملکت کا نقطۂ جاذبہ ہوتا تھا جہاں تمام مملکت کی سیاسی شعاعیں جمع ہوتی تھیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس زمانے میں عوام میں سیاسی شعور بالکل نہ تھا جس میں آج ہم سانس لینے کے عادی ہیں۔ جب سیاسی شعور نہ ہو اور افراد کو اپنی سیاسی ذمہ داریاں اور فرائض نہ معلوم ہوں تو خود اعتمادی کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے۔ حالات یہ تھے کہ افراد اپنے کو مملکت کے بے دست و پا اجزا سمجھتے تھے اور ان کی بقا مملکت کی سرپرستی پر منحصر تھی۔ اسی وجہ سے ان کی نظر بادشاہ اور اس کے دربار پر پڑتی تھی اور ان کی زندگی بادشاہ کی زندگی کے ساتھ وابستہ تھی۔ جب کبھی بادشاہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا تو ملک کے تمام گوشوں میں بے چینی پھیل جاتی تھی۔ مغل تاریخ کا واقعہ ہے کہ علالت کی وجہ سے شاہجہاں بادشاہ چند روز جھروکہ درشن میں نہیں آئے تو تمام ہندوستان میں کھرام مچنے لگا اور لوگ طرح طرح کی تاویلیں کرنے لگے۔ شہنشاہ کا دستور یہ تھا کہ ہر روز صبح کو فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد تسبیح پڑھتے ہوئے جھروکہ درشن میں بیٹھ جاتے تھے۔ اور وہ دیکھتے تھے کہ نیچے سے ان کی رعایا ڈنڈوت کرتے ہوئے گذرتی تھی اور درشنیوں کے دل بھر جاتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ قرون وسطیٰ میں مملکت کی تعمیر اور اس کا قیام اس خاموش اطاعت پر مبنی تھا جس کو انیسویں صدی کے مفکر جری بنتم اور جان آسٹن عادتی اطاعت کہتے ہیں یعنی لوگ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے کو حکومت کے ہر فیصلے کے سپرد کر دیتے تھے کہ "امور مملکت خویش خسرواں دانند"۔ یہ حقیقت پوری طور پر نہیں تو بڑی حد تک زمانہ حال پر بھی صادق آتی ہے آج بھی کوئی فرد اپنی مملکت سے جدا ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کچھ اسی وجہ سے بادشاہ اور اس کا دربار اہل ملک کی امیدوں کا آخری مرجع اور قومی تکمیل کی آخری منزل سمجھی جاتی تھی۔ میدان جنگ میں سپاہی اس وقت تک بے جگری سے لڑتے تھے جب تک ان کے بادشاہ کا نظر افروز نظارہ ہمت بڑھاتا تھا۔ ہندوستان کے بادشاہ اور راجہ عماری میں بیٹھ کر اپنی رونمائی کرتے اور جب بادشاہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا تو فوراً صفیں ٹوٹنے لگتیں۔ ہندوستان کی

تاریخ میں ایسے بہتیرے واقعات ملتے ہیں کہ جب کبھی بادشاہ عماری سے اتر گئے اور نظروں سے غائب ہو گئے تو میدان جنگ میں بھگدڑ مچ گئی اور بڑے بڑے سورما بھی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

اسی وجہ سے ہندوستان ہمیشہ بادشاہ اور دربار کی تزئین بہت ضروری سمجھی گئی۔ کیونکہ ہندوستانی دل و دماغ بہت بادشاہ پرست ہیں جس قدر شاہی تزئین سلطنت کے طول و عرض میں ضیا پاشی کرتی رہا اسی قدر ہندوستان میں جذبات وفاداری ابھرے اور ملک کے ہر گوشے سے اطاعت و انقیاد کی والہانہ صدائیں بلند ہونے لگیں۔ برخلاف اس کے جب دربار خاموش ہو گئے تو رعایا کی گرمئی ہنگامہ بھی ختم ہو گئی۔ چنانچہ ہندوستان میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہیں۔ ہر سلطنت نے اپنے سیاسی بست و کشاد میں دربار کی تزئین کو پہلے جگہ دی۔ کیوں کہ ہندوستان میں حکومت کو موثر بنانے کا یہی ایک آلۂ کار تھا۔ پٹھان بادشاہوں کے دور میں جو تقریباً دو سو سال ہندوستان میں جاری تھا دربار کی زیب و زینت پر بہت زور دیا گیا۔ بادشاہ شاندار لباس زیب تن کرتے تھے۔ دربار کے ایوان بڑے تزک و احتشام سے آراستہ کئے جاتے تھے۔ زرین تخت بچھائے جاتے تھے اور بادشاہ کے جلوس بھی بڑے اہتمام سے کئے جاتے تھے اگرچہ سترھویں صدی میں مغل شہنشاہوں نے اپنے دربار کے سجانے میں کمال کر دیا تھا۔ لیکن پٹھان بادشاہوں نے بھی اس سے چشم پوشی نہیں کی۔ غیاث الدین بلبن نے جو خاندان غلامان کا جلیل القدر فرمان روا تھا سب سے پہلے بڑے اہتمام کے ساتھ شاہی دربار کی تزئین کی تھی۔ دربار کے لئے ایک بہت بڑا محل بنایا گیا۔ جو لال محل کہلاتا تھا۔ اس میں تخت بچھایا جاتا تھا اور سامنے چاروں طرف امراء و وزراء جمع ہوتے تھے۔ آداب دربار کا پورا لحاظ ہوتا تھا اور خاموشی ہوتی تھی۔ بادشاہ پوری متانت کے ساتھ تخت پر بیٹھتے تھے۔ اور حاضرین دربار بادشاہ کے ہر اشارے پر اپنا سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔ دربار کے باہر سوار و ہاتھی کھڑے ہوتے تھے اور اس کا دور دور تک رعب بیٹھتا تھا۔

جب ۱۳۴۷ء میں بہمنی سلطنت کی دکن میں داغ بیل ڈالی گئی تو اس سلطنت کے تعمیر کاروں نے اپنی رعایا کے صحیح جذبات کا پورا اندازہ لگایا۔ سلطنت کی تشکیل میں بادشاہ کی ذات اور دربار کی

شان و شوکت کو سب سے پہلے جگہ دی گئی۔ دربار کو بڑے سلیقے سے سجایا گیا تاکہ رعایا اس سے متاثر ہو اور دل سے اطاعت کرے۔ شمال کی طرح دکن میں رعایا کی شاہ پرست آنکھیں جس چیز کو پہلے ٹٹولتی تھیں وہ شاہی طمطراق ہے جس کو انگلستان کے دستوری مورخ بیجہٹ نے مملکت کا ڈرامائی عنصر کہا ہے۔ اگر دربار کی شان و شوکت نہ ہو تو دیکھنے والوں کی آنکھیں مایوسی کے ساتھ پلٹ جاتی تھیں اور ان میں جذبۂ وفاشعاری نہیں ابھرتا تھا۔ خود دکن کے قدیم راجگان بھی درباروں کو بلند آہنگ بنانے کے عادی تھے۔ ان کے تخت و تاج خوب جگمگاتے تھے۔ واتاپی، ملکھیڑ اور کلیانی کے شاہی درباروں کے افسانے ابھی دکن میں زندہ تھے۔ دیوگری اور ورنگل کو بھی لوگ نہیں بھولے تھے۔ جس سرزمین میں تاج و تخت کی یہ روایتیں گھومتی ہوں وہاں سیدھا سادا خاموش دربار بے اثر ہو کر رہ جاتا اور نو مفتوح رعایا کبھی اپنے بادشاہ کی گرویدہ نہ ہوتی۔

سلاطین بہمنی کا سب سے پہلا دربار اس وقت منعقد ہوا جب امیران صدہ سلطان محمد تغلق کی فوجوں کے سامنے کشاکش زیست میں کامیاب ہوگئے۔ دولت آباد کی دیواروں کے سامنے سلطان محمد تغلق کی شکست اس بات کا اعلان تھا کہ اب دکن امیران صدہ کے ہاتھوں میں خود مختار ہے جس کو دہلی کی مرکزیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب یہ آزادی حاصل ہوگئی تو پھر امیران صدہ نے اس نوخیز سلطنت میں جو ان کی مبارک کوششوں کا پھل تھا سیاسی تنظیم پیدا کرنے کی کوشش کی۔ پہلے انھوں نے اپنے ایک برگزیدہ امیر صدہ ظفر خاں کو اپنا بادشاہ بنایا اور اس کے جلوس شاہی کی تیاریاں ہونے لگیں کیونکہ بادشاہ اور اس کا دربار سلطنت کا نفس ناطقہ تھا۔ اگر اس کی جگہ معین ہو جاتے تو سلطنت کے تمام اعضائے سیاسی خود بخود اپنی جگہ کر لیتے ہیں اور ملک میں ہر طرف روح دوڑ جاتی ہے۔ چنانچہ دکن کے مورخ کہتے ہیں کہ ۷۴۸ھ میں جمعہ کے دن ۲۴۔ ربیع الاول کو قلعہ دولت آباد کی مبارک شاہی مسجد میں یہ مبارک دربار سجایا گیا۔ یہ سلطنت بہمنی کا سب سے پہلا اور عہد آفریں دربار ہے جو ایک قدیم مسجد میں منعقد ہوا تھا۔ گو اس میں وہ شان و شوکت نہ تھی جو شاہی درباروں میں ہونی چاہیئے لیکن اس کے دور رس نتائج کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ تاریخ کا ایک مہتم بالشان اجتماع تھا جس میں ایک متمدن سلطنت کی بنیاد رکھی گئی

اہل دکن کی حیات سیاسی کو منظم کیا۔ دکن کی مشترک قومیت کی تشکیل کی گئی۔ جس میں تمام قومیتیں جمع ہوئیں اور بلا امتیاز قوم و ملت تمام اہل دکن کے قوائے ذہنی اور اخلاقی کی تربیت کا سامان جمع کیا گیا۔ یہ ایک دلفریب سماں تھا کہ تمام امیران صدہ اپنے نئے بادشاہ کی تخت نشینی کے لئے مسجد میں جمع ہوئے، مسجد میں قیمتی قالینوں کا فرش کیا گیا اور جگہ جگہ خوش رنگ مسندیں بچھائی گئی تھیں۔ اس مجمع میں اہل سپاہی اور عالم و صوفی دونوں جمع تھے حضرت شیخ سراج جنیدی بھی آگئے جو اس کاروان کے متاع گراں بہا تھے یہ اس زمانے کے بہت بڑے صوفی ہیں جن کا سلطنت بہمنی کی تعمیر میں بہت بڑا ہاتھ ہے۔ شیخ نے اپنے ہاتھ سے ظفر خان کے سر پر پگڑی باندھی اور کمر میں تلوار آویزاں کرکے اس کو مسجد کے ممبر پر بٹھایا جو سلطنت بہمنی کا پہلا تخت تھا یہ ظفر خاں کی بادشاہی کا اعلان تھا جو علاؤ الدین حسن بہمنی شاہ کے لقب سے دکن کا بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد شیخ نے ایک سبق آموز خطبہ سے حاضرین دربار کو مخاطب کیا۔ اس میں سلطنت کی ضرورت بتائی کہ انسانوں کے سیاسی اجتماع اور سیاسی تنظیم کی کیا ضرورت ہے اور اس کا کیا نصب العین ہونا چاہیئے انصاف و رعایا پروری پر روشنی ڈالی کہ ہر بادشاہ اپنی رعایا کے فلاح و بہبود کا خدا کے سامنے جوابدہ ہے پھر اس نئی سلطنت کی بقا کے لئے دردِ دل سے دعا کی جس میں تمام حاضرین اپنے صمیم قلب کے ساتھ شریک تھے۔ اس کے بعد حاضرین دربار نے بادشاہ کے سامنے پورے خلوص و مسرت کے ساتھ نذریں پیش کیں۔ مورخ کہتے ہیں کہ حاضرین دربار اس قدر خوش تھے کہ جب دربار برخاست ہوا تو سب اچھلتے کودتے ہوئے اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔ اس عہد کے مورخ اور شاعر مولانا عصامی جس نے اس دربار کی نشست و برخاست اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے۔

در آن ساعت خوب و فرخندہ روز　　بہ فرمان دادار دوران فروز
یکے تخت زرین ہمی آراستند　　سران را در آن بارگاہ خواستند
چہ تختے کہ افلاک را سایہ کرد　　زمین را سراسر پر از مایہ کرد
در آمد بر آن تخت گوہر نگار　　یکے شاہ دین پرور و دون شکار

اصل میں شاہی دربار پوری شان و شوکت کے ساتھ اس وقت منعقد ہونے لگے جبکہ [illegible] آباد

کو چھوڑ کر گلبرگہ کو پایہ تخت بنایا گیا۔ علاء الدین حسن بہمنی شاہ نے اپنی مرکزی حکومت بہت جلد دولت آباد سے گلبرگہ میں منتقل کر دی کیونکہ یہ جگہ دکن کا مرکز تعلق ہونے کی وجہ سے زیادہ موزون تھی اور یہاں جنوب کی سلطنت بیجانگر سے باخبر رہنے کے اچھے مواقع تھے جو ایک طاقتور ہمسایہ سلطنت تھی۔ گلبرگہ میں قلعے کی تعمیر کے ساتھ محل بنائے گئے اور اس میں دربار کا انتظام ہوا۔ علاء الدین بہمن شاہ کو دربار کی آرائش کا بہت خیال تھا۔ ایک بہت بڑے دالان میں دربار منعقد ہونے لگا اور بادشاہ کی نشست کے لئے چاندی کا ایک بہت بڑا تخت بنایا جس پر کئی من چاندی صرف ہوئی تھی۔ اس تخت سے دربار کے ضروری لوازم پورے ہوئے اور دربار کی رونق بہت بڑھ گئی۔ بادشاہ اس تخت پر بیٹھتے تھے اور امراء و وزراء ادب کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تھے۔ کبھی سیف الدین غوری کو جو وزیر اعظم ہونے کی وجہ سے ایک ذی عزت شخصیت تھی بیٹھنے کی اجازت ہو جاتی تھی۔ فرشتہ کہتا ہے کہ علاء الدین حسن بہمنی شاہ ہر روز دربار منعقد کرتا تھا اور اسکے اوقات مقرر تھے۔ اس دربار میں احکام جاری ہوتے سیاسی امور پر غور ہوتا تھا اور رعایا کے احوال پوچھے جاتے تھے۔

لیکن بہمنی دربار کی اصل تزئین جو ہندوستان کی تاریخ میں مشہور رہے وہ علاء الدین کے جانشین محمد شاہ اول کے عہد میں پیدا ہوئی۔ جو ۱۳۵۸ء میں تخت نشین ہوا۔ محمد شاہ خاندان بہمنی کا وہ جلیل القدر بادشاہ ہے جس میں تدبر، مہارت حرب، اور قانون دستور سازی کے تمام محاسن جمع تھے سچ پوچھو تو اسی فرماں روا نے سلطنت بہمنی کا حقیقی نقشہ بنایا تھا۔ مرکزی اور مقامی حکومتوں کی تشکیل کی گئی۔ تمام اعضائے سیاسی معین کئے۔ وزراء کے فرائض کی پوری وضاحت کی لیکن جس انتظام میں زیادہ اہتمام کیا گیا وہ شاہی دربار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ میں شاہی شان و شوکت و رعب داب کے لوازم کی صحیح پہچان تھی۔ وہ جانتا تھا کہ بادشاہ اور اس کا دربار جو سلطنت کا نفس ناطقہ ہوتا ہے کس طرح سجایا جائے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک بلند پایہ ذوق حسن کاری بھی جمع تھا۔ دربار کی تزئین میں اس نے جس شگفتہ ذوق سے کام لیا تھا اس زمانے کی تاریخ میں اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ اس دربار میں ایسے شاہی لوازم جمع کئے گئے جس کا اس زمانے میں بہت سوں کو اندازہ نہیں تھا۔

اس میں شاہی رعب و داب کے علاوہ ایک حسن کارانہ ذوق کی تسکین بھی ہوتی تھی۔ آج بھی کچھ ان کے پر لطف دربار کی وجہ سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اور پہچانے جاتے ہیں۔

تخت نشین ہوتے ہی محمد شاہ نے دربار کو آراستہ کرنا شروع کیا۔ بعد اس کے قواعد بنائے۔ ایوان شاہی میں نہایت دیدہ زیب ریشمی و اعلیٰ قالین بچھائے جاتے تھے۔ ایوان شاہی کی دیواروں پر ریشمی پردے آویزاں کئے جاتے تھے اور بیچ میں جہاں شاہی تخت رکھا جاتا تھا۔ مخمل و زربفت کے شامیانے کھڑے کئے جاتے۔ شامیانے کے نیچے شاہی تخت ہوتا تھا۔ ایک شاہی چتر بھی بنایا گیا تھا جس میں بہت تکلفات تھے۔ اس کے قبہ پر جواہر لگائے گئے تھے۔ جو بہت جگمگاتے تھے اور مورخ فرشتہ کہتا ہے کہ اس کے قبہ پر ہما کی شکل کا ایک پرند بٹھایا گیا تھا جس کے سر پر ایک بہت بڑا قیمتی یاقوت نصب تھا۔ یہ چتر بھی دربار میں رہتا تھا اور جب بادشاہ باہر جاتے تھے ان کے سر پر بلند کیا جاتا تھا۔ دربار کے انتظام کے لئے بعض عہدہ دار مقرر تھے جو تواچیاں اور یساولاں کہلاتے تھے۔ تواچیوں کا یہ کام تھا کہ دربار میں لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ اور تمام حاضرین دربار کو ان کے منصب اور رتبہ کے مطابق جگہ دی جاتی تھی اور ہر شخص دربار میں خاموشی کے ساتھ کھڑا ہو جاتا تھا۔ بڑے عہدہ دار و وزراء سامنے کھڑے ہوتے تھے اور دوسرے پیچھے ہوتے تھے۔ دربار کے صحن میں دو سو اسلحہ دار اور ایوان کے باہر چار ہزار سپاہی کھڑے ہوتے تھے جس کو خاصہ خیل کہتے ہیں۔ جب بادشاہ دربار میں آتے تھے تو نوبت بجتی تھی اور حاضرین دربار میں ادب سے کھڑے ہو جاتے تھے۔

جمعہ کے علاوہ ہر روز صبح کو دس بجے کے قریب دربار منعقد ہوتا تھا۔ پہلے حاضرین دربار جمع ہو جاتے تھے اور بادشاہ محل سے باہر آتے تھے۔ محمد شاہ کا دستور یہ تھا کہ پہلے وہ تخت کے سامنے سر جھکاتے تھے کیونکہ یہ علاء الدین حسن شاہ کا تخت تھا اور پھر ادب سے بیٹھ جاتے تھے۔ اور امور سلطنت کی نگہداشت شروع ہو جاتی۔ نذریں دی جاتی تھیں۔ فرامین جاری ہوتے تھے اور نئے عہدہ دار اور منصب داروں کو شاہی معائنہ کے لئے پیش کیا جاتا تھا۔ شاہی لوازم کی جگمگاہٹ کے ساتھ حاضرین دربار کی ترتیب ایک بہت ہی دلکش منظر پیش کرتی تھی۔ تخت کے سامنے حاضرین کے آگے

پیچھے تمام قطاریں ہوتی تھیں اور شاہی متانت کا سماں بندھ جاتا تھا۔ دربار میں کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ وزرار عہدہ داروں کے علاوہ شاہی خاندان کے افراد بھی دربار میں کھڑے ہوتے تھے۔ علاء الدین بہمن شاہ کے عہد میں کبھی سیف الدین غوری کو جو جلیل القدر وزیر اعظم تھا بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔ محمد شاہ کے عہد میں بھی وہ کبھی بیٹھ گیا لیکن محمد شاہ کو اس کا بیٹھنا اچھا نہیں معلوم ہوا۔ اور اس وزیر با تدبیر نے بادشاہ کے تیور پہچان کر خود کنارہ کشی کی۔ اور آپ بھی دوسروں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ حالانکہ ایک جلیل القدر عہدہ پر فائز ہونے کی وجہ سے سلطنت میں اس کی بڑی عزت تھی اور محمد شاہ نے اس کی بیٹی سے شادی بھی کی تھی۔ دربار ظہر کی نماز تک جاری رہتا تھا۔ اور جب نماز کی اذان سنائی دیتی تو دربار برخاست ہو جاتا تھا۔

محمد شاہ کے دربار کی حقیقی رونق اس کے مشہور تخت کی وجہ سے ہے۔ جو تخت فیروزہ کے نام سے موسوم ہے۔ پہلے پہل محمد شاہ چاندی کے تخت پر جلوس کرتے رہے جو ان کے باپ کے عہد میں تیار ہوا تھا۔ لیکن اول تو اس تخت میں وہ آب و تاب نہ تھی جو ایک شاہی تخت میں ہونا چاہیئے۔ اور یہ محمد شاہ کا حسن کارانہ ذوق کا جواب نہ تھا۔ دوسرے بادشاہ اس کو ایک مقدس چیز سمجھ کر احترام کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنی نشست کے لئے ایک علیحدہ تخت بنایا جو بہمنی تاریخ کی ایک خاص چیز ہے۔ اس تخت کی بہت بڑی تفصیل ہے۔ مورخ فرشتہ نے اس تخت کی تاریخ و تفصیل بتائی ہے۔ اگرچہ اس مورخ نے یہ تخت دیکھا نہیں تھا۔ کیونکہ سولھویں صدی میں جبکہ اس مورخ نے اپنی مشہور تاریخ لکھی ہے اس تخت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ لیکن فرشتہ کہتا ہے کہ اس نے اس خاندان کے لوگوں سے اس کے حالات دریافت کئے جو اس تخت کے محافظ تھے اگر اس کی اصلیت دیکھی جائے تو یہ تخت محمد شاہ کو تلنگانہ کے ایک راجہ سے تحفے میں ملا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ محمد شاہ نے ۷۳ھ میں تلنگانہ پر حملہ کیا تھا۔ کیونکہ یہاں اکثر علاقے فتح نہیں ہوئے تھے۔ تلنگانہ کے راجہ نے صلح کر لی اور محمد شاہ کو خوش کرنے کے لئے ایک تخت نذر کیا جس کی ساخت اور رونق بہت دلکش تھی اور محمد شاہ نے اس کو بہت پسند کیا اور اپنی نشست کے لئے استعمال کیا۔

یہ ایک لکڑی کا تخت تھا۔ جس پر فیروزہ رنگ کی میناکاری تھی۔ اس کے تختے اور پایے حسب ضرورت الگ ہو جاتے تھے۔ اور دربار کے وقت ان کو جوڑ کر قایم کر دیا جاتا تھا۔ لیکن محمد شاہ نے اپنے بلند پایہ ذوق سے اس میں بہت اضافہ کئے۔ اس میں سونے کی میناکاری کی گئی۔ اور جگہ جگہ قیمتی رنگا رنگ جواہر نصب کئے گئے ان اضافوں سے یہ تخت اس قدر جگمگاتا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں۔ گو سونے اور جواہر سے اس کا اصل رنگ فیروزہ چھپ گیا تھا۔ لیکن اس کو تخت فیروزہ ہی بولتے تھے۔ اور سونے اور جواہر کی وجہ سے وہ بیش قیمت سمجھا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے کے جوہریوں نے اس کی قیمت کا اندازہ اس وقت ایک کروڑ روپے کیا تھا۔ دربار کے بعد یہ تخت اٹھا کر محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ اور اس کی حفاظت کے لئے کئی لوگ مقرر تھے۔ یہ بہمنیوں کا مشہور تخت فیروزہ ہے۔ جس کے اب تک دکن میں افسانے مشہور رہیں۔ اور اس زمانے میں لوگ دور دور سے دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ جس وقت محمد شاہ کے ذوق کے مطابق یہ تخت تیار ہو گیا تو اس کی مسرت میں ایک خاص دربار منعقد کیا گیا تھا۔ اور کئی روز جشن ہوئے۔ اور جب بادشاہ نے اس تخت پر جلوس کیا تو شاعروں نے ان الفاظ میں گیت گائے۔

بر اورنگ فیروزہ بنشست شاد | بہ مجلس طرب رانی داد و داد
نشستند گرداں بہ گرد سریر | بہ شادی بزرگان روشن ضمیر

تاریخی کاغذات کے ذخیرے

(۴)

نواب عماد الملک میر شہاب الدین خاں کے عنایت نامے

از جناب محمد غوث صاحب، ام، اے، ال، ال بی

کتب خانۂ سعیدیہ کے ذخیرۂ کاغذات میں چار مکاتیب ایسے شامل ہیں جو نواب عماد الملک میر شہاب الدین خاں نے نواب محمد علیخاں والاجاہ نواب کرناٹک کے نام ارسال کئے تھے۔ یہ چاروں مکاتیب مجلہ کی اس اشاعت میں شائع کئے جاتے ہیں۔

نواب عماد الملک میر شہاب الدین خاں حضرت آصف جاہ اوّل کے پوتے اور امیر الامرا غازی الدین خاں فیروز جنگ کے بیٹے تھے۔

بادشاہ گر نواب عماد الملک کا نام تاریخ ہند کے ایک ایسے پر آشوب دور کو یاد دلاتا ہے جب کہ مغلیہ سطوت اور شوکت ایک افسانہ بنتی جارہی تھی۔ عماد الملک کا نام تاریخ میں جرأت اور ہمت کے ساتھ سوء تدبیری اور غیر مآل اندیشی کے لئے یادگار رہے گا۔ اپنی حفاظت اور اپنے آپ کو ممتاز اور سربلند کرنے کا جذبہ اگر تدبیر و دانش کے ساتھ کارفرما ہوتا تو نہ صرف سلطنت اور حکومت کے استحکام کا ذریعہ ہوتا بلکہ ذاتی رفعت و عظمت کا بھی موجب ہوتا۔

بہرحال جب نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ سنہ ۱۱۶۵ھ میں دکن کے انتظام پر مامور ہو کر جانب اورنگ آباد روانہ ہوئے تو اپنے اصلی عہدۂ امیر الامرائی یا منصب بخشی گری پر عماد الملک کو نائب بنا کر احمد شاہ کی پیشگاہ میں متعین کیا۔ اور ابو المنصور خاں صفدر جنگ وزیر سے موالات پیدا کرادی۔ دکن سے غازی الدین خان کے انتقال کی خبر آئی تو صفدر جنگ اور عماد الملک میں باہم اس قدر طویل جول ہوا کہ عماد الملک نے خود اپنے والد کا عہدۂ امیر الامرائی حاصل کرلیا۔ باپ کا خطاب بھی حاصل ہوا[۱]

---

[۱] والاجاہی دفتر میں عماد الملک کے مکتوب کی ایک نقل جو لکھی گئی ہے اس پر یہ خطاب یوں بیان کیا گیا ہے۔ نواب بخشی الممالک آصف جاہ نظام الملک شہاب الدین خاں بہادر فتح جنگ سپہ سالار۔

اس کے بعد جب بادشاہ کے پاس عماد الملک کو بڑا اعتبار حاصل ہو گیا تو صفدر جنگ سے ان بن ہو گئی۔ اس ان بن کی بنا پر عماد الملک نے اپنے ماموخانخاناں سے مل کر قلعہ پر دباؤ ڈال کر کے موسوی خاں کو جو صفدر جنگ کی نیابت میں چار سو آدمیوں کے ساتھ میر آتشی کے عہدہ کے کاروبار انجام دیتے تھے۔ قلعہ سے باہر کر دیا۔ اس واقعہ کے دوسرے روز صفدر جنگ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ کوشش کی کہ میر آتشی کی خدمت پھر حاصل ہو جائے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ حکم ہوا کہ دوسری کوئی خدمت طلب کیجائے۔ صفدر جنگ نے میر بخشی گری کے عہدہ پر عماد الملک کے بجائے سادات خاں ذوالفقار جنگ کو مامور کرا دیا۔ بہر حال یہ قصے چل رہے تھے اور جب بادشاہ صفدر جنگ سے بیدل ہو گئے تو عماد الملک نے یہ چاہا کہ صفدر جنگ کو نیچا دکھایا جائے۔ دونوں میں جنگ وجدل کی نوبت آ گئی۔ اس جنگ کے زمانہ میں عماد الملک نے ملہار راؤ ہولکر کو مالوہ سے اور جے آپا کو ناگور سے کمک کے لئے طلب کیا۔ صفدر جنگ نے سورج مل جاٹ سے امداد چاہی۔ اس زمانہ میں عماد الملک نے جو مکتوب محمد علی خاں والاجاہ کو تحریر کیا وہ

(۷)

حسب ذیل ہے۔

ہو

خان شہامت و بسالت مرتبت اخلاص و موالات نشان۔

دو قطعہ خط محبت نمط یکے مرقوم نوزدہم جمادی الاولیٰ و دیگر تحریر بیست و دوم شہر مذکور درعین انتظار رسیدہ و نشاط افزا گردید از خلوص محبت و دولت خواہی و حصول سرور موفور بہ تعلق یافتن خدمت میر بخشی گری و غیرہ خدمات موروث کہ مرقوم بود باقتضائے کمال خیر اندیشی و اتحاد دلی ست۔ چرا این ہمہ خوش وقتی آں شہامت و بسالت مرتبت رو ندہد کہ ار سہ شبت شریک دولت و رفیق در ہمہ وقت ہمہ ترقیات ما باعث ترقیات رفقائے دولت خواہ و ذریعہ امتیازے مدارج خیر اندیشاں بلا اشتباہ است در باب منصب و خطاب و پالکی جہالر دار کہ نوشتہ اند ہمہ معروض جناب مقدس معلیٰ گشتہ منظور شد۔ دولت خواہی ہا کہ در وقت حضرت مغفرت منزلت از ان اخلاص و موالات نشان بتقدیم رسیدہ و استقامت و ثباتے کہ الحال ان موالات نشان بر صراط مستقیم خلوص محبت دارند بوجہ احسن مرتسم و منقش خاطر است۔ یکی ہمت مصروف بر ہمیں کہ در ازائے این حسن خدمت

و صداقت و وفا مراعاتے بعمل آید کہ آن اخلاص و موالات نشان خوش وقت شوند و ثروت و اقتدارے کہ تمنا دارند زیادہ از آن حاصل نمایند۔ پاس امرے کہ بزرگاں فرمودہ باشند ہمہ منظور بلکہ مافوق آن مرکوز خاطر است در باب فرماں والاشان و خلعت وغیرہ عطیات برائے آن شہامت و ثبات مرتبت بحضور انور معروض داشتہ شدہ لیکن بسبب ہنگامہ کہ درین روزہا رودادہ و مجلس برکاتند علیحدہ بقلم آمدہ بالفعل فرستادہ نہ شدہ انشاء اللہ تعالی متعاقب می رسند۔ وسند ...... و سرناٹک و ترچناپلی وغیرہ نیز خواہد رسید بعض مقدمات بوکیل آن شہامت و عوالی مرتبت گفتہ شد۔ خواہد نوشت۔ جواب آن زود باید نوشت۔ مراتب کارطلبی و فدویت مردم فرنگ انگریز بسیار شنیدہ شدہ است۔ اگر جماعت ما ازین مردم کہ در فن خود ممتاز باشند مستمال نمودہ بہ فرستند باعث کمال استرضاء و مجرائی آن شہامت و عوالی مرتبت است۔"

شرح دستخط خاص:۔ ان موالات نشان بخاطر جمع بکارہائے متعلقہ سرحد خود و تقدیم لوازم دولت خواہی سرگرم و مستعد باشند انشاء اللہ تعالی آنچہ باعث رفاہ و بہبود شما خواہد بود بعمل خواہد آمد۔ (بیفیض خاص)

اس مکتوب میں یہ درج ہے کہ "ہنگامہ کہ درین روزہا رودادہ و مجلس برکاتند علیحدہ بقلم آمدہ" یہ یادداشت ذیل میں نقل کی جاتی ہے:۔

"در ابتدا صفدر جنگ و این جانب را ربط بدرجۂ اتم بود وقتے کہ ایام نکبت و ادبارش نزدیک رسید خواست با حضرت بادشاہ جہاں پناہ کہ ولی نعمت و ظل اللہ اند مصدر حرکات ناشائستہ شود۔ ما از اطلاع این معنی خواہیم کہ او متنبہ شدہ از ارتکاب حرکات نالائقہ باز ماند از آن جا کہ
چو تیرہ شود مرد را روزگار ہمہ آن کند کش نیاید بکار۔ ہر چند فہمانیدم نشنید و بغرور جمعیت موفور با اتفاق سورج مل جاٹ بدذات کہ فیما بین دار الخلافہ و مستقر الخلافہ مصدر بغی و فساد است و از زمان بادشاہان سلف سر ہم بود و بادشاہ زادہ ہائے عالی مقدار معہ راجہائے ہندوستان مثل مہاراجہ جے سنگھ وغیرہ برو تعین شدہ اند و استیصال این ریشۂ فساد از قرار واقع بعمل نیامدہ بے ادبانہ پیش آمد و این جانب بمقتضائے پاس حق نمک و نظر بنام بزرگان متحمل این ہمہ حرکات ناشائستۂ مقہور مذکور نشدہ باوصف این کہ ہمہ ارکان سلطنت بعضے

ازراہ جبن و بعضے ازراہ خفت عقل و بعضے ازراہ نمک حرامی با مخالف سلطنت سازش درداشتند
متوکلاً علی اللہ المستعان با جمعیتے کہ داشتیم بہ تنبیہ و تادیب او کہ با لک سوار دم نخوت و پندار
می زد مستعد شدیم۔ بحول و قوۃ ایزدی و امداد ارواح طیبہ صفدر جنگ ۔ جابث تنبیہ ہائے واقعی یافتہ
از سواد شہر دار الخلافہ ہزیمت خوردہ آوارۂ دشت ادبار گردیدہ و ما متوجہ تعاقب آنہا ہستیم انشاء اللہ
تعالیٰ عنقریب قتیل یا اسیر می شود و عرصۂ سلطنت ازین خار و خاشاک پاک شدہ گلشن ہمیشہ بہار امن و
امان می گردد۔ تفصیل [illegible] وقت جلوہ افروزی مقاصد دولت خواہان صادق الاعتقاد است۔ آن شہامت
و بسالت مرتبت بہمہ وجوہ خاطر جمع دارند و امیدوار ترقیات روز افزون باشند۔"

اس مکتوب کے لفافہ پر جو مہر ثبت ہے وہ یہ ہے ”نظام الملک آصفجاہ بہادر ۱۱۶۶ھ“ لفافہ
کے کونے پر ”سراج الدولہ“ مرقوم ہے جو نواب والاجاہ کا ابتدائی خطاب تھا۔ اس لفافہ پر دفتر والاجاہی
میں یہ شرح کی گئی ہے کہ ”دو نہم ربیع الاول ۱۱۶۷ھ ورود نمود“

اس مکتوب کا مطلب یہ ہے کہ دو خطوط عین انتظار میں وصول ہوئے میر بخشی عہدہ حاصل ہونے پر جو خوشی ظاہر کی گئی ہے وہ
خیر اندیشی و دلی اتحاد کے باعث ہے۔ آپ تو تین پشتوں سے رفیق ہیں ہماری ترقی ہمارے رفیقوں
کی ترقی ہے منصب خطاب اور جھالردار پالکی عطا ہونے کی نسبت آپ نے جو لکھا تھا اس کو بادشاہ
کی خدمت میں عرض کر دیا گیا۔ بادشاہ نے اس کو منظور کر لیا۔ حضرت مغفرت منزل (نواب غازی الدین خاں)
کے زمانہ میں آپ نے جو اخلاص ظاہر کیا اور اب بھی محبت میں جو استقامت ہے وہ دل پر نقش ہے۔ اس
حسن خدمت اور صداقت کا ایسا معاوضہ عمل میں آئے گا کہ آپ بھی خوش وقت ہوں گے۔ جس ثروت
و اقتدار کی آرزو ہے اس سے زیادہ حاصل ہوگا۔ بزرگوں نے جو بات کہی ہے اس کا پاس رہیگا۔ آپکے
لئے فرمان صادر ہونے اور خلعت وغیرہ مرحمت ہونے کی نسبت بادشاہ کی خدمت میں عرض کر دیا گیا
ہے لیکن ان دنوں یہاں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اس کی روئداد ایک علٰحدہ کاغذ پر درج کی گئی ہے۔
اس کی وجہ سے تعمیل نہ ہو سکی۔ متعاقب تعمیل ہوگی۔ اور کرناٹک ترچناپلی وغیرہ کی سند بھی بھیجی جائیگی
بعض امور آپکے وکیل سے کہہ دیئے گئے ہیں۔ وہ آپ کو مطلع کرے گا۔ اس کا جواب جلد ارسال کیا جائے۔

انگریزوں کی قدرومنزلت اور کارپردازی کی شہرت بہت سننے میں آئی ہے۔ اگر ان لوگوں کی کسی جماعت کو جو
اپنے فن میں ممتاز ہوں یہاں بھیجیں تو باعث خوشنودی ہوگا۔

عمادالملک نے مکتوب کے آخر میں اپنے ہاتھ سے جو عبارت لکھی ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ
مکتوب الیہ، نواب والا جاہ خاطر جمعی سے اپنے کاروبار انجام دیتے رہیں جو امور ان کے لئے باعث
بہبودی ہوں گے۔ وہ عمل میں لائے جائیں گے۔

مکتوب کے ساتھ جو یادداشت منسلک ہے اور جو اوپر نقل کی جا چکی ہے۔ اس کا مطلب
یہ ہے کہ ابتدا میں صفدر جنگ اور مجھ میں بہت ربط تھا لیکن جب ان کی نکبت کا زمانہ آیا تو
انھوں نے یہ چاہا کہ بادشاہ کے ساتھ حرکات ناشائستہ عمل میں لائیں۔ مجھے اس کی اطلاع ہوئی
تو میں چاہتا تھا کہ صفدر جنگ متنبہ ہو کر اپنی گستاخی سے باز رہ جائیں۔ ہر چند ان کو سمجھایا گیا انھوں نے
نہ مانا۔ اور بڑی فوج کے غرور میں سورج مل جاٹ کو ساتھ لے کر بے ادبی کر دی۔ حق نمک کے خیال
سے بزرگوں کے نام کی خاطر مجھے یہ باتیں گوارا نہیں ہوئیں، ارکان سلطنت میں چند تو نامردی سے،
چند اپنی عقل کی کمی سے اور بعض نمک حرامی سے، صفدر جنگ سے سازش کرتے رہے۔ خدا پر
بھروسہ کر کے جو فوج بھی میرے پاس موجود تھی اس کی مدد سے میں نے مقابلہ ٹھان لیا۔ مخالفین نے
لاکھ سوار جمع کر لئے تھے۔ خدا کی مدد سے صفدر جنگ اور جاٹ شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہیں
ان کا تعاقب کر رہا ہوں۔ کچھ دنوں میں مخالف یا تو قتل ہو جائیگا یا قید کر لیا جائیگا۔

ذیل میں جو مکتوب نقل کیا جاتا ہے نہ تو اس پر کوئی تاریخ مرقوم ہے اور نہ لفافہ پر کوئی اندراج ہے
لیکن اپنے مطالب کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکتوب بھی اسی ابتدائی زمانہ کا ہے۔

(۸)

هو

خان شہامت و بسالت بنیاد، اخلاص و موالات نشان من۔

خط محبت منزلہ متضمن تبیین مراتب خلوص و وثوق و خیر اندیشی با عنایت نامجات حضرت ظل اللہ

والغفران کہ مشتمل بر ہزاران ہزار تفضل وعنایات بود رسید۔ مراتب الطاف وافضال آن جناب راتحقق و ذہن نشین گردانید۔ چوں مارا پیروی جناب بزرگان خصوص حضرت جد امجد و حضرت علیہ الرحمۃ والغفران ہمیشہ منظور و ترقیات و رتبہ افزائی دوستان صادق الاعجاز ملحوظ و مرکوز است تفضل و اشفاقے کہ ازجناب حضرت مغفرت منزلت مبذول شدہ بود حالا بفضل الٰہی زیادہ ازان بمنصۂ شہود جلوہ نما خواہد شد و ترقیات دلخواہ خواہید نمود۔ چون ازمدت ہا کارہائے ہندوستان ابتر و ہر طرف آتش فساد شعلہ آور است لہذا تنبیہ و تادیب سرکشان بدنہاد و تصفیہ این ملک از خار فساد برذمۂ واجب ولازم آمدہ بحول و قوت الٰہی سلطنت رونق تازہ می یابد و استیصال ریشۂ فساد چنانچہ دل می خواہد بعمل می آید۔ اسلوب ہمہ مطالب موقوف بر سبیل زر پیش کش وارسال است ہر چند زود برسد بجا و باعث حصول مدعا است۔ برائے خطاب قطب الملک کہ نوشتہ اند این خطاب عبداللہ خاں بود وخان مذکور نیک نام نیست بنا بر آں مناسب ندیدیم کہ بہادران صادق و دوستان موافق بچنیں خطاب مخاطب شوند۔ بجائے آں خطاب عمدۃ الملک تجویز نمودہ شدہ است و منصب وغیرہ وجاگیر کہ از محال وطن درخواست نمودہ اند متعاقب بدستخط اقدس رسانیدہ فرستادہ می شود۔ بہ جمیع وجوہ خاطر جمع دارند۔ انشاء اللہ تعالیٰ رعایت ہا کہ در مخیلہ خیال آں موالات نشان نیست جلوہ نمائے ظہور خواہد شد۔ خاطر امشتاق دانستہ نویسان احوال باشند۔" (علامت دستخط)

شرح دستخط خاص ہے۔ "مارا زیادہ از حضرت انار اللہ برہانہ پاس قدامت وحقوق خدمت ملحوظ و منظور است انشاء اللہ تعالیٰ آنچہ رتبہ افزائے وازدیاد جمعیت وعلو مدارج است زیادہ از سابق بعمل می آید۔ خاطر جمع دارند۔"

لفافہ پر جو مہر ثبت ہے اس میں صرف "وزیر الممالک آصفجاہ نظام" پڑھا جاتا ہے۔ باقی الفاظ محو ہو گئے ہیں۔ ایک دوسرے خط پر یہ مہر ثبت ہے۔ جس میں "وزیر الممالک آصفجاہ نظام الملک بہادر سپہ سالار" صاف صاف پڑھا جاتا ہے۔ ممکن ہے پہلے خط پر بھی یہی مہر ثبت ہو۔ لفافہ پر یہ شرح ہے کہ "جواب نوشتہ شد"

اس مکتوب کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا خط وصول ہوا۔ اس کے ساتھ حضرت علیہ الرحمۃ (نواب غازی الدین خاں) کے خطوط بھی وصول ہوئے (غالباً مکتوب الیہ نواب محمد علی خاں کے موسومہ۔ شاید نقلیں بھیجی ہوں گی) ان خطوط سے واضح ہوا کہ مرحوم کی مہربانی کس قدر آپ کے شامل حال تھی۔ مجھے بزرگوں خصوصاً جد امجد (حضرت آصف جاہ) اور حضرت علیہ الرحمۃ (والد۔ غازی الدین خاں) کی پیروی مطلوب ہے۔ دوستوں کی ترقی ہمیشہ پیش نظر رہے گی۔ مدت سے ہندوستان کے کاروبار ابتر ہو چکے ہیں۔ ہر طرف فساد برپا ہے سرکشوں کی تادیب ضرور ہے۔ یہ کام میں نے اپنے ذمہ لیا ہے ان شاء اللہ سلطنت کو نئی رونق حاصل ہو گی۔ تمام ارادوں کی تکمیل پیش کش کے وصول ہونے پر منحصر ہے جس قدر جلد یہ وصول ہو بہتر ہو گا۔ آپ نے خواہش کی ہے کہ قطب الملک کا خطاب آپ کو عطا کیا جائے۔ یہ خطاب عبداللہ خاں[۱] کو حاصل تھا جو نیک نام نہیں ہے دوستوں کے لئے یہ خطاب مناسب نہیں۔ اس کے بجائے عمدۃ الملک کا خطاب تجویز کیا گیا ہے۔ آپ نے اپنے وطن (گوپامو) میں بھی جاگیر کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اس بارے میں ستاقب شاہی دستخط کے بعد فرمان نافذ ہو گا۔

غرض صفدر جنگ اور عماد الملک کی جنگ چھ مہینے جاری رہی اور قبل اس کے کہ ملہار راؤ اور جے آپا مدد کو آئیں، صلح ہو گئی۔ لیکن عماد الملک نے ان مرہٹہ سرداروں کے ساتھ سورج مل جاٹ سے مقابلہ کا قصد کیا اور بھرت پور کی جانب یہ تینوں متحد ہیں روانہ ہوئے۔ اس کا قصہ دراز ہے درمیان میں ہولکر نے ساتھ چھوڑ دیا۔ عماد الملک نے بھرت پور کا محاصرہ اٹھا دیا اور دارالسلطنت چلے آئے اور یہاں پھر ہولکر کے زور اور صمصام الدولہ میر آتش وغیرہ سے سمجھوتہ کر کے وزارت خود حاصل کر لی۔ عہدہ امیر الامرائی صمصام الدولہ کو دیدیا گیا۔ وزارت حاصل کر کے دوسرے روز عماد الملک نے احمد شاہ بادشاہ کو ان کی والدہ کے ساتھ قید کر دیا۔ اور عزیز الدین عالمگیر ثانی کو یکشنبہ ۱۰ شعبان سنہ ۱۱۶۷ھ کو تخت نشین کیا۔

۱۔ سید حسن علی خان کا خطاب سید عبداللہ خاں بہادر دیار وفادار ظفر جنگ تھا۔ اعظم شاہ ... وابستہ تھے۔ محمد فرخ سیر بادشاہ کے وزیر اعظم تھے۔ آصف جاہ سے ان کا اختلاف مشہور ہے۔ ... ۱۱۲۵ھ ... ۱۱۳۰ھ ... ۱۱۳۲ھ

دوسرے ہفتہ میں احمد شاہ اور ان کی والدہ بحالت قید اندھے کر دیئے گئے خیر یہ باتیں بہت طویل ہیں۔
اس زمانہ کے قریب قریب عمادالملک نے جو مکتوب لکھا وہ یہ ہے۔

(۹)

خان شہامت و عوالی پناہ اخلاص و موالات دستگاہ عزیز القدر سن۔

مکاتبت بہجت افزا و عرضداشت آن موالات نشان معرفت وکیل رسید وانچہ بشہامت و عوالی نشان راجہ کیشو راؤ نوشتہ بودند بمطالعہ درآمد۔ انشاء اللہ تعالیٰ جمیع مطالب صورت پذیر می گردد لیکار خود مستقل بودہ بارسال نوشتہ جات باید پرداخت جوہر شجاعت و بہادری آن موالات نشان از تنبیہ و تادیب مفاسید مکرر بامتحان رسیدہ از روئے اخبار مفصلاً و مشروحاً معلوم شدہ باعث مزید تفضل و عنایت جناب اقدس و کمال خوشنودی ما گردیدہ او سبحانہ دوستان دولت خواہ را مظفر و منصور و اعدا را منکوب و مقہور دارد۔ ما از کارطلبی و جرارت و بہادری و اخلاص و وثوق ان شہامت و عوالی نشان بسیار محظوظ ایم و قوت بازوئے خود می دانیم ما را متوجہ دانستہ متواتر نویسان احوال باید بود خطے کہ بشہامت پناہ راجہ کیشو راؤ نوشتہ بودند مکرر بغور مطالعہ درآمد از نوشتہ راجہ مشار الیہ توجہ ما معلوم خواہد شد۔"

شرح دستخط خاص ۔ "آن عزیز القدر را رفیق دلسوز و بہادر و قوت بازو می دانیم و برائے ترقیات سعی موفورہ مبذول داریم مطالب و مدعائے آن موالات نشان جلوہ نمائے ظہور می شود۔"

لفافہ پر لکھا ہے کہ "سراج الدولہ بہادر شہامت جنگ ۱۷۔ محرم سنہ احد" دفتر والا جاہی میں لفافہ پر یہ شرح لکھی گئی ہے کہ ۱۹۔ ربیع الاول سنہ ۱۱۶۸ھ ورود نمود۔ جواب نوشتہ شد۔"

اس مکتوب کا مطلب یہ ہے کہ وکیل کے توسط سے خطوط وصول ہوئے اور عرضداشت بھی پہنچی، نیز راجہ کیشو راؤ کو جو مطالب لکھے وہ بھی معلوم ہوئے۔ آپ کے سب مطالب پورے ہوں گے۔ اپنے کاروبار میں مصروف رہیں۔ آپ کے جوہر شجاعت کا مکرر امتحان ہو چکا ہے، بادشاہ کی اور ہماری مزید خوشنودی کا باعث ہوا۔ خدا آپ کو فتح مند رکھے ہم آپ کو قوت بازو سمجھتے ہیں۔ راجہ کیشو راؤ آپ کو خط لکھیں تو اس سے ہماری توجہ کا حال معلوم ہوگا۔

شرح وتخط خاص کا مطلب یہ ہے کہ آپ جیسے عزیز کو رفیق اور قوت بازو سمجھتا ہوں۔ آپ کی ترقی کے لئے ساعی ہوں۔ آپ کا مدعا پورا ہوگا۔

غرض نواب عماد الملک اپنی ہر کوشش میں ناکام ہوئے۔ خود بھی تباہ حال ہو گئے۔ اور سلطنت بھی کمزور ہوگئی۔ احمد شاہ ابدالی سے مقابلہ کی قوت نہیں رہی۔ پہلے سورج مل جاٹ کے پاس پناہ لی۔ پھر فرخ آباد میں احمد خاں بنگش کے پاس مقیم ہوکر سنہ ۱۱۸۰ھ میں دکن آئے مرہٹوں نے بسر اوقات کے لئے مالوہ میں چند دیہات سپرد کئے۔ چونکہ بادشاہ سے اطمینان نہیں تھا۔ اس لئے سورت میں انگریزوں سے مل ملاکر وقت گزارتے تھے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ:۔

"درین ولا سوار جہاز شدہ عازم بیت اللہ گردید"

نہ معلوم حجاز سے واپس آئے یا نہیں۔ حقیقی تاریخ وفات کا علم نہ ہوسکا۔ البتہ سنہ ۱۱۹۰ھ میں انھوں نے نواب والاجاہ کو ایک خط جو لکھا وہ محفوظ ہے۔ وہ یہ ہے:۔

ھو المستعان

امارت وایالت منزلت حشمت وشوکت مرتبت رکن السلطنۃ العظمیٰ عضد الخلافۃ الکبریٰ برادر سامی المکان عزیز القدر سلمہ اللہ تعالیٰ۔

برخوردار منعم الدولہ سید محمد خاں بہادر راہی آں امارت مرتبت روانہ نمودہ شد۔ مذکورات زبانی ایشان مفصل بدریافت خواہد رسید۔ اندا قریبلئے قریب این جانب اند ہر قدر سلوک کہ نسبت بایشان بعمل می آرند بجا و تحسن و موجب خوشی ما خواہد بود۔ ہمیشہ باطلاع خیریت ہا مسرور یاد داشت۔"

لفافہ پر مہر "وزیر الممالک آصف جاہ نظام الملک بہادر سپہ سالار" ثبت ہے۔

دفتر والاجاہی میں یہ شرح لکھی گئی ہے کہ "خط نواب غازی الدین خاں بہادر ۲۰ ذی قعدہ سنہ ۱۱۹۰ھ معہ سید محمد خاں رسیدہ شد"

اس خط کا مطلب یہ ہے کہ منعم الدولہ سید محمد خاں بہادر آپ کے پاس آتے ہیں۔ ان کے ساتھ مناسب سلوک کیا جائے۔

اس خط کی ظاہری ہیئت سے صاف ظاہر ہے کہ اقتدار و اختیار ہاتھ سے نکل چکا ہے

صاحب مآثر الامرا نے صراحت کی ہے کہ

"با حفظ کلام الٰہی و تحصیل علوم مشق خط را درست ساختہ و جوہر ہمت و شجاعت را باہم برآمیختہ شعری گوید"

یہ حالات مآثر الامرا جلد ۲ صفحات ۴۷۰ تا ۴۷۵ سے ماخوذ ہیں۔

انجمن طیلسانین عثمانیہ کی مطبوعات

۱۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیان، ریاست عادل شاہی دور تولیت کی بسیط اور محققانہ تاریخ مولفہ سید علی محسن صاحب ایم اے (عثمانیہ)۔ **قیمت** (عہ)

۲۔ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی مفصل محققانہ اور مستند تاریخ۔ مولفہ ظہیر الدین صاحب ایم اے (عثمانیہ) **قیمت** (عہ)

۳۔ امام غزالی کی کلامی خصوصیات۔ مولفہ محمد غوث صاحب (محبوب نگری) ایم اے (عثمانیہ) **قیمت** (عہ)

۴۔ موضع دو ملی کی معاشی تحقیقات۔ مولفہ محمد ناصر علی صاحب ایم اے (عثمانیہ) **قیمت** (عہ)

۵۔ دربار اودھ کا اثر لکھنؤ کی شاعری پر۔ مولفہ محمد اعظم خاں صاحب (عثمانیہ) **قیمت** (عہ)

اراکین انجمن اور خریداران مجلہ طیلسانین عثمانیہ سے نصف قیمت

کتب فروشوں کے ساتھ خاص رعایت۔ بغرض سہولت کتابیں

تبادلہ میں بھی دی جاتی ہیں

ملنے کے پتے

(۱) دفتر مجلہ طیلسانین و انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن نظام شاہی روڈ

(۲) مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

معاصروں کے صفحے

۱۔ نواب ناصر جنگ شہید اور نواب مظفر جنگ مرحوم

مدراس سے ایک چہار ماہی مجلہ "جرنل آف انڈین ہسٹری" کے نام سے مشہور مورخ دیوان بہادر ایس کرشنا سوامی اینگار کی ادارت میں شایع ہوتا ہے۔ اس کی اشاعت بابتہ ماہ اپریل ۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر راگھوان ام، اے، پی، ایچ، ڈی کا ایک مضمون "ناصر جنگ بمقابلہ مظفر جنگ" کے عنوان سے شایع ہوا ہے اس مضمون کی تلخیص نامناسب نہیں۔

مضمون نگار نے واضح کیا ہے کہ نواب ناصر جنگ اور نواب مظفر جنگ دونوں کی باہمی آویزش کو تاریخی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن اس آویزش کے متعلق کافی مواد مہیا نہیں ہے اس آویزش کی پوری تفصیلات سے عام طور سے لاعلمی پھیلی ہوئی ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر راگھوان نے انندا رنگا پلے کے حالات زندگی پر سنسکرت میں لکھی ہوئی ایک نظم کی مدد سے اس باہمی آویزش کے اصلی سبب کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نظم کو ان دنوں ڈاکٹر راگھوان مرتب کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر راگھوان نے دعوی کیا ہے کہ باہمی آویزش کا یہ سبب کسی فارسی ماخذ میں متعین نہیں کیا گیا ہے۔ تزک والاجاہی کے انگریزی ترجمہ کے متعلقہ حصہ کا خلاصہ درج کرکے یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اس بیان سے وجہ نزاع کا کوئی علم حاصل نہیں ہوتا سوا اس کے کہ نزاع پیدا ہونے کے بعد جو واقعات ظاہر ہوئے ان کی صراحت ہوتی ہے۔

انگریز مورخوں مثلاً آرم، گریبل، برگس، اور فریزر کے بیانات کو نقل کرکے مضمون نگار نے وضاحت کی ہے کہ ان بیانات سے اصلی وجہ نزاع کا علم نہیں ہوتا۔ ان مورخوں نے صرف یہ لکھا ہے کہ آصف جاہ کے انتقال پر ناصر جنگ اور مظفر جنگ ہر ایک نے اس بات کو شہرت دی کہ ان کے

لئے ہی آصف جاہ نے وصیت کی ہے۔

ڈاکٹر راگھوان نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ مملکت دکن حاصل کرنے کی خواہش خود وجہ نزاع بن سکتی ہے لیکن یہ اصلی اور حقیقی سبب نہیں تھا۔ اصلی سبب دونوں کے ابتدائی روابط اور باہمی تعلقات میں پنہاں ہے۔

بعد ازاں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ ۱۷۴۱ء میں آصفجاہ جب دہلی سے دکن واپس آئے تو ناصر جنگ کو اپنا مخالف پایا۔ ناصر جنگ نے گفت و شنید سے مخالفت چھوڑ دی اور فقیری گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ لیکن فتح یاب خاں نے بیٹے کو باپ کے خلاف ابھارا اور جس وقت آصفجاہ اورنگ آباد میں مقیم تھے۔ فتح یاب خاں نے مولہیر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ یہ قلعہ اس وقت متوسل خاں کی تحویل میں تھا۔ متوسل خاں آصف جاہ کے داماد اور مظفر جنگ کے والد تھے۔

مولہیر کے قلعہ پر قبضہ کر کے فتح یاب خاں نے ناصر جنگ کو جنگ پر آمادہ کر لیا۔ میدان جنگ میں متوسل خاں اپنی تیر سے ناصر جنگ کو نشانہ بنانا ہی چاہتے تھے کہ مظفر جنگ جو ایک ہی ہاتھی پر اپنے والد کے ساتھ موجود تھے اپنے والد کا ہاتھ پکڑ لیا اور ماموں کی جان بچا دی۔ لیکن یہ بھی ایک عجیب ماجرا ہے کہ ایک مرتبہ یہی جان بچانے والا دوسرے وقت جان ستانی کا ذریعہ ہو جاتا ہے۔

بعد ازاں ڈاکٹر راگھوان نے یہ صراحت کی ہے کہ موجودہ ماخذوں کی مدد سے اس سے زیادہ کوئی اطلاع حاصل نہیں ہوتی سوا اس کے کہ یہ قیاس قائم کیا جائے کہ ناصر جنگ اس لڑائی کی وجہ سے متوسل خاں سے عناد رکھتے ہوں اور آصف جاہ نے ناصر جنگ کی اس بے ادبی کی وجہ سے نواسہ سے کچھ زیادہ لطف و عنایت کا برتاؤ کیا ہو۔ آصف جاہ نے مظفر جنگ کو بیجاپور اور ادھونی کی صوبہ داری کس وقت اور کن حالات میں عطا کی اس کے متعلق ڈاکٹر راگھوان نے لکھا ہے کہ انھیں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ نیز اس واقعہ کے بعد متوسل خاں کے دوسرے حالات اور سرگرمیوں کے متعلق بھی معلومات حاصل نہیں ہیں۔

البتہ ایک سنسکرت شاعر کی نظم سے کچھ حوالہ ملتا ہے۔ اس نظم کا موضوع یا نام "انندا رنگا کا پوسر کانی واسانسہ" ہے۔ یہ نظم شاعر نے اپنے ممدوح انندا رنگا پلے کے حالات اور توصیف

میں لکھی ہے۔ آنند ارنگا پلے پانڈی چری کے دوبھاشی تھے۔ انھوں نے اپنے زمانہ کے حالات ایک ڈائری میں قلم بند کئے ہیں۔ جس کا انگریزی ترجمہ مدراس سے کئی جلدوں میں شائع ہو چکا ہے غرض اس نظم کے چھٹے باب میں اس وقت کے سیاسی حالات کا بھی تذکرہ آگیا ہے بر سبیل تذکرہ مظفر جنگ کے حالات بھی واضح کئے ہیں اور مظفر جنگ کو مخاطب کر کے یہ لکھا ہے کہ ناصر جنگ گو آپ کے ماموں تھے لیکن آپ کے والد کے بے رحم قاتل بھی تھے۔

ڈاکٹر راگھوان نے لکھا ہے کہ بد قسمتی سے اس سنسکرت نظم میں واقعہ کی مزید تفصیلات بیان نہیں کی ہیں لیکن انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس نظم سے ہمیں پہلی مرتبہ اس امر کا علم ہوا کہ ناصر جنگ نے اپنے بہنوئی متوسل خاں کو مروا دیا تھا۔ ناصر جنگ کو متوسل خاں سے عداوت پیدا ہو چکی تھی، اس لئے ان کا یہ فعل قدرتی سمجھا جانا چاہیئے۔ باپ کے مارے جانے پر مظفر جنگ لا محالہ ماموں سے برگشتہ ہو گئے اور بدلہ لینے کے لئے موقع کی تلاش میں رہے۔ اور جب موقع ملا بدلہ لے لیا

---

(۲) کرناٹک کی تاریخ (۱۷۴۹ء تا ۱۷۵۵ء) کے متعلق چند کاغذات۔

اس مجلہ کے شمارہ ۳ و ۴ جلد ۹ میں "چند فرامین بادشاہاں دہلی موسومہ رؤسائے دکن وغیرہ" کے عنوان سے کتب خانۂ سعیدیہ کے ایک مخطوطہ کو متعارف کیا گیا ہے۔ اس مخطوطہ کے متعلق ظاہر کیا گیا تھا کہ :۔

"اس مجموعہ میں ایسے منشورات فراہم کئے گئے ہیں جن سے اہل نظر سے ابھی نہ معلوم کہاں مخزون ہیں .... اس مجموعہ کے مکاتیب کا بڑا حصہ تاریخ مملکت آصفیہ سے متعلق ہے اور اس زمانہ سے متعلق کہ جس کے واقعات و حالات پر تاریکی چھائی ہوئی ہے"

غرض یہ بات واضح کی گئی تھی کہ اس مجموعہ میں ایسے مکاتیب بھی شامل ہیں جو نواب ناصر جنگ شہید کی پیشگاہ سے نواب محمد علی خاں والاجاہ نواب کرناٹک کے نام اس وقت صادر ہوئے جبکہ حضرت شہید جانب کرناٹک نواب مظفر جنگ کے مقابلہ کے لئے راہ سپار تھے نیز دو تین

محمد علی خاں والا جاہ کے والد نواب انورالدین خان کے آمبور میں مارے جانے کے بعد یہ عنایت نامہ صادر ہوا۔ اس امر پر افسوس کہ نواب انورالدین خان نے مقابلہ میں جلدی کی۔ شاہ نواز خاں اور عبدالنبی خاں کے مدد کے لئے آنے کا انتظار نہیں کیا۔ دلاسا اور صبر کی تلقین۔

۲۔ عنایت نامہ ناصر جنگ کی جانب سے محمد علی خاں والا جاہ کے نام۔

خطوط پہونچنے کا تذکرہ اور خود کے جلد تر کرناٹک آنے کی اطلاع۔

۳۔ عنایت نامہ ناصر جنگ کی جانب سے محمد علی خان والا جاہ کے نام۔

دریائے تنگبھدرا پر پہونچنے کی اطلاع[۱] اور مرارراو، مانوجی اور جسونت سے ملنے کے انتظار کا تذکرہ۔

۴۔ ناصر جنگ کا عنایت نامہ جو دو بیٹے کے نام صادر ہوا۔ نواب مظفر جنگ کی تائید و حمایت پر تہدید۔

۵۔ ناصر جنگ کا خط محمد علی خاں والا جاہ کے نام۔ والی کنڈہ کے قلعہ کی تسخیر پر مسرت کا اظہار اور دہلی کو نوازشات کیلئے سفارش کا تذکرہ۔ (۶) احمد شاہ کا فرمان بنام محمد علی خاں والا جاہ۔ نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ کو صوبہ دار دکن مقرر کرنے کا تذکرہ اور اعانت کا حکم۔ (۷) محمد علی خاں والا جاہ کا خط پرتاب سنگھ تنجاور کے راجہ کے نام۔ امداد و اعانت کی استدعا۔ (۸) عالمگیر ثانی کا فرمان محمد علی خاں والا جاہ کے نام۔ نواب محمد علی خاں کو ارکاٹ اور ترچناپلی کی دیوانی اور فوجداری عطا ہونے کا حکم۔ (۹) نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ ثالث (عماد الملک) کا خط محمد علی خاں والا جاہ کے نام مورخہ ۲۰ ذی قعدہ ۱ جلوس خود کو وزارت حاصل ہونے اور محمد علی خاں کے نام شاہی فرمان حاصل کرنے کا تذکرہ۔ (۱۰) نواب صلابت جنگ کا خط موسومہ محمد علی خاں مورخہ ۱۴ ذی قعدہ سنہ ۱۱۶۸ھ کاتب نے اپنی مہربانی اور لطف کا اظہار کیا ہے۔ (۱۱) نواب محمد علی خان کا خط اپنے والد کے دیوان اسد خاں کے نام اپنی کامیابی اور انگریزوں سے تائید و اعانت حاصل ہونے کا حال۔

۱۔ دریائے تنگبھدرا پر نواب ناصر جنگ کس تاریخ کو پہنچے۔ اس کے متعلق مضمون نگار نے بہت قیاس آرائی کی ہے کیونکہ خط میں تاریخ درج نہیں۔ کتب خانہ سعیدیہ میں راجہ تنجاور کے موسومہ خطوط جو موجود ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نواب ناصر جنگ نے ۲ محرم ۱۱۶۳ھ کو دریائے کرشنا اور ۱۶ محرم ۱۱۶۳ھ کو دریائے تنگبھدرا عبور کیا۔

یہ خطوط رسالہ معارف اعظم گڈھ جلد ۱۳ نمبر ۶ میں شائع کر دیئے گئے ہیں۔

جامعاتی معلومات

مندرجۂ ذیل معلومات اور اطلاعیں ہر جامعہ کی رپورٹ یا دوسری مطبوعات سے ماخوذ ہیں۔ ہندوستان کی اکثر جامعات نے براہ کرم یہ انتظام کیا ہے کہ ان کی رپورٹ اور دوسری رودادیں وغیرہ بالالتزام مجلّہ کے دفتر پر وصول ہوا کریں۔

لکھنو کی جامعہ کے شعبۂ تاریخ کے استاذ ڈاکٹر یس۔ کے باترجی نے ہمایوں پر تحقیقات کے سلسلہ میں لندن کی جامعہ سے ڈی، لٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔

حکومت ہند نے لکھنو کی جامعہ کو ۱۸۰۰ اس غرض سے عطیہ دئے ہیں کہ ڈاکٹر ڈی، ان موجم دار کی تالیف جس کا موضوع انسانیاتی جائزہ (سروے) ہے، شائع کی جائے۔

انڈین ریسرچ فنڈ اسوسئشن نے لکھنو کی جامعہ کے ایک طبی طیلسانی کو ماہانہ ما ۵۵ ، کا وظیفہ دو سال کے لئے بعض ادویات کے خواص کی تحقیقات کے لئے عطا کیا ہے۔

صوبجات متحدہ کی حکومت نے ڈاکٹر کے، ان بہال پروفیسر حیوانیات کے لئے باغراض ریسرچ ایک مددگار کا تقرر منظور کیا ہے۔

ڈاکٹر آر، کے مکرجی لکھنو کی جامعہ کے پروفیسر تاریخ نے چندر گپت موریہ پر ایک ضخیم کتاب تالیف کی ہے جو عنقریب شائع ہوگی۔ انھوں نے ایک اور تالیف کتبات اشوک پر مرتب کرلی ہے۔

راد ہاکمال مکرجی پروفیسر معاشیات جامعۂ لکھنو کی ایک تالیف جس کا موضوع معاشیات آبادی ہے لانگ من گرین کمپنی نے شائع کی ہے۔

ڈاکٹر ان، اس گپتا پروفیسر فلسفہ جامعۂ لکھنو کی ایک تالیف جس کا موضوع ذہنی ترقی

اور زوال ہے کتابستان آلہ آباد نے شائع کی ہے ۔

۱۹۴۲ء میں لکھنو کی جامعہ میں شعبۂ فنون کے پانچ طلبہ نے پی یہ چ ڈی کے امتحان کے لئے اپنے مقالے پیش کئے جو سب منظور ہو گئے ۔ ان مقالوں کے موضوع حسب ذیل ہیں :-

۱ ۔ گاندھی جی کا فلسفۂ سیاسیات ۔ ۲ ۔ شمالی ہند میں زراعتی مزدوروں کے حالات ۔

۳ ۔ افیون ، ہندوستان اور مجلس اقوام ۔ ۴ ۔ صوبہ جاتی خود اختیاری اور صوبہ جات متحدہ میں اس کا عمل ۔ ۵ ۔ شمالی ہند کے اقوام جرائم پیشہ کے معاشرتی اور معاشی حالات ۔

۱۹۴۲ء میں لکھنو کی جامعہ میں شعبۂ سائنس کے دو طلبہ نے پی ۔ ایچ ڈی کے امتحان کے لئے اپنے مقالے پیش کئے ۔ یہ دونوں مقالے منظور ہو گئے ۔ ان دونوں مقالوں کے موضوع یہ تھے :-

۱ ۔ محلولوں میں ضیا کیمیائی تعاملات ۔ ۲ ۔ ضیا کیمیائی مظہر اپنے اثر کے بعد ۔

۲ ۔ Stingray Trygon کی تشریح ۔

کلکتہ کی جامعہ نے حال میں سنسکرت کے ادب کے سلسلے میں دو نئے کام شروع کئے ہیں ۔ ۱ ۔ کالی داس کی تالیفات میں سنسکرت اور پراکرت الفاظ کا توافق ۔

۲ ۔ ہندوستان کے فلسفہ کی اصطلاحات کی ترتیب بطور ایک لغت کے ۔ یہ کام سنسکرت اور پالی کے شعبوں کی مدد اور تعاون سے انجام پائے گا ۔ اولاً یہ کام خود سنسکرت میں انجام پائے گا ۔ بعد ازاں انگریزی میں ترجمہ ہوگا ۔ اس تالیف کی سات جلدیں ہوں گی ۔ ایک جلد کے بعد دوسری جلد شائع ہوگی ۔ دوسری جامعات کے صاحبانِ علم سے بھی اس کام میں مدد لی جائے گی ۔

ٹراونکور کی جامعہ سے ملحق ایک تحقیقاتی ادارہ "ٹراونکور سنٹرل ریسرچ انسٹیوٹ" کے نام سے قایم ہے ۔ اس ادارہ کے توسط سے ایسے امور کی تحقیقات عمل میں لائی جاتی ہے جو ٹراونکور کی صنعتی اور زراعتی ترقی کے لئے مفید ہیں ۔ جو امور زیر تحقیقات ہیں ان کی

تفصیل مجلّہ کے گزشتہ شمارے میں بیان کی جا چکی ہے۔ حالیہ رپورٹ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ تحقیقاتی مراحل کامیابی کے ساتھ طے ہو رہے ہیں۔ اور جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں ان کو مقامی زراعتی اور صنعتی کاروبار میں کامیابی کے ساتھ اختیار کیا جا رہا ہے۔

ٹراونکور کی جامعہ کے شعبۂ سائنس میں ۱۱ طالب علم پی۔ ایچ ڈی کے امتحان کی تیاری کر رہے ہیں۔ ان میں سے ۳ طالب علم ٹراونکور کی معدنیات پر ۲ طالب علم۔ طبّی جڑی بوٹیوں اور ۲ طالب علم نباتاتی مسائل پر مصروفِ تحقیقات ہیں۔ شعبۂ فنون میں ۶ طالب علم پی۔ ایچ ڈی کیلئے کام کر رہے ہیں۔ ان کے تحقیقات کے موضوع سب ٹراونکور سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ یہ ہیں:۔

۱۔ کرالا کی تاریخ۔ ۲۔ ٹراونکور کی مالیاتی ترقی ۱۹۱۶ء سے۔ ۳۔ ٹراونکور میں تجارت اور صنعت کی ترقی۔ ۴۔ کرالا کے فنونِ لطیفہ اور ادب۔ ۵۔ ٹراونکور کے مسائل حمل ونقل۔ ۶۔ ٹراونکور کی تجارت خارجہ۔

علی گڈھ کی مسلم یونیورسٹی نے عربی میں پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری پہلی مرتبہ یس ایم یوسف کو عطا کی۔ ان کے مقالہ کا موضوع ابومہلب کے سوانح حیات تھا۔

اسی یونیورسٹی کے شعبۂ حیوانیات میں نیشکر کے ردگ پر تحقیقات جاری ہے۔

کلکتہ کی جامعہ نے اپنے ملحقہ کلیات کو اپنے کام میں ترقی کی اجازت دینے کا سلسلہ برابر جاری رکھا ہے۔ ابھی حال میں اس نے متعدد کلیات کو نئی جماعتوں کے قیام کی اجازت دی ہے، چند حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ وکٹوریہ انسٹیٹیوشن کلکتہ کو بنگالی میں بی۔ اے آنرز کی جماعت کے لئے۔ ۲۔ لیڈی برابورن کالج کو عربی، فارسی، تاریخ، سیاسیات اور معاشیات میں بی۔ اے آنرز کی جماعتوں کے لئے اور جغرافیہ میں بی۔ اے پاس کی جماعت کے لئے۔ ۳۔ کرشنا نگر کالج کو سیاسیات میں بی۔ اے آنرز کی جماعت کے لئے۔

مرکزی مقننہ میں ابھی حال میں دہلی کی جامعہ کے قانون میں متعدد دوررس ترمیمات عمل میں آئی ہیں۔ چنانچہ آیندہ بی۔ اے کی ڈگری کے لئے بجائے دوسال کے تین سال کی مدت کا نصاب مقرر ہوگا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان موقوف کردیا جائے گا۔ البتہ فوقانی تعلیم میں ایک سال کا مزید اضافہ کیا جائے گا۔ دوسری اہم ترمیم یہ ہے کہ آیندہ وائس چانسلر تنخواہ یاب مقرر کیا جائے گا۔

لکھنو کی جامعہ کی جانب سے شعبۂ تاریخ کے ام۔ اے کے طلبہ کے لئے ایک تعلیمی سیاحت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس کے مصارف کے سلسلہ میں جامعہ کی جانب سے سات سو روپے منظور کئے جاتے ہیں۔

ٹراونکور کی جامعہ میں کلیۂ فنون اور کلیۂ سائنس دونوں کا انضمام عمل میں آیا ہے۔ اور نئے کلیہ کا نام "ہز ہائنس دی مہاراجہ یونیورسٹی کالج" قرار دیا گیا ہے۔

ٹراونکور کی کلیات میں داخلہ کے لئے طلبہ کے لئے یہ امر لازم قرار دیا گیا ہے کہ اپنی درخواستوں کے ساتھ طبی معاینہ کا صداقت نامہ بھی پیش کریں۔

ٹراونکور کی جامعہ میں مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات ملیالم زبان میں وضع کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ چنانچہ نباتیات کے اصطلاحات کا مجموعہ طباعت کے لئے تیار ہوگیا ہے۔ حیوانیات، عمرانیات اور تعلیم کے اصطلاحات کے سلسلہ میں کام جاری ہے۔

ٹراونکور کی جامعہ نے اپنے شعبۂ طبیعیات و کیمیا کی عمارتیں مکمل کرلی ہیں۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں علی گڈھ کی مسلم یونیورسٹی کو دس ہزار یا اس سے زیادہ عطیات جو وصول ہوئے اس کی تفصیل یہ ہے:۔ اعلیحضرت خسرو دکن مدظلہ العالی نے یونیورسٹیوں کی جنگی کوششوں کے لئے پندرہ ہزار روپے کی امداد یکمشت عطا فرمائی، نیز دس ہزار روپے متوالی طور سے منظور فرمائے۔ سر سید عبدالرؤف نے ایک دارالاقامہ کی تعمیر کے لئے پچاس ہزار روپے عطا کئے۔ اور عبداللہ یوسف علی صاحب نے بھی دارالاقامہ کی تعمیر کیلئے

۴۰ ہزار روپے عطا کئے۔ نواب صاحب رام پور نے انجینیرنگ کالج کے لئے تین ہزار چھ سو روپے کی متوالی امداد منظور کی ہے۔ نواب ظہیر یار جنگ بہادر امیر پائیگاہ نے ۸ وظائف فی وظیفہ پندرہ روپے کے حساب سے عطا کئے ہیں۔

ٹراونکور کی جامعہ کے تعلق سے ایک ادارہ "ٹراونکور یونیورسٹی مسلم وقف کمیٹی" کے نام سے قایم کیا گیا ہے۔ اس نے ۲۸ ہزار روپے کی رقم اس غرض سے وقف کرنے کا ارادہ کیا ہے کہ اس سے جامعہ میں اسلامیات کے متعلق درس وتدریس کا شوق دلایا جائے۔

لکھنو کی جامعہ میں قانونی کتب کی خریدی کے لئے ۷۰۰۸ روپے کے عطیات حاصل ہوئے جسٹس باجپائے نے ال، ال ایم کے امتحان کی ممتحنی کے معاوضہ کی رقم ۵۸ روپے اس مد میں ادا کی۔

علی گڈھ کی جامعہ میں سنہ ۱۹۴۲ء کے دوران میں ۲۳۸۴ طلبہ شریک تھے۔ ان کے من جملہ پی، ایچ ڈی کی جماعت میں ۲۶ طلبہ شریک تھے۔

لکھنو کی جامعہ میں سنہ ۱۹۴۲ء کے دوران میں ۲۴۹۱ طلبہ شریک تھے۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں ۲۵۰۰ طلبہ شریک تھے اس طرح ۹ طلبا کی کمی ہوئی۔

ٹراونکور کی جامعہ میں سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء کے دوران میں ۳۸۳۶ طلبہ شریک تھے، ان کے من جملہ ۶۷۵ خواتین ہیں۔ سال ماقبل میں طلبہ کی تعداد ۳۶۱۱ تھی۔

کلکتہ کی جامعہ کے امتحان میٹرک بابتہ سنہ ۱۹۴۳ء میں جو طلبہ شریک ہوئے ان کی تعداد ۳۸ ہزار ۳ سو ۲۶ تھی۔ جو طلبہ کامیاب ہوئے ان کی تعداد ۲۲ ہزار ۷ سو ۷۴ ہے۔ ۱۲۴۸ طلبہ درجۂ اول میں کامیاب ہوئے۔ ۴۹۴۶ طلبہ درجۂ دوم میں کامیاب ہوئے۔ باقی درجۂ سوم میں۔ کامیابی کا اوسط ۵۹٫۴ فی صد رہا۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں یہ تناسب ۶۲٫۵ فی صد تھا۔

ٹراونکور کی جامعہ کے امتحانات بابتہ سنہ ۱۹۴۲ء کے نتائج کا حال حسب ذیل ہے:۔

امتحان	شریک	کامیاب	فی صد	امتحان	شریک	کامیاب	فی صد
انٹر	۹۷۵	۴۲۵	۴۳٫۶	بی، اے حصۂ اول	۲۲۲	۱۳۸	۶۲٫۱
بی، اے حصۂ دوم	۹۱	۱۲۲	۸۴٫۸	بی، اے حصۂ سوم	۱۸۷	۱۳۷	۷۳٫۳

امتحان	شریک	کامیاب	فی صد	امتحان	شریک	کامیاب	فی صد
بی، ایس سی حصۂ اول	۳۰۳	۱۸۰	۵۹،۴	بی، ایس سی حصۂ دوم	۲۵۲	۲۱۹	۶۸،۴
بی، ایس سی حصۂ سوم	۲۷۵	۱۸۸	۶۸،۴	بی، اے آنرز	۲۱	۲۰	۹۵،۲
بی، ایس سی آنرز	۶	۶	۱۰۰،۰	ام، اے	۸	۷	۸۷،۵
ام، ایس سی	۲	۲	۱۰۰،۰	بی، ال ابتدائی	۱۲۵	۷۸	۹۲،۴
بی، ال آخری	۷۴	۴۲	۵۶،۸	ال، ٹی	۹۹	۷۸	۷۸،۸

لکھنو کی جامعہ کے امتحانات بابتہ ۱۹۴۲ء کے نتائج کا حال حسب ذیل ہے :-

امتحان	شریک	کامیاب	امتحان	شریک	کامیاب
بی، اے	۳۳۳	۲۳۵	بی، اے آنرز	۹۲	۸۴
ام، اے	۲۱۰	۲۰۸	ام، ایس سی حصۂ دوم	۴۹	۴۰
ام، ایس سی حصۂ اول	۵۶	۴۹	بی، ایس سی	۹۱	۵۹
بی، ایس سی آنرز	۷	۵			

علی گڈہ کی مسلم یونیورسٹی کے امتحانات بابتہ ۱۹۴۲ء کے نتائج کا حال یہ ہے :-

امتحان	شریک	کامیاب	تناسب فی صدی	امتحان	شریک	کامیاب	تناسب فی صدی
ام، اے آخری	۱۳۹	۱۲۷	۹۱،۴	ام، ایس سی آخری	۲۳	۲۳	۱۰۰،۰
ام، اے ابتدائی	۱۸۹	۱۵۱	۸۰،۰	ام، ایس سی ابتدائی	۲۵	۲۷	۷۷،۱
بی، اے آنرز	۹	۸	۸۸،۹	بی، اے	۲۶۲	۱۹۹	۷۶،۰
بی، ایس سی	۷۱	۵۳	۷۴،۲	انٹرمیڈیٹ فنون	۲۴۲	۱۲۴	۶۷،۸
انٹرمیڈیٹ سائنس	۲۱۳	۱۳۱	۵۶،۷	ہائی اسکول	۴۱۳	۲۵۱	۶۰،۸
بی، ٹی	۸۱	۸۰	۹۸،۸	ال، ال بی ابتدائی	۱۸۸	۱۱۶	۶۱،۷
ال، ال بی آخری	۱۲۵	۱۱۴	۹۱،۲	پی ایچ ڈی	۲	۲	۱۰۰،۰

انجمن طیلسانیین عثمانیہ و اس کے ملحقہ اداروں کی اطلاعات

عثمانیین کی تالیفیں اور تراجم

از جناب شرف الدین صاحب بی اے (عثمانیہ)
معتمد مجلس نمائش

انجمن طیلسانیین عثمانیہ کے یوم تاسیس کی جو تقریب شہریور ۱۳۵۲ف کو منائی گئی۔ اس کے موقع پر انجمن طیلسانیین عثمانیہ معاشی کمیٹی اور مجلس نمائش کے کتب خانوں سے عام استفادہ کا انتظام کیا گیا۔ کتب خانے کے ساتھ ایک مطالعہ گھر بھی کھولا گیا جس میں وہ تمام اخبارات و رسائل بھی رکھے جاتے ہیں جو مجلہ طیلسانیین کے تبادلہ میں وصول ہوتے ہیں۔

کتب خانوں کی مختلف فہرستیں زیر ترتیب ہیں عثمانیین کے تالیفوں کی بھی ایک فہرست ترتیب پا رہی ہے۔

واضح ہو کہ ۱۳۴۴ف میں طیلسانیین عثمانیہ کی پہلی کانفرنس جو منعقد ہوئی اسکے موقع پر کانفرنس کے ساتھ عثمانیین کے تالیفوں کی بھی ایک نمائش منعقد کی گئی تھی۔ بعد میں بھی کانفرنس کے موقع پر یہ نمائش متعدد مرتبہ منعقد ہوئی۔ ۱۳۵۲ف کی کانفرنس کے موقع پر بھی جو دسویں کانفرنس تھی یہ نمائش منعقد ہوئی۔ ہر نمائش کے موقع پر کچھ نہ کچھ نئی کتابیں انجمن کے کتب خانہ میں جمع ہو گئیں۔ یہ فہرست انہیں تالیفوں کی ہے جو کتب خانہ انجمن میں محفوظ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کتب خانہ میں عثمانیین کی تالیفوں کا معتدبہ حصہ ابھی فراہم ہونا ہے اس فہرست میں جن برادروں کی تالیفیں شامل نہیں ہیں وہ کتب خانہ میں محزون نہیں ہیں توقع ہے کہ مولفوں کی توجہ سے باقی کتابیں بھی جلد وصول ہو جائیں گی۔ تاکہ فرزندان جامعہ عثمانیہ کی قلمی کاوشیں ایک مرکز پر جمع رہیں اور ان سے ہر ضرورت مند بآسانی استفادہ ہو سکے۔ اور ضرورت تھی کہ مکمل حالت میں مختلف

ضرورتوں کے ہیا رہیں ۔

جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے طیلسانیین عثمانیہ کی پہلی کانفرنس میں "جامعۂ عثمانیہ کے فرزندوں کی اردو خدمات" کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا تھا ۔ اس مضمون میں ضمیمہ کے طور پر دو فہرستیں بھی شامل کی گئی تھیں ۔

یہ فہرستیں حسب ذیل ہیں ۔

۱۔ عثمانیین کے اردو خدمات کی مضمون وار تفصیلی فہرست ۔

۲۔ ان عثمانیین کی فہرست جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اردو کی خدمت کی ۔

یہ فہرستیں بھی اب نظر ثانی کی محتاج ہوگئی ہیں ۔ آیندہ اشاعتوں میں ان کو بعد نظر ثانی شائع کیا جائے گا ۔ یہ فہرست جو شائع کی جا رہی ہے اس میں حروف تہجی کے اعتبار سے عثمانیین کے نام درج کئے گئے ہیں اور ہر نام کے مقابل ان کی تالیفوں کا اندراج کیا گیا ہے ۔ کتاب کے نام سے خود فن کا اندازہ ہو جائے گا لیکن جیسا کہ اوپر تذکرہ کیا گیا ہے فن وار فہرستیں متناسب شائع کی جائیں گی ۔

یہاں اس قدر اشارہ نامناسب نہیں کہ اس فہرست میں ۲۸۲ عثمانیین کے نام شریک ہیں ۔ حالانکہ ڈاکٹر زور نے اپنے مضمون میں صرف (۹۰) عثمانیین کے نام شمار کرائے تھے ۔ اس طرح گویا (۱۹۲) جدید ناموں کا اضافہ ہوا ہے ۔ یقیناً اس میں اور بھی مزید اضافہ ہو سکتا ہے ۔ جو نام متروک ہوگئے ہیں ان کا اضافہ اطلاع ملنے پر آیندہ ہوگا ۔

واضح ہو کہ تالیفوں میں خطبے اور ایسے مقالے بھی شریک کر لئے گئے ہیں جو کتابی صورت میں کتب خانوں میں محفوظ ہیں ۔ ممکن ہے کہ دو چار ایسے اصحاب کے نام بھی لاعلمی سے درج ہوگئے ہوں جو جامعۂ عثمانیہ کے فیض تعلیم سے استفادہ نہ کئے ہوں ۔ اس فہرست میں جن تالیفوں کے ساتھ تحریر یا موعد لکھا گیا ہے وہ ایم اے کے مقالے ہیں ۔ اور کتب خانۂ انگریزی میں محفوظ ہیں ۔

فہرست

(الف)

(ب)

۱۶- باقر فریدی، محمد

(۲۲) موضع بون پلی کی معاشی تحقیق (غیر مطبوعہ)

۱۷- باقر خاں، مرزا

(۲۳) نظام ساگر کی معاشی اہمیت (غیر مطبوعہ)

۱۸- بدرالدین خاں، شکیب

(۲۴) نظر کے دھوکے (۲۵) یورپ کے تاثرات

۱۹- برکت علی، شیخ

(۲۶) ابتدائی ریاضی حصہ اول (۲۷) ابتدائی ریاضی حصہ دوم (۲۸) سکونیات اعلیٰ۔

(۲۹) علم ہندسہ مستوی۔ (۳۰) ہندسہ مخروطات

(۳۱ و ۳۲) جبر و مقابلہ حصہ اول و دوم

۲۰- بل بیر پرشاد بھٹناگر

(۳۳) جگ بیت اور ان کا کلام (غیر مطبوعہ)

۲۱- بنکٹ پرشاد -

(۳۴) حیدرآباد دکن اور ہندو مسلم زندگی

۲۲- بھارت چند، کھنہ

(۳۵) سلطان فیروز شاہ تغلق (غیر مطبوعہ)

(پ)

۲۳- پال، او، کے، وی

(۳۶) تانا شاہ کی حکومت میں مادنا کا حصہ (غیر مطبوعہ)

۲۴- پٹواری، وی، این،

(۳۷) ہندسہ تحلیلی (۳۸) ہندسہ مخروطات

(۳۹) تفرقی احصاء (۴۰) علم مثلث مستوی

(ت)

۲۵- تسنیم ربانی

(۴۱) ظفر (بہادر شاہ) اور ان کا کلام (غیر مطبوعہ)

۲۶- تقی ہاشمی، سید محمد

(۴۲) موضع نیکنڈہ کی معاشی تحقیق (غیر مطبوعہ)

(ج)

۲۷- جعفر حسن، سید

(۴۳) زرعی افلاس ہند۔ (۴۴) ہماری ریلیں اور سڑکیں۔

۲۸- جلال الدین، محمد، اشک

(۴۵) سلک گوہر یعنی شیطان کا انتقام

۲۹- جہاں بانو بیگم

(۴۶) رفتار خیال (۴۷) محمد حسین آزاد

(۴۸) دلی کا فن شاعری (۴۹) عرب اور عربستان۔

(چ)

۳۰- چترویدی، نارائن داس

(۵۰) عہد معاونت اور اس کے اثرات (غیر مطبوعہ)

۳۱۔ چوبے، پی، این
(۵۱) سوال وجواب امتحان ایل، ایل، بی۔
(۵۲) قانون ضمانت۔ (۵۳) شرح قانون ابکاری

(ح)

۳۲۔ حبیب احمد فاروقی،
(۵۴) لاسلکی نشر (۵۵) حل پرچہ جات ریاضی۔
(۵۶) تجرباتی تعلیم۔ (۵۷) بیگاری بابو۔

۳۳۔ حسن الدین، میر
(۵۸) مبادی فلسفہ (۵۹) فلسفہ برگساں
(۶۰) فلسفہ عجم۔ (۶۱) ختم نبوت اور قادیانیت
(۶۲) وفاق اور ریاستیں۔

۳۴۔ حسن احمد بینائی۔
(۶۳) ابن الدولی (غیر مطبوعہ)

۳۵۔ حمید اللہ محمد۔
(۶۴) رومی و اسلامی ادارہ غلامی۔
(۶۵) قانون بین الممالک کے اصول و نظریں
(۶۶) عربوں کے تعلقات بیزنطینی حکومت سے۔
(۶۷) آبادی۔ (۶۸) امام ابوحنیفہ کی تدوین
قانون اسلامی۔ (۶۹) مجموعۃ الوثائق
السیاسیۃ فی العہد النبوی
والخلافۃ الراشدۃ (عربی)

۳۶۔ حمید احمد، خواجہ
(۷۰) رہبر نمائش۔ (۷۱) تحریک ترقی
مملکت آصفیہ (۷۲) عمومیت کا سراب

۳۷۔ حمید الدین شاہد، خواجہ،
(۷۳) سرگذشت ادارۂ ادبیات اردو۔

(خ)

۳۸۔ خلیل الرحمن محمد
(۷۴) اسباق کیمیا حصہ اول، (۷۵) اسباق
کیمیا حصہ دوم۔

۳۹۔ خواجہ معین الدین۔
(۷۶) اتحاد عرب

(ر)

۴۰۔ رام راؤ، وی
(۷۷) حیدرآباد اور کساد بازاری (غیر مطبو)

۴۱۔ رادھکا پرشاد۔
(۷۸) مدارس کی تعلیم سائنس میں مدرس کے
اصلاحی طریقے۔ (غیر مطبوعہ)

۴۲۔ رتن لعل۔
(۷۹) جدید ابتدائی ریاضی حصہ اول و دوم

۴۳۔ رحیم الدین کمال، شیخ
(۸۰) خطابیات۔

۴۴ - رحیم الدین، قریشی محمد

(۸۱) ہندوستان کے میٹھے پانی کی مچھلیوں کے خاندان (غیر مطبوعہ)

۴۵ - رشید ترابی -

(۸۲) طب معصومین

۴۶ - رشید الحسن، سید

(۸۳) سر سید کے لکچرز (غیر مطبوعہ)

۴۷ - رشید عباس -

(۸۴) پست جال والے اہتزازے سے پیدا ہونیوالے بلند ترین برقی اہتزازات کی تحقیقات (غیر مطبوعہ)

۴۸ - رشید قریشی -

(۸۵) سمن کی دنیا -

۴۹ - رضی الدین، محمد صدیقی

(۸۶) مخروطی کا ہندسہ (۸۷) نظری علم ہندسہ - (۸۸) تفرقی و تکملی احصا -
(۸۹) خطبہ صدارت چھٹی سالانہ کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ - (۹۰) اضافیت -

۵۰ - روی سنگھ -

(۹۱) ابتدائی نباتیات حصہ اول

(ز)

۵۱ - زاہد حسن -
(۹۲) تعلیم بالغان ہند - (غیر مطبوعہ)

۵۲ - زہرا خانم -

(۹۳) تذکرہ خوشنویسان و نقاشان (غیر مطبوعہ)

(س)

۵۳ - سجاد علی، میر

(۹۴) غیر خالصہ علاقہ جات کے چند تعلیمی پہلو (غیر مطبوعہ)

۵۴ - سدرشن راج -

(۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸) علم طبیعیات حصہ اول و دوم و سوم و چہارم -

۵۵ - سردار خاں

(۹۹) جدید نصاب کیمیا -

۵۶ - سراج الدین -

(۱۰۰) علاؤالدین محمد شاہ خلجی (غیر مطبوعہ)

۵۷ - سعادت علی رضوی، میر

(۱۰۱) سالنامہ بزم اردو (۱۰۲) کلام الملوک (۱۰۳) طوطی نامہ (۱۰۴) سیف الملوک بدیع الجمال - (۱۰۵) میر نوازش علیخاں شیدا کی روضۃ الاحیا (غیر مطبوعہ)

۵۸ - سیادت علیخاں، میر

(۱۰۶) خطبہ صدارت تیسری سالانہ کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ (۱۰۷) حجاج بن یوسف ثقفی (غیر مطبوعہ)

۵۹۔ سید حسین ڈاکٹر

(۱۰۸) خطبہ صدارت چوتھی سالانہ کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ۔

۶۰۔ سید حسین۔

(۱۰۹) قصص القرآن تاریخی حیثیت سے (غیر مطبوعہ)

۶۱۔ سید محمد۔

(۱۱۰) گلشن گفتار (۱۱۱) ابتدائی قواعد فارسی

(۱۱۲) ایوان سخن۔

۶۲۔ سید محمود فضل۔

(۱۱۳) نذر عقیدت۔

۶۳۔ سید محمد حسن عسکری۔

(۱۱۴) اورنگ زیب کی اہمیت بحیثیت صوبہ دار دکن (غیر مطبوعہ)

(ش)

۶۴۔ شاہد حسین سید

(۱۱۵) مملکت حیدرآباد میں ہمہ گیری رجحان (غیر مطبوعہ)

۶۵۔ شام سندر، بی

(۱۱۶) خطبہ صدارت کل حیدرآباد پست اقوام کانفرنس (ہندی)

۶۶۔ شرف الدین محمد

(۱۱۷) موضع عمول مری کی معاشی تحقیق

۶۷۔ شنکر راؤ، ہیں

(۱۱۸) بعض عطری ھیلائیڈز کی آب پاشیدگی اور الکحل پاشیدگی پر ملکیوریک کلورائیڈ کا اثر۔ (غیر مطبوعہ)

۶۸۔ شہاب الدین محمد

(۱۱۹) حکومت ہند اور والیان ریاست کے تعلقات (غیر مطبوعہ)

۶۹۔ شیخ چاند مرحوم۔

(۱۲۰) ملک عنبر۔

(ص)

۔ صفی الدین۔

(۱۲۱) ابوالفیض فیضی (غیر مطبوعہ)

(ض)

۷۱۔ ضیاء الدین انصاری

(۱۲۲ و ۱۲۳) تعمیرات کا نظریہ اور تجویز۔ حصہ اول، دوم۔ (۱۲۴ و ۱۲۵) مضبوطی اشیاء حصہ اول و دوم۔ (۱۲۶) محکم کنکریٹ کی تجویز۔

(ظ)

۷۲۔ ظفر الحسن، مرزا۔

(۱۲۷) محبت کی چھاؤں۔

۷۳۔ ظہیر یار جنگ بہادر، نواب

(۱۲۸) سیاحت نامہ (حال سفر یورپ امریکہ)

(۱۲۹) خطبۂ صدارت حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

۷۴۔ ظہیرالدین احمد۔

(۱۳۰) سر سید احمد خان (۱۳۱) دفتری معلومات (۱۳۲) دادا بھائی نوروزجی۔

۷۵۔ ظہیرالدین حسن، سید۔

(۱۳۳) احمد شوقی بک اور انکی شاعری (غیر مطبوعہ)

۷۶۔ ظہیرالدین محمد۔

(۱۳۴) سلطان احمد شاہ ولی بہمنی۔

۷۷۔ ظہیر احمد۔

(۱۳۵) پرچہ جات سائنس کے جوابات

ع

۷۸۔ عابد علی خاں، میر

(۱۳۶) گزشتہ پچاس سال سے حیدرآباد میں اردو کی ترقی (غیر مطبوعہ)

۷۹۔ عاقل علی خاں، محمد

(۱۳۷) ٹیگور کے تمدنی و سیاسی خیالات (غیر مطبوعہ)

۸۰۔ عباس حسین نقوی سید

(۱۳۸) احوال و تصانیف نعمت خان عالی (غیر مطبوعہ)

۸۱۔ عباس حسین، لطفی،

(۱۳۹) مثنوی بیوی۔

۸۲۔ عباس رضا زیدی، سید محمد،

(۱۴۰) اورنگ زیب کا نظم ونسق دکن میں۔ (غیر مطبوعہ)

۸۳۔ عباس علی رضوی سید۔

(۱۴۱) گارساں دتاسی (غیر مطبوعہ)

۸۴۔ عبدالحفیظ، محمد

(۱۴۲، ۱۴۳) مبادیات سائنس حصۂ اول و دوم

۸۵۔ عبدالحفیظ، قتیل

(۱۴۴) اردو غزل کے جدید رجحانات (غیر مطبوعہ)

۸۶۔ عبدالحفیظ صدیقی

(۱۴۵) رفتار زمانہ (۱۴۶) بلقان۔

۸۷۔ عبدالحلیم حسینی سید

(۱۴۷) موضع پرتاب سنگھارم کی معاشی تحقیق (غیر مطبوعہ)

۸۸۔ عبدالخالق محمد سعید۔

(۱۴۸) میسور میں اردو

۸۹۔ عبدالرحمن، سید

(۱۴۹) نقشہ کشی (۱۵۰) جدید حلوات۔

۹۰۔ عبدالرحمن، رئیس،

(۱۵۱) سیرت و کردار

۹۱۔ عبدالرحمن، سعید

(۱۵۲) لسان الامت۔

۹۲۔ عبدالرشید قریشی، سید

(۱۵۳) عہد [illegible] کا ارتقا (غیر مطبوعہ)

۹۳۔ عبدالرزاق قادری جعفر سید

(۱۵۴) معانی الآثار ۔ امام طحاوی (غیر مطبوعہ)

۹۴۔ عبدالستار نائب

(۱۵۵) کارنوالس (۱۵۶) خطبۂ افتتاحیہ انجمن اتحاد جامعہ عثمانیہ (۱۵۷) داستان ہند کا (۱۵۸) ہند کے سیاسی مسلک کا نشوونما۔

۹۵۔ عبدالسلام ذکی۔

(۱۵۹) چمن زار حکایات۔ (۱۶۰) گلزار اطفال (۱۶۱) تحفۂ رمضان (۱۶۲) آصفی کہانیاں (۱۶۳) شہادت نامہ (۱۶۴) جذبات عالیہ (۱۶۵) پیام حق۔ (۱۶۶) و (۱۶۷) شرح نصاب اردو حصہ اول و دوم، (۱۶۸) گلشن اخلاق۔

۹۶۔ عبدالعلی۔

(۱۶۹) سنہ ۱۹۰۹ء کا اتحاد ثلاثہ (غیر مطبوعہ)

۹۷۔ عبدالقادر سروری، محمد

(۱۷۰) کردار اور افسانہ (۱۷۱) جدید اردو شاعری (۱۷۲) پھول بن (۱۷۳) قصۂ بے نظیر (۱۷۴) دنیائے افسانہ (۱۷۵) انگریزی افسانے (۱۷۶) رات کا بھولا اور دیگر افسانے (۱۷۷) سراج سخن۔

۹۸۔ عبدالقدوس۔

(۱۷۸) نظریۂ خیر و شر (۱۷۹) اسلامی وحدۃ الوجود۔ (غیر مطبوعہ)

۹۹۔ عبدالقیوم خاں باقی، محمد

(۱۸۰) فاؤسٹ اردو نظم میں۔ (۱۸۱) ادبی تنقید کے چند اصول (۱۸۲) عہد اکبری کے فارسی گو شعراء (۱۸۳) یوسف زلیخا لباس نو میں۔

۱۰۰۔ عبدالجبار سجانی۔

(۱۸۴ و ۱۸۵ و ۱۸۶ و ۱۸۷) السباق الاشیاء حصہ اول و دوم و سوم و چہارم۔

۱۰۱۔ عبدالمجید صدیقی، محمد۔

(۱۸۸) خطبۂ استقبالیہ چوتھی حیدرآباد معاشی کانفرنس (۱۸۹) تاریخ گولکنڈہ (۱۹۰) مقدمۂ تاریخ دکن۔ (۱۹۱) عبدالملک ابن مروان ولید (غیر مطبوعہ)

۱۰۲۔ عبدالمنعم۔

(۱۹۲) سلطان محمد عادل شاہ (غیر مطبوعہ)

۱۰۳۔ عبدالوہاب، محمد

(۱۹۳) جداول ریاضیہ اور طبعی مستقلات۔

۱۰۴۔ عبدالوہاب محمد۔

(۱۹۴) تسخیر گولکنڈہ۔ (غیر مطبوعہ)

۱۰۵۔ عزیز احمد۔

(۱۹۵) سکالج کے دن (۱۹۶) فرانس کے افسانے

۱۰۶- عظیم الدین، محمد، محبت -

(۱۹۷) شاعر کی دنیا - (۱۹۸) امجد حیدرآبادی (غیر مطبوعہ)

۱۰۷- عزیز الرحمن، محمد،

(۱۹۹ و ۲۰۰ و ۲۰۱) حسنات جلد اول و دوم و سوم

۱۰۸- علی احمد،

(۲۰۲) داستان گو

۱۰۹- علی حسنین، زیبا، سید

(۲۰۳) اردو ادب بیسویں صدی میں -

۱۱۰- علی شبر، ہاشمی، سید

(۲۰۴) [illegible]

۱۱۱- علی شاکر، سید

(۲۰۵) حیات و کلام صائب (غیر مطبوعہ)

۱۱۲- علی ضامن نقوی، سید

(۲۰۶) سرسید کے مضامین،

۱۱۳- علی محسن، سید

(۲۰۷) عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متوسلین

۱۱۴- علی محمد، سید

(۲۰۸) تسخیر بیجاپور (غیر مطبوعہ)

۱۱۵- عنایت حسین، محمد

(۲۰۹) موضع قطب آباد کی معاشی تحقیق (غیر مطبوعہ)

۱۱۶- علی موسیٰ رضا مہاجر -

(۲۱۰) مبادیات کشافہ

۱۱۷- عمر مہاجر، محمد

(۲۱۱) اردو افسانوں کے جدید رجحانات (غیر مطبوعہ)

۱۱۸- عیسیٰ احمد خواجہ -

(۲۱۲) ہندوستانی سیاسی فضا اور اس کا اثر دستور پر (۱۸۵۷-۱۹۳۹) (غیر مطبوعہ)

(غ)

۱۱۹- غازی الدین -

(۲۱۳) سیرت طیبہ -

۱۲۰- غلام حسن -

(۲۱۴) لیونارڈ و گرٹرود

۱۲۱- غلام دستگیر رشید، محمد،

(۲۱۵) شمس معنوی، (۲۱۶) اسلامی تہذیب کیا ہے -

(۲۱۷) حیات طیبہ (۲۱۸) حضرت خواجہ بندہ نواز

۱۲۲- غلام قادر -

(۲۱۹) جغرافیہ ریاست حیدرآباد -

۱۲۳- غلام محمد خاں -

(۲۲۰) خواجہ میر درد دہلوی (غیر مطبوعہ)

۱۲۴- غوث الدین علی محمد

(۲۲۱) السباق الاشیاء

(ف)

۱۲۵۔ فخر نواز جنگ بہادر، نواب

(۲۲۲) خطبہ صدارت پہلی کانفرنس طیلسانین عثمانیہ

۱۲۶۔ فخر الحسن، سید،

(۲۲۳) موضع ریبوز کی معاشی و معاشرتی تحقیق (غیر مطبوعہ)

۱۲۷۔ فضل اللہ احمد۔

(۲۲۴) تبویب حیدری۔

۱۲۸۔ فیض محمد، صدیقی، ابوالمکارم

(۲۲۵) خلاصہ کیمیا، (۲۲۶) جدید نصاب کیمیا، (۲۲۷) حفظ صحت (۲۲۸) معلمان تعلیم، (۲۲۹) آب دوز کشتیاں و سرنگ۔ (۲۳۰) پانی کی کہانی۔ (۲۳۱) نواب عماد الملک (۲۳۲) سید حسن بلگرامی۔

۱۲۹۔ فصیح الدین احمد قاضی۔

(۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶) اسباق الانشا حصہ اول، دوم، سوم، چہارم۔

(ق)

۱۳۰۔ قادر علی، میر

(۲۳۷) حیدرآباد میں چوڑی کے جوڑ ونگی صنعت (غیر مطبوعہ)

۱۳۱۔ قدرت اللہ بیگ، مرزا،

(۲۳۸) ادبی تاثرات۔

(ک)

۱۳۲۔ کاظم رضا، محمد

(۲۳۹) سلطنت اودھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے تعلقات۔ (غیر مطبوعہ)

۱۳۳۔ کلیم الدین، انصاری۔

(۲۴۰) خطبہ استقبالیہ تیسری سالانہ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ۔ (۲۴۱) خطبہ صدارت پانچویں سالانہ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ۔

(گ)

۱۳۴۔ گرو داس۔

(۲۴۲) جیون چرتر۔ (۲۴۳) خطبہ استقبالیہ چوتھی سالانہ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ (۲۴۴) خطبہ استقبالیہ دوسری عثمانیہ بلدیہ جامعت۔ (۲۴۵) خطبہ صدارت تیسری کانفرنس طیلسانین عثمانیہ۔

۱۳۵۔ گوبند راؤ پوار۔

(۲۴۶) ویدانت وحدۃ الوجود (غیر مطبوعہ)

ل

۱۳۶ لطیف النساء بیگم ۔

(۲۴۷) دلی کا تخیل (۲۴۸) من کی بتیا۔

(۲۴۹) اردو شاعری اور تصوف (غیر مطبوعہ)

م

۱۳۷۔ مدن موہن لعل ۔

(۲۵۰) خطبۂ استقبالیہ چھٹی سالانہ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ ۔

۱۳۸۔ محسن بن شبیر ۔

(۲۵۱) یوسف ہندی قید فرنگ میں۔

(۲۵۲) حج زینب ۔

۱۳۹۔ محمد احمد انصاری ۔

(۲۵۳) سلطان علاؤالدین حسن گنگو بہمنی ۔

۱۴۰۔ محمد احمد خواجہ ۔

(۲۵۴) خطبہ صدارت نویں سالانہ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ ۔

۱۴۱۔ محمد احمد عثمانی ۔

(۲۵۵) تجربی طبیعات (۲۵۶) مبادیات طبیعات حصۂ اوّل ۔

۱۴۲۔ محمد احمد سبزواری، سید

(۲۵۷) موضع ۔۔ دیال کی معاشی تحقیق (غیر مطبوعہ)

(۲۵۸) لوگارتھمی اور طبعی جدول ۔

۱۴۳۔ محمد علیخاں مہکیش، میر

(۲۵۹) کاغذ کی ناؤ (۲۶۰) گریہ و تبسم

۱۴۴۔ محمد علی خاں ۔ مرزا

(۲۶۱) گذشتہ نصف صدی میں دکنی مرثیہ نگاری (غیر مطبوعہ)

۱۴۵۔ مہدی حسین، سید

(۲۶۲) ہندوستان

۱۴۶۔ محمد امیر ۔

(۲۶۳) من کی بانسری ۔ (۲۶۴) شیب و شباب

(۲۶۵) سلیم ۔

۱۴۷۔ محمد علی انصاری، شیخ

(۲۶۶) عمر بن ربیعہ اور اس کی شاعری (غیر مطبوعہ)

۱۴۸۔ محمد غوث ۔

(۲۶۷) مدراس کے بعض کتب خانے۔

(۲۶۸) کرناٹک کی دو فارسی تاریخیں

(۲۶۹) ہندوستان کی ابتدائی فرانسیسی اور انگریزی کشمکش میں خاندان انوری کا حصہ

(۲۷۰) جنایات بر جایداد

۱۴۹۔ محمد غوث ۔ (محبوب نگری)

(۲۷۱) امام غزالی کے کلامی خصوصیات

۱۵۰۔ محمد فاروق۔

(۲۷۲) افتاحی تقریریں (۲۷۳) خطبۂ استقبالیہ نویں سالانہ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ۔

(۲۷۴) قرآنی دعائیں۔

۱۵۱۔ محمد محسن سید محشر عابدی۔

(۲۷۵ و ۲۷۶ و ۲۷۷) سطالع قدرت حصۂ اوّل و دوم و سوم۔

۱۵۲۔ محبوب علی میر۔

(۲۷۸) شادی اپنی حیثیت سے کلم وضو وغیرہ کی

۱۵۳۔ محمود علی، میر

(۲۷۹) گلدستۂ تاریخ ہند (۲۸۰) خطبۂ صدارت پہلی نمائش مصنوعات ملکی۔ (۲۸۱) آصفجاہ ثانی

۱۵۴۔ محی الدین قادری زورؔ۔ سید

(۲۸۲) ہندوستانی کا ارتقاء (۲۸۳) جواہر سخن (۲۸۴) گارساں دی تاسی (۲۸۵) شاہ ظہور الدین حاتم۔ (۲۸۶) روح تنقید (۲۸۷) تین شاعر (۲۸۸) ہندوستانی لسانیات (۲۸۹) روح غالب (۲۹۰) میر محمد مومن۔ (۲۹۱) اردو شہ پارے (۲۹۲) تنقیدی مقالات (۲۹۳) اردو اسالیب بیان۔ (۲۹۴) عہد عثمانی میں اردو کی ترقی (۲۹۵) طلسمی تقدیر

(۲۹۶) مرقع سخن حصۂ اوّل۔ (۲۹۷) مرقع سخن حصۂ دوم (۲۹۸) تاریخ ادب اردو (۲۹۹) فیض سخن (۳۰۰) مکتوبات شاد عظیم آبادی (۳۰۱) گارساں دی تاسی (طبع ثانی) (۳۰۲) بادۂ سخن (۳۰۳) شاد اقبال (۳۰۴) سرگذشت غالب۔

۱۵۵۔ مختار الدین احمد مرزا۔

(۳۰۵) عہد عالمگیر میں دکن کی سیاسی اور تمدنی حالت (غیر مطبوعہ)

۱۵۶۔ مخدوم علی۔

(۳۰۶) عثمانیہ جغرافیہ عالم (۳۰۷) حفظان صحت (۳۰۸) جغرافیہ سلطنت آصفیہ۔ (۳۰۹) رفیق مدرسین، (۳۱۰) ذہنی حساب (۳۱۱) معلومات عامہ (۳۱۲) بچوں کی کہانیاں حصہ اول۔

۱۵۷۔ مخدوم محی الدین، محمد۔

(۳۱۳) اردو ڈراما اور اسٹیج (غیر مطبوعہ) (۳۱۴) ٹیگور اور ان کی شاعری۔ (۳۱۵) ہوش کے ناخن۔

۱۵۸۔ مخدوم علی خاں، میر

(۳۱۶) عہد معاہدہ سنہ ۱۷۹۸ء اور حیدرآباد (غیر مطبوعہ)

۱۵۹ - معین الدین قریشی - سید

(۳۱۷) غالب (۳۱۸) نغمہ -

۱۶۰ - منیر الدین خواجہ

(۳۱۹) دورِ شاہجہانی کا تمدنی ارتقا (غیر مطبوعہ)

۱۶۱ - منیر الدین محمد -

(۳۲۰) حل پرچہ جات ریاضی (۳۲۱) مکمل ہندسہ عملی -

۱۶۲ - مہندر راج سکسینہ،

(۳۲۲) جیومیٹری -

۱۶۳ - میر حسن -

(۳۲۳) ورڈسورتھ اور اس کی شاعری (۳۲۴) ہوش کے ناخن - (۳۲۵) مغربی تصانیف کے اردو تراجم (۳۲۶) سائنس کے کرشمے -

(ن)

۱۶۴ - نارائن پرشاد، سری واستوا

(۳۲۷) آربندو گھوش کا فلسفہ (غیر مطبوعہ)

۱۶۵ - ناصر علی، محمد

(۳۲۸) موضع بٹنہ کی معاشی تحقیق - (۳۲۹) موضع ودیلی کی معاشی تحقیق - (۳۳۰) جاپان کی صنعتی ترقی -

۱۶۶ - نبی الحسن، شمیم

(۳۳۲) عالم حیات (۳۳۳) شمیم سخن - (۳۳۴) شاعِ امید

۱۶۸ - نجم الغنی

(۳۳۵) اسباق الاشیاء

۱۶۹ - نجم النساء بیگم -

(۳۳۶) کلام ولی اور تصوف (۳۳۷) سر سید کی نثر (غیر مطبوعہ)

۱۷۰ - ندیم الحسن -

(۳۳۸) مومن کی شاعری (غیر مطبوعہ)

۱۷۱ - نذیر الدین، محمد

(۳۳۹) علم مثلث کروی (۳۴۰) مساواتوں کا نظریہ - (۳۴۰) علم مثلث مستوی (۳۴۱) ماسکونیات (۳۴۲) علم ہیئت کروی - (۳۴۳) مخروطی تراشیں (۳۴۴) نظری علم الحیل (۳۴۵) علم مثلث کروی - (۳۴۰) علم ہندسہ نظری -

۱۷۲ - نعیم النساء بیگم -

(۳۴۷) ولی کی معلومات اور خصوصیات شاعری

(۳۴۸) علامہ شبلی اور ان کی نثر (غیر مطبوعہ)

۱۷۳۔ نقش عالمی۔

(۳۴۹) شفق آرا۔ (۳۵۰) مختصر تاریخ انگلستان

۱۷۴۔ نوراللہ، محمد

(۳۵۱) داغ۔

۱۷۵۔ نوشابہ خاتون۔

(۳۵۲) موج تخیل

(و)

۱۷۶۔ وحید اللہ خاں۔

(۳۵۳) سلطان محمد تغلق (غیر مطبوعہ)

۱۷۷۔ ودیا کر کراج ایشور چند۔

(۳۵۴) برطانوی ہند میں صوبہ جاتی حکومت کا ارتقاء (غیر مطبوعہ)

۱۷۸۔ ولی الدین، میر

(۳۵۵) فلسفہ کی پہلی کتاب (۳۵۶) تاریخ فلاسفۂ اسلام۔ (۳۵۷) مقدمہ فلسفہ حاضرہ۔ (۳۵۸) رہنمائے قرآن۔ (۳۵۹) قرآن اور علاج خوف (۳۶۰) قنوطیت (فلسفہ یاس)، (۳۶۱) مقدمہ مابعد الطبیعات۔ (۳۶۲) قرآن کا فلسفۂ مذہب (۳۶۳) قرآن اور سیرت سازی

(۳۶۴) اقبال اور حدیث جبر و قدر۔

(۳۶۵) خلق و حق۔

۱۷۹۔ وینکٹ راؤ، چاری

(۳۶۶) مہادیو سندھیا کے سیاسی منصوبے (غیر مطبوعہ)

(ھ)

۱۸۰۔ ہنمنت راؤ۔ ام

(۳۶۷) ازمنہ وسطی ہند میں کے افغانی دور کی عمرانی زندگی کے چند پہلو (غیر مطبوعہ)

۱۸۱۔ ہرو ال کر گنڈے راؤ۔

(۳۶۸) خطبہ استقبالیہ پانچویں سالانہ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ۔

(ی)

۱۸۲۔ یوسف الدین، محمد

(۳۶۹) اسلام کے معاشی نظریے

مجلۂ طیلسانیین کے ناظرین سے

۱۔ مجلّہ کے خریداروں سے استدعا ہے کہ اپنے پتہ کی تبدیلی سے بروقت اطلاع دیں۔
۲۔ تنقید کے لیے کتابیں بھیجی جائیں تو مدیر کے پاس راست دفتر مجلہ پر بھیجی جائیں۔
۳۔ مجلہ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ سے جامعۂ عثمانیہ کے ام' اے اور ام' ایس سی کے امتحانات کی غرض سے لکھے ہوئے مقالے طبع ہوں، چنانچہ اب تک مجلہ نے ۶ مقالے شایع کردئے ہیں۔ جو صاحب اپنا مقالہ مجلہ میں طبع کرانا پسند فرمائیں وہ براہ کرم مدیر مجلہ سے مراسلت فرمائیں۔

مجلس نمائش معاشی کمیٹی حیدرآباد دکن

حساب آمدنی و خرچ ختم ۳۱ ؍ امرداد ۱۳۵۲ف

اخراجات	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
تنصیب اسٹالس						
اداشدہ	۱۹۵۱	۱۳	۵			
اداشدنی	۷۲	–	–	۳۰۲۳	۱۳	۵
اخراجات برقی روشنی				۳۲۷۱	۱۳	۶
تشہیر و طباعت				۲۲۷۶	۱۱	۱۰
تفریحات				۵۴۷۹	۱	۶
شعبۂ فنون لطیفہ				۴۳۵	۵	۸
معاشی کانفرنس				۲۵۰	۰	۰
مظاہرات				۴۷۲	۶	۱۰
اخراجات یوم خواتین						
اداشدہ	۴۳۰	۶	۰			
اداشدنی	۵۰	–	–			
				۴۸۰	۲	۰
امداد صناعان				۲۶۳	۸	۰
انعامات صناعان				۴۶۶	-	
طعام رضاکاران						
اداشدہ	۵۵۵	–	–			
اداشدنی	۱۹۸	۶	–	۷۵۳	۶	
اخراجات یوم افتتاح				۹۸۵	۱۲	۸
مرکزی اسٹال						
اداشدہ	۲۶۱	۴	۱۰			
اداشدنی	۲	۳	۸	۲۶۳	۸	۶

اخراجات	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
انتظامات دفتر اور تنخواہ ملازمین						
ادا شدہ	۲۹۰۰	۴	۴			
ادا شدنی	۵۵	–	–			
				۲۹۵۵	۴	۴
وار فنڈ				۱۱۷۰	۱۲	۱
امداد آموں کی نمائش				۳۵۰	–	–
امداد عثمانیہ بلدی جماعت (برائے نمائش اطفال)				۲۰۰	–	–
دیگر اخراجات:-						
نمائش کلب	۵۰	–	–			
آہک پاشی و آب رسانی	۳۶۱	–	۶			
مزدوری	۹۶۳	۱۰	–			
بقایا غیر وصول شدنی	۱۸	۱۲	۷			
متفرق	۱۳۰	۱	۴			
				۱۵۲۳	۸	۵
مطالبات فرسودگی				۶۱۲	۹	۸
زاید آمدنی بر اخراجات متعلقہ ذخیرہ عام				۱۷۰۹۰	۱۰	–
میزان				۴۲۳۲۸	۱۰	۵

حیدرآباد دکن

مورخہ ۳ آذر ۱۳۵۳ف مطابق ۹ اکتوبر ۱۹۴۳ء

آمدنی	روپیہ	آنہ	پائی
فروخت ٹکٹ داخلہ	۲۷۹۰۵	۰	۴
فیس شرکت و کرایۂ اسٹال	۵۸۹۱	۱۱	۸
امداد از انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ	۸۰۰۰	—	—
عطیہ جات	۹	—	—
چندہ اراکین	۴۰۲	—	—
منافع فروخت حصص	۳۱	۸	—
سود	۸۹	۶	۵
میزان	۴۲۳۲۸	۱۰	۵

حسابات کی جانچ کی گئی ۔ درست پائے گئے ۔ فقط

(شرح دستخط) وی ۔ کے ڈھنگے اینڈ کمپنی

رجسٹرڈ اکونٹنٹس آڈیٹرس

فرد واصل باقی بتاریخ ۳۱ر امرداد ۱۳۵۲ف

سرمایہ دیون	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
ذخیرۂ عام						
باقی بتاریخ یکم شہریور ۱۳۵۱ف	۹۶۲۱	۸	۵			
اضافہ آمدنی براخراجات	۱۷۰۹۰	۱۰	۰	۲۶۷۱۲	۲	۵
ذیلی اخراجات				۳۷۲	۵	—
دیگر رقومات ادا شدنی						
سید اسماعیل اینڈ سنس	۲۴	۸	—			
رضاکار کمیٹی	۲۴	۲	—			
عبدالرؤف صاحب	۲	۳	۸			
مسرت گاہ ہوٹل	۳۱	—	—	۸۱	۱۳	۸
میزان				۲۷۱۶۶	۵	۱

ہم نے فرد واصل باقی کی تنقیح مجلس کے رجسٹرات اور حسابات کی مدد سے کی ہے اور اس سلسلہ میں وہ سب معلومات اور کیفیتیں حاصل کی ہیں جن کی ہم کو ضرورت تھی۔ ہماری رائے میں یہ فرد واصل باقی بالکل صحیح اور قانون کے مطابق مرتب ہوئی ہے اس کی ہم نے علحدہ رپورٹ بھی پیش کی ہے۔ ہم نے ممکنہ حد تک مجلس کے رجسٹرات اور بیانات کے ذریعہ اس امر کا اطمینان کرلیا ہے۔ فقط

(شرح دستخط) ڈی۔ کے۔ ڈھنگے اینڈ کمپنی
رجسٹرڈ اکونٹس آڈیٹرس

حیدرآباد دکن
مورخہ ۳ر آذر ۱۳۵۳ف مطابق ۹ر اکتوبر ۱۹۴۳ء

(شرح دستخط)

احمد محی الدین صاحب۔ صدر مجلس نمائش — میر اکبر علی خاں صاحب۔ رکن — ظہیر الدین احمد صاحب۔ رکن
رائے گرو داس صاحب۔ نائب صدر — خان صاحب محمد عارف صاحب ″ — یل۔ ین۔ گپتا صاحب ″
شرف الدین صاحب۔ اعزازی معتمد — محمد غوث صاحب ″ — خواجہ حمید احمد صاحب ″
عبدالعلی صاحب۔ نائب معتمد — رائے شنکرجی صاحب ″ — ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی صدر رسال ماسبق۔
میر محمد علی صاحب۔ خازن — برہان الدین حسین صاحب ″ — بی۔ کے بھگوان صاحب۔ رکن

اثاثہ جائداد وسامان	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
نقد دردست و بنک						
نقد دردست	۳۹۰	۱۱	۱۱			
سنٹرل بنک آف انڈیا لمیٹڈ	۱۵۱۳	۱	۱			
حیدرآباد کواپریٹو ڈومینین بنک لمیٹڈ	۱۱۲۳	۶	۲	۳۰۲۷	۳	۲
نمغہ جات و ڈائی پنچ				۱۳۲	۱۲	۰
حصص						
۱۰۱ حصص حیدرآباد اسٹیٹ بنک قیمتی یک صد روپیہ				۱۳۹۹۱	۸	۰
فرنیچر ۶۶۸-۴-۴						
اضافہ بوجہ خریدی ۱۲۵-۰-۰	۷۹۳	۴	۴			
کمی بوجہ مطالبات فرسودگی دس فی صدی	۷۹	۵	۲	۷۱۳	۱۵	۲
فلم و البم ۱۶۸۶-۸-۰						
اضافہ بوجہ خریدی ۳۳۵-۱۳-۲	۲۰۲۲	۵	۲			
کمی بوجہ مطالبات فرسودگی ۱۲ فی صدی	۲۴۲	۱۰	۲	۱۷۷۹	۱۱	۰
اشیائے پکوان	۱۹۹	۲	۰			
کمی بوجہ مطالبات فرسودگی دس فی صدی	۱۹	۱۴	۴	۱۷۹	۳	۸
پارچہ اور پردے	۱۰۹۹	۶	۲			
کمی بوجہ مطالبات فرسودگی ۲۵ فی صدی	۲۷۴	۱۲	۰	۸۲۴	۱۰	۲
کتب	۱۴	۸	۰			
اضافہ بوجہ خریدی	۹۸	۱۵	۰	۱۱۳	۷	۰

اثاثہ جائداد وسامان	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
اسٹور روم				۱۲۱	۳	۵
کاغذ				۶۰۶	۸	۰
قرضہ مرکز مصنوعات ملکی امداد باہمی				۴۴۹	۸	۰
قرضہ جات				۴۷۲	۵	۰
رقومات وصول شدنی از داعی صاحبان						
بابتہ سنہ ۱۳۵۱ف ۹۳۵-۰-۸						
منہائی بقایا غیر وصول شدنی ۱۸-۱۲-۷	۹۱۶	۴	۱			
زائد رقوم وصول شدنی بابتہ سال حال	۵۹	۶	۱۱	۹۷۵	۱۱	۰
رقومات وصول شدنی از دیگر مجالس						
انجمن طیلسانین عثمانیہ بابتہ سنہ ۱۳۵۱ف	۳۷۶	۱۲	۰			
نمائش کلب بابتہ سنہ ۱۳۵۱ف	۱۸۲	۸	۰	۵۵۹	۴	۰
دیگر دین دار						
سالمین اینڈ کمپنی	۵۴۳	۰	۰			
اے۔ اے حسین	۱۰	۰	۰			
ترقیات نظام ساگر	۱۸	۸	۰			
سالمین اینڈ کمپنی	۵۹	۰	۰			
مسرت نگار	۲۹	۰	۰			
ٹکنیکل کالج	۱۰۶	۴	۰			
عبدالبصیر صاحب	۲۹	۱				
سررشتہ جیل	۲۱	۰	۰	۸۵۵	۱۳	
دیگر رقومات وصول شدنی بابتہ سنہ ۱۳۵۱ف	۸۵۰	۰				
بابتہ سنہ ۱۳۵۲ف	۱۵۱۳	۱۰	۶	۲۳۶۳	۱۰	۶
میزان				۲۷۱۶۶	۵	۱

مجلہ طیلسانین

حصہ

معاشیات

دوسری جلد - آبان سنہ ۱۳۵۲ ف - اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء - شوال سنہ ۱۳۶۲ھ - چوتھا شمارہ

مدیر مجلہ طیلسانین محمد غوث ام اے ال ال بی (عثمانیہ)

فہرست مضامین

حرفِ آغاز

مجلے کی یہ اشاعت ناظرین کے ہاتھوں میں جس وقت پہنچے گی مصنوعاتِ مملکتِ آصفیہ کی چھٹی نمائش کا آغاز ہو چکا ہوگا۔

رضاکارانہ اصول پر اس نمائش کی داغ بیل رکھی گئی اور پانچ چھ سال کے دوران میں اس کو جو فروغ ہوا وہ دراصل حضرت پیر و مرشد بندگانِ عالی مدظلہ العالی کے توجہاتِ عالی کا پرتو ہے۔ اعلیحضرت خسرو دکن کو مملکتِ آصفیہ کے صنعتی ارتقاء کا جو خیال ہے وہ ایک نہایت ہی خوش آیند مستقبل کا ضامن ہے اسی کے پیشِ نظر حضرت جہاں پناہ بہ نفسِ نفیس نمائش کے افتتاح کی زحمت گوارا فرماتے ہیں ملک اور اہلِ ملک پر بالعموم اور صنّاعوں اور صنعتی کاروبار میں مشغول ملک کے خادموں پر ایک احسانِ عظیم فرماتے ہیں۔

نمائش کے کاروبار میں ہر سال جو نمایاں ترقی حاصل ہو رہا ہے اس کے مدِنظر یہ امر نہایت ضروری تھا کہ ایک مستقل نمائش گاہ کی تعمیر عمل میں آئے۔ بہت ہی مسرت کا مقام ہے کہ مجلس آرائش بلدہ اور انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کی مشترکہ امانت و تائید سے آیندہ سال تک نمائش گاہ کی مستقل طور پر تعمیر عمل میں آجائے گی اور یہ عمارت ملک کی صنعتی ترقی کے لئے ایک نشانِ راہ ثابت ہوگی۔

چھٹی نمائش مصنوعاتِ مملکتِ آصفیہ کا کامیاب انعقاد دلی اور مخلصانہ مبارکباد کا مستحق ہے دنیا کے ہر کاروبار میں مشکلات اور دقتیں پیش آتی ہیں لیکن صاحبانِ عزم اپنی ہمت اور استقلال سے مشکلات پر غالب آجاتے اور کامیابی کا نقارہ بجاتے ہیں۔ سعدیؒ نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہر کارے کہ ہمت بستہ گردد اگر خارے بود گلدستہ گردد

دنیا کے غیر معمولی اور اس کے ان بدلنے والے حالات کے پیشِ نظر نمائش کی کامیابی میں گوناگوں دقتوں کا سامنا ہوتا اور ایک مشکل کے بعد دوسری مشکل پریشان کرتی تھی لیکن خدا کے فضل اور اعلیحضرت بندگانعالی کے

اقبال سے سب مشکلیں آسان ہوگئیں اور اخلاص مندانہ کام کی فیروزمندی ایک اور مرتبہ مسلّم ہوگئی
سب سے بڑی مشکل جو حائل تھی وہ برقی روشنی تھی سررشتہ برقی کا مطالبہ تھا کہ مجلس نمائش
کیجانب سے روشنی کی ڈھائی ہزار اکائیاں فراہم کیجائیں تو اس صورت میں برقی روشنی کا انتظام کیا جائیگا
بڑی خوشی کی بات ہے کہ مجلس نمائش کے ہمدردوں نے ایک ایک و دو دو اکائیوں سے ایک ہزار اکائیوں
کا ایثار کیا اور مطلوبہ اکائیاں فراہم کردیں ملک کی ترقی کے لئے یہ جذبات ہر جگہ مبارکباد اور ستائش
کے مستحق ہیں۔

جس طرح دنیا میں ہر کام کی تکمیل میں کسی نہ کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسی طرح وہاں ہر
قسم کے کاروبار برابر جاری رہتے ہیں۔ خود نمائشیں بھی ہندوستان میں برابر منعقد ہو رہی ہیں۔ چنانچہ
میسور میں ابھی گذشتہ مہینے میں ایک صنعتی نمائش بڑے اہتمام سے منعقد ہوئی جس و نقل کی مشکلات کے
باوجود ۱۹۴۲ء و ۱۹۴۳ء کے دوران میں ہندوستان کے مختلف مقامات پر مویشیوں کی
(۳۳) نمائشیں منعقد ہوئیں۔ جاڑے کے آئندہ موسم میں مویشیوں کی ہندوستان
کے مختلف مقامات پر (۴۰) نمائشوں کا تہیہ کیا گیا ہے خود کلکتے میں جہاں قحط نے الم ناک
حالات پیدا کردے ہیں برباشل کمپنی نے کی ایک نمائش کا
جنوری ۱۹۴۴ء میں اہتمام کیا ہے۔ گورنر بنگال اس کے سرپرست قرار پائے ہیں اور
انعامات کے لئے جو رقم مختص کیگئی ہے وہ بیس ہزار روپے سے زیادہ ہے۔ اس گراں قدر رقم کے معطی حسب ذیل ہیں۔
حکومت ہند، حکومت بنگال، حکومت بمبئی، ریلوے بورڈ، کلکتہ واٹر کمپنی، بنگال کیمیکل کمپنی، جنرل
موٹرس کمپنی، حکومت کشمیر، برٹش انڈیا کارپوریشن، سمنٹ مارکٹنگ کمپنی، ٹیٹا گڑھ کا
کارخانہ کاغذ سازی، امپیریل ٹوباکو کمپنی، ساسون کمپنی، کوڈاک کمپنی، ٹاٹا کمپنی، باٹا کمپنی، ٹائمز
آف انڈیا، بنگال چیمبر آف کامرس وغیرہ۔

انعامات جو مقرر کئے گئے ہیں اس کے سلسلہ میں معلوم ہوا ہے کہ ہر شعبے میں تین انعامات
دئے جائیں گے۔ نمائش (۳۹) شعبوں میں تقسیم کیگئی ہے۔ پہلا انعام (۲۵۰) روپے، دوسرا انعام

(۱۵۰) روپے تیسرا انعام (۵۰) روپے۔ علاوہ ازیں دوسرے خاص خاص (۲۵) انعامات جن کی مقدار زیادہ سے زیادہ (۵۰۰) روپے اور کم سے کم (۵۰) روپے مقرر کئے گئے ہیں۔ ان انعامات سے قطع نظر ایک ایک ہزار روپے کے (۴) وظائف علیحدہ قرار دئے گئے ہیں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ کلکتہ جیسے آفت رسیدہ مقام میں صرف اشتہارات کی نمائش اس عظیم الشان پیمانے پر منعقد ہو رہی ہے کہ بیس ہزار سے زیادہ رقم صرف انعامات پر صرف کیجا رہی ہے۔

ہمارے ملک کے بڑے بڑے صنعتی اداروں نے ملک کی مجلس نمائش کو انعامات یا دوسرے اغراض کے لئے کیا عطیات دئے؟ ہمارے ملک کے جاگیردار زمیندار اور امراء نے کیا رقم بطور عطیہ مرحمت فرمائی؟ انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ نے جو امداد کی ہے وہ اگر حاصل نہ ہوتی تو مجلس نمائش کی کشتی ابھی بھنور میں ہی رہتی ضرورت ہے کہ ہمارے ملک کے روشن خیال اور اصحاب ثروت اور ادارے مجلس نمائش کے توسط سے صنعت اور صناع کی ہمت افزائی کے لئے شاندار عطیات سے آگے بڑھیں اور یہ ثابت کر دیں کہ ان کے دل میں ملک کی صنعتی ترقی کا درد اور تڑپ موجود ہے۔

ہندوستان سے قطع نظر دوسرے اقطاع عالم میں جو نمائشیں ہو رہی ہیں ان میں بھی ہندوستان کیجانب سے حصہ لیا جا رہا ہے مثلاً متحدہ اقوام کی صنعتی نمائش صنعت و فنون لطیفہ میں جس کا افتتاح نیو یارک میں نومبر کے آخر میں ہوگا ایک ہندوستانی شعبہ بھی قائم کیا جا رہا ہے۔ اس شعبہ میں ہندوستان سے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچانے کا انتظام کیا جا رہا ہے یا مثلاً سمرنا میں ایک بین الاقوامی تجارتی نمائش ۲۰ اگست سے منعقد ہوئی جو اپنی قسم کی بارھویں نمائش ہے۔ اس نمائش میں نہ صرف حکومت ہند نے حصہ لینے کا اہتمام کیا تھا بلکہ خود برطانیہ عظمیٰ کی حکومت نے بھی حصہ لیا۔ بیان کیا گیا ہے کہ دو سال پہلے یہ نمائش منعقد ہوئی تھی اس کا ۱۲ لاکھ افراد نے معائنہ کیا تھا، ایک لاکھ افراد اضلاع سے آئے تھے۔

بہرحال ہر طرف حرکت ہے اور ہر قوم جنگ کے غیر معمولی حالات کے باوجود عام قومی اور رفاہی کار و بار کو برابر انجام دئے جا رہی ہے۔ حیدرآباد کو بھی اس سے مستثنیٰ نہ ہونا چاہیئے۔

معاشیات کی الف بے

ناشر

محمد ناصر علی ام اے (عثمانیہ)
لکچرار شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ

تعارف

ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے اردو امتحانات کا مفید اور سود مند سلسلہ قائم کیا گیا ہے امیدواران امتحان کی سہولت کیلئے ۱۳۴۹ف میں چند عام فہم تقریروں کا اہتمام بھی کیا گیا تھا چونکہ اردو فاضل کے امتحان میں معاشیات کا مضمون بھی شریک ہے اس لئے اس موضوع پر بھی جناب محمد ناصر علی صاحب ایم اے استاذ معاشیات جامعہ عثمانیہ کی دو تقریروں کا انتظام ۴ اور ۵ تیر ۴۹ف کو عمل میں آیا تھا ان تقریروں کا مقصد یہ تھا کہ نہ صرف ادارہ کے امتحانات کے امیدواروں بلکہ دوسرے شایقین کو بھی معاشیات کے مفہوم اور اس کی اہمیت سے آگاہی حاصل ہوجائے۔

ان تقریروں کو جناب محمد ناصر علی صاحب نے نظر ثانی کے بعد مرتب کیا ہے ان کو مجلہ میں اس طور سے شائع کیا جارہا ہے کہ نہ صرف ناظرین مجلہ بلکہ دوسرے شایقین بھی استفادہ کرسکیں معاشیات کے اصول اور اس کے معلومات کی اہل ملک میں زیادہ سے زیادہ اشاعت کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کی پیشرفت میں یہ کوشش عمل میں لائی جارہی ہے۔

محمد غوث

مدیر مجلہ طیلسانین

فہرست

معاشیات کی الف بے

(۲) معاشیات کس قسم کا علم ہے

موجودہ زمانے میں علم کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے سہولت کی خاطر علوم کی وسیع تعلیم دو طرح پر کی گئی ہے:۔

(الف) علوم فطری اور (ب) علوم عمرانی

علوم فطری سے مراد وہ علوم ہیں جن میں قدرتی اشیا پر بحث کیجاتی ہے ان کا موضوع بحث مادہ ہوتا ہے۔ فلکیات جس میں اجسام فلکی کا حال معلوم کیا جاتا ہے۔ ارضیات جس میں زمین کے مختلف حالات اور کیفیات پر بحث کیجاتی ہے۔ طبعیات جس میں روشنی، حرارت اور برق سے بحث کیجاتی ہے نباتیات جس میں مختلف پودوں کی خصوصیات اور نشو و نما کی کیفیت سے بحث کیجاتی ہے علوم فطری میں شامل ہیں علوم فطری کے برعکس علوم عمرانی کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا تعلق انسان اور اسکی جماعتوں سے ہوتا ہے۔ اخلاقیات، عمرانیات، سیاسیات، تاریخ اور نفسیات وغیرہ عمرانی علوم ہیں معاشیات بھی ایک عمرانی علم ہے۔ اخلاقیات میں انسانی جماعتوں کے اخلاقی پہلو کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ عمرانیات میں معاشرتی حالات پر بحث کیجاتی ہے اسی بنا پر عمرانیات کو معاشرتی تعلقات کا علم کہا جاتا ہے سیاسیات میں سلطنت یا حکومت کی ماہیت اس کے اصول اور راعی و رعیت کے باہمی تعلقات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تاریخ میں گذشتہ اور موجودہ حالات کا بالتفصیل ذکر کیا جاتا ہے اور نفسیات میں انسان کی ذہنی اور نفسی کیفیتوں پر بحث کیجاتی ہے۔ جہاں تک معاشیات کا تعلق ہے اس میں

---

[1] یہ مقالہ ان تقاریر کا خلاصہ ہے جو ۱۹۴۳ء میں ادارہ ادبیات اردو کے زیر سرپرستی شائع کی گئی تھیں۔

انسان کی معاشی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی جاتی ہے۔ اگر ہم معاشیات کے متعلق صرف یہ کہہ دیں کہ اس میں انسان کی معاشی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس سے ہماری تشفی نہیں ہوتی اور ہم اس کے نفس مضمون یا موضوع بحث کو اچھی طرح سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

(۳) معاشیات کا نفس مضمون یا موضوع بحث

معاشیات کے نفس مضمون کے متعلق ابتداءً بہت کچھ غلط فہمی پائی جاتی تھی اور اب بھی ناواقف لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ معاشیات دولت پرستی کا علم ہے اور اس میں دولت جمع کرنے اور کنجوس بننے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ ڈکنس، کارلائل اور رسکن نے اپنی تصانیف میں علم معاشیات پر طرح طرح سے حملے کیے ہیں۔ کارلائل نے اس کو "گاسپل آف میمونزم" یا "کتاب قارونیت" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

معاشیات درحقیقت ایسی کتاب نہیں ہے جس کے پڑھنے سے "قارونیت" کی ترغیب ہوتی ہے۔ معاشیات کے متعلق یہ خیال کہ وہ دولت پرستی، کنجوسی یا خودغرضی کا علم ہے، صحت پر مبنی نہیں۔ اس کے بارے میں یہ بدظنی محض غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ ابتداءً یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کا نفس مضمون یا موضوع بحث صرف دولت ہے۔ لیکن معاشیات کا براہ راست اور حقیقی نفس مضمون دولت نہیں بلکہ انسانی احتیاجات اور ان کی بہتر طریق پر تکمیل ہے۔ دولت کو اس میں شک نہیں کہ معاشیات سے بہت قریبی تعلق ہے لیکن یہ براہ راست معاشیات کا نفس مضمون نہیں۔ معاشیات کو دولت سے بس یہی تعلق ہے کہ یہ انسانی احتیاجات کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معاشیات میں دولت پس انداز کرنے کے شرائط اور ذرائع پر بحث کی جاتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ معاشیات میں بہرصورت دولت جمع کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اگر ایک شخص اپنی ناگزیر احتیاجات کی پابجائی نہ کرکے دولت جمع کرے تو معاشیاتی نقطۂ نظر سے اس قسم کی پس اندازی کبھی جائز نہیں قرار دی جا سکتی۔

کیونکہ ناکافی اور غیر صحت بخش غذا، لباس اور مکان کی وجہ سے قوت کارگزاری متاثر ہوتی ہے
اور انسان قبل از وقت از کار رفتہ ہو کر پیدائش کے کاروبار میں حصہ لینے سے محروم ہو جاتا
ہے۔ چونکہ اس قسم کی پس اندازی سے بجائے فائدے کے بالآخر نقصان ہوتا ہے اس لیے
ایسے غیر معاشی پس اندازی کہیں گے۔ معاشیات کا اصل مقصد دولت جمع کرنے کی ترغیب دینا
نہیں بلکہ دولت کی بہتر پیدائش، بہتر تقسیم، بہتر مبادلہ اور بہتر صرف کے اصول اور نظریے
پیش کرنا اور بحیثیتِ مجموعی بنی نوع انسان کی عام مادی خوشحالی کے اسباب کی تشریح و توضیح کرنا ہے۔

(۴) معاشیات کے مباحث

مادی زندگی کو خوشحال بنانے کے لیے چونکہ دولت کی مناسب مقدار ناگزیر ہے
اس لیے ابتداءً معاشیات میں اُن مختلف امور پر بحث کی جاتی ہے جن کے ذریعہ کم سے کم
مصارف میں زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کی جاسکتی ہے۔ جس شعبہ میں دولت کی پیدائش
اور اس کی زیادتی کے اسباب پر بحث کی جاتی ہے اُسے اصطلاحاً "پیدائش دولت" کا شعبہ کہتے ہیں۔

معاشیات کے مباحث کا دوسرا شعبہ "تقسیم دولت" ہے۔ فرض کیجئے ایک کارخانے میں
جملہ (۱۰۰۰) روپے کی مصنوعات فروخت ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام قیمت کارخانہ دار کی
جیب میں نہیں جاسکتی۔ کیونکہ مصنوعات کی تیاری میں ایک طرف تو زمین سے مدد لی گئی، دوسری
طرف سرمایہ سے، تیسری طرف مزدوروں سے اور چوتھی طرف خود کارخانہ دار نے منتظم کی حیثیت
سے کام کیا۔ لہذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ قیمت (یعنی ۱۰۰۰ روپے) میں سے زمین،
مزدور اور سرمایہ کا کس قدر معاوضہ ہوگا اور کارخانہ دار کو کتنی رقم ملنی چاہیے۔ زمین کے
حصے کو لگان یا کرایہ کہتے ہیں، مزدوروں کا حصہ اُجرت کہلاتا ہے، سرمایہ کے حصے کو سود
کہتے ہیں اور کارخانہ والے کا معاوضہ منافع کہلاتا ہے۔ تقسیم دولت کے شعبہ میں اُن اصول
اور نظریوں کی تشریح کی جاتی ہے جن کے تحت اُجرت، سود، لگان اور منافع کا تعین ہوتا ہے۔

معاشیات کے مباحث کا تیسرا شعبہ "مبادلہ دولت" کہلاتا ہے روزمرہ زندگی میں

ہم اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ کاشت کار۔ جلاہے۔ بڑھئی۔ لوہار اور معمار وغیرہ بالعموم اپنی محنت کے نتیجے (یعنی مصنوعات) سے براہ راست خود مستفید نہیں ہوتے بلکہ انہیں دوسروں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ حاصل شدہ قیمت سے مختلف اشیاء خرید کر اپنی گوناگوں احتیاجات رفع کرتے ہیں۔ مبادلۂ دولت کے شعبہ میں یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ افراد کو مبادلہ کی ضرورت کیوں لاحق ہوتی ہے؟ اس سے کس قسم کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مبادلہ کے کاروبار کیونکر عمل میں آتے ہیں لیکن مختلف اداروں کی بدولت مبادلے کے کاروبار میں سہولت بہم پہنچتی ہے۔ اشیاء کی قیمتیں کیونکر معین ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

معاشیات کے مباحث کا چوتھا شعبہ "صرف دولت" ہے۔ اس شعبہ میں احتیاجات کی نوعیت اور ان کی خصوصیات پر بحث کی جاتی ہے اور اُن اصول و قوانین کی تشریح کی جاتی ہے جن پر ہم دولت صرف کرتے وقت عمل کرتے ہیں۔ معاشیات کے مختلف مباحث میں صرف دولت کا شعبہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جدید معاشئین اسے سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اسی کو معاشیات کے تمام مباحث کا مرکز اور محور بتاتے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ صرف دولت کی احتیاج کی وجہ سے ہمیں دولت پیدا کرنے، تقسیم کرنے اور اس کا مبادلہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ عام مرفہ الحالی اور خوشحالی کے نقطۂ نظر سے معاشیات کے مباحث کا ہر شعبہ اپنی اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان سب شعبہ جات کے مسائل براہ راست یا بالواسطہ جزوی یا کلی طور پر ہماری معاشی زندگی کی خوشحالی سے متعلق ہوتے ہیں۔ معاشیات کا حقیقی مقصد بنی نوع انسان کی معاشی خوشحالی ہے۔ اسی مقصد کے پورا کرنے کے لئے اس میں دولت کی پیدائش، تقسیم، مبادلے اور صرف پر بحث کی جاتی ہے۔ کیونکہ جب تک دولت کی معقول مقدار پیدا نہ کی جائے یا اس کی مناسب تقسیم نہ ہو اس کے مبادلے کا بہتر انتظام نہ کیا جائے یا صرف کا طریقہ ٹھیک نہ ہو تو پھر معاشیات سے حقیقی مقصد بطور احسن نہیں پورا ہوسکتا۔

مذکورہ چار شعبوں کے علاوہ معاشیات کے مباحث کا ایک اور شعبہ بھی ہے جس کو "مالیات" یا فینانس کہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ کسی ملک کے باشندوں کی مرفہ الحالی کو حاصل کرنے اسے برقرار رکھنے یا اس میں اضافہ کرنے میں حکومت کی جد وجہد کو بہت بڑا دخل ہے۔ ملک میں امن وامان قائم رکھنے کے لئے فوج اور پولیس رکھنی پڑتی ہے۔ علوم وفنون کی اشاعت کے لئے وسیع پیمانے پر مدارس قائم کرنے پڑتے ہیں۔ زراعت۔ صنعت وحرفت۔ تجارت اور نقل وحمل کی ترقی کے لئے گوناگوں تدابیر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام امور کی تکمیل کے لئے حکومت کو آمدنی کی ضرورت ہوگی۔ لہذا حکومت مختلف قسم کے محاصل اور ٹکس عاید کرکے آمدنی حاصل کرتی ہے اور اسے رعایا کی مرفہ الحالی اور خوشحالی پر صرف کرتی ہے۔ مالیات کے شعبہ میں یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ حکومت کے معاشی فرائض کیا ہیں۔ ان فرائض کو انجام دینے کے لیے حکومت کن مختلف ذرائع سے آمدنی حاصل کرتی اور کن مدات پر صرف کرتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر مالیات میں ان مسائل پر بحث کی جاتی ہے جو حکومت کے ذرائع آمدنی اور خرچ سے متعلق ہوں۔

(۵) معاشیات کی قسمیں

معاشیات کے متعلق یہ معلوم کرنے کے بعد کہ یہ کس قسم کا علم ہے۔ اس کا نفس مضمون یا موضوع بحث کیا ہے۔ اس کے مباحث کو کن مختلف شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے ——— اس کی قسموں کا مختصر تذکرہ بھی ضروری ہے۔ مسائل کی نوعیت کا لحاظ کرتے ہوئے معاشیات کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں (۱) نظری معاشیات اور (۲) عملی معاشیات۔ نظری معاشیات کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معاشی قوتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ معاشی رجحانات کی تشریح وتوضیح کی جاتی ہے۔ اور معاشی خوشحالی کے اصول اور نظریے پیش کئے جاتے ہیں نظری معاشیات کا کام اس امر کی وضاحت کرنا ہے کہ "کیا ہے"۔ برعکس اس کے "کیا ہونا چاہیے" کا مسئلہ نظری معاشیات کے مباحث سے خارج ہے۔ نظری معاشیات میں

معاشی قوتوں، اصول و قوانین اور نظریوں کو بیان کیا جاتا ہے لیکن معاشی اصلاح کے متعلق کسی قسم کی رائے زنی نہیں کی جاتی۔ "کیا ہونا چاہیے" کا مسئلہ عملی معاشیات سے متعلق ہے۔ عملی معاشیات کو معاشی اصول، قوانین اور نظریوں کی تحقیق اور ترتیب سے سروکار نہیں ہوتا بلکہ اس میں عملاً معاشی مسائل کو حل کرنے اور معاشی زندگی کے روزمرہ الجھے ہوئے حالات کو سلجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر نظری معاشیات "کیا ہے" سے بحث کرتی ہے تو عملی معاشیات میں "کیا ہونا چاہیے" سے بحث کی جاتی ہے۔ عام طور پر "کیا ہے" کا مسئلہ اتنا اہم نہیں معلوم ہوتا جتنا کہ "کیا ہونا چاہیے" کا۔ اسی لحاظ سے بظاہر نظری معاشیات سے زیادہ عملی معاشیات اہم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ہم ایک کو زیادہ اہمیت دے کر دوسری کو زیادہ گھٹا نہیں سکتے۔ معاشیات کا حقیقی مقصد یعنی بنی نوع انسان کی عام معاشی خوشحالی، اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ نظری اور عملی معاشیات سے مدد نہ لی جائے جس طرح کپڑے کی تراش کے لیے قینچی کے دونوں پھاڑوں کا اشتراک ناگزیر ہے اسی طرح معاشی مسائل کی تحلیل کے لیے نظری اور عملی معاشیات کا اشتراک ضروری ہے جس طرح ڈاکٹر جراحی کے اصول اور طریقوں سے واقف ہوئے بغیر کامیاب اپریشن نہیں کر سکتا اسی طرح ایک مصلح معیشت نظری معاشیات کے اصول و قوانین کو جانے بغیر معاشی اصلاح کا معقول اور متوازن پروگرام نہیں مرتب کر سکتا۔ نظری معاشیات سے نا واقف شخص کے ہاتھ میں معاشی اصلاح کا پورا اقتدار دے دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک اناڑی کے ہاتھ میں عمل جراحی کے آلات و اوزار کا پکڑا دینا۔

(۶) معاشیاتِ ہند

معاشیاتِ ہند عملی معاشیات ہے۔ اس کا مقصد ہندوستانی باشندوں کی مادّی زندگی کو خوش حال بنانا ہے۔ سہولت کی خاطر نظری معاشیات کے مباحث کی طرح معاشیاتِ ہند کے مباحث کو بھی چار عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ہندوستان اور پیدائش دولت (۲) ہندوستان اور تقسیم دولت (۳) ہندوستان اور مبادلہ دولت (۴) ہندوستان اور صرف دولت۔

پہلے عنوان کے تحت یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ یہاں کے وسائل معاش کیا ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہاں کی زمینات۔ دریا۔ پہاڑ۔ آبشار۔ جنگلات۔ معدنیات اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کا معاشی افادیت کے نقطۂ نظر سے تفصیلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ نیز یہاں کی آبادی کے تفصیلی حالات، بلحاظ تعداد اور بلحاظ قسم ـــــ معلوم کئے جاتے ہیں۔ پیدائش دولت کے مختلف طریقوں مثلاً زراعت۔ صنعت وحرفت۔ تجارت اور نقل وحمل کے بھی مکمل حالات معلوم کئے جاتے ہیں۔ ان میں جو خرابیاں ہیں ان کے اسباب دریافت کئے جاتے ہیں اور انھیں دور کرنے کی تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ اس عنوان کے تحت اُن تمام امور پر بحث کی جاتی ہے جن کے ذریعہ ملک کے وسائل سے ممکنہ استفادہ کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کی جا سکتی ہے۔

دوسرے عنوان کے تحت یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں سالانہ کس قدر دولت پیدا ہوتی ہے! اگر اس دولت کو یہاں کی جملہ آبادی پر تقسیم کیا جائے تو فی کس سالانہ کس قدر اوسط آمدنی ہوتی ہے۔ دیگر ممالک کے مقابلہ میں یہاں کی اوسط آمدنی کا کیا حال ہے۔ مزدوروں کی اُجرتوں، حکومت اور زمین داروں کی اراضیات کے معاوضے یعنی مالگزاری اور لگان کے تفصیلی حالات اسی شعبہ میں معلوم کئے جاتے ہیں۔ سرمایہ داروں کی آمدنی یعنی سود، کارخانہ داروں کی آمدنی یعنی منافع کی نوعیت بھی اسی شعبہ میں معلوم کی جاتی ہے۔

تیسرے عنوان کے تحت تین امور کی تشریح کی جاتی ہے۔ پہلا یہ کہ یہاں کے آلات مبادلہ کیا ہیں۔ دوسرے یہ کہ مبادلہ کے کاروبار میں کن مختلف اداروں کے ذریعہ سہولت بہم پہنچ رہی ہے۔ تیسرے یہ کہ یہاں پر مختلف سنین یا مختلف ادواریں قیمتوں کا کیا حال رہا ہے۔

آلات مبادلہ سے مراد وہ مختلف سکے اور نوٹ ہیں جن کے ذریعہ اشیاء کی خرید و فروخت ناگزیر مدد ملتی ہے۔ ہندوستان میں سکے اور نوٹوں کے استعمال کی موجودہ نوعیت، ان کے

استعمال کی ابتدا اور نشو و نما کا تفصیلی حال معلوم کیا جاتا ہے۔

مبادلے کے کاروبار میں سہولت بہم پہنچانے والے اداروں سے ہماری مراد بنک ہیں۔ یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں نظام بنک کاری کی موجودہ نوعیت کیا ہے۔ یہاں پر کن مختلف اقسام کے بنک کام کر رہے ہیں۔ ان کا باضابطہ آغاز کب ہوا اور اس کے بعد سے ان کی نشو و نما کا کیا حال رہا ہے مختصر یہ کہ ہندوستان میں زر۔ بنک اور قیمتوں کے تفصیلی حالات اسی شعبہ میں معلوم کئے جاتے ہیں۔

صرف دولت کے شعبہ میں یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ ہندوستانی باشندے کس قسم کی غذا لباس اور مکان استعمال کرتے ہیں۔ بلحاظ قسم اور بلحاظ مقدار ان کی کیا نوعیت ہے مستعملہ اشیاء کے لحاظ سے ان کے معیار رہائش کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اگر معیار رہائش مقابلتاً ادنیٰ اور معمولی ہے تو اس کے اسباب معلوم کئے جاتے ہیں اور اسے بلند کرنے کی تدابیر پیش کی جاتی ہیں۔

معاشیات ہند کے مباحث کا ایک اور شعبہ مالیات ہے۔ اس شعبہ میں یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ حکومت ہند کے ذرائع آمدنی کیا ہیں۔ ان سے سالانہ کس قدر آمدنی ہوتی ہے اور حکومت اس آمدنی کو باشندوں کی فلاح و بہبود پر کیونکر صرف کرتی ہے۔ مالگزاری۔ انکم ٹکس۔ کروڑگیری چنگی۔ سرکاری قرضہ جات وغیرہ کا تفصیلی حال اسی شعبہ میں معلوم کیا جاتا ہے اور بجٹ کی بہتر ترتیب پر بحث کی جاتی ہے۔

معاشیات کے متعلق اب تک جن مختلف امور کی توضیح کی گئی اس سے اندازہ ہوگا کہ معاشیات کس قسم کا علم ہے۔ اس کا نفس مضمون یا موضوع بحث کیا ہے۔ اس کے مباحث کی تقسیم کیوں کر کی گئی ہے۔ اس کی قسمیں کیا ہیں۔ معاشیات ہند سے کیا مراد ہے اور اس میں کن مختلف امور پر بحث کی جاتی ہے۔ اب ہم اس علم کی مختصر تاریخ بھی بیان کریں گے تاکہ اس کے متعلق اہم ابتدائی امور ذہن نشین ہو جائیں۔

(۷) معاشیات کی ابتدا اور نشو و نما

معاشیات ایک جدید علم ہے اس کی ابتدا وسط اٹھارھویں صدی سے ہوتی ہے۔ لیکن عہد قدیم میں بھی مختلف عالموں نے اپنے مضامین اور کتابوں میں معاشی خیالات کا اظہار کیا ہے چنانچہ یونان کے مشہور فلسفی افلاطون۔ زنوفن اور ارسطو نے اپنی تصانیف میں معاشی خیالات کا اظہار کیا ہے اسی طرح رومی فلسفیوں مثلاً سسرو، سینیکا اور پلینی اعظم وغیرہ کی تصانیف میں بھی معاشی مباحث ملتے ہیں۔ نیز رومی مقننوں نے بھی معاشی مسائل کے متعلق اظہار خیال کیا ہے اس میں شک نہیں کہ قدیم مفکرین نے معاشیات کو علمی بنیادوں پر نہیں قائم کیا تاہم معاشیات کی تاریخ کے بیان کرتے وقت ان کی خدمات کو خواہ وہ کس قدر معمولی کیوں نہ ہوں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سولھویں صدی سے لے کر وسط اٹھارویں صدی کا زمانہ معاشیات کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے اس دور کو عہد تجاریت کہا جاتا ہے اس زمانے میں جن عالموں نے معاشی خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں تجاریین یا مرکنٹیلسٹ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ علمار ملک کی مادی ترقی کے لئے تجارت پر بہت زور دیتے تھے اس لئے انھیں تجاریین کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تھامس من۔ ولیم پٹی اور جوشیا چائلڈ وغیرہ ممتاز تجاریین گزرے ہیں۔ تجاریین کے اہم خیالات یہ تھے — (۱) جہاں تک ہو سکے ملک میں سونا چاندی زیادہ سے زیادہ مقدار میں جمع رکھے جائیں۔ (۲) ملک کے باشندوں کو چاہیے کہ وہ جس قدر اشیاء دوسرے ممالک سے اپنے ہاں منگواتے ہیں ان سے زیادہ اشیاء اپنے ملک سے دیگر ممالک کو روانہ کریں تاکہ ملک میں سونے چاندی کی درآمد ہو سکے۔ (۳) یہ لوگ صنعت کو زراعت پر غیر ضروری ترجیح دیتے تھے۔ (۴) چونکہ آبادی قومی طاقت کا ایک عنصر ہے لہذا اس خیال کے حامی تھے کہ ملک کی آبادی زیادہ سے زیادہ ہو۔ (۵) ہر قسم کی ترقی کے لئے حکومت کی امداد ضروری تصور کرتے تھے۔

وسط اٹھارویں صدی میں معاشی مفکرین کا ایک اور گروہ نمودار ہوا جس کو فطر آئین یا

فزیوکراٹس کہتے ہیں معاشیات کی ترقی میں فطرائین کی خدمات بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ انھیں باتیان معاشیات کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ چونکہ فطرائین قانون فطرت کے حامی تھے لہذا انھیں فطرائین کہنا مناسب سمجھا گیا۔ کوئینے۔ گورنے اور ترگو اہم فطرائین گذرے ہیں۔ فطرائین کے اہم خیالات یہ تھے (۱) انسان اپنی ہر جد وجہد میں کسی خود ساختہ نظام کے تابع نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک قدرتی نظام پر عمل کرتے ہیں۔ اس قدرتی نظام کو وہ "قانون فطرت" کہتے تھے (۲) ان کے نزدیک حکومت کا کام بس اسی قدر تھا کہ وہ رعایا کی جان و مال اور آزادی کی حفاظت کرے اور دیگر معاملات میں مداخلت نہ کرے۔ فطرائین عدم مداخلت کی پالیسی کے حامی تھے اور یہ اصطلاح انھیں کی ساختہ ہے۔ (۳) ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت زراعت کو حاصل تھی اور وہ یہ کہتے تھے کہ زراعت ہی ایک ایسا پیشہ ہے جس کے ذریعہ ہر سال دولت پیدا ہوتی ہے اور اس سے تمام قوم کی کفالت ہوتی ہے۔ (۴) زراعت کے ذریعہ جس قدر دولت پیدا ہوتی ہے وہ تمام افراد قوم کے مابین تقسیم ہوتی ہے۔ اسی بناء پر وہ صرف زراعت کو پیدا آور پیشہ تصور کرتے تھے۔ دیگر پیشے ان کے نزدیک غیر پیدا آور تھے یعنی ان پیشوں سے کسی قسم کی جدید دولت نہیں پیدا ہوتی۔ (۵) چونکہ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ صرف زراعت ہی کے ذریعہ ہر سال جدید دولت پیدا ہوتی ہے لہذا ٹکس بھی صرف زراعت ہی پر عاید کیا جانا چاہیے۔ فطرائین کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے پیشرووں کے غلط خیالات پر تنقید کی اور اس کی بدولت معاشیات کو ترقی ہوئی۔

معاشی تاریخ میں جو نام سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے وہ آدم اسمتھ (۱۷۲۳ء تا ۱۷۹۰ء) کا ہے۔ اس نے ۱۷۷۶ء میں ایک مشہور کتاب "دولت اقوام" لکھی۔ یہ کتاب دو جلدوں میں لکھی گئی ہے جس میں ۵ حصے اور بحیثیت مجموعی (۳۲) ابواب ہیں۔ پہلے حصہ میں اس نے ان امور پر بحث کی ہے جن کے ذریعہ افراد کی دولت پیدا کرنے کی قابلیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ بھی بتلایا ہے کہ جب زمین۔ مزدور اور سرمایہ وغیرہ کی اجتماعی جد وجہد سے دولت پیدا

کی جائے تو پیدا شدہ دولت مذکورہ ارکان کے مابین کیوں کر تقسیم ہوگی ۔ دوسرے حصہ میں سرمایہ کی ماہیت پر بحث کی گئی ہے ۔ نیز یہ بتلایا گیا ہے کہ سرمایہ کے اجتماع کے لئے کن حالات کا ہونا ضروری ہے اور جمع کیا ہوا سرمایہ مختلف کاروبار میں کیوں کر مشغول کیا جا سکتا ہے ۔ تیسرے حصے میں یہ بتلایا گیا ہے کہ قوموں کی دولت مندی کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں ۔ اگر ان پر مصنوعی تحدیدات عاید کی جائیں تو اس کے کیا نتائج برآمد ہوں گے ۔ شہروں اور دیہاتوں کے مابین تجارت کے مفید نتائج پر بھی اسی حصے میں بحث کی گئی ہے ۔ چوتھی کتاب میں اس نے اپنے پیش رو مفکرین یعنی تجارئین کے اہم نظریات کو مختلف دلائل کے ذریعہ غلط ثابت کیا ہے ۔ پانچویں کتاب میں حکومت کی آمدنی کے ذرائع اور مدات خرچ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے ۔

"دولت اقوام" کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کا ترجمہ دنیا کی تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانوں میں ہو چکا ہے ۔ خود آدم اسمتھ کے زمانے میں یہ کئی مرتبہ چھپ چکی تھی ۔ اس کتاب کا اس زمانے کے سیاست دانوں پر بہت گہرا اثر پڑا اور اس کا شمار دنیا کی بڑی کتابوں میں ہوتا ہے ۔ یہی کتاب درحقیقت علم معاشیات کا سنگ بنیاد ہے ۔ اس کی تصنیف کے ذریعہ چونکہ آدم اسمتھ نے معاشیات کو علمی بنیادوں پر قائم کیا لہذا اُسے معاشیات کا باوا آدم کہا جاتا ہے ۔

آدم اسمتھ کے بعد دوسرے اہم نام بنتھم اور مالتھس کے ہیں ۔ جرمی بنتھم (۱۷۴۸ء تا ۱۸۳۲ء) نے معاشیات پر مختلف کتابیں اور رسالے لکھے ہیں ۔ ان میں "ربا کی وکالت" بہت مشہور ہے ۔ بنتھم ایک معاشی سے کہیں زیادہ ایک فلسفی تھا لیکن اس کے باوجود اس نے معاشیات کی ترقی میں جو اہم خدمت انجام دی ہے اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ۔

روبرٹ مالتھس (۱۷۶۶ء تا ۱۸۳۴ء) کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ اس نے عوام کی توجہ ایک ایسے مسئلہ کی جانب منعطف کرائی جو معاشی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے ۔ یہ مسئلہ آبادی کا ہے ۔ ۱۷۹۸ء میں اس نے آبادی پر ایک مضمون شائع کیا ۔ اس کی اشاعت کے بعد وقتاً فوقتاً اس میں مختلف قسم کی تبدیلیاں کی گئیں چنانچہ اسی مضمون کو جدید شکل میں ۱۸۰۳ء میں پیش کیا گیا ۔ اس مرتبہ اُس کا نام "اصول آبادی"

رکھا گیا۔ مالتھس کے اس مضمون کو بہت اہمیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس کی زندگی میں کوئی چھ مرتبہ اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ آخری مرتبہ یہ مضمون ۱۸۲۶ء میں شائع ہوا اور آج کل یہی نسخہ باقی ہے۔ نہایت مختصر طور پر ہم مالتھس کے نظریۂ آبادی کو اس طرح بیان کرسکتے ہیں "جس رفتار سے آبادی میں اضافہ ہوتا ہے اس رفتار سے ذرائع معاش میں زیادتی نہیں ہوتی۔ لہٰذا ایسی صورت میں آبادی کی روک تھام کے لئے اگر اخلاقی ضبط (مثلاً شادیاں دیر سے کرنا اور ساتھ ہی ساتھ ناجائز طریق پر جنسی جذبات کی تکمیل سے احتراز کرنا) سے کام نہ لیا جائے تو دوسرے ذرائع مثلاً مختلف قسم کی بیماریوں، قحطوں، زلزلوں اور جنگ وجدال وغیرہ کی بدولت خود بخود آبادی میں مناسب تخفیف ہوگی"۔ آبادی کے اس نظریہ کو چونکہ مالتھس کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ مالتھس ہی نے سب سے پہلے اس نظریہ کو پیش کیا۔ مالتھس سے قبل وقتاً فوقتاً مختلف مفکرین نے اس مسئلہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن مالتھس کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے اس نظریہ کو سب سے پہلے منظم اور مدلل طریقے پر پیش کیا۔ اسی بناء پر اس نظریہ کو مالتھس کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

مالتھس کے بعد دوسرا اہم معاشی ڈیوڈ ریکارڈو (۱۷۷۲ء تا ۱۸۲۳ء) گذرا ہے۔ ریکارڈو آدم اسمتھ کا پیرو تھا۔ معاشی مسائل کے متعلق اس نے بہت سے مضامین اور کتابچے لکھے ہیں لیکن اس کی سب سے اہم تصنیف "اصول معاشیات" ہے۔ اس کتاب میں ریکارڈو نے مختلف معاشی مسائل پر بحث کی ہے۔ لیکن ان میں مسئلہ لگان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ریکارڈو کے مسئلہ لگان کا خلاصہ یہ ہے "استعمال زمین کی بناء پر کاشتکار جو معاوضہ زمیندار کو ادا کرتا ہے وہ لگان ہے۔ اور یہ لگان قیمت پیداوار میں سے جملہ مصارف کاشت منہا کرنے کے بعد جو کچھ بچ رہے اس کے مساوی ہوتا ہے۔" تجارت بین الاقوام اور زر وغیرہ کے متعلق بھی ریکارڈو نے قابل قدر خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ریکارڈو کے بعد جیمس مل اور میکلاک کے نام قابل ذکر ہیں لیکن ان میں زیادہ

اہمیت ناسو ولیم سینیر (۱۷۹۱ء تا ۱۸۶۴ء) کو حاصل ہے۔ اس کی ایک مشہور کتاب اصول معاشیات کا خاکہ ۱۸۳۶ء میں شائع ہوئی۔ سینیر کے بیان کردہ مسائل میں نظریۂ سود کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ سود کے متعلق اس نے "اجتناب کا نظریہ" پیش کیا، وہ کہتا ہے کہ سود اجتناب کا معاوضہ ہے۔ اجتناب سے مراد رقم جمع کرنے والوں کا یہ فعل ہے کہ وہ اپنی موجودہ احتیاجات میں سے چند کی تکمیل کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اور رقم جمع کرتے ہیں۔

تاریخ معاشیات میں دوسرا اہم نام جان اسٹورٹ مل (۱۸۰۶ء تا ۱۸۷۳ء) کا ہے۔ مل کی اہم کتاب "اصول معاشیات" ہے۔ مل کا مقصد دراصل ایسی تصنیف پیش کرنا تھا جو عام استعمال میں آدم اسمتھ کی کتاب "دولت اقوام" کی جانشین بن جائے۔ اگرچہ مل اس تدبیر میں ناکام رہا تاہم اس کی خدمات اس قدر اہم ہیں کہ آدم اسمتھ کے بعد اُسے دنیا کے بڑے معاشیین میں جگہ دی جانی چاہیئے۔ تعین اُجرت کے متعلق اس کا ایک نظریہ بہت مشہور ہے جسے "نظریۂ اجرت فنڈ" کہتے ہیں۔ اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے ہر ملک میں مزدوروں کی اجرتیں ادا کرنے کے لئے سرمایہ کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے۔ اس ذخیرہ کے مقابلے میں مزدوروں کی تعداد جس قدر زیادہ ہوگی اجرتوں کی شرح میں کمی ہوگی۔ اس کے برعکس مزدوروں کی تعداد جس قدر کم ہوگی اسی لحاظ سے اجرتوں کی شرح بھی زیادہ ہوگی۔ موجودہ زمانے میں یہ نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے تاہم اسے تاریخی اہمیت ضرور حاصل ہے۔

مذکورہ معاشیین کے علاوہ وقتاً فوقتاً اور بھی بہت سے مشہور معاشیین گذرے ہیں انھوں نے اپنی مختلف تصانیف کے ذریعہ معاشیات کی ترقی میں حصہ لیا۔ ان معاشیین میں حسب ذیل نام اہم ہیں۔ (۱) کیری۔ لستا۔ سے۔ راؤ۔ فان تھیونن سسمنڈی۔ مل۔ فریڈرک لسٹ۔ لاڈرڈیل اور فان ہرمن وغیرہ۔

(۲) راڈبرٹس۔ لاسیل اور کارل مارکس وغیرہ۔

(۳) رچرڈ جونس۔ ڈاکٹر بجھٹ۔ انگرام اور ٹائن بی وغیرہ۔

(۴) رو شر۔ ہلڈی براناڈ۔ کارل کینز۔ شالرا ورشفلے وغیرہ۔

(۵) تھامسن۔ جیونس اور والراس وغیرہ۔

(۶) منجر۔ وینرز اور بہوہم بارک وغیرہ۔

جدید معاشیین میں ڈاکٹر مارشل (سنہ ۱۸۴۲ء تا سنہ ۱۹۲۴ء) کا نام بہت اہمیت رکھتا ہے۔ قدیم معاشیین میں جو اہمیت آدم اسمتھ کو حاصل ہے جدید معاشیین میں تقریباً وہی اہمیت ڈاکٹر مارشل کو حاصل ہے اسی بنا پر ڈاکٹر مارشل کو جدید معاشیات کا بانی کہا جاتا ہے۔ مارشل کی سب سے اہم تصنیف "اصول معاشیات" ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی۔ اسے طبع ہو کر کوئی پچاس سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے لیکن اب بھی اسے بہت ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس کو مختلف جامعات میں نصابی کتاب کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ مارشل کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ اس نے قدیم نظریات کو جدید حالات کی روشنی میں صحت اور عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر مارشل کے بعد پیلگریو۔ پیگو۔ وکسٹیڈ۔ وکسل۔ ہکس۔ رابرٹسن۔ ہابسن۔ ہنڈرسن۔ رابنس۔ کینس اور گریگری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر گریگری اس وقت ہندوستان کے معاشی مشیر ہیں۔ مذکورہ معاشیین کے علاوہ پیٹن۔ اڈمس سیلگمن۔ ٹاسگ۔ فشر۔ ایلی۔ کارور۔ ٹیلر۔ ڈیونپورٹ اور سیگر بھی اہمیت رکھتے ہیں۔

(۸) عہد حاضرہ میں معاشیات کی اہمیت

پچھلے چند صفحات میں معاشیات کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس علم کی ابتدا ہو کر ابھی بہت زمانہ نہیں گزرا۔ اگر آدم اسمتھ کی کتاب "دولت اقوام" کی اشاعت (سنہ ۱۷۷۶ء) سے اس علم کی باضابطہ ابتدا کا دور شمار کیا جائے تو پھر اس کی عمر صرف ڈیڑھ سو سال سے کچھ زیادہ نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود موجودہ زمانے میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہو گئی ہے اور ہوتی جا رہی ہے۔ یوں تو تمام عمرانی علوم انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان سے ہمیں ناقابل انکار

مددملتی ہے لیکن معاشیات براہ راست ایک ایسے پہلو کا مطالعہ کرتا ہے جسے زمانۂ قدیم سے لے کر اب تک ہر زمانے اور ہر دور میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے ۔ اس پہلو سے ہماری مراد انسانی زندگی کا معاشی پہلو ہے ۔ تہذیب اور شائستگی کے ابتدائی دور میں زندگی کے جہاں اور مسائل سیدھے سادے اور معمولی تھے معاشی مسائل بھی کچھ پیچیدہ نہ تھے ۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ خاندانی زندگی قبیلہ واری زندگی میں اور قبیلہ واری زندگی قومی زندگی میں تبدیل ہو گئی ہے ۔ موجودہ زمانے میں ذرائع نقل و حمل اور ذرائع خبر رسانی کی غیر معمولی ترقی کی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات بھی بہت وسیع اور مستحکم ہو چکے ہیں ۔ لہٰذا اب ہماری زندگی بہت بڑی حد تک بین الاقوامی ہو گئی ہے ۔ معاشرتی تعلقات کی اس ترقی کی وجہ سے معاشیات کے مسائل خاندانی، قبیلہ واری یا قومی معیشت تک محدود نہیں رہے بلکہ ان کا دائرہ بین الاقوامی معیشت تک وسیع ہو گیا ہے ۔ بحیثیت مجموعی آبادی کے اضافے، ذرائع معاش کی قلت ۔ معاشی کش مکش کی شدت نے خاندانی، قبیلہ واری، قومی اور بین الاقوامی معیشت کے نقطۂ نظر سے نئے نئے اور پیچ در پیچ مسائل پیدا کر دیے ہیں ۔ ان تمام مسائل کا مطالعہ اور تحلیل کوئی آسان کام نہیں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ معاشیات کے مباحث کا دائرہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے ۔ اس کے لٹریچر میں دن بدن ترقی ہو رہی ہے اور اسی مناسبت سے اس کی اہمیت بھی بڑھتی جا رہی ہے ۔ موجودہ زمانے میں معاشیات کی نمایاں اہمیت کا حقیقی سبب معاشی کش مکش کی شدت اور زیادتی ہے ۔ معاشیات کا مطالعہ نہ صرف بین الاقوامی اور قومی نقطۂ نظر سے مفید رہے بلکہ اس کے ذریعہ خاندانی معیشت کو بھی بہت کچھ بہتر بنایا جا سکتا ہے ۔

(۹) کنن کی کتاب مبادی معاشیات[1]

ایڈون کنن (۱۸۶۱ء تا ۱۹۳۵ء) کی کتاب ایلیمنٹری پولیٹیکل اکانمی پہلی مرتبہ ۱۸۸۸ء میں

---

[1] ادارۂ ادبیات اردو کی ایما کے مطابق نقاریر کا ایک حصہ ایڈون کنن کی کتاب ایلیمنٹری پولیٹیکل اکانمی پر مشتمل تھا۔ یہ کتاب ادارے کے اردو فاضل کے طلبا کے نصاب میں شریک ہے ۔ ابتدائی معلومات کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا ۔

شائع ہوئی اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اس کی طباعت ہوتی رہی۔ مبادی معاشیات" کے نام سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدر جامعہ ملیہ نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ کنن نے مذکورہ کتاب میں بتلایا ہے کہ "معاشیات کا اصل مقصد بنی نوع انسان کی مادّی خوش حالی کے اسباب کی تشریح و توضیح کرنا ہے۔" خوش حالی کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (الف) عام خوش حالی اور (ب) انفرادی خوش حالی۔ کتاب کے پہلے حصے میں عام خوش حالی پر بحث کی گئی ہے۔ اور دوسرا حصہ انفرادی خوش حالی سے متعلق ہے۔ انفرادی خوش حالی اور عام خوش حالی کے حاصل کرنے میں کسی ملک کی حکومت کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ لہٰذا اس اہمیت کے پیش نظر کتاب کے تیسرے حصے میں خوش حالی اور حکومت کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم ابتداً عام خوش حالی پر بحث کریں گے۔

(۱۰) پہلا حصہ۔ عام مادّی خوش حالی

عام مادّی خوش حالی کا مفہوم عرف عام میں اُس قوم کو خوش حال سمجھا جاتا ہے جس کے پاس مجموعی طور پر زیادہ سے زیادہ دولت ہو لیکن کسی قوم کی خوش حالی کا یہ معیار صحیح نہیں۔ ایک ملک اپنی مجموعی دولت کے نقطۂ نظر سے کس قدر فوقیت کیوں نہ رکھے اس کو اس وقت تک خوش حال نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ اس ملک میں تقسیم آمدنی کا کیا حال ہے۔ فرض کیجئے دو ملک ہیں۔ ہر دو کی آبادی مساوی ہے اور ہر دو کی مجموعی دولت بھی مساوی ہے۔ یہ بھی فرض کیجئے کہ ایک ملک کی مجموعی دولت کا ۳/۴ حصہ مجموعی آبادی کے ۱/۴ حصے کے ہاتھ میں ہے اور دوسرے ملک کی مجموعی دولت تمام باشندوں کے مابین بڑی حد تک مساوی مساوی طور پر منقسم ہے۔ اس صورت میں پہلے ملک کے مقابل دوسرے ملک کو خوش حال سمجھا جائے گا۔ گو کہ پہلے ملک میں بھی اُسی قدر دولت ہے جس قدر کہ دوسرے ملک میں۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ پہلے ملک میں دولت کی تقسیم انتہائی درجہ ناقص ہے اور دوسرے ملک میں

مناسب ہے۔ اگر کسی ملک کی آبادی کا محدود حصہ آرام و آسایش کی زندگی بسر کرے اور باقی افراد مصیبت اور کوفت کی زندگی بسر کریں تو ایسا ملک خوش حال نہیں کہلایا جا سکتا۔ کسی ملک کی خوش حالی کے لئے دیگر امور کے علاوہ دو اہم چیزیں ضروری ہیں۔ پہلا یہ کہ اُس ملک میں اس قدر دولت پیدا کی جانی چاہیئے کہ اس کے ذریعہ تمام ملک کے باشندے انسانوں کے شایان شان ایک معقول معیار آرام پر زندگی بسر کر سکیں۔ دوسرے یہ کہ پیدا شدہ دولت کی تقسیم بھی مناسب ہو۔ اگر دولت تو زیادہ پیدا کی جائے اور اس کی تقسیم غیر مساوی ہو تو اس کا مخالف اثر عام خوش حالی پر پڑے گا۔ باشندگان ملک کی ایک محدود تعداد دولت سے مستفید ہوگی اور باقی باشندے غربت۔ افلاس اور ناداری کی زندگی بسر کریں گے۔

دولت کی زیادتی کے شرائط

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ باشندگان ملک کی خوش حالی کے لئے دولت کی مناسب مقدار کا ہونا ضروری ہے تو پھر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا ذرائع ہیں جن کی بدولت ملک میں دولت کی مناسب مقدار پیدا کی جا سکتی ہے۔

(۱) وسائل قدرت ــــ دولت کی مناسب مقدار پیدا کرنے کے لئے سب سے پہلے وسائل قدرت یا وسائل معاش کا مناسب مقدار میں پایا جانا ضروری ہے۔ وسائل قدرت یا وسائل معاش سے مراد کسی ملک کے وہ تمام ذرائع معاش ہیں جو قدرت نے اس ملک کو عطا کئے ہیں۔ کسی ملک کی زمینات۔ دریا۔ پہاڑ۔ آبشار۔ جنگلات۔ معدنیات وغیرہ قدرتی وسائل میں شامل ہیں۔ جس ملک میں وسائل قدرت کی جس قدر بہتات ہوگی اسی مناسبت سے اس ملک میں زیادہ دولت پیدا کرنے کے امکانات ہوں گے۔ برعکس اس کے جس ملک میں وسائل قدرت کی مقدار جس قدر محدود ہوگی اسی مناسبت سے دولت بھی کم پیدا کی جا سکے گی۔

(۲) وسائل قدرت سے پورا پورا استفادہ کرنے کی صلاحیت ــــ دولت کی مناسب مقدار پیدا کرنے کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ باشندوں میں اس امر کی پوری پوری صلاحیت ہو کہ وہ اپنے ملک کے خداداد وسائل سے مکمل استفادہ کر سکیں۔ کیونکہ کسی ملک میں

وسائل قدرت کی کس قدر زیادتی کیوں نہ ہو اگر وہاں کے باشندے ان وسائل سے پورا پورا استفادہ نہ کر سکیں تو دولت کی مناسب مقدار پیدا نہ ہو سکے گی۔ پس معلوم ہوا کہ دولت کی زیادہ مقدار پیدا کرنے کے لئے ایک طرف وسائل معاش کا ہونا ضروری ہے اور دوسری طرف باشندگان ملک میں ایسی صلاحیت بھی ہونی چاہئے کہ وہ ان وسائل سے بدرجہ اتم استفادہ کر سکیں۔ ایسی حالت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسے ذرائع ہیں جن کی بدولت کسی ملک کے باشندوں میں اپنے وسائل سے پورا پورا استفادہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں تعلیم کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تعلیم کی وسیع تقسیم دو طرح پر کی جا سکتی ہے۔ فنی تعلیم اور عام تعلیم۔ فنی تعلیم سے ہماری مراد ایسی تعلیم ہے جو خاص خاص پیشوں سے متعلق ہو۔ مثلاً زراعت، صنعت و حرفت، تجارت وغیرہ کی تعلیم۔ عام تعلیم سے مراد ایسی تعلیم ہے جس کی نوعیت ادبی و نظری ہو۔ مادی ترقی کے لئے ہر دو قسم کی متناسب تعلیم ضروری ہے۔

تعلیم کے علاوہ عمدہ صحت کا مسئلہ بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ کسی قوم کے قدرتی وسائل خواہ کس قدر زیادہ کیوں نہ ہوں اُس ملک میں تعلیم کا معیار بھی کس قدر بلند کیوں نہ ہو۔ اگر وہاں کے باشندوں کی صحت ٹھیک نہ ہو تو دولت کی خاطر خواہ مقدار نہیں پیدا کی جا سکتی۔ عمدہ صحت کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں — صحت بخش غذا، صحت بخش لباس۔ اور صحت بخش مکان۔ یعنی قوت کارگذاری میں دولت پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک طرف تو پیٹ بھر غذا میسر ہو اور دوسری طرف اُس غذا میں صحت اور توانائی میں اضافہ کرنے والے اجزا بھی متناسب مقدار میں موجود ہوں۔ اسی طرح لباس بھی اس نوعیت کا ہونا چاہئے کہ اس کی بدولت موسمی اثرات سے اچھی طرح بچ سکیں خصوصاً سرد ممالک میں لباس کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ عمدہ صحت کے لئے صاف اور ہوادار مکان بھی ضروری چیز ہیں۔ اگر مکانات تاریک، غیر ہوادار اور گندے ہوں تو ظاہر ہے کہ اس سے صحت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

(۳) مفید مادی اشیاء کا استعمال — دولت کی زیادہ مقدار پیدا کرنے کے لئے

مفید مادّی اشیاء کا استعمال بھی ضروری ہے۔ مفید مادّی اشیاء دو قسم کی ہیں ۔ غذا، لباس اور مکان براہ راست مفید مادّی اشیاء ہیں۔ برعکس اس کے وہ اشیاء جن سے غذا، لباس اور مکان کی تیاری میں مدد ملتی ہے، بالواسطہ مفید مادّی اشیاء کہلاتی ہیں مختلف قسم کے آلات و اوزار اور مشین وغیرہ بالواسطہ مفید مادی اشیاء میں شامل ہیں۔ براہ راست مفید مادّی اشیاء کو اشیائے صرف اور بالواسطہ مفید مادّی اشیاء کو اشیائے پیدائش بھی کہا جاتا ہے۔ پیدائش دولت کے نقطۂ نظر سے بالواسطہ مفید مادّی اشیاء یا آلات و اوزار اور مشنری وغیرہ کا استعمال بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگر اشیاء ہاتھ سے تیار کی جائیں تو وہ نہ صرف بھدّی قسم کی تیار ہوں گی بلکہ ایک مقررہ وقت میں مقابلتاً بہت کم تیار ہوں گی۔ برعکس اس کے اگر ان کی تیاری میں عمدہ قسم کے آلات و اوزار اور مشین استعمال کئے جائیں تو نہ صرف یکساں اشیاء تیار ہوں گی بلکہ وہ خوبصورت بھی ہوں گی اور ایک مقررہ وقت میں مقابلتاً زیادہ تیار کی جاسکیں گی۔ مثال کے طور پر کپڑے کی بُنائی کو لیجئے۔ کپڑا ہاتھ سے بھی تیار کیا جاسکتا ہے اور مشین کے ذریعہ بھی لیکن دوسری صورت میں نہ صرف نفیس اور عمدہ کپڑا تیار ہوگا بلکہ اس کی مقدار بھی مقابلتاً زیادہ ہوگی۔ یہی حال دیگر اشیاء کی پیدائش کا ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اشیاء کی پیدائش میں آلات و اوزار اور مشنری وغیرہ سے جس قدر زیادہ کام لیا جائے گا اسی قدر زیادہ دولت پیدا ہوسکے گی۔ ہندوستان کے مقابل ترقی یافتہ ممالک میں زیادہ دولت پیدا کی جاتی ہے جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں پیدائش دولت کے لئے جس قسم کے آلات و اوزار استعمال کئے جاتے ہیں وہ بالعموم بہت ادنیٰ اور معمولی قسم کے ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے ترقی یافتہ ممالک میں معمولی معمولی اشیاء کی تیاری کے لئے بھی مشین استعمال کی جاتی ہے نتیجہ یہ کہ دولت بھی زیادہ پیدا ہوتی ہے ۔ واضح رہے کہ معاشیات میں دولت سے مراد صرف سکّے اور نوٹ نہیں بلکہ اس کی تعریف میں وہ تمام اشیاء شامل ہیں جن سے ہماری کوئی نہ کوئی احتیاج پوری ہوتی ہے اور جنھیں ہم خریدتے اور بیچتے ہیں۔

(۴) باہمی تعاون عمل یا تقسیم عمل ۔۔۔ جس طرح آلات و اوزار اور مشین وغیرہ کے استعمال کی وجہ سے زیادہ دولت پیدا ہوتی ہے اسی طرح باہمی تعاون یا تقسیم عمل کے طریقے سے کام لینے کی وجہ سے بھی دولت کی پیدائش میں اضافہ ہوتا ہے۔ تقسیم عمل سے مراد دولت پیدا کرنے کا وہ طریقہ ہے جس کے تحت ہر چیز کی تیاری متعدد کاموں میں تقسیم کر دی جاتی ہے اور ان میں سے ہر ایک کام جداگانہ مزدور کے سپرد کیا جاتا ہے۔" مثال کے طور پر جوتا سازی کے کام کو لیجئے۔ بڑے بڑے کارخانوں میں اس کام کو متعدد افراد کے مابین تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک شخص صرف چمڑا صاف کرتا ہے، دوسرا اس کے مناسب ٹکڑے کرتا ہے، تیسرا تلے کاٹتا ہے، چوتھا ایڑیاں تیار کرتا ہے۔ اسی طرح جوتے کی تیاری سے متعلق دیگر کام جزوی طور پر متفرق افراد کے سپرد کر دئے جاتے ہیں اور متعدد افراد کی اجتماعی کوشش سے جوتا تیار ہو کر فروخت کرنے کے قابل بنتا ہے۔ یہ سوال کہ تقسیم عمل کے طریق سے کام لینے کی بدولت مقدار پیدا وار میں کیوں اضافہ ہوتا ہے تو اس کے چند وجوہ ہیں۔

پہلا یہ کہ اس کی وجہ سے بڑا کام چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور ہر شخص کو اس کی قابلیت اور استطاعت کے مطابق کام ملتا ہے۔ مرد مشکل کام انجام دیتے ہیں۔ عورت اور بچے معمولی کام کرتے ہیں۔ چونکہ ہر مزدور کو اس کے کام کی نوعیت کا لحاظ کرتے ہوئے زیادہ یا کم اجرت دی جاتی ہے۔ لہٰذا مصارف پیدائش میں کمی ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ آلات و اوزار اور پیداوار خام وغیرہ کی بھی کفایت ہوتی ہے۔ تیسرے یہ کہ ایک ہی کام بار بار کرنے کی وجہ سے مزدور کو مہارت حاصل ہوتی ہے اور وہ مقررہ وقت میں مقابلتہً زیادہ کام کرتا ہے اور مجموعی طور پر دولت زیادہ پیدا ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ تقسیم عمل کے فوائد کے ساتھ ساتھ اس کے نقائص بھی ہیں۔ پہلا نقص یہ ہے کہ اس کے تحت چونکہ مزدور ایک ہی کام انجام دیتا ہے لہٰذا اس کی واقفیت کا دائرہ بہت محدود ہو جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ اس کے کام کی مانگ نہ رہے تو چونکہ وہ دوسرا کام نہیں

انجام دے سکتا لہٰذا بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ ہر وقت ایک ہی کام کرنے کی وجہ سے مزدور کو اپنے پیشے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی اور وہ ایک مشین کی طرح کام کرتا ہے۔ تیسرا نقص یہ ہے کہ اس کی بدولت چونکہ عورتوں اور بچوں سے کام لینے کے امکانات نکل آئے ہیں۔ لہٰذا اکثر معاشرتی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ کارخانوں میں آئے دن حادثات کا ہونا۔ بچوں اور حاملہ عورتوں وغیرہ کی کارکردگی کا متاثر ہونا۔۔۔ عورتوں اور مردوں کے یکساں کام کرنے کی وجہ سے مخرب اخلاق عادتوں کا پڑنا وغیرہ ــــ تقسیم عمل کی ترقی اور استعمال مشین کا نتیجہ ہے۔

(۵) آبادی کی مناسب تعداد ــــ کسی ملک کے وسائل معاش سے پورا پورا استفادہ کرنے اور دولت کی ممکنہ مقدار پیدا کرنے کے لئے آبادی کی ایک خاص تعداد ضروری ہے۔ فرض کیجئے کسی ملک کے وسائل قدرت سے خاطر خواہ استفادہ کرنے کے لئے چار کروڑ آبادی مطلوب ہے۔ اب اگر آبادی چار کروڑ کی بجائے چھ کروڑ ہو جائے یا صرف دو کروڑ رہ جائے تو ہر دو صورتوں میں دولت کی ممکنہ مقدار نہیں پیدا ہو سکے گی۔ پہلی صورت میں آبادی زائد از ضرورت ہوگی اور دوسری صورت میں ضرورت سے کم۔ اس کی تعداد اس قدر ہونی چاہئے کہ اس کے ذریعہ ملک کے وسائل سے بہترین استفادہ کرتے ہوئے بہترین دولت پیدا کی جا سکے۔ آبادی کی ایسی تعداد جو کسی ملک کے وسائل سے اتم استفادہ کرنے کے لئے موزوں ترین ثابت ہو ــــ متوازن آبادی کہلاتی ہے۔ اگر آبادی اس حد سے بڑھ جائے یا گھٹ جائے تو ہر دو صورتوں میں اس کی حالت غیر متوازن ہوگی۔ عملی طور پر کسی ملک میں متوازن آبادی کا ٹھیک طور پر تعین بہت ہی دقت طلب بلکہ محال ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ متوازن آبادی کا نظریہ عملی حیثیت سے بے کار ہے۔ اس کی مدد سے آبادی کے مسئلہ کو حل کرنے میں قابل لحاظ مدد ملتی ہے۔

(۱۰) دوسرا حصہ۔ انفرادی خوش حالی

جس طرح اجتماعی خوش حالی کے نقطۂ نظر سے دولت ضروری چیز ہے اسی طرح انفرادی

خوش حالی کا مدار بھی (دیگر امور کے علاوہ) دولت کی مناسب مقدار پر ہوتا ہے۔ جہاں تک انفرادی طور پر دولت یا آمدنی حاصل کرنے کا تعلق ہے اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ (۱) ذاتی محنت اور (۲) ذاتی جائداد۔ ذاتی محنت سے آمدنی حاصل کرنے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں (الف) خود اپنے استعمال کے لئے اشیا تیار کرنا۔ (ب) دوسروں کے پاس ملازمت یا نوکری کرنا۔ (ج) کوئی کارخانہ یا کاروبار جاری کرنا۔ اسی طرح ذاتی جائداد سے آمدنی حاصل کرنے کی بھی تین صورتیں ہیں (الف) ذاتی جائداد کو خود استعمال کرنا۔ (ب) اس کے استعمال کا حق دوسروں کو دینا۔ (ج) یا اپنے قبضے میں ایک خاص قسم کی املاک اس وقت تک رکھنا کہ وہ قابل استعمال ہو جائے یا دوسرے اس کو طلب کریں۔ محنت اور جائداد سے آمدنی حاصل کرنے کی جو مختلف صورتیں بیان کی گئیں، اب ہم ان کی جدا جدا تشریح کریں گے۔

محنت سے آمدنی حاصل کرنے کی تین صورتیں

(الف) جیسا کہ اس سے قبل ہم معلوم کر آئے ہیں محنت سے آمدنی حاصل کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم خود اپنے لئے کوئی چیز تیار کریں مثلاً اگر کسی شخص کی بیوی اپنے شوہر اور بچوں کے کپڑے سی لے یا ماما رکھنے کی بجائے ذاتی طور پر پکوان کا انتظام کرے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ زیر بحث شخص کی بیوی کپڑوں کی سلائی کی اجرت اور ماما کی تنخواہ کے مساوی آمدنی حاصل کر رہی ہے۔ آیڈون کنن نے اسی خیال کو دو مدرسین کی مثال سے واضح کیا ہے فرض کیجئے دو مدرسین ہیں ــــ الف اور ب۔ (الف) کو ذاتی جائداد سے ۲۰۰ روپے سالانہ آمدنی ہوتی ہے اور دوسروں کے بچے پڑھانے سے سالانہ ۲۵۰ روپے ملتے ہیں۔ خود اپنے بچے کی تعلیم کے لئے وہ دوسرے شخص کو سالانہ ۵۰ روپے دیتا ہے۔ (ب) کو بھی ذاتی جائداد سے (الف) کے مساوی آمدنی ہے اور بچے پڑھانے سے سالانہ ۲۰۰ روپے ملتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو ذاتی طور پر اسی حیثیت کی تعلیم دے لیتا ہے جیسی کہ (الف) کے بچوں کو دی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں (الف) اور (ب) کی آمدنی مساوی ہوگی۔ گو بظاہر

(الف) کو (ب) کے مقابل ۵۰ روپے زائد ملتے ہیں۔ اس قسم کی آمدنی کو عام طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے حالانکہ اس کا پورا پورا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ آمدنی حاصل کرنے کا یہ طریقہ خصوصاً ایسے افراد کے لئے بہت مفید ہے جو دوسروں کے ہاں محنت کرکے اپنی آمدنی میں اضافہ نہیں کرسکتے۔ مسلمان معاشرے کی عورتوں میں بالعموم یہ نقص پایا جاتا ہے کہ وہ اندرون خانہ اپنا ذاتی کام کرتے ہوئے بھی عار کرتی ہیں! اس قسم کی عورتیں حالات کا لحاظ کرتے ہوئے اگر پکوان کا انتظام خود کرلیں، صفائی اور اسی قسم کے معمولی کاموں کا انتظام اپنے بچوں کے تفویض کردیں، شوہر اور بچوں کا لباس ممکنہ طور پر خود ہی سی لیں تو خاندان کی مجموعی آمدنی میں قابل لحاظ اضافہ ہوسکتا ہے! اس میں شک نہیں کہ بعض سمجھ دار اور محنتی عورتیں اس قسم کا گھریلو کام انجام دے کر اپنی زندگی کو قابل لحاظ حد تک خوش حال بناتی ہیں لیکن بہت سی کم سمجھ سست اور کاہل عورتیں ایسی ہیں جو اپنے شوہروں پر غیر معمولی طور پر بار ثابت ہوتی ہیں۔

(ب) محنت سے آمدنی حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ ملازمت یا مزدوری ہے۔ ملازمت کے معاوضے کو تنخواہ اور مزدوری کے معاوضہ کو اُجرت کہا جاتا ہے۔ اُجرت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو بہ شکل زر ادا کی جائے مثلاً آٹھ آنے روز یا (۱۵) روپے ماہانہ۔ دوسرے وہ جو ضروریات کی شکل میں دی جائے، مثلاً کھانا کپڑا اور رہنے کے لئے مکان وغیرہ۔ پہلی قسم کی اُجرت کو اجرت متعارفہ اور دوسری قسم کی اجرت کو اجرت صحیحہ کہتے ہیں۔ مزدور کے نقطۂ نظر سے اجرت صحیحہ بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ مزدور کی خوش حالی کا مدار زر کی اس مقدار پر نہیں ہوتا جو اسے روزانہ یا ماہانہ ملتی ہے بلکہ مایحتاج زندگی کی اشیاء کی مقدار یا تعداد پر ہوتا ہے جو اسے اس زر کے معاوضے میں حاصل ہوتی ہے۔ مایحتاج زندگی کی مختلف اشیاء جس قدر زیادہ ملیں گی! اسی لحاظ سے مزدور کی مادی خوش حالی کے امکانات شکل آئیں گے۔ برعکس اس کے مقدار زر کے معاوضے میں مایحتاج زندگی کی مختلف اشیاء جس قدر کم ملیں گی! اس کا مخالف اثر مزدور کی خوش حالی پر پڑے گا۔ اگر غلہ روپے کو ۱۰ سیر ملنے کی بجائے (۱۵) سیر ملنے لگے تو اس سے

مزدور کی خوش حالی بڑھ سکے گی۔ برعکس اس کے اگر غلہ ۱۰ سیر کی بجائے ۵ سیر ملنے لگے تو اس سے مزدور کی خوش حالی گھٹے گی۔ ایسی صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر غلہ اور دیگر اشیاء کی گرانی کے ساتھ ساتھ اجرتوں اور تنخواہوں میں متناسب اضافہ نہ ہو تو اس کا مخالف اثر مزدور کی خوش حالی پر پڑے گا۔ برعکس اس کے غلہ اور دیگر اشیاء کی ارزانی کے ساتھ ساتھ اجرتوں اور تنخواہوں میں تخفیف نہ ہو تو مزدور کی خوش حالی بڑھ سکے گی۔ بہر طور اشیائے ضروریات کی گرانی کے ساتھ مزدوروں کی اجرتوں اور تنخواہوں میں اضافہ ضروری ہے۔ اشیاء کی گرانی کے ساتھ بہت عرصہ تک اجرتوں اور تنخواہوں میں متناسب اضافہ نہ کیا جائے تو اس سے مزدوروں کی قوت کارگزاری متاثر ہوگی اور وہ سابقہ معیار پر زندگی نہیں بسر کر سکیں گے۔ مزدوروں کو اس قدر اجرت ملنی چاہئے کہ جس کے ذریعہ وہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی صحت اور قوت کارگزاری کو بڑھا سکیں اور ایک خاص معیار پر برقرار رکھ سکیں۔

(ج) محنت سے آمدنی حاصل کرنے کا تیسرا طریقہ کاروبار جاری کرنے کا ہے مثلاً پارچہ بافی۔ صابن سازی۔ بٹن سازی یا کسی اور قسم کا کارخانہ قائم کرنا۔ کارخانہ دار کو معاشیات کی اصطلاح میں آجر کہا جاتا ہے اور اس کی محنت کے معاوضے کو اجرت نہیں بلکہ منافع کہتے ہیں۔ کارخانہ دار اور مزدور کی جدوجہد اور ذمہ داری میں فرق ہوتا ہے۔ اسی لئے ایک کی محنت کے معاوضے کو منافع اور دوسرے کی محنت کے معاوضے کو اجرت کہتے ہیں۔ کارخانہ دار کو قیام کارخانہ کے لئے مکان کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ رقم کا انتظام کر کے آلات و اوزار اور پیداوار خام کی خریدی کرنی پڑتی ہے۔ مزدور مہیا کرنا پڑتا ہے اور اشیاء کی تیاری یا فروخت سے قبل اجرت دینی پڑتی ہے۔ کارخانہ دار بحیثیت مجموعی کارخانے کی ترقی یا دیوالیہ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ برعکس اس کے مزدور بہت بڑی حد تک آزاد ہوتا ہے۔ مقررہ وقت تک کام کرتا ہے اور اجرت پاتا ہے۔ کارخانے کی ترقی یا دیوالیہ کی براہ راست ذمہ داری مزدور پر نہیں ہوتی۔

محنت سے حاصل ہونے والی آمدنی میں فرق کے اسباب | یہاں تک اس امر کی

تشریح کی گئی کہ محنت سے آمدنی حاصل کرنے کے مختلف طریقے کیا ہیں لیکن روزمرہ زندگی میں ہم اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ محنت سے حاصل ہونے والی آمدنی میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ بعض افراد کو ان کی محنت کا بہت ہی کم معاوضہ ملتا ہے اور بعض کو بہت زیادہ۔ لہٰذا اب دیکھنا یہ ہے کہ اس فرق کے کیا اسباب ہیں۔

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ خاص خاص کاموں کو عمدگی کے ساتھ انجام دینے کی تمام افراد میں یکساں قابلیت نہیں ہوتی۔ اس قابلیت میں جس قدر فرق ہوگا اس مناسبت سے آمدنیوں میں بھی فرق پایا جائے گا۔ جو افراد اپنے کام کو جس قدر عمدگی کے ساتھ انجام دیں گے انھیں اسی قدر زیادہ معاوضہ ملے گا۔ برعکس حالت میں معاوضہ کم ہوگا۔ جہاں تک کہ مختلف کارخانہ داروں کی شرح منافع میں فرق کا تعلق ہے اس کی بھی اہم وجہ یہ ہے کہ بعض کارخانہ داروں میں خداداد کاروباری صلاحیت ہوتی ہے اور اکثر اس سے محروم رہتے ہیں نتیجہ یہ کہ بعضوں کو بہت زیادہ منافع ملتا ہے اور اکثروں کو بہت کم۔

آمدنیوں میں فرق کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض کام سیدھے سادے اور معمولی ہوتے ہیں اور بعض مشکل اور مہارت طلب۔ جو کام آسان اور معمولی ہوتے ہیں ان کا معاوضہ بھی کم ہوتا ہے لیکن مشکل اور مہارت طلب کاموں کا معاوضہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جب مشکل اور مہارت طلب کاموں کا بہت زیادہ معاوضہ ملتا ہے تو سب لوگ اسی نوعیت کے کام انجام دینے کی کوشش کیوں نہیں کرتے تاکہ انھیں زیادہ معاوضہ ملے۔ واضح رہے کہ سب لوگ یکساں محنت پسند نہیں ہوتے۔ نیز ہر شخص بالعموم اپنے معاشرے کی مناسبت سے کوئی پیشہ اختیار کرتا ہے۔ ادنیٰ طبقہ کے لوگ بالعموم اسی نوعیت کے کام کرتے ہیں جو ان کے معاشرے کے افراد انجام دیتے ہیں۔ یہی حال متوسط اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کا ہے۔ علاوہ ازیں مشکل اور مہارت طلب کام انجام دینے کے لئے خاص قسم کی تعلیم ضروری ہوتی ہے لیکن سب افراد کو تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع (بالخصوص پس ماندہ

ممالک میں) حاصل نہیں ہوتے۔ ان وجوہ کی بناء پر تمام افراد کی صلاحیت اور قابلیت یکساں نہیں ہوسکتی اور محنت سے حاصل ہونے والی آمدنیوں میں فرق کا پایا جانا لازمی ہوتا ہے۔

املاک سے آمدنی حاصل کرنے کی تین صورتیں

پیچھے ہم معلوم کر آئے ہیں کہ املاک یا جائداد سے آمدنی حاصل کرنے کی بھی تین صورتیں ہیں۔ (الف) پہلا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی جائداد کو خود استعمال کریں۔ اگر ہم اپنے مکان میں خود رہیں یا اپنی موٹر کو ذاتی سواری کے لئے رکھیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہمیں مکان اور موٹر سے آمدنی حاصل ہو رہی ہے۔ بظاہر یہ خیال عجیب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسی چیز سے جسے ہم خود استعمال کر رہے ہیں کیونکر آمدنی حاصل ہوسکتی ہے۔ اگر ہم ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہمیں ذاتی جائداد سے بھی جسے ہم خود استعمال کر رہے ہیں آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص کی (۱۰۰۰) روپے تنخواہ ہے۔ اس کا ایک ذاتی مکان بھی ہے اور اس مکان میں وہ خود رہتا ہے لیکن اگر اس مکان کو کرایہ پر دیا جائے تو (۱۰۰) روپے ماہانہ کرایہ وصول ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ شخص زیر بحث کی حقیقی آمدنی (۱۱۰۰) روپے ہے۔ بالعموم اس قسم کی آمدنی کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقی آمدنی کا حساب لگانے وقت اس کا پورا پورا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(ب) املاک سے آمدنی حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کے استعمال کا حق دوسروں کو دیا جائے اور اس کے عوض کچھ آمدنی حاصل کی جائے۔ مثلاً مکان یا ملکیات وغیرہ کا کرایہ پر دینا، سیکلوں کا کرایہ پر چلانا یا موٹروں کو کرایہ پر دینا۔ واضح رہے کہ املاک دو قسم کی ہوتی ہیں — ایک بہ شکل زر اور دوسرے مکانات، ملکیات، موٹر یا سیکل وغیرہ کی شکل میں۔ ملک کی نوعیت کا لحاظ کرتے ہوئے ان سے حاصل ہونے والی آمدنی کے نام بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً سکونتی زمین کے استعمال کے معاوضے کو کرایہ کہا جاتا ہے۔ لیکن زراعتی زمین کے استعمال کا معاوضہ لگان کہلاتا ہے۔ اسی طرح زر کے استعمال کے معاوضے کو لگان یا کرایہ نہیں کہتے بلکہ

اسے "سود" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

(ج) املاک سے آمدنی حاصل کرنے کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم کسی چیز کو اس وقت تک بطور ذخیرہ محفوظ رکھیں جب تک کہ وہ زیادہ کارآمد نہ ہو جائے۔ اس کی بہترین مثال ہمارے ہی ماحول سے لی جا سکتی ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب کہ نارائن گوڑہ، حیدر گوڑہ اور حمایت نگر کی آبادی بہت ہی ناقابل لحاظ تھی۔ ہر طرف جنگل ہی جنگل تھا۔ زمینات کی قیمت بہت ادنیٰ اور معمولی تھی۔ چنانچہ اکثر لوگ یہاں کی زمینات کو چار آنے گز کے حساب سے خریدنا بھی خلاف منفعت سمجھتے تھے۔ لیکن جوں جوں اس طرف آبادی کا رجحان بڑھتا گیا زمینات کی قدر و قیمت میں بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ اس رجحان کو دیکھ کر اکثر افراد نے منافع کی خاطر وسیع آراضیات خرید لیں۔ چنانچہ اب اس نواح میں زمینات کی قیمت تین روپے گز سے لے کر پانچ روپے گز ہے۔ جن افراد نے دوراندیشی سے ارزاں زمینات خریدی تھیں انہیں اس وقت معقول نفع مل رہا ہے۔ نہ صرف اراضیات بلکہ دیگر اشیاء کے لین دین سے بھی لوگ اسی طرح کی آمدنی حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً فصل پر غلہ بالعموم ارزاں ہوتا ہے۔ لہٰذا تجارت پیشہ افراد وسیع پیمانے پر اس کی خریدی کرتے ہیں، اور کچھ عرصہ تک اسے بطور ذخیرہ محفوظ رکھتے ہیں۔ جب طلب خوب بڑھتی ہے اور قیمتیں گراں ہو جاتی ہیں تو اس وقت کافی منافع سے فروخت کر دیتے ہیں۔

املاک سے حاصل ہونے والی آمدنی میں فرق کے اسباب

جس طرح محنت سے حاصل ہونے والی آمدنیوں میں مختلف وجوہ کی بناء پر فرق پایا جاتا ہے اسی طرح املاک سے حاصل ہونے والی آمدنیوں میں فرق کے مختلف وجوہ ہیں۔

اس فرق کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بعض افراد دولت کمانے اور پس انداز کرنے کی مقابلۃً زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا اس قابلیت کا لحاظ کرتے ہوئے بعض افراد کے ہاں زیادہ جائداد ہوگی اور بعض کے ہاں کم۔ ایسی صورت میں بعض کو املاک سے زیادہ آمدنی حاصل ہوگی تو بعض کو

بہت ہی کم اور اکثر تو اس سے محروم نظر آتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض افراد کو وراثتاً زیادہ جائداد ملتی ہے۔ جن افراد کو ورثہ میں زیادہ جائداد ملے گی ظاہر ہے کہ انھیں دوسروں کے مقابل املاک سے زیادہ آمدنی ہوگی۔

تیسرے یہ کہ جائے وقوع کی مناسبت کا بھی املاک سے حاصل ہونے والی آمدنیوں پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ فرض کیجئے کسی شخص کی ایک ملگی عابد روڈ پر واقع ہے اور اس کا کرایہ ماہانہ (۴۵) روپے آتا ہے۔ دوسرے شخص کی ملگی اسی نمونے، گنجایش اور مالیت (صرفۂ تعمیر ملگی) کی یاقوت پورہ میں واقع ہے اور اس کا کرایہ صرف (۲۰) روپے ماہانہ وصول ہوتا ہے۔ ہر دو ملگیوں کے نمونے، گنجایش اور صرفۂ تعمیر کی یکسانیت کے باوجود کرایوں کا یہ فرق محض جائے وقوع کا نتیجہ ہے۔

انفرادی خوش حالی کے بیان کو ختم کرتے ہوئے مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا مدار انفرادی آمدنی کی نوعیت اور اس کے صرف پر ہوتا ہے۔ جس شخص کی آمدنی جس قدر زیادہ ہوگی اسی لحاظ سے اس کی زندگی بھی خوش حال ہو سکے گی، بشرطیکہ آمدنی کا صرف بھی مناسب اور مفید ہو۔ اگر آمدنی تو زیادہ ہو اور صرف کے طریقے ٹھیک نہ ہوں تو اس سے خاطر خواہ نتائج نہیں برآمد ہو سکیں گے۔ جہاں تک آمدنیوں کی زیادتی کا تعلق ہے اس کا مدار زیادہ تر افراد کی قوتِ پیدا آوری پر ہوتا ہے۔ اگر ہم ایک خوش حال زندگی بسر کرنا چاہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر وہ صلاحیت پیدا کریں جس کے ذریعہ ہم زیادہ دولت پیدا کرسکتے ہیں۔ اس صلاحیت کے لئے مفید تعلیم و تربیت صحت بخش غذا، لباس، مکان اور عمدہ ماحول ضروری چیزیں ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ مناسب اور مفید طریقۂ صرف کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

(۱۱) تیسرا حصہ ۔ مادی خوش حالی اور حکومت

حکومت کے فرائض

خوش حالی ۔۔ خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی ۔۔ کا بہت قریبی تعلق

حکومت سے بھی ہے۔ جس ملک کی حکومت روشن خیال اور حقیقی معنی میں رعایا کی ہمدرد ہوگی اس ملک کی خوش حالی نسبتاً آسانی کے ساتھ اور مقابلتہً جلد حاصل کی جاسکے گی۔ بشرطیکہ بعض دیگر موافق حالات بھی موجود ہوں کسی ملک کے وسائل قدرت خواہ کس قدر زیادہ کیوں نہ ہوں اور اور وہاں پر زیادہ دولت پیدا کرنے کے کس قدر امکانات کیوں نہ پائے جائیں ان سے حقیقی استفادہ صرف اُس وقت کیا جاسکتا ہے جب کہ وہاں کی حکومت اچھی ہو۔ غیر ذمہ دار اور غیر فرض شناس حکومتوں کی وجہ سے بھی ملک میں افلاس اور ناداری پھیلتی ہے اور آزاد ممالک غیروں کے غلام بن جاتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں حکومت کے فرایض بہت وسیع ہو گئے ہیں۔ اب عدم مداخلت کی پالیسی کا زمانہ نہیں رہا۔ ہر روشن خیال اور ہمدرد حکومت ملک کی خوش حالی کو حاصل کرنے کے لئے تقریباً تمام معاملات میں دخل دیتی ہے۔ اچھی سیاست کے علاوہ اچھی معیشت اور اچھی معاشرت کو حاصل کرنا یا برقرار رکھنا ہر ذمہ دار حکومت کا فریضہ ہے۔ سہولت کی خاطر حکومت کے فرایض کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) حکومت کا ایک اہم فریضہ یہ ہے کہ باشندگان ملک کو دشمنوں کے حملے سے بچائے۔ اگر کسی ملک پر آئے دن مختلف قوموں کے حملے ہوتے رہیں تو اس کی وجہ سے ملک خاطرخواہ طور پر ترقی نہیں کرسکتا۔ خوش حالی کے حاصل کرنے کے لئے امن ضروری چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر حکومت اپنی استطاعت کے مطابق قومی مدافعت اور قومی تحفظ کے لئے مناسب فوج اور آلات حرب مہیا رکھتی ہے۔ تاکہ وقت ضرورت ان سے کام لیا جاسکے۔

(۲) خوش حالی کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ ملک کو بیرونی حملہ آوروں سے بچایا جائے بلکہ اندرونی امن وامان کا قائم رکھنا بھی لازمی ہے۔ اندرون ملک چوری۔ لوٹ مار۔ غارت گری۔ دغابازی اور حق تلفی عام ہو تو بھی ملک ترقی نہیں کرسکتا۔ لہٰذا حکومت کا دوسرا فریضہ یہ ہے کہ اندرون ملک امن قائم رکھے۔ اس غرض کے لئے حکومت مختلف قسم کی عدالتیں قائم کرتی ہے اور پولیس رکھتی ہے۔

کرتی ہیں اور اسے رعایا کی فلاح اور بہبود کے لئے صرف کرتی ہیں۔ واضح رہے کہ "بہتر صرف دولت" کا مسئلہ نہ صرف انفرادی حیثیت سے بہت اہمیت رکھتا ہے بلکہ حکومت کے مدات خرچ میں بھی اس کا لحاظ رکھنا انتہائی درجہ ضروری ہے۔ جس حکومت کا بجٹ غیر متناسب ہوگا (غیر متناسب بجٹ سے مراد ایسا بجٹ ہے جس میں آمدنی کی تقسیم قومی احتیاجات کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے نہ کی گئی ہو۔ کم اہم کاموں کے لئے تو زیادہ رقم مختص کی جائے اور زیادہ اہم کاموں کے لئے مقابلۃً کم رقم رکھی جائے) اس ملک میں حصول خوش حالی کے خاطر خواہ نتائج نہیں برآمد ہوسکیں گے۔

چھٹی معاشی کانفرنس ممالک محروسۂ سرکار عالی

چھٹی معاشی کانفرنس بہ دوران نمائش مصنوعات ملکی ماہ بہمن کے دوسرے ہفتہ ہو رہی ہے۔ جس میں حسب ذیل مباحث پر مقالہ جات پڑھے جائیں گے۔

(۱) تنظیم مابعد جنگ میں حیدرآباد کا معاشی موقف (۲) حیدرآباد میں فراہمی اغذیہ کا مسئلہ

(۳) حیدرآباد میں بنک کاری کی ترقی کے مسائل (۴) صنعتی فروغ میں حکومت کی امداد

(۵) حیدرآباد کی معاشی تعمیر میں امداد باہمی کا حصہ

امید کہ جناب براہ کرم اس کانفرنس میں خاص طور پر حصہ لیں گے اور مباحث بالا سے متعلق کوئی مقالہ کانفرنس میں پڑھیں گے۔ نیز اپنے ارادہ سے قبل از قبل مطلع فرمائیں گے۔

مقالہ (۸) فلسکیپ صفحات سے زائد نہ ہو۔ براہ کرم ۳۰؍ دے تک دفتر معاشی کمیٹی پر روانہ کیا جائے۔ وقت اور افتتاح سے متعلق متعاقب مطلع کیا جائے گا۔

خواجہ حمید احمد معتمد معاشی کمیٹی

(۴) حکومت کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ ٹکس یا محصول ہے۔ ٹکس سے مراد کسی شخص یا جماعت کی دولت کا وہ حصہ ہے جو بلا لحاظ اس کی رضامندی یا ناراضگی کے سرکاری اغراض کے لئے حاصل کیا جائے۔ ٹکس یا محصول کی دو قسمیں ہیں ـــــ بالواسطہ اور بلاواسطہ محصول بلاواسطہ کی خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کا بار براہ راست ادا کرنے والے پر پڑتا ہے۔ مثلاً انکم ٹکس۔ اس کا بار براہ راست ادا کرنے والے پر پڑتا ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر اس قسم کے محصول کو محصول بلاواسطہ کہا جاتا ہے۔ برعکس اس کے محصول بالواسطہ کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کا بار ادا کرنے والے پر قائم نہیں رہتا بلکہ دوسرے اشخاص پر منتقل ہو جاتا ہے۔ دیگر ممالک سے جو مال درآمد کیا جاتا ہے "اس کا محصول تاجر ادا کرتے ہیں لیکن یہ بار تاجروں پر نہیں پڑتا بلکہ اشیاء کے خریداروں پر منتقل ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ تاجر اسے قیمتوں میں شریک کر کے خریداروں سے وصول کر لیتے ہیں۔ محصول بالواسطہ بظاہر تاجروں کی جیب سے ادا ہوتا ہے لیکن اس کے حقیقی ادا کرنے والے اشیاء کے خریدار ہوتے ہیں اسی خصوصیت کی وجہ سے اس محصول کو بالواسطہ محصول کہتے ہیں۔

(۵) فاتح حکومتوں کو محکوم ممالک سے سالانہ خراج وصول ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی آمدنی ہے۔

(۶) نیز اکثر حکومتیں دیگر ممالک سے قرض بھی حاصل کرتی ہیں۔ قرض کے مقاصد مختلف ہوتے ہیں۔ بعض مرتبہ اندرون ملک مفاد عامہ کے کاروبار مثلاً زراعت صنعت وحرفت۔ تجارت اور نقل وحمل کی ترقی کے لئے قرض حاصل کیا جاتا ہے بعض وقت جنگ جاری رکھنے کے لئے کثیر مقدار میں قرضے لئے جاتے ہیں تعمیری قرضوں کا مفید اثر باشندگان ملک کی خوش حالی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ برعکس اس کے جنگی قرضوں کا بار بالخصوص مفتوح ممالک پر بہت ہی نمایاں ہوتا ہے۔

بہرحال باشندگان ملک کی خوش حالی کے لئے حکومت کی امداد ناگزیر ہوتی ہے چنانچہ ہر ذمہ دار حکومت کا اہم فریضہ ملک میں امن وامان قائم رکھنا اور وہاں کے باشندوں کو مرفہ الحال اور خوش حال بنانا ہوتا ہے۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے حکومتیں مختلف ذرائع سے آمدنی حاصل

تعلیمات کی ترقی کے لیئے ایک بڑی اسکیم مرتب کی ۔ اس اسکیم میں حرفتی مدارس کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا۔ سررشتۂ فینانس نے رقم بھی موازنہ میں شریک کردی مگر محض اس بنا پر کہ نواب عماد الملک مرحوم کی وظیفہ یابی پر نواب سراج یار جنگ مرحوم ناظم تعلیمات مقرر کئے گئے جن کو سر اکبر حیدری معتمد فینانس اور سر گیبسن واکر معین المہام فینانس پسند نہیں کرتے تھے اور ان کی کوشش کہ مسٹر سیٹن پرنسپل نظام کالج ناظم تعلیمات بنائیں جائیں بار آور نہیں ہوئی ۔ مولوی عزیز مرزا اور نواب سراج یار جنگ مرحوم کی کوششوں میں مزاحمت پیدا کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا ۔ یہ امر طے کردیا گیا کہ اولاً برطانوی ہند سے ایک ماہر تعلیمات طلب کیا جائے ۔ وہ جو اسکیم مرتب کرے گا اس کے نفاذ کے لئے سررشتۂ فینانس رقم مہیا کرے گا اس وقت تک کوئی رقم سررشتۂ تعلیمات کو نہیں دی جائے گی ۔ کہا جاتا ہے کہ سر اکبر حیدری کے ایما اور مشورت سے ڈاکٹر الما لطیفی نے اس خدمت کے لیے درخواست پیش کی لیکن سر گیبسن واکر کا اثر غالب ہوگیا اور خود سر اکبر حیدری کو مثل میں ڈاکٹر الما لطیفی کے خلاف رائے لکھنی پڑی ۔ بالآخر مسٹر مھوجہ مدارس کی ایجوکیشنل سرویس کے رکن اور نواب سراج یار جنگ سے کم درجہ اور کم تجربہ رکھتے تھے بلائے گئے ۔ انھوں نے جامعۂ مدراس کے دو مسلمان طیلسانیوں کی مدد سے اپنی اسکیم مرتب کی ۔ اس اسکیم کے نفاذ کا وقت آیا تو سر اکبر حیدری فینانس کی معتمدی سے تعلیمات کی معتمدی پر بدل گئے تھے ۔ ان کے اثر سے سراج یار جنگ مرحوم نظامت تعلیمات سے رکنیت عدالت العالیہ پر بھیج دیئے گئے اور نظامت تعلیمات پر ڈاکٹر الما لطیفی کا تقرر کرایا گیا ۔ ڈاکٹر الما لطیفی سول سرونٹ اور پنجاب کے سررشتۂ مالگزاری میں کارگزار تھے ۔

بطور ایک جملۂ معترضہ کے یہ امر واضح کرنا بے محل نہیں کہ سراج یار جنگ مرحوم کی ملازمت کا بڑا حصہ سررشتۂ تعلیمات میں بسر ہوا تھا ۔ گو قانونی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی تھیں لیکن سررشتۂ عدالت کا کوئی خاص عملی تجربہ حاصل نہیں تھا ۔ ایسے شخص کو بلا کسی پہلے تجربے کے رکنیت عدالت العالیہ پر بھیجدیا گیا اور اس کی جگہ پر سررشتۂ مالگزاری کے ایک عہدہ دار کو جس کو تعلیمات کا کسی قسم کا تجربہ نہیں تھا ناظم تعلیمات بنا دیا گیا ۔

یادگار میں صنعت وحرفت کی ایک بڑی تعلیم گاہ ملک میں سرکار اور رعایا کی مشترک کوششوں سے قایم کیجائے۔ مگر لارڈ رپن کے ہندوستان سے چلے جانے پر یہ تحریک فراموش کردی گئی۔

چند سال کے بعد نواب آصف یار الملک وزیر علی پاشا مرحوم نے کونسل آف اسٹیٹ میں یہ تحریک پیش کی کہ ملکی دستکاریوں کا زوال فوری توجہ کے قابل ہے اور یہ کہ مدارس صنعت وحرفت بھی جابجا قایم کئے جائیں۔ کہا جاتا ہے کہ نواب آصف یار الملک نے نواب تلاوت جنگ بہادر کے مشورہ اور ان کے مرتبہ مسودہ کی بنا پر یہ تحریک پیش کی تھی۔ نواب سر آسمان جاہ مرحوم مدارالمہام وقت نے یہ تحریک پسند کی اور عملی کارروائی آغاز کی۔ ایک مدرسۂ صنعت وحرفت ورنگل میں قایم کیا گیا اور مزید مدارس کے قیام کی تجویز تھی۔ ایک انجینیرنگ اسکول بھی ورنگل میں قایم کیا گیا۔ نواب سر آسمان جاہ مرحوم وزارت سے سبکدوش ہوئے تو مدارس صنعت وحرفت کے قیام کی اسکیم بھی ملتوی بلکہ ختم ہوگئی۔ ورنگل کے دونوں مدرسے کچھ مدت کے بعد حیدرآباد میں منتقل کر لئے گئے جو معمولی حیثیت کے تھے۔ اس دوران میں ملکۂ وکٹوریہ ان جہانی کی یادگار میں یتیم خانہ سرورنگر بس قایم ہوا۔ اس کو یتیموں کے لیے صنعت وحرفت کی اعلیٰ تعلیم گاہ بنانے کا خیال پیش نظر رہا۔ سر ڈیوڈ بار ریزیڈنٹ وقت نے بوقت افتتاح صنعت وحرفت کی ترقی کی بڑی بڑی امیدیں ظاہر کی تھیں۔

مہاراجہ سر کشن پرشاد آں جہانی نے اپنے دور مدارالمہامی میں بمقام نظام آباد ۱۳۱۴ف میں ایک سرکاری تقریر میں یہ واضح کیا کہ بمقام نظام آباد اور ہر ضلع میں ایک ایک مدرسۂ صنعت وحرفت قایم ہونے کی ضرورت ہے، مگر سررشتۂ مال وفینانس سے اس کی عملی تائید نہ ہوئی۔ اورنگ آباد میں نواب سراج یار جنگ مرحوم صدر مہتمم تعلیمات اور نظام آباد میں نواب رفعت یار جنگ مرحوم اول تعلقدار کی ذاتی دلچسپی سے معمولی پیمانہ پر مدارس صنعت وحرفت قایم ہوئے۔ نواب رفعت یار جنگ کا تبادلہ بیدر میں ہوا تو ان کی کوشش سے وہاں بھی ایک مدرسۂ صنعتی قایم ہوا۔ اورنگ آباد کا مدرسہ ترقی پانے لگا تو حیدرآباد کا مدرسہ بھی اسی مدرسہ میں ضم کر دیا گیا۔

مولوی عزیز مرزا مرحوم معتمد تعلیمات نے نواب سراج یار جنگ مرحوم کی مشورت سے

نظامت تعلیمات سے منتقل ہو کر اس جدید سررشتہ کے کمشنر و معتمد قرار پائے جہاں تک دفتر کا تعلق تھا نہایت فیاضی کے ساتھ منظوری صادر ہوئی۔ شریک معتمد کا بھی ایک جدید عہدہ قایم ہوا اعلیٰ اور ثانوی تعلیم کی تجدید شروع ہو گئی، مگر جہاں نفس مدارس حرفت و پیشہ کا تعلق تھا کارروائی برابر لیت و لعل میں پڑی رہی اور سررشتۂ فینانس نے یہ شرط لگائی کہ کسی اور ماہر کو بلایا جائے۔ یہ تقریب تھی مسٹر ایبٹ کے آنے کی۔ انھوں نے بھی اپنی رپورٹ اور اسکیم مرتب کی لیکن پھر بھی محکمۂ فینانس نے اُس کے مصارف کی سبیل نہ کی۔ خان فضل محمد خان صاحب نے اپنی ایک رپورٹ میں یہ امر واضح کیا ہے کہ ایک کے بعد دوسری اسکیم کس طرح بنتی اور پھر غور طلب ہوتی چلی گئی۔ بہرحال یہ ہے ۶۰ سالہ سرگزشت ملک میں حرفتی مدارس کے قیام کی۔ چند معمولی مدارس خان فضل محمد خان صاحب نے ابتدا میں قایم کرا دیے مگر جو مدارس کھلے وہ معمولی حیثیت کے ہیں۔ ان مدارس کو کسی خاص سلسلہ میں مربوط بھی نہیں کیا گیا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کل مملکت آصفیہ سے ہزاروں طلبہ ان چند مدارس میں سمیٹ کر آ جائیں۔ اور مرکزی اسکیم کا اصل مقصود تعلیم پیشہ وری اُس سے حل ہو سکے۔

عثمانیہ ٹکنیکل انسٹیٹیوٹ

اس سلسلہ میں دار الضرب اور سررشتۂ برقی کی تعلیم گاہ عثمانیہ ٹکنکل انسٹیٹیوٹ کی سرگزشت بھی قابل تذکرہ ہے۔ یہ تعلیم گاہ اپنے نقائص کے باوجود ایک اچھی تعلیم گاہ تھی۔ بتدریج اس کو ترقی حاصل ہو رہی تھی، ایک شاندار عمارت بھی اس کے لیے تعمیر ہوئی۔ طلبہ بھی زیادہ ہونے لگے۔ مگر مسٹر گیاملن کے آخری دور میں اس تعلیم گاہ کی ترقی مسدود ہو گئی۔ سررشتۂ تعمیرات و برقی اضلاع نے یہ بحث پیدا کی کہ وہ سررشتۂ دار الضرب و برقی بلدہ کے ورک شاپ سے کام نہ لے گا۔ دوسری جانب سررشتۂ تجارت و حرفت نے جب کہ مسٹر کالنس اس کے صدر ناظم تھے، دار الضرب اور اس کی ملحقہ ورک شاپ اور سررشتۂ برقی بلدہ پر مخالفانہ نکتہ چینی آغاز کی۔ سررشتۂ ریلوے سے بھی اس ورک شاپ اور تعلیم گاہ کے متعلق کچھ اختلافی رجحان ظاہر ہونے لگا۔ مسٹر میکنزی نے اس کو جامعۂ عثمانیہ میں کھینچنے کی کوشش کی۔ بالآخر مسٹر گیاملن کی وظیفہ یابی پر ورک شاپ کا کام بڑی حد تک

ڈاکٹر الماللطیفی نے کام شروع کیا اور جس جانفشانی اور ہمدردی سے کام کیا وہ ہنوز فراموش نہیں ہوا ہے۔ فنی تعلیم کی بھی ایک اسکیم ان کے پیش نظر تھی لیکن اس دوران میں سر اکبر حیدری کو ڈاکٹر الماللطیفی سے اختلاف پیدا ہوگیا۔ اب سر اکبر نے نظامت تعلیمات کے لیے سر راس مسعود مرحوم کو تلاش کیا اور ہر طرح یہ کوشش کی کہ سر راس مسعود کے آنے تک ڈاکٹر الماللطیفی کی مجوزہ اسکیمیں نافذ نہ ہوں۔ اس طرح زمانۂ ماموری ڈاکٹر الماللطیفی یعنی ۳ سال کا عرصہ رائگاں گزر گیا۔

آخر کار سر راس مسعود نواب مسعود جنگ مرحوم نے سررشتۂ تعلیمات کی کایا پلٹ دی اور اس کو سطح سے بلندی پر پہنچا دیا۔ سب اسکیمیں نافذ ہوگئیں حتیٰ کہ جامعۂ عثمانیہ کا خواب بھی پورا ہوگیا لیکن لیت و لعل میں پڑ گئی تو حرفتی مدارس کی اسکیم۔ عام خیال یہ ہے کہ سررشتۂ فینانس اور کارفرمایان سررشتۂ تجارت و حرفت و برقی و دارالضرب اس کی راہ میں حایل ہو جاتے تھے۔ البتہ مسٹر گیلمن ناظم سررشتۂ برقی نے اپنے سررشتہ کے ساتھ مکانکل اور برقی انجنیرنگ کی ایک علاحدہ تعلیم گاہ اپنی نگرانی میں قایم کرلی۔ یہ تعلیم گاہ ایک اچھی تعلیم گاہ بتدریج ہونے لگی۔

دورِ عثمانی کے آغاز پر بلدہ میں عامۃ الناس اور سرکار کی امداد سے مولانا انوار اللہ خاں فضیلت جنگ مرحوم کی سرپرستی میں بھی ایک مدرسۂ صنعت و حرفت قایم ہوا۔ اس طرح چار مدارس حرفتی اور یتیم خانہ سرور نگر تمام ممالک محروسہ میں قایم تھے۔ بعض مشنری زنانہ مدارس میں طالبات کو زنانہ دستکاری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور اس کے بعد سے سر راس مسعود کی مدت ملازمت سرکار عالی تک افتتاح مدارس صنعت و حرفت کی تجاویز صرف مثلہ سرکار عالی میں نظر آتی ہیں۔

بالآخر مسٹر میکنزی جامعۂ عثمانیہ کے پرو وائس چانسلر ہوئے تو انھوں نے اعلیٰ تعلیم کی تحدید اور پیشہ وری کی تعلیم کا خیال آگے بڑھایا۔ انھوں نے بھی باشتراک خان فضل محمد خان صاحب ناظم تعلیمات ایک رپورٹ اور اسکیم مرتب کی۔ اس اسکیم کے نفاذ سے قبل مسٹر میکنزی کا انتقال ہوگیا۔ بالآخر اسکیم کو منظوری حاصل ہوئی اور یہ قرار پایا کہ اس اسکیم کا وہ جزو جو حرفت و پیشہ کی تعلیم سے متعلق ہے ایک علاحدہ سررشتہ کے ذریعے نافذ کرایا جائے اور خان فضل محمد خان صاحب

سر اکبر حیدری کے بعد سالہا سال نواب فخر یار جنگ اور جناب نواب مہدی یار جنگ بہادر اور مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب معتمد فینانس کے دور میں بھی سر رشتہ تعلیم صنعت و حرفت کی اسکیمیں نامعلوم اسباب کی بنا پر منظور نہ ہوسکیں۔ اور بظاہر یہ عذر پیدا کیا گیا کہ مدارس نہیں کارخانے ضروری ہیں۔ یہ ممکن تھا کہ جس وقت فینانس و تعلیمات کی ذمہ داری ایک ہی صدر المہام صاحب سے وابستہ تھی۔ ذمہ داران تعلیمات و فینانس کے مشورت سے اس کی مشکل حل کر لی جاتی۔

عامۃ الناس کا رجحان ملازمت کی طرف۔

اس خطبہ صدارت میں آگے چلکر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اہل ملک کا عام رجحان سرکاری ملازمت کی طرف زیادہ ہے کیونکہ اس میں دلکشی زیادہ ہے۔ اور یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ ملازمت کی دلکشی کو کم کر دینا چاہیئے۔ یہ خیال کہ ملک کے تعلیم یافتہ افراد ملازمت سرکاری کی طرف متوجہ ہیں اور ملازمتیں امید داروں سے کم ہیں اور سب کو نہیں مل سکتیں۔ عام طور پر سب اعلیٰ عہدہ دار ظاہر کرتے ہیں لیکن اس کے بارے میں تمام ضروری امور پیش نظر نہیں رہتے۔

یہ واقعہ بالکل صحیح ہے کہ ہر نوجوان اپنی تعلیم سے فارغ ہوتے ہی کسی ذریعۂ معیشت پر نظر ڈالتا ہے اور اگر سرکاری ملازمت نہ مل سکے تو نیم سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت کو بھی قبول کرنے سے انکار نہیں کرتا۔ چنانچہ سر رشتۂ ریلوے، معدنیات کی کمپنیوں، بنکوں اور کارخانوں کی ملازمت میں بھی ہزاروں آدمی روزگار حاصل کرتے ہیں، لیکن اس کے بعد بھی ایسے افراد کی بڑی تعداد باقی رہ جاتی ہے جن کو کوئی ملازمت یا کام نہیں ملتا۔

یہ امر مد نظر رہنا چاہیے کہ بے روزگاروں کی کثرت حکومتوں میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ یوروپ اور امریکہ کی ہر حکومت بے روزگاروں کے لیے روزگار فراہم کرنا اپنا ایک فریضہ سمجھتی ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان اور ہمارے ملک میں اس جانب کافی توجہ نہیں کی گئی۔ حکومت چاہے تو تعمیرات کے کاروبار بڑھا سکتی ہے۔ ریلوے کی توسیع کر سکتی ہے۔ معدنیات اور جنگلات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے اسباب مہیا کر سکتی ہے۔

محدود ہوگیا۔ دارالضرب اور برقی کے سررشتے علحیدہ کردئے گئے۔ تعلیم گاہ جامعۂ عثمانیہ میں منتقل کردی گئی۔ اور اب تو جنگ کی ضروریات کے تحت کام ہو رہا ہے۔ کچھ سنٹر قایم ہوے ہیں۔

اس توضیح کے بعد راقم کو یہ عرض کرنا ہے کہ کارہائے جنگ کے ٹریننگ سنٹروں سے اہلِ ملک کماحقہ استفادہ نہ کر رہے ہوں تو اس کی وجہ علحیدہ تلاش کرنی چاہیئے۔ اس کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہ ہوگا کہ اہل ملک حرفتی تعلیم گاہوں سے استفادہ نہیں کر رہے ہیں۔

ملک میں حرفتی مدارس کے قیام پر ذمہ دار اصحاب نے کیوں کافی توجہ نہیں کی، یہ ایک معمہ ہے۔ اس موقع پر ایک واقعہ کا اظہار بے محل نہ ہوگا۔ سر راس مسعود مرحوم جاپان کی سیاحت سے واپس ہو رہے تھے۔ مدراس سنٹرل اسٹیشن پر راقم الحروف کی ان سے ملاقات ہوئی۔ تاثرات سفر دریافت کرنے پر مرحوم سراپا جوش بن گئے، اور پُرجوش الفاظ میں جاپان کی ترقی کا حال بیان کرکے اپنے ارادوں کا بھی اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ جاپان میں صنعت و حرفت کے لیے حکومت پوری توجہ کرتی اور ہر ممکن طریقے سے مدد کرتی ہے۔ پھر کہا کہ مدارس حرفت کے لیے میں نے ایک اسکیم مرتب کی تھی مگر اب اس کو نظر انداز کرکے جاپان کے نمونہ پر میں ایک بڑی اسکیم مرتب کروں گا۔

حیدرآباد میں مرحوم راس مسعود کے مماثل مجسم عملیت اور قوت سے کام کرنے والے اور کام کو کامیاب بنانے والے اعلیٰ عہدہ دار کم ہوئے ہیں۔ انھوں نے جو کام اپنے ہاتھ میں لیا اس کو کامیاب بنادیا۔ سر اکبر حیدری ان کی ہر بات سُنتے تھے۔ کیا بات تھی کہ صنعت و حرفت کی تعلیم کے بارے میں راس مسعود مرحوم کامیاب نہ ہوسکے؟ جاپان سے واپس آکر کئی سال وہ حیدرآباد میں رہے لیکن ان کے ارادے قوۃ سے فعل میں نہ آسکے۔ بالآخر وہ حیدرآباد سے چلے گئے۔

قیاس یہ قایم ہوتا ہے کہ سر اکبر حیدری اور سر راس مسعود میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ حیدرآباد میں رہنا اور باوجود امکان دوبارہ حیدرآباد کے بجائے بھوپال میں ملازمت کرنا اسی کی وجہ تھی اور یہ تو واقعہ ہے کہ سر اکبر حیدری نے مدارس حرفت و صنعت کے متعلق سر راس مسعود کی تحریکوں میں ایک ایسے پیچیدہ طریقے سے مزاحمت پیدا کردی جس میں سر اکبر کو کمال تھا

سرکار عالی نے بھی حیدر آباد ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے نام سے ایک بہت بڑے
ادارہ کے قیام کی منظوری دے دی ہے جس کے زیر نگرانی مختلف کارخانے قایم
کیئے جائیں گے جس میں پچاس فی صدی سرمایہ حکومت کا ہوگا۔ اب یہ اہل ملک کا
کام ہے کہ ان کمپنیوں کے قیام میں حصہ لیں جس سے نہ صرف ملک کے ضروریات زندگی
ملک میں مہیا ہو جائیں گے بلکہ اہل ملک کے لیے روزی کے ذرایع کھل جائیں گے،
اور بے روزگاری کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جائے گا۔"

اس نوعیت کے کارپوریشن کے متعلق پھر کچھ معلوم نہ ہوا۔ غالباً اس کی کامیابی مشتبہ خیال کی گئی۔ اس ڈیولپمنٹ کارپوریشن سے ملک کے بہترین ماہرین اور اصابت رائے والے افراد کی رائے و شرکت سے بظاہر دانستہ اغماض کیا گیا۔

ہمارے ملک کا زرعی ملک ہونا۔

اس خطبۂ صدارت میں زراعت پیشہ طبقہ کی معاشی حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ:

سب سے پہلے یہ امر ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ حیدر آباد ایک زرعی
ملک ہے اور زراعت کو پس پشت ڈال کر محض صنعت و حرفت پر ہی ساری
توجہ منعکس نہیں کی جاسکتی۔"

برطانوی ہند میں کبھی کبھی کسی نے اس قسم کی لفاظی کی ہے مگر اب علانیہ کوئی یہ نہیں کہتا کہ ہندوستان زرعی ملک ہے اور ہندوستان کو تقسیم عمل کے اصول پر زرعی اور اشیائے خام بہم پہنچانے والا ملک رہنا چاہیے۔ اسی طرح آج تک کسی کار فرمائے حکومت نے حیدر آباد کے متعلق یہ نہیں کہا کہ حیدر آباد ایک زرعی ملک ہے اور صنعت و حرفت پر ساری توجہ منعکس نہیں کیجاسکتی۔
ہر شخص یہ جانتا ہے کہ خود امریکہ بڑی حد تک زرعی ملک ہے اور وہ زراعت پر ہر قسم کی توجہ مرکوز کرنے کے باوجود بھی ہمہ تن اس کوشش میں محو ہے کہ جہاں تک ممکن ہو صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے۔ آخر بنگال، بہار اور صوبجات متحدہ بھی زرعی ملک ہیں۔

بڑے کارخانوں کے قیام میں سہولتیں اور ترغیبات فراہم کر سکتی ہے۔ ان امور کو عمل میں لانے سے بے روزگاری خود بخود کم ہو جائے گی۔ صرف وعظ و نصیحت نہیں بلکہ حقیقی عملی کام نوجوانوں کو خود بخود ملازمت سے ہٹا کر کاروبار کی طرف راغب کر سکیں گے۔

اس سے قطع نظر ملازمت کی دلکشی تو اب بظاہر چند اعلیٰ گزیٹیڈ خدمات کی حد تک، جہاں زاید از اسکیل اٹھارہ سو، دو ہزار، اکیس سو یا بائیس سو کی تنخواہیں میسر آتی ہیں، جہاں مکان، سواری، ٹیلیفون، برقی قوت اور خدمتگار حاصل ہیں اور جہاں عزیزوں اور احباب کو ایک ترقی کے بعد دوسری ترقی دینے یا دلانے کے اسباب فراہم ہو جاتے ہیں، محدود رہ گئی ہے۔ ورنہ عام ملازمین بلکہ کوتوالی اور فوج کے سپاہیوں تک کی حالت کاریگروں سے بھی گئی گزری ہے۔ بڑھائی، لوہار، معمار اور کارخانوں کے کاریگر ماہانہ اوسطاً تیس چالیس روپے کما لیتے ہیں۔ اور اپنے بال بچوں کو بھی ساتھ ساتھ کاروبار میں لگا دیتے ہیں، مگر سرکاری ملازمت ادنیٰ کی صورت میں جس میں کوتوالی اور فوج کے جوان بھی ہیں بڑی سے بڑی شرح ماہوار بیس پچیس روپے ماہانہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ معمولی صورتوں میں نو بارہ روپے سے پندرہ روپے تک ماہوار ہوتی ہے۔ اہلکاروں کی عام شرح تنخواہ تیس تا ساٹھ یا چالیس تا اسی روپے ہوتی ہے[1]۔ جو افراد تجارت و کاروبار کرتے ہیں اس سے بڑھ کر پیدا کرتے ہیں۔ اگر ملک میں فنون اور پیشوں کی تعلیم کا انتظام ہوتا اور کارخانے قایم رہتے تو یقیناً زیادہ افراد سرکاری ملازمت کی طرف نہ دوڑتے۔ اس صورت میں سرکاری ملازمت کی دلکشی کو کم کرنا بجائے خود صحیح نہیں ہو سکتا۔

آگے چلکر جناب صدر صاحب نے اپنے خطبہ میں فرمایا ہے کہ :-

> جنگ کی وجہ سے بیرون ملک سے اشیا کی درآمد رُک گئی ہے اور یہی موقع ہے حیدرآباد میں مختلف کارخانے فوراً قایم کئے جائیں۔ چنانچہ

---

[1] یہ مضمون الونس گرانی منظور ہونے سے قبل لکھا گیا تھا، تاہم کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔

یہ کاروبار زمانۂ جنگ میں حوصلہ افزا ہے۔ دوسرے مقامات پر بھی غیر زراعت پیشہ سرمایہ داروں کا زراعت میں سرمایہ لگانا فایدہ مند پایا گیا ہے۔

ہندوستان کو امریکہ، کناڈا اور نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا وغیرہ کی طرح زرعی ترقی حاصل کرنے کے لیے متمول زمینداروں اور سرمایہ داروں کی ضرورت ناگزیر ہے۔ ہمارے ملک میں برطانوی ہند کے خیالات کو کافی تجربہ کے بغیر اختیار کرنے میں بہت کافی احتیاط برتنی چاہیے۔ انتقال اراضی کا مسئلہ خاص اہمیت اور خاص غور و تحقیقات کے قابل ہے۔ اگر ایک طرف بے رحم ساہوکار سود در سود میں جاہل کاشت کار اور رپٹہ دار کو تھوڑی رقم کے لیے اراضی کی ملکیت سے بے دخل کر دیا کرتے ہیں تو دوسری جانب ایسے افراد بھی موجود ہیں جو زمین پر کافی سرمایہ لگا کر ملک کے زرعی کاروبار کو بلندی پر لانا چاہتے ہیں اور اپنے قولداروں اور زرعی مزدوروں سے نہایت فیاضانہ سلوک کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے عملی نمونے اہل ملک کے سامنے ہیں۔

زمین کی حالت روز بروز گرتی جاتی ہے اور پیداوار کی مجموعی مقدار کم ہوتی جاتی ہے تو اس کا اصلی سبب انتقال اراضی نہیں بلکہ یہ ہے کہ کاشت کار اس قدر مفلس ہیں کہ عمدہ کھاد اور عمدہ تخم مہیا نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے انتقال اراضی کی ممانعت پر احتیاط کے ساتھ عمل پیرائی ہونی چاہیے۔

کاشت کاروں کا قرضہ۔

قرضہ کی گراں باری سے کاشت کاروں کی سبکدوشی کے لیے وسیع پیمانہ پر کام کرنے کی اور اس کے متعلقہ مسایل پر زیادہ غور و خوض کی ضرورت ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ امداد باہمی کے بنک زیادہ کامیاب نہ ہوسکے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ مصالحت قرضہ کا قانون اور اس کے مجالس نے بھی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی۔ اور یہ تجویز بھی کہ زمین گروی بنک قایم ہو اور پچاس لاکھ روپے کی ذمہ داری سرکار عالی کے

کیا ان ممالک میں سن اور شکر کی حرفتوں پر توجہ مرکوز نہیں کی گئی ہے۔ پھر کیوں حیدرآباد کو زراعتی ملک رکھے جانے پر اصرار کیا جائے۔

انتقال اراضی۔

یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ زراعتی اراضی کی منتقلی غیر زراعتی طبقہ میں ہونی چاہئیے یا نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سود خوار پیشہ ور قرض خواہوں میں اراضی کی منتقلی بآسانی، سود در سود قرضہ کی وجہ سے نہ ہونے کے لیے کامل مزاحمت ہونی چاہیے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ عملی طور پر دشوار ہوتا جارہا ہے کہ "چار ذاتوں" کا قدیم ہندی اصول اب قایم رہ سکے۔ بہت سے افراد اور خاصکر وظیفہ یاب و تجارت پیشہ افراد اپنی دولت کو باغ لگانے یا کاشت کرنے میں صرف کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح ایک طبقہ کا فرد دوسرا پیشہ اختیار کرتا جاتا ہے۔

یہ خیال بھی معرض بحث میں آسکتا ہے کہ:۔

"قول دار کو زمین میں دلچسپی اس لیے نہیں رہتی کہ اس کا قول دوامی نہیں ہوتا"

صورت حال یہ ہے کہ موروثی کاشتکار اپنے کاروبار میں اپنی جہالت اور افلاس کی وجہ سے ہمت نہیں کرسکتا۔ اس کے برخلاف زمین کا شوقین اپنی دولت باولیوں کی کھدائی، پمپ کی فراہمی، زمین کی ہمواری، عمدہ تخم اور اچھے جانوروں کی فراہمی میں کافی طور پر لگاسکتا اور اپنے قول دار کو اس کی محنت کا کافی معاوضہ دے سکتا ہے۔ ممالک محروسۂ آصفیہ میں جابجا نظر آتا ہے کہ نیک دل سرمایہ داروں نے زمین پر اپنی پونجی لگائی اور زرعی پیداوار اور زرعی کاروبار کو ترقی دینے میں اپنے روپے اور وقت کا کافی حصہ صرف کیا مگر اسکو قولداروں اور کاشتکاروں نے نقصان پہنچایا۔ سیلو میں نظر آتا ہے کہ غیر موروثی زراعت پیشہ سرمایہ داروں نے موسمبی، کونلہ اور انگور کے بڑے بڑے باغ لگائے اور اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اور یہ نظر آنے لگا ہے کہ روی اور حبوب روغن دار کے مقابل

نہ ہوسکے گی۔ زرعی طبقہ کی اصلاح صرف اس امر پر منحصر ہے کہ سود و بہبود کے عظیم بارگراں سے اسکی گلو خلاصی کی جائے۔

ممالک محروسۂ آصفیہ کے زرعی طبقہ کے قرضہ کا بیک وقت تصفیہ بحیثیت ادائی کی صورتیں ۲۵ سے ۳۰ کروڑ روپے میں ہوسکتا ہے۔ کروڑوں روپے کے معاملات کا تصفیہ صرف چند لاکھ روپے کو ہاتھ میں لے کر نہیں ہوسکتا۔ یہ تو محض وقت ضائع کرنا ہے۔ پچیس تیس کروڑ روپے کی رقم بہت بڑی رقم نظر آتی ہے لیکن اس کا سرانجام ہوسکتا ہے۔

یہ ہوسکتا ہے اور بہت آسانی سے ہوسکتا ہے کہ اولاً ہر صوبہ میں دو دو اس طرح ممالک محروسہ میں جملہ آٹھ تعلقے ایسے چنے جائیں جو زرعی قرضہ داری میں بہت زیادہ گراں بار ہوں۔ ہر تعلقہ کی زرعی قرضہ داری کا بوقت واحد تصفیہ کم و بیش تیس لاکھ روپے میں ہوجاسکتا ہے۔ آٹھ تعلقات کے لیے ڈھائی کروڑ کا سرمایہ کافی ہوجائیگا۔ سرکار عالی کو زمین گروی بنک کی پچاس لاکھ روپے کی حد تک نہیں بلکہ سردست ڈھائی کروڑ روپے کی حد تک منافعہ کی ذمہ داری لینی چاہیے۔ ان آٹھوں اضلاع میں جن کے تعلقات کے قرضہ کی ادائی پیش نظر ہو زمین گروی بنک قومی بنک کے اصول پر قایم ہوں ضلع کی ہر بنک کا اصل سرمایہ پندرہ بیس لاکھ روپے کی حد تک حسب ضرورت مقرر کیا جائے اور باقی روپیہ پبلک میعادی امانتوں یا میعادی قرضوں سے جو اسٹیٹ بنک مہیا کرے حاصل کیا جائے۔

تمام ضلع میں سرکار کی ذمہ داریٔ منافع کی بنا پر یہ جذبات پیدا ہوسکتے ہیں کہ تمام سرمایہ دار خواہ وہ مہاجن ہوں یا وکیل، زمیندار ہوں یا کاشتکار، ملازم سرکار ہوں یا معاش دار، سب اس میں حتی الوسع کم از کم ایک ایک حصہ کا سرمایہ لگائیں۔ اس طرح بیس پچیس لاکھ روپے کا مستقل سرمایہ مہیا ہوجانا کسی طرح مشکل نظر نہیں آتا۔ اس سے بوقت واحد پورے تعلقہ کی قرضداری کا تصفیہ ہوجائے گا۔ دو تین سال کے بعد باقی اضلاع و تعلقات میں یہ کام پھیلایا جاسکتا ہے۔ اور دس سال کے پروگرام میں تمام مملکت آصفیہ کے مزارعین سودی قرضہ کے

سر رہے گی کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔

اول تو سرکار عالی نے دیوانی عدالتوں اور رجسٹری کے دفاتر کے ذریعہ کاشتکاروں پر سودی کاروبار کرنے والے ساہوکاروں کی عملاً ہمت افزائی فرمائی۔ اب اس کے برخلاف منفی عمل ہو رہا ہے کہ ساہوکاروں کی راہ میں مشکلات پیدا کی جائیں۔ اس قسم کی افراط و تفریط سے مفید نتائج پیدا نہ ہو سکیں گے۔

مسٹر بھروچہ نے اپنی تحقیقات سے مزارعین کے قرضہ کی مقدار ۶۰ کروڑ کے لگ بھگ ظاہر کی ہے۔ ایسی حالت میں امداد باہمی کی انجمنیں اور صدر بنک جن کا کل کاروبار ایک کروڑ سے کچھ زیادہ ہے حالت کی حقیقی اصلاح نہیں کر سکتے۔ اور زمین گروی بنک جس کی ذمہ داری ۵۰ لاکھ کی ہوگی کیوں کر مزارعین کی قرضداری کا حساب چکتا کر دے گا۔

فرض کر لیا جائے کہ مجالس مصالحت قرضہ اس بات میں کامیاب ہو جائیں کہ قرضہ کی مقدار گھٹ جائے۔ اور نصف یا ثلث رقم لینے پر باقی رقم سے دست بردار ہو کر ساہوکار رضامند ہو جائے تو یہ رقم بھی کیونکر بیک وقت فراہم ہو سکے گی۔ صرف قانون کے الفاظ سے یہ امر ممکن نہیں کہ مزارعین قرضہ سے سبکدوش ہو جائیں۔ اور اگر قوانین کے ذریعہ ساہوکاروں پر پابندیاں عائد کی جائیں تو دوسری طرف کاشتکار کو روپیہ ملنا اور اس کا کام چلنا مشکل ہو جائیگا۔ فی الوقت کاشتکار کا تمام کاروبار مثل تخم کی فراہمی، مال گزاری کی ادائی اور روزانہ قوت لایموت کی فراہمی سب ساہوکار کی امداد پر منحصر ہے۔ یہ بھی فی الوقت ممکن نہیں کہ ہر موضع میں انجمن امداد باہمی قایم ہو جائے۔ پچیس سال کی مدت میں یہ کام پورا نہ ہو سکا اور اگر ہو بھی جائے تو اپنے ماہانہ حصص کی قلت سے مزارعین فوراً اپنے قرضہ سے سبکدوش نہ ہو سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ ابتدائی حصص کی رقم بہت قلیل رہے گی۔

جہاں تک راقم الحروف نے غور کیا اور زرعی طبقہ کی قرضداری کا حل معلوم کرنے کی کوشش کی وہاں وہ یہی رائے قایم کر سکا کہ کافی سرمایہ کے بغیر اس قسم کے قوانین سے کوئی اصلاح

ایسے امور کی نگہداشت کا انتظام رکھا جا سکتا ہے کہ کاشتکار پھر کسی اور قرضہ کا کاروبار زمین گروی بنک کے سوا دوسرے سے نہ کرے۔ اور جب موضع کے ساہوکار وغیرہ کیلئے بھی زمین گروی بنک میں سرمایہ لگانے کی سہولتیں مہیا ہو جائیں گی تو سود در سود کے امتناع اور سود کی حد بندی کے متعلق بھی قوانین کے نفاذ پر غور ہو سکتا ہے۔

آیندہ سے مواضع کے کاشتکاروں اور اہل حرفہ میں بلاسودی امداد باہمی کی انجمن کے اصول کو کامیابی سے رائج کرنے کی تبلیغ اور کوشش کامیابی کے ساتھ کیجا سکتی ہے۔ بڑے قرضہ کا کاروبار ضلع کی قومی بنک اور زمین گروی بنک سے کم سود سے کرنے کی اور موضع کے اندرونی اور معمولی ضرورتوں کی بجائے خود موضع کی بلاسودی انجمن امداد باہمی کے ذریعہ سے کرنے کا اصول نہایت کامیاب ہو سکتا ہے۔ ابتدا میں چند سال تک بلاسودی امداد باہمی کا کام زیادہ کامیاب نہ دکھائی دے گا مگر جیسے جیسے ہر سال سرمایہ زیادہ ہوتا جائے گا ویسے ویسے یہ کام ایک ایسے عظیم معیار پر پہنچ جائے گا کہ سردست اس کا تخیل بھی نہیں ہو سکتا۔ عموماً مواضع میں دس پندرہ سال میں سالانہ ایک ہزار روپے کے حساب سے پندرہ ہزار روپے جمع ہو سکتے ہیں اور کسی موضع کے لیے اس قدر رقم اس کے باشندوں کی فوری ضرورتوں اور کاروبار قرضہ کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔ اور بتدریج موضع کی جانب سے اس رقم مجتمع کا نصف حصہ تجارتی کاروبار مثلاً موضع کی پیداوار کو زرعی مارکیٹوں تک لانے اور موضع کی دوسری ضروریات کو فراہم کرنے میں لگائی جا سکتی ہے۔ جو کچھ محدود تجربہ حیدرآباد میں سررشتہ بندوبست اور محکمہ معتمدی مالگذاری وغیرہ کی بلاسودی انجمن ہائے امداد باہمی کے عمدہ نتائج کے متعلق ہو چکا ہے وہ اس امر کی قوی اُمید دلاتا ہے کہ تبلیغ و کوشش سے بہت اعلیٰ نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ مواضعات کی خوشحالی کے لیے اس سے بہتر اور اس سے آسان تر کوئی اور کوشش نہیں ہو سکتی البتہ ہر ایک کوشش اور تحریک کی طرح لازمی ہے کہ یہ تحریک بھی سرکاری رہنمائی میں آگے بڑھے۔ سررشتہ امداد باہمی جس طرح سودی انجمنوں کی جانب متوجہ ہے اسی طرح

مہیب بارگراں سے سبکدوش ہو جائیں گے، اور ان کے بنک کے قرضہ کے وصول کے لیے وہی انتظامات عمل میں آسکتے ہیں جو زمین گروی بنک معمولاً عمل میں لاتے ہیں۔ قرضہ کی یکسوی سے کاشتکار اپنے زمینوں کی اصلاح، باؤلیوں کی کھدائی، عمدہ تخم اور کھاد کی فراہمی، اچھے جانوروں کی خریدی اور دیگر امور کی جانب متوجہ ہو سکے گا۔

دس سال میں کل مملکت آصفیہ کے زرعی قرضہ کی ادائی کے انتظامات اور اس کے لیے پچیس تیس کروڑ روپیے کے سرمایہ کی فراہمی بڑی نزاکتوں اور مشکلات سے مملو ہے گر یہ مشکلات ہمت و عزم صمیم اور صحیح طریقۂ کار سے حل ہو سکتے ہیں۔

اس ضمن میں معاشی ترقی کے دو اہم ذریعے بھی بآسانی فراہم ہو جا سکیں گے۔ اول تو یہ کہ اس عمل سے ہر موضع میں بنک کا کاروبار کچھ نہ کچھ قایم ہو جائے گا۔ اور ۲۲ ہزار مواضع کے قرضہ کی دریافت، ادائی، اور پھر حصول اقساط و منافع قرضہ کے لیے ہر ضلع کی بنک کا کاروبار مواضع میں بہت کچھ پھیل جائے گا۔ اس کی وجہ سے سیکڑوں نہیں ہزاروں تعلیم یافتہ افراد کے لیے ذرایع روزگار مہیا ہو جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ جب تمام مواضع کی زرعی قرضہ داری کا بوقت واحد تصفیہ عمل میں آجائے گا موضع کے ساہوکاروں کے پاس کافی روپیہ مہیا ہو جائے گا۔ اس کو وہ بیکار نہیں رکھ سکتے۔ اور مناسب کوشش سے ان کا یہ روپیہ ضلع کی بنک کے توسط سے زرعی و حرفتی کاروبار میں لگایا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہم اپنے ملک کے زرعی کاروبار کو امریکہ اور کناڈا وغیرہ ممالک کی سطح پر پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں گے، اور بنک کاری موضع بموضع پھیل جائیگی۔

لیکن اس موقع پر یہ سوال پیدا ہونا لامحالہ ضروری ہے کہ:-

"اس کی کیا ذمہ داری ہے کہ آیندہ پھر کاشتکار جدید قرضے لے کر اپنے لیے پھر وہی مصیبت پیدا نہ کرلیں۔"

اس سلسلے میں یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ جب کاشتکار کے زراعتی کاروبار کا اصل سرمایہ یعنی "زمین" جب قومی زمین گروی بنک کے پاس مکفول ہو جائے گی تو قواعد و ضوابط میں

ہے کہ ولایت کی تعلیم کے اخراجات کا بار بھی سسرال اٹھائے۔ دعوتوں اور ناچ رنگ میں جو فضول خرچی ہوتی ہے وہ جداگانہ ہے۔ جناب بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ مرحوم نے اپنے ایک لکچر میں جو خواتین کے کسی جلسہ میں دیا گیا ان مذموم امور پر کافی روشنی ڈالی ہے جن افراد کے گھر میں دختروں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اگر وہ اہل ثروت ہیں تو ناگزیر داماروں کی ان خواہشوں پر توجہ کرنی پڑتی ہے اور اس کے لیے قرض داری یا حصول مایہ الاحتفاظ کی مذموم روش اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اور بھی ناجائز اور قابل نفرت مطالبات ہیں جن کے پورے نہ کرسکنے کی وجہ سے شرفا کے خاندانوں میں بکثرت لڑکیاں کافی عمر کے بعد بھی ناکتخدا بیٹھی ہوئی ہیں۔ اور بکثرت افراد شادیوں کی قرض داری کی وجہ سے زیر بار ہیں۔ طبقۂ مزارعین میں نہیں، بلکہ متمول طبقہ میں ترک مراسم اور مطالبۂ جہیز کے مذموم رواج کو ترک کرانے کے لیے خود چند متمول سنجیدہ افراد کو میدانِ عمل میں آجانا چاہیے اور اپنے عمل کا کوئی بلند نمونہ قایم کرنا چاہیے تاکہ قومی معاشرت کی اصلاح سے عام معاشی خوش حالی کا بھی دور دورہ ہو۔

مزارعین اور گھریلو صنعتیں۔

ایک خیال عام طور سے یہ ہے کہ مزارعین اپنے فرصت کے زمانے میں گھریلو صنعتوں کا کام انجام دیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ بہت سے زراعت پیشہ افراد جب زراعتی کاروبار سے فارغ ہوجاتے ہیں قصبات وغیرہ میں مزدوری کے لیے چلے جایا کرتے ہیں۔ اور اگر کام مہیا ہو تو ضرور کام کریں گے۔ یہ خیال کہ گھریلو صنعتوں کا کام اختیار کرنا چاہیے کچھ زیادہ آسان نہیں ہے۔ اس کے سلسلے میں مشکلات بھی ہیں۔ ایک پیشہ ور کو دوسرے پیشہ کا کام کرنا آسان نہیں ہے۔ ایک زراعت پیشہ سے بافندگی یا کسی اور حرفت کا کام کافی مہارت کے بغیر نہیں چل سکتا۔ علاوہ ازیں دوسرے پیشہ کے آلات فراہم کرنا، کاروبار کے لیے رقم مہیا کرنا اور پھر جو سامان تیار ہو اس کو بازار میں فروخت کے لیے روانہ کرنا۔ غرض یہ اور دوسری مشکلیں درپیش ہوتی ہیں۔ پھر جو منافع حاصل ہوتا ہے وہ بھی حوصلہ افزا نہیں ہوتا کہ ندھی رچی

بلاسودی انجمنوں کے متعلق بھی متوجہ ہوسکتا ہے۔

ابتدائی زمانہ میں جب کہ رجسٹر شدہ سررشتہ امداد باہمی کی بلاسودی انجمن کے پیسے سرمایہ محدود ہوتا اور ماہانہ قسطیں کم مقدار میں وصول ہوتی ہیں یہ سہولت رکھی جاسکتی ہے کہ ناگزیر حالات میں کوا پریٹو بنک یا کسی دوسرے مقامی ادارہ سے کم منافع پر قرضہ لیا جائے۔ اس کے لیے قواعد مرتب ہوسکتے ہیں اور آہستہ آہستہ جیسے جیسے انجمن کا سرمایہ زیادہ ہوتا جائے سودی قرضہ کو کم کرتے ہوئے بالکلیہ بے باق کردیا جائے۔

اسراف وفضول خرچی کا انسداد۔

ان مباحث کے بعد جناب مولوی محمد لیاقت اللہ خان صاحب نے یہ رہنمائی فرمائی کہ چند امور کی تبلیغ زراعت پیشہ طبقہ میں ہونی چاہیے۔ اُن کی ایک بات یہ ہے کہ:۔

کفایت شعاری کی عادت پیدا کریں اور شادیوں اور دوسری تقریبوں میں جو فضول خرچی ہوتی ہے اس کو روکیں۔"

مناسب ہونے میں کوئی کلام نہیں مگر صورت حال یہ ہے کہ خالص زراعت پیشہ طبقہ اپنی مالی حالت اور مفلسی کی وجہ سے شادی بیاہ اور دوسری تقریبوں میں فضول خرچی نہیں کرسکتا۔ گاؤں والے مزارعین کی شادیاں محدود پیمانے پر ہی مبنی ہوتی ہیں۔ حقیقت دریافت کی جائے تو مزارعین نہیں بلکہ سرمایہ دار طبقہ اور خاصکر حکام، جاگیردار، معاش دار، وکلا اور ساہوکاروں کے پاس شادیوں اور دوسری تقریبوں میں اسراف ہوتا ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ چھوٹے طبقہ کے نوجوان جو خوش قسمتی سے تعلیمی اسناد حاصل کرلیتے ہیں یا تعلیمی کامیابی کے بعد مزید خوش قسمتی سے سیول بین یا گزیٹیڈ عہدہ دار ہوجاتے ہیں ان میں ہی بعض افراد اس تماش کے ہوتے ہیں کہ شادی کو حصول دولت کا ذریعہ بنایا جائے۔ ان کی فرمائش ہوتی ہے کہ جہیز میں کافی تعداد میں قیمتی ملبوسات دیے جائیں۔ مرصع زیورات دیے جائیں۔ فرنیچر دیا جائے۔ چاندی کا سامان ملے۔ موٹر ملے، بنگلہ ملے اور اگر ابھی متعلم ہیں تو یہ خواہش ہوتی

الف۔ رقبۂ جاگیرات و انعامات جو علاقۂ خالصہ میں شریک ہوگیا کس قدر ہے اور اس کی بنا پر آمدنی مالگزاری میں کس حد تک اضافہ ہوا کس حد تک منہائی عمل میں آنی چاہیے۔

ب۔ ذرائع آبپاشی میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی وجہ سے منہائی کس قدر ہونی چاہیے ان دونوں منہائیوں کے باوجود جو اضافہ ہوا ہے وہ ۶۰ سالہ گرانی اجناس۔ ترقی ذرائع رسل و رسایل کے مدنظر کہاں تک واجبی یا ناواجبی خیال کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ محصولات مالگزاری ادا کرنے کے بعد مزارعین کے لیے جو رقم باقی رہ جاتی ہے وہ ان کی بسر بہر وکیلئے کافی ہے یا ناکافی۔

۳۔ گزشتہ دور میں گرانی قیمت اجناس کا جو فایدہ ہوا ہے اس سے تمتع کس طبقہ کو ہوا ہے اور اگر خود مزارعین واجبی تمتع سے محروم رہے ہیں تو اس کے وجوہات کیا ہیں۔

۴۔ موجودہ محاصل کروڑگیری اور مالگزاری اور جنگلات وغیرہ میں کیا کسی بنیادی تغیر کی ضرورت ہے۔

۵۔ اس ملک کے لیے انکم ٹکس کا طریقہ مناسب ہو سکتا ہے یا نہیں، اور اس سے کن فوایدکی توقع ہے۔

۶۔ آبکاری کی بنیادی پالسی سے حقیقت میں استعمال مسکرات کم ہورہا ہے یا زیادہ۔ استعمال مسکرات میں کمی کے لیے صحیح چارۂ کار کیا ہوسکتا ہے۔

ان امور کے متعلق راقم الحروف کی ذاتی رائے یہ ہے کہ۔

گزشتہ ۶۰ سال کے مقابل جب کہ محاصل مالگزاری دو کروڑ تھے اب تین کروڑ ہیں بلند کر دیا ہر دو منہائیوں کے بعد محاصل میں جو اضافہ جدید بندوبستوں کی وجہ سے ہوا ہے وہ گرانی قیمت اجناس اور ذرایع رسل و رسایل کی ترقیوں کے مقابل چنداں ناقابل برداشت نہیں ہے۔ لیکن وہی ساہوکار اور تاجر مزارعین کو فایدہ پہنچانے کے بجائے خود فائدہ حاصل کر لیتے ہیں۔ نقص سرمایہ داری اور درمیانی واسطہ کا ہے۔ اس سلسلہ میں مزارعین کی قرض داری کے لیے

کانگریس اور دوسرے ادارے بائیس۲۲ سال سے اس کا پرچار کر رہے ہیں لیکن کامیابی ایسی نہیں حاصل ہوئی جو خاص اہمیت رکھتی ہو

میوہ کی کاشت۔

یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ اہل دیہات کو اس بات کی بھی ترغیب دینی چاہیئے کہ اپنے مکانات کے صحن میں میوہ کے دو ایک درخت لگائیں، اور ایک آدھ بیل ترکاری کی اپنے مکان یا صحن کی دیوار پر چڑھائیں۔

یہ چیز ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے مفید ہونے میں کوئی کلام نہیں، البتہ میوہ کے بہتر درخت اور ترکاریوں کے عمدہ تخم کی فراہمی کا انتظام ہونا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ہمارے ملک میں میوہ کی درآمد بھی کثرت سے ہوتی ہے۔ سالانہ جو تر اور خشک میوہ درآمد ہوتا ہے اس کی قیمت پچاس لاکھ سے زیادہ ہوتی ہے جس کثرت سے بے نشان، طوطا پری، نیلم آم، موسمبی، کونلہ اور موز وغیرہ کی درآمد بیرون ملک سے ہوتی ہے وہ بڑی حد تک کم ہو جا سکتی ہے، اگر ملک میں میوہ کی پیداوار کو ترقی دی جائے۔ ہمارے ملک کی زمین میں اچھے میوے اور عمدہ ترکاری کی قوت روئیدگی کافی موجود ہے۔ سررشتۂ زراعت اور محکمۂ مال کے باہمی تعاون اور مشورے سے بہت کچھ کام ہو سکتا ہے۔ چند سال تک دہارہ کی کمی سے بھی کوئی صورت پیدا کی جا سکتی ہے۔

محاصل مالگذاری۔

ملک کے معاشی مسایل کے سلسلے میں محاصل مالگذاری کا مسئلہ بہت غور و خوض کا محتاج ہے۔ بعض حلقوں میں محاصل مالگزاری کی گرانباری اور اس کو کم کرنے کی خواہش کا اظہار ہوتا رہتا ہے، نیز محصول کروڑگیری اٹھا دینے اور انکم ٹکس جاری کرنے کا مطالبہ بھی ہوتا رہتا ہے اس لحاظ سے مناسب ہوگا کہ مسایل ذیل پر صاحبان ذوق و علم تفصیلی طور سے غور و تامل کریں۔

۱۔ مالگزاری میں گزشتہ (۱۴) سال میں کس قدر اضافہ ہوا اور اس اضافہ میں

رسایل مالگزاری کے بعد ہمارے ملک میں مالگزاری کے معاملات پر کوئی قابلِ استناد ادب وجود میں نہیں آیا۔ ضرورت ہے کہ ملک کے نوجوان معاشیات داں اور ذوقِ سلیم رکھنے والے حکام مالگزاری و بندوبست اس جانب متوجہ ہوں۔

دست کاریاں۔

یہ امر کہ زراعت پیشہ افراد اپنی فرصت کے وقت میں گھریلو صنعتوں کا کام انجام دیں۔ اس کے متعلق اوپر کچھ اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے قطع نظر مشینوں سے دستکاریوں پر جو اثر پڑا اس کی بنا پر دستکاریوں کی تباہی لازمی ہے۔ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ برطانوی ہند میں مشکلات کے باوجود بہت سی دستکاریاں اچھی حالت میں موجود ہیں، اور ان کی حالت اس قدر بہتر ہے کہ خود حیدرآباد اور ممالک محروسہ کے بازاروں میں یہ چیزیں فروخت ہوجاتی ہیں۔ ہماری ہر قسم کی دست کاریاں برباد ہوگئی ہیں۔ مثلاً پٹن، اورنگ آباد، ناندیڑ، نارائن پیٹ، اور سنگا ریڈی وغیرہ مقامات کی زرین، ریشمی پارچہ بافی، گوٹا کناری وغیرہ ہیں۔ ان کی پہلے کیا حالت تھی کس قدر زیادہ تعداد میں یہ چیزیں فروخت ہوتی تھیں اب کس قدر اُجڑی ہوئی حالت ہے۔ بنارس، احمد آباد، سورت، مدہرہ وغیرہ سے کس قدر وافر سامان ملک میں آتا ہے کیوں ان مقامات کی دست کاریاں فروغ پر ہیں۔ اور کیوں ہمارے ملک کی دستکاریاں تباہ ہوچکی ہیں۔ ان امور پر متعدد مرتبہ اظہار خیالات کیا جاچکا ہے۔ بنارسی زرین پارچے یا دوسرے مقامات کی ریشمی اور سوتی ساڑیاں اس لیے ہمارے ملک میں آتی ہیں کہ وہاں کافی مقدار میں سرمایہ لگا ہوا ہے اور ان کی آڑتھیاں یہاں موجود ہیں۔ اور آسانی کے ساتھ تیار مال لاکر فروخت کرتی ہیں۔ ملک کی دست کاریوں کو یہ سہولتیں حاصل نہیں ہیں۔ حال حال میں اورنگ آباد و حیدرآباد میں ترقی یافتہ دستی پارچہ بافی کے مشینوں کو برقی قوت سے چلانے اور ریشمی پارچے تیار کرنے کی کوشش کامیاب نتائج کا اظہار کرتی ہے۔

دست کاریوں کی کامیابی کے لیے زمانۂ حال میں تین چیزیں ضروری ہیں:۔

حقیقی چارہ کار دریافت کرنا ناگزیر ہے۔

محاصل مالگزاری وجنگلات میں کوئی بنیادی تغیر بہت کچھ غور وخوص کا محتاج ہے۔ برطانوی ہند کے نظریات پر آنکھ بند کرکے عمل نہ کرنا چاہیے۔

راقم الحروف کے خیال میں اس ملک میں محصول کروڑگیری بہترین طریقۂ محصول اندازی ہے۔ اور اس کی وجہ سے اصل بار ہر طبقۂ رعایا پر حسب حصۂ رسدی قلیل مقدار میں پڑتا ہے۔ محصول کروڑگیری برخاست کردیا جائے تو اس سے یورپ وامریکہ کی مصنوعات کو اور محدود تجارتی طبقہ کو فایدہ ہوگا۔ رعایا کو اس کا فایدہ چنداں محسوس نہ ہوگا۔

انکم ٹکس اس ملک میں بالکل اجنبی محصول ہے۔ اس ملک میں وہ زیادہ مقدار میں وصول نہ ہوسکے گا بمقابلہ محصول کروڑگیری کے مقابلہ میں انکم ٹکس کے وصول کرنے میں خیانت اور رشوت کے زیادہ امکانات رہیں گے۔ اس کے وصول کرنے میں مصارف بھی زیادہ عائد ہوں گے۔ انکم ٹکس کا اس ملک میں نہ لیا جانا ایک عظیم ترین برکت اور بہترین خصوصیت ہے جس پر ہم فخر کرسکتے ہیں۔ ہم پر لازمی اور واجبی نہیں ہے کہ اس طریقۂ محصول کو ہم اس بنا پر جاری کرنا چاہیں کہ دوسرے ممالک میں یہ طریقہ رائج ہے۔ اس ملک میں حکومت جو عام محاصل وصول کرتی ہے وہ اس کے مصارف جاریہ کے بعد بھی بچ رہتے ہیں اکروڑوں کی ملکیت اور اثاثے اس کے نتائج ہیں۔ پھر کیوں یہ محصول لیا جائے۔ دنیا کی ہر حکومت کا مسلمہ اصول ہے کہ اسی قدر محصول لیا جائے جس کی ضرورت ہے۔

آبکاری کی پالیسی جو کچھ ہے اس سے قطع نظر بہرحال منشیات کی جو کچھ کثرت ہے اور خاصکر ولایتی شرابوں کی روز بروز گرمی بازار موثر تدابیر انسداد کی متقاضی ہے مگر ان طریقوں سے نہیں جو کانگریسی وزراء کی جانب سے چند روز برطانوی ہند کے چند صوبجات میں اختیار کئے گئے تھے۔

مسایل مالگزاری بہت کچھ تحقیق وتفحص کے محتاج ہیں۔ نواب محسن الملک مرحوم کے

چائے خانے اور طعام خانے لازمات سے ہوگئے ہیں۔ جب یہ سب ترغیبات کھلے بندوں نظر فریب بنے ہوئے ہیں اور کوئی روک ٹوک نہیں تو عام طور سے لوگ اس سے باز نہیں رہ سکتے خواہ کوئی اپنی جگہ کتنا ہی تاسف کیوں نہ کرے۔ قانون کے ذریعہ مناسب حد بندیاں پیدا کر دی جائیں اور تعلیم و تربیت میں اخلاق اور خوفِ خدا کے عنصر کو ترقی دی جائے تو بدی کے نشانات خود بخود مدھم پڑ جائیں گے۔ محض معاشی کلب گھروں سے حالات کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ آخر اعلیٰ طبقہ کے افرادِ ملک کیلئے کلب گھر کھلے ہوئے ہیں، وہاں اخبارات، کتب، ٹینس وغیرہ مفید مشاغل موجود ہیں لیکن سب سے زیادہ اجتماع تاش کی میز پر نظر آئے گا۔ عمال سے بڑھ کر حکام تاش اور گھوڑ دوڑ میں بازی لگانے کے شوق میں مبتلا ہیں۔ سرکاری فرائض سے زیادہ انہماک اس تاش اور دوسرے لہو و لعب میں نظر آئیگا۔ اسکی اصلاح دفترداری معاشی کمیٹیوں کے بجائے موجودہ دفتری انجمن ہائے امداد باہمی کے ذریعہ زیادہ آسانی سے ہوسکتی ہے۔ حکام چاہیں تو عمال اور ملازم پر اپنا اخلاقی اثر ڈال سکتے ہیں۔ اگر اعلیٰ حکام و عہدہ دار خود اصلاح معاشرت اور ترک رسوم کا نمونہ بنیں تو حالات بہتر ہوسکتے ہیں۔

جناب مولوی لیاقت اللہ خان صاحب نے متوسط اور اعلیٰ طبقے کی خواتین کی نسبت فرمایا ہے کہ:۔

> "کوئی کام جسمانی محنت کا نہیں کرتیں، متعدد ملازمین کی ان کو ہر آن محتاجی رہتی ہے جیسے کہ مریض کو نرس کی۔ گھر کے کاروبار سب ملازمین کے تفویض رہتے ہیں اور ہر قسم کی فضول خرچی ہوا کرتی ہے۔ بچے آیاؤں کے سپرد ہو جاتے ہیں۔ ماں باپ کے ساتھ نہ اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ماں کی ذاتی توجہ و تربیت سے یہ محروم ہو کر بڑے ہوتے ہیں۔ رسم و رواج کو ہماری مستورات اس درجہ اہمیت دیتی ہیں کہ چاہے کل اثاث البیت فروخت ہو جائے مگر مقررہ تقاریب نہ ٹلیں۔"

یہ امور بڑی حد تک صحیح ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک اور قوم میں ہر زمانہ میں اعلیٰ طبقہ کی خواتین کی زندگی تقریباً اسی طرح گزرتی رہی ہے۔ وہ عیش و نشاط اور راحت و تنعم اور لطف زندگی کا ذریعہ سمجھی جاتی ہیں، البتہ اگر ہمارے دور میں اس میں زیادہ ابتری نمایاں ہے تو اس لیے کہ

۱۔ دست کار کی رہنمائی مال کی وضع اور رنگ بافت اور جدید طریقۂ دست کاری اور جدید آلات کے بارے میں مسلسل ہوتی رہنی چاہیے ۔

۲۔ سرمایہ موجود ہو کہ خام مال خرید سکے اور مال کافی مقدار میں تیار کر سکے ۔

۳۔ مال فروخت کرنے کے لیے بازار آسانی سے مل جائے ۔

ان تینوں امور میں ہمارے ملک کے دست کار کس قدر مبتلائے مشکلات ہیں وہ روشن ہے ۔ ہمارے ملک کی سالانہ نمائشوں میں ملک کی اور خاصکر اضلاع کی دست کاریاں کس قدر مقدار میں فروخت ہوتی ہیں اور ان کی کیا حالت ہے وہ عیاں ہے ۔ فروخت گاہ مصنوعات ملکی میں کچھ سامان فرمائش سے تیار کر کے رکھ دینا اصلی مشکل کو حل نہیں کر سکتا ہے ۔ نیز تین چار لاکھ روپے کی قلیل امدادی رقم سے جو زراعت کی تقاوی کے طور پر منظور اور تقسیم کی جائے کوئی حقیقی فایدہ نہیں حاصل ہو سکتا ۔ یہ کام معاشی کمیٹی کا ہے کہ صناعوں اور تاجروں سے براہ راست تبادلۂ خیالات کے بعد ان ذرایع کو دریافت کرے کہ جن سے ملکت آصفیہ کے دست کاروں کی مشکلات حل ہوں اور بازاروں میں ان کے تیار شدہ مال کی فراہمی بآسانی ہو سکے ۔

طبقۂ ملازمین و طبقۂ اناث ۔

اس خطبۂ صدارت کے آخر میں ملازم پیشہ طبقہ اور طبقۂ اناث کے متعلق بھی اظہار خیال کیا گیا ہے ۔ ملازم پیشہ طبقہ سے قطع نظر معاشی اور معاشرتی حالات کے اعتبار سے ملک کے تمام طبقات کی حالت یکساں ہے ۔ چائے خانہ اور سینما کا شوق علی الاکثر تمام ملک پر محیط ہے اور ملازموں سے زیادہ مزدور پیشہ اور دیگر غیر ملازم طبقات کو ان امور سے دلچسپی ہے ۔ یہ شوق مغرب زدگی کا لازمی نتیجہ ہے ۔ مدارس اور تعلیم سے خوف خدا ، اخلاق کی پاکیزگی اور شریعت کے عنصر کو خارج کرتے جائیں اور مغربی آزاد خیالی بڑھاتے جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ وہی طرز زندگی ہے جس کی شکایت کی جاتی ہے ۔ ایک طرف آبکاری کے کاروبار باقاعدگی کے ساتھ کھلے بندوں چل رہے ہیں ؛ دوسری طرف سینما کسی حد بندی کے بغیر عیش رونشاط اور جذبات کو ابھارنے والے مناظر دکھا رہے ہیں ۔ ساتھ ہی موجودہ زمانہ کی ضروریات زندگی کیلئے

حیدرآبادی روغنی تخم کی اہمیت

از ڈاکٹر امیر علی خاں صاحب پی ایچ ڈی چیف مارکٹنگ افیسر سرکارعالی

"یہ مضمون ۱۳۵۰ف کی معاشی کانفرنس میں پڑھا گیا تھا۔ اس کے بعد حالات میں بہت بڑا تغیر ہوگیا ہے بریں ہم مضمون کی اہمیت آج بھی کسی طرح کم نہیں ہوئی۔" مجلہ

حضرات! مجھے افسوس ہے کہ گزشتہ دو ہفتوں کی علالت کی وجہ اس دلچسپ موضوع پر میں آپ کے لئے اب مضمون نہ لکھ سکا جیسا کہ لکھنے کا ارادہ تھا۔ علالت کے مابعد کمزوری کی وجہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں اس وسیع مضمون کے چند پہلو کا مختصر ذکر کرنے پر اکتفا کروں۔ البتہ میری مختصر تقریر کے بعد اگر آپ میں سے کوئی بھی اس بارے میں سوال کرنا چاہیں تو میں حتی الامکان جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

یہ آپ لوگوں سے پوشیدہ نہیں کہ اب ہمارا ملک دنیا کی تجارتی گردش میں آچکا ہے۔ ہم از خود نہ اپنے پورے ضروریات مہیا کرسکتے ہیں اور نہ اپنے ملک کی صنعتی یا خام پیداوار کو باہر جانے سے روک سکتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیئے کہ اس تجارتی دور میں ہماری فلاح و بہبود، بلکہ ہماری بقا ہی اس میں ہے کہ زیادہ سے زیادہ تجارت کو فروغ دیں، اپنا مال باہر بھیجیں اور باہر سے اپنے ضروریات بھی مہیا کریں۔ البتہ کونسی اشیا کو برآمد کرنے میں ملک کا فائدہ ہے اور کونسی چیزوں کو درآمد کرنا چاہیے اس کا تمیز کرنا ہمارا فرض ہے۔

اس نقطۂ نظر سے ہمارے ملک کے درآمد و برآمد کے اعداد کو ملاحظہ فرمایئے تو ایک عبرتناک منظر دکھائی دیتا ہے۔ اس منظر کو آپ کی نمایش کے بانیان نے ابتدائی اشتہاری کارڈ میں بخوبی ظاہر کیا تھا۔ یہ کارڈ آپ کی نظروں سے ضرور گذرا ہوگا اور آپ نے ضرور محسوس کیا ہوگا کہ ہماری برآمد تقریباً پوری خام پیداوار پر مبنی ہے، اور ہماری درآمد میں زیادہ تر صنعتی اشیاء موجود ہیں۔

مغربی زندگی کا دور ہے۔ وہ اس میں نسوانی ضروریات اور روایات قومی و ملکی اور غذا پرستی کی تعلیم اور اس نقطۂ نظر سے تربیت ہو تو یہ مصائب خود بخود دور ہو جائیں گے۔ مستورات کو خود مرد نمونہ بنکر اصلاح حالات پر مائل کرسکتے ہیں۔

جناب مولوی لیاقت اللہ خان صاحب کے خطبۂ صدارت کے بعد اور بھی بعض تقریریں ہوئیں۔ مثلاً ایوانِ تجارت کے عشائیہ میں آنربیل صدرالمہام بہادر فینانس کی تقریر سے بھی ملک کے خود مکتفی ہونے کے نظریہ اور سرکاری امداد صنعتی کاروبار میں شامل کرنے کی جو نفی کی گئی ہے اُس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ہمارے ملک کو زیادہ تر خام پیداوار فراہم کرنے والا ملک بنے رہنے پر قانع ہونا چاہیے۔

آخر میں مجھ کو یہ عرض کرنا ہے کہ تمام دنیا میں انقلابی طوفان چل رہا ہے۔ ہمارے ملک اور ہماری حکومت کے لیے معاشی امور میں صرف غور و خوض نہیں بلکہ حرکت اور سعی عظیم کی ضرورت ہے۔

بہر حال گزشتہ ۶۰ سال میں اگر ہم درحقیقت کام کرتے تو آج حیدرآباد کہاں رہتا۔ اس ۶۰ سال کی مدت میں ہم ایک کے بعد دوسرے مدارالمہام یا وزیر سلطنت کے خلاف انٹریگ کرتے رہے۔ ہم شخصی منافع اور مصالح میں الجھے ہوئے رہے۔ بلند نظری، ایثار اور جراءت سے ہم دور رہے۔ ہم اپنے سایہ سے ڈرتے رہے۔ معاشی اور ترقی ترقی سے قطع نظر دوسرے اور شعبہ جات میں بھی ہم پیچھے رہ گئے۔ گزشتہ ۶۰ سال کی مدت تو خیر دور کی بات ہے۔ گزشتہ ۲۲ سال کو ہی لیجئے۔ ہم کس قدر بیدار ہوئے اور کتنی مسافت طے کی۔ غرض اب مستقبل کا مقابلہ کرنا ہے۔ اگر ہمت، اولوالعزمی اور عزم صادق پیدا ہو جائے تو پھر ترقی کا ہر میدان کامیابی سے سر ہو سکے۔"

---

*

نرخ بہت کم ہو جائیں گے تو کاشت کار کو کافی رقم کس طرح ہاتھ آئے گی۔

مختلف طریقے اس کو حل کرنے کے لئے پیش نظر ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ سرکار کو چاہیے کہ مونگ پھلی خریدے اور جب قیمتیں زیادہ ہوں تو اس وقت فروخت کرے۔ دوسرا کہتا ہے کہ رقبہ کو ہر طرح کم کرنا چاہیے۔ تیسرے کا خیال ہے کہ کاشت کار کو اپنا مال روک رکھنے کے لیے رقمی سہولتیں بہم پہنچانا چاہیے۔ دقت یہ ہے کہ ان سب تحریکوں میں ذرا سی جانچ پر کوئی نہ کوئی بڑا نقص دکھائی دینے لگتا ہے جس کی وجہ کوئی خاص تحریک قبول کرنے میں سرکار کو تامل ہوتا ہے۔

چار و ناچار ایک ہی صورت نظر آتی ہے وہ یہ کہ ملک ہی کی صنعت کو اس طرح فروغ دیا جائے تاکہ خام پیداوار بجائے باہر جانے کے ملک ہی میں صنعتی کارخانہ جات قائم ہو جائیں۔

آپ کو یہ سنکر مسرت ہوگی کہ سرکار کی اس جانب توجہ سے صنعت روغن ہی کو کس قدر فروغ دیا۔ سنہ ۱۳۴۴ف میں سرکار نے روغن کی برآمد پر سے چالیس ہزار روپیہ کا نقصان برداشت کر کے محصول کروڑ گیری برخواست کر دیا۔ اس ایک حکم کی بناء پر مابعد (چار) سال میں ملک کے گوشہ گوشہ میں روغن کشی کی اتنی گرنیاں قائم ہوئیں کہ جب سنہ ۱۳۴۶ف میں نصف محصول عائد کیے جانے لگا تو اس کی آمدنی چار لاکھ ہو گئی اور آج صرف روغن مونگ پھلی کی برآمد سے سرکار کو تقریباً آٹھ لاکھ روپیہ کروڑ گیری وصول ہو رہی ہے۔

صرف تیل کشی کے پیچے نہیں بلکہ اس تیل سے مصنوعی گھی بنانے کے کارخانے کیلئے بھی سرکار عالی نے منظوری دیدی ہے اور عنقریب یہ کاروبار بھی آغاز ہو جائیں گے۔

چند ہی سال قبل ہمارے ملک سے تخم ارنڈی کافی مقدار میں برآمد ہوتا تھا بلکہ کہنا چاہیے کہ دنیا میں سب سے زیادہ ارنڈی ہماری ہی مملکت میں پیدا ہوتی تھی۔ یوں تو اب بھی کافی مقدار میں یہ تخم پیدا ہوتا ہے لیکن گذشتہ دس سال میں ملک برازیل میں اس کی کاشت کو فروغ ہونے کی وجہ اس کی قیمت نہایت گر گئی ہے جس کی وجہ کاشت میں بھی انحطاط شروع ہو گیا ہے لیکن اس کے روغن کے استعمال کے لئے ایسے نئے نئے ذریعہ پیدا ہو رہے ہیں کہ عنقریب ممکن ہے کہ اس کی طلب میں زیادتی ہو کر

اپنے ملکیوں کو پارچہ بافی سے فائدہ اُٹھانے سے محروم رکھ کر ہم روئی برآمد کرتے ہیں اور باہر کے ملکوں کو اسی روئی سے کپڑ بنا کر ہم ہی کو فروخت کرنے کا موقعہ دیتے ہیں۔ اس طرح ہم اپنے تیلیوں کو بے روزگار رکھ کر تخم ہائے روغن برآمد کرتے ہیں اور ہمارے ہی ملک کے تخم سے دوسرے ملکوں میں نکالا ہوا تیل خوشی خوشی خرید کر استعمال کرتے ہیں اگر یہ خام پیداوار برآمد شدہ کی مقدار قلیل ہوتی تو زیادہ مضائقہ نہیں تھا لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ہماری برآمد کی جملہ قیمت پندرہ کروڑ روپیوں کے منجملہ پانچ کروڑ روپے کے تو ہم صرف تخم روغن برآمد کرتے ہیں۔

اسی طرح خام پیداوار برآمد کر دینے سے نہ صرف ملک کے باشندوں کو صنعتی کاروبار کا موقعہ نہیں ملتا بلکہ اراضیات کو بھی اس قیمتی جزو سے محروم کیا جاتا ہے جو روغن نکالے جانے کے بعد بحیثیت کھلی اراضیات میں واپس ڈالا جانا چاہیے تھا۔

اس اندھی برآمد کی وجہ نہ صرف ہماری آبادی بلکہ ہماری زمین بھی مفلس ہوتی جاتی ہے۔

اس عام تبصرہ کے بعد مختلف تخم ہائے روغن کے متعلق مختصر تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ ان میں آج کل سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا تخم روغن مونگ پھلی ہے۔ پندرہ بیس سال آگے یہ تخم کا رقبہ ممالک محروسہ میں بہت کم تھا بلکہ کہئے کہ اسکی کاشت ہمارے ملک میں ہوتی ہی نہیں تھی لیکن اس قلیل مدت میں مونگ پھلی کا شمار اس ملک کی اہم ترین پیداوار میں ہونے لگا ہے۔ آج ہمارے ملک میں اس کی کاشت (٦) لاکھ ایکر پر ہوتی ہے اور چار لاکھ ٹن یعنی (٣٦) لاکھ پلے تخم پیدا ہوتا ہے جس کی قیمت تقریباً ساڑھے چار کروڑ ہوتی ہے اس پیداوار کا ¾ حصہ ہم تخم کی شکل میں بمبئی اور مدراس کو برآمد کرتے ہیں ان مقامات پر اس تخم سے روغن نکالا جا کر کچھ تو بیرون ممالک کو روانہ کر دیا جاتا ہے اور کچھ مصنوعی گھی کی صورت میں ہندوستان ہی میں فروخت ہوتا ہے۔

اب تک ہماری مونگ پھلی اور اس کے تیل کے خریدار فرانس۔ اٹلی۔ جرمنی تھے لیکن جنگ کی وجہ یہ مارکٹیں ہمارے لیئے بند ہو گئے ہیں اور گورنمنٹ کے لیے یہ اہم سوال آپڑا ہے کہ اپنے ملک کی پیداوار سے کیا کیا جائے۔ اس کی ملک ہی میں کس طرح کھپت ہو سکتی ہے، اور طلب کی کمی کی وجہ

ہندوستان میں افراطِ زر

از جناب خواجہ شمس الدین صاحب ایم۔ اے (ابتدائی)

جنگ کی وجہ سے جو پیچیدہ معاشی مسائل پیدا ہوتے ہیں ان میں افراط زر کا مسئلہ اپنی ہمہ گیری اور دوررس اثرات کے اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ زر کے مسائل ویسے ہی بہت مشکل ہوتے ہیں لیکن جنگ نے انھیں مشکل تر بنا دیا ہے۔ گذشتہ آٹھ دس مہینوں سے ہندوستان میں غیر معمولی حالات کی رفتار اتنی تیز رہی ہے کہ ہر شخص اسی طرف متوجہ ہے۔ معاشی حلقوں میں افراط زر کے اسباب و نتائج مرکز توجہ بن گئے ہیں۔ یہ مسائل اپنی پیچیدگی کے باوجود ہماری روزمرہ زندگی سے اتنا گہرا تعلق رکھتے ہیں کہ ان کا جاننا نہایت ضروری ہے۔

افراط زر سے عموماً یہ مراد لی جاتی ہے کہ کسی ملک میں زر یا قوت خرید کے مقابلے میں اشیاء یا ایسی چیزوں کی کمی پڑ جائے جن کو خریدا جا سکے۔ افراط زر کی کوئی جامع تعریف نہیں ہے لیکن مختلف معاشیین نے زر کی پالیسی کے سلسلے میں اس کو استعمال کیا ہے۔ فیڈرل ریزرو سسٹم کے ڈاکٹر گولڈن ویزر نے افراط زر کی یہ تعریف کی ہے کہ "زر کی افراط اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ زر کی مقدار جو اشیاء اور خدمات کے لئے مختص ہے ممکن الحصول رسد کے مقابلے میں بہت بڑھ جائے یا قومی آمدنی زر کی اکائیوں میں مادی اکائیوں سے زیادہ ہو جائے۔" افراط زر کے اسباب یہ ہوتے ہیں کہ حکومتیں اپنے جنگی اغراض پورے کرنے کے لئے فرضی اعتبار پر زیادہ نوٹ رائج کر دیتی ہیں یا وہ نظام بنک کاری سے قرض لیتی ہیں اور بنک اپنے اعتبار میں توسیع کر دیتے ہیں۔ ان دونوں کا نتیجہ زر کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اشیاء کی مقدار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اس طرح سے زر کی قدر گھٹ جاتی ہے اور اشیاء گراں ہو جاتی ہیں جس کے باعث غیر منظم مزدوروں اور مستقل تنخواہ پانے والوں کو نقصان ہوتا ہے۔ بچتوں پر اس کا برا اثر پڑتا ہے کیونکہ ان کی قدر بہت گھٹ جاتی ہے۔ ملک کے کارخانہ داروں،

اس کی قیمتوں میں اور اس کے تحت رقبہ میں کافی اضافہ ہو۔

ارغذی کے بعد ہمارے ملک میں تل۔السی اور کرڈڑ کی پیداوار ہوتی ہے ان میں سے تل اور کرڈڑ کا تیل جو میٹھا تیل کہلایا جاتا ہے اکثر غذا کی طرح استعمال ہوتا ہے۔لیکن السی کا تیل ہزاروں صنعتی مرکبات جیسے وارنس مختلف قسم کے پینٹ وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔

لڑائی کی وجہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ان اشیاء کی برآمد میں کمی ہو کر ان کی قیمتیں گرنے کا اندیشہ ہے لیکن یہ قیمتوں کے گرنے سے ہمیں چاہیئے کہ دوسری طرح فائدہ اٹھائیں تیل کے نئے نئے استعمال ڈھونڈ نکالیں اور ان طریقوں کو صنعتی جامہ پہنا کر خود کو اور ملک کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کریں۔

مجھے اپنے فرائض کی انجام دہی میں زیادہ تر ملک کے تجارتی اور صنعتی طبقوں سے سابقہ پڑتا ہے۔مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے ان اہم پیشوں میں ہمارے ملک کے باشندے بہت کم ہیں۔ جو ہندو ہیں وہ مارواڑ۔گجرات۔کاٹیاوار سے آکر یہاں بسے ہیں، جو مسلمان ہیں وہ بھی گجراتی یا کچھی ہیں حیدرآباد کے باشندوں کو ابھی تجارت کی طرف توجہ ہی نہیں ہوئی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ جب ملازمت کا دائرہ روز بروز محدود ہوتا جائے گا تو اکثر کو تجارت کی طرف توجہ ہوگی اور یہ اس شعبۂ زندگی میں خود کو کامیاب ثابت کریں گے میں آپ لوگوں کو اس طرف دعوت دیتے ہوئے یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ فن تجارت آسان نہیں۔تجارت پیشہ کو کامیابی کے لیے ہشیار ہونا ضروری ہوتا ہے۔روپیہ تو کجا آنہ آنہ پائی پائی کی نگہداشت پر تجارت میں کامیابی منحصر ہے۔تجارت و صنعت میں "پرتل" ایک ایسا لفظ ہے جو سوتے جاگتے تجار کے کانوں میں بھنبھناتا رہتا ہے۔اخراجات میں تھوڑی سی کمی یا فائدے میں تھوڑا سا اضافہ لوگوں کو مالا مال کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ تجارت پیشہ حساب میں عموماً ماہر ہوتے ہیں۔لیکن یہ ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ ہر انسان جس طرف خاص توجہ کرے اس طرف ماہری حاصل کر سکتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے وطن کے باشندے اور تعلیم یافتہ طبقہ اگر تجارت کی طرف توجہ کرے تو علم حساب کے اہم نکات سے بھی جلد از جلد واقف ہو جائیں گے۔

اگست ۱۹۳۹ء سے پہلے = ۱۰۰

جنگ کا پہلا سال ۱۱۹

دوسرا سال ۱۲۳

تیسرا سال ۱۵۳

دسمبر ۴۲ء ۲۳۵

اس طرح سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ جنگ شروع ہونے کے بعد سے اب تک قیمتوں میں ۱۰۶٪ کا اضافہ ہوا ہے اور دوسرے ملکوں کی طرح یہاں پر کوشش کے باوجود قابو حاصل نہیں کیا جا سکا۔ انگلستان میں پہلے سال قیمتوں میں ۵۰٪ اضافہ ہوا، دوسرے سال صرف ۸٪ اضافہ ہوا اور تیسرے سال ۳½٪ اور اب قیمتوں پر قابو پا لیا گیا ہے اور مزید اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ انگلستان ہندوستان کی بہ نسبت جنگ سے زیادہ متاثر ہے لیکن وہاں پر صرف ۶۲٪ کا اضافہ ہوا ہے۔ ذیل کی جدول سے معلوم ہوگا کہ دنیا کے مختلف برسرِ جنگ ممالک میں جنگ کے ابتدائی سالوں میں قیمتوں میں کس قدر اضافہ ہوا

تھوک فروشی کی قیمتوں کے اشاری اعداد :-

(اساس) ۱۹۲۹ = ۱۰۰

سال	کلکتہ	بمبئی	برطانیہ	ممالک متحدہ امریکہ	کینیڈا	جرمنی	جاپان
۱۹۳۸	۶۸	۷۰	۸۹	۸۲	۸۲	۷۹	۱۱۴
۱۹۳۹	۷۶	۷۵	۹۰	۸۱	۷۹	۷۸	۱۲۶
۱۹۴۰	۸۵	۸۱	۱۲۰	۸۲	۸۷	۸۰	۱۴۲
۱۹۴۱	۹۹	۹۳	۱۳۴	۹۳	۹۴	۸۲	۱۵۰

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ کے ابتدائی سالوں میں کلکتہ میں ۳۶٪ بمبئی میں ۴۳٪ کینیڈا میں

بڑے بڑے ٹھیکیداروں اور تاجروں کو اس سے بہت فائدہ پہنچتا ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی ملک کا معاشی نظام تباہ ہو جاتا ہے اور ملک کی دنیا میں ساکھ گھٹ جاتی ہے۔

زر کی مقدار میں اگر پیدائش دولت اور کاروبار کی ترقی کی وجہ سے اضافہ ہو تو اُس کو افراطِ زر نہیں کہیں گے کیون کہ ایسی صورت میں تو ہر اچھے نظامِ زر اور اچھی حکومت کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ زر کی مقدار میں اشیاء اور خدمات کی رسد کی زیادتی کے تناسب سے اضافہ کرے ورنہ تفریطِ زر کی صورت پیدا ہو جائے گی جس سے قیمتیں گر جائیں گی، کاروبار بُری طرح متاثر ہوں گے اور ملک میں بے روزگاری پھیل جائے گی۔ ہندوستان میں جنگ کی ابتداء میں کوئی ۲۰۰ کروڑ کی مالیت کے نوٹ جاری تھے لیکن یہ بڑھتے بڑھتے اب ۶۰۰ کروڑ ہو گئے یعنی ۴۰۰ بز کا اضافہ ہوا۔ مندرجہ فہرست بنکوں کے چالو کھاتوں میں اکتوبر ۴۲ء سے دسمبر ۴۲ء تک ۱۳۶ کروڑ سے بڑھ کر رقم ۲۲۳ کروڑ ہو گئی لیکن ان بنکوں کے صرف چالو کھاتوں میں اضافہ ہوا ہے میعادی امانتوں میں کمی ہو گئی ہے، یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ عوام میں اب بنکوں کا اعتماد گھٹ گیا ہے، وہ اپنے سرمایہ کو زیادہ سے زیادہ رقیق حالت میں رکھنا چاہتے ہیں اس کا ثبوت پوسٹل سیونگس اور کیاش سر ٹیفکٹس کی رقم سے بھی ہو سکتا ہے، جنگ سے پہلے ان مدات میں ۱۴۱ کروڑ کی رقم جمع تھی لیکن اب صرف ۹۵ کروڑ رہ گئی ہے، اس سے دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ موجودہ گرانی کے سبب سے لوگوں کے اخراجات میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے اور اس کا اثر بچتوں پر پڑ رہا ہے۔ نوٹوں کی زیادتی کے علاوہ ۶۰ کروڑ کی مالیت کے نئے روپے اور روپے والے نوٹ جاری کئے گئے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ زر کی مقدار میں یہ اضافہ آیا پیدائش دولت میں اضافے کے باعث ہے؟ لیکن قیمتوں میں غیر معمولی اضافے کی رفتار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اشیاء کی مقدار میں زر کے تناسب سے اضافہ نہیں ہوا۔ ایسے ملک میں جہاں کا نظامِ زر محض زر وضعی اور زر کاغذی پر مشتمل ہو افراطِ زر کا پتہ چلانے کے لئے اشاری اعداد (انڈکس نمبر) ہی پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ذیل کے اشاریہ سے ہندوستان میں قیمتوں کی گرانی کا اندازہ ہو سکے گا۔

کس قدر اضافہ ہوا ہے۔ ذیل کی جدول سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جنس	۱۹۳۹ـ۱۹۴۰	سنہ ۴۰، ۴۱، ۴۲ء کا اوسط	سنہ ۳۹/۴۰ء کے مقابلہ میں فیصد تخفیف یا اضافہ
جوٹ کے گٹھے	۹۷۵۰	۹۳۰۵	− ۴٫۶
روئی کے گٹھے	۴۹۴۲	۵۸۰۲	+ ۱۷٫۴
نیشکر ٹن	۴۶۶۲	۴۸۷۶	+ ۴٫۶
مونگ پھلی ٹن	۳۱۶۵	۳۱۲۴	− ۱٫۳
تل ٹن	۴۱۵	۴۰۹	− ۱٫۴
السی ٹن	۴۶۶	۳۹۶	− ۱۵٫۰
کھلی اور رائی ٹن	۱۱۱۷	۱۰۹۶	− ۱٫۹

اس جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف روئی اور نیشکر میں سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء کی بہ نسبت اضافہ ہوا ہے جو در اصل جنگ سے پہلے کا زمانہ ہے۔ زرعی کاروبار میں عدم ترقی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عام حالات میں بھی زرعی پیداوار پر قیمتوں کے اضافے کا بہت آہستہ اثر پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان کی تجارتی فصلوں کے لئے جو بیرونی مارکٹ ہاتھ سے جاتے رہے اُن کا کوئی مناسب بدل نہیں معلوم کیا گیا۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ حکومت پروپگنڈا کے ذریعہ غلہ زیادہ اُگانے کی ترغیب دے رہی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں افراطِ زر کی جو صورت پیدا ہو گئی ہے وہ اشیا کی غیر معمولی طلب اور ان کی قیمتوں میں اضافے کے سبب سے ہوئی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کی قوت خرید اور آمدنیوں میں پیدائش دولت کی ترقی کے باعث اضافہ ہوا ہے۔ ہندوستان میں کمانے والوں کی کل تعداد ۹ کروڑ ۷۰ لاکھ ہے ان میں سے ۴ کروڑ ۸۰ لاکھ کاشت کار ہیں اور ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ زرعی مزدور۔ ان کی آمدنی کا اہم ذریعہ

۳۴ بز ممالک متحدہ میں ۱۲ بز جاپان میں ۳۰ بز اور جرمنی میں ۶، ۴ بز قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ان ممالک میں جو جنگ سے زیادہ متاثر ہیں قیمتوں کے اضافے پر قابو پالیا گیا ہے لیکن ہندوستان میں اضافے کی رفتار مستقل حیثیت رکھتی ہے چنانچہ کلکتہ کے اشاری اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپریل ۴۲ء میں یہ ۱۵۷ تھا لیکن اکتوبر ۴۲ء میں بڑھ کر ۲۰۶ ہو گیا یعنی صرف مہینوں میں ۳۱ بز کا اضافہ ہوا۔ ان اعداد سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہندوستان میں افراطِ زر بہت خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے اور اگر اس کا مناسب سدباب نہ کیا گیا تو یہ غریب طبقے کے لئے تباہ کن ثابت ہوگا۔ قیمتوں کے اضافے سے تو یہ ثابت ہو چکا ہے کہ پیدائش دولت کے اعداد سے یہ معلوم ہوگا کہ کہاں تک زر کی مقدار میں اضافہ پیدائش دولت کی زیادتی کی بدولت ہوا ہے۔

صنعتی پیداوار کے اشاری اعداد

اساس = ۱۹۳۸ - ۱۹۳۹ = ۱۰۰

سال	ہندوستانی روئی کا صرف	جوٹ کی مصنوعات	فولاد	کاغذ
۱۹۳۹ - ۱۹۴۰	۹۵	۱۰۵	۱۱۰	۱۱۸
۱۹۴۰ - ۱۹۴۱	۱۰۷	۹۱	۱۲۳	۱۸۵
۱۹۴۱ - ۱۹۴۲	۱۲۵	۱۰۰	۱۳۰	۱۵۴

اس کے علاوہ دوسرے صنعتی کاروبار میں بھی اضافہ ہوا ہے اور اس طرح سے کل اضافہ ۳۰ بز ہوا۔ ریلوے کی سرگرمیوں سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ خدمات کی مد تک ۲۰ بز کا اضافہ ہوا ہے۔ ان کا مقابلہ اگر زر کی مقدار کے اضافے سے کیا جائے تو یہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہندوستان میں زراعت کی اہمیت کے مدنظر یہ دیکھنا چاہیے کہ زراعت کے کاروبار میں

درمیانی اشخاص فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مزید برآں قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ صرف گذشتہ آٹھ یا دس مہینوں میں ہوا ہے۔ ہندوستان کی ۷۵ ٪ آبادی کی قوت خرید اور آمدنیوں کی جب یہ ناگفتہ بہ حالت ہے تو نہیں معلوم کس طبقے کی قوت خرید میں اتنا زیادہ اضافہ ہوا ہے کہ پورے ملک کے حالات متاثر ہو رہے ہیں۔ ہندوستان میں صنعتی کاروبار میں بھی کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوا ہے۔ ذیل کی جدول سے ہندوستان کی صنعتی مصروفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اساس ۱۹۳۵ = ۱۰۰ — ۱۹۳۸ - ۱۹۳۹ - ۱۱۳،۱

۱۹۳۹ - ۱۹۴۰ - ۱۱۴،۰ — ۱۹۴۰ - ۱۹۴۱ - ۱۱۷،۳

مارچ ۱۹۴۲ - ۱۱۸،۹

یعنی سنہ ۱۹۳۵ء سے اب تک صنعتی مصروفیت میں صرف ۱۹ اعداد کا اضافہ ہوا ہے۔ ان صنعتوں میں روئی، جوٹ، فولاد، خام لوہا، سمنٹ، کاغذ، کوئلہ دریائی اور ریلوں کے حمل و نقل کا کاروبار اور جہازرانی شامل ہے۔ دوسرے کاروباروں کی حالت بھی رو بہ انحطاط رہی۔ اسٹاک اور شیرس میں اگست سنہ ۳۹ء کے مقابلے میں اگست سنہ ۴۲ء تک صرف ۷،۴۴ اعداد کا اضافہ ہوا ہے۔ درآمد میں سنہ ۳۸-۳۹ء کی بہ نسبت سنہ ۴۰-۴۱ء میں ۸،۲۵ ٪ اور برآمد میں ۹،۶ ٪ کی کمی ہوئی۔ مزدوروں کے حالات بھی نہایت مایوس کن ہیں۔ اجرتوں میں ۶ تا ۱۰ ٪ اضافہ ہوا ہے لیکن ان کے مصارف زندگی بہت بڑھ گئے۔ ذیل کے اشاری اعداد سے صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

مزدوروں کے مصارف زندگی کا اشاریہ

	اساس		فروری سنہ ۴۲ء	فروری سنہ ۴۱ء
بمبئی	اساس جون سنہ ۳۴ء	= ۱۰۰	۱۳۵	۱۱۹
پٹنہ	″ سنہ ۱۹۱۴ء کے پہلے پانچ سال کا اوسط	″	۱۴۱	۱۲۱
جمشید پور	″ ″ ″ ″ ″	= ″	۱۳۸	۱۱۹
جھریا	″ ″ ″ ″ ″	= ″	۱۴۴	۱۲۴
رانچی	″ ″ ″ ″ ″	= ″	۱۴۱	۱۰۸
مدراس	″ سال تا ختم جون سنہ ۳۶ء	= ۱۰۰	۱۱۵	۱۰۸
کانپور	″ اگست سنہ ۳۹ء	= ۱۰۰	۱۴۴	۱۰۸

جوٹ، روئی، تیل کے بیج، کھالیں اور چمڑے ہیں۔ زراعت پیشہ لوگوں کی آمدنی میں اضافہ اگر ہو سکتا ہے تو ان ہی اشیا کی قیمتوں کے اضافے کے سبب سے۔ مگر ذیل کی جدول سے معلوم ہوگا کہ ۱۹۳۹ء سے ان کی قیمتوں میں کوئی قابل لحاظ اضافہ نہیں ہوا۔ برخلاف اس کے ان کی روزمرہ ضروریات کی قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔

کلکتہ کے تھوک فروشی کے اشاری اعداد

اساس جولائی ۱۹۱۴ء = ۱۰۰

سال	غلہ	دالیں	شکر	چائے	اشیاء	تیل کے بیج	خام جوٹ	روئی کی مصنوعات	خام روئی	چمڑے اور کھالیں	دیگر خام و تیار اشیاء
۱۹۳۹	۸۶	۹۹	۱۶۴	۱۴۳	۱۲۵	۱۰۶	۸۰	۱۰۶	۷۵	۶۷	۹۵
۱۹۴۰	۹۹	۱۰۱	۱۵۷	۱۴۹	۱۴۶	۱۰۶	۷۹	۱۲۲	۸۷	۷۲	۱۱۵
۱۹۴۱	۱۱۲	۱۰۵	۱۴۵	۲۰۲	۱۷۸	۱۰۳	۷۷	۱۷۹	۷۷	۷۴	۱۲۶
۱۹۴۲ مارچ	۱۱۵	۱۲۷	۱۷۷	۲۲۲	۲۱۳	۱۰۰	۷۰	۱۹۰	۷۰	۸۶	۱۴۰

جنوری ۱۹۴۲ء میں جنوری ۱۹۴۱ء کے مقابلے میں روئی کی برآمد میں ۸۸ جز اور مالیت میں ۸۱ جز کمی ہوئی۔ جوٹ کی برآمد میں ۷۲ جز کمی اور مالیت میں ۴ جز اضافہ ہوا۔ تیل کے بیجوں کی برآمد میں ۸۴ جز اور مالیت میں ۴۳ جز کمی ہوئی۔ گائے کی خام کھالوں کی برآمد میں ۸ جز اور مالیت میں ۹ جز کمی ہوئی۔ بھیڑوں کے چمڑوں کی برآمد میں ۳ جز کمی اور مالیت میں ۸ جز اضافہ ہوا۔ ہندوستان کی اہم برآمدی چیزوں کی اتنی پست حالت ہے اور اب تک کوئی دوسرا بازار میسر نہ آسکا۔ موجودہ گرانی کی وجہ سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ زرعی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے لیکن ہم زرعی اجناس کی شہروں میں جو قیمت ادا کرتے ہیں وہ اُس قیمت سے بہت مختلف ہے جو کاشتکار کو دیہات میں ملتی ہے اور ان دونوں قیمتوں سے فرق سے

سونے کا تناسب وہی ہے جو جنگ کے شروع میں تھا۔ ذیل کی جدول سے صورت حال کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

حکومت کا زر کاغذی اور اُس کے تمسکات :۔ کروڑ روپیوں میں :۔

سال	مجموعی جاری شدہ نوٹ	سونے کے سکے اور اینٹیں	اسٹرلنگ کے تمسکات	سونا اور تمسکات	سونا فی صد	اسٹرلنگ فی صد
۱۹۳۸ - ۱۹۳۹	۲۱۰٫۵۸	۴۴٫۴۲	۶۸٫۸۸	۵۲٫۸۵	۲۱٫۱	۳۱٫۷۱
۱۹۳۹ - ۱۹۴۰	۲۲۷٫۷۵	〃	۸۷٫۳۲	۵۳٫۸۹	۱۹٫۵	۳۴٫۳۴
۱۹۴۰ - ۱۹۴۱	۲۵۸٫۷۷	〃	۱۲۹٫۹۷	۶۹٫۳۹	۱۷٫۱	۵۰٫۲۹
۱۹۴۱ - ۱۹۴۲	۳۲۰٫۶۷	〃	۱۶۵٫۴۵	۶۵٫۴۵	۱۳٫۹	۵۱٫۵۵
یکم جنوری سنہ ۱۹۴۳ء	۵۹۱٫۷۷	〃	۴۱۲٫۸۳	۷۶٫۶۹	۴٫۷	۶۹٫۸۶

اس جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوٹ فرضی اعتبار کی بناء پر جاری کئے گئے ہیں اور اعتبار کا زیادہ حصہ اسٹرلنگ پر مشتمل ہے اور سونے کی مقدار صرف ۴٫۷ بز ہے۔ سرکاری ہنڈیوں کی مقدار میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء میں ان کی مقدار ۱۹ا کروڑ تھی یعنی سرکاری ہنڈیاں مجموعی قرضے کے ۶٫۵ بز سے بڑھ کر ۴٫۵ ابز ہوگئیں۔ ریزرو بنک کے قانون کی رو سے اعتبار کے طور پر سونے اور سونے کے تمسکات اسٹرلنگ اور اسٹرلنگ کے تمسکات کے علاوہ روپیہ اور اس کے تمسکات بھی رکھے جاتے ہیں۔ جنگ کی وجہ قانون میں یہ ترمیم کردی گئی ہے تاکہ روپیہ اور اُس کے تمسکات زیادہ مقدار میں رکھے جاسکیں، اس ترمیم سے فائدہ اُٹھا کر ریزرو بنک نے سرکاری ہنڈیوں کے عتبار پر نوٹ جاری کردیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خود ریزرو بنک کے روپے کے اعتبار پر نوٹ جاری کئے گئے ہیں۔ یہ تمام کاروبار فرضی اور غیر مستحکم ہونے کی وجہ سے

ہندوستان میں افراطِ زر کی شدت کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک تو زر کی مقدار میں بیحد اضافہ کیا گیا، دوسرے اشیاء اور خدمات کی رسد میں عام حالات کی بہ نسبت کمی ہوگئی ہے، مثلاً کپڑا ۲۰ فیصد کم ہے اور برما کے ہاتھ سے جانے کے بعد سیلون کے لئے چاول بھی ہندوستان کو ہی فراہم کرنا پڑ رہا ہے۔ کچھ ان وجوہ کی بنا پر اور کچھ فصل کی خرابی کے سبب رکن تجارت نے اندازہ کیا ہے کہ ہندوستان میں اس سال ۵ لاکھ ٹن چاول کی کمی پڑے گی، علاوہ اس کے ملک سے سونا اور چاندی بھی بہت بڑی مقدار میں باہر گئی ہے ورنہ لوگ روپیہ لگانے کی طرف راغب ہوتے۔ ملک کے باشندوں کی قوتِ خرید میں جس قدر بھی اضافہ ہوا ہے اُس رقم کے چلن کی رفتار بہت کم ہے ورنہ اگر یہ قوتِ خرید بھی بازار میں مسابقت کے لئے آتی تو قیمتوں میں اور اضافہ ہو جاتا۔

حکومتِ ہند کو افراطِ زر کا کلیتہً ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جا سکتا کیوں کہ حکومت نے خسارے کو دُور کرنے کے لئے نوٹ نہیں چھاپے بلکہ حکومتِ ہند کے گذشتہ تینوں جنگی موازنے کافی متوازن تھے اور حکومت اپنے اخراجات محاصل یا محاصل کے اضافے سے پورے کرتی رہی اس کے باوجود بھی اگر اخراجات اور آمدنی میں کوئی تفاوت رہتا تو حکومت قرض لیتی رہی اور اخراجات پورے کرتی رہی۔ لیکن حکومتِ ہند حکومتِ برطانیہ کی خاطر افراطِ زر کی خرابیوں کو ملک میں راہ دینے پر مجبور ہوئی۔ حکومتِ برطانیہ اور ممالکِ متحدہ امریکہ کو کامیاب انصرام جنگ کے لئے اشیاء کی غیر معمولی مقدار درکار ہوتی ہے اور چونکہ ہندوستان کے وسائل بہت وسیع ہیں اس لئے یہ کام حکومتِ ہند کے ذمے ہے کہ وہ روپیہ فراہم کرے اور اشیاء مہیا کرے، اس کے معاوضے میں حکومتِ ہند کو اسٹرلنگ ملتے ہیں جو خود سونے میں غیر نقد پذیر ہے اور ایک اعتباری زر ہے۔ ریزرو بنک کے پاس اس طرح سے کروڑوں روپے کا اسٹرلنگ جمع ہو رہا ہے، اندازہ ہے کہ اب تک ۲۲۷ کروڑ کا اسٹرلنگ جمع ہو چکا ہے۔ ریزرو بنک ان کے اعتبار پر یعنی اعتباری زر کے اعتبار اور بنیاد پر مزید نوٹ جاری کر رہا ہے اس کی وجہ سے مرکزی بنک کے پاس اعتباری حصے میں اسٹرلنگ اور اسٹرلنگ کے تمسکات بہت بڑھ گئے ہیں لیکن سونا اور

گذشتہ جون اور جولائی میں بمبئی کے اسٹاک اکسچینج میں کافی سرگرمی رہی۔

ان حالات کی وجہ سے ملک کے مختلف معاشی اداروں نے اس صورتِ حال سے نبٹنے کے لئے تجویزیں پیش کی ہیں۔ ایک تجویز تو یہ ہے کہ اسٹرلنگ کے ذرائع سے اسٹرلنگ کا دوسرا قرضہ بھی ادا کر دینا چاہیے اور اس پر عمل شروع ہو چکا ہے اور حکومت نے چند ریلوں کو خریدنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اسی طرح سے برطانوی حکومت کو چاہیے کہ وہ ہندوستان میں اپنے مشغولات فروخت کر دے اور اس طرح سے جو رقم حاصل ہو اُس سے اپنی ضرورت کی اشیاء خریدے۔ ہندوستان کی حیثیت اس وقت لین دار ملک کی ہے اور حسب عملدرآمد ہندوستان کو حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ تجارت کی شرائط طے کرے۔ ہندوستان کو اشیاء کے معاوضہ میں یا تو سونا ملنا چاہیے یا مشنری وغیرہ تاکہ یہاں صنعتوں کو فروغ دیا جا سکے۔ مشنری وغیرہ تو ذرائع حمل و نقل کی دشواریوں کی وجہ سے نہیں آسکتی اور سونے کی کل مقدار کا ۹ جز امریکہ کے پاس جمع ہے اس لئے یہ صورت بھی تقریباً ناممکن ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ جس طرح ہندوستان نے اپنی ضرورت کے وقت انگلستان میں اسٹرلنگ کے قرضے جاری کئے تھے اور خود انگلستان نے اپنی ضرورت کے مدنظر امریکہ میں ڈالر کے قرضے جاری کئے تھے اسی طرح اب وہ ہندوستان میں روپے کے قرضے جاری کرے اور اگر انگلستان اُس کے مشغولات کو ضمانت کے طور پر پیش کرے گا اور خود حکومتِ ہند مزید ضمانت دے گی تو کافی رقم ان قرضوں میں وصول ہو سکتی ہے اور انگلستان اس رقم سے اور اپنے مشغولات کو فروخت کر کے اپنی ضرورتوں کی چیزیں خرید سکتا ہے۔ یہ صورت اس لئے ممکن بھی ہے کہ کنیڈا نے خود انگلستان سے اس قسم کا مطالبہ کیا ہے ورنہ اس سے کیا فائدہ کہ ہندوستان کی مادی دولت تو ہر چلی جا رہی ہے اور محض کاغذ کے پُرزے اُس کے بدلے میں مل رہے ہیں۔ روپے کے قرضے ری کرنے کا دوسرا فائدہ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر جنگ کے بعد شرح مبادلہ ۱ شلنگ ۶ پنس کی بجائے ۱ پنس ہو جائے تو ہندوستان کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ حکومتِ ہند افراطِ زر کو روکنے کے لئے یہ بھی کر سکتی ہے کہ محاصل اور قرضوں کے ذریعہ سے عوام کی قوتِ خرید کو حاصل کر لے، لیکن

صورت حال خراب ہوتی جارہی ہے۔ ہندوستان کو امریکہ سامان کے بدلے میں سونا یا ڈالر دیتا ہے، لیکن ان دونوں کو انگلستان اپنے لئے مختص کرلیتا ہے اور ہندوستان میں چونکہ نگرانی تبادلہ قایم ہے اور ہندوستان اسٹرلنگ بلاک سے تعلق رکھتا ہے اس لئے پھر اسٹرلنگ حاصل ہوتے ہیں۔

اب ہندوستان میں یہ اہم سوال پیدا ہوگیا ہے کہ اسٹرلنگ کی اس غیر معمولی مقدار کا جو اب تک ۶۲۷ کروڑ وصول ہوچکی ہے اور ماہانہ تقریباً ۲۰ کروڑ وصول ہورہی ہے کیا کیا جائے۔ ہندوستان پر اسٹرلنگ کے دو طرح کے قرضے ہیں، ایک تو وہ قرضے جو حکومت ہند نے اپنے اغراض کے لئے انگلستان میں حاصل کئے ہیں، ان کو اسٹرلنگ کے قرضے کہتے ہیں جن کی مقدار ۴۶۹ کروڑ تھی اور یہ قرضہ جنوری ۱۹۴۳ء کے پہلے ہفتے میں ادا ہوچکا ہے۔ دوسری قسم کا اسٹرلنگ کا قرضہ وہ ہے جو ہندوستان نے ریلوں کی تعمیر، نہروں وغیرہ کے بنانے کے لئے انگلستان میں لیا تھا، اس کی کل مقدار کارخانوں اور دوسرے کاروباروں کے برطانوی مشغولات کو شامل کرنے کے بعد ۸۰۰ کروڑ روپے ہوتی ہے جس پر ۱۰۰ کروڑ سالانہ منافع ملتا ہے۔ ان قرضوں کو اسٹرلنگ قرضے کہتے ہیں۔ پہلے قرضے کی ادائی کے بعد روپیہ کے قرضے میں جو اُس وقت ۷۰۹ کروڑ تھا اضافہ کردیا گیا اور یہ بڑھ کر ۱۰۲۶ کروڑ ہوگیا۔ اس طرح سے شرح مبادلہ میں تبدیلی کی وجہ سے نقصان کا اندیشہ دور ہوگیا۔ ہندوستان میں افراطِ زر کی وجہ سے غریب اور مفلوک الحال ہوگئے ہیں۔ اس کے خلاف بڑے بڑے کارخانہ دار تاجر اور ٹھیکہ دار اس موقع سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور وہ اب اس قابل ہیں کہ بڑے پیمانے پر تخمینی کاروبار کر کے قومی معیشت کو درہم برہم کردیں۔ اگر ہندوستان میں یہی حالت رہی تو جنگ کے بعد انتہا درجہ کی معاشی پستی پیدا ہوگی۔ زر کی قدر بے حد گھٹ جائے گی اور وہی صورت حال پیدا ہوجائے گی جو جرمنی میں گذشتہ جنگ عظیم کے بعد ہوئی تھی، یعنی کئی ہزار مارک کے بدلے ایک روٹی بھی نہ ملتی تھی۔ اُن غریب لوگوں کو بہت نقصان ہوگا جنھوں نے کچھ پس انداز کیا ہے۔ افراطِ زر کے موقعہ پر سرمایوں کو تباہی سے بچانے کی ایک ہی صورت ہوسکتی ہے، وہ یہ کہ حصص کو ان کی موجودہ حالت کو نظر انداز کرتے ہوئے خرید لینا چاہیئے اور اسی ذہنیت کی وجہ سے

گذشتہ بجٹ کو پیش کرتے ہوئے حکومتِ ہند کے رکنِ مالیہ سر جرمی رئیسمن نے افراطِ زر پر اپنی تقریر میں جو روشنی ڈالی وہ کچھ زیادہ امید افزا نہیں تھی، کیونکہ اس میں افراطِ زر کے وجود ہی سے تقریباً انکار کر دیا گیا تھا اور قیمتوں کی موجودہ گرانی کی یہ توجیہہ کی گئی تھی کہ حکومتِ برطانیہ اور حکومتِ امریکہ کی غیر معمولی خریداریوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ حکومتِ ہند نے یہ بتلا کر کہ افراطِ زر بجٹ کے خسارہ کی وجہ سے نہیں پیدا ہوئی ہے، اپنے آپ کو افراطِ زر کی ذمہ داریوں سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ اسٹرلنگ کے ذرائع جو ہندوستان کے حساب میں انگلستان میں جمع ہو رہے ہیں اُن کے مابعد جنگ استعمال کے متعلق سر جرمی نے بتلایا کہ اسٹرلنگ کے اُن ذریعوں کو ہندوستان کی صنعتی ترقی کے لئے مشنری خریدنے کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ اس پر ہندوستان میں یہ اعتراض کیا گیا کہ ہندوستان کو اس کا پابند نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ان اسٹرلنگ کے ذریعوں سے صرف انگلستان میں مشنری خریدے، بلکہ اُس کو اس بات کی آزادی ملنی چاہیے کہ جہاں وہ مناسب سمجھے اور جہاں سے سستے داموں مشنری ملے وہیں سے خریدے۔

ہندوستان میں جب افراطِ زر کی وجہ سے صورتِ حال بہت زیادہ خراب ہوگئی تو حکومتِ ہند اس بات پر مجبور ہوئی کہ افراطِ زر کی سختی کو روکنے کے لئے چند اقدامات عمل میں لائے۔ یہ مخالف افراطِ زر اقدامات کہلاتے ہیں۔ ان اقدامات کی وجہ سے زر کی گردش کی رفتار میں کمی ہوئی اور لوگوں کے پاس جو بیکار زر تھا اور جو قیمتوں میں مزید اضافے کا باعث بن سکتا تھا اُس کو حکومت نے حاصل کر لیا تاکہ قیمتوں میں کمی ہو۔ حکومتِ ہند نے مشغولی سرمایہ پر پابندی عائد کی تاکہ نئے کاروبار جاری نہ ہو سکیں اور قیمتوں کی سطح میں کوئی غیر معمولی تبدیلی نہ واقع ہو۔ علاوہ ازیں حکومت نے محصول زائد منافع کی شرح میں اضافہ کر کے ایک تو اپنے غیر معمولی اخراجات کے لئے رقم حاصل کی اور دوسرے اس محصول کو ایک مخالف افراطِ زر حربے کے طور پر استعمال کیا۔ برطانوی ہند میں یکم ستمبر ۱۹۳۹ء سے یہ محصول عائد کیا گیا ہے۔ یہ محصول اُس کاروبار پر عائد ہوتا ہے جس کا منافع مقررہ مدت کے دوران میں ۳۶ ہزار روپے سالانہ کی ابتدائی حد سے متجاوز ہو۔ یہ محصول ۵۰ فیصد رکھا گیا تھا اور باقی ۵۰ فیصد سے

ہندوستان چونکہ اس جنگ کو اپنا قومی مسئلہ نہیں سمجھتا اس لئے اس قسم کے قرضوں میں صرف ۲۵ اکروڑ روپے وصول ہوئے ہیں۔ محاصل اس لئے عائد نہیں کئے جاسکتے کہ عوام کی آمدنی میں اضافہ نہیں بلکہ اُن کی قوت خرید اثاثوں کو رقیق حالت میں رکھنے کی وجہ سے بڑھی ہے۔ ان کے علاوہ حکومت ایسے طریقے اختیار کرسکتی ہے کہ عوام زیادہ صرف نہ کرنے پائیں۔ امریکہ میں افراطِ زر کو روکنے کے لئے قرضے حاصل کئے گئے اور کانگریس کے زیرِ غور اس وقت ایک مسودۂ قانون ہے جس سے ۲۶ ارب ڈالر بطور محاصل حاصل کئے جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی پریسیڈنٹ کو مخالف افراطِ زر قانون کے ذریعہ سے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۲ء کو معیار بنا کر قیمتوں اور اجرتوں کا تعین کریں۔ ہندوستانی زر کا اعتبار کم قدر اور غیر مستحکم اسٹرلنگ پر منحصر ہے۔ ہندوستان کے زر کے اعتبار کو مستحکم کرنے کے لئے اسٹرلنگ کی بجائے ڈالر حاصل کئے جائیں، حکومتِ ہند افراطِ زر کو روکنے کے لئے فروخت کا محصول بڑھا سکتی ہے اور صوبوں کو مشورہ دیا جاسکتا ہے کہ وہ عوام سے قرض لیں اور مرکز کا قرض ادا کریں۔

دوسرے ممالک میں افراطِ زر کو روکنے کے لئے نگرانی قیمت اور راشننگ کے طریقے بہت کارگر ثابت ہوئے ہیں، لیکن ہندوستان میں حکومت کو ان طریقوں میں سخت ناکامی ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افراطِ زر کو روکتے ہوئے ان طریقوں کو اختیار کیا جائے تو کامیابی ہوتی ہے لیکن حکومتِ ہند عجیب منطقی مخمصے میں پھنس گئی، وہ خود افراطِ زر کی پالیسی پر کاربند ہے اور ساتھ ہی ساتھ نگرانی قیمت اور رسد بندی کے لئے جد و جہد کرکے اپنے آپ کو دھوکا دینا نہیں چاہتی۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ یہاں پر نگرانی قیمت کا طریقہ سخت نہیں ہے، انگلستان میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کی مدد سے چور بازاروں پر قبضہ کیا گیا، لیکن حکومتِ ہند ایسا کرنا نہیں چاہتی جیسا کہ رکن تجارت کی ایک تقریر سے ظاہر ہوتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ حکومتِ ہند فوجی اغراض کے لئے چور بازار سے خریدتی ہے اور اس کے مطابق نرخ کا تعین کرتی ہے۔ حکومتِ ہند چونکہ افراطِ زر کی پالیسی پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے اس لئے وہ نگرانی قیمت اور رسد بندی کے مسائل میں اتنی سختی نہیں برتتی جتنی کہ ضروری ہے۔

معاشی ناکہ بندی

از سعید احمد صاحب کیتانی متعلم ام اے (عثمانیہ)

بیسویں صدی میں سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے طریق جنگ میں عظیم الشان انقلاب پیدا کردیا ہے فن جنگ کو پہلی سی اہمیت نہیں حاصل رہی ہے اور جنگ نے بڑی حد تک معاشی حیثیت اختیار کرلی ہے[1] ظاہر ہے کہ اسکے باعث معاشی ناکہ بندی کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے۔

قبل اس کے کہ معاشی ناکہ بندی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے اسکے حقیقی مفہوم کی مختصر صراحت مناسب ہے۔ یہ امر قابلِ خیال ہے کہ موجودہ زمانے میں ناکہ بندی کے تصور کو زمانہ قدیم کی مثل محدود حیثیت حاصل نہیں بلکہ اس میں رفتہ رفتہ غیر معمولی وسعت پیدا ہوچکی ہے اور یہ ضروری ہے کہ اسکے قدیم محدود مفہوم اور جدید وسیع معنوں میں امتیاز کیا جائے۔

اصولاً معاشی ناکہ بندی کی تشریح انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں مندرجہ ذیل الفاظ میں[2] کیگئی ہے "معاشی ناکہ بندی سے مراد غنیم کے نقل وحمل اور لین دین کا دُنیا کے دوسرے خطوں سے انقطاع ہے جو ہر فریق جنگ کا اولین مقصد ہوتا ہے۔ اسکی رو سے غنیم اور غیر جانب دار ممالک کے درمیان مبادلے کو غیر قانونی اور ناجایز قرار دیا جاتا ہے — غرض اسکی تمام تر غایت یہ ہوتی ہے کہ خود دشمن کے اپنے ملک تک یا مقبوضہ ممالک تک اشیاء کی رسد غیر ممکن بنادی جائے"[3]

---

[1] ملاحظہ فرمائیے جیوفری کرارتھ کا مشہور پمفلٹ THE SINEWS OF WAR

[2] سر ٹامس بارکلے کا مضمون "ناکہ بندی پر" انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں۔ [3] معاشی ناکہ بندی کے حقیقی مفہوم کے لئے سر ٹامس بارکلے نے اپنی مشہور تصنیف "PROBLEMS OF INTERNATIONAL PRACTICE AND DIPLOMACY" میں اور مارسس پامرلی نے ENCYCLOPAEDIA OF SOCIAL SCIENCES میں تفصیلی بحث کی

انکم ٹکس اور سوپر ٹکس کے لئے گنجایش نکالنے کے باوجود بھی صنعتوں کے پاس کافی رقم بچ رہتی تھی، اس لئے یہ شرح بڑھاکر ۶۶⅔ مقرر کی گئی۔ ۱۹۴۳ء کے محصول زائد منافع کے آرڈیننس کے ذریعہ سے زائد منافع کے ۱/۱۲ جز کی لازمی بچت ضروری قرار دی گئی۔ اس طرح سے زاید منافع کے ۱/۱۲ جز کے علاوہ تمام کا تمام ۹۳⅓ جز زاید منافع حکومت کے خزانے میں چلا جاتا ہے۔

حکومت نے نگرانی پارچہ اور معیاری کپڑے کے ذریعہ سے پارچہ کی قیمتوں پر کڑی نگرانی قائم کی ہے اور جس کی وجہ سے قیمتیں ۴۰ جز تک کم ہوگئی ہیں، لیکن پھر بھی ہندوستان میں اشیائے احتیاج کی قیمتیں اس قدر زیادہ ہیں کہ اُن کا حاصل کرنا غریب طبقے کے لئے بہت دقت طلب بلکہ بعض صورتوں میں ناممکن ہے، اس لئے ان تمام اقدامات کے ساتھ حکومت کو چاہیے کہ وہ زر کی مقدار میں نوٹوں کے شائع کرنے کی وجہ سے جو زیادتی ہورہی ہے اُس کو روکے۔

چھٹی نمایش مصنوعات مملکت آصفیہ

بمقام باغ عام حیدرآباد دکن

۲۴ ردے ۱۳۵۳ف تا ۲۴ بہمن ۱۳۵۳ف

اغراض نمایش

مملکت آصفیہ کی معاشی ترقی کے لئے ملک کے مصنوعات اور قدرتی ذخائر و پیداوار کے نمونے اور ان کی کیفیت و حالات اہلِ ملک کے سامنے پیش کرنا۔ قدرتی ذخائر اور وسایل سے استفادہ کرنے اور مصنوعات تیار کرنے کے مختلف طریقوں اور ترکیبوں کا عملی مظاہرہ کرنا اور ملک میں صنعتی کاروبار کی ترقی کے امکانات کو ظاہر کرنا اور ان سے دلچسپی پیدا کرنا اور ملکی مصنوعات خریدنے اور استعمال کرنے کا شوق دلانا۔ نیز صناعوں اور تاجروں کی ہمت افزائی کرنا اور ان کو ترغیب دینا کہ جدید صنعتیں آغاز کریں اور مصنوعات تیار کرنے کے جدید طریقے اختیار کرنے کے لئے کوشاں رہنا۔

ہر محب وطن اور ہر صناع سے التماس ہے کہ اس قومی اور رفاہ کارانہ کام میں ہاتھ بٹائے۔

اس سے متعلق بھی شدید ترین نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے کہ غیر جانبدار ممالک اپنی ضروریات سے زاید اشیا درآمد کرکے اُسے دشمن تک تو نہیں پہنچاتے ۔ چنانچہ گذشتہ جنگ عظیم کے دوران میں جب یہ محسوس کیا گیا کہ ناکہ بندی میں شریک اشیاء کی جو فہرست قانون بین الاقوام کی روشنی میں اعلان لندن[۵۱] کے بعد مرتب کی گئی تھی اور جو تقریباً ایک صدی پیشتر کے حالات پر مبنی تھی برآمد اور درآمد کے ترقی یافتہ طریقوں کے سامنے موثر ثابت نہیں ہو رہی ہے تو برطانیہ نے ایک جدید طریقہ اختیار کیا۔ اسکے تحت تمام غیر جانبدار ممالک میں تجارتی اداروں کا قیام عمل میں آیا اور یہ ادارے چونکہ برطانیہ کی وزارت تجارت سے راست تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کا فرض یہ تصور ہوتا کہ اس امر کی کامل نگرانی کریں کہ اپنی ضروریات سے زائد اشیاء درآمد کرکے غیر جانبدار ممالک انہیں دشمن کے علاقے میں تو نہیں بھیجتے۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بحری تجارت کا نظام موجودہ زمانے میں اس قدر پیچیدہ ہو چکا ہے کہ .... ناکہ بندی کے سلسلے میں اس پر کافی قابو برقرار رکھنا سہل نہیں۔ اول تو سمندری راستوں پر تسلط قائم کرنے کے لئے ایک طاقتور بحریہ ناگزیر ہوتا ہے علاوہ ازیں غیر جانب دار ممالک کو اس کا یقین دلانا ہوتا ہے کہ اُن کی ضروری رسد کے حصول میں قطعاً رخنہ اندازی نہ ہوگی ورنہ اسکے برخلاف صورت میں ان سے بھی دشمنی مول لینے کا اندیشہ ہوتا ہے ۔ اس طرح درحقیقت معاشی ناکہ بندی سمندروں کی نگرانی تک محدود نہیں بلکہ اس میں یہ غرض بھی شامل ہے کہ غیر جانب دار ممالک کے توسط سے رسد حاصل کرکے غنیم کو معاشی ناکہ بندی کے انتہائی شدید اثرات سے نجات حاصل کرنے کا موقع نہ دیا جائے[۵۲]۔

---

۵۱ - ملاحظہ فرمایئے جے۔ بی۔ اسکاٹ J. SCOTT کی تصنیف "اعلان لندن" (DECLARATION OF LONDON)

۵۲ - یہاں اس امر کا اعادہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ گذشتہ جنگ عظیم کے دوران میں مشہور جہاز EMDEN اور جنوبی سمندروں کے دوسرے جہازوں کو رسد غیر جانبدار بندرگاہوں سے حاصل ہوتی رہی۔ چنانچہ اس جنگ میں بھی ایسے واقعات ہوئے ہیں لیکن اسکے باوجود بہت سے ممالک نے اپنے فرض کو سختی سے پورا کیا ہے مثلاً مغربی آفریقہ میں پرتگالی افسروں نے اس ضابطے کو توڑنے سے صاف انکار کردیا اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو مسلح جہازوں کو راستہ نہیں دیا۔

موجودہ زمانے میں معاشی ناکہ بندی کی اصطلاح محض اپنے لفظی یا قانونی مفہوم میں استعمال نہیں ہوتی ہے بلکہ اسکے دائرے میں تمام ایسے امور شامل ہوتے ہیں جنکا مقصد دشمن کی تجارت خارجہ کا خاتمہ ہوتا ہے۔ معاشی ناکہ بندی سے یوں تو ہوائی، بحری اور بری تینوں اقسام کی ناکہ بندی مراد ہوسکتی ہے لیکن چونکہ تجارت خارجہ کی اہم ترین راہ سمندری ہے اسلئے بحری ناکہ بندی کو نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

معاشی ناکہ بندی کا تصور کسی طرح جدید نہیں جیسا کہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ دو صدیوں سے ناکہ بندی طریق جنگ کا ایک نہایت ناگزیر جزو بنی رہی ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی سے طاقتور بحری دستوں کے ذریعے دشمن کی بندرگاہوں پر اسکا عملدرآمد کیا جارہا ہے چنانچہ نپولین کا کونٹنینٹل سسٹم یا براعظمی نظام زمانۂ ماضی میں معاشی ناکہ بندی کے ایک ناکام تجربے کی حیثیت سے کافی اہم ہے۔

گزشتہ صدی میں معاشی ناکہ بندی کے طرز اور طریق میں نمایاں تغیرات ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ناکہ بندی کی اوّلین شرط یہ ہوتی ہے کہ بحری قوت اتنی کافی ہو کہ کامیابی سے دشمن کے تجارتی راستے پوری طرح روکے جاسکیں۔ معاشی ناکہ بندی کے حدود کا باضابطہ تعین پہلے سے کر دینا ہوتا ہے تاکہ غیر جانبدار ممالک کے جہازوں کو بے کار وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے[1]۔ اسکے علاوہ ہر جہاز پر قبضہ کرنے سے قبل طویل اور گہری تحقیق کی جاتی ہے۔

زمانۂ قدیم میں جبکہ نقل و حمل کے وسائل آسان اور ترقی یافتہ نہ تھے تو معاشی ناکہ بندی پر عمل زیادہ دشوار نہ ہوتا تھا کیونکہ دشمن کے لئے غیر جانب دار ممالک کے توسط سے رسد حاصل کرنے کا امکان نہ تھا۔ لیکن آج جبکہ ذرائع حمل و نقل ہماری گزشتہ نسلوں کے خواب و خیال سے بھی کہیں زیادہ ترقی کر چکے ہیں کامیاب ناکہ بندی کے لئے محض یہی لازمی نہیں کہ دشمن کے جہازوں کو سامان لیجانے سے باز نہ رکھا جائے بلکہ اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں غنیم غیر جانب دار ممالک کے ذریعہ رسد نہ حاصل کرلے

---

[1] - دیکھئے اڈمنرل سر ہربرٹ رچمنڈ کا پمفلٹ "بحریہ کا حصہ موجودہ طریق جنگ میں" (NAVAL ROLE IN MODERN WARFARE)

اثرات سے محفوظ رہنے کیلئے جو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں وہ نہایت دشوار اور گراں ہوتے ہیں سب سے پہلے تو سارے ذخیروں یعنی توفیری مقداروں کو استعمال کیا جاتا ہے پھر اصول بدل پر عمل ہوتا ہے اور بالآخر مصنوعی کیمیاوی بدل ایجاد کئے جاتے ہیں[۱]۔ دوسری جانب معاشی ناکہ بندی کے ذریعے کوشش یہ ہوتی ہے کہ اشیا کے بدل معلوم کرنے کیلئے دشمن کی مساعی کو انتہائی مشکل اور محض ناکام بنایا جائے۔

اس طرح اس مسئلے کی بخوبی تشریح ہوتی ہے کہ ناکہ بندی کے اثرات فوری کیوں نہیں ظاہر ہوتے۔ ظاہر ہے کہ فوری نتائج کی توقع اسی صورت میں ہوسکتی ہے جبکہ ایک شئے کے عوض دوسری شئے کے استعمال کا نتیجہ خود اسی شئے کی قلت میں رونما نہ ہو۔ چنانچہ مسٹر کلارک اپنے پمفلٹ " برطانیہ کی ناکہ بندی " میں رقمطراز ہیں " اشیا کی قلت کچھ اس طرح رونما ہوتی ہے کہ ایک شئے کی قلت، دوسری شئے کی قلت پیدا کرتی ہے۔ اس طرح یہ طریقہ نائن پنس کے کھیل سے بہت مشابہ ہے "۔

یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ معاشی ناکہ بندی خواہ کس قدر شدید اور موثر کیوں نہ ہو اس امر کی ضمانت نہیں ہوتی کہ اشیا کی رتی برابر مقدار بھی ناکہ بندی کے منطقوں سے نہیں نکل رہی ہے۔ دشمن کی تجارت خارجہ چاہے کتنی بھی کم رہ جائے اشیاء کی تھوڑی بہت مقدار کے حصول کا امکان برابر قائم رہتا ہے۔

معاشی ناکہ بندی کا ایک طریقہ جس پر جرمن مدت سے عمل پیرا ہیں یہ ہے کہ آبدوز کے ذریعے بغیر کسی امتیاز کے جہازوں کو غرق کیا جائے۔ بلاشبہ یہ طرز عمل بغیر یہ یقین کئے کہ جہاز اتحادیوں کا ہے یا کسی غیر جانب دار ملک کا علاوہ بین الاقوامی قانون سے صریح انحراف کے برطانیہ کی موثر ناکہ بندی کے طریقے کے سامنے ہرگز کامیاب ثابت نہیں ہوسکتا۔

معاشی ناکہ بندی کا ناگزیر نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ علاوہ تجارت درآمد کے دشمن کی ساری تجارت برآمد بھی ختم ہوجاتی ہے جسکے باعث نت نئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دشمن اپنی زاید یا توفیری پیداوار سے مناسب و موزوں استفادہ نہیں کرسکتا اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکی صلاحیت بحیثیت ایک درآمد

---

[۱] - ان طریقوں کی مزید تفصیلات معلوم کرنے کیلئے دیکھئے سر ولیم بیورج " WILLIAM BEVERIDGE " کا مشہور پمفلٹ ناکہ بندی اور شہری آبادی THE CIVILIAN POPULATION

اس احساس کے پیشِ نظر کہ ہر بندرگاہ پر جہازوں کی مکمل تلاشی لینے کے طریقے میں بہت وقت ضائع ہوتا ہے اور فضول طوالت ہوتی ہے برطانیہ نے ناکہ بندی کا بہتر اور جدید طریقہ ایجاد کیا ہے یہ طریقہ اس اصول پر مبنی ہے کہ کوئی جہاز ناکہ بندی کے منطقے کا رخ نہیں کرسکتا تاوقتیکہ اسکے پاس بحری اجازت نامہ موجود نہ ہو۔ یہ اجازت نامے روانگی کے مقام پر کامل تحقیق کے بعد اجرا ہوتے ہیں۔ چنانچہ برطانیہ کی یہ جدت نہایت کامیاب ثابت ہوئی ہے اور اسکی بدولت ایک طرف ناکہ بندی بہت زیادہ موثر بن چکی ہے تو دوسری طرف غیر جانبدار ممالک کی تجارت میں سہولت ہوگئی ہے۔[۵۷]

معاشی ناکہ بندی کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن کی معاشی زندگی کو انتہائی شدید طور پر متاثر کیا جائے یقیناً غنیم کی جنگی تیاریوں میں کامل انجماد پیدا کرنے کا یہ موثر ترین ذریعہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس طرح بالواسطہ طور پر معاشی ناکہ بندی سے حصول فتح میں نمایاں کامیابی ہوتی ہے۔ جیسے جیسے دشمن پر معاشی ناکہ بندی کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں اسی قدر اس کے لئے جنگی سامان کی پیدائش دقت طلب بنتی جاتی ہے۔ معاشی ناکہ بندی کے سبب سے جو قلت ظہور پذیر ہوتی ہے اسکے باعث ملک کی معاشی زندگی میں کچھ ایسا تغیر ہوتا ہے اور اسقدر شدید حالات پیدا ہوجاتے ہیں کہ سامانِ جنگ کی تیاری میں جمود کی سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ قلت اور فاقوں کی مصیبت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک انقلاب، لوٹ مار اور بغاوت کا شکار ہوجاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے نازک حالات میں جبکہ ضروریات کی قلت کیا بعض صورتوں میں کامل فقدان ہو لوگوں کی ہمت اور حوصلے قائم رکھنا نہایت دشوار بلکہ اکثر غیر ممکن ثابت ہوتا ہے۔

اس واقعے نے کہ موجودہ جنگ میں کامیابی کا انحصار بجائے شجاعت اور دلیری کے بڑی حد تک آلات حرب اور معاشی ذرائع پر ہے معاشی ناکہ بندی کی اہمیت میں مزید اضافہ کردیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن ممالک کو معاشی ناکہ بندی کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے وہ قبل سے خود مکتفی بننے کی سعی کرتے ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل کیلئے جو مختلف و پیچیدہ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں ان سے یہاں بحث نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ ایسی اشیاء جو ضروریات میں شامل ہیں انکے بدل معلوم کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ غرض معاشی ناکہ بندی

۵۷۔ اس طریقے کی تفصیلات کیلئے ملاحظہ فرمائیے کلارک کا پمفلٹ "برطانیہ کی ناکہ بندی" "BRITAIN'S BLOEKODE"

اشیاء جو جنگی سامان کی تیاری میں کام آتی ہیں اُنکی روک تھام اصولاً جائز نہ تھی[۵۱]۔ ظاہر ہے کہ اس طرح معاشی ناکہ بندی کو موثر نہیں بنایا جاسکتا تھا اور اسی لئے بالآخر اس اعلان کی پابندی نہ ہو سکی۔

پروفیسر پیگو کے اس خیال کے باوجود کہ معاشیات اخلاقیات کی خادمہ ہے، ہمیں یہاں اس مسئلے کے اخلاقی پہلو سے زیادہ سروکار نہیں لیکن پھر بھی یہ مسئلہ کافی جاذب توجہ ہے کہ معاشی ناکہ بندی کی فہرست میں آخر کن کن اشیاء کو منصفانہ طور پر شامل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ موجودہ جنگ میں بھی یہ مسئلہ مباحثے کا مرکز بنا رہا ہے۔ اتحادیوں کا زاویہ خیال یہ ہے کہ نازی خطرے کا مقابلہ ہر ممکنہ طریقے سے کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر برطانیہ نے معاشی ناکہ بندی کے اصول پر آغاز جنگ سے ہی سختی کے ساتھ عمل شروع کر دیا اور اسکے نتائج بھی رفتہ رفتہ نمایاں ہوتے جارہے ہیں کیونکہ ہٹلر کی جرمنی نے باوجود خود کفالت کے پُر زور دعوں کے برطانیہ کے اس عمل کے خلاف احتجاج شروع کر دیا ہے چنانچہ اس امر کا اعادہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ روس بھی اتحادیوں کی صف میں شامل ہونے کے قبل برطانیہ کے اس طرز عمل کو ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتا تھا[۵۲]۔ اُسکا استدلال تھا کہ شہری آبادی کو فاقے مارنا اُسی قدر وحشیانہ فعل ہے جسقدر کھلے شہروں کی بمباری۔

موجودہ زمانے میں جبکہ جنگ مملکتوں کی ساری ساری آبادیوں کے درمیان ہوتی ہے شہریوں اور فوجیوں کے درمیان کامل تفریق ممکن نہیں۔ گذشتہ جنگ عظیم میں جنرل لیوڈنڈراف نے یادداشت میں لکھا تھا "اس جنگ میں یہ اندازہ کرنا غیر ممکن ہے کہ کہاں فوج و بحریئے کا دائرہ ختم ہوتا ہے اور کہاں عوام کی ابتدا ہوتی ہے۔ فوج اور عوام ایکساں ہیں"۔

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ آج سے پچیس برس قبل جنگ اس قدر ہمہ گیر تھی تو موجودہ جنگ میں یہ پہلو کس درجے نمایاں ہوگا۔ اس ضمن میں خود فان اشٹائن کا یہ بیان کہ[۵۳] موجودہ زمانے میں کشمکش فقط

۵۱۔ سنہ ۱۹۰۰ کی جنوبی آفریقہ کی جنگ کے دوران میں لارڈ سیلسبری نے یہ کہا یہ بنا دیا تھا کہ "غذائی اجناس کی روک تھام اُسی وقت ہو جبکہ وہ دشمن کی فوجوں کیلئے استعمال ہوں۔ اسکے ساتھ اس نے یہ بھی صراحت کر دی کہ صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ ان اجناس کو فوجی اغراض کیلئے استعمال کیا جاسکتا ہے بلکہ یہ ثابت کر دینا ہوگا کہ سامان پر قابض ہوتے ... یہی ہو ... رہا تھا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لارڈ سیلسبری کے اس خیال کا انطباق موجودہ متغیرہ حالات پر ممکن نہیں۔ ۵۲۔ ملاحظہ فرمائیے روس کی حکومت کا ۲۵ اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء والا مراسلہ جسمیں برطانیہ کے ۶ اور ۱۱ ستمبر والے اعلانات کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا اور جس کا متن ... ج کے ——— " ناکہ بندی اور شہری آبادی" کے ن پمفلٹ "BLOCKADE AND THE CIVILIAN POPULATION" میں ملتا ہے صفحہ ۴۔ ۵۳۔ دیکھیے جیمز گارنر کی تصنیف بین الاقوامی قانون اور عالمگیر جنگ "INTERNATIONAL LAW AND THE WORLD WAR" ج اول صفحہ ۳۱۹۔

کرنے والے ملک کے متاثر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شاشت کی وہ تجویز جسے جرمنی کے حامیوں نے "برطانیہ کی بڑی ناکہ بندی" کا دل خوش کن لقب دیا ہے اگر غور کیا جائے تو ایک ایسی سعی مبہم سے زاید حیثیت نہیں رکھتی جس کا مقصد یہ ہے کہ "برطانیہ کی ناکہ بندی" سے جرمنی کی تجارت برآمد پر جو شدید اثرات مترتب ہوئے ہیں ان کا ایک حد تک ازالہ کیا جائے۔

فوری اور نمایاں نتائج کیلئے محض غنیم کے ملک کی معاشی ناکہ بندی کافی نہیں بلکہ ایسے تمام رقبوں کو بھی ناکہ بندی کے منطقے میں شامل کرنا ہوتا ہے جن پر دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مقبوضہ ممالک میں معاشی انتشار و بیچینی شدت اختیار کر کے بغاوت کی حد تک پہنچ جاتی ہے اور اس طرح دشمن کو ایک مستقل مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔

معاشی ناکہ بندی کے ضمن میں موجودہ زمانے میں یہ مسئلہ مورد بحث بنا رہا ہے کہ مقبوضہ آبادی کو جو دشمن کے مظالم کا شکار پہلے سے ہی ہے ناکہ بندی کے منطقے میں شامل کر کے مزید مصائب میں مبتلا کر دینا کس حد تک انصاف پر مبنی ہے[۱]۔ اس میں شک نہیں کہ سطحی طور سے تو یہ چیز بڑی ظالمانہ معلوم ہوتی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو یقیناً یہ طرز عمل ہر طرح حق بجانب بلکہ ناگزیر ہے۔ کیونکہ اگر مقبوضہ علاقوں کو ناکہ بندی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے تو اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے توسط سے دشمن کو رسد پہنچا کرے گی۔ مزید برآں اسطرح مقبوضہ علاقوں میں امن اور تسلط برقرار رکھنے میں نمایاں سہولت ہوگی اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں ناکہ بندی کرنے والی قوت کے مفاد کے قطعاً منافی ہیں۔

معاشی ناکہ بندی کے باعث، اشیاء کی جو عام اور مجموعی قلت پیدا ہوتی ہے اُس سے مفتوحہ علاقوں کے شدید استحصال کے مواقع کم ہو جاتے ہیں۔ غرض ناکہ بندی ہٹا کر مقبوضہ ممالک مثلاً فرانس کے مصائب کا ازالے کی تجاویز قابلِ توجہ ضرور ہیں لیکن بنیادی اسباب کی بناء پر قابل عمل کسی طرح بھی نہیں۔

اعلان لندن کے بعد جو جدول ترتیب دیا گیا تھا اسکی پابندی کی صورتمیں ناکہ بندی کا مسئلہ بہت دشوار بن گیا تھا کیونکہ اس کی رو سے معاشی ناکہ بندی کے تحت محض تیار سامان جنگ کو شامل کیا جاسکتا تھا اور ایسی خام

۱۔ دیکھئے گڈہارٹ GOOD HART کا پمفلٹ "جنگ کے کونسے افعال مبنی بر انصاف ہیں" "WHAT ACTS OF WAR ARE JUSTIFIABLE?" اور کلیرنڈن پریس CLARENDON PRESS کی مرتب کردہ تصنیف "جنگ کا پس منظر اور اس سے متعلقہ مسائل" "THE BACKGROUND AND ISSUES OF THE WAR"

فوجوں کے مابین نہیں بلکہ عوام کے درمیان ہوتی ہے، معاشی ناکہ بندی کے خلاف جرمنی کی جو دلیل ہے اُسکی کافی تردید کرتا ہے۔[1]

اسکے علاوہ معاشی ناکہ بندی کے سلسلے میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ آج کل جنگ میں اسقدر مختلف اور متعدد اشیاء استعمال ہوتی ہیں کہ کسی شئے کے متعلق بھی یقین نہیں ہو سکتا کہ اُسے جنگ کے سلسلے میں استعمال نہ کیا جائے گا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خواہ کوئی شئے کتنی ہی غیر اہم کیوں نہ ہو اُسے ناکہ بندی سے مستثنیٰ نہیں قرار دیا جا سکتا یہانتک کہ اسکی ضمانت نہیں ہو سکتی کہ ایسی اجناس جنہیں معاشی ناکہ بندی کی بندشوں سے آزاد کر دیا جائے اُن سے ناکس شہریوں کا پیٹ بھرا جائیگا یا فوجوں کے لئے غذا فراہم کیجائیگی۔[2]

اس میں شک نہیں کہ معاشی ناکہ بندی اگر موثر اور کامیاب ہو تو حصول فتح میں نہایت ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس سے متعلق گذشتہ جنگ عظیم سے دنیا نے جو سبق حاصل کئے ہیں انکے پیش نظر مزید شبہات کی قطعاً گنجائش نہیں حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ جنگ میں برطانیہ کی فتح کی بڑی وجہ کامیاب ناکہ بندی تھی فیلڈ مارشل ہنڈن برگ نے معاشی ناکہ بندی کے شدید اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا[3] "یہ تاریخ کا انتہائی المناک منظر ہے اور کوئی ایسا شخص جسکے دل میں واقعی انسانی ہمدردی کے جذبات موجود ہوں اس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا"۔

فریڈرک اعظم کا قول ہے کہ "فوج بھی سانپ کی مثل پیٹ کے بل چلتی ہے" اور اس جنگ میں بھی آثار صاف طور سے یہی بتاتے ہیں کہ برطانیہ ناکہ بندی کے ذریعے جرمنی کو شکست دیکر فریڈرک اعظم کے اس مقولے کی صداقت کو ثابت کریگا۔ علاوہ ازیں گذشتہ تجربہ جو مستقبل کا سب سے بڑا رہبر ہے جرمنی کے خود مکتفی ہونے کے متعلق گورنگ کے پُرزور دعوؤں اور ہٹلر کے اس خیال کی کہ معاشی ناکہ بندی کے ذریعے جرمنی کی معاشی قوت کا خاتمہ ہرگز ممکن نہیں، کامل تردید کرتا ہے۔ چنانچہ حالات کی رفتار سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان دعوؤں کے محض فرضی و باطل ثابت ہونے میں شاید زیادہ عرصہ باقی نہیں۔[4] بہرحال اس حقیقت سے کسی طرح چشم پوشی نہیں اختیار کی جا سکتی کہ ماضی کی مثل اس جنگ میں بھی معاشی ناکہ بندی نہایت فیصلہ کُن ثابت ہو گی اور بحیثیت مجموعی جنگ کا ایک ناگزیر و لازمی پہلو ہونے کے اسکی اہمیت میں مزید اضافہ ہو گا فقط

---

[1] خود جرمنوں کا یہ عقیدہ کہ KRIEGSMONNIER KRIEGSRISON GHET VAR یعنی ضرورت کے سامنے جنگ کے سارے قوانین سے انحراف جائز ہے، برطانیہ کی معاشی ناکہ بندی کو مبنی بر انصاف قرار دیتا ہے۔ [2] چنانچہ چارلز ہائڈ .... CHARLES HYDE نے اپنی مشہور تصنیف بین الاقوامی قانون جیسے کہ اسے ممالک متحدہ امریکہ نے استعمال اور تعبیر کیا ہے" LAW, CHIEFLY AS APPLIED AND INTERPRETED BY THE U.S.A میں اس خیال کی تائید کی ہے کہ ہر وہ شئے جس سے غنیم کو مدد ملتی ہے معاشی ناکہ بندی کے تحت حاصل کی جا سکتی ہے۔ [3] دیکھئے آرنلڈ فارسٹر ARNOLD FORSTER کا پمفلٹ "ناکہ بندی ۱۹۱۴-۱۹۱۹" THE BLOCKADE 1914-19 صفحہ ۳۔ [4] دیکھئے سر ولیم بیورج SIR WILLIAM BEVERIDGE کا پمفلٹ اور R. W. B. CLARKE کا پمفلٹ برطانیہ کی ناکہ بندی "BRITAINS BLOCKADE"

مجلّۂ طیلسانیین کے مقاصد و قواعد

(۱) "مجلّۂ طیلسانیین" انجمن طیلسانیین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا ترجمان ہے۔

(۲) اغراض انجمن کے لحاظ سے مجلّہ میں مضامین مقالے اور نظمیں شائع ہونگی۔

(الف) جامعۂ عثمانیہ کے منظورہ مابعد طیلساں مقالے شائع کئے جائینگے۔

(ب) اُردو مطبوعات پر تنقید و تبصرہ کیا جائیگا۔

(ج) انجمن طیلسانیین عثمانیہ اور اسکے ملحقہ اداروں کی سرگرمیوں اور کاروبار کے تفصیلات کی اشاعت عمل میں آئیگی۔

(د) علمی اور ہر جہتی ترقی کے معلومات و اطلاعات شائع کیجائینگی۔

(ھ) سیاسیات حاضرہ اور اختلافی مذہبی امور کے متعلق مضامین وغیرہ کسی صورت میں شائع نہ کئے جائینگے۔

(۳) حسب ضرورت مجلہ کے مختلف حصّے خاص خاص علم و فن سے مختص ہونگے۔ فی الوقت مجلّہ کے دو حصّے ہونگے ایک عام حصّہ دوسرا سوم معاشیات

(۴) مجلّہ بہمن۔ اردی بہشت۔ امرداد۔ آبان مطابق جنوری۔ اپریل۔ جولائی۔ اکتوبر میں شائع ہوگا۔

(۵) مجلّہ کے ہر حصّہ کی ضخامت کم از کم ۶ جزو ہوگی۔

(۶) مضمون یا مقالہ نگاروں کو انکے مضمون یا مقالہ کے ۲۵ نسخے بلا قیمت ارسال ہونگے اور ایم۔اے کے مقالہ کے ۱۰ نسخے بلا قیمت ارسال ہونگے۔ بشرطیکہ پہلے مطلع کردیا جائے اگر ان نسخوں سے زاید نسخے درکار ہوں تو کاغذ کی قیمت قبل از قبل ادا کرنے پر انتظام عمل میں آئیگا۔

(۷) اگر مضمون یا مقالہ نگار پہلے سے مجلّہ کے خریدار نہوں تو مجلّہ کا وہ شمارہ جسمیں مضمون شائع ہو بلا قیمت ارسال کیا جائیگا۔

(۸) سال بھر میں کسی صاحب کے دو مضمون یا مقالے شائع ہونے کی صورت میں سال مابعد کیلئے اگر قواعد انجمن طیلسانیین عثمانیہ مانع نہ ہوں، مجلّہ بلا قیمت جاری کیا جائیگا۔

(۹) اگر کوئی مضمون یا مقالہ یا نظم قابل اشاعت قرار نہ پائے تو اسکو واپس کردیا جائیگا۔

(۱۰) اگر کسی مضمون یا مقالہ کیلئے مجلّہ اپنے خرچ سے تصاویر کے بلاکس تیار کرے تو ان کو مناسب قیمت پر جسکا تصفیہ مہتمم مجلّہ کریگا فروخت کیا جاسکیگا۔

(۱۱) اگر مجلّہ کا کوئی شمارہ اشاعت کے مقررہ مہینہ میں وصول نہو تو اسکی اطلاع مہتمم کو دوسرے مہینہ میں کردینی چاہیئے۔